نفسیات

از

پروفیسر ڈاکٹر چوہدری عبدالقادر

سابق اقبال پروفیسر و صدر شعبہ فلسفہ

پنجاب یونیورسٹی

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ، لاہور

طبع اول	-	-	-	مارچ	۱۹۶۵ء
طبع دوم	-	-	-	جون	۱۹۶۷ء
طبع سوم	-	-	-	جنوری	۱۹۷۲ء
طبع چہارم	-	-	-	نومبر	۱۹۷۷ء
تعداد	-	-	-	۳۱۰۰	
قیمت	-	-	-	۳۵ روپے	

ناشر :
ڈاکٹر سیّد عبداللہ
جنرل سیکرٹری، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی
اُردو نگر، ملتان روڈ، لاہور

پرنٹر :
جدید اُردو ٹائپ پریس
۳۹- چیمبرلین روڈ، لاہور

مہتمم مطبع
مرزا نصیر بیگ

فہرست مضامین

ساتواں باب : محرکات کا ارتقا

آٹھواں باب: تأثر اور ہیجان (Feeling and Emotion) ... ۱۹۱

نواں باب : انفرادی اختلافات اور ذہانت

بیسواں باب: انتخاب، کشمکش، ناکامی

مصنف کی دوسری کتابیں

۱- اخلاقیات (اُردو میں)
۲- Logical Positivism [منطقی اثباتیت انگریزی زبان میں]
۳- The World of Philosophy [پروفیسر ایم۔ ایم۔ شریف کے اعزاز میں فلسفیانہ مضامین کا مجموعہ بزبان انگریزی]
۴- نفسیات تسویہ (اُردو میں)
۵- صنعتی نفسیات
۶- معاشری نفسیات
۷- معاشریات
۸- نمونی نفسیات
۹- عسکری نفسیات
۱۰- معاشری مفکر
۱۱- صنعتی معاشریات

پیش لفظ

اس کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ نفسیات کے متعلق جو جدید معلومات انگریزی زبان میں موجود ہیں انھیں اردو زبان میں منتقل کر دیا جائے۔ اس غرض کے پیش نظر میں نے کئی انگریز اور امریکی ماہرین نفسیات سے استفادہ کیا ہے۔ ان میں سے ووڈورتھ (Woodworth)، رش (Ruch)، من (Munn) اور ڈیشیئل (Dashiel) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

جدید نفسیات میں ہر امر کے لیے تجربات اور شواہد پیش کیے جاتے ہیں۔ حقائق کی تشریح تصاویر، گرافوں اور چارٹوں سے کی جاتی ہے۔ چنانچہ اس کتاب میں بھی ہر بحث کا فیصلہ تجربات اور شواہد سے کیا گیا ہے۔ مضمون کی تشریح کرتے وقت تصاویر پیش کی گئی ہیں اور نتائج کو گرافوں اور چارٹوں کی صورت میں ظاہر کیا گیا ہے۔

یہ کتاب ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور اور جنرل سیکرٹری مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کے ایما پر لکھی گئی۔ سید صاحب کی اردو دوستی تو مشہور ہے لیکن اردو دوستی سے زیادہ ان کی علم دوستی ہے اور ان دونوں سے بڑھ کر ان کا خلوص اور شوق ہے۔ اس کتاب کے سلسلے میں جس اخلاص اور شوق کا مظاہرہ سید صاحب نے کیا ہے میں اس کا تہ دل سے مشکور ہوں۔ ممتاز منگلوری صاحب نے اس کتاب کے پروف دیکھے اور اس کی طباعت میں حد سے زیادہ دلچسپی لی، یہ ممتاز صاحب کی شبانہ روز محنت کا نتیجہ ہے کہ یہ کتاب اس قدر جلد چھپ سکی۔ میں اپنی بیوی کا بھی شکر گزار ہوں جو

ع

اس کام میں میری ہمت بندھاتی رہیں اور اپنے لڑکے امتیاز قادر کا بھی جس نے سر ورق تیار کیا۔

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب طلبہ کے علاوہ پبلک کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کرے گی۔ غالباً اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جو نفسیات کو جدید طریقے سے پیش کرتی ہے۔

ڈاکٹر عبدالقادر

لاہور

۲۶ اکتوبر ۱۹۷۷ع

دیباچہ طبع سوم

پروفیسر چودھری عبدالقادر کی کتاب نفسیات کی یہ چوتھی اشاعت ہے - کسی علمی کتاب کا تھوڑے ہی عرصے میں چار اشاعتوں سے گزر جانا اس امر کی واضح شہادت ہے کہ قارئین کے طبقے میں اسے غیرمعمولی مقبولیت حاصل ہے ---،

نفسیات کا موضوع یوں بھی اس دور کا پسندیدہ موضوع ہے، اس پر اگر اس کی پیشکش بھی دلچسپ اور عام فہم ہو تو اس کے لیے قارئین کا حلقہ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے -

پروفیسر صاحب ماہر استاد ہیں، انھیں اپنے موضوع پر عالمانہ قدرت حاصل ہے، اس پر ان کا انداز بیان بھی سادہ، دلچسپ اور بے تکلف ہے، ان کی نظر اس امر پر مرکوز رہتی ہے کہ پڑھنے والا بات کو سمجھ لے - وہ اپنے علم کی نمائش نہیں کرتے دوسروں تک علم پہنچانا چاہتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ ان کے قاری بے نصیب نہیں رہتے - ان کی کتاب سے علم حاصل کرکے مطمئن ہو جاتے ہیں اور مقصد پا لیتے ہیں -

میں پروفیسر صاحب کا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے اس مرتبہ کچھ اضافے بھی کیے ہیں۔ آخر میں اصطلاحات کا ایک فرہنگ بھی دیا ہے جو مفید ہے - میں جدید اردو ٹائپ پریس کے مہتمم مرزا نصیر بیگ کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے کتاب محنت سے چھاپی ہے - اگرچہ اب یہ گلہ پیدا ہوتا جاتا ہے کہ طباعت میں دیر بہت لگاتے ہیں - تاہم پرانا مضمون

ہے، دیر آید درست آید ۔ اور یہ امر بھی باعث اطمینان ہے بہر حال ۔

والسلام

نیاز مند

ڈاکٹر سید عبداللہ

معتمد عمومی،

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور

۵۔ نومبر ۱۹۷۷ء

پہلا باب

تعارف

DEFINITION

آج سے سینکڑوں برس پہلے انگریزی کے ایک مشہور شاعر پوپ (Pope) نے کہا تھا کہ ''انسانوں کا صحیح موضوعِ مطالعہ فقط انسان ہے'' اس مقولہ سے ان علوم کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے ، جن کا تعلق انسانیت سے ہے - یہ تو ظاہر ہے کہ سارے کے سارے علوم انسانیت کا مطالعہ نہیں کرتے - طبیعات ، کیمیا اور حیاتیات کا موضوعِ مطالعہ انسان نہیں، بلکہ مظاہر فطرت ہیں - ان علوم کا اپنا درجہ ہے ، اور سچ تو یہ ہے کہ ان علوم نے جس قدر ترقی کی ہے ، اتنی ترقی دیگر علوم نے نہیں کی - جدید سائنس کا آغاز سترہویں صدی سے ہوتا ہے ، اور تین سو سال کے عرصہ میں اس نے وہ کمال حاصل کیا ہے کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے - امریکیوں اور روسیوں نے ، اور اب ان کی دیکھا دیکھی دیگر ممالک نے سائنس اور تکنالوجی میں وہ وہ نکتے دریافت کیے ہیں ، اور وہ وہ ایجادات کی ہیں کہ کائنات اور انسانی زندگی کے متعلق ہمارے سابقہ نظریات یکسر بدل گئے ہیں -

لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا طبعی علوم کی حیرت انگیز ترقی انسانوں کو سکون اور چین بھی دے سکی ہے یا نہیں ؟ اس میں شک نہیں کہ موجودہ زندگی کا عیش بہت حد تک سائنسی ترقی کا مرہون منت ہے - ہوائی جہاز سے دنوں اور مہینوں کا فاصلہ چند گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے - ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے گھر بیٹھے بٹھائے دور دراز کے گانوں سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں - کولر (Cooler) ، فرج

(Frigidiare) اور ایر کنڈیشنر (Air-Conditioner) سے صحرا میں بھی انگلینڈ اور امریکہ کا مزا لے سکتے ہیں - اسی طرح اخباروں ، رسالوں اور کتابوں سے دنیا کے بہترین دماغوں سے مستفید ہو سکتے ہیں - لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود موجودہ سائنس نے زندگی کو زیادہ پرخطر اور مخدوش بنا دیا ہے - دنیا ابھی دو عالمی جنگوں سے نپٹ کر بیٹھی ہے کہ تیسری جنگ کا خطرہ سر پر منڈلا رہا ہے - پہلے تو ایٹم بم سے صرف جاپان کے دو مشہور شہر تباہ ہوئے ، لیکن اب اگر جنگ چھڑ گئی تو معاندین کے پاس ایسے خطرناک بم موجود ہیں کہ دنیا منٹوں میں تباہ ہو جائے گی - رسل (Russell) کے خیال میں تیسری عالمی جنگ کے بعد انسان تو ختم ہو جائیں گے ، اور صرف کیڑے مکوڑے رہ جائیں گے -

لیکن طبعیی علوم کی ترقی سے دنیا صرف جسمانی تباہی کے خطرے ہی میں مبتلا نہیں ، بلکہ روحانی تباہی سے بھی دو چار ہے - مہذب لوگوں کی زندگیوں میں ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے کہ اسے پُر نہیں کیا جا سکتا - اس امر کا احساس روز بروز بڑھ رہا ہے کہ سائنس کی ترقی ، روح کی تشنگی کو نہیں بجھا سکتی - لہذا طبعیی علوم سے انسانی علوم کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے -

پچھلے تین سو سال میں جہاں طبعیی علوم نے ترقی کی ہے ، وہاں انسانی علوم کو بھی ترقی حاصل ہوئی ہے - لیکن دونوں علوم کی ترقی کی رفتار ایک جیسی نہیں رہی ، طبعیی علوم اس دوڑ میں بہت آگے نکل گئے ہیں - اب ضرورت اس امر کی ہے کہ انسانی علوم کو بڑھایا جائے ، اور ان کی اہمیت پر زور دیا جائے -

نفسیات (Psychology) کا شمار انسانی علوم میں ہے - اس کا مطالعہ انسانوں سے براہ راست ہے - خواہ اندرونی کیفیت اور واردات ہوں ، خواہ خارجی اعمال و افعال ہوں ، نفسیات کا تعلق ان سے بلا واسطہ یا

بالواسطہ ہے ۔ افراد اور ان کا کردار نفسیات کا موضوع ہے ۔ آپ ریل کے ڈبے میں سوار ہوں یا ریستوران کے کونے میں بیٹھے ہوں ، خواہ اخباری دنیا کا خاموشی سے مطالعہ کر رہے ہوں یا بچوں کے ساتھ دل بہلا رہے ہوں ، آپ دیکھیں گے کہ ہر جگہ دلچسپی کا مرکز انسان اور صرف انسان ہیں ۔ بین الاقوامی سیاست ہو یا گھریلو معاملات ، ان کا محور صرف ایک ہی ہے — افراد اور ان کا کردار ۔ اگر طبعیی علوم کی خشک ، جامد اور بے جان دنیا کو چھوڑ دیا جائے ، تو انسانوں کی ساری دلچسپی سمٹ سمٹا کر انسانوں کے مطالعے میں رہ جاتی ہے ۔

'انسانوں کے مطالعہ' سے ہماری کیا مراد ہے ، یا دوسرے الفاظ میں 'نفسیاتی حقیقت' کسے کہتے ہیں ؟ اس سوال کا جواب تاریخی پس منظر چاہتا ہے ، جو اختصار کے ساتھ ذیل میں بیان کیا جاتا ہے ۔

تاریخی پس منظر :

یورپ میں فلسفہ کا آغاز یونانیوں سے ہوتا ہے ، اور نفسیات کی ابتدا بھی وہیں سے ہوتی ہے ۔ یونانیوں نے سب سے پہلے یہ دریافت کرنا چاہا کہ 'نفس کی حقیقت' کیا ہے ؟ یہ سوال یوں پیدا ہوا کہ جب ہمارا کسی شے سے واسطہ پڑتا ہے تو وہ چیز ہمارے سامنے ہوتی ہے ، اور حواس کے ذریعے ہمارے ذہن میں داخل ہو جاتی ہے ۔ بعد میں اس شے کی عدم موجودگی میں یادداشت اور تخیل کی بنا پر ہم اس کا خاکہ کھینچ سکتے ہیں ، دوسروں کو بیان بھی کرسکتے ہیں ، جیسے کہ دیکھی ہوئی شے ہمارے ذہن میں محفوظ ہو ۔ ظاہر ہے کہ ذہن میں محفوظ شدہ شے اس شے سے مختلف ہوگی ، جو خارجی دنیا میں وجود رکھتی ہے ۔ مثال کے طور پر اگر آپ نے کوئی عجیب سا جانور دیکھا ہے ، تو اس کا جو نقشہ آپ کے ذہن میں ہے وہ اصلی جانور سے مختلف ہوگا ۔ جانور پانی پیتا ہے یا کھانا کھاتا ہے ، لیکن اس کا نقشہ یا تمثال (Image) نہ تو پانی پیتا ہے نہ کھانا کھاتا ہے ، اصل شئے میں اور اس کے تمثال

میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔ پس سوال یہ پیدا ہوا کہ تمثال اور شے میں کیا تعلق ہے ؟ ولایت میں بیٹھے ہوئے میرے دوست اور اس کے ذہنی نقشے میں کیا رابطہ ہے ؟ یہ سوال در اصل یادداشت (Memory) اور تخیل (Imagination) کا ہے ۔ یونانیوں نے اس سوال کو نہایت خوبی سے اٹھایا اور بین طریقے سے پیش کیا ۔

یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ پا اور نقش پا میں فرق ہے ۔ ایک تو پاؤں ہے اور دوسرا پاؤں کا نشان ۔ کوئی رہرو اپنے قدموں کا نشان تو مٹی پر چھوڑ جاتا ہے ، لیکن پاؤں اپنے ساتھ لے جاتا ہے ۔ افلاطون اور ارسطو نے اوپر والے سوال کو پا اور نقش پا کے انداز میں لیا ۔ ارسطو نے کہا کہ ہر شخص کے اندر سومی تختی (Tabulaprasa) موجود ہے ، جس پر بیرونی مہیجات (External Stimulii) اپنا نقش چھوڑ جاتے ہیں ۔ ارسطو نے 'موسی تختی' کو استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے ۔ اصل میں وہ کہنا یہ چاہتا تھا کہ ہر شخص کے اندر ایک خاص قسم کا جوہر موجود ہے ، جو نقوش قبول کرتا ہے ، اور پھر انہیں حفاظت سے رکھتا ہے ۔ اس جوہر کو روح (Soul) کہا گیا ۔

یوں Psychology کے لغوی معانی بھی علم روح کے ہیں ۔ Psyche روح کو کہتے ہیں ، اور Ology سے مراد علم یا سائنس ہے ۔ موجودہ زمانے کے ماہرین نفسیات کو 'روح' کا لفظ پسند نہیں وہ نفسیات کی تعریف 'روح' سے نہیں کرتے ۔ اس کی کئی وجوہات ہیں ۔ مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ روح کی حقیقت ازمنہ قدیم سے مابعد الطبیعات کا مسئلہ بنا ہوا ہے ، اور فلسفی اس مسئلے کو سلجھا نہیں سکے ۔ نفسیاتی ماہر فلسفیانہ بحث میں نہیں پڑنا چاہتا ۔ اس کا زاویہ خالص سائنسی ہے ، جو تجربے اور مشاہدے کی حدود سے باہر نہیں نکلتا ۔ اس کے نزدیک روح کے متعلق جو مفروضات قائم کیے گئے ہیں یعنی یہ کہ روح :

۱- غیر فانی ہے ۔

۲- جسم سے الگ زندہ رہ سکتی ہے ، اور

۳۔ خدا کا پرتو[1] یا جز ہے ۔

سب کے سب غیر سائنسی ہیں ۔ سٹیگنر (Stagner) کا کہنا ہے[2] کہ ارسطو اور افلاطون کے بعد بہت لوگوں نے روح کو جسم سے جدا خود مختارانہ حیثیت دے دی اور یہ خیال کیا کہ روح کی زندگی جسم سے بالکل الگ ہے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طبعی اور نفسیاتی واردوں (Physical and mental events) میں ایسی خلیج حائل ہو گئی جسے عبور کرنا قریب قریب ناممکن ہو گیا ۔ روح اور جسم کا تعلق سمجھانے کے لیے مختلف نظریات قائم کیے گئے لیکن کوئی نظریہ بھی اس گتھی کو خاطر خواہ طریقے پر نہ سلجھا سکا ۔ اگر روح اور جسم بنیادی طور[3] پر ایک دوسرے سے الگ ہیں اور ان کے اوصاف میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے تو ان کا آپس میں علاقہ کیسے ہو سکتا ہے ؟ جدید نفسیات اس کوشش میں ہے کہ طبعی اور نفسیاتی واردوں کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کیا جائے ۔

روح کے تصور پر جو تنقید کی گئی ہے اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ نفسیات کے بارے میں ارسطو اور افلاطون کے خیالات بالکل بے کار ہیں ۔

افلاطون نے نباتات ، حیوانات اور انسانوں کو ایک ہی سلسلے کی کڑی شمار کیا ۔ نباتات کا تفاعل (Function) نشو و نما اور بالیدگی سے تعلق رکھتا ہے۔ حیوانات میں نباتی تفاعل بھی ہے، اور اس کے علاوہ حساسی (Sensitive) بھی ۔ انسانوں میں نباتی اور حساسی وظائف کے علاوہ عقلی وظائف بھی موجود ہیں ۔ اس بیان سے صاف نظر آتا ہے کہ

۱۔ سایہ ۔

۲۔ ملاحظہ ہو اس کی Psychology مطبوعہ نیویارک ۱۹۵۲ع صفحہ ۴ ۔

۳۔ ملاحظہ ہو رسل (Russell) کی کتاب Analysis of Mind اور گلبرٹ رائل (Gilbert Ryle) کی کتاب Concept of Mind ۔

نباتات سے انسان تک ایک ارتقائی سلسلہ اور نموئی منازل ہیں لہذا افلاطون کے نزدیک نفسیاتی واردات کا مطالعہ نموئی طریقے (Develop-mental Methods) سے ہونا چاہیے - لیکن یاد رکھیے کہ افلاطون کا فلسفہ ثنویت کو تسلیم کرتا ہے - افلاطون عالم امثال (World of Ideas) کو عالم حسیات (World of Sense experience) سے جدا مانتا ہے اور عالم مثال کے تصورات کو ازلی اور ابدی حیثیت دیتا ہے - لہذا انہیں انسانی تجربے اور مشاہدے کا محتاج نہیں سمجھتا - یہ تصورات بچوں کے ذہن میں تو صاف ہوتے ہیں لیکن بالغوں کے ذہن میں مادہ سے ملوث ہو جاتے ہیں لہذا افلاطون چاہتا ہے کہ روح کو صاف رکھا جائے اور اس کا گدلا پن دور کیا جائے - یہی اس کے نزدیک اخلاقی مطمع نظر ہے -

افلاطون نے نہ صرف عالم امثال اور عالم موجودات میں ثنویت قائم کی بلکہ ذہن کو جسم پر فوقیت دی - انسان کا فرض ہے کہ وہ مادے اور جسم سے ہٹ کر ذہن کی طرف رجوع کرے - چونکہ تصورات غیرفانی ہیں ، اور روح ان کا مکان ہے ، روح بھی غیر فانی ہے - اور جسمانی موت کے بعد ابدالاباد تک قائم رہتی ہے - افلاطون کی تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا میں رہبانیت نے فروغ پکڑا -

افلاطون کے شاگرد ارسطو نے نموئی طریقے پر زور دیا - اس نے نباتات اور حیوانات اور نیز حیوانات اور انسانوں کی مماثلت کو اجاگر کیا - افلاطون نے روح کا احاطہ بڑا وسیع رکھا ہوا تھا - ارسطو نے اسے چھوٹا کر دیا - ارسطو کے مطابق عملی عقل تو تجربے اور مشاہدے کی محتاج ہے - صرف تخلیقی عقل تجربے سے بالا ہے اور اسی وجہ سے صرف تخلیقی عقل ہی ابدی اور ازلی زندگی کی مستحق ہے -

اپنی اپنی تعلیمات کی وجہ سے افلاطون نے عقلیت (Rationalism) کی اور ارسطو نے تجربیت (Empricism) کی بنا ڈالی - عقلیت کے

دعویداروں نے بڑی موشگافیاں کیں ، لیکن چونکہ وہ تجربے اور مشاہدے سے حقائق کو بے نیاز سمجھتے تھے ، انھوں نے کئی ایک بے ہودہ اور لا یعنی سوال بھی اٹھائے مثلاً یہ کہ کتنے فرشتے سوئی کے نوک پر ناچ سکتے ہیں ۔ تجربیت کا انحصار تجربے اور مشاہدے پر ہے، جدید نفسیات مکمل طور پر تجربی ہے ۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سائنسدان کو نظریات اور تعقلات سے کوئی سروکار نہیں ۔ کیونکہ کوئی علم بھی نظریات اور تعقلات سے خالی نہیں ہوتا ۔ تجربی صرف یہ چاہتے ہیں کہ سائنسی نظریات اور مفروضات کی بنا تجربے اور مشاہدے پر ہونی چاہیے - دوسرے الفاظ میں طریق کار استقرائی (Inductive) ہونا چاہیے نہ کہ استخراجی (Deductive) -

جدید سائنس کا آغاز سترہویں صدی سے ہوتا ہے - ڈیکارٹ ایک لحاظ سے جدید سائنس کا بانی ہے ۔ اس نے ارسطو اور افلاطون کے بت کو یورپی دماغوں سے باہر نکال پھینکا ۔ وہ ارسطو اور افلاطون کو عظیم مفکر ضرور سمجھتا تھا ، لیکن اس کی خواہش تھی کہ جب تک ان لوگوں کی تعلیمات مشاہدات سے پرکھ نہ لی جائیں تب تک قبول نہیں کرنی چاہییں ۔ اس لحاظ سے ڈیکارٹ کو تجربیت کا علم بردار سمجھنا چاہیے -

جدید نفسیات کو اضطراری فعل (Reflex Action) کا تصور ڈیکارٹ نے دیا ۔ وہ کہتا تھا حسی اعصاب (Sensory Nerves) دماغ میں داخل ہوتی ہیں ، اور وہاں سے جاندار ارواح (Animal Spirits) نالیوں کے ذریعہ عضلات (Muscles) تک پہنچ کر انہیں متأثر کرتے ہیں ۔ ڈیکارٹ عضویہ کو ایک طرح کی کل سمجھتا تھا جو مہیج آنے پر خود بخود کام کرتی ہے ۔ حیوانی عضویہ تو بالکل مشین ہے اور مشین کی طرح کام کرتا ہے لہذا اس کا ہر فعل اضطراری ہے لیکن انسانی عضویہ میں چونکہ روح کو بھی دخل ہے اس لیے انسان کا ہر فعل اضطراری

نہیں ۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ڈیکارٹ ہر عضویہ کو، خواہ وہ حیوان کا ہو یا انسان کا، مشین ہی سمجھتا تھا لیکن عیسائی پادریوں کے ڈر سے، جو ملحدوں کو عبرت ناک سزائیں دیتے تھے، ڈیکارٹ نے روح کے وجود کو تسلیم کر لیا اور اسے انسانی دماغ کے صنوبری غدود (Pineal Gland) میں مقید کر دیا ۔

اضطراری فعل کا تصور نفسیات میں ایک سنگ میل ہے ۔ جانوروں کا کردار اس نظریے سے سراسر اضطراری ہے ۔ جانوروں کا رد عمل ان مہیجات کی بدولت ہے جو ماحول سے اٹھتے ہیں اور جن کا مطالعہ روح کے مفروضہ کے بغیر ممکن ہے ۔ ڈیکارٹ انسانی کردار کا مطالعہ بھی مہیجات اور رد عمل سے کرے گا اور یہ مطالعہ بڑی حد تک اضطراری ہوگا لیکن انسانی کردار میں چونکہ روح کو بھی دخل ہے لہذا کئی افعال غیر اضطراری ہوں گے ۔

ڈیکارٹ کے طریق کار سے تجربی نفسیات کی بنیادیں پختہ سے پختہ تر ہو جاتی ہیں ۔ اس کے ہم عصر انگریز نفسیاتی عالموں نے بھی تجربیت کو اپنایا لیکن ان کا طریق کار ڈیکارٹ سے مختلف تھا ۔ روح کو انگریز عالموں نے بھی چھوڑ دیا لیکن کردار کا مطالعہ کرنے کی بجائے انگریزوں نے شعور کو لے لیا ۔ اور نفسی واردات کا تجزیہ اپنا لائحہ عمل بنایا ۔ ارسطو نے کہا تھا کہ عملی عقل کی بنیادیں تجربہ میں گڑی ہیں اور انسان کی یادداشت اور اس کے تخیلات کے اسباب تلازم (Association) میں موجود ہیں ۔ دو سو سال بعد لاک (Locke) نے تلازم کو نفسیات کا سنگ بنیاد سمجھا اور نفسی وارداتوں کا حل اصول تلازم میں ڈھونڈا ۔

ڈیکارٹ تک بلکہ اس کے بعد بھی ارسطو اور افلاطون کے زیر اثر عقل کو جسم پر فوقیت حاصل رہی ۔ جسم کو فسق و فجور کا منبع گردانا گیا اور اسے کچلنا صالح زندگی کا ماحصل سمجھا گیا ۔ لہذا فلسفے اور نفسیات کا مطالعہ عقل اور اس کے مظاہر تک محدود رہا ۔ نتیجہ یہ ہوا

کہ انسانی محرکات (Human motives) کا پہلو نظروں سے اوجھل رہا ۔

انسانی زندگی میں سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ کوئی انسان کیوں وہ فعل کرتا ہے جو وہ کر رہا ہے ۔ اس کے محرکات ، ہیجانات اور جذبات کیا ہیں ؟ انسان کا علم بھی اہمیت رکھتا ہے لیکن علم سے کئی گنا زیادہ طاقتور اور زیادہ دور رس وہ محرکات ہیں جو کبھی شعوری سطح پر کام کرتے ہیں اور کبھی لاشعوری سطح پر ۔ جدید نفسیات کا ایمان ہے کہ محرکات اول درجہ پر آتے ہیں اور عقل دوم درجہ پر ۔ انسان خواہشات ، ہیجانات اور جبلات کا پتلا ہے ۔ اس کا پیار کرنا یا لڑنا جھگڑنا ، عقل کی بدولت نہیں بلکہ جبلی یا اکتسابی رجحانات کے تحت ہے ۔ یونانی اسطوریات (Greek Mythology) میں عشق کے دیوتا کیوپڈ کو اندھا دکھایا گیا ہے ، وہ دائیں بائیں تیر چھوڑ رہا ہے اور جسے تیر لگ جاتا ہے وہ عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔ یہی حال دوسرے جذبات کا ہے ۔ انسان صرف عشق میں ہی نہیں بلکہ غصے میں بھی اندھا ہوتا ہے ۔ اگر آپ ہومر (Homer) یا شیکسپیئر (Shakespeare) کے ڈرامے پڑھیں تو پتہ چلتا ہے کہ عقل کو انسانی زندگی میں کتنا تھوڑا دخل ہے ۔ افلاطون نے زندگی کی مثال ایک ایسی گاڑی سے دی ہے ، جسے منہ زور گھوڑے کھینچے لیے جا رہے ہوں ۔ ان کی بھاگ دوڑ عقل کے ہاتھ میں ہے لیکن عقل کی گرفت نہایت ڈھیلی ہے اور جذبات کے گھوڑے زندگی کی گاڑی کو تیز بھگائے لیے جا رہے ہیں ۔ فرائڈ (Freud) نے اپنی نئی نفسیات میں انہی منہ زور گھوڑوں کی طرف دنیا کی توجہ دلائی ۔ لیکن مذہبی لوگ اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے کیونکہ فرائڈ عقل کو عضو معطل یا عضو باطل سمجھ کر بنیادی محرکات پر زور دیتا تھا ۔

سائنسی نفسیات :

نفسیات کی مختصر سی تاریخ اس غرض سے پیش کی جا رہی ہے کہ

'نفس کی حقیقت' عیاں ہو جائے ۔ اس سلسلے میں افلاطون ارسطو، ڈیکارٹ اور دیگر نفسیاتی ماہروں کے نظریات سے واسطہ پڑا ۔ یہ نظریات کئی لحاظ سے مفید ثابت ہوئے ۔ کسی نے نفسیات کے ایک پہلو کو اجاگر کیا کسی نے دوسرے کو ۔ لیکن باوجود اس افادیت کے یہ تمام کے تمام نظریات عقل کے بل بوتے پر کھڑے کئے گئے ۔ سترہویں صدی تک نفسیات نے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر ایسی ترقی حاصل نہیں کی تھی کہ خود اپنے مفروضات قائم کر سکے ۔ نہ تو اس کی اپنی تجربہ گاہیں تھیں اور نہ ہی دوسرے اثباتی علوم نے اس قدر ترقی کی تھی کہ نفسیاتی زندگی کے متعلق صحیح صحیح اصول قائم ہو سکیں ۔

یونانیوں کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ ذہن میں اشیا کیسے داخل ہوتی ہیں ؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب اس وقت تک مہیا نہیں ہو سکتا، جب تک ہمیں روشنی اور آواز کی طبیعیات سے واقفیت نہ ہو، اور آنکھ، کان، ناک، اور جلد کی عضویاتی ساخت اور ان کے وظائف کا علم نہ ہو ۔ یہ دونوں علوم اور اسی قسم کے اور علوم، جو نفسیات سے بلاواسطہ یا بالواسطہ تعلق رکھتے ہیں، سترہویں صدی سے پہلے محض مفروضات اور قیاس آرائیوں کا مجموعہ تھے ۔ سترہویں صدی کے بعد جب اثباتی علوم نے زور پکڑا، اور استخراجی منہاج کی بجائے استقرائی منہاج کا استعمال ہوا، تو طبعیات اور عضویات میں قیاس آرائیوں کو ترک کر کے ایسے تعمیمات (Generalisation) وضع ہوئے، جن کی جڑیں مشاہدات اور تجربات میں گڑی تھیں ۔ فی زمانہ ایک علم کی ترقی دوسرے علوم کی ترقی سے وابستہ ہے ۔ جب تک سب علوم ایک ساتھ نہ بڑھیں، تب تک کسی ایک علم میں خاطر خواہ ترقی نہیں ہو سکتی ۔ یہی وجہ تھی کہ نفسیات پر بہت مدت تک جمود طاری رہا، جب حیاتیات، طبعیات، کیمیا، عضویات جیسے علوم نے بڑھنا شروع کیا، تب نفسیات نے بھی ترقی کی طرف قدم بڑھایا ۔

نفسیات کی اپنی تجربہ گاہ پہلے پہل ونت (Wundt) نے ۱۸۷۹ع میں لیپزگ (Leipzig) کی یونیورسٹی میں قائم کی ۔ ولیم جیمز (William James) نے بھی قریب قریب اسی زمانہ میں ہارورڈ (Harvard) کے مقام پر نفسیاتی تجربہ گاہ کی بنیاد ڈالی ۔ دنیا کے کونے کونے سے طلبہ لیپزگ کے مقام پر آئے ، اور نفسی کوائف کا اثباتی طریقوں سے مطالعہ کرنے لگے ۔ تھوڑے ہی عرصے میں انگلینڈ ، امریکہ اور بر اعظم یورپ پر تجربہ گاہیں معرض وجود میں آ گئیں ۔ ان تجربہ گاہوں میں سائنسی طریقہ ، جو کہ استقرائی ہے ، نہ کہ استخراجی ، رائج ہوا بلکہ اسی طریقے کی بدولت نفسیات نے فلسفے سے رہائی حاصل کی ، اور اپنا شمار اثباتی علوم میں حاصل کیا ۔

نفسیات کی تعریف :

اگر ہمیں نفسیات کی تعریف کرنا مقصود ہو یعنی یونانیوں کے اس سوال کا جواب دینا ہو کہ نفس کی حقیقت کیا ہے ، تو سائنسی نقطہ نگاہ کو ملحوظ رکھنا ہوگا ۔ یہ سائنسی نکتہ نگاہ کیا ہے ؟ اس کا مفصل بیان تو اگلے باب میں آئے گا ، یہاں صرف یہ یاد رکھنا چاہیے کہ چوں کہ سائنسی طریقہ استقرائی ہے ، اس لیے ہمیں نفسیات کی ایسی تعریف اختیار کرنی ہوگی جو مشاہدے اور تجربے میں ممد ثابت ہو ، اور جو ہمیں فلسفیانہ بحثوں میں الجھنے سے بچائے ۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے نفسیات کو علم روح کہنے سے انکار کیا ، اور یہی وجہ ہے کہ آج کل نفسیات کو نہ تو علم شعور کہا جاتا ہے ، اور نہ ہی علم نفس ۔

اگر اثباتی علوم کی بنیاد مشاہدے پر ہے ، تو جو چیز مشاہدے میں نہ آ سکے یا جس چیز کی اگر تحلیل (Analysis) کی جائے ، تو کسی جگہ پر بھی مشاہدے سے سابقہ نہ پڑے تو اسے اثباتی علوم میں جگہ نہیں دی جائے گی ۔ نفس کے متعلق دقت یہ ہے کہ اس کا مشاہدہ ناممکن ہے ۔ مجھے غصے ، خوشی اور رنج وغیرہ کا تجربہ تو ہو سکتا ہے ،

کیوں کہ یہ سب کے سب نفسی واردے ہیں ۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ ان واردوں کی پشت پر کوئی الگ طاقت ہے ، تو سائنس دان اسے باور نہیں کرے گا ، کیوں کہ یہ طاقت مشاہدے میں نہیں آتی ۔ نفس کے متعلق یہ وہم ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اس کا وجود وقوف (Cognition) ، احساس (Affection) اور طلب (Conation) سے الگ ہے ۔ لیکن یہ سراسر غلط ہے ، نفس تو ذہنی کیفیات کا مجموعہ ہے ، اور ان سے الگ اس کی کوئی حیثیت نہیں ۔ ٹیچنر (Titchner) نے اس مغالطے کو بڑی خوبصورتی سے رفع کیا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ عام آدمی (Layman) یہ خیال کرتا ہے کہ کرسی کی ٹانگیں ، بازو اور سیٹ ہے ۔ لیکن اگر کرسی سے اس کی ٹانگیں ، سیٹ اور بازو نکال دے جائیں تو پھر کرسی کیا ہوگی ، ظاہر ہے کہ کرسی کا وجود ختم ہو جائے گا ، کیوں کہ کرسی کا وجود اس کی ٹانگوں ، سیٹ اور بازو سے الگ نہیں ۔ اسی طرح نفس کا وجود نفسی واردات سے الگ نہیں ، بلکہ نفس کا لفظ اگر استعمال کرنا ہو تو اس سے مراد صرف نفسی واردات کا مجموعہ ہو سکتا ہے[1] ۔ اس حقیقت کو گلبرٹ رائل (Gilbert-Ryle) نے پیش کیا ہے[2] ۔ وہ کہتا ہے کہ مشین کے سارے وظائف اس کے پرزوں کی ساخت اور طبعی کیمیائی تفاعل پر موقوف ہیں ۔ مثال کے طور پر ریلوے کا انجن لیں ، اس میں پرزے ہیں ، تیل پڑتا ہے ، اور کیمیائی عمل معرض ظہور میں آتا ہے ۔ انجن کا فعل پرزوں کی ساخت اور کیمیائی عمل پر موقوف ہے ، لیکن اگر یہ کہا جائے کہ انجن کو چلانے والا در حقیقت کوئی بھوت ہے ، جو ہمیں نظر نہیں آتا ، لیکن ان پرزوں کے پیچھے کام کرتا ہے ، تو کوئی سائنس دان اس توجیہہ (Explanation) کو قبول نہیں کرے گا ۔ بعینہ یہی حالت نفس کی ہے ۔ انسانی عضویہ کا تفاعل

۱۔ ملاحظہ ہو ٹیچنر Titchner کی Primer of Psychology باب اول ۔

۲۔ ملاحظہ ہو گلبرٹ رائل کی کتاب Concept of Mind ۔

اعضا اور ان کے کیمیائی عمل پر موقوف ہے۔ نفس کا مفروضہ اس ضمن میں بے فائدہ اور بے کار ہے۔

شعور (Consciousness) کے بارے میں بھی یہی شکایت ہے۔ اگر سائنس دان یہ چاہتے ہوں کہ ہر چیز کا امتحان ٹیسٹ ٹیوب (Test Tube) میں ہو، اور جس چیز کا امتحان امتحانی نلی میں نہ ہو سکے، اس کے وجود سے انکار کر دیا جائے، تو ظاہر ہے کہ شعور کو امتحانی نلی میں بند کرکے ملاحظہ نہیں کیا جا سکتا، اور اس لحاظ سے شعور کے متعلق بھی وہی مشکلات پیش آئیں گی جو نفس کے بارے میں آتی ہیں۔ اس کے علاوہ شعور کو نفسیاتی زندگی کے برابر تصور نہیں کیا جاسکتا۔ فرائڈ اور اس کے رفقائے کار نے یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچا دی ہے کہ شعور کے علاوہ لاشعور بھی ہے، اور لاشعور زندگی کا نہایت اہم اور ضروری حصہ ہے۔ تجزیۂ نفس کے ماہروں کا خیال ہے کہ شعور، لاشعور کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی ہے، اور انسانی کردار کے اسباب لاشعور میں ملتے ہیں نہ کہ شعور میں۔ پس اگر ہم نفسیات کی تعریف شعور کے ذریعہ کرتے ہیں، تو زندگی کا بہت بڑا حصہ کٹ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایسا نقصان ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ شعور تو نفسیاتی زندگی کا ایک قلیل اور حقیر حصہ ہے، زیادہ اہم تو لاشعوری حصہ ہے۔

اب اگر نفسیات کو نہ تو نفس کے ذریعہ سے متعارف کرایا جا سکے، اور نہ ہی شعور کے ذریعہ سے، تو پھر اور کون سا ذریعہ رہ جاتا ہے جس سے نفسیاتی حقیقت کو واضح کیا جا سکے؟ یہاں پر واٹسن (Watson)، ایک امریکی نفسیاتی ماہر آتا ہے، جس نے کرداریت (Behaviorism) کا نظریہ پیش کیا ہے۔ واٹسن سے پہلے بھی کردار کا مطالعہ کیا جاتا تھا، لیکن جس انداز سے واٹسن نے کردار کو نفسیاتی زندگی کے مساوی قرار دیا، وہ اسی کا حصہ ہے۔

واٹسن دراصل حیوانات کی نفسیات کا ماہر تھا ۔ وہ سفید چوہوں اور انسانی بچوں پر تجربے کیا کرتا تھا ۔ اب نہ تو چوہے اور نہ ہی انسانی بچے اس قابل تھے کہ مطالعہ باطن (Introspection) کرکے اپنا مافی الضمیر نفسیاتی ماہر کو بتا سکتے ، لیکن اس کے باوجود واٹسن کا دعویٰ ہے کہ اس نے محض مشاہدے کے بل بوتے پر معنی خیز مواد حاصل کیا ۔ یاد رہے کہ واٹسن سے پہلے جن لوگوں نے نفسیات کا مطالعہ نفس اور شعور کے ذریعہ سے چاہا ، ان کے پاس مطالعہ باطن ہی اہم طریق کار تھا ۔ اسی کی مدد سے نفس کا تجزیہ کیا جاتا تھا ، اور نفسی واردوں کی جماعت بندی (Classification) ہوتی تھی ۔ واٹسن نے مطالعہ باطن کو فضول قرار دیا ۔ مطالعہ باطن کو نکالنے سے نفس کو بھی نکالنا پڑا ، کیونکہ دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے ۔

واٹسن سمجھتا تھا کہ سائنسی نفسیات کی راہ میں بڑی رکاوٹ غیر مادی خیالی اور فرضی اشیا سے بحث ہے ۔ نفس بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے ۔ پہلے روح کا تنازعہ تھا ، بعد میں یہی تنازعہ نفس کے متعلق پیدا ہوا ۔ فلسفیوں نے اس میدان میں زور دکھایا ، لیکن کوئی طے شدہ بات ہاتھ نہ آئی ۔ واٹسن چاہتا تھا کہ نفسیات کی تعریف ایسے تعقلات (Concepts) پر مشتمل نہ ہو ، جو فلسفیانہ بحثوں کا اکھاڑہ بن جائیں ۔ لہذا نفس اور شعور کو نفسیات سے نکال کر فلسفیوں کے حوالے کر دینا چاہیے ۔ وہ ان کے بارے میں قیاس آرائیاں کرتے رہیں ، ماہر نفسیات کو ان سے کوئی سروکار نہیں ۔

کرداریت کی وجہ سے عضلات (Muscles) اور احشا (Viscera) کے مطالعہ نے ترقی پکڑی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جن چیزوں کو عموماً نفسیاتی کہا جاتا تھا ، وہ فعلیاتی نکلیں ۔ یہ محیطی عناصر (Peripheral Factors) اب تک نظروں سے اوجھل تھے ، اور ان کا مطالعہ کسی نے نہ کیا تھا ۔ واٹسن نے فعلیاتی مطالعہ کی اہمیت بتائی ۔ اس سلسلہ میں اس نے

مبالغہ ضرور کیا ، لیکن جن حقائق کی طرف اس نے نفسیاتی ماہروں کی توجہ مبذول کرائی ، ان سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ۔ مثلاً اس کا کہنا ہے کہ ہم سارے جسم سے سوچتے ہیں ۔ یہ بیان مبالغہ سے خالی نہیں ، لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سوچ بچار جیسے لطیف واردوں میں بھی عضویہ کا تکمل (Integration) درکار ہے ۔ اسی طرح سے جب واٹسن نے کہا کہ فعلیاتی ماہر تو ہر عضو کا وظیفہ علیحدہ علیحدہ کرتا ہے ، اور نفسیاتی ماہر عضویہ کا ، تو اس کا اصل مطلب یہ تھا کہ نفسیات کا موضوع فرد ہے نہ کہ اس کے اعضا ۔

واٹسن کے موقف کو اگر مبالغے سے پاک کر دیا جائے تو اس میں بڑے کام کی چیزیں ملتی ہیں ۔ مطالعۂ باطن اور نفس کو مسترد کرنے میں واٹسن نے ضرور زیادتی کی ، لیکن نفسیات کو محض شعور کا مطالعہ قرار دینا ، اور مطالعۂ باطن ہی کو نفسیات کا طریق کار سمجھ لینا بھی کہاں کی دانش مندی ہے ؟ واٹسن حد سے تجاوز کر گیا ، اس کا خوشگوار اثر یہ ہوا کہ نفسیات ، جو صدیوں سے فلسفیانہ قیاس آرائیوں کی اکھاڑہ بنی ہوئی تھی ، اثباتی اور تجربی سائنس بن گئی ۔ انسانی زندگی کا مطالعہ اسی طور ہونے لگا ، جس طور سائنس دان یعنی طبیعی اور کیمیائی ماہر اپنے مواد کا مطالعہ کرتے ہیں ۔ وہ علت (Cause) سے معلول (Effect) کی طرف آتے ہیں ۔ اور معلول سے علت کی جانب ، اور اس تلاش میں ان کا سہارا صرف مشاہدہ اور تجربہ ہوتا ہے ۔ نفسیات میں علت کی بجائے مہیج (Stimulus) اور معلول کی بجائے رد عمل (Reaction) کے الفاظ آتے ہیں ۔ ان الفاظ کو آپس میں مترادف نہیں سمجھنا چاہیے ، اگرچہ ان کا مفہوم کم و بیش ایک جیسا ہے۔

واٹسن کے نزدیک نفسیات کا مطالعہ مندرجہ ذیل فارمولے سے ہونا چاہیے :

S—O—R

ایس (S) سے مراد مہیج (Stimulus) ، اور (O) سے مراد عضویہ (Organism) اور (R) سے مراد رد عمل (Reaction) ہے - اس فارمولے کی وضاحت بعد میں آئے گی - اس موقع پر صرف یہ یاد رکھیے کہ مہیجات عضویہ میں داخل ہوتے ہیں اور عضویہ ان کا رد عمل پیش کرتی ہے - مکھی ناک پر بیٹھتی ہے (مہیج) ، دماغ کو اطلاع ملتی ہے (عضویہ) ، ہاتھ ہلتا ہے تا کہ مکھی کو اڑا دیا جائے (رد عمل) -

نفس کو محض شعور یا محض کردار کہنے والے انتہا پسندی سے کام لیتے ہیں - دونوں نظریات میں خوبیاں بھی ہیں اور خامیاں بھی - ہمیں ایسی تعریف پیش کرنی چاہیے جو خامیوں سے بچ کر صرف خوبیوں کو اجاگر کرے -

ووڈورتھ (Woodworth) کی تعریف :

ووڈورتھ کا خاصہ ہے کہ وہ انتہا پسند نہیں بلکہ درمیانی راستہ اختیار کرتا ہے اور ہر مسلک سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے - و کہتا ہے کہ نفسیات ایسا علم ہے جو فرد کے کردار کا سائنسی مطالعہ اس کے ماحول میں کرے -

اس تعریف کو سمجھنے کی خاطر ہمیں فرد ، کردار ، سائنسی مطالعہ اور ماحول کا مفہوم واضح کرنا ہوگا -

فرد :

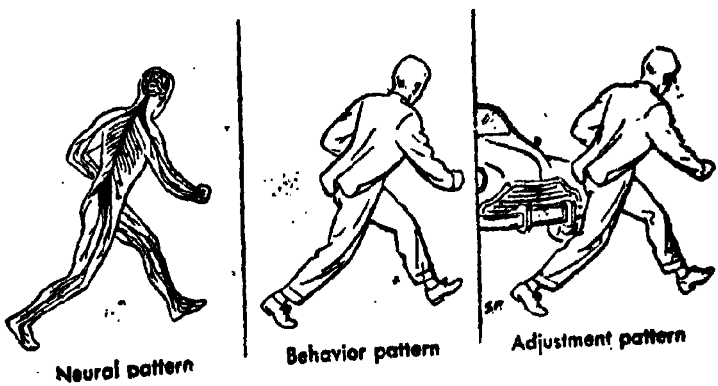
سب سے پہلے فرد کو لیجیے - نفسیاتی وظائف میں یاداشت ، تخیلات سوچ بچار ، منصوبہ بندی ، مشاہدات ، خواہشات ، پیار اور نفرت جیسے واردوں کا ذکر آتا ہے - ان واردوں کی جماعت بندی ، وقوف ، احساس اور طلب کے تحت کی جاتی ہے - لیکن ظاہر ہے کہ ہر نفسی واردات کی تہہ میں یا اس کے ساتھ جسمانی تفاعل بھی ہوتے ہیں - ہمارا دماغ کام کرتا ہے اور حواس اور عضلات بھی - دماغ اور جسم کا چولی

دامن کا ساتھ ہے ۔ ہر نفسی وارد ے کے ہمراہ جسمانی وارد ے ہوتے ہیں ۔ پس نفسیات اس امر کی مقتضی ہے کہ ہر عضو کے علیحد علیحدہ وظائف سے آگاہی ہو ۔ دل ، دماغ ، پھیپھڑے ، معدہ ، خون وغیرہ کا عمل کسی نہ کسی نفسی فعل میں بلا واسطہ یا بالواسطہ ظاہر ہوتا ہے ۔ شدید خوف اور غصے میں دل دھڑکنے لگتا ہے ، معدہ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے ۔ خون میں تیزی آ جاتی ہے ۔ اکتاہٹ میں دماغ سست اور اعضا ڈھیلے پڑ جاتے ہیں ۔ وہ علم جو اعضا کے الگ الگ وظائف کا مطالعہ کرتا ہے فعلیات (Physiology) کہلاتا ہے ۔ فعلیات کا کام ، عضویہ کے حصے بخرے کرنا اور ہر حصے کا ایسا مطالعہ کرنا ہے جیسے کہ وہ کسی دوسرے حصے سے متعلق نہیں ۔ مثلاً آنکھ کی بینائی کا مطالعہ کرتے وقت کانوں کی سماعت کا مسئلہ اسے بھول جانا چاہیے ، فعلیات کا موضوع عضلات کا تفاعل بتانا اور دماغ کی کارگردگی سے آشنا کرنا ہے ۔ لیکن اس تمام مطالعہ میں اس کا نقطہ نگاہ صرف ایک ہی ہونا چاہیے یعنی یہ کہ ہر عضو کا الگ الگ تفاعل کیا ہے ؟

نفسیات کی دلچسپی اعضا کے علیحدہ علیحدہ تفاعل سے نہیں ۔ نفسی ماہر کو دل کی دھڑکن یا معدے کے فعل میں اگر دلچسپی ہے تو وہ اس لحاظ سے کہ جب ماحول سے افراد کو ایسے مہیجات ملتے ہیں ، جو عضویہ کو جذباتی طور پر برانگیختہ کرتے ہیں تو دل دھڑکتا ہے اور معدے کے فعل میں فرق آ جاتا ہے ۔ نفسیات کا تعلق انسانی کردار سے ہے ، اور کردار عضویہ کے مجموعی رد عمل کا نام ہے ۔ انسان پیار کرتا ہے ، لڑتا جھگڑتا ہے ، ارادہ بناتا ہے ، اپنے آپ کو مشاغل میں مصروف رکھتا ہے ، یہ مختلف قسم کے کردار ہیں جن میں عضویہ مجموعی طور پر مشغول ہوتا ہے ۔ فرد کو ایک اکائی تصور کرنا چاہیے۔ ہر فرد بہ حیثیت اکائی کام کرتا ہے ۔ پس جہاں فعلیات کا یہ کام ہے کہ وہ ہر عضو کا علیحدہ علیحدہ مطالعہ کرے وہاں نفسیات کا یہ ہے کہ

وہ عضویہ کو اکائی مان کر اس کے تفاعل اور وظائف کا جائزہ لے ۔ جیسے نفسیات کا تعلق فعلیات سے ہے ، ویسے ہی اس کا تعلق عمرانیات (Sociology) سے ہے ۔ عمرانیات کا موضوع گروہی زندگی ہے ۔ ظاہر ہے کہ افراد اکیلے اکیلے نہیں رہتے بلکہ بستیاں بنا کر قبیلوں ، برادریوں اور قوموں کی صورت میں زندگی گزارتے ہیں ۔ ارسطو کا کہنا ہے کہ الگ تھلک انسان یا تو خدا ہوگا یا وحشی درندہ ۔ ظاہر ہے کہ وہ خدا تو ہو نہیں سکتا صرف وحشی درندوں والی زندگی اسے حاصل ہو سکتی ہے ۔ یوں تو وحشی درندے بھی گروہوں میں رہتے ہیں کیونکہ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ تنازع للبقا (Struggle for Existence) میں مار نہیں کھاتے اور دشمن کا مقابلہ مل جل کر کرتے ہیں ۔ لیکن نفسیاتی نقطہ نگاہ کی حدیں افراد کو بحیثیت افراد مطالعہ کرنے تک محدود ہیں ، اس نقطہ نگاہ میں گروہی زندگی نہیں آتی ۔ یہ فرق بیان کرنے سے ہمارا مطلب صرف یہ ہے کہ نفسیات میں گروہی زندگی کو اولین درجہ حاصل نہیں ۔ اول نمبر پر تو افراد بحیثیت افراد آتے ہیں اور دوم درجہ پر ان کی سماجی زندگی ۔ سماجی زندگی کا ذکر اس وقت کیا جاتا ہے جب کردار کی حقیقت اس حوالے کے بغیر سمجھ میں نہ آسکے ۔

Man functions as a whole



رش (Ruch) نے اپنی کتاب (Psychology and life)[1] میں لکھا ہے کہ نفسیات کچھ حیاتیاتی علم (Biological Science) اور کچھ عمرانی علم ہے لیکن یہ ہر دو علوم کے موضوعات پر حاوی (Over-lapping) ہے اور ان کے مابین رشتہ استوار کرتی ہے ۔ ووڈورتھ نے فعلیات، نفسیات اور عمرانیات کے باہمی واسطے کو ایک نہایت ہی عمدہ مثال سے واضح کیا ہے[2]۔ وہ کہتا ہے کچھ لڑکے فٹ بال کا میچ کھیل رہے ہیں ۔ ایک فعلیاتی ماہر عضلات اور حواس کے تفاعل کو دیکھے گا ۔ لڑکے ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں، بال کو ٹھوکر لگاتے ہیں، ایک دوسرے سے بال چھینتے ہیں، اس میں عضویاتی توانائی خرچ ہوتی ہے ۔ دماغ کام کرتا ہے، عضلات برانگیختہ ہوتے ہیں، حواس کو چوکنا رہنا پڑتا ہے ۔ غرضیکہ ہر عضو اپنا فریضہ بجا لاتا ہے ۔ اس فریضے کا الگ الگ مطالعہ کرنا عضویاتی ماہر کا منصب ہے ۔ لیکن اس کھیل کو نفسیاتی ماہر اپنے نقطہ نگاہ سے لے گا، وہ دیکھتا ہے کہ کھلاڑی بھاگتے ہیں دوڑتے ہیں، ان کا تمام عضویہ مشغولِ کار ہے ۔ تماشائی بھی کھلاڑیوں کو بحیثیت افراد دیکھ رہے ہیں ۔ ان کا دل، دماغ یا عضلات ان کی نظروں سے اوجھل ہیں اور اگر اجاگر بھی ہوں تو ان کی نگاہ میں زیادہ وقعت نہیں رکھتے ۔ اب عمرانی نقطہ نگاہ کو لیجیے ۔ کھلاڑی ٹیم کی صورت میں کھیل رہے ہیں ۔ ہار جیت بھی ٹیم کی ہے ۔ کھلاڑی مل جل کر کھیل کھیلتے ہیں، جب تک ان میں اتحاد اور یک جہتی نہ ہو کھیل نہیں کھیلا جا سکتا ۔ فٹ بال کے میچ کو دو ٹیموں کے مقابلے کی صورت میں لینا عمرانی نقطہ نگاہ ہے ۔

نفسیات کا موضوع گو فعلیات اور عمرانیات سے جدا ہے لیکن بالکل

۱۔ مطبوعہ نیویارک تیسرا ایڈیشن ۱۹۴۸ء صفحہ ۴ ۔

۲۔ ملاحظہ ہو اس کی Psychology مطبوعہ میتھوئن اینڈ کمپنی ۱۹۶۳ء پیپر بیک ایڈیشن صفحہ ۴ ۔

الگ بھی نہیں - کردار کا مطالعہ کرتے وقت اعضا کا تفاعل بھی دیکھنا پڑتا ہے اور افراد کی سماجی زندگی بھی -

سائنسی مطالعہ :

'فرد' کی تشریح کے بعد سائنسی مطالعہ کو لیجیے - سائنسی مطالعہ سے ہماری مراد استقرائی طریق کار ہے - اس کا اجرا بیکن (Bacon) نیوٹن (Newton) اور ہرشل (Herschel) سے ہوتا ہے - جے - ایس - مل (J. S. Mill) نے صاف اور بین الفاظ میں اس کے اصول وضع کیے - استقرائی طریقہ طبیعیات ، کیمیا اور حیاتیات جیسے علوم کا طریقہ ہے - اس کا منشا یہ ہے کہ مشاہدے اور تجربے سے حقائق کو اکٹھا کرکے ان میں علت و معلول کا رشتہ منضبط کیا جائے اور بعد میں تعمیمات (Generalisation) قائم کیے جائیں - جیسا کہ ظاہر ہے یہ طریقہ اثباتی علوم کا ہے اور ارسطو کے استخراجی طریقے سے بالکل مختلف - ارسطو کے نزدیک قیاس (Syllogism) مثالی استدلال کا نمونہ ہے - اس میں دو مقدمات کو لے کر نتیجہ نکالا جاتا ہے - دو مقدمات میں ایک کا کلیہ (Universal) ہونا لازمی ہے مثال کے طور پر :

تمام انسان فانی ہیں
اور خالد انسان ہے } سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خالد فانی ہے

اس قیاس میں پہلا مقدمہ کلیہ ہے - پس استخراجی استدلال میں کلیات سے جزئیات (Particulars) کی طرف آتے ہیں - لیکن استقرائی استدلال میں شواہد اور حقائق کی مدد سے کلیات تک آتے ہیں - یاد رہے کہ شواہد اور حقائق جزئیے ہیں اور کلیات اٹل اور عالمگیر اصول -

نفسیات اپنے مواد کا مطالعہ دوسرے اثباتی علوم کی مانند کرتی ہے اس کا مسلک وہی ہے جو طبیعی یا حیاتیاتی علوم کا ہے - اگلے باب میں اس طریقہ کی مثالیں نفسیات سے مہیا کی جائیں گی - یہاں صرف یہ یاد رکھیے کہ نفسیات کا طریقہ کوئی انوکھا طریقہ نہیں - یہ وہی طریقہ ہے جو اثباتی علوم نے صدیوں کی کاوش کے بعد اپنی تحقیقات اور تفتیش کے

لیے وضع کیا ہے -

ویسے آج کل استخراجی اور استقرائی طریقے ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہیں - اثباتی علوم میں بھی استخراج کی ضرورت پڑتی ہے لیکن اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اثباتی علوم کی ابتدا شواہد اور مظاہر سے ہوتی ہے اور ان کے نزدیک استقرائی طریق کار کی اہمیت ہے -

کردار اور ماحول

'فرد' اور 'سائنسی طریقہ' کے بعد کردار اور ماحول کی طرف آئیے - کردار کی تعریف تو اوپر ہو چکی ہے ، کردار سے مراد عضویہ کا رد عمل ہے - اس کا مطالعہ S—O—R کے فارمولے سے کیا جاتا ہے - افراد کے ماحول سے مہیجات اٹھتے ہیں ، اور عضویہ میں داخل ہونے کے بعد عضویہ کو کسی خاص فعل پر آمادہ کرتے ہیں - گرمی کی تیزی کم کرنے کے لیے پنکھ چلایا جاتا ہے - گرمی ماحول میں موجود ہے ، یہ عضویہ کو تنگ کرتی ہے - تنگی سے رہائی پانے کے لیے پنکھے کا بٹن دباتے ہیں ، اور پنکھا چل پڑتا ہے -

ماحول سے یوں تو کئی قسم کے مہیجات اٹھتے ہیں - لیکن ان تمام کو دو اقسام میں منقسم کیا جا سکتا ہے - یہ مہیج یا تو طبعیی ہوتے ہیں یا معاشری - گرمی کی تیزی طبعیی مہیج ہے ، لیکن افسر کی جھڑک ، جو ماتحت کو سارا دن مغموم رکھتی ہے ، سماجی مہیج ہے - ہمارا عضویہ طبعیی مہیجات سے بھی متأثر ہوتا ہے اور سماجی سے بھی - نفسیات میں ، جہاں طبعیی مہیجات کا مطالعہ ہوتا ہے وہاں معاشری مہیجات سے بھی واسطہ پڑتا ہے ، اور سچ تو یہ ہے کہ طبعیی مہیجات کو انسانی زندگی میں وہ اہمیت نہیں ، جو سماجی مہیجات کو حاصل ہے - شیکسپیئر نے اپنے ڈرامے As you like it میں لکھا ہے کہ سردی کی شدت میں وہ چبھن نہیں جو دوستوں کی بے رخی میں ہے -

نفسیات میں دو قسم کے رد عمل کا مطالعہ ہوتا ہے - یہ رد عمل یا

تو حیوانوں کے ہیں یا انسانوں کے - پیولو (Pavlov) نے کتنے پرمشروط اضطراری فعل (Conditioned Reflex) کے تجربے کیے - واٹسن نے سفید چوہوں کا مطالعہ کیا ، فی زمانہ اکثر تجربات اور مشاہدات حیوانات پر ہوتے ہیں - حیوانوں کا کردار آسان اور سادہ ہوتا ہے ، اور اس کا مطالعہ بھی پیچیدگی سے خالی ہوتا ہے - اس کے علاوہ ڈارون (Darwin) کے مسئلہ ارتقا (Theory of Evolution) کے بموجب حیوان اور انسان ، ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں - لہذا حیوانوں کا مطالعہ انسانوں کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے - نفسیات میں انسانی بچوں ، طلبہ ، طالبات ، جوان اور بوڑھوں ، سبھی کا مطالعہ ہوتا ہے -

جیسے مہیج ماحول سے اٹھتے ہیں ، ویسے ہی رد عمل بھی ماحول میں کیا جاتا ہے - افسر کی جھڑک اور ماتحت کی افسردگی دونوں ہی ماحول کا حصہ ہیں - پس کردار کو سمجھنے کے لیے S—O—R فارمولے کی توسیع کی ضرورت ہے - نئے فارمولے کی شکل حسب ذیل ہوگی :

$$W—S—O_w—R—W$$

ڈبلیو (W) سے مراد دنیا یا ماحول ہے ، جہاں سے مہیجات (S) اٹھتے ہیں - (O_w) ، سے عضویہ جس کا تعلق ماحول سے ہے ، ان مہیجات سے متأثر ہو کر رد عمل (R) پیش کرتا ہے ، یہ رد عمل دنیا یا ماحول (W) میں رونما ہوتا ہے -

اس فارمولے کا مفصل بیان آگے آئے گا -

دوسرا باب

طریق کار اور مقصد

METHOD ANE SCOPE

پچھلے باب میں ذکر آچکا ہے کہ نفسیات کا طریق کار وہی ہے جو دیگر اثباتی علوم کا ہے ، اور اس طریق کار کو سائنسی کہا جاتا ہے ۔ 'سائنسی' اس لحاظ سے کہا جاتا ہے کہ اس کی تہہ میں مندرجہ ذیل چھ سائنسی اصول کارفرما ہیں :

(۱) سائنسی منہاج : دیگر اثباتی علوم کی طرح نفسیات کی ابتدا بھی مشاہدات سے ہوتی ہے ۔ جب مشاہدات کو لیباریٹری شرائط کے تحت ملاحظہ کیا جائے ، تو یہ مشاہدات ، تجربات کی صورت اختیار کر جاتے ہیں تجربات کے بے شمار فوائد ہیں ۔ سائنس دان کو تجربہ کرتے وقت عوامل کا علم ہوتا ہے ۔ ان عوامل میں وہ کمی بیشی کر سکتا ہے ، اس کے تجربے سے جو نتیجہ برآمد ہو ، اس کا مشاہدہ وہ خود بھی کر سکتا ہے ، اور دوسرے سائنس دان بھی ۔ مثال کے طور پر آموزش کے منحنی خط (Curve of Learning) کو لیجیے ۔ پیشتر اس کے کہ خط تیار ہو ، مختلف افراد کی آموزش کی رفتار کو دیکھا جاتا ہے ، پھر اس کی وسط نکالی جاتی ہے ۔ یہ اوسط ، جو خط کے ذریعہ ظاہر ہوتی ہے ، آموزش کے قانون یا تعمیم یا آموزش کی ترقی کے اصول کو پیش کرے گی ۔ اس اصول کی جانچ پڑتال ہر وقت ہو سکتی ہے اور ہر سائنس دان یہ کر سکتا ہے ۔

سائنسی تحقیقات حسب ذیل عناصر پر مشتمل ہے :

(الف) مشاہدات پر ، جس سے مناسب حقائق اکٹھے کئے جاتے ہیں ۔

(ب) جماعت بندی پر ، جس کے ذریعہ حقائق کو ترتیب دی جاتی ہے ، اور اوسط نکالی جاتی ہے -

(ج) پڑتال پر ، جس کی رو سے تجربات کا اعادہ کیا جاتا ہے ، اور نتائج کی پڑتال ہوتی ہے ، تاکہ غلطی کا امکان نہ رہے ، اور ہر سائنس دان ایک ہی نتیجہ پر پہنچے -

(د) تعمیمات پر ، جن نتائج میں استمرار ہو ، ان کے اصول بنا لیے جاتے ہیں -

(۲) سائنسی نقطہ نگاہ : یہ نقطہ نگاہ شک و شبہ کا ہے - جب تک سائنس دان کو مناسب ثبوت اور شواہد دستیاب نہ ہوں ، تب تک وہ ہر شے کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے - اس نقطہ نگاہ کا فائدہ یہ ہے کہ انسان قیاس آرائیوں سے بچ جاتا ہے ، اور خوش فہمیوں کا شکار نہیں ہوتا - گراہم سمر (Graham Summer)[1] نے نہایت عمدگی سے لوگوں کی آرا ، عقاید ، روایات اور قیاسات کا سائنسی تجزیہ پیش کیا ہے - اس کا خیال ہے کہ روایات (Traditions) کو گروہی رد عمل سمجھنا چاہیے مثلاً ہل چلانے ، کپڑے پہننے ، مکان بنانے ، بچوں کی تربیت ، پرستش کے طریقوں کے متعلق روایات ہیں ، ان میں سے بعض روایات سماجی بہبود کے لیے ضروری ہیں ، اور بعض توہمات پر مبنی ہیں - اہل علم کا کام ہے کہ وہ ہر روایت کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھے ، اور جب تک اس کی صحت کا ثبوت نہ ملے ، اسے قبول نہ کرے - جو حالت روایات کی ہے ، وہی عامی انسانوں کی آرا ، عقاید اور قیاسات کی ہے - انھیں پرکھنے کی ضرورت ہے ، لیکن جب ان کی صحت اور افادیت واضح ہو جائے ، انھیں قبول کرنے میں تامل نہیں کرنا چاہیے ، اور جو عقاید اور آرا محض خوش فہمی اور توہمات پر مبنی ہوں ، انھیں مسترد کر دینا چاہیے -

---

(۱) ملاحظہ ہو اس کی کتاب Folkways -

نفسیاتی ماہر کو جو رائے نفسیاتی حقیقت کے بارے میں ملتی ہے ، یا جس نفسیاتی نظریہ کی بنیاد وہ فہم عامہ میں دیکھتا ہے ، اس کی پڑتال ضروری ہے ، اور جب تک وہ عقل یا شواہد کی کسوٹی پر پوری نہ اترے ، اسے قبول نہیں کرنا چاہیے - جے - ایف ڈیشیئل (J. F. Dashiel) اپنی کتاب 'Fundamentals of General Psychology میں نفسیاتی معلومات کو فراہم کرنے کے تین ذرائع بتاتا ہے - پہلا ذریعہ اپنے بزرگوں ، ہم جولیوں ، ہم جماعتوں یا دوستوں سے زندگی اور کائنات کے متعلق علم سیکھنا ہے - یہ علم کہاوتوں ، پہیلیوں اور عام توہمات میں پایا جاتا ہے - اگر آپ اپنے معاشرے کی ضرب المثال کا مطالعہ کریں ، تو پتہ چلے گا کہ ان میں سے کئی ایک کی بنا توہمات پر ہے اور کئی ایک کی عقل اور تجربے پر - پس فہم عامہ (Common sense) کو نہ تو پورے طور پر رد کرنا چاہیے اور نہ ہی پورے طور پر تسلیم کرنا چاہیے - اس میں کانٹ چھانٹ کی ضرورت ہے - دوسرا ذریعہ لٹریچر کا مطالعہ ہے - ڈرامے ، ناول ، شعر اور نثر کے مطالعہ سے زندگی کے متعلق بیش بہا معلومات ملتی ہیں - شیکسپیئر کے ڈرامے پڑھیے یا اقبال کی شاعری کا مطالعہ کیجیے تو زندگی کے کئی نکات حل ہو جائیں گے - لیکن یہ علم بھی فہم عامہ کی طرح غلطی سے مبرا نہیں - شاعر ، صحافی اور ڈرامہ نویس زندگی کو بے نقاب کرتے وقت ذاتی تجربے اور عقل سے فائدہ اٹھاتے ہیں - لہٰذا ان کے اپنے تعصبات اور میلانات کو ان کی تحریروں میں بڑا دخل ہوتا ہے - تیسرا ذریعہ سائنسی ہے جس کی تشریح کی جا رہی ہے - ظاہر ہے جب تک نفسیاتی معلومات فہم عامہ اور لٹریچر سے نکل کر سائنسی رتبہ نہ اختیار کر لیں انہیں قابل یقین نہیں سمجھا جا سکتا -

(۳) اثباتی علوم کا ایمان ہے کہ انہیں صرف قابل مشاہدہ حقائق کی تحقیق کرنی چاہیے - تمام اثباتی عالم اس امر پر متفق ہیں کہ اثباتی علوم

۱- مطبوعہ نیویارک ، تیسرا ایڈیشن ۱۹۳۹ ع -

میں صرف ان حقائق کا مطالعہ ہو سکتا ہے جو مشاہدے میں آسکیں ۔
اس لیے سائنس زمان و مکان کی حقیقت تسلیم کرتی ہے اور وہ بھی مانتی ہے کہ مادہ میں مقدار (Quantity) اور کیفیت (Quality) دونوں موجود ہیں ۔

نفسیات میں موہومی ، خیالی یا فرضی ہستیوں کو مطلقاً دخل نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ جدید نفسیات میں روح کا ذکر بالکل نہیں آتا نفس اور شعور سے بھی حتی‌المقدور احتراز کیا جاتا ہے ۔ سائنسی نفسیات کا تعلق ان مظاہر نفسی سے ہے جو قابل مشاہدہ ہوں ۔ فلسفہ اور مذہب میں غیب اور ان دیکھی چیزوں سے بحث ہوتی ہے لیکن اثباتی علوم میں ایسی بحث کی گنجائش نہیں ۔

(۴) چوتھا اصول علت و معلول سے تعلق رکھتا ہے ۔ ہر اثباتی علم میں علت اور معلول کا سلسلہ قائم کیا جاتا ہے ۔ طبیعیات ، کیمیا اور حیاتیات میں علت سے معلول کی جانب اور معلول سے علت کی جانب آتے ہیں ۔ سائنسدانوں کا ایمان ہے کہ کائنات کے تمام واردے علت اور معلول کے سلسلے میں منضبط ہیں ۔ اسی لیے علت سے معلول اور معلول سے علت کا علم ہوتا ہے ۔ نفسیات میں بھی یہی عقیدہ ہے ۔ ہر نفسی واردے کا سبب ہوگا اور ہر نفسی سبب کا مسبب بہ ہوگا ۔ خوابوں کے متعلق قدما کا خیال تھا کہ یہ سب کی سب بے سبب ہوتی ہیں ، نیز پاگل پن کی بھی کوئی وجہ نہیں ہوتی لیکن فرائڈ (Freud) نے ثابت کر دیا کہ خوابوں کے بھی اسباب ہیں اور پاگل پن کے بھی ، البتہ ان اسباب کا پتہ لاشعور میں ملتا ہے ۔

"بے سبب" کا نظریہ غیر سائنسی اور غیر عقلی ہے ، نفسی مظاہر قانون علت کے تابع ہیں ۔ انسانوں کے سمجھنے کے لیے وہی اصول برتنے چاہئیں جو طبیعیات میں کارآمد ثابت ہو چکے ہیں ۔

(۵) نفسیات خیر و شر کی اقدار سے واسطہ نہیں رکھتی یہ بیان ہر

اثباتی علم کے لیے درست ہے ۔ سائنس میں نیک و بد یا صائب و غیر صائب کی کوئی گنجائش نہیں ۔ اثباتی علوم صرف حقائق کے متلاشی ہیں ، انھیں اچھائی برائی سے کوئی واسطہ نہیں ۔ سیلاب یا بھونچال کتنے ہی برے نتائج کیوں نہ لائیں ان کی برائی سے سائنسدان کو کوئی واسطہ نہیں وہ صرف ان کے اسباب دریافت کرے گا تاکہ ان کے متعلق پیش گوئی (Prediction) کر سکے اور ان پر قابو (Control) پا سکے ۔

(٦) نفسیات میں مفروضے (Hypotheses) اور نظریات (Theories) گھڑے جاتے ہیں ۔ حقائق کو اکٹھا کرنے کے بعد ان کی توجیہہ مقصود ہوتی ہے ۔ لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا کہ دکھائی دیتا ہے ۔ اس لیے اکثر اوقات مفروضے تراشنے پڑتے ہیں ، پھر ان کی پڑتال ہوتی ہے ، تب کہیں جا کر ان کی صحت یا عدم صحت کا پتہ چلتا ہے ۔ بعض دفعہ ایک ہی وقوعہ کے لیے دو یا دو سے زیادہ مفروضے بن جاتے ہیں اس وقت ہمیں لائڈ مارگن (Lloyd Morgan) کے قانون پر عمل کرنا پڑتا ہے جس کا منشا ہے کہ مختلف مفروضوں میں سے اس مفروضے کو اختیار کرنا چاہیے جو نسبتاً آسان ہو ۔ مثلاً کھانا کھانے کے بعد کتا لیٹا ہوا ہو تو اس کے متعلق یا تو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ وہ فلسفیانہ مسائل سوچ رہا ہے یا محض لیٹا ہوا کھانا ہضم کر رہا ہے ۔ لائڈ مارگن کہے گا کہ دوسرا مفروضہ کہ کتا کھانا ہضم کر رہا ہے آسان مفروضہ ہے لہٰذا اسے اختیار کرنا چاہیے اور اسی سے تحقیقات شروع کرنی چاہیے ۔

سائنسی اصولوں کی تشریح کے بعد نفسیاتی طریق ہائے کار کو سمجھنا مشکل نہ ہوگا ۔ ان سب کا منشا صرف ایک ہے اور وہ ہے مشاہدے اور تجربے کے بل بوتے پر تعمیمات وضع کرنا ۔ طریق کار باطنی کوائف سے تعلق رکھے یا خارجی احوال سے اس کا مقصد سائنسی اصولوں کے مطابق حقائق کی فراہمی اور صف بندی کے بعد قوانین بنانا ہے ۔ مجھے ان لوگوں سے اتفاق نہیں جو مطالعۂ باطن (Introspection) کو غیر سائنسی

کہہ کر نفسیات کا دائرۂ تحقیق صرف کردار کے طبعیی اور عضویاتی مہیجات اور اس کے طبعیی اور عضویاتی رد عمل تک محدود کر دیتے ہیں ۔ واٹسن (Watson) نے جسے کرداریت (Behaviourism) کا بانی مبانی قرار دیا جاتا ہے ۔ مطالعۂ باطن کے متعلق بڑی یاوہ گوئی سے کام لیا ۔ وہ اسے غیر سائنسی قرار دے کر شعور کے ساتھ اسے بھی نفسیات کی حدود سے باہر پھینک دینے کا حامی ہے ۔ ووڈورتھ کا رویہ بڑا معقول ہے، وہ ہر طریقے سے نفسیات کا مطالعہ جائز تصور کرتا ہے ۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر کوئی طریقہ نفسیاتی ماہر کو موزوں مواد دے سکے اور تعمیات بنانے میں ممد ثابت ہو تو اسے ضرور استعمال کرنا چاہیے ۔ نفسیات کا سروکار فرد اور اس کے کردار سے ہے اس سلسلہ میں جو ذریعہ بھی مفید ہو اسے اختیار کرنا چاہیے اس مقصد کو حاصل کرنے میں نفسیات کو :

۱۔ افراد کی نفسی واردات بیان کرنی ہوں گی ۔
۲۔ افراد کے مستقبل میں ہونے والے نفسی واردوں کے متعلق پیش گوئی کرنی ہوگی ۔
۳۔ نمبر ایک یا دو سے فائدہ اٹھا کر نفسی واردات پر قابو پانا ہوگا اور
۴۔ نفسی معلومات کی فراہمی کے بعد سود مند اصول وضع کرنے ہوں گے ۔

ظاہر ہے کہ سائنسی تحقیق میں اول قدم افراد کے خیالات ، احساس اور مشاغل کا صحیح ذکر ہے ۔ پیش گوئی اور قابو پانا بعد کا مسئلہ ہے ۔ پہلے ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ مختلف احوال میں کیا کچھ ہوتا ہے ۔ بعد میں ہم اس کے متعلق پیش گوئی کر سکتے ہیں ۔ اور ضرورت کے مطابق حالات پر قابو پا کر اس سے استفادہ کر سکتے ہیں ۔ رش (Ruch)[1] نے رنگ کوری (Colour Blindness) کی مثال لے کر نفسی

۱۔ ملاحظہ ہو Psychology and Life صفحہ ۱۵ ، ۱۶ ۔

کوائف کی صحیح رپورٹ کی اہمیت اجاگر کی ہے وہ کہتا ہے کہ سرخ اور سبز رنگ کورے کے سامنے سرخ ، سبز اور نیلے دھاگوں کا ڈھیر لگائیے اور اسے کہیے کہ ہر رنگ کے علیحدہ علیحدہ ڈھیر بنائے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ صرف نیلے دھاگوں کے ڈھیر لگا سکے گا یا پھر سرخ اور سبز دھاگوں میں فرق نہ کر سکے گا اور ان میں گڈ مڈ کر دے گا۔ اگر وہ صرف نیلے دھاگوں کو پہچان سکا ہو تو اس کی رنگ کوری مکمل ہوگی ، وگرنہ مکمل نہ ہوگی ۔ رنگ کوری کئی درجے کی ہوتی ہے ۔ رنگ کورا خود اپنی رنگ کوری کو بیاف نہیں کر سکتا کیوں کہ اکثر اوقات اسے علم ہی نہیں ہوتا کہ وہ رنگ کورا ہے ، البتہ خارجی طریقوں سے اس کی رنگ کوری کا پتہ لگ سکتا ہے۔ رنگ کوری کا پتہ لگاتے وقت ہمیں باطنی مشاہدے سے بھی کام لینا پڑتا ہے اور خارجی مشاہدے سے بھی ۔ ان دونوں کے بغیر ہماری رپورٹ مکمل نہیں ہو سکتی اور جب تک رپورٹ مکمل نہ ہو ہم مواد پر قابو نہیں پا سکتے اور نہ ہی مستقبل کے متعلق کوئی پیش گوئی کر سکتے ہیں ۔

پس کردار کے مشاہدے اور بیان میں نفسیات کے پاس دو اہم طریقے ہیں ۔ (۱) مطالعۂ باطن جس کی وساطت سے فرد کو خود اپنے شعور کا اور اندرونی واردات کا علم ہوتا ہے ۔ (۲) خارجی مشاہدہ جس کی مدد سے خود اپنا یا دوسروں کا طرز عمل مختلف احوال میں دیکھا جا سکتا ہے ۔

مطالعۂ باطن (Introspection) : اوپر ذکر آ چکا ہے کہ مطالعۂ باطن کو واٹسن (Watson) نے غیر سائنسی کہہ کر بالکل مسترد کیا ۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے ۔ نفس کی بعض ایسی حالتیں ہیں جن کا پتہ مطالعۂ باطن سے ہی ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر بعد شبیہہ (After-image) کو لیجیے اگر آپ لگاتار بیس سیکنڈ کے لیے سیاہ مربع کو دیکھیں اور فوراً بعد مٹیالی دیوار کو ۔ تو آپ کو سفید مربع دکھائی

دے گا۔ اب اگر آنکھیں گھمائیں تو مربع بھی گھومے گا۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ خارج میں تو مربع نہیں گومتا آپ کے اندر گھوم رہا ہے۔ ان امور کا علم مطالعۂ باطن سے ہی ممکن ہے۔ ہر شخص اپنا اپنا بعد شبیہہ دیکھ سکتا ہے نہ کہ کسی دوسرے کا۔ پس خارجی مشاہدہ یہاں نا کام ہو جاتا ہے اور صرف باطنی مطالعہ کام آتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی غور کریں کہ اکثر نفسیاتی تجربوں میں معمول (subject) سے استدعا کی جاتی ہے کہ جو کچھ وہ دیکھتا ہے یا سنتا ہے یا سونگھتا ہے اس کی رپورٹ دے، یہ اگر مطالعۂ باطن نہیں تو اور کیا ہے؟ اس لحاظ سے ہر سائنسی تجربے میں سائنسدان کو مطالعۂ باطن کی ضرورت پڑتی ہے۔ جو چیز تجربہ کنندہ یا زیر تجربہ کے اندر گزرتی ہے اسے بیان کرتا ہے۔ یہ بیان اس کی ذاتی رپورٹ ہے جو مطالعۂ باطن کا نتیجہ ہے۔

پس مطالعۂ باطن کو فضول نہیں کہا جا سکتا۔ نفسیات میں بھی اس کی ضرورت ہے اور دوسرے اثباتی علوم میں بھی۔ مطالعۂ باطن کو ایک قسم کا مشاہدہ سمجھنا چاہیے۔ روزمرہ کی زندگی میں بھی اس مطالعہ کی ضرورت پڑتی ہے اور اس پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ جب آپ کا دوست کہتا ہے کہ میں نے آپ کو نہیں سنا۔ یا مجھے آپ سے اتفاق ہے یا مجھ پر ان کی باتوں کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ تو ہم اس کی باتوں کو سچ مان لیتے ہیں۔

ہاں اگر یہ کہا جائے، جیسا کہ قدیم نفسیاتی ماہر کہتے تھے، کہ نفسیات کا طریق کار سوائے مطالعۂ باطن کے اور کچھ نہیں، تو ہم حق بجانب نہ ہوں گے۔ ہمیں واٹسن کا احسان مند ضرور ہونا چاہیے کیونکہ اس نے مطالعۂ باطن کی خامیوں کی طرف ہماری توجہ مبذول کی۔ قدیم نفسیاتی ماہر ابھی ابتدائی دور میں تھے، نفسیات کو محض شعور کا مطالعہ اور تجزیہ سمجھتے تھے لہٰذا ان کے ذہن میں مطالعۂ باطن کے علاوہ کوئی اور طریقہ نہ آتا تھا۔ شعور کا تجزیہ اور شعوری

کوائف کی ترتیب مطالعۂ باطن سے ہی ہو سکتی ہے ۔ اگر نفسیات کا موضوع وقوف ، احساس اور طلب کی تشریح ، تجزیہ اور جماعت بندی ہو تو ظاہر ہے کہ ہر فرد کو اپنے اندر دھیان کرنا ہوگا اور اس کی صحیح رپورٹ بیان کرنی ہوگی ۔ لیکن زمانہ حال میں نفسیات کا موضوع شعور نہیں رہا لہٰذا مطالعۂ باطن کو وہ اہمیت حاصل نہیں رہی جو شروع شروع میں تھی ۔ اگر نفسیات کا لائحہ عمل افراد اور ان کے مشاغل (activities) ہیں ۔ اور اس لائحہ عمل میں جانوروں اور بچوں کا مطالعہ بھی شامل ہے ، تو مطالعۂ باطن کو ثانوی اہمیت دینی ہوگی ۔ نہ تو جانور مطالعۂ باطن کر سکتے ہیں اور یہ ہی صغر سن بچے ۔ ان کا کردار تو خارجی طریقوں سے ہی جانچا بھالا جا سکتا ہے ۔ ایک اور نقص جو مطالعۂ باطن میں ہے وہ یہ ہے کہ مطالعۂ باطن[۱] سے لاشعور کا پتہ نہیں چلتا ۔ لاشعور کہنے سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ حصہ شعور کی دسترس سے باہر ہے اور فرد کو اس کا علم نہیں ۔ آج کل لاشعور کی بڑی اہمیت ہے ۔ صرف پاگلوں کا ہی نہیں بلکہ نارمل انسانوں کا کردار بھی لاشعوری عوامل کا نتیجہ ہے ۔ البرٹ مال (Albret-Moll)[۱] نے بیان کیا ہے کہ ایک تنویم شدہ (hypnotised) شخص کو کہا جاتا ہے کہ شعوری حالت میں لوٹنے کے بعد تم نے پھولدان کھڑکی سے اٹھا کر کپڑے میں لپیٹنا ہوگا ، پھر اسے صوفہ پر رکھ کر تیس دفعہ جھکنا ہوگا ۔ یہ سب کچھ وہ ہوش میں آنے کے بعد کرتا ہے ۔ جب اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تو نے ایسا کیوں کیا ۔ تو کہتا ہے کہ جب میں جاگا تو پھولدان پر میری نظر پڑی، مجھے احساس ہوا کہ پھولدان کو سردی لگ رہی ہے اور اسے کپڑے میں ڈھانپنا چاہیے ورنہ پھول مر جائیں گے ۔ پس میں نے کپڑا لپیٹ دیا ۔ پھر میں نے خیال کیا کہ صوفہ آگ کے قریب ہے پھولدان وہاں رکھنا چاہیے ۔ پھر میں تیس دفعہ جھکا

۱۔ ملاحظہ ہو اس کی کتاب Hypnotism ۱۹۰۹ء صفحہ ۱۷۳ ۔

کیونکہ میں اپنے آپ کو اس شاندار تجویز پر مبارکباد کہنا چاہتا تھا ۔
اس مثال سے صاف پتہ چلتا ہے کہ لاشعوری عوامل بڑے زور دار ہیں ۔
فرائڈ کا دعویٰ ہے کہ جس کردار کو ہم شعوری سمجھتے ہیں اس کے
اسباب بھی لاشعور ہی میں ملیں گے۔ پس کردار خواہ شعوری ہو یا لاشعوری
اس کے کئی حقیقی اسباب لاشعور میں پائے جاتے ہیں۔ تیسرا نقص جو سائنسی
لحاظ سے بڑا وزنی ہے وہ یہ ہے کہ ذاتی اور شخصی ہونے کی وجہ سے
دوسرے سائنسدان مطالعۂ باطن کے نتائج کی پڑتال نہیں کر سکتے اور
جب تک مختلف سائنسدان ایک ہی نتیجہ پر نہ پہنچیں اس نتیجہ کی
سائنسی حیثیت کمزور رہتی ہے ۔

ان نقائص سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ مطالعۂ باطن بےکار طریقہ
ہے ، اسے مسترد کر دینا چاہیے ۔ نتیجہ صرف یہ نکلتا ہے کہ مطالعۂ
باطن کے ساتھ اور طریقے بھی استعمال ہونے چاہئیں ورنہ ماہرینِ نفسیات
اپنے علم کے ساتھ پورا پورا انصاف نہ کر سکیں گے ۔ مطالعۂ باطن کے
لیے سائنسی تربیت درکار ہے ۔ اس تربیت کے بغیر مطالعۂ باطن ایک
قسم کی مجنونانہ حرکت بن کر رہ جاتا ہے ۔ یاس پسند لوگ اکثر اپنے
باطن میں گم رہتے ہیں اور ان کا اپنی ذات سے شغف انہیں پاگل خانے کا
مکین بنا دیتا ہے ۔

خارجی مشاہدہ (Objective Observation) :

۱۔ مواد اکٹھا کرنا :

مشاہدۂ باطن کی خامیاں دور کرنے کے لیے خارجی مشاہدہ استعمال
ہوتا ہے ۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ مشاہدات کی پڑتال ہوسکتی ہے ، جس
ماحول میں کوئی فعل صادر ہو اس ماحول کو سائنسی زبان میں ادا کیا
جا سکتا ہے اور بعد میں اس کا اعادہ ہو سکتا ہے ۔ اس طرح کردار کا
سائنسی مطالعہ دقیق اور ترقی یافتہ مشینوں کے ذریعہ ہو سکتا ہے ۔

کردار کے گراف بنائے جا سکتے ہیں جن کی وجہ سے ہر سائنسدان ماحول اور کردار دونوں کی پڑتال کر سکتا ہے۔ خارجی مشاہدے کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ اس کی بدولت، جانوروں، بچوں، کم عقل اور پاگل آدمیوں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ جس چیز کا مشاہدہ ہوتا ہے وہ تو ان کا کردار ہے لیکن کردار سے ان کی نفسی واردوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یاد رہے کہ مطالعۂ باطن سے بھی تمام نفسی کوائف کا علم نہیں ہوتا، خاص طور پر لاشعوری کیفیات کا۔ لامحالہ ایسی حالت میں خارجی مشاہدے کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ کردار کو دیکھ کر شعوری اور لاشعوری احوال کا پتہ لگایا جاتا ہے۔

خارجی مشاہدے کے لیے تربیت کی ضرورت ہے۔ اناڑی آدمی تو مشاہدہ نہیں کر سکتا۔ مشاہدے کا مطلب ہر چیز کو دیکھنا نہیں بلکہ موزوں اور کارآمد اشیا کا معائنہ ہے۔ بازار میں ہزاروں چیزیں دیکھی جاسکتی ہیں لیکن خریدار اسی دکان پر جائے گا اور وہی چیز دیکھے گا جو اس کی ضرورت کو پورا کرے۔ خریدار کا مشاہدہ منضبط مشاہدہ (Controlled observation) ہے۔ اناڑی کا مشاہدہ منضبط نہیں ہوتا۔ اسے تربیت کی ضرورت ہے تاکہ صحیح طور پر مشاہدہ کر سکے۔

رش نے اناڑی کی حسب ذیل غلطیاں شمار کی ہیں[1]:

(۱) چونکہ اناڑی ہے اس لیے مشاہدے اور استدلال میں فرق نہیں کر سکے گا مثلاً عامی انسان کہتا ہے کہ وہ سورج چڑھتا اور ڈوبتا دیکھتا ہے حالانکہ وہ سورج کو چڑھتے اور ڈوبتے نہیں دیکھتا بلکہ چند مشاہدات کی بنا پر یہ اس کا استدلال ہے۔ دراصل جو چیز دیکھی جاتی ہے وہ تو زمین اور سورج کی باہمی پوزیشن میں فرق ہے اور ہمارا مشاہدہ یہاں ختم ہو جانا چاہیے۔ جب اس پوزیشن کی تبدیلی سے آگے بڑھ کر یہ کہہ دیں کہ سورج چڑھتا ہے یا ڈوبتا ہے تو یہ مشاہدہ نہیں بلکہ

۱۔ ملاحظہ ہو Psychology and life صفحہ ۸۱۔

استدلال ہے -

(۲) اسے زیر تجربہ فرد کا ماضی معلوم نہ ہوتا ، یہ علم بعض حالتوں میں نہایت ضروری ہوتا ہے -

(۳) اسے زیر غور کردار کے تمام مثبت اور منفی عوامل کا علم نہیں ہوتا -

(۴) اسے معمول یعنی زیر تجربہ فرد سے محبت یا نفرت ہو سکتی ہے جس کی وجہ سے وہ اس کا مقام اونچا یا نیچا دکھانا چاہے گا۔

(۵) وہ زیب داستان کے لیے مواد تراشے گا۔

مطالعہ باطن اور خارجی مشاہدہ دونوں مل کر کام کرتے ہیں - انہیں ایک دوسرے کا دشمن سمجھنے کی بجائے ایک دوسرے کا حلیف سمجھنا چاہیے - ہزبنڈ (Husband) کے اس تجربے کو دیکھیں جہاں خارجی اور باطنی مشاہدہ مل جل کر کام کرتے ہیں - اس نے کاغذ پر تاریں لگا کر بھول بھلیاں بنائیں اور کالج کے طلبہ پر تجربہ کیا تجربے سے پہلے ان کی آنکھیں باندھ دیں گئیں پھر ان کی انگلی بھول بھلیوں کے منہ پر رکھی اور انہیں ہدایت کی کہ انگلی اٹھانی نہیں بلکہ سرکا کر آخری مقام تک لے جانی ہے - راستے کئی تھے لیکن سوائے ایک کے سب بند ہو جاتے تھے - جب انگلی بند مقام پر پہنچتی تو پیچھے آتی اور تجربہ کنندہ (Experimenter) غلطی شمار کر لیتا - اس طرح سب طلبہ کی غلطیاں شمار ہوئیں - دیکھنا یہ تھا کہ کون سے طلبہ کم سے کم غلطیاں کرتے ہیں - تجربے کے بعد طلبہ سے پوچھا گیا کہ انہوں نے بھول بھلیاں سمجھنے میں کون سا طریقہ اختیار کیا - اکثر نے کہا انہوں نے لفظی طریقہ (Verbal Method) برتا - یعنی انہوں نے اپنے آپ سے کہا - پہلے سامنے چلو ، پھر بائیں ، پھر سامنے اور پھر دائیں وغیرہ وغیرہ - کچھ طلباء کہنے لگے کہ انہوں نے بھول بھلیاں کا بصری نقشہ (Visual map) ذہن میں رکھا - کچھ کہنے لگے کہ

نھوں نے انگلیوں اور بازو کی حسوں سے بھول بھلیوں کا راستہ سیکھا۔
یلے گروپ کا نام لفظی ، دوسرے کا بصری اور تیسرے کا لامسی رکھا
گیا ۔ ان گروپوں کا جب ریکارڈ دیکھا تو لسانی اول نمبر پر آئے۔ بصری
دوم پر اور لامسی تیسرے نمبر پر ۔

اس تجربے میں کچھ حصہ خارجی مشاہدے سے اور کچھ حصہ مطالعۂ باطن سے حاصل ہوا ۔ مطالعۂ باطن سے پتہ چلا کہ طلبہ کا سیکھنے کا طریقہ کیا تھا ۔ ان کی رپورٹ پر لسانی ، بصری اور لامسی گروپ بنے ۔ اگر مطالعۂ باطن نہ ہوتا ، تو تجربہ ادھورا اور بے فائدہ رہ جاتا ۔ خارجی مشاہدے سے ان کی غلطیاں شمار کی گئیں ۔ پس مطالعۂ باطن اور خارجی مشاہدہ ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں ، اور ایک دوسرے کی تکمیل کے لیے ضروری ہیں ۔

۲- پیش گوئی کرنا :

اس امر کا ذکر آ چکا ہے کہ مواد کو اکٹھا کرنا سائنس دان کا پہلا کام ہے ۔ اس کا دوسرا کام مستقبل کے مطلق پیشین گوئی کرنا ہے ۔ مثلاً ہزبنڈ (Husband) کے تجربے پر کہہ سکتے ہیں کہ بھول بھلیاں سیکھنے میں لفظی طریقہ بہترین رہتا ہے ۔ رنگ کوری کے تجربوں کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ رنگ کورا ہوا بازی یا سگنل کے محکمہ میں نہیں لینا چاہیے ، وہ ٹریفک میں حادثے کرے گا ، کیونکہ بتیاں یا تو سرخ ہوتی ہیں یا سبز اور وہ ان میں تمیز نہیں کر سکے گا ۔ یہ دونوں پیشین گوئیاں ہیں ، جو حقائق اکٹھا کرنے کے بعد کی گئیں ۔

۳- حالات پر قابو پانا :

پیشین گوئیوں کے بعد سائنس دان کا تیسرا کام حالات پر قابو پانا ہے ، وہ کہے گا کہ رنگ کورے کو ہوا باز نہ بنائیے ، اور نہ ہی ٹریفک کا لائسنس دیجیے ۔ ہاں اگر سرخ اور سبز رنگ کے ساتھ نیلا اور پیلا بھی شامل کردیں تو رنگ کورے حادثات نہیں کریں گے ۔

۴۔ تعمیمات قائم کرنا :

جب حقائق کی فراہمی ختم ہو جائے، پیشین گوئی بھی ہو چکے اور حالات پر بھی قابو پالیا جائے، تو سائنس دان کا چوتھا کام تعمیمات وضع کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہزبنڈ (Husband) کا تجربہ اور رنگ کوروں کا مشاہدہ تعمیمات کی بنیاد بن سکتے ہیں۔

نفسیات میں تحقیقی طریقے (Research Methods) :

تحقیقی طریقے تو کئی ہو سکتے ہیں، لیکن نمایاں طریقے چار ہیں :

۱۔ ساحتی مطالعہ (Field Study)۔

۲۔ سوانح عمری (Life History)۔

۳۔ کلینک ((Clinic) یا سریری۔

۴۔ تجربی (Experimental)۔

(۱) ساحتی مطالعہ (Field Study)

جب جانوروں اور انسانوں کا مطالعہ، ان کے قدرتی ماحول میں کرنا ہو، تو اس طریق کار کی ضرورت پڑتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ پرندوں کی عادات، ان کی طرز بود و باش اور کھانے پینے کے طریقے معلوم کرنے کے لیے لوگ جنگلوں میں چلے جاتے ہیں، اور خاموشی سے ان کی ہر ادا نوٹ کرتے رہتے ہیں۔ شیر، بھیڑیا اور دیگر درندہ جانوروں کا مطالعہ بھی یونہی کیا جاتا ہے۔ گسٹالٹ نفسی ماہروں (Gestalt Psychology) کا کہنا ہے کہ جب جانوروں کو پنجروں میں ڈال کر ان کے کردار کا مطالعہ کیا جاتا ہے، تو یہ مطالعہ ٹھیک نہیں ہوتا۔ اگر چوہوں یا کتوں کی ذہانت دیکھنی ہو تو جنگلوں یا کھلے میدانوں میں جا کر دیکھیں، جہاں یہ عام طور پر رہتے ہیں۔ لیبارٹری میں سارا ماحول بناوٹی ہوتا ہے، اور جانور اس ماحول میں گھٹے گھٹے رہتے ہیں۔

انسانوں کے خیالات کا پتہ لگانا ہو تو خاموشی سے کبھی اس ٹولے میں کبھی اس ٹولے میں جا بیٹھیے ، اور چپکے سے سنتے رہیے - خفیہ پولیس والے یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں ، اور حکومتیں بھی یہی طریقہ اختیار کرتی ہیں - کہتے ہیں کمیونسٹ ممالک میں جاسوسی کا ایسا اچھا انتظام ہے کہ ہر چھوٹی بڑی چیز حکومت تک پہنچ جاتی ہے - یہ جاسوس ہر محفل میں موجود ہوتے ہیں ، لیکن ان کا پتہ نہیں چلتا ، کیونکہ یہ عام لباس میں ملبوس ہوتے ہیں -

اگر آپ معلوم کرنا چاہتے ہوں کہ آج کل کی لڑکیاں اور لڑکے کیا گفتگو کرتے ہیں ، تو خاموشی سے طلبہ اور طالبات کے پاس کھڑے ہو جائیں یا ان کے ساتھ بیٹھ جائیں - یہ خاموش مطالعہ آپ کو بتائے گا کہ گفتگو کا موضوع اکثر جنس مخالف ہوتا ہے ، لڑکے لڑکیوں کے متعلق اور لڑکیاں لڑکوں کے متعلق باتیں کرتی ہیں - دوسرے نمبر پر پڑھائی آتی ہے ، پروفیسروں کا ذکر ہوتا ہے ، بعد میں سیاست اور کلچرل مشاغل ہیں -

ان چند مثالوں سے واضح ہوگیا ہوگا کہ ساختی مطالعہ بڑے کام کی چیز ہے ، اور بڑے وسیع پیمانے پر استعمال ہوتا ہے -

۲- سوانح عمری طریقے (Life History Method)

فرد کی زندگی کا گہرا مطالعہ کرنے کے لیے سوانح عمری طریقے استعمال ہوتے ہیں ، ان کا اصل مقصد یہ معلوم کرنا ہوتا ہے کہ کوئی شخص کن حالات کے تحت ، خواہ وہ حالات ورثہ میں ملے ہوں یا ماحول سے لیے گئے ہوں - شاعر ، ڈاکو ، لیڈر یا پاگل وغیرہ بنا ہے - اس مطالعہ سے کردار یا شخصیت کے اسباب سے آگہی ہوتی ہے -

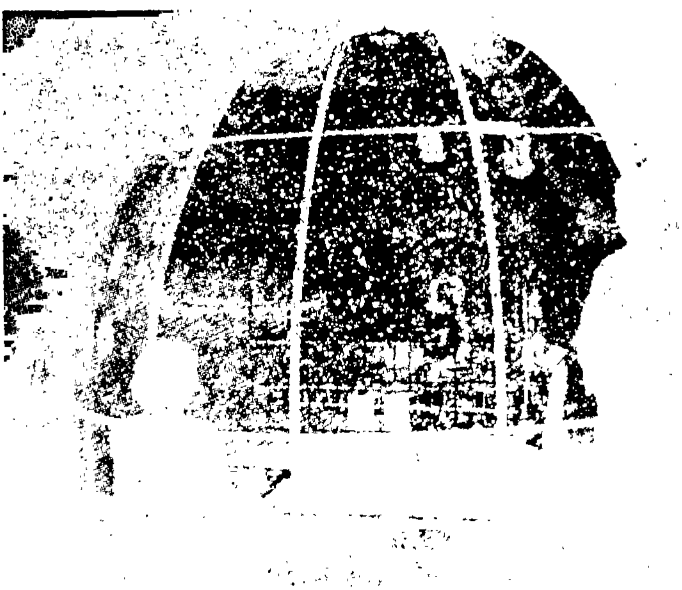
سوانح عمری طریقے تین صورتیں اختیار کرتے ہیں :

۱- روز نامچہ (The Daybook Method) -

۲- مطالعۂ احوال (The Case Hsistory Method) -

۳- سر گزشت (The Biographical Method) -

(۱) روزنامچہ (The Daybook Method) - کئی والدین اپنے بچوں کی نشو و نما کے چارٹ بناتے ہیں ، اور ہر روز کی ترقی اس میں درج کرتے ہیں ۔ مثلاً یہ کہ بچہ نے بات کرنا کب سیکھا ، پہلے کون سے الفاظ استعمال کیے ، ان الفاظ سے جملے کیسے بنے وغیرہ وغیرہ ۔ اس طرح یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ بچے میں غصہ کب اور کیوں آیا ؟ غصے کا اظہار کیسے ہوا ؟ غصہ بڑھا یا گھٹا ؟ وغیرہ وغیرہ ۔ استاد بھی بچوں کے ریکارڈ رکھتے ہیں ۔ یہ ریکارڈ زبان دانی ، لکھائی یا ہندسوں میں مہارت کے متعلق ہوتے ہیں ۔ بعض ریکارڈ بچوں کی تھکاوٹ یا تعلیمی دلچسپیوں کو ظاہر کرتے ہیں ۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ دلچسپی بڑھی ، اور کن حالات میں پروان چڑھی ؟



ڈاکٹر گیسل بچے کا ملاحظہ کر رہے ہیں۔ فوٹوگرافر تصویر لے رہا ہے اور اسٹینو نوٹس لے رہی ہے!

ووڈورتھ کے مطابق یہاں پر دو احتیاطوں کی ضرورت ہے :

۱- بچہ ہر وقت کسی نہ کسی شغل میں مشغول ہوتا ہے ۔ وہ کھیلتا کودتا یا ہنستا روتا ہے ۔ کبھی ہمجولیوں کے ساتھ رسہ پھلانگ رہا ہے اور کبھی گلی ڈنڈا کھیل رہا ہے ۔ کبھی پتنگ اڑا رہا ہے اور کبھی فٹ بال کھیل رہا ہے ۔ غرضیکہ اس کی زندگی کسی نہ کسی شغل میں گزرتی ہے ، وہ سوچتا کم ہے ، کھیل کود میں زیادہ مصروف رہتا ہے ۔ ماہر نفسیات کے لیے ممکن نہیں کہ وہ ہر شغل کو ریکارڈ کر سکے وہ صرف نمونہ کے چند مشاغل لے گا ، باقی کو غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کر دے گا ۔ اس انتخاب میں ماہر نفسیات دھوکا کھا سکتا ہے ۔

۲- بچے کا کردار بذات خود معنی خیز نہیں ۔ ماہر نفسیات کے سامنے کوئی سوال یا مسئلہ ہونا چاہیے ۔ جب تک کردار کو سوال کے پیش نظر نہ دیکھا جائے ، کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا مثال کے طور پر استاد کے سامنے یہ سوال ہو سکتا ہے کہ کس قسم کے ٹائم ٹیبل سے بچوں میں کم تھکن ہوگی ۔ یہ سوال خود بتائے گا کہ کردار کا کون سا پہلو لینا چاہیے ، اور کس زاویۂ نگاہ سے اس کا مطالعہ کرنا چاہیے ۔ ان سوالوں کو بتاتے وقت سائنسی تقاضوں کا لحاظ ضروری ہے ۔

(۲) مطالعۂ احوال کا طریقہ (The Case-history Method) : روزنامچے میں بچے کا تدریجی ارتقاء درج ہوتا ہے ۔ ماہر نفسیات حال سے مستقبل کی طرف جاتا ہے اور بچوں کے مشاغل اور دلچسپیوں کا آئینہ ابتدا سے لے کر انتہا تک پیش کرتا ہے ۔ کیس ہسٹری طریقہ اس سے بالکل الٹ ہے ۔ یہاں حال سے ماضی کی جانب اور انتہا سے ابتدا کی طرف آتے ہیں ۔ مثلاً ہمارے سامنے ایک بگڑا بچہ ہے جو چوری کرتا ہے ، جھوٹ بولتا جماعت سے بھی بھاگ جاتا ہے ۔ ماں باپ پریشان ہیں ، بچے کو نفسیاتی کلینک میں لاتے ہیں جہاں نفسیاتی ماہروں کے علاوہ ڈاکٹر اور سوشل ورکر بھی موجود ہیں ۔ ڈاکٹر جسمانی حالت کو دیکھتا ہے ، سوشل

ورکر بچے کی گزشتہ زندگی قلمبند کرتا ہے اور نفسیاتی ماہر ٹسٹ (Test) دیتا ہے - یہ مواد بتائے گا کہ بچے کا ماضی کیسے گزرا اور کن اسباب سے موجودہ خرابیاں پیدا ہوئیں مثال کے طور پر انجم کو لیجیے جس کی زبان میں لکنت ہے۔ اس کے والدین بچے کو کلینک میں لاتے ہیں - تحقیقات کے دوران پتہ چلتا ہے کہ اس کا باپ بھی لکنت کا شکار ہے - اس کے بھائی بہنوں میں بھی ایک آدھ کی زبان کبھی کبھی رکتی ہے - مزید تحقیقات پر پتہ چلا کہ باپ جابر ہے اور یہ بچہ بے توجہی کا بھی شکار ہے ، ان تمام حالات نے بچے میں احساس کمتری پیدا کر دیا ہے - لکنت توجہ کو پہنچنے کا ایک بہانہ ہے ماہر نفسیات نے گفتگو کے نقائص کی طرف توجہ نہ دی بلکہ عدم توجہی اور احساس کمتری کو دور کیا - نتیجہ یہ ہوا کہ لکنت جاتی رہی -

ذہنی تکالیف کو دور کرنے کے لیے مریض کے ماحول میں تبدیلی کی ضرورت ہے - والدین کو ماہر نفسیات سے پورا پورا تعاون کرنا چاہیے - اگر عدم توجہی کا موجب باپ ہو یعنی وہ دوسرے بچوں سے تو لاڈ پیار کرتا ہو لیکن اس بچے کو اچھا نہ سمجھتا ہو تو اسے اپنا رویہ بدلنا چاہیے اور تمام بچوں سے یکساں سلوک کرنا چاہیے - اسی طرح استادوں کو بھی ہدایات دی جاتی ہیں اور انہیں بھی کہا جاتا ہے کہ اگر بچے کی بہبودی مقصود ہو تو انہیں ان ہدایات پر عمل کرنا ہوگا - جب تک ماہر نفسیات کا ساتھ گھر اور سکول نہ دیں ، مکمل صحت نہیں ہوسکتی -

(۳) سرگزشت کا طریقہ (The Biographical Method) : پرانے وقتوں میں بڑے بڑے نامور آدمی ہو گذرے ہیں - ان میں پیغمبر بھی تھے ، ریفارمر ، شاعر ، فلسفی اور ڈرامہ نویس بھی - ان کے علاوہ بڑے بڑے قاتل ، رہزن اور زانی بھی گذرے ہیں - ان کے زمانے میں نفسیات سے دلچسپی رکھنے والے اشخاص نہ تھے ورنہ وہ ان کی عظمت یا رذالت کا ارتقائی مطالعہ کرتے اور بعد میں آنے والے لوگوں کو اپنی معلومات

سے مستفید کرتے۔ لہٰذا اب سائنسدان صرف یہ کر سکتا ہے کہ ان لوگوں کی سوانح عمریوں کا مطالعہ کرے اور دیکھے کہ ان میں کون سے غیر معمولی خصائص تھے۔ یہ مطالعہ بتاتا ہے کہ عام آدمیوں مقابلے میں بڑے بڑے آدمی بچپن سے ہی زیادہ ذہین، ہونہار اور ہوشیار ہوتے ہیں۔

زندگیوں کی سرگزشت دیکھتے وقت یاد رکھیے کہ

۱۔ یہ سرگزشت نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے نہیں لکھی گئی۔ پس ایسے احوال و افعال جو بظاہر غیر معمولی لیکن نفسیاتی اعتبار سے نہایت وزنی ہوں اس میں موجود نہ ہوں گے سیرتوں میں کارہائے نمایاں کا ذکر آتا ہے لیکن چھوٹی چھوٹی باتیں جو شخصیت کی تعمیر کرتی ہیں انہیں چھوڑ دیا جاتا ہے۔

۲۔ سیرت نویس کا نقطۂ نگاہ بھی جاننا چاہیے کہ آیا وہ تعصب کے زیر اثر لکھ رہا ہے یا تعصب سے بالا رہ کر۔ اورنگ زیب عالمگیر کو لیجیے اور اس کی سوانح عمریاں جو ہندوؤں اور مسلمانوں نے لکھی ہیں ان کا مطالعہ کیجیے تو پتہ چلے گا کہ دونوں کی سوانح عمریوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ سقراط کے متعلق بھی یہی ہوا، افلاطون نے اسے آسمان پر چڑھا دیا لیکن زینوفون نے اسے مضحکہ خیز انسان بنا دیا۔ پس گزشتہ لوگوں کی سرگزشت مطالعہ کرتے وقت یہ ضرور خیال رکھیں کہ سرگزشت کس نقطۂ نگاہ سے لکھی گئی۔ سرگزشت کے ہر لفظ کو قابل اعتبار سمجھنا بہت بڑی نادانی ہے۔

۳۔ کلینکی طریقے (Clinic)

کیس ہسٹری سے کلینکی طریقوں کی طرف لامحالا آنا پڑتا ہے۔ کلینکی نفسیات کا منشا نفسی تکالیف کو دور کرکے انسانی بہبود کو بڑھانا اور فرد کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ ماحول سے توافق (Adjustment) پیدا کر سکے اور اپنی قویٰ کو مناسب طریقے سے بروئے کار لا سکے۔ مغرب میں کلینکی طریقے اور تکنیک خاص شہرت پا چکے ہیں۔ جب مریض

کو ڈاکٹر جواب دے دیں اور مرض جوں کا توں رہے تب نفسیاتی ڈاکٹروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہمارے ملک میں نفسیاتی ڈاکٹروں کا قحط ہے اس کے علاوہ نفسیاتی مرضوں کا علم بھی کم ہے لیکن ترقی یافتہ ممالک میں جہاں ڈاکٹری علاج عمدہ سے عمدہ تر ہو رہے ہیں وہاں نفسیاتی علاج بھی دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہے ہیں۔ نفسیاتی ڈاکٹروں کے پاس لکنت، دمہ، دق، ضیق النفس، دل کی دھڑکن، پھیپھڑے میں پھوڑے وغیرہ کے مریض آتے ہیں۔ ایسے مریضوں کو ڈاکٹری سرٹیفکیٹ ملنے چاہیں کہ ان کی بیماریاں جسمانی نہیں۔

ان بیماریوں کے علاوہ نفسیاتی ڈاکٹر کے پاس خالص نفسی بیماریوں کے مریض بھی آتے ہیں۔ مثلاً ایک آدمی اندھیرے سے گھبراتا ہے اور کوئی کام سورج چھپنے کے بعد نہیں کرسکتا۔ یا ایک بچہ ہے جو دس بارہ سال تک بستر پر پیشاب کر رہا ہے۔ یا کوئی طالب علم ہے جو توجہ نہیں دے سکتا یا جسے ہیجانی تکلیف ہے۔

کئی مشکل مریض بھی آ جاتے ہیں، جنہیں ذہنی ہسپتال میں بھیجنا پڑتا ہے۔ وہاں کچھ طبعیی طریقے برتے جاتے ہیں اور کچھ غیر طبعیی مریض کو بجلی کے جھٹکے (Electric Shocks) دیے جاتے ہیں اور کچھ دوائیاں اور ساتھ نفسی علاج ہوتا ہے۔

کلینکی طریقہ کا منشا صرف یہی نہیں کہ ذہنی تکالیف کو دور کیا جائے؛ اس کا منشا یہ بھی ہے کہ فرد کو جماعت سے الگ کرکے بحیثیت فرد مطالعہ کیا جائے۔ عام نفسیات (General Psychology) کا زاویہ نگاہ انسانیت ہے۔ اس میں انسان کو بحیثیت انسان سمجھ کر اس کے نفسی کوائف اور کردار کو الم نشرح کیا جاتا ہے لیکن بسا اوقات ہم انسانیت کی بجائے زید، بکر کی زندگی میں الجھ جاتے ہیں۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ زید بلاوجہ اندھیرے سے کیوں گھبراتا ہے؟ وہ ہر وقت کیوں پریشان رہتا ہے؟ وہ خواب میں کیوں چونک اٹھتا ہے؟ جب

ان مسائل کا مطالعہ کریں تو کلینکی طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔

۴- تجربی طریقہ (Experimental)

ہر انسان کا دوسرے انسانوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ لہٰذا وہ انہیں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، جیسے دوسرے لوگ اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ خیال کرنا کہ ہر انسان ماہر نفسیات ہے ایک غلط اور بے ہودہ خیال ہے۔ جس طرح ایک غریب کسان ساری عمر ہل جوتنے کے بعد ماہر زراعت نہیں بن جاتا اسی طرح عام انسان ساری عمر انسانوں میں گزارنے کے بعد بھی ماہر نفسیات نہیں کہلا سکتا۔ عامی اور ماہر کا فرق ان کے زاویۂ نگاہ اور طریق کار سے واضح ہو جاتا ہے ماہر کے پاس تجربی تکنیک ہے جو عامی کے پاس نہیں۔

تجربی تکنیک یا طریق کار کا تجزیہ حسب ذیل ہے:

۱- منضبط شرائط (Controlled Condition): تجربہ کرتے وقت اس امر کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے کہ تمام اسباب و علل ہمارے قابو میں ہوں ان کی مقدار اور تفاعل کا صحیح صحیح علم ہو۔ مثلاً اگر ڈاکٹر نے کسی مرض کے خصائص دریافت کرنے ہوں تو اسے ٹمپریچر، دباؤ اور دوسری احوال پر قابو پانا ہو گا۔ اس کی توثیق آپ کو انیسویں صدی کے عجوبۂ روزگار کلیور ہانس (Clever Hans) ایک بولنے والے گھوڑے سے ملتی ہے۔ یہ گھوڑا جمع، تفریق، ضرب اور تقسیم کے سوال نکال لیتا تھا۔ طریقہ یہ تھا کہ گھوڑا اپنا قدم صحیح جواب کے نمبر پر رکھ دیتا تھا۔ جواب خواہ تربیت دہندہ (Trainer) پیش کرے یا کوئی اور، گھوڑا درست جواب پر قدم مار دیتا تھا۔ ایک ماہر نفسیات بھی نمائش میں موجود تھا۔ اسے خیال ہوا کہ جو شخص سوال کا صحیح جواب اپنے ہاتھ میں لیے ہے اس کے سر اور کندھے سے ہلکے ہلکے اشارے خود بخود اٹھتے ہیں۔ گھوڑا ان اشاروں سے سمجھ

جاتا ہے کہ درست جواب کون سا ہے - ماہر نفسیات نے اشاروں کو خارج کرنا چاہا ، تا کہ صحیح پوزیشن کا پتہ لگے - چنانچہ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ایک صحیح جواب گھوڑے کو خود پیش کیا لیکن چالاکی یہ کی کہ نہ تو اس نے جواب کی طرف دیکھا نہ ہی اس کا سر ہلا اور نہ ہی شانے ، یعنی اس نے کوئی اشارہ نہ کیا - نتیجہ یہ ہوا کہ گھوڑا درست جواب نہ بتا سکا -

اس تجربے نے ثابت کر دیا کہ اگر حالات پر پورا قابو نہ ہو تو صحیح نتائج برآمد نہیں ہوتے - گھوڑے والے تجربے میں خود تجربہ کنندہ کی حرکات پر قابو کی ضرورت تھی - جب تک ان حرکات کو خارج نہیں کیا گیا گھوڑے کی چالاکی کا پتہ نہ چل سکا -

(۲) **شرائط میں باضابطہ تبدیلی :** تجربے میں شرائط کو گھٹایا بڑھایا جاتا ہے ، ایسا کرنے سے تجربہ کنندہ معلوم کر لیتا ہے کہ آیا نتائج بھی اسی رفتار یا مقدار سے گھٹتے بڑھتے ہیں یا نہیں - اگر اسباب و علل کی کمی زیادتی نتائج میں بھی کمی زیادتی پیدا کر دے تو گمان غالب ہو جاتا ہے کہ یہاں پر علت اور معلول کا رشتہ موجود ہے - مثلاً گیٹس (Gates) کا خیال تھا کہ بار بار پڑھنے کی نسبت قرأت (Recitation) زیادہ مفید ہے اس نے طلبہ کے پانچ گروپ لیے - پہلے نے سو فی صد بار بار پڑھا - دوسرے نے ۸۰ فی صد تو بار بار پڑھا اور ۲۰ فی صد دہرایا - تیسرے نے ۶۰ فی صد پڑھا اور ۴۰ فی صد دہرایا - چوتھے نے ۴۰ فی صد پڑھا اور ۶۰ فی صد دہرایا - پانچویں نے ۲۰ فی صد پڑھا اور ۸۰ فی صد دہرایا - تمام گروہوں نے ایک جیسا وقت لیا - وقت مقررہ کے بعد ہر گروپ سے کہا گیا کہ وہ یاد کیے ہوئے سبق سنائے - نتائج حسب ذیل ہیں :

گروپ نمبر	کتنا یاد رہا (فی صد)
۱	۳۵

۲	۵۰
۳	۵۴
۴	۵۷
۵	۷۴

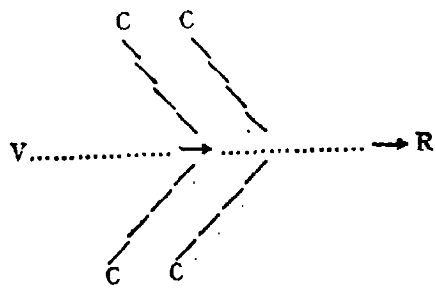
اس تجربے نے ثابت کر دیا کہ دہرائی بڑھنے سے یادداشت بھی بڑھتی ہے -

(۳) کنٹرول گروپ (Control Group) : بعض اوقات ایسے گروپ کا ملاحظہ بھی ضروری ہوتا ہے جو تجربے میں شریک نہ ہو - تجربے سے کردار پر اثر پڑتا ہے لہذا اگر معمولی گروپ کا مقابلہ کنٹرول گروپ سے کریں تو یہ اثر زائل ہو سکتا ہے - سٹیگنر (Stagner) اور بریٹن (Britton) دیکھیا چاہتے تھے کہ ناخوشگوار حالات کا رائے عامہ پر کیا اثر پڑتا ہے - انھوں نے جنوبی امریکہ کے متعلق استصواب رائے کی - کچھ طلبہ لیے اور جب بولیوا (Boliva) یا کولمبیا (Colombia) کا نام آیا ، ان طلبہ کو بجلی کے جھٹکے (Electric Shocks) دیے- تجربے کے بعد جب ان کی رائے بولوا اور کولمبیا کے متعلق پوچھی گئی تو معلوم ہوا کہ جھٹکوں سے (یعنی ناخوشگوار حالات سے) ان ممالک کے لیے طلبہ کی محبت گھٹنے کی بجائے بڑھ گئی اس معمول گروپ کے علاوہ کنٹرول گروپ بھی تھا جو تجربے میں شریک نہ تھا - ان کی رائے لی گئی ان کا پیار اور محبت زیرتجربہ گروپ سے بڑھ چڑھ کر تھا - زیر تجربہ اور کنٹرول گروہوں کے مقابلے نے ثابت کر دیا کہ ناخوشگوار حالات سے پیار میں کمی واقع ہوجاتی ہے - اس چیز کا پتہ کنٹرول گروپ کے بغیر ممکن نہ تھا -

(۴) تابع اور غیر تابع متغیرات (Dependent and Independent Variables) : ہر تجربے میں کچھ متغیرہ تابع ہوتے ہیں اور کچھ غیر تابع - غیر تابع تجربے کے دوران بدلتے نہیں مثلاً گیٹس (Gates) کے تجربے میں وقت نہیں بدلتا ، یہ غیر تابع متغیرہ ہے - لیکن یاد آنے والا

مواد متغیرہ ہے کیوں کہ یہ گھٹتا بڑھتا ہے ، اس پر تجربے کے عوامل کا اثر پڑتا ہے ۔

ووڈورتھ (Woodworth) بیان کرتا ہے کہ ہوا باز اونچے سے اونچا جانے کی کوشش میں کبھی کبھار بے ہوش ہو جاتا ہے ، یہ کیوں ؟ کئی مفروضے سامنے آتے ہیں ۔ شاید بے ہوشی ڈر کے مارے ہو یا جہاز کے چکروں کی بدولت ، یا بالا کرۂ ہوائی کی سردی سے ، یا ہوا کا دباؤ کم ہونے سے یا آکسیجن کی کمی سے ۔ ان تمام مفروضوں کو یکے بعد دیگرے لیا جاتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ آکسیجن کی کمی بے ہوشی کا سبب ہے ۔ اگر کسی آدمی کو کمرے میں بند کر دیں اور آہستہ آہستہ آکسیجن خارج کرنا شروع کریں تو ہم دیکھیں گے کہ پہلے تو وہ شخص ہانپنے لگتا ہے اور بعد میں بے ہوش ہو جاتا ہے ۔ اس تجربے میں صرف ایک چیز یعنی آکسیجن گھٹتی ہے اور اثر یہ ہوتا ہے کہ سانس گھٹتا ہے اور انسان بےہوش ہو جاتا ہے باقی تمام شرائط کو بدلنے نہیں دیا جاتا ۔ آکسیجن غیر تابع متغیرہ ہے اور بے ہوشی تابع متغیرہ ۔ ووڈورتھ اس کو مندرجہ ذیل شکل سے ظاہر کرتا ہے :



وی (V) سے مراد متغیرات ہیں ، اور سی (C) سے مراد مستقل یا غیر متغیر علل و اسباب ہیں ۔ دیکھنا یہ ہے کہ متغیرہ احوال سے کس قسم کا رد عمل پیدا ہوتا ہے ۔

نفسیاتی تجربے کو ووڈورتھ نے یوں بیان کیا ہے ، وہ کہتا ہے کہ اگر تجربہ کنندہ کو ای (E) کہیں اور زیر تجربہ فرد کو او (O) ، تو تجربہ میں او (O) کے کردار یا تفاعل کے کسی پہلو کو ملاحظہ کرنا ہوتا ہے ۔ ای (E) نے یہ معلوم کرنا ہے کہ مخصوص حالات میں او (O) کا کردار کیا ہے ، اس کا رد عمل کیسا ہے اور وہ تجربی متغیر سے کیسے متأثر ہوتا ہے ؟ اگر او (O) انسان ہو تو اسے ہدایات دی جاتی ہیں ، اور کوئی کام اس کے سپرد کیا جاتا ہے ، لیکن تجربے کا مقصد اسے نہیں بتایا جاتا ۔

تجربے میں ، جن اسباب پر قابو پانے کی ضرورت ہے ، وہ یا تو ماحول سے تعلق رکھتے ہیں یا او (O) کے باطنی احوال ہیں ۔ ماحول پر قابو پانا چنداں مشکل نہیں ، یہ مسئلہ تو لیبارٹری کا ہے ۔ البتہ باطنی احوال کو مکمل ضبط میں رکھنا آسان نہیں ۔ او (O) کے ہیجان اور جذبات کو ایک نہج پر نہیں رکھا جا سکتا ۔ تجربے کے متعلق وہ پریشان یا جذباتی ہوسکتا ہے ۔ اس قسم کی باطنی کیفیات تجربے پر ضرور اثر انداز ہوتی ہیں ، لیکن آج کل کی تجربہ گاہوں میں زیر تجربہ افراد کی تربیت کا خاص بندوبست ہوتا ہے ۔ اس تربیت کے بعد ممکن ہو جاتا ہے کہ تجربے کے دوران زیر تجربہ فرد خواہ مخواہ پریشان یا مشتعل نہ ہو ۔ او (O) ہدایات سے بھی معلوم کر لیتا ہے کہ اسے کون سا کام کرنا ہے ، اور اپنا ذہن کیسے رکھنا ہے ؟

لیکن تربیت اور ہدایات کے باوجود کچھ ایسی مشکلات رہ جاتی ہیں ، جو تجربہ کنندہ کو فراموش نہیں کرنی چاہییں ۔

۱۔ اگر کام تھکا دینے والا ہو یا بوریت پیدا کرے ، تو او (O) کی دلچسپی ختم ہو جائے گی ، اور نتائج ٹھیک برآمد نہیں ہوں گے ۔

۲۔ اگر بیرونی حالات ناسازگار ہو جائیں تو او (O) زیادہ محنت سے کام لے گا ۔ اگر کوئی شخص ہوا بازی کی ملازمت چاہتا ہو ، اور اسے

آڑنے کے لیے کہا جائے ، تو آکسیجن کی کمی کے باوجود وہ اوپر اڑتا جائے گا ، کیونکہ اس تسلط پر اس کا انتخاب منحصر ہے ، اور جو اثر آکسیجن کی کمی سے ہوتا ہے ، اسے ظاہر نہیں ہونے دے گا ۔

۳۔ اگر کسی طریقے سے او (O) کو تجربے کا مقصد معلوم ہو جائے تو وہ جانبداری سے کام لے گا ۔ فرض کیا کہ تجربہ کنندہ شراب کا اثر دیکھنا چاہتا ہے ۔ اگر شراب پینے والے کو پتہ چل جائے کہ اسے شراب کیوں پلائی جا رہی ہے ، تو وہ نشے کو کنٹرول میں رکھے گا ، اور ضرورت کے مطابق یا تو اسے ظاہر نہیں ہونے دے گا ، اور یا زیادہ ظاہر کرے گا ۔ اس امر کو روکنے کے لیے تجربہ کنندہ شراب کی بجائے کڑوا پانی بھی دے دیتا ہے ۔ اگر پانی پر بھی (جس کا علم او (O) کو نہیں) نشے کا اظہار ہو تو زیر تجربہ فرد کی چالاکی اور فریب ظاہر ہو جائے گا ۔

چونکہ داخلی کیفیات کا مکمل کنٹرول ممکن نہیں ، اور مختلف افراد ایک ہی ماحول میں ، ایک جیسا رد عمل پیدا نہیں کرتے ، اس لیے ضروری ہے کہ وسیع پیمانے پر تجربے کیے جائیں ، تا کہ شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے ۔ ایک ہی تجربہ مختلف حالات میں ، مختلف انسانوں یا حیوانوں پر کرنا چاہیے ، تا کہ انفرادی عناصر خارج ہو جائیں اور صرف عمومی عناصر رہ جائیں ۔

تیسرا باب

کردار کی عمومی خصوصیات

GENERAL CHARACTERISTICS OF BEHAVIOUR

ارسطو نے انسان کی تعریف حیوان ناطق کی تھی ۔ اس کے بہت بعد ڈارون (Darwin) نے بیشتر شواہد اور تجربات سے ثابت کر دیا کہ حیوان اور انسان ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں ، اور اپنی تمام خوبیوں کے باوجود انسان ، حیوان ہی رہتا ہے ۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان صرف حیوان ہی رہتا ہے ، کیونکہ وہ کئی ایسے کام کرتا ہے جو حیوانوں کو نصیب نہیں ۔ وہ فلسفہ پڑھتا ہے ، ہوائی جہاز چلاتا ہے ، ڈرامے اور نظمیں لکھتا ہے ، لیکن ان کارہائے نمایاں کے باوجود اس کی حیوانیت قائم رہتی ہے ۔ اس کے احوال و افعال حیوانوں جیسے ہیں ، گو حیوانوں سے زیادہ مشکل اور پیچیدہ ہیں ۔ حیوانوں اور انسانوں کے کردار میں صرف مقدار کا فرق ہے ۔ جو چیز حیوانوں میں سادہ ہے، وہ انسانوں میں پیچیدہ بن جاتی ہے ۔ حیوان بھی ہاتھ استعمال کرتے ہیں اور انسان بھی ۔ لیکن انسان ان سے وائلن بجاتا ہے ، ٹائپ کرتا ہے ، نازک اور خطرناک مشینوں کو چلاتا ہے ۔ جانور ہاتھوں سے چند ایک چھوٹے موٹے کام کر سکتے ہیں ، اور بس ۔

کردار کے عناصر کیا ہیں ؟ اگر زندگی تفاعل کا نام ہے ، اور ہر جاندار کسی نہ کسی کام میں مصروف ہے ، تو ان مسلسل سرگرمیوں کی تہہ میں کون سی قوت موجود ہے ؟

بلی یا کتے کے بچوں کو دیکھیے ، ان میں ان تھک طاقت دکھائی دیتی ہے ۔ شروع شروع میں تو وہ گوشت کے لوتھڑے دکھائی دیتے

ہیں ، لیکن چند دنوں کے بعد وہ دوڑنے ، بھاگنے اور پھدکنے لگتے ہیں - ایک منٹ بھی نچلے نہیں بیٹھتے - اب انسانی بچے کو لیجیے - اگر وہ تندرست اور خوش ہے ، تو وہ بھی نچلا نہیں بیٹھتا - کبھی ہاتھ اٹھاتا ہے - کبھی ٹانگ اونچی کرتا ہے ، کبھی سر کو اِدھر اُدھر کرتا ہے ، کبھی دولتیاں مارتا ہے اور کبھی منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکالتا ہے - غرضیکہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کر رہا ہے -

بالغوں کو دیکھیے ، وہ بھی کسی نہ کسی سرگرمی میں مشغول ہیں - ان کا بیشتر وقت تو روٹی کمانے میں گزرتا ہے ، اور فارغ وقت میں وہ ٹینس یا بیڈمنٹن کھیلتے ہیں ، یا شمع معمہ حل کرتے ہیں یا دوستوں سے گپیں ہانک رہے ہیں ، اور کوئی ناول پڑھ رہے ہیں - بعض صرف حقہ پی کر ہی وقت گزار دیتے ہیں -

پس حیوان ہو یا انسان ، کسی نہ کسی شغل میں مصروف ہے - اس شغل کا سرچشمہ ذی جان کے اندر موجود ہے - بلی اور انسان کا بچہ ، بیرونی اسباب سے مشتعل ہو کر سرگرمی نہیں دکھاتا ، اس کے اندر کافی سے زیادہ توانائی (Energy) موجود ہے ، جس کا اظہار سرگرمیوں میں ہوتا ہے - بچے کا بازو یا ٹانگ اٹھانا ، یا اِدھر اُدھر سر مارنا ، خارجی مہیجات کی بدولت نہیں بلکہ یہ حرکات وہ اس لیے کرتا ہے کہ اس کے اندر توانائی کا ان تھک خزانہ موجود ہے - یہ خزانہ تحول (Metabolism) کی صورت میں ہوتا ہے - یاد رہے کہ زندگی میں دو طاقتیں کام کرتی ہیں - ایک قسم کی طاقتیں زندگی بڑھاتی ہیں ، طاقت اور توانائی بخشتی ہیں ، اور دوسری قسم کی طاقتیں زندگی گھٹاتی ہیں ، کمزوری اور نقاہت پیدا کرتی ہیں ، اور موت کا موجب بنتی ہیں - زندگی کا مطلب ہے ، تعمیری قوا (Assimilative Forces) کا تخریبی قوا (Destructive Forces) پر غالب رہنا - جب تخریبی قوا غلبہ پالیتے ہیں ، تب انسان بیمار پڑ جاتا ہے یا زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے - جب

ہم کھانا کھاتے ہیں یا صاف ہوا میں سانس لیتے ہیں ، تو توانائی پیدا ہوتی ہے ، اور جب کام کرتے ہیں تو توانائی صرف ہوتی ہے ۔ بیرونی مہیجات کا کام توانائی کو رہا کرنا ہے ۔ مشاغل کا ظہور توانائی کی رہائی کا کرشمہ ہے ۔

توانائی ایسی شے نہیں جو مخفی ہو یا فہم و ادراک سے بالا ہو ، یا جس کو سائنسی طریقے سے سمجھا نہ جا سکے ۔ عضویاتی ماہروں کا کہنا ہے کہ اس توانائی کا مقام جاندار کی رگوں ، ریشوں اور عضلات میں پایا جاتا ہے ، اور اس کی حقیقت خالص فعلیاتی ہے ۔

جاندار کو فٹ بال نہیں سمجھنا چاہیے کہ جدھر ٹھوکر لگی ، ادھر کا ہو لیا ۔ جاندار کے اندر طاقت کا خزانہ موجود ہے ۔ یہ طاقت ہی کردار کو تحریک دیتی ہے ۔

بچوں کے کردار میں کوئی نظم نہیں ہوتا ، ان کی سرگرمیاں (جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے) وافر طاقت کی بدولت ہیں ۔ جوں جوں بچہ جوان ہوتا ہے ، اس کی حرکات منظم اور منضبط ہوتی جاتی ہیں ۔ ابتدا میں وہ یونہی ہاتھ پاؤں مارتا ہے ، لیکن بعد میں وہ انھی سے فٹ بال یا ٹینس کھیلتا ہے ، نازک مشینوں کو چلاتا ہے اور اپریشن کے اوزاروں پر قابو پاتا ہے ۔ بچہ صرف نئی حرکات ہی نہیں سیکھتا بلکہ جن حرکات کو وہ سیکھ چکا ہے ، ان میں نظم لاتا ہے ، روانی اور بے ساختگی پیدا کرتا ہے ، اور بغیر کسی تکلیف کے ادا کرتا ہے ۔ سائیکل چلانے والے کی مثال لے لیجیے ۔ ابتدا میں اسے بڑی تکلیف ہوتی ہے ، لیکن جب اسے سائیکل چلانی آ جاتی ہے ، تب وہ نہایت آسانی اور سرعت سے مناسب حرکات ادا کر لیتا ہے ۔ لکھنے میں بچوں کو بڑی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے ، وہ قلم ٹھیک نہیں پکڑ سکتے ، لکھتے وقت ایسا دکھائی دیتا ہے جیسے تختی سے کشتی کر رہے ہوں ، لیکن جب مہارت ہو جاتی ہے ، لکھنے میں کوئی دقت نہیں رہتی ، اور لکھائی

خوشی اور اطمینان کا موجب بن جاتی ہے ۔

کردار کی تہہ میں سب سے اہم اصول حیاتیاتی اصول ہے ، جسے توافق کا اصول (Law of Adjustment) کہا جاتا ہے ۔ یوں تو لوگوں کو اس اصول کا علم ڈارون سے بہت پہلے تھا ، لیکن ڈارون نے اس اصول کی بنیاد سائنسی مواد پر رکھی ، اور ثابت کر دیا کہ کائنات کی ہر جاندار شے اپنے ماحول سے توافق پیدا کرنا چاہتی ہے ۔ اور جو نہیں کر سکتی ، وہ نیست و نابود ہو جاتی ہے ۔ سٹیگنر (Stagner)[1] رقم طراز ہے کہ توافق کا اصول یوں تو ٹھیک ہے ، لیکن معین اور واضح نہیں ۔ نفسیات کے لیے ہمیں معین اصول چاہیے ۔ سٹیگنر یہ اصول Homeostasis (توازنی میلان) میں پاتا ہے ۔ Homeostasis سے مراد ہے ، عضویہ کا وہ عام حیاتیاتی میلان ، جس کی رو سے وہ اپنا توازن قائم رکھتا ہے مثلاً اگر گرمی کی شدت ہو تو پسینہ آ جاتا ہے ، اور جسم قدرے ٹھنڈا ہو جاتا ہے ، اگر سردی زیادہ ہو تو جسم ٹھٹھرتا ہے اور ٹھٹھرنے سے گرم ہو جاتا ہے ۔ والٹر کینن (Walter Cannon)، ایک فعلیاتی ماہر ، نے بتایا ہے کہ ہیجانی کیفیات میں یہی اصول کار فرما ہے ، ڈر کی کیفیت لیجیے ۔ ڈر اسی وقت پیدا ہوتا ہے ، جب عضویہ کو کوئی خطرہ ہو ۔ اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے طبعیی توانائی کی کثیر مقدار خرچ ہوتی ہے ۔ فوری اور زور دار رد عمل کے لیے معمولی طاقت سے کام نہیں چلتا ۔ عضویہ اس معاملے میں بخل سے کام نہیں لیتا ، بلکہ جتنی توانائی درکار ہو ، وہ پیش کرتا ہے ۔

کظری غدودوں (Adrenal Glands) سے خون کو مادہ کظریہ (Adrenin) ملتا ہے جس کی بدولت جگر سے نشاستہ حیوانی (Glycogen) رہا ہوتا ہے ۔ کظریہ مادہ سے خون قدرے منجمد ہو جاتا ہے جو خون بہنے کی صورت میں مفید رہتا ہے ۔ دل کی حرکت اور خون کا دباؤ بھی

---

۱ ۔ ملاحظہ ہو اس کی کتاب Psychology صفحہ ۱۴ ۔

بڑھ جاتا ہے ، سانس تیز ہو جاتا ہے اور ہاضمہ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ ان طبیعی تفاعل سے عضویہ کو خطرے کا مقابلہ کرنے اور اپنے آپ کو محفوظ رکھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ والٹر کینن کی تشریح سے دقیق کردار میں بھی توازنی میلان کے اصول کی وضاحت اور اہمیت عیاں ہو جاتی ہے۔ (اس میلان کی تشریح آگے بھی آئے گی)۔

سٹیکنر کے خیال میں توازنی میلان کا اصول صرف اسی لیے مفید نہیں کہ وہ اصول توافق سے زیادہ معین ہے بلکہ اس لیے بھی کہ یہ کردار کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے جن کا مشاہدہ ممکن ہے۔ توافق تو کردار کی آخری منزل ہے۔ اس سے پہلے کئی واردات طعبیی اور نفسیاتی سطح پر پیدا ہوتے ہیں جن کا مطالعہ ضروری ہوتا ہے۔ توازنی میلان ہماری توجہ ان بے شمار کوائف کی طرف لے جاتا ہے جن سے توافق بالاخر پیدا ہو جاتا ہے مثلاً خطرے کا مقابلہ کرنا اور اپنی زندگی کو قائم رکھنا ایک بہت بڑا توافق ہے۔ لیکن اس سلسلے میں عضویہ کے اندر کئی تبدیلیاں آتی ہیں جو کچھ خون ، معدہ ، دل اور دیگر اعضا پر گزرتی ہے ان کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔۔ یہ مطالعہ مشاہدے اور تجربے سے ممکن ہے۔ پس اگر توازنی میلان کو پیش نظر رکھیں تو کردار کا مطالعہ سائنسی رتبہ حاصل کرلیتا ہے۔

توازنی میلان کا اصول بتاتا ہے کہ توافق کی جد و جہد میں جاندار کو کبھی سادہ اور کبھی مشکل کام کرنے پڑتے ہیں۔ زندگی ایک ہی نہج پر نہیں رہتی بلکہ ہر قدم پر نئے مسائل ہیں۔ جانوروں کی زندگی میں نئے مسائل کم ہوتے ہیں لیکن انسانوں کی زندگی میں ہر سٹیج پر نت نیا معاملہ ہوتا ہے۔ ان مسائل کو سمجھنا اور نئے حالات پر قابو پانا زندگی کا بہت بڑا فریضہ ہے۔ اس فریضے سے توافق پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ توافق سے پہلے کئی نفسی اور عضویاتی تبدیلیاں اور عواسل ظاہر ہوتے ہیں ان کو صحیح طور پر نوٹ کرنا اشد ضروری

ہے - توازنی میلان کا اصول ہماری توجہ ان تبدیلوں کی طرف لاتا ہے -

یرکیز (Yerkes) نے توازنی میلان کی صداقت پرکھنے کے لیے مینڈک پر تجربہ کیا - ہر شخص جانتا ہے کہ اگر مینڈک کو پانی سے باہر رکھا جائے تو وہ پریشان ہو جاتا ہے اور جب تک پانی میں واپس نہ لایا جائے چین نہیں پاتا - اگر مینڈک کو پانی سے کچھ دور رکھا جائے تو مینڈک پانی تک پہنچنے کا راستہ سیکھ لیتا ہے - اور اگر اس کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کر دی جائیں تو پھر کیا ہوگا ؟ یرکیز نے پنجرہ بنوایا اور مینڈک کو اس کے منہ پر رکھ دیا - پنجرے کے دوسرے سرے پر پانی تھا - پہلے مینڈک نے پانی تک پہنچنے کا صحیح راستہ سیکھا لیکن یرکیز نے کئی قسم کی رکاوٹیں پیدا کیں - مینڈک ان رکاوٹوں سے پریشان ضرور ہوا اور کئی غلطیاں بھی کیں لیکن ہر دفعہ صحیح راستہ پانے میں کامیاب ہو جاتا تھا -

یہ تجربہ سادہ سا ہے لیکن اس سے پتہ چلتا ہے کہ جب توازنی میلان درہم برہم ہوتا ہے تو عضویہ اس کی بحالی کے لیے کوشش کرتا ہے اور جب تک توازن دوبارہ قائم نہ ہو اسے چین نہیں پاتا - جو چیز جانوروں میں صحیح ہے وہ انسانوں میں بھی صحیح ہے - انسانوں کی زندگیوں میں بے شمار مسائل نئے ہوتے ہیں اور یہ مسائل ہر مقام پر ملتے ہیں - جو آدمی کسی کی محبت میں یا کسی ذہنی الجھن میں گرفتار ہو اسے پتہ ہوتا ہے کہ کن نئے حالات سے اسے ہر روز سابقہ پڑتا ہے - محبت میں کامیاب ہونے کے لیے ضروری ہے کہ رقیبوں کی چالیں سمجھی جائیں اور ان کا مناسب جواب دیا جائے - ذہنی مسائل کے حل میں بھی مختلف راستے اختیار کرنے پڑتے ہیں - کوئی ایسا راستہ جسے رائل روڈ یا پختہ شاہرہ کہہ سکیں ، زندگی میں نصیب نہیں - پس توافق حاصل کرنے کے لیے جن راستوں سے گزرنا پڑتا ہے ان کا علم بھی ہونا چاہیے - یہ علم عضویہ کے مطالعہ سے ملے گا اور خصوصاً ان اعضا کے تفاعل سے

جو سرگرم کار ہوں ۔

متذکرہ بالا بحث سے عیاں ہوگا کہ کردار کی تہہ میں طبیعی توانائی کار فرما ہے ۔ اس توانائی کو توافق حاصل کرنے کے لیے خرچ کیا جاتا ہے ۔ چونکہ توافق کا نظریہ کوئی متعین شے پیش نہیں کرتا اور قابل مشاہدہ حقائق کی طرف توجہ نہیں لے جاتا لہذا توازنی میلان (Homoestasis) کا اصول اختیار کرنا پڑتا ہے ۔

اس بحث کے بعد اگر کردار کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ :

۱۔ جاندار تبھی سر گرم کار ہوگا جب ماحول اور اس کے درمیان توازن قائم نہ رہے ۔ مثلاً مینڈک پانی سے باہر رہ کر پریشان ہے اور اس کی پریشانی تبھی دور ہو سکتی ہے جب وہ دوبارہ پانی میں چلا جائے ۔ اسی طرح عاشق کو معشوق کے بغیر چین نہیں آتا ، کامیابی حاصل کرنے کے لیے وہ تجاویز بناتا ہے اور جو تجویز اس کے خیال میں زیادہ موزوں ہوتی ہے اس پر عمل کرتا ہے ۔

۲۔ چونکہ جاندار کا توازن ماحول سے بگڑ چکا ہوتا ہے ۔ لہذا اسے بحال کرنے کے لیے وہ سرگرمی دکھاتا ہے ۔ مینڈک اچھلے گا، کودے گا، پنجرہ میں ادھر آدھر جائے گا اور اگر ایک راستہ بند پائے گا تو روانگی کے مقام کی طرف لوٹے گا ۔ یہی حال عاشق اور مفکر کا ہے ۔ جب ایک طریقہ نا کام ہو جاتا ہے تو دوسرا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے ۔

۳۔ بالآخر صبر و استقلال سے یا سعی و خطا کے طریقے سے صحیح راستہ پا لیا جاتا ہے یا صحیح حل مل جاتا ہے ۔ اس سے توازن دوبارہ قائم ہوتا ہے اور بے چینی ختم ہو جاتی ہے ۔

اس تجزیے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح (Homeostasis) توازنی اصول زندگی کے ہر شعبے میں کار فرما ہے ۔ خواہ فعل سادہ ہو یا ترقی یافتہ ، اصل مطلب یہ ہوتا ہے کہ توازن قائم رکھا جائے اور ان اسباب کو رفع کیا جائے جو عضویہ کو بے چین کر رہے ہوں ۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ ہم اس سے پہلے اس امر کا ذکر کر آئے میں کہ کائنات سے مہیجات اٹھتے ہیں۔ عضویہ ان سے متأثر ہوتا ہے اور مناسب رد عمل پیش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ رد عمل کی نوعیت مہیجات کے علاوہ عضویہ پر بھی موقوف ہے۔ ہر عضویہ دوسرے سے مختلف ہے اس لیے مختلف افراد خواہ ایک جیسے مہیج سے ہی متأثر کیوں نہ ہو رہے ہوں ان کا رد عمل ایک جیسا نہ ہوگا۔ ایک ہی ماحول میں بچے، جوان اور بوڑھے کو رکھیں ان کی سرگرمیاں مختلف ہوں گی۔ ہر شخص اپنے حالات کے مطابق ماحول کو سمجھے گا اور اسی کے پیش نظر رد عمل کرے گا۔

یہ معاملہ ذرا تفصیل طلب ہے۔ ماحول سے نپٹتے ہوئے ہر فرد کا کردار تین صورتیں اختیار کر سکتا ہے۔

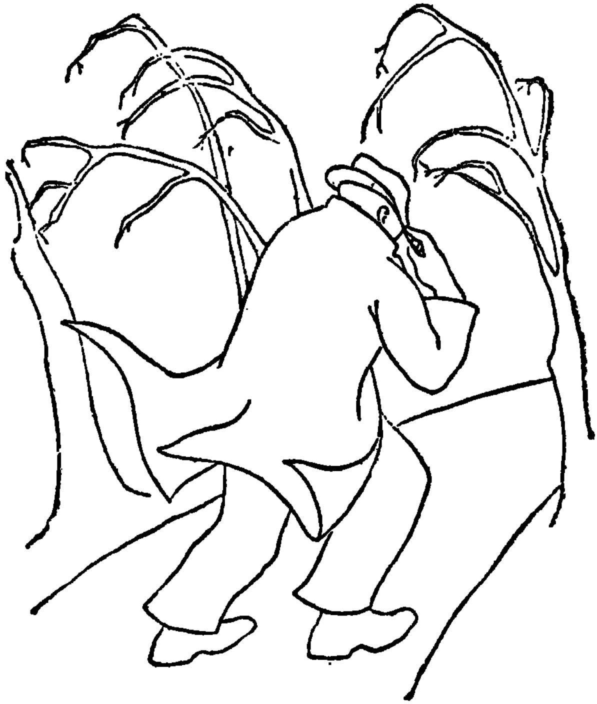
۱۔ یا وہ ماحول کا مقابلہ کرتا ہے۔

۲۔ یا وہ ماحول سے اتفاق کرتا ہے۔

۳۔ یا وہ ماحول کو اپنے اغرض و مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔

پہلی صورت میں ماحول اور اس کے اثرات اس کی مرضی کے مطابق نہیں ہوتے۔ لہذا وہ ان کا مقابلہ کرتا ہے اور انہیں بدلنا چاہتا ہے۔ کبھی گرمی کی شدت ہوتی ہے کبھی سردی کی، وہ گرمی اور سردی کو کم کرتا ہے۔ پنکھے چلاتا ہے اور کولر کا استعمال کرتا ہے، تو گرمی کم ہو جاتی ہے۔ آگ جلاتا ہے، گرم کپڑے پہنتا ہے، چائے پیتا ہے اور انڈے کھاتا ہے، تو سردی کم ہو جاتی ہے۔ اگر چوٹ آ جائے اور خون بہنے لگے، تو مرہم پٹی کرتا ہے۔ بیماریوں کی حالت میں دوائیاں موجود ہیں، جو کیڑوں کا ستیاناس کرتی ہیں، اور عضویہ کو تندرستی بخشتی ہیں۔

افراد کو سوشل ماحول کا بھی مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ بچے ماں باپ کی زد و کوب سے گھبراتے ہیں، اور کئی طرح اس کا



ماحول سے مقابلہ کیا جا رہا ہے

مقابلہ کرتے ہیں۔ بڑوں کے اپنے مسائل ہیں۔ کہیں رشتہ داروں سے جھگڑے ہیں اور کہیں افسروں سے لڑائی ہے، کہیں بچے کہا نہیں مانتے اور کہیں بیوی ضرورت سے زیادہ خرچ کرتی ہے، طبیعی ماحول کی طرح سوشل ماحول بھی مخالفت کرتا ہے، دونوں کا مقابلہ لازمی ہے۔

دوسری صورت میں فرد اپنے ماحول کو موافق پاتا ہے، اور اس میں شرکت کرتا ہے۔ صبح کے وقت ہوا صحت بخش ہوتی ہے، لوگ سیر کو نکل جاتے ہیں، اور تازہ ہوا سے صحت بناتے ہیں۔ گرمیوں میں لوگ مری چلے جاتے ہیں، اور وہاں کی ٹھنڈ اور نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔



ماحول سے شرکت ہو رہی ہے

سوشل ماحول بھی موافق ہو سکتا ہے۔ جب دوستوں سے گپیں چلتی ہیں، بچوں کے ساتھ قہقہے لگتے ہیں یا شام کو کلبوں اور ریستورانوں میں اکٹھی چائے وغیرہ پی جاتی ہے، تب پتہ چلتا ہے کہ لوگ کیسے ایک دوسرے سے پیار محبت کرتے ہیں، اور سوشل ماحول میں شرکت کیسے منفعت بخش اور طرب انگیز ہوتی ہے۔

تیسری صورت میں فرد کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ماحول سے فائدہ اٹھائے۔ اس کی ایک مثال تو اوپر گزر چکی ہے۔ صبح کی تازہ ہوا میں سیر کرنا، اس امر کی دلالت ہے کہ ماحول سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ جب قدرتی ذرائع کو اس طور استعمال کریں کہ ان سے زندگی زیادہ آرام دہ بن جائے یعنی ہوائی جہاز، ریڈیو، پل،

ریل گاڑی وغیرہ بنائیں ، تب ماحول کو اپنی مرضی پر ڈھال کر اس سے فائدہ حاصل کر رہے ہوتے ہیں ۔

سوشل حالات سے بھی فائدہ اٹھایا جاتا ہے ۔ افسروں کی چاپلوسی کر کے یا انہیں رشوت دے کر کئی کام نکلوائے جاتے ہیں ۔ کہتے ہیں ۔ کہ وقت پر گدھے کو بھی باپ بنا لینا چاہیے ، اور مشکل وقت میں ہر آدمی اپنی بساط کے مطابق دوسروں سے کام نکالنا جانتا ہے ۔

یاد رکھیے کہ خواہ ماحول کی مخالفت ہو یا شرکت ، مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ ماحول سے توافق ہو ، کیونکہ عدم توافق کا مطلب موت کے سوا اور کچھ نہیں ۔

توافق کا مطالعہ کرتے وقت ہمارا فورمولا S – R ہی ہے ۔ ایس (S) سے مراد (جیسا کہ ذکر آ چکا ہے) مہیج اور آر (R) سے مراد رد عمل ہے ۔ چونکہ یہ فارمولا غلط فہمیوں کا شکار ہو چکا ہے ، اس لیے یاد رکھیں کہ :

رد عمل صوتی (Vocal) ہو سکتا ہے ۔

رد عمل ہیجانی (Emotional) ہو سکتا ہے ۔

رد عمل یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جسم یا عضو کو ایک کیفیت پر برقرار رکھا جائے ۔

ایک رد عمل دوسرے کو روک بھی سکتا ہے ۔

اکثر مہیجات اندرونی ہوتے ہیں ۔

کئی S – R سلسلہ بناتے ہیں ۔

عضویہ کی حالت S – R پر اثر انداز ہوتی ہے ۔

S – R کسی شغل کا جزو ہوتا ہے ، اور شغل کے حوالے سے اس کا مطلب سمجھایا جا سکتا ہے ۔

ان نکات کی تشریح حسب ذیل مثال سے ہو جائیگی :

ٹیکسی ڈرائیور کو لیجیے ۔ اس کا دل و دماغ کئی قسم کے مہیجات

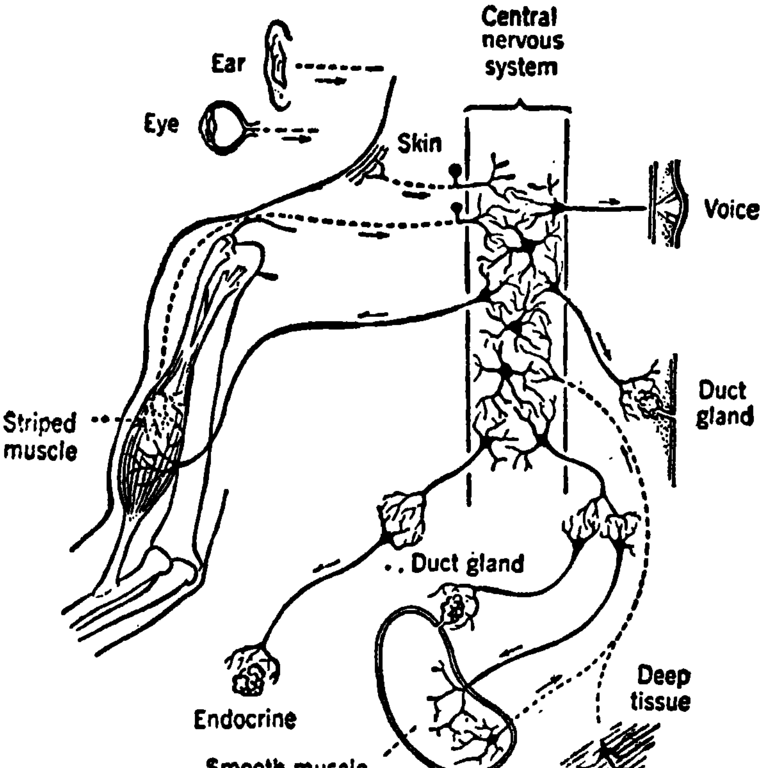
کا مرکز بنا ہوا ہوتا ہے ، اس کی آنکھوں پر دوسری ٹیکس
روشنی ، سائے اور رنگ پڑ رہے ہوتے ہیں ، اور کانوں میں اپنی
یا دوسری ٹیکسیوں کی ، یا مسافروں کی آوازیں آ رہی ہوتی
پیڈل اور گیئر (Gear) دبانے سے اس کی جلد پر متعدد اثرات
ہوتے ہیں ۔ ناک بھی طرح طرح کی خوشبوؤں یا بدبوؤں کا شکار
ان بیرونی مہیجات کے علاوہ اور مہیجات بھی کار فرما ہیں ۔ عـ
(Muscles) اور دیگر اندرونی اعضا سے بھی کئی مہیج اٹھتے ہیں ۔

ٹیکسی ڈرائیور کا رد عمل ملاحظہ کریں ، وہ بھی پیچیدہ
الجھا ہوا ہے ۔ ایک ہاتھ سے گیئر پکڑتا ہے اور دوسرے سے سٹر
ایک پاؤں پیڈل پر ہے اور دوسرا بریک پر ۔ اس کی آنکھیں اور سڑ
کا جائزہ لینے میں دائیں بائیں گھومتی ہیں ۔ منہ سے مسافروں کے
باتیں بھی کرتا ہے ، اور اس کے علاوہ اپنے جسم کو سیدھا اور بـ
بھی رکھتا ہے ۔

یہ کردار منظم ، مربوط اور متدون ہے ، لیکن ماہر نفـ
مطالعہ کرتے وقت تحلیل اور تجزیے کی خاطر اس کے حصے :
کر دیتا ہے ۔ اب ایک اور مثال لیجیے ۔ آپ گاڑی پکڑنا چاہتے
وقت تنگ ہے ، اور سیٹی کی آواز آپ کے کانوں میں آ رہی
آپ کا سانس رک جاتا ہے ، دل کی حرکت مدہم پڑ جاتی ہے ،
دل دھڑکنا شروع ہوتا ہے اور آپ کے قدم تیز ہو جاتے ہیں ۔
سے دوست دکھائی پڑتا ہے ، اور آپ جلدی سے اسے السلام عـ
کہہ کر منزل مقصود کی طرف بھاگتے ہیں ۔ اس بھاگ دوڑ
مچھر یا کوئلہ آپ کی آنکھ میں پڑ جاتا ہے ، اور آنکھ سے آ
نکل آتے ہیں ۔

اس مثال میں کردار کے کئی پہلو ملتے ہیں ۔ ہر ایک
علیحدہ علیحدہ S – R میں دکھایا جا سکتا ہے ۔

کوئلے کا آنکھ میں پڑنا (S) اور آنکھ سے آنسوؤں کا بہنا (R)
دوست دکھائی دینا (S) سلام کہنا (R)
سیٹی سننا (S) سانس رکنا اور دل کا دھڑکنا(R)



مہیجات اور ردعمل میں مختلف اعضا کے وظائف۔ کٹی ہوئی لکیریں درآور اعصاب کو اور مسلسل لکیریں برآور اعصاب کو ظاہر کرتی ہیں ۔ ان کو ہم ایک قوس (Arc) میں پیش کر سکتے ہیں ، جیسے حسی حرکی

(Sensori-Motor) قوس کہا جاتا ہے ۔ اس قوس کی ایک جانب تو حواس ہیں ، اور دوسری جانب عضلات ۔

ٹیکسی ڈرائیور کو آنکھ ، کان ، ناک اور جلد سے مہیجات آ رہے ہیں ۔ آنکھ ، کان ، ناک اور جلد ہمارے حواس ہیں ۔ ٹیکسی ڈرائیور کا رد عمل ہاتھ ، ٹانگ ، آنکھ اور کان وغیرہ سے ہے ۔ مہیجات کے داخلے کا راستہ حواس ہیں ، جنھیں آخذات (Receptors) کہا جاتا ہے ۔ عضویہ کا ردعمل عضلات سے ہوتا ہے ، جنھیں ہم برآور (Effectors) اعصاب کہتے ہیں ۔ طریقہ یہ ہے کہ مہیجات کا داخلہ آخذات سے ہوتا ہے ، اور رد عمل کا اظہار برآور عصاپ سے ، ہمارے حسی اعصاب (Sensory Nerves) درآور ہیں ، اور حرکی عصاب (Motor Nerves) بر آور ہیں[1]۔

پچھلے باب میں بیان آ چکا ہے کہ S—R کا فارمولا اپنی موجودہ صورت میں نامکمل ہے ۔ ہر قسم کا مہیج پہلے عضویہ میں داخل ہوتا ہے ، پھر ردعمل کا موجب بنتا ہے ۔ ٹیکسی ڈرائیور اور اس کی ٹیکسی کے مسافر ایک ہی ماحول میں ہیں ۔ مہیج بھی ایک جیسے ہی قبول کرتے ہیں ، لیکن ان کے رد عمل یکساں نہیں ۔ یہ کیوں ؟

ووڈورتھ[2] کہتا ہے کہ عضویہ کا فرق تین عناصر سے عیاں ہوتا ہے :

۱۔ عضویہ کی ساخت ۔ مستقل خواص ۔
۲۔ عضویہ کی ساخت ۔ عارضی خواص ۔
۳۔ شغل ، جو جاری ہو ۔

عضویہ کے مستقل خواص اس کی جسمانی ساخت اور تشریح (Anatomy) میں موجود ہیں ، جواہر تخلیق (Gene) کے علاوہ ٹانگیں ، ہاتھ ، عضلات ، غدودیں ، حواس ، اعصاب اور دماغ ساخت کا حصہ

۱۔ اشکال ووڈورتھ Psychology صفحہ ۲۴۱-۲۴۳ ۔
۲۔ ملاحظہ ہو اس کی Psychology صفحہ ۲۰۵ ۔

ہیں ۔ عمر کے ساتھ یہ چیزیں پھلتی پھولتی ہیں ، اور ان کی نشو و نما، ماحول سے تفاعل کی بدولت ہے ۔ پس مستقل خواص میں ورثہ کو دخل ہے ، اور اکتسابی عناصر کو بھی ۔ جو کچھ پڑھا یا سیکھا گیا ہو ، جس قسم کی عادات اور قابلیتیں ہوں ، یہ سب کی سب مستقل خواص میں شامل ہیں ۔ عضویہ کا ماضی اس کے حال کے لیے ضروری ہے ، اور رد عمل کی نوعیت اور شکل تعمیر کرتا ہے ۔ ٹیکسی ڈرائیور اور مسافروں کا ماضی ایک جیسا نہیں ، ان کی قابلیتوں اور استعداد میں فرق ہے ، اور ان کی دلچسپیاں اور مشاغل بھی مختلف ہیں ، اس لیے مہیجات ایک جیسے ہونے کے باوجود ان کا رد عمل ایک جیسا نہیں ۔

عارضی خواص سے بھی بڑا فرق پڑتا ہے ۔ اونگھنے اور جاگنے کا رد عمل مختلف ہوتا ہے ۔ جس چیز کا انکار بیداری میں ممکن ہو اونگھنے میں شاید ممکن نہ ہو ۔ بچے اس امر سے فائدہ اٹھاتے ہیں ۔ باپ کو جب نیند آ رہی ہو ، وہ پیسے مانگتے ہیں—باپ ایک دفعہ انکار کرے گا یا دو دفعہ ۔ بالآخر وہ مان جائے گا ، کیونکہ نیند غالب آ رہی ہوتی ہے ، وہ اسے خراب نہیں کرنا چاہتا ۔ پولیس والے بھی کبھی کبھار یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں ۔ ملزم کو نہایت لذیذ اور مرغن کھانا کھلایا جاتا ہے ۔ جب اسے نیند آنے لگتی ہے ، تب جرم کے متعلق پوچھ گچھ شروع ہوتی ہے ۔ چونکہ لذیذ اور مرغن کھانا پیٹ بھر کر کھایا ہوتا ہے ، اس لیے نیند کا غلبہ زوروں پر ہوتا ہے ، اور ملزم سچ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔ جاگنے میں وہ ایسی باتیں نہیں کرے گا ۔ اس قسم کی اور مثالیں لوگوں کے متلون مزاجی میں ملیں گی ۔ مزاج جب بدلتا ہے، رد عمل بھی بدل جاتا ہے ۔ خوشی اور غم کے رد عمل بالکل مختلف ہوتے ہیں ۔

مصروفیتوں کی اہمیت بھی اس ضمن میں خاصی ہے ۔ ہمارے رد عمل کی تشکیل ان مصروفیتوں اور مشاغل سے بھی ہوتی ہے ، جو تھوڑے یا لمبے وقفے کے لیے ہماری توجہ کے مرکز بنے ہوں ۔ ٹیکسی چلاتے وقت ٹیکسی ڈرائیور صرف انھی مہیجات کو قبول کرے گا ، اور وہی رد عمل

روا رکھے گا ، جو اس کے موجودہ وقتی شغل سے متعلق ہو۔ ہو سکتا ہے کہ جب ٹیکسی ڈرائیور آرام کر رہا ہو یا کسی دوسری مصروفیت میں منہمک ہو ، اس وقت وہ اور قسم کے مہیجات قبول کرے ، اور اور قسم کا رد عمل روا رکھے ۔ جب کوئی طالب علم بی ۔ اے پاس کرکے ایم ۔ اے میں داخل ہوتا ہے تب اس کے رد عمل بدل جاتے ہیں ، اور وہ ، مہیجات بھی اور قسم کے قبول کرتا ہے۔ شادی بیاہ کے بعد لڑکے لڑکیوں کے مشاغل میں فرق آ جاتا ہے ، اور ان کے افعال و خصائل بدل جاتے ہیں ۔

مستقل اور عارضی خصائص اور مشاغل کے سلسلے میں جو بحث ہوئی ہے ، اس کا ماحصل یہ ہے کہ رد عمل کی نوعیت اور تشکیل چار عناصر پر منحصر ہے :

۱۔ عضویہ کے مستقل خصائص ۔
۲۔ عضویہ کی اندرونی کیفیت یا عضویہ کے عارضی خصائص ۔
۳۔ مصروفیت ۔
۴۔ مہیج کی نوعیت ۔

فرض کیا کہ آپ نے سینما کے لیے کہانی لکھی ہے ، اور دیکھنا یہ ہے کہ اس کا اثر پروڈیوسر پر کیا ہوگا ، آیا وہ کہانی پسند کرے گا یا نہیں ۔ اس کا جواب دریافت کرتے وقت آپ کو پروڈیوسر کی گزشتہ زندگی سے واقفیت حاصل کرنا ہوگی کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے ؟ اس کی دلچسپیاں کیا رہی ہیں ؟ وہ کیسی کہانیاں پسند کرتا ہے ، اس کے علاوہ آپ کو یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ اس کی موجودہ مصروفیات کیا ہیں ؟ وہ کون کون سی فلمیں بنا رہا ہے اور ان کی کہانیاں کیا ہیں ؟ ایسے معاملات میں نہایت ضروری عنصر یہ ہوتا ہے کہ آپ اپنا کیس کیسے پیش کریں گے ؟ پروڈیوسر کو کیا سبز باغ دکھائیں گے — وغیرہ وغیرہ ۔ ظاہر ہے کہ اس تجزیہ میں متذکرہ بالا سب کے سب

عناصر کار فرما ہوں گے۔ پروڈیوسر کے عضویہ کے مستقل اور عارضی خصائص اس کی مصروفیتوں اور آپ کی پیشکش سب ضروری امور ہیں۔

ووڈورتھ کہتا ہے کہ ہمارے سامنے دو فارمولے آتے ہیں :

۱۔ W—O—W یعنی او (O) یا عضویہ کا تعلق کائنات سے ہے۔ کائنات سے اثرات آتے ہیں، اور کائنات ہی مشاغل اور مصروفیات کا مرکز ہے۔

۲۔ S—O—R یعنی ایس (S) یا مہیجات عضویہ میں داخل ہوتے ہیں، اور عضویہ، آر (R) یعنی رد عمل پیش کرتا ہے۔

ان دو فارمولوں کو اکٹھا کیا جا سکتا ہے۔ اب فارمولا ہوگا

W—Ṡ—O—R—W

جس کا مطلب ہوگا کہ مہیجات کائنات سے اٹھتے ہیں، عضویہ میں داخل ہوتے ہیں، اور عضویہ اپنی نیچر کے مطابق کائنات میں رد عمل کرتا ہے۔

ماحول سے عہدہ برآ ہونے کے اصول :

اوپر والے پروگرام کی مزید وضاحت دو اصولوں سے ہو سکتی ہے۔ ان اصولوں کا مطلب یہ ہے کہ افراد اپنے ماحول سے کیسے عمدہ طریقے سے نپٹ سکتے ہیں۔ یوں تو ہر شخص ماحول سے لپٹا ہوا ہے، اور عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتا ہے، لیکن بعض اشخاص عمدگی سے عہدہ برآ ہوتے ہیں، اور بعض خطرناک غلطیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ دو اصول ہیں، انتخاب (Selectivity) اور ذہنی حالت (Set)۔

۱۔ انتخاب

انتخاب کے وقت مندرجہ ذیل عناصر قابل غور ہیں :

(الف) درک کا انتخابی ہونا (Selective Reception)

ریڈیو سیٹ کی وصولی انتحابی ہوتی ہے۔ ہوا میں لاکھوں آوازیں موجود ہیں، لیکن ریڈیو کی سوئی جس مقام پر ہوگی وہیں کی آوازیں سنائی دیں گی۔ اگر ایک وقت میں سب کی سب آوازیں دھاوا بول دیں،

تو ایک عظیم الشان انتشار پیدا ہو جائے گا ، جو لطف کی بجائے ،
موجب ثابت ہوگا - اسی طرح اگر کسی پارٹی میں شرکت ہو ،
بائیں سے ہزاروں آوازیں آتی ہیں ، لیکن ہم صرف وہ آواز سنتے
ہمارے مطلب کی ہو یعنی دوست کی ، جس سے گفتگو کر رہے
کوئی اور شیریں آواز ، جو دل کو اچھی لگ رہی ہو ـ بعض دفعہ
آوازیں اور مکروہ شکلیں بھی سنی اور دیکھی جاتی ہیں ، وقتی طو
بھی توجہ کا مرکز بن جاتی ہیں .

(ب) رد عمل کا انتخابی ہونا (Selective Response)

جب مہیج عضویہ میں داخل ہوکر رد عمل کا تقاضا کرتا
کئی رد عمل ممکن ہوتے ہیں ، لیکن ہر قسم کا رد عمل موزوں ؛
اس کے انتخاب کی ضرورت ہے ، تاکہ صرف وہی فعل صادر ہو ج
کا جواب احسن طریقے پر پیش کر سکے ـ جب موٹر سامنے سے آ
سائیکل چلانے والا ٹکر بھی مار سکتا ہے ، لیکن اگر اسے
مقصود ہو ، تو ٹکر نہیں مارے گا بلکہ ایک طرف ہٹ جائے گ
طرح ہر موقعہ پر بے شمار افعال ممکن ہیں ، لیکن موزوں فعل ایک ·
ہے اور اسے ہی بجا لانا چاہیے۔ اگر آپ کے اردگرد دلچسپ چیزیں
ہیں ، تو ایک وقت میں ایک ہی چیز دیکھ سکتی گے - ہماری آنک
بائیں ضرور جائے گی، لیکن ایک وقت میں یا دائیں جانب ہو جا
بائیں جانب ایک ہی لحظہ میں دونوں اطراف نہیں دیکھی جا سک

یاد رہے کہ انتخاب کا یہ مطلب نہیں کہ مہیجات یا ر
اکٹھے نہیں کیے جا سکتے ، یا ایک مہیج اور رد عمل سے ہم
مہیج یا رد عمل کی طرف نہیں جا سکتے ـ

(ج) رد عمل میں تبدیلی

جب ارد گرد جاذبِ نظر اشیاء ہوں ، تو ہم کبھی ایک کو
ہیں اور کبھی دوسری کو ـ یہ نہیں ہوتا کہ بس ایک پر نظر پڑ
وہیں جمی رہی - باغ میں طرح طرح کے پھول ہوتے ہیں ، کبھ

پھول ہماری توجہ کا مرکز بنتا ہے اور کبھی دوسرا اگر مہیجات یا رد عمل میں تبدیلی کا اصول تسلیم نہ کیا جائے، تو انسان کی دلچسپیاں ختم ہو جائیں، اس کا علم بڑھنے سے جواب دے دے، اور اس کا مشاہدہ محدود ہو کر رہ جائے۔

(د) جمع کرنا

ایک وقت میں مہیجات بھی بے شمار آتے ہیں اور رد عمل بھی بے شمار ممکن ہیں۔ ظاہر ہے نہ تو سارے مہیجات قبول کیے جا سکتے ہیں، اور نہ ہی سارے رد عمل بجا لائے جا سکتے ہیں، اس لیے انتخاب ضروری ہے۔ لیکن انتخاب کا یہ مطلب نہیں کہ چند ایک مہیج کو اکٹھا نہیں کیا جاتا یا چند ایک رد عمل کو ایک ساتھ بجا نہیں لایا جاتا۔ پروفیسر کا لیکچر سنتے وقت طالب علم پروفیسر کو دیکھتا ہے، اس کی آواز سنتا ہے، اور اپنی کرسی سے سختی یا نرمی کا احساس پاتا ہے۔ ارد گرد سے بوئیں بھی آتی ہیں۔ یہ تمام مہیجات مجتمع صورت میں قبول کیے جاتے ہیں۔ اب رد عمل کو لیجیے۔ فرض کیا کہ آپ نے زمین سے کوئی چیز اٹھائی ہے، تو لازماً ہاتھوں کے ساتھ آپ کے بازو بھی جھکیں گے، کمر سے بھی کام لیا جائے گا، اور عضویہ کے دوسرے عضو بھی کسی نہ کسی شکل میں مصروف کار ہوں گے۔ غرض کہ ہر عضو کا علیحدہ علیحدہ کام جمع ہو کر چیز اٹھانے کا موجب بنتا ہے۔ دوڑ کو لیجیے۔ یہ صرف ٹانگوں کا کرشمہ نہیں بلکہ اس میں سارا جسم مصروف کار ہے۔ کان سیٹی پر لگے ہوئے ہیں، آنکھیں راستے (Track) پر جمی ہیں، پاؤں بھاگے جا رہے ہیں اور ساتھ ٹانگیں بھی۔ دوڑنے والے کا جسم خاص انداز میں ہے، قدرے آگے کی طرف جھکا ہے منہ میں رومال ہے، بدن سے پسینہ نکل رہا ہے، اور آخری چکر پر سارا زور لگا دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر عضو کا رد عمل دوسرں کے ساتھ مل کر ایک منضبط اور متدون فعل بناتا ہے۔

۲۔ حالت (Set)

اس کی قسمیں حسب ذیل ہیں :

(الف) تیاری کا سیٹ (Preparatory Set)

جیسے کوئی فعل، توجہ اور انتخاب سے منضبط ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی تیاری سے زیادہ احسن طریقہ پر بجا لایا جا سکتا ہے۔ لڑکے امتحان کے لیے تیاری کرتے ہیں، ڈراموں کے لیے مشق (Rehearsel) کرتے ہیں، اور قومیں سال ہا سال تک جنگوں کی تیاری میں مصروف رہتی ہیں۔ ایسے اشغال کا تجزیہ کریں، تو ان میں کچھ رد عمل تو تیاری کے ہیں اور کچھ خاتمہ کے۔ چھینک ایک سادہ سا فعل ہے۔ اس میں دونوں چیزیں نظر آئیں گی، تیاری بھی اور خاتمہ بھی۔ پھیپھڑوں میں ہوا بھرتی ہے اور نکل جاتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں گانے میں بھی نظر آئیں گی۔ پہلے گلہ صاف کیا جاتا ہے، اور پھر گانا گایا جاتا ہے۔

ہر جگہ تیاری کی ضرورت ہے، اور اس کا فائدہ ہر صورت میں واضح ہے۔ دوڑ لگانے والوں کو دیکھیے، کیسے لکیر پر چاق و چوبند



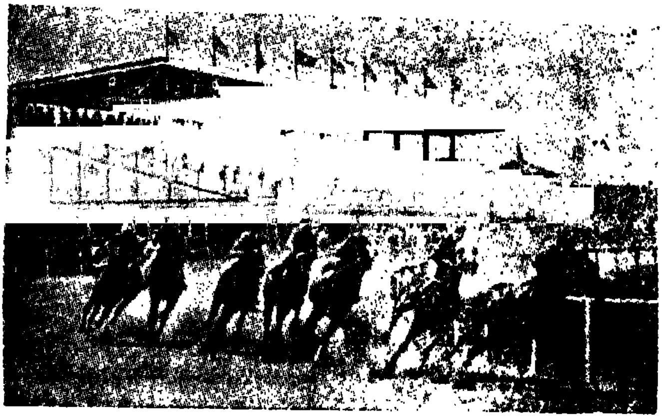
تیاری کا سیٹ

کھڑے ہیں ، ان کے کان سیٹی پر لگے ہوئے ہیں ، جسم آگے کو جھکے ہوئے دوڑنے کے لیے بے تاب ہیں - اگر کوئی کھلاڑی تیاری کی صورت میں کھڑا نہ ہو تو دوڑ میں پیچھے رہ جائے گا ، اس کا رد عمل فوری نہ ہوگا بلکہ سست اور بعد از وقت ہوگا - سیٹی بجنے پر اسے فوراً بھاگنا چاہیے ، وگرنہ وہ مار کھا جائے گا -

(ب) شروع کرنے اور جاری رکھنے کا سٹ -

کام کی ابتدا ہوتی ہے ، لیکن ابتدا کے ساتھ ہی انتہا نہیں ہو جاتی - ابتدا کے بعد کچھ عرصے تک شغل جاری رہتا ہے ، اور جب تک اس کا مقصد پورا نہ ہو ، اسے چھوڑا نہیں جاتا - مثال کے طور پر دوڑ لگانے والوں کو دیکھیے ، جو لکیر پر کھڑے سیٹی کا انتظار کر رہے ہیں - بدن آگے کی طرف جھکا ہے ، قدم بھاگنے کے لیے تیار ہیں اور کان آواز پر لگے ہیں - سیٹی بجتے ہی دوڑ شروع ہو جاتی ہے - لیکن جونہی دوڑ شروع ہوتی ہے ، ختم نہیں ہو جاتی - کچھ مدت چاہیے ، تا کہ دوڑ والے منزل مقصود پر پہنچ سکیں - دوڑ کے دوران جسم کی حالت وہی نہیں رہتی جو شروع میں ہوتی ہے - دوڑ کی ابتدا میں تو جسم آگے کو جھکا ہوا ہوتا ہے ، لیکن دوڑ لگاتے وقت اس کا جھکاؤ اندر کی طرف ہو جاتا ہے - اس کے علاوہ اور بھی کئی فرق ہیں ، جن کا پتہ بغور دیکھنے سے چلتا ہے -

ہر سٹ انتخابی ہوتا ہے - دوڑ لگانے والوں کے دونوں سٹ یعنی شروع کرنے اور جاری رکھنے کے انتخابی ہیں - کھلاڑیوں کے کان سیٹی پر لگے ہوئے ہوتے ہیں - وہ وقتی طور پر صرف سیٹی ہی کو سنیں گے ، باقی آوازیں ان کے کانوں کو متأثر نہیں کر سکتیں - اسی طرح دوڑتے وقت ان کو اپنے کام سے کام ہے - کام سے تعلق رکھنے والے مہیجات تو ان کے ذہن میں داخل ہوتے ہیں ، لیکن دوسروں کا وجود ان کے لیے نہ ہونے کے برابر ہے -



بازی رکھنے کا سیٹ

(ج) ذہنی سٹ (Mental Set)

حسی اور حرکی سٹوں کا ذکر تو اوپر آ چکا ہے ۔ ڈھونڈتے وقت حسی سٹ اور دوڑتے وقت حرکی سٹ ہوتا ہے ، لیکن ان دو سٹوں کے علاوہ ذہنی سٹ بھی ہوتا ہے ، جس کا علم مطالعہ باطن سے ہو سکتا ہے ۔ مثلاً اگر کوئی بھولی ہوئی چیز دوبارہ یاد کرنی ہو یا کسی مسئلہ کا حل دریافت کرنا ہو ، یا کسی سفر کے لیے پروگرام واضح کرنا ہو تو ذہنی سٹ درکار ہے ۔ ووڈ ورتھ کا خیال ہے[1] کہ حسی ، حرکی اور ذہنی سٹوں کی تمیز قطعی نہیں ۔ حسی اور حرکی سٹ خلط ملط ہو جاتے ہیں ، اور اسی طرح ذہنی سٹ دوسرے سٹوں سے مل جاتا ہے ۔ ذہنی سٹ میں دماغ کی ضرورت پڑتی ہے لیکن دماغ کا کام حرکی اور حسی سٹوں میں بھی موجود ہے ۔

جیسے حسی اور حرکی سٹوں میں تیاری کی ضرورت ہے ، ویسے

۱- ملاحظہ ہو اس کی کتاب Psychology صفحہ ۲۱۶ ۔

ہی ذہنی سٹ میں بھی ہے ۔ کمرۂ امتحان میں پرچے تقسیم ہونے سے پہلے ہر امیدوار تیاری کی حالت میں بیٹھا ہوا ہوتا ہے ۔ پرچہ ملتے ہی وہ کام شروع کر دینا ہے ۔ اور وقت مقررہ کے اندر کام ختم کرنا چاہتا ہے ۔

دوسرے سٹوں کی طرح ذہنی سٹ بھی انتخابی ہے ۔ اگر پرچہ تاریخ کے متعلق ہو ، تو امیدوار کے ذہن میں صرف وہی علم یاد آئے گا جو سوالوں کے جواب کے لیے ضروری ہے ، باقی علم خواہ اپنی جگہ پر اہم ہی کیوں نہ ہو ، یاد نہیں آئے گا ، کیوں کہ اس کی ضرورت نہیں ۔ سوال کے متعلق ذہن کے گوشے گوشے سے علم آتا ہے ، فارمولے یاد پڑتے ہیں ، ان کا مناسب استعمال سوجھتا ہے ۔ علاوہ ازیں جو بھی معلومات اس ضمن میں بالواسطہ یا بلاواسطہ مفید ہو سکتی ہیں، وہ کھچی چلی آتی ہیں ، لیکن جن معلومات کی ضرورت نہ ہو یا جنھیں امیدوار اپنی سمجھ اور معلومات کی بنا پر مفید خیال نہ کرتا ہو ، وہ یاد نہیں آئیں گی ۔

ذہنی سٹ کبھی تو خود بہ خود بن جاتا ہے ، اور کبھی بنانا پڑتا ہے ۔ طلباء کو کبھی کبھار پڑھائی کا مزاج (Mood) بنانا بھی پڑتا ہے ۔ امتحان سر پر آ گیا ہو ، اور تیاری ادھوری ہو تو طلباء اپنے پہ جبر کرتے ہیں ، اور زبردستی پڑھائی کا ذہنی سٹ بناتے ہیں ۔ ہونہار اور مستقل مزاج بچوں کو یہ دقت پیش نہیں آتی ، ان کا سٹ لا شعوری طور پر بنا بنایا موجود رہتا ہے ۔ یاد رہے کہ شعوری اور لا شعوری سٹ کی تمیز بھی قطعی نہیں، اکثر یہ دونوں مل جل جاتے ہیں۔ لا شعوری سٹ کو زیادہ کارآمد بنانے کے لیے شعوری طور پر سوچ بچار کی ضرورت پڑتی ہے ، اور شعوری سٹ کی تہہ میں بھی کئی لاشعوری عوامل کارفرما ہوتے ہیں ۔

(د) موقع اور محل کا سٹ (Situation Set)

ہم نے کئی ایک سٹوں میں ذکر کیا ہے کہ شغل کے لیے تیاری کی

ضرورت پڑتی ہے۔ شغل کی ابتدا ہوتی ہے، اور منزل پانے پر انتہا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا تیاری کے، شروع کے، جاری رکھنے اور منزل کے سٹ ہیں۔ لیکن ایک اور سٹ، جو اہمیت میں کسی سے کم نہیں، وہ موقعہ کا سٹ ہے۔ ہر شغل کے لیے محل اور موقعہ درکار ہے۔ اس کے متعلق بھی پوری واقفیت چاہیے۔ موقعہ اور محل سے ہماری مراد اشیاء، اشخاص، جگہ اور کارروائیاں ہیں۔ کمرۂ امتحان میں بیٹھا ہوا امیدوار اپنے آپ کو ایک خاص ماحول میں پاتا ہے۔ یہ کمرہ دوسرے کمروں کی طرح نہیں، اس میں سپرنٹنڈنٹ ہے، نگران ہیں، یونیورسٹی کی طرف سے قواعد و ضوابط ہیں، گھڑی ہے جو وقت بتا رہی ہے، پھر کاپیاں اور سوال نامہ ہے۔ یہ سب چیزیں کمرۂ امتحان کو خاص اہمیت بخشتی ہیں۔ امیدوار کو چاہیے کہ وہ اس اہمیت سے آگاہ ہو۔ دوڑ لگانے والوں کو بھی پتہ ہونا چاہیے کہ دوڑ کہاں سے شروع ہوگی اور کس جگہ ختم ہوگی؟ کتنے چکر کاٹنے ہوں گے اور راستہ (Track) کون سا ہے؟ دوڑ کے کیا قواعد ہیں اور ریفری کون ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں موقعہ کا ضروری حصہ ہیں، ان کے متعلق علم ہونا چاہیے۔

موقع و محل کے تصور میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ جوں جوں انسان بڑھتا ہے اس کی نظر وسیع ہوتی جاتی ہے۔ اگر وہ پہلے کنوئیں کا مینڈک تھا تو اب اس کی نظر زمین اور آسمان کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہے۔ عامی آدمی تو اپنے گھر کو ہی کائنات سمجھتا ہے اس کی حد گھر سے شروع ہوتی ہے اور گھر پر ہی ختم ہو جاتی ہے لیکن ملک اور قوم کے سربراہ کے لیے تمام دنیا، اس کا ماضی، حال، اور مستقبل بھی شاید اس کی کائنات کو نہ بھر سکے۔

موقع اور محل کے سٹ کو خالصتاً ذہنی نہیں سمجھنا چاہیے۔ صبح کے وقت کھڑکی سے باہر بادل اور تیز ہوا دکھائی دیتی ہے ہم فوراً

اس قسم کے ماحول کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ یہاں پر کسی خاص ذہنی سوچ بچار کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بادل دیکھتے ہی چھتری یا برساتی کا خیال آ جاتا ہے یا پھر یہ کہ بستر میں لیٹا رہنا چاہیے۔ مختلف ماحول میں رد عمل بھی ایک جیسا نہیں رہتا۔ شیر کو چڑیا گھر میں دیکھیے اور جنگل میں بھی۔ چڑیا گھر میں جنگلے کے ساتھ لگ کر آپ بڑے اطمینان سے اس کی حرکات ملاحظہ کر سکتے ہیں اور اس کی چنگاڑوں سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر یہی شیر آپ کو جنگل میں مل جائے تو نہ آپ اطمینان سے کھڑے رہیں گے، اور نہ ہی چنگاڑ سننے کا شوق آپ کے دل میں اٹھے گا۔ ماحول بدل گیا ہے رد عمل بھی بدل جائے گا۔ اب تو آپ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگیں گے۔

کردار کے مطالعہ کے لیے ہم نے اب تک جو فارمولا وضع کیا تھا وہ تھا .W-S-O-R-W لیکن اس فارمولے میں کچھ ترمیم کی ضرورت ہے۔ اس فارمولے میں موقع محل کا ذکر نہیں آتا۔ کائنات سے عضویہ کو مہیجات آتے ہیں، اس کا رد عمل بھی کائنات میں ہوتا ہے۔ لیکن ہر مصروفیت کے لیے ماحول یا مناسب محل کی ضرورت ہے۔ پس ہمارا فارمولا اپنی مکمل صورت میں

W-S-Ow-R-W.

ہوگا۔ او (O) کے ساتھ جو ہم نے چھوٹا ڈبلیو (w) لگا دیا گیا ہے اس کا مطلب ہے کہ او (O) یعنی عضویہ ایک خاص ماحول (Situation) میں ہے اس کا علم بھی ضروری ہے۔

زمان رد عمل پر تجربے (Reaction Time Experiments)

مہیج اور رد عمل کے مابین کچھ نہ کچھ وقفہ ضرور ہوتا ہے۔ بعض افراد کی حالت میں یہ وقفہ زیادہ ہوتا ہے بعض میں کم۔ اس وقفہ کو ناپا جا سکتا ہے، ناپنے سے نہ صرف انفرادی اختلافات کا پتہ چلتا

ہے بلکہ پیشہ ورانہ انتخاب میں بھی مدد ملتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کئی صنعتوں میں فوری رد عمل درکار ہے۔ تیز رفتار آروں اور چکیوں میں رد عمل اگر سست یا دیر سے ہو تو جان گنوانے کا ڈر ہے۔ جنگوں میں بھی فوری رد عمل کی ضرورت ہوتی ہے ہوائی جہازوں کو دیکھ کر ایک سیکنڈ میں فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ جہاز کس کا ہے، دشمن کا ہے یا حلیف کا؟ اگر دیکھنے والا سوچ میں پڑ جائے اور جلد فیصلہ نہ کر سکے تو تباہی یقینی ہے۔ بمباری تو آن واحد میں ہو جاتی ہے۔ اگر اسے روکنا ہو تو رد عمل جلد ہونا چاہیے۔ ڈرائیور کے رد عمل کا وقفہ بھی بہت کم ہونا چاہیے۔ کئی دفعہ بچے بیچ میں آن دھمکتے ہیں، یا تیز رو کاریں، بسیں اور سکوٹر پاس سے گزرتے ہیں۔ اگر انہیں دیکھ کر فوری طور پر مناسب کارروائی نہ کی جائے تو حادثے



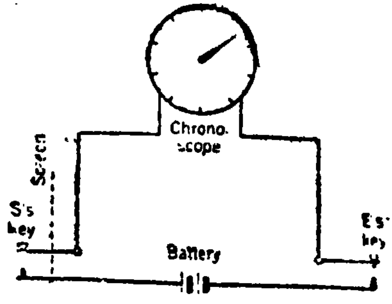
زمان رد عمل کی پیمائش پر تجربہ کھلاڑی اشارہ پاتے ہی بھاگ پڑیں گے جو وقفہ اشارے اور دوڑ کے درمیان گزرے گا۔ اسے ناپ لیا جائے گا

(Accident) کا ڈر ہے ۔ کھیلوں میں بھی پھرتی چاہیے ۔ ہاکی اور فٹ بال میں جہاں تیز کھیل کھیلی جاتی ہے اور ہار جیت کا فیصلہ ایک گھنٹے میں ہو جاتا ہے ، رد عمل نہایت تیز ہونا چاہیے ۔ کھلاڑیوں کو دیکھیے کس چستی سے بال کی روک تھام میں مشغول ہیں اگر ذرا سی کوتاہی د کھائیں تو جھٹ گول ہو جائے۔ کر کٹ میں بھی تیزی سے بال پھینکا اور روکا جاتا ہے ۔ اگر کھلاڑی کا رد عمل جلد نہ ہو اور گیند پڑتے ہی ٹھوکر (hit) نہ لگائے تو آؤٹ ہو جائے گا ۔

ان چند مثالوں سے واضح ہو گیا ہوگا کہ رد عمل اور مہیج کے درمیان جو وقفہ گزرتا ہے اس کی اہمیت روزمرہ کی زندگی میں کتنی زیادہ ہے ۔ ذیل میں چند ایک رد عمل کے تجربات کا ذکر آتا ہے ۔

سادہ رد عمل (Simple Reactions):

ایک بجلی کی گھری (Chronometer) لیجیے جس کے نیچے دو کلیدیں ہوں ۔ ایک کلید معمول نے دبائی ہوئی ہوتی ہے ۔ اسے ہدایت ہوتی ہے کہ جونہی دوسری کلید تجربہ کنندہ دبائے وہ اپنی کلید چھوڑ دے ، جو وقفہ درمیان میں گزرتا ہے وہ خود بخود گھڑی پر ظاہر ہو جاتا ہے ۔



سادہ ردعمل کی پیمائش کا آلہ

یاد رہے کہ یہ وقفہ گھٹتا بڑھتا ہے۔ اس کی مدت کا انحصار حس پر بھی ہے۔ بعض حسوں پر وقفہ زیادہ بدلتا ہے بعض پر کم۔ درد کا رد عمل سب سے زیادہ لمبا ہوتا ہے[1]۔ رد عمل کا وقفہ مشق سے کم ہو جاتا ہے، تھکاوٹ میں بڑھ جاتا ہے۔ توجہ کی حالت میں نسبتاً تیز ہو جاتا ہے۔ اگر زیر تجربہ فرد کا دھیان رد عمل پر ہو (عضلاتی رد عمل Muscular reaction) تو اس کا وقفہ زیادہ نسبتاً ہوگا۔ جب زیر تجربہ فرد کا دھیان مہیج پر ہو اسے حسی رد عمل (Sensorial reaction) کہتے ہیں۔

مرکب رد عمل (Complex Reaction) :

جوں جوں زندگی ترقی کرتی ہے انسان کے رد عمل سادہ رہنے کی بجائے مرکب ہو جاتے ہیں۔ مرکب رد عمل کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ بسا اوقات ہمارے رد عمل انتخابی (Choice reaction) صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً زیر تجربہ فرد کو کہا جاتا ہے کہ یا تو وہ سفید رنگ دیکھے گا یا سرخ۔ سفید رنگ کی حالت میں دایاں ہاتھ اٹھانا ہوگا اور سرخ رنگ کی حالت میں بایاں ہاتھ یا اسے یہ کہا جاتا ہے کہ یا تو اسے رنگ دکھائے جائیں گے یا چھپے ہوئے الفاظ جن کے نام اسے بتانے ہوں گے۔ دوسرے رد عمل کو ادراکی (Perceptual) کہتے ہیں اور یہ انتخابی سے قدرے مشکل ہوتا ہے کیونکہ زیر تجربہ فرد کو یہ علم نہیں ہوتا کہ کون سا مہیج آ رہا ہے۔ اسے رنگ دکھائے جا رہے ہیں یا چھپے ہوئے الفاظ اور رنگوں میں سے کون سا رنگ اور چھپے ہوئے الفاظ میں سے کون سا لفظ اس کے سامنے آئے گا۔

۱- ڈیشئیل(Deshiel)، Fundamentals of General Psychology صفحہ ۳۷۔

انتخابی اور ادراکی رد عمل کا وقفہ سادہ ردعمل کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔

ایتلافی رد عمل (Associative Reaction) :

لفظی ایتلاف (Word Association) پر متعدد تجربات ہوئے ہیں۔ زیر تجربہ فرد کو کوئی لفظ دکھایا جاتا ہے یا پڑھ کر سنایا جاتا ہے اور اسے کہا جاتا ہے کہ جو لفظ مہیج لفظ کی وجہ سے اس کے ذہن میں آئے اسے کہہ دے، یہ آزادانہ ایتلاف (Free Association) ہے۔ یہاں اس امر کا مطلقاً خیال نہیں ہوتا کہ آیا جو لفظ بولا جا رہا ہے اس کا مہیج لفظ کے ساتھ کوئی تعلق بھی ہے یا نہیں۔ آزادانہ ایتلاف کے مقابلے میں منضبط ایتلاف (Controlled Association) ہوتا ہے جہاں معمول کو ہدایت کی جاتی ہے کہ اس کا رد عمل کس نوعیت کا ہونا چاہیے مثلاً اسے کہا جاتا ہے کہ اس نے مہیج لفظ کا الٹ بتانا ہوگا یا نام سنتے ہی آوازیں پیدا کرنی ہوں گی یعنی سفید کا الٹ بتائے گا اور کتے کی آواز نکالے گا۔

ایتلافی رد عمل اور بھی سست ہوتے ہیں یعنی ادراکی اور انتخابی رد عمل کی نسبت ان کا وقفہ زیادہ ہوتا ہے۔

ان تمام تجربات میں معمول کو تیار کرنا ضروری ہے۔ اگر خبردار ہوشیار (Ready) کا سگنل نہ ملے تو معمول فوراً رد عمل نہ کر سکے گا۔ لکیر پر کھڑے کھلاڑیوں کو پہلے تیار (Ready) رہنے کا سگنل دیا جاتا ہے بعد میں دوڑنے کا۔ اگر تیار رہنے کا اشارہ نہ دیا جائے تو دوڑ خراب ہو جائے گی۔

چوتھا باب

ورثہ اور ماحول

HEREDITY AND ENVIRONMENT

نفسیات کا موضوع انسانی کردار ہے۔ کردار کا کچھ حصہ ورثہ کی بدولت ہے اور کچھ حصہ ماحول کی بدولت۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل ہوگا کہ فلاں کردار میں ورثہ کی کتنی مقدار ہے اور ماحول کی کتنی۔ لیکن زندگی میں ایسے سوال اکثر اٹھائے جاتے ہیں جن کا تعلق ورثہ یا تربیت سے ہوتا ہے اور ان کی باہمی تفاعل اور مقدار سے۔ مثلاً کوئی طالب علم جاعت میں اول رہتا ہے اور یونیورسٹی کے سابقہ ریکارڈ مات کر دیتا ہے، اس کے متعلق ہم دریافت کر سکتے ہیں کہ آیا اس کی غیر معمولی کامیابی کا راز اس کی فطری صلاحیتوں میں ہے یا یونیورسٹی کے نظم و نسق میں یا اساتذہ کی محنت اور عام ماحول میں۔ لوگ مجرم کیسے بنتے ہیں؟ کیا جرائم پیشہ لوگ جرم کے لیے پیدا ہوتے ہیں یا ان کا ماحول انھیں مجرم بنا دیتا ہے؟ اگر جرم کے حقیقی اسباب مجرم کی فطرت میں ہوں تو ظاہر ہے اس کا سدھرنا ناممکن ہے۔ لیکن اگر مجرم بنانے میں ماحول کا ہاتھ ہو تو ماحول کو بدلا اور سنوارا جا سکتا ہے۔ پس ورثہ اور ماحول کا سوال جرمیات (Criminology) میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ پاگل پن کے متعلق بھی یہی سوال اٹھا سکتے ہیں۔ کیا جنون پیدائشی ہے یا اکتسابی؟ اگر جنون کے متعلق ثابت ہو جائے کہ اس کے اسباب پیدائشی ہیں تو جنون لاعلاج مرض بن جائے گا۔ ورثہ تبدیل نہیں ہو سکتا۔ جو چیز وراثت میں آ گئی وہ اٹل ہے لیکن اگر جنون کے اسباب

ماحول میں پائے جاتے ہوں تو ماحول ہمارے اختیار کی بات ہے اسے بدلنا چنداں مشکل نہیں - جو سوال ہم نے جنون کے متعلق پوچھا ہے بعینہ یہی سوال ہر مرض کے متعلق پوچھ سکتے ہیں - کیا ذیابیطس پیدائشی ہے یا اکتسابی ؟ کیا امراض قلب پیدائشی ہیں یا اکتسابی ؟ وغیرہ وغیرہ - ظاہر ہے کہ مریض کے لیے ان سوالات کے جوابات بہت ضروری ہیں - فطین لوگوں (Genius) کے متعلق بھی استفسار کر سکتے ہیں کہ آیا ان کی غیر معمولی ذہانت فطری ہے یا ماحول کی رہین منت - شاعروں کے متعلق انگریزی میں مقولہ ہے کہ وہ پیدا ہوتے ہیں نہ کہ بنائے جاتے ہیں (Poets are born and not made) - کیا یہ سچ ہے ؟ کیا شاعروں کی زندگی میں ماحول کی کچھ وقعت نہیں ؟ کیا ہم یہی مقولہ بت تراش ، مصور اور گویے کے لیے بھی کہہ سکتے ہیں ؟ یہ سوالات نہایت اہم ہیں - سوشل ریفارم کے پروگرام ان سوالوں کا صحیح صحیح جواب چاہتے ہیں - کیونکہ اگر ماحول کو انسانی زندگی میں کوئی دخل نہ ہو تو ماحول کو سنوارنے اور بہتر بنانے کے پروگرام محض تضیع اوقات ہوں گے - گورنمنٹ کے ترقی کے منصوبے اور افراد کی ماحول سنوارنے کی ذاتی کوششیں سب کی سب بیکار ہوں گی -

ورثہ اور ماحول کا باہمی عمل :

اوپر کچھ سوالات جنون ، امراض ، جرائم اور فطانت کے متعلق اٹھائے گئے ہیں اور دریافت کیا گیا ہے کہ آیا ان کے اسباب فطرت میں ڈھونڈنے چاہییں یا ماحول میں - سوال اس انداز سے کیے گئے ہیں جن سے ظاہر ہو کہ ان کے مسائل کے اسباب یا تو فطرت میں ملیں گے یا ماحول میں لیکن دونوں میں نہیں مل سکتے - سوال کرنے کا یہ ڈھنگ نہایت غیر سائنسی ہے ، یا۔یہ یا وہ (Either-or) کا انداز مبالغہ کی جانب لے جاتا ہے اور بے لوث تحقیقات سے باز رکھتا ہے - حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان اپنے ورثہ اور ماحول کے باہمی عمل کی پیداوار ہے - کسی

کردار میں ورثہ کا ہاتھ زیادہ ہوتا ہے کسی میں ماحول کا ۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ ایک کردار میں صرف ورثہ ہو اور ماحول نہ ہو ، یا صرف ماحول ہو اور ورثہ نہ ہو ۔ ممکن ہے اس عام اصول کی کچھ مستثنیات (Exception) ہاتھ آ جائیں لیکن ان کی تعداد زیادہ نہ ہوگی ۔

ورثہ سے مراد نشو و نما کے میلانات ہیں ۔ مثلاً انسان اور کتے کا بچہ ورثہ کی وجہ سے انسان یا کتا بنتا ہے ۔ اسی طرح سے ہر پودا اور پھول اپنا اپنا رنگ ، قد اور پتے وراثتاً پاتا ہے ۔ گلاب کا بیج گلاب پیدا کرے گا اور چنبیلی کا چنبیلی ۔ گندم کے بیج سے چنے کا پودا نہیں اگے گا اور نہ چنے کے بیج سے گندم اگے گی ۔ ان مثالوں سے پتہ چل گیا ہوگا کہ خواہ نباتات ہو یا حیوانات ہر چیز اپنی فطری قویٰ کی بدولت اپنی انفرادی حیثیت پاتے ہیں ۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ ماحول کو ان کی زندگیوں میں کوئی دخل نہیں ۔ اگر بیج کو مناسب زمین میں نہ بویا جائے، وقت پر پانی نہ دیا جائے یا کٹائی وغیرہ نہ کی جائے تو بیج اگے گا نہیں یا اگر اگے گا تو کمزور رہے گا ۔ زمین ، پانی ، کٹائی ، کھاد وغیرہ بیج کے لیے ماحول ہے ۔ انسانوں کو کئی چیزیں ورثہ میں ملتی ہیں ان کے لیے بھی ماحول چاہیے ۔ اگر خوراک ، پانی ، تازہ ہوا خالص اور مناسب مقدار میں نہ ملے تو قد جتنا بڑھنا چاہیے نہیں بڑھے گا ۔ جسم جتنا مضبوط ہونا چاہیے نہیں ہوگا اور ذہانت جتنی چمکنی چاہیے نہیں چمکے گی ۔ ۱۷۹۹ء کا ذکر ہے ۔ ایوی ران (Aveyron) کے جنگلات میں ایک جنگلی لڑکا پکڑا گیا جو ننگا ، گونگا ، میلا کچیلا اور بھیانک شکل کا تھا ۔ نہ اونچی آوازیں سنتا تھا نہ نیچی ۔ نہ خوشبوئیں اس کے ناک کو متأثر کرتی تھیں نہ بدبوئیں ۔ نہ کسی آواز سے وہ چونکتا تھا اور نہ ہی کسی اشارے کو سمجھتا تھا ۔ اس میں توافق کی صلاحیت مطلقاً نہ تھی ۔ اس لڑکے کو معائنہ اور تربیت کی خاطر لایا گیا ۔ بعض اہل علم کہتے

تھے کہ لڑکا فطرتاً ابلہ (Idiot) ہے اور اس کی ابلہی لاعلاج ہے۔ دوسرے کہتے تھے کہ بچہ سلیم الطبع ہے، اسے صرف تعلیم اور مناسب ماحول کی ضرورت ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ دونوں فریق درست کہہ رہے تھے۔ بچے میں فطری کمزوریاں بھی تھیں، اور اسے مناسب ماحول بھی نہ ملا تھا۔

پس ورثہ اور ماحول دونوں اپنی اپنی جگہ پر اہم عنصر ہیں۔ یہ کبھی خیال نہیں کرنا چاہیے کہ شخصیت کی تشکیل صرف ایک عنصر پر موقوف ہے خواہ وہ عنصر کتنا ہی ضروری کیوں نہ ہو۔ کوئی سے دو افراد ایک جیسا ماحول اور ورثہ نہیں پاتے۔ اس کا نتیجہ انفرادی اختلافات ہیں۔ سکول میں مختلف بچے ایک ہی جماعت میں تعلیم پاتے ہیں۔ ان کا ماحول ایک جیسا ہے، ایک ہی استاد ہے، ایک ہی کتابیں، ایک ہی کمرہ اور ایک ہی کھیل کا میدان۔ لیکن اس کے باوجود ان کی شخصیتیں ایک جیسا اثر قبول نہیں کرتیں اور نہ ہی ایک جیسا انسان بنا دیتی ہیں۔ یہاں پر فرق ماحول کا نہیں بلکہ ورثے کا ہے۔ چونکہ ہر بچے کا ورثہ مختلف ہے ماحول ایک جیسا مؤثر ثابت نہیں ہوتا۔ ماحول کی یکسانیت مساوات پیدا نہیں کر سکتی۔ ایک ہی ماحول میں مختلف افراد کو رکھنے سے ان کا کردار ایک جیسا نہ ہو سکے گا۔

ورثے اور ماحول کا جدا جدا اثر دیکھنے کے لیے تجربات ہو چکے ہیں[1]۔ ووڈ ورتھ کہتا ہے کہ دو نسلے (Hybrid) جانوروں سے ورثے کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے۔ اگر مختلف نسل کے نر اور مادہ سے بچہ حاصل کیا جائے مثلاً گدھے اور گھوڑی سے تو ان کا بچہ گدھے اور گھوڑے کے عام بچے سے مختلف ہوگا، نہ تو بچہ بڑا ہو کر گدھا بنے گا نہ گھوڑا۔ وہ خچر بنتا ہے۔ اس دو نسلے بچے کا ماحول عام گدھے اور گھوڑے

۱۔ ووڈ ورتھ اپنی کتاب Psychology میں صفحہ ۱۵۷ پر دو تجربات کا ذکر کرتا ہے۔

کے بچوں جیسا رکھیے لیکن پھر بھی یہ دو نسلا بچہ خچر ہی بنے گا۔ شروع میں فرق اتنا نمایاں نہیں ہوتا لیکن بعد میں فرق زیادہ واضح ہو جائے گا۔ پس

۱۔ خچر اور گھوڑے یا گدھے کا فرق ورثے کی بدولت ہے۔

۲۔ مختلف ورثے والے جاندار ایک ہی ماحول میں رکھنے سے ایک جیسے نہیں بن جاتے۔

۳۔ نشو و نما سے ارثی اختلافات چمکتے ہیں۔

گھر میں تمام بچوں کے لیے تقریباً ایک جیسا ماحول ہوتا ہے لیکن جوں جوں بچے جوان ہوتے ہیں ان کی انفرادیت اجاگر ہوتی جاتی ہے اس کا ایک بڑا سبب ورثے کا فرق ہے۔ ارثی اختلافات کو ماحول نہیں مٹا سکتا۔

ماحول کا اثر دکھانے کے لیے ووڈورتھ عجیب الخلقت جانوروں (Monsters) کی مثال پیش کرتا ہے۔ تجربہ کنندہ ابتدائی ماحول کو بدل کر ورثے میں تبدیلی پیدا کر دیتا ہے۔ مچھلی یا مینڈک کے انڈوں کو ٹھنڈا یا گرم کر دیا جاتا ہے یا بجلی اور ایکس رے سے اندرونی مادہ کے تفاعل پر اثرات ڈالے جاتے ہیں۔ ماحول بدلنے سے جو بچے انڈوں سے برآمد ہوتے ہیں وہ نارمل (Normal) بچوں سے مختلف ہوتے ہیں، ان کی شکل و صورت عجیب بن جاتی ہے۔ مچھلی کے جنین (Embryo) کو، جب اس کی آنکھیں بن رہی ہوں، برف میں چند گھنٹوں کے لیے رکھیں، نتیجہ یہ ہوگا کہ آنکھیں نا مکمل رہ جائیں گی اور بعض دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ دو کی بجائے ایک آنکھ رہ جاتی ہے۔ دو آنکھ اور ایک آنکھ والی مچھلی کا فرق محض ماحول کی بدولت ہے۔

مؤثر ماحول (Effective Environment)

یوں تو شخصیت کی نشو و نما میں ماحول کا عنصر بڑا اہم ہے لیکن یاد رہے کہ ماحول سے ہماری مراد خالی طبعی اور سماجی عوامل

نہیں بلکہ صرف وہ طبعی اور سماجی عناصر ہیں جو شخصیت پر اثر انداز ہوں ۔ مثلاً مسجد کا مکان کے قریب واقع ہونا اس شخص کے ماحول میں داخل نہیں جو نماز نہ پڑھتا ہو ۔ اسی طرح سنیما کا پاس ہونا بھی اس شخص کے ماحول میں شمار نہ ہوگا جو فلم نہ دیکھتا ہو ۔ بھوکے کتے کو ہرے بھرے گھاس کے کھیتوں سے کیا تشفی ہو سکتی ہے، یا گائے سے مچھلیوں سے بھرپور تالاب کو ۔ گرد و نواح کا اثر اگر شخصیت پر ہے تو اسے ماحول سمجھنا چاہیے ۔ وگرنہ نہیں ۔ اسی لیے ماحول اور مؤثر ماحول کی تمیز لازمی ہے ۔ بعض لوگ یہ تمیز بھلا دیتے ہیں اور عجیب قسم کی اغلاط میں پھنس جاتے ہیں ۔ وہ حیران ہوتے ہیں کہ گھر کے تمام بچے ایک جیسے مؤدب، فرماں بردار اور فرض شناس کیوں نہیں نکلتے جب کہ ماں باپ بھی ایک ہیں اور گھر بھی ایک ۔ وہ ماحول کو طبعی اور سوشل عوامل کا مجموعہ سمجھ لیتے ہیں حالانکہ گھر ہر بچے کے لیے ماحول تو ضرور ہے لیکن مؤثر ماحول نہیں ۔ بچہ اپنی سمجھ کے مطابق ماحول سے متأثر ہوتا ہے چونکہ اس کی سمجھ اپنی ہے اس کا مؤثر ماحول بھی اپنا ہوگا ۔

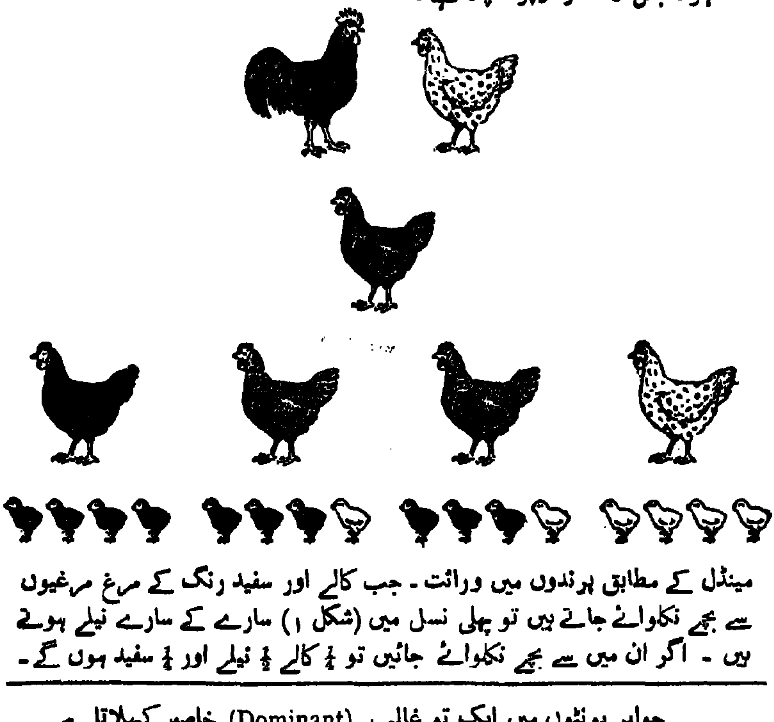
انفرادی اختلافات کو مٹانے کے لیے مؤثر ماحول میں تبدیلی چاہیے ۔ جماعت میں مختلف قسم کے لڑکے موجود ہیں کسی کی استعداد کچھ اور کسی کی کچھ ۔ ہر بچہ اپنی استعداد کے مطابق ترقی کرے گا ۔ لیکن اگر استاد کی خواہش ہو کہ سال کے بعد تمام بچوں کا علم ایک جیسا ہو تو وہ کمزور بچوں پر زیادہ محنت کرے گا اور ذہین بچوں کو چھوڑ دے گا یعنی وہ بچوں کو یکساں مواقع نہیں دے گا بلکہ کسی کو زیادہ کسی کو کم ۔ جو بچے کمزور ہوں گے وہ ترقی کریں گے ؛ البتہ ذہین بچے زیادہ فائدہ نہ اٹھا سکیں گے ، آزادانہ نظم و نسق میں انفرادیت نشو و نما پاتی ہے ۔ فوجی نظام میں یکسانیت ہے ، لیکن یہ یکسانیت بڑی خطرناک ہوتی ہے ، کیوں کہ اس کے نتائج بڑے مضر

ہوتے ہیں ۔ گھر میں ایک بچہ فرماں بردار اور دوسرا سرکش ہو
دوسرے کو ڈانٹ ڈپٹ سے یا مار کر مؤدب بنا دیا جاتا ہے ۔ دو
بچوں کا کردار اب ایک جیسا ہوگا ، لیکن جس بچے کی سرکشی کو
ڈپٹ سے دبا دیا گیا ہو اس کا مستقبل یقیناً روشن نہ رہے گا ، طرح
کی ذہنی الجھنیں اسے پریشان رکھیں گی ، وہ خود اعتمادی کھو بیٹھے
احساس کمتری کا شکار رہے گا ، اور سماج کے خلاف بغاوت کی دبی
آرزوئیں اپنے اندر پائے گا ۔ ہو سکتا ہے کہ وہ جرائم کا پیشہ اختیار
لے یا عقل و ہوش سے ہاتھ دھو کر ذہنی ہسپتال کا مکین بن جائے ۔
پس ماحول کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ اس کے اثرات ؛
دور رس ہیں۔ لیکن ورثہ بھی ضروری عنصر ہے۔ اب ورثہ پر بحث ش
ہوتی ہے ۔

ورثہ (Heredity)

گریگر مینڈل (Gregor Mendel)) کا نام اس ضمن میں خاص
پر قابل ذکر ہے ۔ اسی کے ایک مضمون سے ، جس کا پتہ اس
موت کے بعد لگا ، یہ معلوم ہوا کہ جرثومہ حیات (rm Plasm
کی ورثہ میں کیا حیثیت ہے ۔ اس نے مٹروں پر بھی تجربات
اور جانوروں پر بھی ۔ جانوروں پر تجربہ یوں ہوا کہ اس
کالے مرغ اور سفید مرغی سے بچے نکلوائے ۔ یہ سارے کے سار
نیلے رنگ کے تھے ۔ ان نیلے رنگ کے مرغ اور مرغیوں سے
نکلوائے تو ان میں ¼ تو کالے تھے ½ نیلے اور ¼ سفید ۔ اگر ان
بچے نکلوائے جائیں تو سفید ، یا سیاہ سے سفید ، یا سیاہ بچے آئندہ نس
میں نکلتے رہیں گے ۔ نیلے رنگ والوں کے بچے متذکرہ بالا تناسب ،
پیدا ہوں گے یعنی کچھ سیاہ کچھ سفید اور کچھ نیلے ۔ مینڈل کا ک
ہے کہ سفید یا سیاہ سے ہی صرف سفید یا سیاہ بچے نکلیں گے کیوں
ہر ایک میں دو دفعہ سفید یا سیاہ رنگ کا جوہر یونٹ (erm unit

موجود ہے لیکن نیلے سے صرف نیلے بچے نہیں نکلتے کیونکہ ہر ایک میں ایک سفید ایک سیاہ جوہر یونٹ ہے ۔ اگر نیلے اور سفید یا سیاہ مرغوں مرغیوں سے بچے نکلوائیں تو سفید ، سیاہ اور نیلے بچوں کا تناسب وہی ہوگا جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے ۔



مینڈل کے مطابق پرندوں میں وراثت ۔ جب کالے اور سفید رنگ کے مرغ مرغیوں سے بچے نکلوائے جاتے ہیں تو پہلی نسل میں (شکل ۱) سارے کے سارے نیلے ہوتے ہیں ۔ اگر ان میں سے بچے نکلوائے جائیں تو ¼ کالے ½ نیلے اور ¼ سفید ہوں گے ۔

جواہر یونٹوں میں ایک تو غالب (Dominant) خاصہ کہلاتا ہے اور دوسرا رجعی (Recessive) ۔ دو نسلوں کی جسمانی ساخت میں صرف غالب خاصہ ہی نظر آتا ہے اگر مٹیالے اور سفید رنگ کے چوہوں سے بچے نکلوائیں جائیں تو یہ سارے کے سارے مٹیالے ہوں گے ، دوسری نسل میں سفید ¼ ہوں گے اور مٹیالے ¾ ۔ اگر سیاہ غالب ہو اور سفید رجعی ہو تو بچے سیاہ نکلیں گے ، اور اگر سفید غالب ہو اور سیاہ رجعی

تو بچے سفید ہوں گے -
ان تجربات سے مینڈل یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ دو نسلے کے حیاتی جواہر (Germ cells) میں وراثت مقرر کرنے والے خاصے الگ الگ رہتے ہیں اور دوسری نسل میں اپنی خاصیت کے بچے پیدا کرتے ہیں - اسے وہ قانون علیحدگی (Law of Segregation) کا نام دیتا ہے -

اوپر والی مثال میں صرف دو رنگ تھے ، جن کی وراثت کا سوال در پیش تھا - لیکن جانوروں اور پودوں میں کئی خصائص ہوتے ہیں ، جو نسل بہ نسل منتقل ہوتے رہتے ہیں - کیا ان کے متعلق بھی کوئی اصول ہے؟ مینڈل نے پھلوں کی مکھی پر تجربات کیے - اس نے دو مکھیاں لیں : ایک سفید آنکھ اور پیلے پروں والی ، اور دوسری سرخ آنکھ اور مٹیالے پروں والی مکھی تھی ، ان کو ملا کر مکھیاں پیدا کیں ، اور دیکھا کہ ان کی آنکھ کا رنگ پروں کے رنگ کے ساتھ نہیں ملتا ، بلکہ جن چار طریقوں سے آنکھوں اور پروں کے رنگ مل سکتے ہیں ، ان میں سے کوئی ایک ، اس مکھی یا آس مکھی میں موجود تھا - یعنی سفید پیلا ، سفید مٹیالا ، سرخ مٹیالا اور سرخ پیلا ، ان رنگوں میں سے کوئی سا رنگ کسی مکھی میں پایا جا سکتا ہے - اس تجربے سے مینڈل کو اصول ترتیب (Law of Assertment) ملتا ہے ، جس کی رو سے علیحدہ علیحدہ خصائص ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہ سکتے ہیں -

مینڈل کے دونوں اصول اپنی اپنی جگہ پر نہایت اہم ہیں ، لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ پودوں ، جانوروں اور انسانوں میں خصائص بتدریج بدلتے ہیں - یہ نہیں ہوتا کہ یا تو کوئی کالا ہے یا سفید ، بلکہ کالے اور سفید رنگ کے درمیان مختلف قسم کے لوگ موجود ہیں ، جن میں کالا اور سفید رنگ مختلف مقدار میں موجود ہوتا ہے - اسی طرح سے ۱ : ۲ : ۱ کا تناسب ، جو قانون علیحدگی سے ملا تھا ، وہ بھی جانداروں میں نہیں پایا جاتا - کیا مینڈل کے اصول یہاں غلط ہو جاتے ہیں ؟

اس سوال کا جواب تجربی طریقے سے یوں حاصل ہوا کہ بھوسے کا رنگ خاکی ہوتا ہے ، لیکن ہر قسم کا بھوسہ ایک ہی طرح کا خاکی نہیں ہوگا ، کوئی زیادہ خاکی ہوتا ہے اور کوئی کم - نلسن اور اہلی (Nilssen-Ehle) نے دریافت کیا کہ خاکی رنگ کو متعین کرنے والے دو خود مختار خاصے ہیں ، ان کو اگر B اور B' اور ان کی عدم موجودگی کو *b* اور *b'* کہا جائے ، تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ والدینی جوہر میں ان عناصر کی موجودگی یا عدم موجودگی کیا نتائج پیدا کرتی ہے - نلسن اور اہلی نے دریافت کیا کہ ممکن صورتیں ۱۶ ہو سکتی ہیں ، اور خاکی رنگ کی چار تدریجی کیفیتیں BBB'B' (یعنی بہت خاکی) سے *bbb'b'* (سفید) تک ملتی ہیں ، جس نسبت سے یہ کیفیتیں بار بار اپنے آپ کو دہراتی ہیں ، ان کا حساب بھی ریاضی طریقے سے ہو سکتا ہے - مندرجہ ذیل صورت ملاحظہ ہو :

مختلف والدین سے	ایک ہی والدین سے			
	BB'	B*b'*	*b*B'	*bb'*
BB'	BB' BB' (۴)	B*b'* BB' (۳)	*b*B' BB' (۳)	*bb'* BB' (۲)
B*b'*	BB' B*b'* (۳)	B*b'* B*b'* (۲)	*b*B' B*b'* (۲)	*bb'* B*b'* (۱)
*b*B'	BB' *b*B' (۳)	B*b'* *b*B' (۲)	*b*B' *b*B' (۲)	*bb'* *b*B' (۱)
bb'	BB' *bb'* (۲)	B*b'* *bb'* (۱)	*b*B' *bb'* (۱)	*bb'* *bb'* (۰)

اس شکل سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود مختار مماثل خاصے کے (بھوسی کے خاکی رنگ کے سلسلے میں) کتنے اتصال (Combination) ممکن ہیں -

B اور B' خود مختار عناصر ہیں -

b اور *b'* ان کے عدم کو ظاہر کرتے ہیں یا ان کے مخالف عناصر کو - خطوط وحدانی میں ہندسے ظاہر کرتے ہیں کہ ایک مربع میں

کتنے اتصال ہوں گے -

چونکہ عضویہ کے خصائص کو متعین کرنے والے خصائص کئی ہوتے ہیں ، اور ان خصائص کی طاقتیں بھی مختلف ہوتی ہیں ، اس لیے مینڈل کے اصول تدریجی کیفیتوں کی صورت میں بھی ٹھیک بیٹھتے ہیں - ماہر نفسیات کے لیے یہ نتائج بڑے کارآمد ہیں - نفسی کیفیات بھی بتدریج گھٹتی بڑھتی ہیں - ذہانت ہی کو لیجیے - مختلف افراد میں اس کی مقدار مختلف ہے - ۳۸۸ انگریز والدین اور ان کے ۸۱۲ بچوں کا ذہانتی شمار (Intelligence Score) لیا گیا ، اور اس کی تشریح مندرجہ بالا اصول سے کی گئی - ایک غالب اور پانچ ترمیمی خاصے فرض کیے گئے ، اور ان کے امتزاج اور تفاعل سے جو مختلف اشکال پیدا ہوئے ، ان کا شمار ریاضی طریقہ سے کیا گیا -

خلیے (Cells)، اجسام لونیہ (Chromosomes) اور جواہر تخلیق (Genes)

آئیے ایک اور طریقے سے وراثت کا مطالعہ کریں - نباتات اور حیوانات کی زندگی کا آغاز ایک خلیہ سے ہوتا ہے - انسان کی ابتدا ایک ننھے سے انڈے سے ہوتی ہے ، جس کا قطر $\frac{۱}{۲۰۰}$ انچ ہوتا ہے - اس انڈے کی پیدائش ماں اور باپ کے ملنے پر منحصر ہے - ماں کے رحم میں انڈا پھلتا پھولتا ہے - ایک خلیے سے دو بنتے ہیں ، دو سے چار ، چار سے آٹھ ، آٹھ سے سولہ و علیٰ ہذا القیاس ان خلیوں کی تعداد لاکھوں اور کڑوروں تک پہنچ جاتی ہے - اگرچہ یہ سب کے سب خلیے ایک ہی خلیے سے بنتے ہیں ، لیکن ان کی نشو و نما ایک جیسی نہیں ہوتی- بعض عضلات کے خلیے ، کوئی غدودوں کے خلیے اور کوئی اعصاب کے خلیے بن جاتے ہیں -

ہر خلیہ کا ایک مرکزی حصہ (Nucleus) ہوتا ہے ، جس کا کام خلیے کے باقی حصوں سے بالکل مختلف ہے مثلاً عضلاتی خلیوں کا کام سکڑنا ، غدودوں کا رطوبت نکالنا اور اعصاب کا ترسیل ہے ، لیکن

مرکزی حصے کا تفاعل نشو و نما میں پیش قدمی کرنا اور خلیوں کی زندگی اور طاقت کو بحال رکھنا ہے۔ ایک مرکزی حصے سے دو بنتے ہیں، اور ان سے دو خلیے وجود میں آتے ہیں، یہی ڈرامہ باقی خلیوں میں دھرایا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جسم کے ہر خلیے میں مرکزی حصہ موجود ہوگا۔ چونکہ مرکزی حصے کا تعلق ماں باپ سے ہے۔ ہر خلیہ کسی نہ کسی شکل میں وارثت کا ضامن ہوگا۔ پس

۱۔ بچے کی وراثت اس کے ماں باپ سے آتی ہے۔

۲۔ حمل کے ساتھ ہی وراثت متعین ہو جاتی ہے، بعد میں وراثت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

۳۔ ہر خلیے میں وراثت موجود ہے، لہٰذا تمام عضویہ اس سے متأثر ہوگا۔

اجسام لونیہ (Chromosomes) :

ہر خلیہ میں ڈانڈوں جیسی شے پائی جاتی ہے۔ کسی کے ڈانڈے لمبے ہوتے ہیں، کسی کے چھوٹے۔ کوئی ڈانڈے سیدھے ہوتے ہیں اور کوئی ٹیڑھے۔ لیکن ہر خلیے میں ان کی تعداد ایک ہی ہے یعنی ۴۸۔ ہر نوع (Species) میں بھی ان کی تعداد ایک ہی رہے گی، لیکن مختلف انواع میں تعداد مختلف بھی ہو سکتی ہے۔ بعض جانوروں اور پودوں میں ان اجسام کی تعداد ۴۸ سے کم ہے۔

انسانی ۴۸ اجسام لونیہ میں سے ۲۴ ماں کی طرف سے آتے ہیں اور ۲۴ باپ کی طرف سے۔ اسی نسبت سے یہ اجسام لونیہ ہر خلیہ میں موجود ہیں۔ حمل کے وقت ۲۴ اجسام لونیہ ماں کے رحم میں ہوں گے اور ۲۴ باپ کی طرف سے آئیں گے۔ بچے کی وراثت میں آدھا دخل ماں کو ہے اور آدھا دخل باپ کو۔

ہر سادہ لونیہ میں جواہر تخلیق ہوتے ہیں، انہیں خورد بین سے دیکھا جا سکتا ہے۔ شکل میں یہ تسبیح کے دانوں کی مانند ہیں۔

انسانی عضویہ میں ان کی تعداد ہزار کے لگ بھگ ہوگی ۔ ہر مادہ لونیہ میں ان کی تعداد یکساں نہیں ۔ یہ بھی مادہ لونیہ کی طرح جوڑے کی صورت میں آتے ہیں ۔ ایک باپ سے اور ایک ماں سے ۔

ماں باپ کے جوہر تخلیق اکثر مشابہہ ہوتے ہیں مثلاً پنجابی ماں باپ کی آنکھوں کی رنگت ایک جیسی ہے ۔ لیکن اگر والدین میں سے ایک کی آنکھیں کالی ہوں اور دوسرے کی نیلی تو بچے کی آنکھیں مینڈل کے اصول کے مطابق کئی رنگ اختیار کر سکتی ہیں ، جو کالے اور نیلے کے درمیان ہوں اگر کوئی نسل خالص ہو تو اس میں اپنے خصائص پائے جائیں گے ، اگر آنکھیں کالی ہیں تو سب کی آنکھیں کالی ہوں گی ، اگر نیلی ہیں تو سب کی نیلی ہوں گی ۔ اگر ان خالص نسلوں کے بچے آپس میں شادیاں کر لیں تو آنکھوں کی رنگت مختلف صورتیں اختیار کرے گی ۔ آج کل کی دنیا میں خالص نسل تو شاید ہی کوئی ہوگی، ہر نسل میں ایک دوسرے کا خون موجود ہے ۔ ایک نسل کے جواہر تخلیق دوسری میں پائے جاتے ہیں ، لہٰذا ہر شخص دوسرے سے مختلف ہے ۔ یہ اختلاف جسم کی ساخت ، چال ڈھال ، رنگ ، افراد کی مختلف صلاحیتوں اور استعداد میں بھی دیکھا جا سکتا ہے ۔

چونکہ ہر بچہ اپنا ورثہ ماں باپ سے لیتا ہے اس لیے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہر بچہ اپنے ماں باپ جیسا ہوگا لیکن ایسا ہوتا نہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وراثت کا دار و مدار جواہر تخلیق پر ہے ، اور ان کی ترتیب پر ۔ یہ سچ ہے کہ ہر بچہ اپنے والدین سے جواہر تخلیق لے گا لیکن کس ترتیب میں وہ لیتا ہے اس کا علم کسی کو نہیں ۔ بھائی بہن ایک ہی والدین سے جنم لیتے ہیں لیکن ان کا جسم بھی ایک جیسا نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کی صلاحیتیں اور قابلیتیں ایک جیسی ہوتی ہے ۔ ایک بچہ مصور یا بت تراش ہے تو دوسرا کھلاڑی ہے چونکہ بھائی بہنوں میں جواہر تخلیق کی ترتیب مختلف ہے اس لیے بچوں میں انفرادیت ہوگی ۔

لہٰذا وراثت کے معاملے میں پیشین گوئی کبھی یقینی نہیں ہو سکتی۔ عام طور پر لمبے قد والے والدین کے بچے لمبے قد کے ہوں گے۔ لیکن قد کی لمبائی کسی ایک جوہر پر منحصر نہیں بلکہ بہت سے جواہر پر منحصر ہے۔ اب یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ یہ جواہر کس ترتیب میں کس بچے میں آئیں گے۔ اگر ماں باپ میں سے ایک لمبا ہو اور دوسرا پست قد تو ممکن ہے بچہ لمبا ہو یا پست قد رہ جائے یا درمیانے قد والا ہو یا اس کا دھڑ لمبا ہو اور ٹانگیں چھوٹی، یا ٹانگیں لمبی ہوں اور دھڑ چھوٹا۔ لمبائی اور پستی کے بے شمار تدریجی منازل ہیں ان میں سے بچہ کسی بھی مقام پر ہو سکتا ہے۔ ورثہ کے علاوہ ماحول بھی قد پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اچھی خوراک، تازہ ہوا اور ورزش قد کے لیے مفید ہوگی۔ بری یا تھوڑی خوراک، گندی ہوا اور کاہلی قد کو گھٹائے گی۔ امریکیوں کے قد خوراک، ہوا، ورزش اور ذہنی اطمینان سے بڑھ گئے ہیں۔

اکتسابی خصائص ورثہ میں نہیں ملتے۔ ماں باپ اپنی زندگی میں کئی چیزیں سیکھتے ہیں لیکن یہ چیزیں بچوں کو ورثہ میں نہیں ملتیں۔ زمانہ گزشتہ میں بعض ماہرین حیاتیات خاص طور پر لا مارک (Lamarck) کا خیال تھا کہ اکتسابی خصائص ورثہ میں منتقل ہو جاتے ہیں لیکن اس امر کی قطعی شہادت موجود نہیں، لہٰذا ماہروں نے اس مفروضہ کو چھوڑ دیا ہے۔ چند ایک بیماریوں کے متعلق بھی یہ خیال تھا خصوصاً دق اور سوزاک کے متعلق کہ یہ نسل بہ نسل چلتی ہیں لیکن یہ نظریہ بھی ترک کر دیا گیا ہے۔ جن بیماریوں کے متعلق خیال ہے کہ وہ ورثہ میں ملتی ہیں ان کا اصل سرچشمہ ماحول ہے مثلاً اگر بچہ مدقوق والدین کے ہاں پرورش پائے گا تو ماحول سے دق کے جرم لے لے گا۔ یہی حال دیگر اکتسابی خصائص کا ہے۔ انہیں ماحول سے لیا جاتا ہے نہ کہ ورثہ سے۔ جن فوجیوں کی ٹانگیں یا بازو کٹ جاتے ہیں ان کے بچے ایک بازو یا ایک ٹانگ والے پیدا نہیں

ہوتے۔ انگریزی میں محاورہ ہے کہ لکڑی کی ٹانگیں نسل بہ نسل نہیں چلتیں گو لکڑی کے دماغ چلتے ہیں -

(Wooden legs do not run in families even though wooden heads may)

ادیب کا بچہ الف ب اور حساب دان کا بچہ ۲ جمع ۲ چار ہوتے ہیں ضرور سیکھے گا۔

ویسمین (Weismann) کا کہنا ہے کہ دو قسم کے جواہر تخلیق میں تمیز کرنی چاہیے - ایک قسم تو وہ ہے جو افزائش نسل کا باعث بنتے ہیں اور دوسری وہ جو جسم (Soma) کی تعمیر میں کام آتے ہیں۔ جیسا کہ ذکر آچکا ہے بیضہ، جہاں سے انسان کی ابتدا ہوتی ہے، خلیے پیدا کرتا ہے اور یہ خلیے مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض خلیے عضلات، بعض اعصاب، بعض حصوں کی تعمیر میں کام آتے ہیں۔ ویسمین کے خیال میں صرف پہلی قسم کے جواہر تخلیق اپنے خواص قائم رکھتے اور افزائش نسل کا باعث بنتے ہیں۔ یہی جواہر دوسری نسل میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ دوسری قسم کے جواہر جو جسم کی تعمیر میں کام آتے ہیں ایک نسل سے دوسری نسل میں نہیں پہنچتے۔ جوں جوں آپ بڑھتے ہیں اور قسم قسم کے تجربات حاصل کرتے ہیں آپ کا جسم مختلف مہارتیں سیکھتا ہے۔ ہاتھ زیادہ مضبوط ہو جاتے ہیں اور زیادہ نازک کام کرتے ہیں۔ آنکھیں اور کان زیادہ تیز ہو جاتے ہیں۔ ٹانگیں زیادہ دوڑ سکتی ہیں، جسم زیادہ قلابازیاں لگا سکتا ہے۔ دماغ بھی زیادہ تیز، دور رس اور دور فہم ہو جاتا ہے۔ یعنی تجربے اور عمر سے جسم بھی بڑھتا ہے اور دماغ بھی۔ پیانو سیکھتے ہیں، نظمیں یاد کرتے ہیں، نازک انجنوں کو ٹھیک کر سکتے ہیں۔ فلسفہ پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، ہوائی جہاز، ایٹم بم، سمندر دوز کشتیاں بناتے ہیں، ان کے لیے جسم میں نئے خلیے تیار ہوتے ہیں یا پرانے خلیوں سے نیا کام لیا جاتا ہے لیکن یہ خلیے ایک نسل سے دوسری نسل

میں منتقل نہیں ہوتے ۔ لہٰذا ہر فرد کو ہر وہ ہنر جو اس کے والدین نے سیکھ رکھا تھا از سر نو سیکھنا پڑتا ہے ۔ جسمانی جواہر ہر فرد کی ذاتی ملکیت نہیں ۔ فرد تو ایک امانت کو لیے ہوئے ہے جسے وہ اپنے بچوں میں منتقل کر دیتا ہے ۔ وہ بچے اپنے بچوں میں منتقل کریں گے اور وہ اپنے بچوں میں وعلیٰ ھذالقیاس جب باپ اور بیٹے میں ایک سے خصائص ہوں یعنی دونوں اول درجے کے گوبے ہوں ، یا ایک جیسی چال چلیں یا مزاج ایک جیسا رکھیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ باپ کے اکتسابی خصائص بچے میں پہنچ گئے بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ دونوں باپ بیٹا ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں ۔ یا یہ کہ ایک ہی ماحول میں رہ رہے ہیں ۔

انسانوں پر ماحول اور ورثے کے سلسلے میں تجربات :

تجربہ کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ تغیر پذیر حالت کے علاوہ باقی سب عوامل اور عناصر کو مستقل رکھا جائے کیوں کہ اگر باقی عوامل بھی بدلتے رہیں تو کسی نتیجہ پر نہیں پہنچا جا سکتا ۔ پس ماحول کا اثر دیکھنا ہو تو ماحول کو مستقل رہنا چاہیے ۔

فرض کیا کہ ہمیں ورثہ کا اثر دیکھنا ہے ۔ اس تحقیق میں ماحول کو نہیں بدلنا چاہیے ۔ ایسا ماحول جو نہ بدلے وہ ہمیں گھروں میں دستیاب ہو سکتا ہے اور ایسے گھروں میں جہاں بچوں کے والدین ایک ہی ہوں ۔ بچے کئی قسم کے ہوتے ہیں ۔ بعض تو صرف بھائی بہن ہوتے ہیں اور والدین کے ہاں مختلف وقتوں میں جنم لیتے ہیں ۔ بعض بچے ایک ہی بیضہ سے بیک وقت جنم پاتے ہیں اور متماثل توام (Identical Twins) کہلاتے ہیں ، بعض بچے پیدا تو ایک وقت ہوتے ہیں لیکن ان کی پیدائش دو مختلف بیضوں سے ہوتی ہے انہیں اخوی توام (Fraternal Twins) کہا جاتا ہے ۔

متماثل اور اخوی توام پر شکاگو (Chicago) کی یونیورسٹی میں تجربات ہوئے ، اور ان کی مماثلت کو ناپا گیا ۔ نتائج حسب ذیل ہیں :

خصائص	اخوی توام	متماثل توام
قد کی لمبائی	۶۵/-	۹۳/-
وزن	۶۳/-	۹۲/-
سر کی لمبائی	۵۸/-	۹۱/-
متغیر ہدف کا تعاقب	۵۱/-	۹۵/-
زین (ڈرل) لپیٹنے میں پھرتی	۵۶/-	۸۲/-
تاش تقسیم کرنے میں پھرتی	۳۹/-	۸۵/-
چرخی پر ڈور لپیٹنے میں پھرتی	۴۴/-	۷۱/-
ذہانتی حاصل قسمت I. Q	۶۳/-	۸۸/-
الفاظ کے مطالب	۵۶/-	۸۶/-
تعلیمی عمر ۔ سکول کے امتحانات	۷۰/-	۸۹/-
شخصیت کا سوالنامہ	۳۷/-	۵۶/-

ایک اور تجربہ روزناف (Rosanoff) اور اس کے ساتھیوں نے لاس اینجلیز (Los Angles) میں کیا ۔ انہوں نے متماثل اور اخوی توام لیے اور ان کی ذہنی بیماریوں میں مماثلت ڈھونڈی ۔ نتائج حسب ذیل ہیں :

	منگولی ہونا	مرگی	بالغ مجرم	طفلانہ خطاکاری	ہسٹیریا	انفصامی ذہنی	جنونی افسردگی	ذہنی کم عقلی
متماثل	۸/۸	۱۴/۲۳	۲۵/۳۷	۳۹/۴۲	۴۱/۴۷	۲۸/۴۱	۱۶/۲۳	۱۱۵/۱۶۲
اخوی	۰/۱۳	۷/۳۹	۵/۲۸	۲۰/۲۵	۲۶/۶۰	۱۰/۵۳	۸/۳۵	۶۲/۱۰۱

یہ دونوں تجربات ورثہ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہیں ۔ یہ تجربات اس مفروضہ پر مبنی ہیں کہ ماحول کو مستقل رکھا گیا ہے ۔ بعض ماہرین نفسیات اس مفروضہ کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ۔ وہ

کہتے ہیں کہ اس تجربہ میں اخوی توام کو بہ نسبت متماثل توام کے ایک جیسا ماحول ملتا ہے۔ متماثل توام چھٹیوں میں ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں، ان کے دوست مختلف ہوتے ہیں، ان کے استاد بھی ایک نہیں ہوتے، ان کی کھیلوں میں، پڑھائی میں، خوراک میں اور دیگر مصروفیات میں دلچسپیاں بھی یکساں نہیں ہوتیں۔

اب دوسری طرف آئیے۔ ورثہ کو مختلف رکھنا ہے تاکہ ماحول کا اثر معلوم نہ ہو۔ جنگ کے دنوں میں کئی توام بچھڑ گئے، کوئی انگلینڈ پہنچ گیا کوئی کینیڈا، کوئی اپنے گھر رہ گیا کوئی دوسرے ملک جا بسا۔ ان بچوں کی وراثت ایک تھی لیکن ماحول الگ الگ۔ مثلاً ایلس (Elice) تو لندن کے ایک غریب گھرانے میں جا پہنچی اور اس کی توام آلو (Olwe) کینیڈا میں ایک کھاتے پیتے گھر میں، یا ایلینور (Eleanore) تو جاہل خاندان میں پہنچی اور اس کی توام بہن جارجینا (Georginia) پڑھے لکھے گھر میں۔ اسی طرح ریمانڈ (Raymond) تو ڈاکٹر کے گھر پہنچا اور اس کا توام بھائی رچرڈ ایک ٹیکسی ڈرائیور کے ہاں، ان بچوں کے ماحول میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ لیکن جب انہیں اکٹھا کیا گیا تو اس فرق کے باوجود ان میں مماثلت بھی خوب تھی۔ ان کے جذبات، رویے، دلچسپیاں، ذہنی قابلیتیں اور بیماریاں بہت حد تک ملتی جلتی تھیں۔ انہیں ناپا گیا اور نتائج حسب ذیل ہیں:

خصائص	بچھڑے ہوئے متماثل توام	غیر بچھڑے ہوئے متماثل توام	غیر بچھڑے ہوئے اخوی توام
قد کی لمبائی	۹۷/-	۹۸/-	۹۳/-
وزن	۸۹/-	۹۷/-	۹۰/-
سر کی لمبائی	۹۲/-	۹۱/-	٦۹/-
ذہانتی حاصل قسمت I.Q	٦۷/-	۹۱/-	٦۳/-
تعلیمی عمر	۵۱/-	۹٦/-	۸۸/-
شخصیت	۵۸/-	۵٦/-	۳۷/-

ان نتائج سے پتہ چلتا ہے کہ جہاں تک قد ، وزن اور سر کی لمبائی کا تعلق ہے بچھڑے ہوئے متماثل توام اور غیر بچھڑے ہوئے متماثل اور اخوی توام میں کوئی چنداں فرق نہیں ۔ البتہ ان کی ذہانت اور تعلیمی عمر میں بڑا تفاوت ہے ۔ قد ، سر کی لمبائی اور وزن ، ورثہ میں آتے ہیں ۔ ماحول اگر بہت زیادہ غیر معمولی نہ ہو تو انسان کا ڈھانچہ قدرتی لمبائی اور چوڑائی حاصل کر لیتا ہے ، لیکن تعلیمی معیار کا انحصار سراسر ماحول پر ہے ۔ لہٰذا جب ماحول سازگار نہ ہو ، جہالت اور لاعلمی گھر میں پھیلی ہوئی ہو یا جہاں سکول دقیانوسی طریقہ پر چل رہا ہو ، اساتذہ مار پیٹ میں اعتقاد رکھتے ہوں وہاں تعلیمی معیار اگر پست نہ ہو تو اور کیا ہوگا ۔

یہی نتائج ہمیں رضاعی بچوں (Foster children) کے تجربات سے حاصل ہوتے ہیں ۔ ان تجربات میں یہ احتیاط برتی گئی کہ بچے ایک جیسے ورثہ کے ہوں ان کے ماحول البتہ مختلف ہونے چاہییں ۔ مثال کے طور پر ایک تو رضاعی بچے ہوں گے اور دوسرے گھر والوں کے اپنے بچے ۔ منوسوٹا (Minnesota) کی یونیورسٹی میں تجربہ کنندوں نے بچوں کو کچھ اس انداز سے لیا کہ ذہانتی خصائص کی بنا پر انہیں ترتیب دی جا سکتی تھی ۔ یہ خصائص بتدریج گھٹتے بڑھتے تھے ۔ فرض کیا کہ بچوں کے نام امتیاز ، شمیم ، مرتضیٰ ، مقبول ، عرفان اور افتخار ہیں ۔ اور جس لحاظ سے ان کے نام آئے ہیں اسی لحاظ سے ان کی ذہانت گھٹتی ہے ۔ یعنی امتیاز اول نمبر پر ہے اور افتخار آخر نمبر پر ۔ باقی بچے ذہانت کے لحاظ سے اپنے اپنے مقام پر ہیں ۔ اب ان کے والدین ہیں ۔ ان کی ذہانت بھی اسی انداز سے گھٹ رہی ہے ۔ بچوں اور ان کے والدین کے مابین ذہانت کا متوازی ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ ضرور کوئی اہم عناصر اس کی تہہ میں کار فرما ہیں ۔ کیونکہ اتفاقیہ طور پر اگر بچوں اور والدین کو اکھٹا کر دیا جائے تو ایسی مماثلت ملنا تو در کنار ،

مماثلت صفر کے برابر ہوگی ۔

اس ریسرچ میں ۹۴ ؛ رضاعی بچے اور اتنے ہی گھروں کے اپنے بچے جو بہ لحاظ جنس ، عمر ، تعلیم اور والدین کے پیشوں کے رضاعی بچوں کے برابر تھے، لیے گئے ۔ ان بچوں کے والدین کے ذہنی خصائص بھی قریباً یکساں تھے ۔ آزمائشوں (Tests) کے بعد حسب ذیل مماثلت ملی :

بچوں کے I.Q کا رشتہ ان کے	رضاعی بچے	اپنے بچے
باپ کی ذہانت سے	۱۹ء	۵۱ء
ماں کی ذہانت سے	۲۴ء	۵۱ء
باپ کے مجموعہ الفاظ سے	۲۶ء	۴۷ء
ماں کے مجموعہ الفاظ سے	۲۴ء	۴۹ء
گھر کے ثقافتی انڈکس (Index) سے	۲۶ء	۵۱ء
بچے کے تربیتی انڈکس سے	۲۲ء	۵۲ء
مالی انڈکس سے	۱۵ء	۳۷ء
سماجی انڈکس سے	۱۳ء	۴۲ء
باپ کی تعلیم سے	۱۹ء	۴۸ء
ماں کی تعلیم سے	۲۵ء	۵۰ء
باپ کی پیشہ ورانہ حیثیت سے	۱۴ء	۴۵ء

اتفاقیہ طور پر اکٹھے کیے ہوئے بچوں اور والدین کے درمیان مماثلت صفر فی صد ہے۔ اس جدول سے پتہ چلتا ہے کہ رضاعی بچے بہ‌نسبت دوسرے بچوں کے، اپنے اتکہ والدین (Foster parents) سے زیادہ مشابہ ہیں ۔ اس مماثلت کا سبب ماحول ہے ۔ 'اپنے بچے' والدین سے رضاعی بچوں کی نسبت اور بھی زیادہ متماثل ہیں ۔ اس کی وجہ ماحول اور ورثہ دونوں ہیں ۔

ماحول اور ورثہ سے کون سی چیز زیادہ اہم ہے ؟ یہ سوال اکثر اٹھایا جاتا ہے لیکن یہ سوال اپنی موجودہ شکل میں نہایت ہی غیر معین ، غیر واضح اور مبہم ہے ، لٰہذا اس کا کوئی سائنسی جواب ممکن نہیں ۔ ہاں اگر یہ پوچھا جائے کہ فلاں نفسی خاصیت کی تہہ میں ورثہ کار فرما تھا یا ماحول ؟ تو سوال متعین ہو جاتا ہے اور جواب سائنسی

طریقے پر ممکن ہو جاتا ہے ۔ اگر سوال اور بھی واضح کر دیا جائے اور فلاں نفسی خاصیت کی بجائے اس نفسی خاصیت کا نام لے دیا جائے تو جواب اور بھی سہل ہو جائے گا ۔ مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ فطانت (Genius) کم عقلی ، اوسط درجہ کی ذہانت ، پاگل پن ، حرکی (Motor) قابلیتوں اور ہیجانی ، طبیعی کوائف میں ورثہ کا پلہ بھاری نظر آتا ہے ۔ اس کے علاوہ طبعی ساخت ، عام ذہانت اور حسی صلاحیتیں بھی ورثہ کی مرہون منت ہیں لیکن روزمرہ کے احوال و اطوار ، رویوں ، اعتقادات اور افکار میں ورثہ کی بجائے ماحول کا ہاتھ ہے ۔ ہمارا علم ، پسند یا ناپسند اور مہارتیں بالکل اکتسابی ہیں ۔ لیکن یاد رکھیے کہ انسانی زندگی کے ہر اکتسابی فعل میں ورثہ کسی حد تک شامل ہوگا اور ہر وراثتی فعل میں ماحول کو دخل ہوگا ۔ پس یہ کہنا کہ فلاں فعل میں ورثہ کی کیا مقدار ہے یا ماحول کے فی صد ہے ایک بے کار سا مشغلہ ہے ۔ ہم سائنسی رو سے صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس فعل میں ورثہ اور ماحول سے کون سا عنصر زیادہ غالب ہے ۔ دو اصول پیش نظر رکھنے چاہییں :

۱۔ جس حد تک کسی خاصیت کا انحصار جسم کے ڈھانچے پر ہوگا اسی حد تک اس خاصیت کو ارثی سمجھنا چاہیے اور جس حد تک کسی خاصیت کا انحصار تعلیم و تربیت پر ہوگا اس حد تک اسے اکتسابی سمجھنا چاہیے ۔

۲۔ جس حد تک ذوقی خاصیت عضویہ کا عام وصف ہوگا اسی حد تک وہ ارثی ہوگی اور جس حد تک اس کا تعلق علم ، پسند یا ناپسند اور خاص مہارتوں اور ہنروں سے ہوگا اسی حد تک وہ ماحول کی رہین منت ہوگی ۔

چونکہ تمام اطوار و افعال میں ورثہ اور ماحول کا ہاتھ ہے ، کسی میں کسی کا زیادہ کسی میں کسی کا کم ، لہٰذا بجائے اس استفسار

کے کہ کوئی فعل ورثہ کی بدولت ہے یا ماحول کے اثر کا نتیجہ ، ہمارا استفسار یہ ہونا چاہیے کہ یہ فعل کیسے شروع ہوا اس نے کون کون سے ارتقائی منازل طے کیے اور اب اس کی موجودہ صورت کیا ہے ؟ یعنی ورثہ اور ماحول کے سوال کو چھوڑ کر ہمارا سوال افعال کی ابتدا، ان کی ترقی اور انتہا سے متعلق ہونا چاہیے ۔

کئی دفعہ ماحول اور ورثہ کے حامیوں میں اس امر پر لڑائی ہوئی کہ سوسائٹی کی اصلاح کے لیے ماحول سنوارنا چاہیے یا ورثہ ۔ ماحول کے حامیوں کا دعویٰ ہے کہ ورثہ تو طے شدہ امر ہے اس میں رد و بدل ممکن نہیں ۔ البتہ آپ اچھے سکول بنا سکتے ہیں گھروں میں جمہوری نظام رائج کر سکتے ہیں ۔ حکومتوں کو انسانی بہبود کے اصول پر چلا سکتے ہیں ۔ رہنے سہنے کا معیار اونچا کر سکتے ، وغیرہ وغیرہ ۔ یہ محنتیں بار آور ہوں گی ۔ ماحول کو بہتر بنانے سے عمدہ خصلتیں اور ترقی پسندانہ خیالات جنم لیتے ہیں اور سوسائٹی ترقی کرتی ہے ۔ ورثہ کے حامی کہتے ہیں کہ ورثہ کو بھی بہتر بنایا جا سکتا ہے جب نوجوان بچوں اور بچیوں کی شادیوں کا سوال درپیش ہو تو جسمانی اور ذہنی لحاظ سے تندرست اور صحیح سالم بچوں کی شادیاں روا رکھی جائیں ۔ برادری ، ذات پات اور حسب نسب کا سوال نہیں اٹھانا چاہیے ، مالی حالت بھی اتنی اہم نہیں جتنی لوگ خیال کرتے ہیں ۔ ایسے گھروں کے بچے جہاں میاں بیوی سکون اور چین سے زندگی بسر کرتے ہوں ، بہتر ورثہ پاتے ہیں بہ نسبت ان گھروں کے جہاں ہر روز لڑائیاں ہوتی ہوں ۔

لہٰذا ماحول کو بھی بہتر بنانا چاہیے اور ورثہ کو بھی ۔ دونوں کی بہتری سے ہی نوع انسانی کی اصلاح ہو سکتی ہے ۔

پانچواں باب

انسانی نشو و نما

(How an Individual Develops)

گزشتہ باب میں اس امر کا ذکر آ چکا ہے کہ کسی فعل کے متعلق یہ سوال کہ آیا اس کا وجود ورثہ پر منحصر ہے یا ماحول پر ، ایک بے کار سا سوال ہے ، کیونکہ انسانی زندگی میں شاذ ہی کوئی فعل ہوگا جس کی تہہ میں ورثہ اور ماحول دونوں کارفرما نہ ہوں ۔ لہٰذا نفسیات کے لیے زیادہ مفید کام احوال و افعال یا اطوار و کردار کا نشو و نما اور ان کے تدریجی منازل کا تعین ہوگا ۔

زندگی کا آغاز بچپنے سے ہوتا ہے ۔ پیدا ہوتے ہی کوئی انسان مرد یا عورت نہیں بن جاتا ۔ بچپن سے لے کر بڑھاپے یا موت تک بیسیوں منزلیں طے کرنی ہوتی ہیں ۔ ہر منزل کی دلچسپیاں اپنی اپنی ہیں ۔ ہر منزل کے نفسی مسائل جدا ہیں ، اور ہر منزل کی اپنی اہمیت ہے ۔ لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر سن بلوغ سے پیشتر کئی منازل ہیں اور ان کی نفسیات بھی الگ ہے تو ان منازل پر عام نفسیات میں بحث کیوں کی جائے؟ اس سوال کا آسان سا جواب تو یہ ہے کہ بالغ انسان میں جو کردار الجھا ہوا دکھائی دیتا ہے وہ بچے میں سادہ نظر آئے گا ۔ لہٰذا بچے کا مطالعہ بالغوں کے سمجھنے میں مدد دیتا ہے ۔ ذہنی خرابیوں کا مطالعہ کرتے وقت بھی ہمیں بچپن کی طرف لوٹنا پڑتا ہے ۔ جو ذہنی بیماری اب شدید صورت میں نمودار ہوئی اس کا آغاز پہلے سادہ طریقے سے ہوا ۔ پس تجزیۂ نفس اور مطالۂ احوال میں بچپن کی منزل خاص اہمیت رکھتی ہے ، اور اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ اس کے

علاوہ فرائڈ (Freud) کا خیال ہے کہ شخصیت کی بنا بچپن میں یعنی زندگی کے پہلے پانچ برسوں میں پڑ جاتی ہے ، زندگی کا باقی ماندہ حصہ اس بنیاد پر عمارت ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں پہلے پانچ سال سے بعد کی زندگی پہلے پانچ سال کے شعوری اور لاشعوری نفسی کوائف کی محض تشریح ہے ۔ اس نظریہ کے اثباتی ثبوت نہیں ملتے اور ووڈ ورتھ کو بھی اس سے شدید اختلاف ہے ، لیکن اختلاف کے باوجود اس نے بچپن کے زمانہ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا ۔ انگریزی کا مقولہ (Child is the Father of man) اسی حقیقت کو عیاں کرتا ہے ۔

بچے کو ملاحظہ کریں ، اس کا ہر عضو کمزور ہوگا اور ٹانگیں منحنی ہوں گی ، ہاتھ چھوٹے ہوں گے ، مشکل سے ٹھیک طرح پر کھڑا ہو سکے گا یا کسی چیز کو پکڑ سکے گا ۔ زندگی کے پہلے سال میں تو وہ نہایت ہی بے بس دکھائی دیتا ہے کوئی اسے لٹائے ، اٹھائے ، بٹھائے تو لیٹ ، اٹھ یا بیٹھ سکتا ہے ۔ آہستہ آہستہ اس کے اعضا مضبوطی پکڑتے ہیں اور ایک وقت آتا ہے کہ وہ خود بخود اٹھ بیٹھ یا چل سکتا ہے ۔ بچے کو اگر نہ بھی سکھایا جائے تو بھی اس کے اعضا کچھ عرصے بعد اس قابل ہو جاتے ہیں کہ بعض افعال سر انجام دے سکیں ۔ اسے پختگی (Maturation) کہا جاتا ہے ۔ لیکن ظاہر ہے کہ زندگی میں صرف پختگی ہی کافی نہیں ۔ کوئی بچہ محض پختگی سے ڈانس نہیں کر سکے گا ، مشین نہیں چلا سکے گا، کتابیں نہیں پڑھ سکے گا وغیرہ وغیرہ ۔ بلکہ اس کے لیے آموزش (Learning) بھی درکار ہے ۔

انسانی نشو و نما میں جہاں پختگی کے بغیر گزارہ نہیں وہاں آموزش بھی از حد ضروری ہے ۔

نشو و نما بذریعہ پختگی

گو اکثر افعال کے لیے پختگی اور آموزش دونوں ضروری ہیں ، لیکن بعض افعال پختگی کے محتاج ہیں ، انہیں آموزش کی ضرورت نہیں ۔

صدیوں تک جبلات (Instincts) یعنی ایسے افعال جو آموزش سے بے نیاز ہوں ، بحث و مباحثہ کا مرکز بنے رہے ۔ بعض ماہرین نفسیات کا خیال تھا ، کہ جبلات ورثہ میں حاصل ہوتی ہیں ، معترضین کہتے تھے کہ ان کے فطری ہونے کا کوئی قطعی ثبوت نہیں ملتا ۔ جبلت کے حامیوں نے جبلت کی فہرستیں تیار کیں کسی نے کچھ تعداد بتائی کسی نے کچھ ۔ منکرین اس تمام کوشش کو فضول اور بے کار گردانتے تھے ۔

یہ بحث کئی وجوہ سے طول پکڑ گئی ۔ فریقین محض قیاس آرائیوں سے کام لیتے تھے ۔ کسی کے پاس بھی تجربی اور اثباتی شواہد موجود نہ تھے ۔ حیاتیات ، فعلیات اور علم تشریح البدن جیسے علوم ابھی ابتدائی منازل پر تھے لہٰذا نفسیات کے متنازعہ مسائل فلسفیانہ انداز پر سلجھانے کی کوشش کی جاتی تھی ، سائنسی انداز ممکن نہ تھا ۔ جب تجربی مواد موجود نہ ہو تو باتیں خواہ مخواہ لمبی ہو جاتی ہیں اور کوئی سائنسی نتیجہ ممکن نہیں ہوتا ۔ رش (Ruch) کے خیال میں[1] یہ تنازعہ اس وجہ سے بھی طول پکڑ گیا کہ جبلت کے لفظ کی تعریف نہ کی گئی اور اس کے معانی صریح اور بین الفاظ میں متعین نہ ہوئے ۔

رش (Ruch) جبلت کو ایک پیچیدہ نظام کردار (Behaviour pattern) سمجھتا ہے جو پختگی کی بدولت معرض وجود میں آتا ہے ، نہ کہ آموزش کی بدولت ۔ بعض اوقات جبلات کا اظہار پیدائش پر نہیں ہوتا کیونکہ :

۱۔ جسمانی اعضا جن پر جبلی تفاعل کا انحصار ہوتا ہے وہ پختہ نہیں ہو چکتے یا

۲۔ بعض غدودیں ابھی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچی ہوئی ہوتیں ۔

نمبر ایک کے تحت کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں ۔ مینڈک کے بچے پیدا ہوتے ہی تیرتے نہیں کیونکہ ان کا اعصابی نظام پختہ نہیں ہوتا ۔ اسی

۱۔ ملاحظہ ہو Psychology and Life صفحہ ۱۰۸ ۔

طرح پرندے جنم لیتے ہی اُڑ نہیں پڑتے کیونکہ ان کے بازوؤں کے عضلات ابھی کمزور ہوتے ہیں ۔ نمبر دو کے تحت بھی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں ۔ مثلاً چوہے پیدا ہوتے ہی جنسی خواہش ظاہر نہیں کرتے اور مرغیاں بھی کچھ بڑی ہو کر انڈے دینے کے قابل ہوتی ہیں اور انڈوں پر بیٹھتی ہیں ۔

پختگی کے سلسلے میں دو تجربات پیش کیے جاتے ہیں ۔

۱۔ مینڈک کے انڈوں کو کلوری ٹون (Chloretone) کے محلول (Solution) میں رکھا گیا یہ ایک بے ہوش کرنے والی دوائی (Anes-thesia) ہے جو مہیجات کو عضویہ میں داخل ہونے سے باز رکھتی ہے لیکن جسمانی نشو و نما میں کوئی روڑا نہیں اٹکاتی ۔ اس محلول کی وجہ سے مینڈک کے بچے سیکھنے سے معذور ہو گئے ، وہ صرف پختگی سے فائدہ اُٹھا سکتے تھے ۔

اس تجربی گروپ کے مقابلے میں ایک منضبط گروپ تھا ۔ مؤخرالذکر کو پانی میں تیرنے کی عام اجازت تھی ۔ اس گروپ کے مینڈک ہر قسم کے مہیج سے متأثر ہو رہے تھے ۔ لہٰذا ان کی حرکات میں آموزش اور پختگی دونوں کو دخل تھا ۔

مسئلہ یہ تھا کہ آیا مینڈکوں کا تیرنا پختگی کی بدولت ہے یا آموزش کی بدولت ؟ کیا کرداری نظام جو تیرنے میں مطلوب ہے وہ فطری اور پیدائشی ہے یا اسے پریکٹس اور آموزش کی ضرورت ہے ؟

جب کنٹرول گروپ والے مینڈک جو مہیجات بھی قبول کر رہے تھے اور پختگی سے بھی مستفیض ہو رہے تھے تیرنے کے قابل ہو گئے تو تجربی گروپ کو بے ہوش کرنے والے محلول سے باہر نکال کر پانی میں ڈال دیا گیا ۔ دونوں گروپ ایک جیسا تیر رہے تھے ۔ تجربی گروپ جسے آموزش سے بالکل محروم کر دیا گیا تھا وہ بھی ویسے ہی تیرا جیسے منضبط گروپ تیرا ۔ اگرچہ مؤخرالذکر کو آموزش کا موقعہ بھی ملا ۔

اس تجربے نے ثابت کر دیا کہ تیرنے کے لیے جس کرداری نظام کی ضرورت ہے اس کا انحصار سراسر پختگی پر ہے - اس فعل کو ہم جبلت کہہ سکتے ہیں -

۲- یہ تجربہ چوہوں پر ہوا اور چوہوں کی ان حرکات پر ہوا جو پیدائش پر ظاہر نہیں ہوتیں بلکہ کچھ عرصے بعد ظاہر ہوتی ہیں - کچھ چوہے لیے گئے اور جب تک وہ جنسی تعلقات کے قابل نہ ہونے انھیں چوہیوں سے علیحدہ رکھا گیا اور کبھی کسی چوہی سے ملنے نہ دیا گیا - جب یہ چوہے اس قابل ہو گئے کہ وہ جنسی تعلقات قائم کر سکیں تو انھیں ایسی چوہیوں میں چھوڑ دیا گیا جو اس سے پہلے اور چوہوں سے مل چکی تھیں - فوراً ہی یہ چوہے چوہیوں سے مل گئے اور جنسی فعل میں مشغول ہو گئے - تجربہ کنندہ کو ان چوہوں اور عام چوہوں میں کوئی فرق نہ نظر آیا -

یہ تجربہ ثابت کرتا ہے کہ کرداری نظام جس پر جنسی تعلقات موقوف ہیں آموزش سے نہیں بنتا - اس کا انحصار پختگی پر ہے - اس کرداری نظام کو بھی جبلت کہہ سکتے ہیں - جانوروں اور پرندوں کی کئی حرکات کو جبلی اور فطری حرکات کا نام دیا جا سکتا ہے، لیکن انسانوں میں ایسی حرکات کم ملیں گی، بچوں میں شاید مل جائیں - لیکن وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی حرکت جسے ہم جبلی کہتے ہیں آموزش سے بالکل بے نیاز ہے - جو حرکات پیدا ہوتے ہی نمودار ہوتے ہیں وہ اکثر فطری ہوتے ہیں لیکن یاد رہے کہ پیدائش کوئی ایسا مقام نہیں جو قطعی طور پر فیصلہ کر دے کہ جو حرکات اب ظاہر ہو رہی ہیں ان پر آموزش کا اثر بالکل نہیں پڑا - کئی بچے سات یا آٹھ ماہ میں پیدا ہو جاتے ہیں یعنی وقت سے ایک یا دو ماہ پہلے - یہ بچے بھی عام بچوں جیسی حرکات کرتے ہیں - اگرچہ یہ حرکات قدرے کمزور ہوتی ہیں - اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان حرکات کے لیے

پیدائش سے قبل ہی عضوی نظام پختہ ہو جاتا ہے۔ آموزش صرف اسے مضبوط کرتی ہے۔

پیدا ہوتے ہی بچے کے ننھے سے جسم میں تمام اعضا اور حواس موجود ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ حیرانی ہوتی ہے کہ کیسے ایک ہی بیضہ سے مختلف اعضا اور حواس نکل پڑے۔ یہ تو صحیح ہے کہ ایک خلیہ سے دو ہوئے، دو سے چار، چار سے آٹھ وغیرہ وغیرہ لیکن یہ کیسے ہو گیا کہ جب ہر خلیہ میں اجرام تخلیق اور اجسام لونیہ ایک جیسے ہوں تو کوئی خلیہ تو آنکھ بنائے کوئی دل، کوئی دماغ، کوئی ہاتھ اور کوئی کان۔ ماہرین فعلیات کے پاس اس کا تشفی بخش جواب نہیں۔ لیکن ان کا کہنا ہے کہ امتیازات (Differentiation) پہلے دن سے شروع ہو جاتے ہیں۔ ان امتیازات کے وجوہ ورثہ میں نہیں ڈھونڈھنے چاہییں کیونکہ جہاں تک ورثہ کا تعلق ہے ہر خلیہ کا ورثہ یکساں ہے۔ ہمیں امتیازات کے لیے ماحول کی طرف رجوع کرنا چاہیے پیدائش سے پہلے جنین (Embryo) کا ماحول ماں کا رحم ہے، یہیں وہ پھولتا پھلتا ہے۔ لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ ہر خلیہ کے لیے مؤثر ماحول (effective enviornment) ایک جیسا نہیں۔ رحم تو سب خلیوں کے لیے ماحول ہے لیکن ہر خلیے کا اپنا اپنا ماحول بھی ہے جو خلیوں کے باہمی تفاعل سے بنتا ہے ظاہر ہے ہر خلیے کا باہمی تفاعل ایک جیسا نہ ہوگا، اس اختلاف کی بدولت خلیوں کی نشو و نما اور پختگی علیحدہ علیحدہ طریقوں پر ہوگی۔

یاد رہے کہ ہر خلیے کی تین تہیں (Layers) ہوتی ہیں۔ بیرونی تہہ سے جلد بنتی ہے۔ اندرونی سے اندرونی اعضا اور درمیانی سے عضلات اور ہڈیاں، دماغ اور اعصابی نظام بیرونی تہہ سے بنتے ہیں۔ ان کا وجود جنین کے چوتھے ہفتہ میں نمایاں ہو جاتا ہے۔ شروع میں دماغ کا حجم کل عضویہ کے حجم کا $\frac{1}{2}$ ہوتا ہے۔ پیدائش کے وقت $\frac{1}{10}$ اور بلوغت پر $\frac{1}{50}$ کو چوتھے ہفتہ ہی دماغ کا حجم کافی بڑا ہوتا ہے لیکن

دماغ کے وظائف تب تک شروع نہیں ہوتے جب تک اعصاب نہ بن جائیں اور ان کے درمیان رشتہ نہ قائم ہو جائے۔ نخاع یا حرام مغز (Spinal Cord)) تو پیدائش سے کچھ پہلے تیار ہو جاتا ہے لیکن مخ کبیر (Cerebrum) پیدائش کے چند ہفتہ بعد تیار ہوتا ہے -

کئی حواس اور اعصاب پیدائش سے پہلے تیار ہو جاتے ہیں - پیدائش سے قبل بچے کے کان آوازیں سن لیتے ہیں - جب وہ ماں کے پیٹ میں ہلتا ہے تو اس کی حرکی اور جلد کی حسیں بیدار ہوتی ہیں -

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب عضویہ کے کئی اعضا اور حواس پیدائش سے پہلے ہی اپنے اپنے وظائف ادا کرنے کے قابل بن جاتے ہیں تو کیا جتنا عرصہ بچہ ماں کے پیٹ میں رہتا ہے اتنا عرصہ وہ آموزش اور مشق سے کچھ فائدہ نہیں اٹھاتا ؟

اس سوال کا جواب ہمیں مثبت میں دینا ہوگا نشو و نما میں مشق اور آموزش کا بہت بڑا حصہ ہے - پہلے مشق کو لیں - اگر عضو کو بار بار ورزش دیں تو وہ مضبوط ہو جاتا ہے لیکن اس کی مضبوطی کا راز اس کے بڑھے ہوئے حجم یا موٹائی میں نہیں - یہ تو اس لیے ہے کہ خون کا دورہ بڑھ جاتا ہے ، آکسیجن زیادہ دستیاب ہوتی ہے - قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور دماغ سے بہتر تأثرات وصول ہوتے ہیں - جب کسی عضو کا استعمال ترک کر دیں تو وہ کمزور پڑ جاتا ہے اور اپنے وظائف کھو بیٹھتا ہے - ہڈی ٹوٹنے پر بازو کو پلستر کر کے لکڑی کی کھپچی پر باندھ دیا جاتا ہے - جب مقررہ معیاد کے بعد بازو کھولا جاتا ہے تو بازو مشکل سے ہل جل سکتا ہے - چند دن ، اور بعض دفعہ چند مہینوں کے لیے بازو کو ورزش کرائی جاتی ہے تب کہیں جا کر وہ اس قابل ہوتا ہے کہ اپنے معمولی وظائف ادا کر سکے -

ووڈ ورتھ اس دعویٰ کی تائید میں بڑا پرانا تجربہ پیش کرتا ہے[1] -

---

[1] ملاحظہ ہو Psychology ، صفحہ ۲۸۰ -

۱۸۹۷ء میں ایک موٹے تازے کتے کو ایک ماہ کے لیے بے کار رکھا گیا۔ بعد میں آپریشن کے ذریعے ایک ٹانگ سے ران کا عضلہ نکال دیا گیا۔ جب آپریشن سے آرام آیا تو کتے کو چالیس دن تک دوڑ کی مشق کرائی گئی۔ اس عرصہ میں وہ دو ہزار میل دوڑا۔ اس کے بعد دوسری ٹانگ سے ران کا عضلہ نکالا گیا۔ اب دونوں عضلات کا مقابلہ کیا گیا، ایک تو وہ تھا جسے مشق نصیب ہوئی تھی اور دوسرا مشق کے بغیر تھا۔ مشق یافتہ عضلہ کا قطع شدہ تراشہ (Cross section) غیر مشق یافتہ عضلہ کے تراشے کے مقابلہ میں پچاس فی صد بڑا تھا۔ مشق اور ورزش نے عضلہ کا حجم بڑھا دیا اور مضبوطی بخش دی۔ خورد بین سے جب عضلات کا معائنہ کیا گیا، تو پتہ چلا کہ دونوں میں ریشے ایک جتنے تھے یعنی ورزش سے نئے ریشے پیدا نہیں ہوئے۔ البتہ ورزش سے ریشے موٹے ہو گئے یہ ریشے محفوظ خزانے کی مانند عضلات میں پہلے سے موجود تھے۔ ان سے کام لیا گیا اور ورزش نے انھیں مضبوط اور توانا بنا دیا۔

دماغ کے استعمال سے نئے خلیے نہیں بنتے۔ بچے نشو و نما کے مختلف مدارج پر ہوتے ہیں۔ جب ان کے دماغوں کا مقابلہ کیا جاتا ہے تو ترقی یافتہ دماغ میں زیادہ خلیے نہیں نکلتے۔ ہر منزل پر دماغ کے خلیے ایک جیسے ہوں گے، زیادہ اور کم ترقی یافتہ دماغ کا فرق خلیوں کی تعداد میں نہیں، یہ فرق خلیوں کے حجم، شجریوں (Dendrite) کی لمبائی اور خلیوں کے باہمی تفاعل میں ہوتا ہے۔ ترقی یافتہ ذہن میں خلیوں کا حجم بڑا اور شجریے لمبے ہوتے ہیں، اس کے علاوہ خلیوں کا باہمی تفاعل پیچ دار اور الجھاؤ والا ہو جاتا ہے۔ قشر (Cortex) کے بصری حصہ کا مطالعہ ان لوگوں میں کریں جو بچپن میں اندھے ہو جاتے ہیں اور جو اخیر تک دیکھتے رہتے ہیں، آپ دیکھیں گے کہ اندھوں میں بصری خلیے کمزور اور چھوٹے رہ جاتے ہیں ان کا دیگر خلیوں سے رابطہ بھی محدود رہ جاتا ہے۔

آموزش :

ورزش اور مشق کے بعد آموزش کی طرف آئیں ۔ آموزش بھی نشو و نما میں ایک اہم عنصر ہے ۔ ابتدائی منازل میں پختگی کی ضرورت پڑتی ہے بعد میں مشق اور آموزش کی ۔ لیکن پختگی کے ساتھ ساتھ بھی مشق ہوتی رہتی ہے اور آموزش سے بھی فائدہ اٹھایا جاتا ہے ۔

مشق سے ریشے مضبوط اور توانا ہو جاتے ہیں جن مشاغل کے لیے عضویہ کا کرداری نظام تیار ہوتا ہے وہ مشاغل زیادہ سہولت ، زیادہ خوش اسلوبی اور قدرے تھوڑے وقت میں سر انجام پاتے ہیں۔ لیکن مشق سے نئی مہارتیں یا نئے ہنر حاصل نہیں ہو سکتے ۔ اس مطلب کے لیے آموزش درکار ہے ۔ آموزش سے مراد کتابی علم نہیں ۔ تمام عمر ہم سیکھتے رہتے ہیں ۔ زندگی کا ہر شعبہ خواہ ذہانت سے تعلق رکھے خواہ یاد داشت یا تخیل ، عادات اور رویوں سے ، ہر ایک میں آموزش کو دخل ہے ۔

آموزش کی بدولت ہم دو یا دو سے زیادہ افعال کو اکٹھا کر لیتے ہیں ، جیسے ستار بجانے والا ستار کے ساتھ گانا بھی گاتا ہے یا اکٹھے افعال کو الگ الگ کر لیتے ہیں ۔ جیسے ستار بجانے والا اکٹھی انگلیوں میں سے ایک کو الگ کر کے اس سے کام لیتا ہے ۔ یا نئے ماحول ، نئے شخص اور نئی شے سے واقفیت حاصل کر کے اس کے ساتھ ٹھیک رابطہ قائم کر لیتے ہیں ۔ بچے کو نیا کھلونا دیں اور دیکھیں کہ وہ کیا کرتا ہے ۔ کھلونے کو ہاتھ میں لے کر بچہ اسے اوپر نیچے دائیں بائیں دیکھے گا ۔ زمین پر مارے گا کہ اس سے کیا آواز پیدا ہوتی ہے ۔ اگر اس کھلونے کو پہلے دیکھ چکا ہو تو اس کے ساتھ ویسے ہی کھیلے گا جیسے پہلے کھیلتا رہا ہو ، لیکن اگر کھلونا نیا ہو اور پہلے کھلونوں سے مختلف ہو تو بچہ اس پر قابو پانے کی کوشش کرے گا ۔ نئی مہارت حاصل کرے گا ۔ اگر چڑھنے کے لیے ہو تو اوپر

چڑھے گا، اگر بجانے کے لیے ہو تو بجائے گا، غرضیکہ جیسا کھلونا ہوگا ویسے ہی اس کے ساتھ سلوک ہوگا۔ نئے کھلونے سے کھیلنے کے لیے آموزش درکار ہے۔ نیا ہنر سیکھے بغیر نئے کھلونے سے کھیلا نہیں جا سکتا۔

آموزش میں تقویت (Re-inforcement) کا عنصر :

ہر آموزش میں مشق کی ضرورت ہے۔ سائیکل چلانے والا سائیکل کو بار بار چلاتا ہے اور سائیکل چلانے کا ہنر سیکھتا ہے۔ یہی حال دوسرے فنون میں ہے، کوئی فن مشق کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ مشق کے علاوہ ایک اور عنصر جو آموزش میں از بس ضروری ہے وہ نتائج کا ہے۔ جب سائیکل چلانے والا کسی خاص حرکت کو تسلی بخش پاتا ہے تو اسے دہراتا ہے اور اپنے ہنر کا جزو بنا لیتا ہے۔ اسی طرح جب مغنی کوئی سریلا اور نیا نغمہ نکال لیتا ہے تو اسے بار بار گاتا ہے، دہرانے سے مشق ہو جاتی ہے اور گانا زیادہ صاف اور شیریں بن جاتا ہے۔

ہر فعل کے نتائج ہوتے ہیں، کبھی اچھے کبھی برے۔ یہ نتائج اپنا اثر رکھتے ہیں اور رد عمل پیدا کرتے ہیں۔ اس رد عمل کو تقویت کہا جاتا ہے۔ فعل خواہ کیسا ہی ہو ضروری یا غیر ضروری، دماغی یا جسمانی اس کا حاصل اور نتیجہ فاعل کے لیے دلچسپی کا موجب ہوتا ہے۔ چوہوں اور بلیوں کو بھول بھلیوں میں رکھا جاتا ہے، ان بھول بھلیوں کے منہ سے کئی راستے نکلتے ہیں، چوہا کئی راستے لیتا ہے جب ایک راستہ مسدود ہو جاتا ہے تو واپس آتا ہے اور دوسرا لیتا ہے۔ اس کوشش میں کئی غلطیاں ہوتی ہیں لیکن بالآخر صحیح راستہ مل جاتا ہے۔ ایک راستے پر چلنے سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں وہ چوہے کے لیے اہم ہیں۔ اہم نہ ہوں تو وہ کیوں غلط راستوں سے احتراز کرے اور صحیح راستے پر چلنے کی کوشش کرے۔ بلیوں پر تجربے سے بھی یہی نتائج ملتے ہیں۔ ایک پنجرہ لیں جس کے دو دروازے ہوں، ایک صحیح اور دوسرا غلط۔ صحیح دروازے سے خوراک ملتی ہے اور دوسرے سے

نہیں ملتی یا غلط راستے پر بجلی کا جھٹکہ (Shock) پڑتا ہے اور دوسرے پر نہیں پڑتا ۔ سزا اور جزا کی بدولت آموزش میں بڑی مدد ملے گی جو نتائج تسلی بخش ہوں انہیں حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی اور دوسروں سے چھٹکارا پانے کی ترکیب سوچی جائے گی ۔ بچہ کھلونوں سے کھیلتا ہے۔ ہر کھلونے کی اپنی ترکیب ہے اور وہ ترکیب سیکھنی ہوتی ہے۔ اگر ترکیب سے کھیلا جائے تو نتائج خوشگوار ہوں گے ورنہ نہیں ۔ ریل گاڑی، ہوائی جہاز، زمین دوز کشتیاں اور اس قسم کے اور کھلونوں سے تبھی لطف اٹھایا جا سکتا ہے جب ان سے کھیلنے کا ڈھنگ آتا ہو ۔

تقویت سے مراد تسکین یا تشفی نہیں ۔ اوپر ذکر آ چکا ہے کہ ہر فعل کے نتائج خاطر خواہ نہیں ہوتے۔ لیکن یہ نتائج اپنی جگہ بہت اہم ہوتے ہیں ۔ انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ بچہ بجلی کی چمک دیکھتا ہے اور اس کے بعد گرج کی آواز سنتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں قانون تلازم کی وجہ سے اس کے ذہن میں مربوط ہو جاتی ہیں ۔ جب کبھی بچہ بجلی کی چمک دیکھے گا وہ گرج کا منتظر رہے گا، اور مناسب کارروائی عمل میں لائے گا ۔ زندگی میں کامیابی اس امر پر منحصر ہے کہ مہیجات کا مناسب جواب دیا جائے اور یہ معلوم ہو کہ ان سے کیا توقع کی جا سکتی ہے ۔ اکثر جوابی عمل اور توقعات مل جل جاتے ہیں ۔ جوابی عمل توقعات پر مبنی ہوتا ہے اور توقعات جوابی عمل سے بنتی ہیں ۔ لیکن کئی اعمال و افعال میں توقعات اور جوابی عمل کا فرق لازمی ہوتا ہے ۔

آموزش اور تقویت پر مبسوط بحث بعد میں آئے گی ۔

کرداری نشو و نما (Behavioral Development)

بچے کے نشو و نما میں پہلے تو پختگی کی ضرورت ہوگی ، بعد میں مشق اور آموزش کی ۔ لیکن اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ مشق اور آموزش سے پختگی پایہء تکمیل تک پہنچ گئی ہوگی تو یہ ٹھیک نہ ہوگا ۔ پیدائش

تک پختگی کا عنصر غالب ہوگا جسم کے کئی اعضا پیدائش تک اس قابل ہو جائیں گے کہ اپنے اپنے وظائف ادا کر سکیں ۔ لیکن یہ پختگی مکمل نہیں ہوتی ۔ مشق اور آموزش کے ساتھ ساتھ پختگی بھی اپنی منازل طے کرتی رہتی ہے ۔

نو زائیدہ بچوں پر کئی قسم کے تجربات ہوتے ہیں ۔ تجربے میں ضروری ہے کہ تمام احوال قابو میں ہوں اور صرف ایک حالت کو متغیر ہونے دیا جائے ۔ بچوں کا مطالعہ کرتے وقت تمام احوال کو ضبط میں رکھ کر مہیج پیش کیا جاتا ہے اور اس کا رد عمل دیکھا جاتا ہے ۔ امریکہ کی بعض تجربہ گاہوں میں بچے کے کمرے میں شور نہیں ہونے دیا جاتا ۔ ہوا کا جھونکا تک داخل نہیں ہو سکتا ۔ روشنی کی مقدار میں فرق نہیں آ سکتا اور کمرے کا ٹمپریچر اور رطوبت گھٹ بڑھ نہیں سکتی ۔ ان کمروں میں ایسی مشینیں لگی ہوتی ہیں جو خود بخود بچے کی حرکات اور ان حرکات کی مقدار کو نوٹ کر لیتی ہیں ۔

بچوں کے تجربے اس مفروضہ پر مبنی ہیں کہ بچہ منہ سے نہیں بتا سکتا لیکن مہیج وصول ہونے پر حرکات و سکنات کرتا ہے ۔ ان حرکات سے پختگی اور آموزش پر روشنی پڑتی ہے ۔ بچے کا رد عمل ظاہر کرے گا کہ بچہ کس قسم کے مہیجات وصول کرتا ہے اور کس شدت کے ساتھ ۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مہیج دیا جاتا ہے لیکن بچے کی طرف سے کوئی رد عمل نہیں ہوتا ۔ رد عمل کے فقدان سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ بچے میں اس قسم کے مہیجات قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا عصبی اور عضلاتی نظام ابھی اتنا پختہ نہ ہوا ہو کہ بچہ اس مہیج سے متعلق رد عمل ادا کر سکے ۔

ان احتیاطوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ذیل میں بچوں کی حساسیت (Sensitivity) کا ذکر کیا جاتا ہے ۔

آواز کا احساس :

پیدائش سے پہلے بچہ آوازیں سنتا ہے پیدائش سے ۲۴ گھنٹے بعد جتنی جلدی بچے کے کان سے پانی نکال دیا جائے اتنی جلدی وہ اونچی آوزیں سنیے گا اور سن کر رو پڑے گا۔ اس کے علاوہ تجربے سے ثابت ہے کہ چھوٹے بچے آوازوں کی ٹاپ (Pitch) میں فرق کر سکتے ہیں۔ سی۔ٹی مارگن (C. T. Morgan) اپنی کتاب[1] میں بیان کرتا ہے کہ مختلف ٹاپوں سے دو سے چار ہفتے کی عمر کے ایک بچے نے مختلف رد عمل پیدا کیے۔ اونچی ٹاپ والی سروں سے فعلیت (Activity) پیدا ہوئی لیکن نیچی ٹاپ والی سروں سے بچوں کا رونا بند ہو گیا اور فعلیت میں کمی واقع ہوئی۔ ایک اور تجربہ کنندہ نے اس تجربے کو دھرایا اس کے نتائج بھی کم و بیش یہی ہیں۔ لیکن اس کا خیال ہے کہ مختلف ٹاپوں کے لیے بچوں کے رد عمل میں ایسا نمایاں فرق نہیں جو مارگن کہتا ہے۔

ایک اور تجربہ جو چھوٹے بچوں میں مشروط آموزش (Conditioned Learning) کو ظاہر کرتا ہے وہ الڈرچ (Aldrich) نے کیا۔ جب بچے کے پاؤں کو کھجلایا جائے تو وہ انگوٹھے کی انگلی بڑھا دے گا اور باقی انگلیاں علیحدہ علیحدہ کر لے گا۔ محض آواز سے وہ ایسا نہیں کرتا۔ لیکن اگر دونوں کو مشروط کر دیا جائے تو آواز سے بھی یہی حرکت ہوگی۔ فرض کیا کہ جب بچے کے پاؤں کو کھجلائیں اسی وقت گھنٹی کی آواز بھی آئے۔ اس فعل کو اگر متعدد بار دھرائیں تو بچہ گھنٹی کی آواز پر ہی پاؤں کا انگوٹھا بڑھا دے گا اور باقی انگلیاں علیحدہ علیحدہ کر لے گا۔

اس تجربے سے بچوں کا بہرہ پن بھی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اگر بچہ مشروط آموزش سے یعنی گھنٹی کی آواز پر مناسب مشروط رد عمل کرتا ہے تو بہرہ نہیں ہو سکتا۔

۱- Physiological Psychology مطبوعہ نیو یارک ۱۹۴۷ء

روشنی اور رنگوں کا احساس :

تیز روشنی میں بچے کی آنکھ کی پتلی سکڑتی ہے اور مدھم روشنی میں پھیلتی ہے - پیدائش پر روشنی کا احساس نہیں ہوتا لیکن پیدائش کے ۳۶ گھنٹے تک حساسیت تسلی بخش ہو جاتی ہے -

تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ پندرہ دن کے بچے مختلف رنگوں میں تمیز کر سکتے ہیں - ڈبلیو - پی چیز (W. P. Chase) نے دو رنگوں کو لیٹے ہوئے بچے کے سامنے پردہ سکرین پر پھینکا - ان میں سے ایک رنگ دوسرے کے گرد ہالہ بنائے ہوئے تھا - سکرین پر درمیانی رنگ چکر کاٹتا تھا اور بچے کی نگاہیں چکر کے ساتھ گھومتی تھیں - چیز (Chase) کا خیال ہے کہ یہ تجربہ اس عمل کی دلیل ہے کہ بچہ رنگوں میں تمیز کر سکا -

بوؤں (Odours) کا احساس :

پیدائش کے وقت بچے کے نتھنے غلاظت سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں ، جونہی وہ صاف ہو جاتے ہیں بچہ بوئیں قبول کرتا ہے اور مناسب رد عمل کرتا ہے - ڈشر (Disher)[1] ایک تجربہ بیان کرتا ہے جس میں نوزائیدہ بچے لیے گئے ، جن کی عمریں تین گھنٹے سے دس دن تک تھیں اور ان کے ناک میں مختلف بودار ہوائیں گزاری گئیں - تجربہ کنندہ نے دیکھا کہ جتنی بو تیز تھی اتنی ہی تیز بچے کی فعلیت بھی تھی - معمولی ہوا گزارنے پر بچے کی فعلیت بھی معمولی تھی - اس تجربے نے ثابت کر دیا کہ بچہ شروع سے ہی بوؤں سے متأثر ہوتا ہے -

حرکت کا احساس :

آخذات کے مراکز عضلات ، اوتار (Tendons) اور جوڑوں میں پائے جاتے ہیں - جسمانی حرکات انھیں متأثر کرتی ہیں - اور یہیں سے عضلی حواس (Kinesthetic Sensation) جنم لیتے ہیں - عضلاتی

۱- ملاحظہ ہو Contributions to Psychology -

نظام کی بنیاد انہیں حواس پر کھڑی ہے۔ اگر ہمیں اپنے جسم کی حرکات کا صحیح پتہ نہ ہو تو حرکی رد عمل بھی غیر یقینی ہو جائے گا۔ شیرمین (Sherman) کا کہنا ہے کہ عضلاتی حواس بہت جلد کام کرنا شروع کر دیتے ہیں ۔ اگر ننھے منھے کی ٹھوڈی کو ہاتھ سے مسلا جائے تو وہ بچاؤ کی حرکات کرتا ہے۔ ہاتھ کو پکڑنا چاہتا ہے تاکہ تکلیف رفع ہو۔ ہاتھ پکڑنے میں بچے کو کئی ناکامیاں ہوتی ہیں۔ عمر کے ساتھ کامیابی بڑھ جاتی ہے۔ ایک تجربے میں ۲۱ گھنٹے کا بچہ کوئی کامیاب حرکت نہ کر سکا۔ ۵ گھنٹے کے بچے کو پچاس بار کوشش کرنی پڑی۔ اور ۱۲ دن کا بچہ چار بار میں کامیاب ہو گیا۔

یہ تجربہ ظاہر کرتا ہے کہ عضلاتی نظام بہت جلد اپنے وظائف ادا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس تجربے کو قطعی نہیں سمجھنا چاہیے کیوں کہ اس سلسلے میں عضلاتی نظام کے علاوہ اور بھی کئی عناصر کار فرما نظر آتے ہیں۔ مثلاً بچے کی توانائی بڑھ رہی ہے اور اس کے چھونے کی قوت ترقی کر رہی ہے۔

درد کا احساس :

بچہ شروع سے ہی درد سے متأثر ہوتا ہے ایک تجربے میں بچوں کی ٹانگوں اور منہ کے اوپر سوئیاں چبھوئی گئیں۔ اگر بچہ ابھی پیدا ہی ہوا ہو اور اس پر یہ تجربہ کیا جائے تو بچے پر کوئی اثر نہیں ہوتا کیوں کہ بچہ کوئی رد عمل ظاہر نہیں کرتا۔ لیکن اگر سوئیاں بار بار چبھوئی جائیں تو پانچ گھنٹے کا بچہ بھی متأثر ہو جاتا ہے ، اس کے چہرے سے بے چینی ٹپکتی ہے۔

چھوٹے بچوں کی حسیات آواز ، روشنی ، بوؤں اور درد کے متعلق بیان کی جا چکی ہیں۔ ان حسیات کے علاوہ بیسیوں اور بھی ہیں۔ بچہ ذائقے سے متأثر ہوتا ہے ، جلد سے مہیجات قبول کرتا ہے، کھانے ،

پکڑنے، حرکت کرنے، بولنے کے بارے میں بھی مہیجات لیتا ہے اور رد عمل کرتا ہے۔ ان تمام چیزوں پر متعدد مستند تجربات ہو چکے ہیں۔ یہ تجربے اس امر کی دلالت کرتے ہیں کہ بچے کے کئی اعضا پیدائش سے پہلے یا پیدائش کے کچھ عرصہ بعد اپنے وظائف کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ وظائف نہایت ہی سادہ، بے ربط اور غیر منظم ہوتے ہیں۔ مشق ان کی خامیاں دور کرتی ہے، آموزش ان میں نظم اور ربط لاتی ہے۔

اکثر پختگی اور مشق مل جل کر کام کرتے ہیں۔ چوزے کو دیکھیے۔ شروع میں دانہ چگتے وقت اس کی چونچ صحیح مقام پر نہیں پڑتی۔ دانہ کسی اور جگہ ہے اور وہ کسی اور جگہ چونچ مارتا ہے۔ انڈے سے نکلتے ہی اس کی چونچیں ۲۰ فی صد صحیح پڑتی ہیں۔ لیکن مشق سے سو فی صد صحیح ہو جاتی ہیں۔ مشق کے ساتھ ساتھ پختگی بھی بڑھتی جاتی ہے۔ پختگی کی بدولت نئے کام سیکھے جاتے ہیں۔ بچے کے جب دانت نکل آتے ہیں تو چبانا اور کاٹنا سیکھ لیتا ہے۔

بچے کے لیے پیدائش پر یہ کائنات ایک پریشان کن منتشر نا معلوم اشیا کا مجموعہ ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ وہ اس میں نظم اور ربط لاتا ہے۔ اس کے حواس جو قدرت کی جانب سے ایک بے بہا عطیہ ہیں پہلے تو سادہ مہیج وصول کرتے ہیں اور سادہ ہی رد عمل پیش کرتے ہیں لیکن بعد میں مشق اور آموزش سے اس قابل ہو جاتے ہیں کہ مشکل اور دقیق رد عمل بجا لا سکیں۔ مثلاً آنکھ اور ہاتھ کو لیجیے۔ دونوں ہی ماحول سے نپٹنے کے لیے از حد ضروری ہیں۔ پیدائش کے وقت ان دونوں کا ربط مکمل نہیں ہوتا۔ بچہ چمکدار چیز دیکھتا ہے لیکن اسے پکڑنے کے لیے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ یا وہ کسی شے کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہے لیکن اسے دیکھتا نہیں۔ پہلے دو

مہینوں میں اس کی آنکھیں متحرک اشیا کا تعاقب کرتی ہیں ۔ جب بچہ اشیا پر نگاہ جما سکتا ہے اس کے ہاتھ حرکت میں آتے ہیں ۔ اس کے بعد جب وہ کوئی دلچسپ شے دیکھتا ہے تو ہاتھوں کو جوش سے ہلاتا ہے جیسے وہ پکڑنا چاہتا ہے لیکن اسے پتہ نہیں کہ کیسے پکڑا جائے ۔ چند ہفتوں کے بعد وہ دونوں بازو آگے کو جھکا دیتا ہے لیکن اب بھی ٹھیک طرح سے پکڑ نہیں سکتا ۔ ساتویں مہینے میں بچہ چیزوں کو پکڑ سکتا ہے ۔ سال، کے آخری تین مہینوں میں اس کی گرفت زیادہ صحیح ہو جاتی ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہاتھ اور آنکھ ایک دوسرے سے مل کر کام کرتے ہیں ۔ یہاں پر تقویت کا اصول بھی کام کر رہا ہے بچہ نتائج سے متأثر ہوتا ہے ، کامیاب رد عمل کو دھراتا ہے ۔ ناخوشگوار سے احتراز کرتا ہے ۔ جوں جوں اس کی عمر بڑھتی ہے اس کے آنکھ اور ہاتھ زیادہ مل جل کر کام کرتے ہیں ۔

اب چلنے کے عمل کو لیجیے ۔ کیا ہم چلنا سیکھتے ہیں ؟ بعض کہیں گے نہیں ۔ ڈینس (Dennis) نے ہوپی (Hopi) انڈین کی ایک رسم بیان کی ہے جس کی وجہ سے بچے کی حرکات محدود ہو جاتی ہیں ۔ بعض مائیں اس رسم کی پیروی نہیں کرتیں اور بچوں کو کھلا چھوڑ دیتی ہیں ۔ مؤخرالذکر بچے مشق سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اگر مشق سے چلنا آتا ہو تو اول الذکر بچوں سے پہلے چلنا شروع کر دیں ۔ لیکن ڈینس کا کہنا ہے کہ دونوں قسم کے بچے ایک ساتھ ہی چلنا شروع کرتے ہیں ۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ چلنا پختگی کی بدولت ہے مشق کو دخل نہیں ۔ ووڈ ورتھ[1] کہتا ہے کہ یہاں پر دو مفروضے پیش کیے جا سکتے ہیں - (۱) چلنا قدرتی فعل ہے اس کا انحصار چند ایک اعصابی مراکز پر ہے اور جب تک وہ تیار نہ ہوں بچہ چل پھر نہیں

۱- ملاحظہ ہو Psychology صفحہ ۲۹۷ ۔

کتا۔ (۲) چلنا اکتسابی فعل ہے بچہ تب چلتا ہے جب وہ پیشتر رد عمل
ں سے چند ایک کامیاب رواتِ عمل کو چن لے ، اور انہیں دھرائے۔

غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ دونوں مفروضوں میں سچائی
ہے۔ چلنا قدرتی فعل ہے لیکن مشق کو بھی اس میں دخل ہے۔
لنے کے لیے حرکت (Locomotion) اور توازن قائم رکھنے
(Balancing) کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک بچے کا جسم حرکت اور
ازن قائم رکھنے کے قابل نہ ہو جائے چلنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔
کن بچے کو دیکھیے کہ وہ اس سلسلے میں کیا جتن کرتا ہے۔
ہتا ہے گر پڑتا ہے۔ کبھی چارپائی کا سہارا لیتا ہے ، کبھی انگلی
ڑ کر چلتا ہے۔ چھٹے ساتویں مہینے حرکت کرنا ، آٹھویں مہینے
نگنا اور پیٹ کے بل چلنا شروع کرتا ہے ، آٹھویں اور نویں مہینے
نوں ہاتھوں اور دونوں پاؤں پر چوپایوں کی طرح چلتا ہے۔
ازن قائم رکھنے میں بھی وہ خاصی محنت کرتا ہے ، تیسرے اور
تھے مہینے سر کو اٹھا لیتا ہے۔ ساتویں اور آٹھویں مہینے اٹھ کر
ھ جاتا ہے ، دسویں اور گیارہویں مہینے سہارے سے چل لیتا ہے
ودھویں مہینے اکیلا چل سکتا ہے۔

حرکت اور توازن قائم رکھنے میں پختگی اور مشق دونوں کو
خل ہے۔ تقویت کا اصول بھی کام کر رہا ہے۔ اندھے بچے آٹھ نو
ہینے دیر سے چلتے ہیں۔ جہاں تک پختگی کا تعلق ہے اندھے اور دیکھنے
لے بچوں کا جسم ایک ہی وقت تیار ہو جاتا ہے لیکن اندھے پن کی
جہ سے مشق میں مشکل پڑتی ہے۔ تقویت سے بھی خاطر خواہ فائدہ نہیں
ٹھایا جاتا۔

اب بولنے کو لیجیے۔ اس میں بھی وہی جھگڑا ہے۔ کچھ لوگ
لنے کو قدرتی عمل کہیں گے کچھ اکتسابی۔ ظاہر ہے کہ الفاظ بولنے
ے لیے پختگی اور مشق دونوں درکار ہیں۔ اس سلسلے میں پختگی پر

سٹریر (Strayer)[1] نے تجربہ کیا ، دو توام بچے لیے گئے۔ جب ان کی عمر بیس مہینوں کی ہوئی تو انھیں ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا گیا۔ ایک توام کو پانچ ہفتوں تک الفاظ سکھائے گئے ۔ دوسرے کو یہ موقعہ نہ دیا گیا بلکہ کوشش کی گئی کہ وہ کوئی لفظ نہ سن پائے۔ پانچ ہفتوں کے بعد دوسرے توام کو چار ہفتوں تک الفاظ سکھائے گئے ۔ چونکہ دوسرا توام پہلے کی نسبت زیادہ پختہ ہو چکا تھا ۔ اس نے الفاظ جلد سیکھ لیے ۔ چار ہفتوں میں اس کی ترقی پہلے توام سے بڑھ چڑھ کر تھی ۔ پہلے توام نے جو پانچ ہفتوں میں سیکھا دوسرا اسی قدر چار ہفتوں میں سیکھ گیا بلکہ اس کے ذخیرۂ الفاظ میں سات لفظ زیادہ تھے ۔

اس تجربے سے ثابت ہوا کہ پختگی نہایت ضروری ہے لیکن مشق بھی خالی از فائدہ نہیں ۔ بچے کر دیکھیے وہ کیسے الفاظ سیکھتا ہے پہلے وہ کیا لفظ کہتا ہے پھر کون سے کہتا ہے ۔ جملے کیسے بناتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ وہ گویائی کی تانتوں (Vocal Chords) کو مشق دیتا ہے ، کئی لفظ بار بار کہتا ہے ۔ کسی زبان کو سیکھنا اور اس میں گفتگو کرنا سراسر آموزش کا نتیجہ ہے ۔ جب بچے کی بولی سمجھ لی جاتی ہے تو اسے تقویت ملتی ہے۔

سوشل نشو و نما : بچہ سوسائٹی میں پیدا ہوتا ہے اور جلد ہی سوسائٹی کا رکن بن جاتا ہے۔ پیدا ہوتے ہی اسے سوسائٹی کا پتہ نہیں چلتا ۔ لیکن ایک سال کی عمر میں اسے سوسائٹی کا احساس ہو جاتا ہے ۔ ماں باپ تو اس کے ساتھ چوبیس گھنٹے رہتے ہیں ، بہن بھائی بھی ہوتے ہیں ، کچھ گھروں میں نوکر چاکر بھی ہوتے ہیں ۔ کئی دفعہ دادی اور نانی بھی اسی گھر میں رہتی ہیں ۔ یہ سب لوگ اپنے رویوں اور احکام سے بچوں کو بتاتے ہیں کہ انھیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے ۔ دو ماہ کا بچہ پہچاننا شروع کر دیتا ہے ۔

---

[1] ملاحظہ ہو Genetic Psychology Monographs ۔

ماں کو دیکھ کر ہنس پڑھتا ہے ۔ دس ماہ کا بچہ بڑوں کے ساتھ ہلکی ہلکی کھیلیں کھیل لیتا ہے ۔ بارہ ماہ کا بچہ نقل آتار لیتا ہے اور جو کھیل دوسرے کھیلتے ہیں وہ بھی کھیل سکتا ہے ۔

پہلے سال تو بچہ بڑوں سے گھرا رہتا ہے ۔ اپنے ہم عمروں کے ساتھ برتاؤ کرنا نہیں جانتا ۔ تین سال کی عمر میں وہ ہم جولیوں سے کھیلتا ہے ۔ چار سال کی عمر میں بہت سے بچے مل کر ایک ہی مشغلے میں حصہ لیتے ہیں ۔ جوں جوں عمر بڑھتی ہے بچے زیادہ مل کر اور زیادہ تقسیمِ کار (Division of Labour) کے اصول پر کام کرتے ہیں۔

سوشل ارتقا کے لیے ذہانت اور علم کی ضرورت ہے ۔ ہم احساسی کا جذبہ بھی چاہیے ۔ کئی بچے زیادہ ہاتھ بٹاتے ہیں کئی کم ۔ کئی اتفاق اور پیار سے کھیلتے ہیں کئی کھچے کھچے رہتے ہیں ۔ اس کی وجہ لا شعور میں ہو تو ہو شعور میں تو نہیں ملتی ۔

شخصیت کا نشو و نما : بچے کی شخصیت اس کی عمر کے ساتھ ساتھ بدلتی ہے ۔ طفولیت سے لے کر بلوغت تک بچے کو کئی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے ۔ ہر منزل کے اپنے مسائل اور دلچسپیاں ہیں ۔ بالغ بچہ اپنے ہم جولیوں میں ہر دلعزیزی چاہتا ہے وہ ناموری کا بھی خواہاں ہے ۔ اس میں جنسی خواہشات بھی بیدار ہو جاتی ہیں ، آزاد روی کا جذبہ بھی زور پکڑتا ہے ۔ بعض لوگ کہیں گے کہ یہ نئی نئی اُمنگیں اور خواہشات سیکھی گئی ہیں ۔ مثلاً بالغ بچہ دیکھتا ہے کہ دوسرے جوان بچے جنسی دلچسپیاں رکھتے ہیں ، کھیل ، کود اور پڑھائی میں امتیازات حاصل کرتے ہیں اور ماں باپ کے ہاتھوں سے نکل چکے ہیں ، اس لیے وہ بھی (شعوری طور پر نہ سہی لا شعوری طور پر ہی سہی) چاہتا ہے کہ خود مختار ہو جنس مخالف میں دلچسپی لے اور ایسا کام کرے جو شہرت کا باعث ہو ۔ یہ سب کچھ صحیح ہے لیکن تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھنا چاہیے ۔ جب تک اندرونی غدودیں ، خصوصاً مولدہ (Gonad)

لعاب دار رطوبت پیدا نہ کریں کوئی شخص جنسی تعلقات کے قابل نہیں ہوتا ۔ لڑکوں کی نسبت لڑکیوں میں یہ غدودیں دو سال پہلے کام کرنا شروع کر دیتی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ لڑکوں کی نسبت لڑکیوں کی جنسی دلچسپیاں پہلے شروع ہو جاتی ہیں ۔ مولدہ غدودوں کے تفاعل سے لڑکیاں عورتیں بن جاتی ہیں اور لڑکے مرد ۔ ان کے جسم میں تبدیلیاں آتی ہیں ، آواز بدل جاتی ہے ، داڑھی مونچھ نکل آتی ہے ۔ لڑکیوں کا جسم نسوانی شکل اختیار کرتا ہے ، ماہواری آنی ہے وغیرہ وغیرہ ۔ ان تبدیلیوں کی بدولت کئی نئی دلچسپیاں پیدا ہوتی ہیں اور کئی چھٹ جاتی ہیں ۔ جنسی دلچسپیاں اسی جسمانی پختگی کی مرہون منت ہیں ۔ آزادی کا جذبہ بھی انہیں سے جنم لیتا ہے ۔ جسم کی پختگی احساس کمتری کو ختم کر دیتی ہے ۔ بچپن میں تو گھر کے بڑے بوڑھے جسمانی اور دماغی لحاظ سے اعلیٰ و ارفع ہوتے ہیں لیکن بالغ ہو کر بچے کو جسمانی کمتری کا احساس مٹ جاتا ہے ۔ دماغی کمتری بھی اسے خاص تنگ نہیں کرتی ۔ گو بڑے بوڑھے بہتر سوچ سکتے ہیں لیکن وہ بھی عقل رکھتا ہے اور مسائل کو اپنی ضرورت کے مطابق سمجھ سکتا ہے ۔ اب وہ دنیا کے مقابلے کے لیے تیار ہے ۔ اس میں طاقت ہے ، علم ہے ، دماغ ہے ، کسی چیز کی کمی نہیں ۔ پس آزادی کا ولولہ بھی جسمانی نشو و نما سے وابستہ ہے ۔ ناموری کی خواہش بھی جسمانی اور دماغی ارتقا کا نتیجہ ہے ۔ جسمانی طاقت کھیلوں کے میدان میں اس کا ساتھ دیتی ہے اور دماغی طاقت سے پڑھائی میں درجے حاصل کرتا ہے ۔

پس شخصیت کی نشو و نما میں پختگی اور مشق دونوں کو دخل ہے ۔ اصول تقویت بھی کام کرتا دکھائی دے گا ۔ اپنی امنگوں اور خواہشات کو پورا کرتے وقت نتائج خواہ اچھے نکلیں یا برے ان کا اثر بالغوں کے دل و دماغ پر ضرور پڑے گا ۔ نتائج اگر خوشگوار ہوں تو فعل عموماً دھرایا جاتا ہے اور اگر برے ہوں تو عموماً اس فعل سے احتراز کیا جاتا ہے ۔

ہنی قابلیت کی نشو و نما :

عمر کے ساتھ ساتھ بچے کا جسم بھی بڑھتا ہے اور ذہانت بھی۔
بنے (Binet) کا طریق آزمائش (Testing Method) اس مفروضہ پر
بنی ہے کہ ذہانت پندرہ یا سولہ سال تک بڑھتی ہے ، اور اس کا
ںحیح صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔۲ چنانچہ اس نے بچے کی مختلف عمروں
کے لیے سوال نامے بنائے، جن کے جوابات سے بچے کی ذہنی عمر کا
تہ لگ جاتا ہے۔ بینے (Binet) کا کہنا ہے کہ طبعی عمر اور
ہنی عمر ایک ساتھ نہیں بڑھتیں۔ بینے کے نظریہ کو سب ماہرین
فسیات نے تسلیم کر لیا ہے ، گو اس کے طریق آزمائش میں کئی
بدیلیاں کی گئی ہیں ، اور سولہ سال کی بجائے بیس سال تک ذہانت میں
رقی مان لی گئی ہے۔

جسمانی ترقی کا گراف آسانی سے بن سکتا ہے ، لیکن ذہنی ترقی کا
گراف ایسا آسان نہیں۔ پیدائش سے پہلے تو ذہنی ترقی کے آثار نہیں
ملتے ، لیکن پیدائش کے بعد دو سال کے عرصہ میں بچہ حیرت انگیز
رقی کرتا ہے۔ اس کا دنیا سے رابطہ قائم ہو جاتا ہے ، اور اس کے
اتھ پاؤں اس قدر سیکھ جاتے ہیں کہ شاید باقی ساری زندگی اتنا
ہ سیکھ سکیں۔ یہی حال دوسرے حواس کا ہے۔ بچہ ان سب سے
ائدہ اٹھاتا ہے اور انہیں استعمال کرتا ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے
کہ شباب سے پہلے یا کچھ دیر بعد ذہانت میں غیر معمولی تیز رفتاری
(Spurt) آتی ہے۔ شاید یہ بات ٹھیک ہو ، لیکن ابھی تک اس بیان
ی تائید میں تجربی شواہد نہیں ملتے۔ بہر حال شباب کی ذہنی
یز رفتاری ، شباب کی جسمانی تیز رفتاری کا مقابلہ نہیں کر سکتی ،
ر نہ ہی اس ذہنی تیز رفتاری کا مقابلہ کر سکتی ہے جو پہلے دو سال
یں ہوتی ہے۔

عام لوگوں کا خیال ہے کہ دماغی ترقی متوسط عمر تک جاری

رہتی ہے ، بعد میں اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے ۔ لیکن یہ خیال سراسر غلط ہے ، ذہانت کا زوال تو بہت پہلے ، پچیس تیس برس کی عمر ہی سے شروع ہو جاتا ہے ۔ اس ضمن میں کئی تجربے ہو چکے ہیں ، اور سب کے نتائج اس امر کی تائید کرتے ہیں کہ دماغی ہوشیاری ۱۷ یا ۲۰ سال کی عمر میں عروج پر پہنچ جاتی ہے اور پھر جلد زوال شروع ہو جاتا ہے ۔ کئی آزمائشوں میں بوڑھے آدمی جوانوں کے ساتھ ذخیرۂ الفاظ میں ہم پلہ دکھائی دیتے ہیں ، لیکن نئے ہنر سیکھنے میں یا تیز نگاہی میں وہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے ۔

یہ آزمائشیں گروہوں پر ہوئی ہیں ۔ لیکن یاد رہے کہ ان سے کسی فرد کے ذہنی ارتقاء کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا ، کیوں کہ ہر ایک فرد دوسرے سے مختلف ہے ، اور اس کی ذہنی اور جسمانی ترقی بھی دوسروں سے مختلف ہو سکتی ہے ۔ لہٰذا گروہوں کے نتائج کو افراد پر چسپاں کرتے وقت خاص احتیاط برتنی چاہیے ۔

ہمیں دو چیزوں، تحصیل (Achievement) اور صلاحیت (Capacity) میں فرق کرنا چاہیے ، کیونکہ تحصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ فرد نے اب تک کیا کیا ہے ، اور صلاحیت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سیکھ کر فرد کیا کچھ کر سکتا ہے ، پختگی کے بعد آموزش کا دور شروع ہوتا ہے ۔ ہر فرد کے لیے لازم ہے کہ وہ کچھ عرصہ مشق اور آموزش میں گزارے ، تاکہ اپنی قابلیتوں اور کارناموں میں کمال حاصل کرے ۔ اس کے لیے زیادہ وقت نہیں چاہیے ۔ علم و فن میں نئی نئی ایجادات اور نئے نئے انکشافات ، بیس سے تیس سال کی عمر والے لوگوں نے کیے ہیں ، اور اس عمر کے بعد زوال کا دور آتا ہے ۔ یاد رہے کہ پختگی کے ساتھ ہی ذہنی عروج نہیں آتا ، کیوں کہ جب تک مناسب مہارتیں سیکھ نہ لی جائیں ، اور مناسب علم حاصل نہ کر لیا جائے ، جس کے لیے وقت درکار ہے ، قابلیتیں اپنے پورے

آب و تاب سے کام نہیں کرتیں ۔ یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب قابلیتیں عروج پر پہنچتی ہیں تو وہاں قائم کیوں نہیں رہتیں ؟ فوراً کیوں ہی گھٹنے لگتی ہیں ؟

اس سوال کا جواب کئی طرح سے دیا جا سکتا ہے ۔ اول تو یہ کہ کئی آدمی محرکات (Motives) کھو بیٹھتے ہیں ، اور پرانی شہرت پر گزارا کرتے ہیں ۔ جس شوق اور انہاک سے انھوں نے کام شروع کیا ، وہ شوق کچھ نتائج حاصل کرنے کے بعد جاتا رہا ، یا جس ادارے نے پہلے مالی امداد دی ، وہ ادارہ سست پڑگیا۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ نئے خیالات نہیں سوجھتے ،کبھی طبیعت میں جولانی تھی، نئے نئے مضامین آتے تھے ، مگر اب زندگی کی پریشانیوں نے دماغ کو معطل کر دیا ہے ۔ تیسری وجہ سن رسیدہ ہونا ہے ۔ بڑھاپے سے پہلے ہی اعضا کی کارکردگی میں فرق آ جاتا ہے ۔ جسمانی طاقت بیس برس کے بعد گھٹنی شروع ہو جاتی ہے ، کانوں میں انحطاط بیس برس سے پہلے آ جاتا ہے ۔ بعض اونچی سریں سننے کی صلاحیت تو بیس برس کی عمر سے پہلے ہی چھن جاتی ہے ، بینائی بھی کم ہو جاتی ہے ، اگرچہ ذرا دیر سے ، اور جنسی تفاعل میں بھی کمی واقع ہو جاتی ہے ، جلد پتلی پڑ جاتی ہے ، اور بالوں کا رنگ ہلکا ہو جاتا ہے ۔ علاوہ ازیں اور بھی عضویاتی تبدیلیاں آ جاتی ہیں ۔ عقلی قابلیتیں ذرا دیر سے گھٹتی ہیں ۔ بعض بوڑھے آدمی خوب سوچتے سمجھتے ہیں ، لہٰذا بوڑھے آدمیوں کو بے کار نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے ۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جوان آدمی بوڑھوں کا منہ تکتے رہیں ، اور اپنے خیالات کو عملی جامہ نہ پہنائیں ۔ دماغی اور جسمانی عروج کا عرصہ زیادہ لمبا نہیں ہوتا لہٰذا اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے ۔

چھٹا باب

محرکات (Motives)

اپنے کالج کے ٹورنامنٹ تو آپ نے دیکھے ہی ہوں گے ، کتنا شور و غوغا ہوتا ہے ۔ دونوں کالجوں کے لڑکے اپنی اپنی ٹیم کی حمایت میں نعرے لگاتے، تالیاں بجاتے ہیں ، شعر پڑھتے ہیں اور کبھی کبھی مغلظات پر بھی اتر آتے ہیں—یہ کیوں ؟ دونوں ٹیموں کی طاقت کا اندازہ تو پہلے سے ہی ہوتا ہے کیوں کہ وہ کئی میچ کھیل چکی ہوتی ہیں ۔ کہیں سے میچ جیتا ہے اور کہیں ہارا ہے ۔ ایک حساب دان اس ہار جیت کے اعداد و شمار سے نتیجہ نکال سکتا ہے کہ اس ٹورنامنٹ میں کون جیتے گا یا ہارے گا ؟ پھر یہ ہو ہو ہا ہا کیوں ؟ یہ بغلیں بجانا کس لیے ؟ یہ تالیاں کیوں ؟ لوگوں کا ہجوم کس مطلب کے لیے ؟ کیا لوگ گھر بیٹھے ہوئے یہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ٹورنامنٹ کا کیا نتیجہ نکلے گا ؟ وہ دور دراز سے کرایہ خرچ کر کے میچ دیکھنے کیوں آتے ہیں؟ آپ کہہ سکتے ہیں کہ میچ گنے ستھے حساب سے نہیں ہوتے ان میں اتفاق کو بڑا دخل ہوتا ہے ۔ کئی دفعہ کمزور ٹیمیں جیت جاتی ہیں ۔ اتفاقاً گول ہو جاتے ہیں ۔ اور ہمارے اندازے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں ۔ اس کے علاوہ کھلاڑیوں کی ذاتی قابلیت اور مہارت کا اندازہ کسی کو نہیں ہوتا ۔ کوئی کھلاڑی اچانک چمک اٹھتا ہے ، اس کا کھیل تماشائیوں کو مسرور کرتا ہے ۔

جو وجوہات بیان کیے گئے ہیں ، وہ سب ٹھیک ہیں ۔ کھیل میں اتفاق کو دخل ہے ۔ کھیل میں کھلاڑیوں کی ذاتی قابلیتوں سے شناسائی ہوتی ہے ، لیکن اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ

شور و غوغا ، شعر بازی اور تالیوں سے اپنی ٹیم کا دل بڑھتا ہے اور دوسری ٹیم بد دل ہو جاتی ہے - اسی خیال سے پرنسپل صاحبان میچ کے دن کالج کو بند کرتے ہیں ، تاکہ لڑکے اپنی ٹیم کا دل بڑھائیں -

دل بڑھانے سے کیا مطلب ہے ؟ دل کیوں بڑھایا جاتا ہے ؟ لوگ کیوں دل بڑھاتے ہیں ؟ یہ سوالات عملی زندگی میں بڑے اہم ہیں - ان سوالات کی تہہ میں ایک مفروضہ ہے اور وہ یہ کہ محض بیرونی ماحول اور مہیجات کے مطالعہ سے کردار کے متعلق پیشین گوئی نہیں ہو سکتی - بیرونی ماحول کے علاوہ اندرونی ماحول بھی ہے ، جو اہمیت میں بیرونی ماحول سے بڑھ چڑھ کر ہے - اندونی ماحول ، جو متذکرہ بالا مثال میں دل کے نام سے پکارا گیا ہے ، نفسیاتی زبان میں محرکات کہلائے گا -

ایک اور مثال لیجیے - لوگ صبح سے شام تک فیکٹریوں میں کیوں کام کرتے ہیں ؟ کیا وہ بھوک سے مجبور ہیں یا بچوں کی محبت اور ان کی پرورش کا خیال انھیں شبانہ روز محنت پر اکساتا ہے ، اور یا وہ اس لیے کام کرتے ہیں کہ وہ نکما نہیں کہلانا چاہتے ؟ ماہر مدنیات کے لیے یہ سوالات بڑے وزنی ہیں - وہ یہ بھی دیکھنا چاہتا ہے کہ لوگ کون کون سی چیزیں خریدتے ہیں اور کیوں ؟ اگر نئی چیز خریدنے کے لیے انھیں آمادہ کرنا ہو تو کون سی ترکیب کرنی چاہیے ؟ کس اندرونی محرک کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے ، تاکہ خاص قسم کی اشیا بکیں ؟

اب قانون کو لیجیے - ایک پولیس انسپکٹر سے دریافت کیا گیا کہ وہ قتل کے مقدمے میں کیسے کارروائی شروع کرے گا - اس نے جواب دیا کہ پہلے تو وہ قتل کی غایت ڈھونڈے گا اس کے بعد تفتیش کا پروگرام بنائے گا - غایت کو نفسیات میں محرک کہا جاتا ہے - آج کل عدالتوں میں محرکات کو دیکھے بغیر سزائیں نہیں دی جاتیں - اتفاقی موت اور ارادی موت کی سزا برابر نہیں ہوتی - دوسرے جرائم

ہیں بھی محرکات دیکھے جاتے ہیں۔ انسان چوری کیوں کرتا ہے ؟ جھوٹ کیوں بولتا ہے ؟ دغا کیوں کرتا ہے ؟ دوسرے کی بیوی کو کیوں لے اڑتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان جرائم کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ان وجوہات کو دریافت کرنا اور سزا کو ان کے مناسب بنانا فلسفہ قانون کا کام ہے۔

تعلیم کو لیجیے۔ آج کل کا فلسفہ تعلیم گزشتہ فلسفہ تعلیم سے بہت مختلف ہے۔ پرانے وقت میں طلبہ کو منفعل (Passive) بے حرکت اور جامد شے سمجھ کر ان کے ذہنوں کو مختلف معلومات سے بھرا جاتا تھا۔ اب طالب علموں کو فاعل (Active) حرکی اور جاندار اشخاص جان کر طریقے اور نصاب تعلیم کو ان کی ضرورت کے مطابق ڈھالا جاتا ہے۔ تعلیم کا مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک بچوں میں پڑھنے کا شوق نہ ہو۔ ایک پرانی کہاوت ہے کہ آپ گھوڑے کو پانی تک لے جا سکتے ہیں لیکن پانی پینے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ گھوڑا اسی وقت پانی پیے گا جب اسے پیاس ہوگی۔ اسی طرح بچوں کو سکول میں لایا توجا سکتا ہے لیکن جب تک ان کی دل چسپیوں کو بیدار نہ کیا جائے اور ان کے محرکات کو برسر کار نہ لایا جائے تعلیم کی غرض و غایت پوری نہیں ہوتی۔

ان چند مثالوں سے واضح ہو گیا ہوگا کہ اگر ہمیں یہ دریافت کرنا ہو کہ بیرونی مہیجات کے علاوہ اندرونی مہیجات کیا تھے یا کیوں کسی شخص نے ایک رویہ اختیار کیا اور دوسرے کو مسترد کر دیا یا ایک فعل کیا اور دوسرے سے احتراز کیا تو ہمیں محرکات کا حوالہ دینا ہوگا۔ووڈ ورتھ کے خیال میں[1] نفسیات میں تین سوال اٹھائے جاتے ہیں۔

۱۔ فرد کیا کرتا ہے ؟

۱۔ ملاحظہ ہو اس کی کتاب Psychology - صفحہ ۱۹۵ -

۲۔ فرد کیوں ایسا فعل کرتا ہے ؟

۳۔ فرد کیسے یہ فعل کرتا ہے ؟

'کیوں' کا جواب محرکات سے دیا جاتا ہے ۔

تیسرے باب میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ نفسیاتی واردات کو سمجھنے کے لیے ہمارا فارمولا S–O–R ہے ۔ O سے مراد عضوید ہے ۔ عضویہ میں کچھ تو مستقل خصائص ہیں کچھ عارضی ۔ اس کے علاوہ ایسے مشاغل جن میں فرد مصروف ہو وہ بھی عضویہ میں شامل ہیں ۔ جب محرکات بیدار ہو جائیں تو ان کا شمار مشاغل اور مصروفیت میں ہوگا ۔ مصروفیات تب ختم ہوتی ہیں جب ان کا مقصد حاصل ہو جائے ۔ مقصد (Goal) کو ترغیب (Incentive) اور جزا (Reward) بھی کہا جاتا ہے ۔ جب بھوک کا محرک کار فرما ہو تو اس کا مقصد خوراک ہے ۔ خوراک کو تبھی ترغیب کہا جائے گا جب O یعنی عضویہ بھوکا ہو ۔ اگر بھوک نہ ہو تو لذیذ خوراک بھی اچھی نہیں لگتی ۔

محرکات کی جماعت بندی (Classification of Motives) ۔

محرکات کی صف بندی کئی طریقوں سے ہو سکتی ہے ۔ لیکن آج کل کے ماہرین نفسیات تین قسم کے محرکات میں تمیز کرتے ہیں ۔

۱۔ حیاتیاتی یا عضویاتی محرکات ۔

۲۔ اشتہات اور کراہتیں (Desires and Aversions) ۔

۳۔ محرکات جن کا انحصار فرد اور ماحول کے تعلق پر ہو ۔ یہ دو قسم کے ہیں :

(الف) ہنگامی محرکات (Emergency Motives) ۔

(ب) خارجی محرکات (Objective Motives) ۔

حیاتیاتی محرکات :

سائنس دان بتاتے ہیں کہ اندرونی توانائی کو واگزار کرنے

والے مہیجات اکثر بیرونی ہوتے ہیں - ہوا کی لہریں قوت سامعہ کو بیدار کرتی ہیں اور برق مقناطیسی روئیں قوت بصارت کو - اسی طرح کیمیائی عناصر شامہ اور ذائقہ کے اعصاب کو اور ٹمپریچر کا اتار چڑھاؤ جلد کے درآمد مراکز کو متاثر کرتے ہیں - فرض کیا کوئی آدمی سٹیشن کی طرف بھاگا جا رہا ہو اسے پیچھے سے چھرا گھونپیں - یا اس کا نام پکاریں یا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیں - یا زور زور سے کسی مشہور سرکس کی اطلاع دیں تو دیکھیں گے کہ اس شخص کے عضویاتی مراکز فوراً بیدار ہو جاتے ہیں اور کسی نہ کسی فعل پر اس شخص کو آمادہ کر دیتے ہیں -

لیکن یہ مت خیال کیجیے کہ انسان بیرونی مہیجات کے ہاتھوں کٹھ پتلی ہے ، یا قسمت نے محض اس کو فٹ بال بنا دیا ہے کہ جدھر ٹھوکر لگی ادھر کا رخ اختیار کر لیا - بیرونی مہیجات صرف باطنی توانائی کو واگزار کرتے ہیں - عضویہ اس واگزار توانائی کو کام میں لائے گی اور مناسب رد عمل پیش کرے گی - افعال اضطراری (Reflex Actions) تو سراسر بیرونی مہیجات کا نتیجہ ہیں - لہٰذا ان کی توجیہہ ہمیں عضویہ کی اندرونی کیفیات میں نہیں ڈھونڈنی چاہیے - عضویہ کے توازن میں فرق ضرور آتا ہے لیکن توازن کو بحال کرنے میں عضویہ کا کام اتنا اہم نہیں جتنا بیرونی مہیجات کی نوعیت ، شدت یا مقدار کا ہے - اضطراری افعال قدرت کے طے شدہ اصولوں کے مطابق ظاہر ہوتے ہیں - مہیج آتے ہی رد عمل نمودار ہوتا ہے - اگرچہ اضطراری افعال عضویہ کی بقا کے لیے لابدی ہیں لیکن عضویہ انھیں جنم نہیں دیتا ان کا وجود بیرونی مہیجات پر منحصر ہے -

ہر عضویہ کی خواہش ہے کہ اپنے آپ کو احسن طریقہ پر برقرار رکھے تاکہ اس کے عضویاتی تقاضے نہایت عمدگی سے پورے ہو سکیں - لہٰذا اس کے تفاعل کا سرچشمہ بیرونی مہیج میں نہیں ہوتا بلکہ ان بے شمار پیچدار توانائی مبادلوں (Energy Exchanges)

میں ہوتا ہے جو ہماری ذات کے اندر پائے جاتے ہیں۔ انھی پر زندگی کے ترقی یافتہ احوال و افعال کا دار و مدار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گھوڑے کو پانی تک تو لے جا سکتے ہیں لیکن اسے پانی پینے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ جانوروں اور حیوانوں میں نر اور مادہ ایک دوسرے میں اس وقت تک دلچسپی نہیں لیتے جب تک خاص عضویاتی حالت میں نہ ہوں۔ شیر کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کبھی حملہ نہیں کرے گا جب تک وہ بھوکا نہ ہو یا اسے جان کا خوف نہ ہو، اسی طرح بچہ بھوکا ہوگا تو کھانا کھائے گا، تھکا ہوا ہوگا تو لیٹے گا، درد میں ہوگا تو ماں کی طرف دوڑے گا، اگر اسے ٹھنڈ لگ رہی ہو تو کپڑے پہنے گا۔

ان امور سے واضح ہوتا ہے کہ گو اضطراری افعال کا دار و مدار بیرونی مہیجات پر ہے لیکن انہیں چھوڑ کر باقی ہر چھوٹے بڑے فعل کا منبع عضویہ کی اندرونی حالت اور کیفیات میں ہے۔ عمر اور تجربے کے ساتھ ساتھ انسانی دلچسپیاں بڑھتی ہیں۔ خواہشات سماجی اور رومانی رنگ اختیار کر لیتی ہیں۔ مقاصد زیادہ صاف ستھرے ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان تمام امور کے باوجود ان افعال کی بنیادیں بدستور عضویاتی توانائی میں رہتی ہیں۔

پچھلے باب میں (Homeostasis) توازنی میلان کا ذکر آ چکا ہے۔ اس میلان کی رو سے ہر عضویہ اپنے اندرونی توازن کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ عضویاتی ماہروں کا کہنا ہے کہ اس میلان سے ہمیں عضویہ کے بنیادی تفاعل کا علم ہوتا ہے۔

اس میلان کی طرف پہلے پہل کلائیڈ برنرڈ (Claude Bernard) نے توجہ دلائی۔ اس کا کہنا ہے کہ ہر عضویہ کے دو ماحول ہوتے ہیں۔ ایک بیرونی اور دوسرا اندرونی۔ بیرونی ماحول تمام عضویہ کو گھیرے ہوئے ہے۔ اندرونی ماحول جسم کے اعضا، بافتوں

(Tissues) اور سیال گشتی مادہ پر حاوی ہے یہ مادہ ہر خلیہ کو خوراک پہنچاتا ہے اور فضلہ خارج کرتا ہے۔ عضویہ کا مستقل طور پر ایک ہی حالت پر رہنا اندرونی ماحول کی بدولت ہے۔ یہی ماحول ٹمپریچر، آکسیجن، پانی، چربی، شکر اور نمک کی معین مقدار جسم میں قائم رکھتا ہے۔

کلائیڈ برنرڈ کے نظریے کو تجربی طور پر پرکھا گیا اور اس کی تفصیلات معلوم کی گئیں۔ محققین کا کہنا ہے کہ کلائیڈ برنرڈ کا نظریہ سو فی صد درست ہے۔ ہر عضویہ اپنے توازن کو قائم رکھتا ہے، اور اگر یہ توازن بگڑ جائے تو ہر ممکن کوشش سے اسے بحال کیا جاتا ہے۔

اس توازنی میلان کو جو کہ خود انضباطی (Self regulating) ہے کینن (Cannon) نے Homeostasis کا نام دیا۔ سٹیگنر کے مطابق یہ نظریہ انسانی کردار کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

رچٹر (Richter) نے سفید چوہوں کی اندرونی غدودیں یکے بعد دیگرے کاٹ دیں اس سے چوہوں کے عضوی توازن میں فرق پڑ گیا۔ ایک تجربے میں چوہے کی کظری (Adrenal) غدود (وہ غدود جو خون کے دورے اور عضلات پر ضبط رکھتی ہیں) کاٹ دی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گردوں نے کثرت سے نمک خارج کیا۔ تجربہ کنندہ نے کچھ چوہے پنجرے میں رکھے جہاں نمکین پانی بھی تھا اور نل کا پانی بھی۔ چند ہفتوں کے بعد چوہوں کی کظری غدودیں نکال دی گئیں۔ فوراً ہی چوہوں نے زیادہ سے زیادہ مقدار میں نمکین پانی پیا۔ پہلے کی نسبت یہ بیس گنا زیادہ تھا۔ اس طرح سے ایک تین سال کا لڑکا دیکھا گیا جو بے تحاشا نمک کھاتا تھا۔ اس کی خوراک پر پابندی لگا دی گئی اور نمک کی مقدار معمول کے مطابق کر دی گئی۔ یہ بچہ سات روز میں مر گیا۔ موت کے بعد جب اس کی لاش کا معائنہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ بچے کی کظری غدود خراب ہو چکی تھی اور ڈاکٹروں کو اس کا علم نہ تھا۔ ایک اور تجربہ جو توازنی میلان

کو ثابت کرتا ہے یوں ہوا کہ کچھ چوہے لیے گئے اور ان کے سامنے مختلف قسم کے کھانے رکھے گئے۔ چوہے ہر قسم کا کھانا کھاتے تھے۔ ان چوہوں میں سے چند ایک کی لبلبہ غدود (Pancreas) کو کاٹ دیا گیا۔ یہ چوہے اب ہر قسم کی خوراک نہیں کھاتے تھے، بلکہ صرف وہ خوراک کھاتے تھے جو چربی کاربو ہائیڈریٹ (Carbohydrate) کی کمی کو پورا کر سکے (لبلبہ کی عدم موجودگی میں چربی اور کاربوہائیڈریٹ کا توازن بگڑ جاتا ہے)۔ ایک اور تجربہ بلغمی غدود (Pituitary Gland) پر ہوا۔ اگر اس غدود کو نکال دیا جائے تو جسم کا ٹمپریچر گر جاتا ہے جس جانور کی یہ غدود خراب ہو جائے یا جاتی رہے وہ اپنی رہائش کی جگہ زیادہ وسیع اور زیادہ گرم بنائے گا۔چوہوں پر یہ تجربہ بھی ہوا۔ چوہوں کے قریب کاغذ رکھ دیے گئے۔ جن چوہوں کی بلغمی غدود نکالی گئی تھی وہ اپنے بلوں میں کاغذوں کی بڑی مقدار لے گئے، کیونکہ وہ ان کاغذوں میں جسم لپیٹتے ہیں اور اس طرح انھیں سردی کم لگتی ہے۔



شکل نمبر ۱۲

بلغمی غدود کی تلفی کے بعد چوہا کاغذات اپنے بل میں لے جا رہا ہے

توازنی اصول سے پتہ چلتا ہے کہ عضویہ کا بنیادی اصول اپنے توازن کو قائم رکھنا ہے اور عضویاتی سطح پر بے شمار ایسے احوال و افعال یا حرکات و سکنات ہوتے ہیں جو محض توازن قائم رکھنے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ یہ توازن اس لیے قائم رکھا جاتا ہے کہ زندگی کا دار و مدار اسی پر ہے۔ اگر توازن بگڑ جائے تو انسان بیمار ہو جاتا ہے اور اگر یہ اس قدر بگڑ جائے کہ اس کی بحالی ممکن نہ ہو تو زندگی ختم ہو جاتی ہے۔

توازن کئی طرح سے بگڑ جاتا ہے۔ بھوک، پیاس، جنسی خواہش اور اس قسم کی دیگر اشتہات فعلیاتی توازن کو درہم برہم کر دیتی ہیں۔ جب تک یہ توازن قائم نہ ہو جائے ہر جاندار تفاعل کی صورت میں رہتا ہے۔ اس کی سرگرمی تب ختم ہوتی ہے جب توازن ٹھیک ہو جاتا ہے۔ ایسے فطری تقاضوں کو عضویاتی محرکات کہہ سکتے ہیں۔

نارمن ایل من (Norman L. Munn) کا کہنا ہے[1] کہ حیاتیاتی تقاضوں کی پہچان ذیل کے تین حوالوں سے ہو سکتی ہے۔

۱۔ یہ تقاضے کس فعل پر ختم ہوئے؟

۲۔ کس شے کے فقدان سے تقاضے پیدا ہوئے؟

۳۔ کون سے فعلیاتی عوامل اس تقاضے کی تہہ میں کار فرما تھے؟

مثلاً بھوک کو لیجیے۔ یہ تقاضا کھانے پہ ختم ہوتا ہے۔ خوراک کے فقدان سے پیدا ہوتا ہے، اور اس کی تہہ میں معدے کا سکڑنا اور خون کی شکر کی کمی جیسے فعلیاتی عوامل کار فرما ہیں۔ لیکن یاد رکھیے کہ ہر فطری تقاضے میں ان تینوں خصائص کا پایا جانا ضروری نہیں۔ مثلاً کھوج لگانے (Exploratory) کے تقاضے کو لیجیے۔ یہاں پر ہمیں پتہ نہیں چلتا کہ عضویہ کو کس چیز کی

۱۔ ملاحظہ ہو اس کی Psychology مطبوعہ نیویارک ۱۹۴۶ء، صفحہ ۲۰۰۔

کمی ہے ، جس کی وجہ سے یہ تقاضا بیدار ہوا ۔ اس کی تہہ میں جو فعلیاتی عوامل کار فرما ہیں ، ان کا بھی ہمیں علم نہیں ۔ ہمیں صرف یہ پتہ ہے کہ وقتاً فوقتاً جانور پر زور طریقے سے مصروف کار نظر آتے ہیں ۔ انھی زور دار مصروفیتوں سے کھوج لگانے کے تقاضے کا اندازہ کیا جاتا ہے ۔

ذیل میں چند ایک حیاتیاتی تقاضوں کا ذکر کیا جاتا ہے :

(۱) **بھوک :** ہم ابھی ذکر کر آئے ہیں کہ بھوک کی تہہ میں کچھ فعلیاتی عوامل ہیں ۔ ان میں ایک معدے کا سکڑنا ہے ۔ آئیے تجربی طور پر اسے دریافت کریں ۔ مطالعۂ باطن تو صرف یہ بتاتا ہے کہ بھوک میں تحسسات (Sensations) اٹھتی ہیں ، جنھیں ہم محسوس بھی کرتے ہیں اور بتا بھی سکتے ہیں ۔

متعدد تجربوں سے معلوم ہوا ہے کہ جب معدہ خالی ہوتا ہے ، تب سکڑتا ہے ۔ کینن (Cannon) اور کارل سن (Carlson) نے نہایت دلچسپ تجربہ کیا ۔ انھوں نے ایک ربڑ کی نالی لی ، جس کے ایک سرے پر ربڑ کی تھیلی تھی ، اسے ہوا بستہ (Air-Tight) بنایا گیا ۔ یہ نالی اندر گزاری جاتی ہے ۔ تجربہ کنندہ نالی کی تھیلی کو معدے کے اوپر والے حصہ پر رکھتا ہے ، اور اس نالی میں ہوا بھری جاتی ہے حتیٰ کہ یہ معدے کی دیوار سے ٹکراتی ہے ، اور اس نالی کا حصہ جسم سے باہر ایسی مشین سے باندھ دیا جاتا ہے ، جو نالی کے تاثرات کو خود بہ خود درج کر لیتا ہے ۔

اس تجربے کے لیے لوگوں کو تربیت دی جاتی ہے ۔ وہ نالی کو نگلنا ، اور بعد میں پر امن طریقے سے بیٹھا رہنا سیکھتے ہیں ، تاکہ بھوک لگنے پر ان کے معدے کی حرکات کو ریکارڈ کیا جا سکے ۔ تجربہ بتاتا ہے کہ کھانے کے بعد معدہ سکڑنے نہیں لگتا ، بلکہ کھانے کے بعد تو ہاضمے کا عمل شروع ہوتا ہے ، لیکن جونھی معدہ

خالی ہونا شروع ہوتا ہے ، سکڑنے کی حرکات نمایاں ہوتی جاتی ہیں -
کھانا کھانے کے ڈیڑھ گھنٹے بعد یہ حرکتیں شروع ہو جاتی ہیں ،
لیکن جب وقت زیادہ گزر جاتا ہے تو حرکات کی مقدار بڑھ جاتی ہے -
شروع میں یہ حرکات ہلکی مدھم سی ہوتی ہیں ، لیکن بعد میں تیز سے
تیز تر ہو جاتی ہیں -



کینن اور کارل سن کا تجربہ

اس تجربے سے ثابت ہوا کہ بھوک میں معدہ سکڑتا ہے ، لیکن
یہ تجربہ قطعی طور پر درست نہیں ، کیوں کہ بعض تجربے اس کی توثیق
نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر یہ تجربہ ملاحظہ کیجیے - ایک
تجربہ کنندہ نے چوہے کا معدہ نکال لیا ، لیکن اس کے باوجود بھی
چوہے کو بدستور بھوک لگتی رہی - انھیں ایسا پنجرہ سیکھنا پڑا ،

جس کے ایک کنارے پر خوراک تھی۔ معدے کے بغیر چوہوں نے بھی اس پنجرے کو ویسے ہی سیکھا ، جیسے معدے والے چوہوں نے۔ خیال یہ تھا کہ اگر معدے کی وجہ سے بھوک لگتی ہے ، تو جن چوہوں کا معدہ نکال دیا گیا ہے ، وہ یا تو پنجرہ سیکھنے کی زحمت گوارا نہ کریں گے ، یا اگر سیکھیں گے تو نہایت بد دلی سے ۔ لیکن تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ معدے کی موجودگی یا عدم موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا ، بھوک بدستور لگتی رہتی ہے[1] ۔ رش (Ruch) کا کہنا ہے کہ اس تجربے سے دو صورتیں پیدا ہوتی ہیں ۔

(۱) معدے کا سکڑنا ، بھوک کے اسباب میں سے ایک سبب ہے ۔

(۲) بھوک کا اصلی سبب عضویہ کے کیمیائی عوامل ہیں ۔ اور معدے کا سکڑنا ان کی ضمنی پیداوار ہے ۔

رش کہتا ہے کہ دوسرا مفروضہ تجربی طور پر نہیں پرکھا جا سکتا ، کیونکہ اس تجربے میں ضروری ہے کہ معدے کے سکڑنے کے علاوہ باقی عضویہ کے عوامل میں کوئی فرق نہ آئے ، اور یہ ممکن نہیں ہے ۔ بعض تجربوں سے پتہ چلتا ہے کہ اگر بھوکے کتے کے خون کو ایسے کتے کے جسم میں داخل کر دیا جائے ، جو ابھی ابھی کھانا کھا کر بیٹھا ہو ، تو اس کا معدہ سکڑنے لگتا ہے ۔ لیکن کوئی ایسا فیصلہ کن تجربہ نہیں ہوا ، جو یہ بتا سکے کہ آیا بھوک کا سبب معدے کا سکڑنا ہے یا نہیں ؟

ان تجربوں کے بعد اب بھوک کا اثر ملاحظہ کیجیے ۔ اس ضمن میں بھی کئی تجربات ہوئے ہیں ۔ ان سب کا ماحصل یہ ہے کہ بھوک سے ذہنی اور جسمانی طاقت بڑھ جاتی ہے ۔ ایک تجربہ انسانوں پر ہوا ۔ ان کے معدوں میں ربڑ کی نالی اتاری گئی ، جس کے سرے پر ربڑ کی تھیلی تھی ، جو معدے کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی اور اس کے

۱۔ ملاحظہ ہو باش (Bash) کا مضمون Journal of Comparative Psychology ، ۱۹۳۹ع ، صفحہ ۱۶۰-۱۳۷ ۔

دباؤ یا پھیلاؤ کو ظاہر کرتی تھی - جن لوگوں پر تجربہ ہو رہا تھا ، ان کے معدے کبھی سکڑتے تھے اور کبھی نہیں سکڑتے تھے - دونوں حالتوں میں ان سے کہا جاتا تھا کہ وہ ڈائنمو میٹر (Dynmometer) دبائیں یا ذہانت کا ٹیسٹ لیں ، یا اپنی مجموعی جسمانی حرکات کی پیمائش کرائیں - ان تجربوں سے معلوم ہوا کہ بھوک میں انسان ڈائنمو بہتر دباتا ہے ، ذہانت کی پیمائش میں زیادہ نمبر پاتا ہے اور اس کا جسم زیادہ ہوشیار ہوتا ہے -

ایک اور تجربہ سوتے ہوؤں پر ہوا - سونے کی حالت میں ربڑ کی نالی ان کے معدہ میں تھی ، اس سے پتہ چلتا تھا کہ کب معدہ سکڑ رہا ہے اور کب معمول پر ہے - معدہ سکڑنے کے بعد اور اسی طرح جب معدہ سکڑ نہ رہا ہو ، اس کے بعد ان لوگوں کو جگایا گیا ، اور پوچھا گیا کہ آیا تم نے کوئی خواب دیکھا ؟ پتہ چلا کہ بھوکے معدے کی حالت میں خواب زیادہ آتے ہیں -

تجربوں میں یہ بھی ثابت ہوا کہ بھوک میں خوب پڑھا اور سیکھا جاتا ہے - پنجروں میں چوہے اور بلیاں اسی وقت بھاگتے ہیں ، جب وہ بھوکے ہوں - اگر انھوں نے کھانا سیر ہو کر کھایا ہو تو پنجرے کو کبھی نہیں سیکھیں گے -

(۲) پیاس : اس سلسلے میں کئی دلچسپ تجربے ہوئے ہیں - معلوم یہ کرنا تھا کہ پیاس کا سبب حلق کا خشک ہونا ہے یا کچھ اور ؟ ایک تجربے میں اٹھارہ خرگوش لیے گئے ، اور انھیں سات دن تک پیاسا رکھا گیا - اس کے بعد ان میں سے بارہ خرگوشوں کو ایسا ٹیکہ لگایا گیا ، جس سے منہ اور حلق تر رہتا ہے - یاد رہے کہ جہاں تک جسم میں پانی کا تعلق تھا ، سب خرگوش برابر تھے - جن خرگوشوں کے حلق تر رہنے لگے تھے ، ان کے جسموں میں پانی کی مقدار میں اضافہ نہیں ہوا تھا - جب ان تمام خرگوشوں کو پانی پلایا

گیا ، تو جن خرگوشوں کے حلق خشک رہے، انھوں نے خوب پانی پیا[1] ۔

اس تجربے سے ثابت ہوا کہ پیاس میں گلا خشک ہوتا ہے ، اور یہی پیاس کا سبب ہے ۔ لیکن اس کے مخالف تجربات بھی ہیں ۔ ایک کتا لیا گیا ، اور اس کی وہ نالی نکال دی گئی جو منہ سے معدے تک جاتی ہے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کتا جو پانی پیتا تھا ، وہ معدے تک نہیں پہنچتا تھا ، صرف اس کے حلق کو تر کرتا تھا ۔ یہ کتا بھی پانی اتنا ہی پیتا تھا ، جتنا کہ عام کتے پیتے ہیں ۔ اب اس تجربے کو بدلا اور ایک کتا لیا گیا ، جس کے پیٹ میں براہ راست پانی بھرا گیا یعنی پانی حلق کے ذریعہ داخل نہیں کیا گیا ، بلکہ حلق ویسے کا ویسے خشک رہا ۔ کتے کو فوراً پانی پلایا گیا ، اور دیکھا گیا کہ اس نے اس طرح پانی پیا جیسے اس کے جسم میں پانی تھا ہی نہیں ۔ یہ دونوں تجربے اس امر کو ظاہر کرتے ہیں کہ پیاس کی وجہ خشک حلق کے سوا اور کچھ نہیں ۔ لیکن ذرا انتظار کیجیے ، کیوں کہ ابھی تجربہ مکمل نہیں ہوا ۔ اگر اس کتے کو جس کے جسم میں پانی بھر دیا گیا ہے ، پندرہ منٹ کے بعد پانی پینے کے لیے دیں تو بالکل نہیں پیے گا ۔ اس سے ثابت ہوا کہ جسم میں پانی کی مقدار بھی پیاس کا سبب ہے ، اور کم از کم پندرہ منٹ کا وقفہ درکار ہے ، تا کہ بلغمی غدود (Pituitary Gland) اپنا کام کر سکے ۔

جیسے بھوک کے متعلق ماہرین وثوق سے نہیں کہہ سکے کہ اس کے مہیجات کیا ہیں ویسے ہی پیاس کے متعلق بھی ان کا علم ناکافی ہے ۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ بھوک کی طرح پیاس بھی زبردست فطری تقاضا ہے ۔ بھوک اور پیاس مٹانے کے لیے انسان زمین اور آسمان کے قلابے ملا دیتا ہے ۔ جانور بھی پیاس سے

۱۔ ملاحظہ ہو جی ٹی پیک (G. T. Pack) کا مضمون Proceedings of National Academy of Sciences، ۱۹۲۵ء، صفحہ ۶۱۶-۶۱۳ ۔

بے چین ہو جاتے ہیں ، اور جب تک پیاس نہ بجھے ، انھیں آرام نہیں آتا ۔

(۳) ہوا : زندگی کے لیے سانس ضروری ہے ۔ ہوا نہ ملے تو انسان مر جائے ، لیکن عام طور پر ہمیں اس فطری تقاضے کا پتہ نہیں چلتا ، کیوں کہ ہوا عام ہے ، اور کثرت سے ہر طرف مل جاتی ہے ۔ لیکن اگر دم گھٹنے لگے تو ہوا کی قدر معلوم ہو جاتی ہے ۔ اگر ہوا سے آکسیجن خارج کر دی جائے تو کاربن ڈائی آکسائیڈ باقی رہ جائے گی ، جس سے دم گھٹے گا اور سارا عضویہ متأثر ہوگا ۔

بعض دفعہ یوں ہوتا ہے کہ آکسیجن کی مقدار گھٹ جاتی ہے لیکن کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار میں کمی نہیں ہوتی ۔ یہ تجربہ اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں پر یا اونچائی پر اڑان سے ہوتا ہے ۔ اس وقت عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے یا تو آدمی بے ہوش ہو جاتا ہے یا ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتا ہے ۔ اسے ضبط نہیں رہتا ، چیختا ، روتا اور لڑتا ہے ، حافظہ خراب ہو جاتا ہے ۔ حواس کام نہیں کرتے اور ٹانگوں پر رعشہ گر جاتا ہے ۔

تجربوں سے ثابت ہے کہ اگر آکسیجن کی مقدار میں کچھ کمی کر دی جائے تو بعض ہیجانی کیفیات ، جو عموماً دبی رہتی ہیں ، ظاہر ہو جاتی ہیں ۔

(۴) تھکاوٹ : انسانوں کو آرام کی ضرورت ہے ۔ تھکاوٹ سے بچنے کے لیے وہ ہزار ہا جتن کرتے ہیں ، لیکن تھکاوٹ کے عضویاتی اسباب کا خاطر خواہ علم ابھی تک حاصل نہیں ہوا ۔ لگاتار ورزش سے جسم کے کیمیائی عوامل میں فرق ضرور پڑتا ہے ۔ ایک قسم کا تیزاب خون اور عضلات میں جمع ہو جاتا ہے شاید اسی وجہ سے عضویہ آرام کا متلاشی ہوتا ہے ۔ آرام سے دوبارہ توافق نصیب ہوتا ہے اور جن عناصر نے تھکاوٹ پیدا کی ہو ان کو رفع کر دیا جاتا ہے ۔

(۵) نیند : نیند بھی ایک زبردست فطری تقاضا ہے لیکن ابھی

پتہ نہیں چلا کہ اونگھنے یا سونے کی جگہ تلاش کرنے میں
، سے درآمد اعصاب (receptors) کام کرتے ہیں ۔
بعض دوائیاں مثلاً کلورو فارم اور ایتھر جسم کو ڈھیلا کر دیتی
۔ ان سے نیند جیسی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور خیال پیدا ہوتا ہے
نیند کے اسباب کیمیائی ہیں ۔ کیمیائی عوامل ذہن پر بھی اثر
تے ہیں اور اعصابی مراکز پر بھی ، عضلات پر بھی اثر ہوتا ہے ۔
سے نیند آ جاتی ہے ۔
بعض دفعہ دماغ کے کسی خاص حصہ کو چوٹ آ جائے تو بھی
آ جاتی ہے کیونکہ یہاں پر وہ مراکز ہوتے ہیں جو نیند پر
رکھتے ہیں ۔
ایک نظریے کے تحت نیند ایک مشروط رد عمل (Conditioned
respo) ہے ، جو سیکھا جاتا ہے ۔ مثلاً مختلف لوگ مختلف مدت
لیے سوتے ہیں اور مختلف اوقات پر ، بعض دن کو سوتے ہیں بعض
کو ، بعض چند گھنٹے سوتے ہیں اور بعض اکثر سوتے رہتے ہیں ۔
بن کے متعلق مشہور ہے کہ وہ جب چاہتا تھا سو جاتا تھا اور
، چاہتا تھا اٹھ بیٹھتا تھا ۔
نیند کی اہمیت اور ضرورت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا ۔
کچھ دنوں کے لیے نیند نہ آئے تو آدمی ذہنی مریض بن جاتا ہے ۔
س والے بھی مجرموں کو خوب مرغن کھانا کھلا کر سونے نہیں
، اور انہیں بھگاتے ہیں ۔ نیند کا غلبہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ مجرم
یا جھوٹ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔
(٦) گرمی اور سردی : ہر انسان گرمی اور سردی سے متاثر
ہے ۔ ہمارا لباس ، ہمارا گھر ، ہمارے کھیل تماشے ، حتیٰ کہ ہمارا
؛ اس امر کی دلیل ہے کہ موسم کا اتار چڑھاؤ ، گرمی اور سردی
مدت کیسے اہم عناصر ہیں ۔ بعض لوگ تہذیب و تمدن ، مذہب

اور اقدار کو بھی آب و ہوا کے ساتھ منسلک کر دیتے ہیں -

گرمی اور سردی کے لیے جلد میں درآمد اعصاب موجود ہیں - اس کے علاوہ دماغ کا ایک حصہ جسے ، زیر عرشہ (Hypothalamus) کہتے ہیں ، ٹمپریچر سے متاثر ہوتا ہے - اسی کی بدولت ہمارا جسم گرمی اور سردی کو برداشت کرتا ہے اور اس کا ٹمپریچر یکساں رکھتا ہے -

خواہ موسم گرم ہو یا سرد - باہر لو چل رہی ہو یا برف پڑ رہی ہو ہمارے جسم کا ٹمپریچر ۹۸°ء۴ رہتا ہے - اس کی کیا وجہ ہے ؟ اگر جسم کے عمل کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ جتنی گرمی اس سے خارج ہوتی ہے اتنی پیدا کر لی جاتی ہے - گرمی دو قسم کی ہے ایک تو خارج میں اور دوسرے جسم کے اندر ، گرمیوں میں ہمارے اندر سے اتنی ہی گرمی نکلتی ہے جتنی سردیوں میں نکلتی ہے - اس کی وجہ حسب ذیل ہے -

سردیوں میں جسم کی سرگرمی تیز ہو جاتی ہے - اندرونی غدودیں زیادہ کام کرتی ہیں اور زیادہ مقدار میں افراز درقیہ (Thyroxin) اور کظری رطوبت (Adrenin) بناتی ہیں - اس رطوبت کی وجہ سے جسم میں زیادہ چستی آتی ہے اور زیادہ کام کرنے کو جی چاہتا ہے - سردیوں میں گرمیوں کی نسبت زیادہ کھیل تماشے ہوتے ہیں - اس کے علاوہ خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے اور خون دور نسیجوں (Tissues) میں چلا جاتا ہے جہاں ٹھنڈ نہیں لگتی - گرمیوں میں اس کے برعکس عمل ہوتا ہے - جسم کی گرمی گھٹ جاتی ہے ، جلد کی نسیں (Artries) پھیل جاتی ہیں تاکہ خون ٹھنڈا رہے - خون کا دورہ بھی تیز ہو جاتا ہے -

یہ حرکات خود بخود نمودار ہوتی ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جسم کا ٹمپریچر ہر حالت میں ایک ہی رہتا ہے - اگر یہ ٹمپریچر بڑھ جائے تو بخار ہوتا ہے ، اگر گھٹ جائے تو کوئی اور خرابی پیدا ہو جاتی

ہے، اور اگر بہت بڑھ جائے یا بہت گھٹ جائے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔

قدرت کے اس انتظام کو انسان بھی کئی طرح سے امداد پہنچاتا ہے۔ گرمیوں میں ہلکے پھلکے کپڑے پہنتا ہے۔ بجلی کے پنکھے چلاتا ہے۔ کولر اور ائر کنڈیشنر استعمال کرتا ہے یا پہاڑوں پر چلا جاتا ہے۔ سردیوں میں گرم کپڑے پہنتا ہے۔ آگ یا ہیٹر (Heater) سے کمرے گرم رکھتا ہے، کھیلیں کھیلتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

(۷) درد: درد بھی زبردست فطری تقاضا ہے۔ اس سے بچنے کے لیے ہزار ہا جتن کیے جاتے ہیں۔ کئی فلسفوں کی بنیاد ہی درد پر ہے۔ وقتی درد اتنا نہیں ستاتا جتنا دیرپا اور مسلسل درد ستاتا ہے۔ اگر انگلی جل جائے اور تکلیف فوراً رفع ہو جائے تو کسی تردد کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر درد بڑھ جائے یا بدستور قائم رہے تو ڈاکٹر کے پاس جانا پڑے گا اور اس کے بل ادا کرنے ہوں گے۔

زندہ رہنے کے لیے درد کا احساس نہایت ضروری ہے۔ زخموں اور چوٹوں میں اور اسی طرح اور بیماریوں میں درد ہوتا ہے۔ اور اگر درد نہ ہو تو شاید اکثر بیماریوں کا پتہ ہی نہ چلے۔ درد سے بچنے کے لیے کلوروفارم نکلا اور اب ہزاروں قسم کے ٹیکے اور دوائیاں ایجاد ہوئیں۔ اسپرو دیکھیے کتنی مقبول ہے اور کس بھاری مقدار میں کھائی جاتی ہے۔ وجہ صرف یہی ہے کہ درد کو دور کرتی ہے اور ہے بھی بہت سستی۔

(۸) احشا (Viscera) کا کھچاؤ: احشوں کا کھچاؤ بھی کئی تقاضوں کو پیدا کرتا ہے۔ جب معدے کا بلیڈر (Bladder) پھولتا ہے تو اعصابی مراکز بیدار ہوتے ہیں اور آرام کی خواہش ہوتی ہے۔ جب تک کھچاؤ دور نہ ہو چین نہیں آتا۔ اس کھچاؤ کے اسباب عضویاتی ہوتے ہیں۔ پس کھچاؤ کو رفع کرنے کے لیے یا ڈاکٹری نسخوں کی ضرورت پڑتی ہے یا علم صحت کے اصولوں کی پیروی کرنی ہوتی ہے۔

اشتہات اور کراہتیں (Attractions and Aversion)

بعض فطری تقاضوں کو ووڈورتھ پسند یا ناپسند (Likes and dislikes) کہتا ہے ان کو رش (Ruch) اشتہات اور کراہتوں کا نام دیتا ہے - حیاتیاتی محرکات کی طرح یہ بھی فطری اور غیر اکتسابی تقاضے ہیں - فرق صرف اتنا ہے کہ اشتہات اور کراہتوں کے بغیر بھی جیا جا سکتا ہے - ان کا وجود افراد کی زندگیوں سے اتنا گہرا تعلق نہیں رکھتا جتنا عضویاتی محرکات کا ہے - مثلاً اگر بھوک پیاس نہ لگے ، ہوا کی ضرورت محسوس نہ ہو تو انسانوں کا زندہ رہنا محال ہے - لیکن قدرتی پسندیں یا ناپسندیں جیسے گانے اور مٹھاس کے لیے ہو سکتی ہیں وقتی طور پر دبا دی جائیں یا بالکل ہی ختم کر دی جائیں تو ان سے طبعی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا -

ووڈورتھ نے بھی پسندوں اور ناپسندوں کو علیحدہ عنوان میں رکھا ہے لیکن ماہرین نفسیات اس بارے میں متفق نہیں کہ کون سے میلانات کو فطری پسندوں یا ناپسندوں میں شمار کیا جائے - مثلاً جنسی میلان کو من (Munn) ، ووڈورتھ (Woodworth) اور سٹیگنر (Stagner) عضویاتی محرکات سمجھیں گے اور اس کا شمار فطری پسندوں میں نہیں کریں گے - البتہ رش (Ruch) اسے پسندوں میں شمار کرتا ہے اور یہ دلیل دیتا ہے کہ جنسی میلان پر زندگی کی بقا منحصر نہیں ، لہٰذا اسے حیاتیاتی میلانات کی صف میں نہیں کھڑا کرنا چاہیے - رش (Ruch) اس کے عضویاتی پہلو سے انکار نہیں کرتا صرف اس کی اہمیت اتنی نہیں سمجھتا جتنی حیاتیاتی محرکات کی ہے -

جنسی اشتہا (Sex Appetite) : بھوک اور پیاس کے بعد شدت اور تیزی کے لحاظ سے جنسی محرک کا نمبر آتا ہے - یہ سچ ہے کہ اس کے بغیر بھی انسان زندہ رہ سکتا ہے لیکن گروہی زندگی کا قیام اور بقا سراسر اس میلان پر ہے - اس کے علاوہ یہ بھی یاد

رہے کہ ذہنی اور بدنی صحت بہت حد تک اس میلان کی خاطر خواہ تشفی پر منحصر ہے ۔ اگر بہت عرصہ تک اس میلان کو دبائے رکھیں یا تمام عمر اس کی تشفی نہ کر سکیں یا نہ ہونے دیں تو جسمانی صحت کے علاوہ نفسی صحت بھی گر جائے گی ۔ جو عورتیں یا مرد بعض حالات کی بنا پر شادی نہیں کرتے ان کی شخصیتیں نارمل (معمولی) نہیں رہتیں ۔ جنسی میلان کو تسکین دینے کے لیے شعوری یا لاشعوری طور پر کئی بہانے ڈھونڈے جاتے ہیں ۔ اسی بنا پر اسلام میں شادی کو سراہا گیا ہے اور رہبانیت کی مذمت کی گئی ہے ۔

ایک طرف تو جنسی تقاضا بڑا شدید ہے دوسری طرف سوسائٹی نے اس کے اظہار پر بڑی کڑی پابندیاں لگا رکھی ہیں ۔ لہٰذا انفرادی اور گروہی سطح پر زبردست خرابیاں نمودار ہو گئی ہیں ۔ فرائڈ (Freud) سمجھتا ہے کہ ذہنی بیماریوں کا سبب صرف جنسی مشکلات ہیں ۔ جنس (Sex) کے لیے فرائڈ نے لبیڈو (Libido) کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن تحلیل نفسی کے جدید ماہرین نے تسلیم کر لیا ہے کہ لبیڈو کو جنس کے مترادف نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ اس سے طلب حیات (Life Energy) مراد لینی چاہیے ۔ فرائڈ کا نظریہ بعد میں زیر بحث آئے گا ۔ لیکن اس امر سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ فرائڈ نے دنیا کی توجہ ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف دلائی اور جنس کے بارے میں جو غلط فہمیاں تھیں انہیں دور کرنے کی کوشش کی ۔

جنسی میلان کی عضویاتی اساس دریافت کرنے کے لیے کئی تجربات ہوئے ہیں مثلاً وانگ (Wang) نے ایک ایسا پنجرہ بنایا جس میں ایک گردش کرنے والا ڈھولک تھا ۔ ڈھولک کے ساتھ ایسا آلہ باندھ دیا جو خود بخود گردش کی تعداد کو ظاہر کرتا ہے ۔ اس ڈھولک میں چوہیا کو داخل کر دیا گیا ۔ دن میں وہ کئی میل چکر لگاتی تھی ۔ چوہے ذرا کم چکر لگاتے ہیں اور ان کے چکروں کی تعداد آئے دن ایک جیسی

رہتی تھی ۔ لیکن چوہیا (یعنی مادہ) تین چار روز تو ایک جیسے چکر لگاتی تھی اور چوتھے پانچویں روز بے حد تیز ہو جاتی تھی ۔ جہاں پہلے وہ ایک میل سفر کرتی تھی اب پندرہ میل سفر کرتی ۔

چونکہ چوہوں (یعنی نر) میں یہ تیزی نہیں دیکھی گئی اور نہ ہی اتار اور چڑھاؤ۔ لہٰذا فرض کیا گیا کہ چوہوں کے فطری تقاضے اس نوعیت کے ہیں کہ ان کی سرگرمیاں چوہیوں سے مختلف ہونی چاہئیں ۔ جن ایام میں چوہیوں کی سرگرمی اوج پر پہنچتی ہے ان کے جنسی اعضا اور بیضہ دان میں تبدیلیاں آتی ہیں ، اور وہ جنسی خواہش کی تشفی چاہتی ہیں ۔ لہٰذا چوہیوں کی تیزی کا سبب یا تو جنسی اعضا کی تبدیلیوں میں ہونا چاہیے یا بیضہ دان کی رطوبتوں میں ۔ لیکن تجربوں نے ثابت کر دیا کہ اس سلسلے میں جنسی اعضا کی تبدیلیاں چنداں ضروری نہیں ۔ چوہیوں کے جنسی اعضا کو اگر نکال بھی دیا جائے تو بھی ان کی تیزی میں فرق نہیں آتا ۔ اس کے علاوہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ عورتوں میں ماہواری کا آغاز سن بلوغت پر ہوتا ہے اور ادھیڑ پن یا اس سے ذرا بعد ایسا دور آتا ہے جب حیض آنا بند ہو جاتا ہے۔ جنسی اعضا تو قائم رہتے ہیں لیکن اگر بیضہ دان کو نکال دیا جائے تو جنسی سرگرمی میں فرق آتا ہے اور اگر بیضہ دان دوبارہ پیوند کر دیا جائے تو سرگرمی لوٹ آتی ہے ۔ بیضہ دان کی رطوبتوں سے بنے ہوئے ٹیکے اگر لگا دیے جائیں تو سرگرمی بڑھ جاتی ہے ۔ اگر یہی ٹیکے نر کو لگ جائیں تو وہ مادہ جیسی حرکتیں کرتا ہے ۔ ان ٹیکوں میں ایسٹرن (Estren) کی رطوبت موجود ہے ۔

نر چوہوں اور دیگر حیوانوں پر بھی تجربات کیے گئے ہیں ۔ اگر بلوغت سے پیشتر ان کے جنسی اعضا معطل کر دیے جائیں تو وہ جنسی وظائف ادا نہیں کر سکتے ۔ کیونکہ خصیوں کی رطوبتیں جنسی وظائف کے لیے لابدی ہیں ۔ لیکن جب جانوروں کو بلوغت کے بعد آختہ کیا جاتا ہے تو ان کے جنسی وظائف کسی حد تک پورے ہو

سکتے ہیں - ایک قسم کی رطوبت جو خصیوں سے خارج ہوتی ہے اور جسے ٹسٹوٹرون (Testoterone) کہتے ہیں - اگر اس کا ٹیکہ لگ جائے تو جنسی سرگرمی بڑھ جاتی ہے -

اندرونی غدودوں (Endocrine Glands) میں سے ایک غدود جسے مولدہ غدود (Gonad) کہتے ہیں وہ خاص طور پر جنسی وظائف میں سرگرم کار ہوتی ہے لیکن اور غدودوں سے بھی رطوبتیں خارج ہوتی ہیں جو جنسی وظائف میں مدد دیتے ہیں - بلغمی (Pituitary) اور کظری (Adrenal) غدودیں بھی رطوبت چھوڑتی ہیں۔ یاد رہے کہ غدودی نظام میں بلغمی غدود کا خاص مقام ہے اس کا وظیفہ غدودوں کے مابین توازن رکھنا ہے جب بلغمی غدود اپنا وظیفہ ٹھیک طور پر بجا نہیں لاتی تو جنسی غدودیں بھی کمزور پڑ جاتی ہیں - اگر بلغمی کظری اور مولدہ غدودوں کو نکال دیا جائے تو جنسی وظائف کا زور گھٹ جاتا ہے - بلکہ درقیہ غدود (Thyriod Gland) کو بھی اگر زک پہنچے تو بھی سرگرمی کم ہو جاتی ہے -

حیوانوں سے جب انسانوں کی طرف آتے ہیں تو ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے - جانوروں اور حیوانوں میں مادہ کو خاص ایام میں نر کی ضرورت ہوتی ہے ، آگے پیچھے نہیں - انسانوں میں ایسا نہیں - اگرچہ فعلیاتی لحاظ سے ہر جانور ایک جیسا ہے - اگر بلوغت سے پہلے بیضہ دان نکال دیا جائے تو عورتوں میں نسوانی علامتیں پیدا نہیں ہوتیں ، اور جنسی خواہش بھی مر جاتی ہے - مردوں کے جنسی اعضا کو اگر معطل کر دیا جائے تو بھی یہی اثر ہوتا ہے - لیکن اگر بلوغت کے بعد مردوں یا عورتوں کی جنسی غدودیں نکال دی جائیں تو ان کے جنسی وظائف بدستور قائم رہتے ہیں - غالباً اس کی وجہ عادت یا دلچسپی ہے - جنسی وظائف پیدا تو غدودوں سے ہوتے ہیں لیکن غدودوں کے خاتمہ پر عادات اور دلچسپیوں کی صورت

میں قائم رہتے ہیں - جن مردوں یا عورتوں کے جنسی غدود ادھیڑ پن یا اس کے بعد ، ضعیف اور ناکارہ ہو جاتے ہیں ان کے جنسی وظائف میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی -

ہر انسان میں جنسی خواہش کی شدت ایک جیسی نہیں - کسی میں بڑے زوروں پر ہوتی ہے ، کسی میں معمول کے مطابق اور کسی میں معمول سے کم - بعض معاشروں میں جنس کو برا بھلا کہا گیا ہے اور اسے کچلنے کی تلقین کی گئی ہے - ایسے معاشرے میں لوگ اپنی جنسی خواہشات کو دیر تک دبائے رکھتے ہیں - اس معاشرے کے لوگ جسمانی لحاظ سے جنسی وظائف کے قابل ہوتے ہیں لیکن معاشرے کی پابندیاں اتنی سخت ہوتی ہیں کہ وہ بے بس اور مجبور ہوتے ہیں اور جنسی خواہش کی تشفی نہیں کر سکتے اس کے علاوہ فطرتاً بھی بعض مرد اور عورتیں جنسی فرائض کے قابل نہیں ہوتے مگر ان کی تعداد کچھ زیادہ نہیں - بعض مردوں اور عورتوں میں جنسی خواہش حد سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے غالباً ان کی جنسی غدودیں ضرورت سے زیادہ رطوبت پیدا کرتی ہیں - یا ان کا سوشل ماحول کچھ اس قسم کا ہوتا ہے کہ جنسی خواہشیں بہت زیادہ ابھرتی ہیں -

بچپنے میں لڑکوں اور لڑکیوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا ، ان کی آواز ، دلچسپیاں ، مشاغل اور جسم کی ساخت تقریباً ایک جیسی ہوتی ہے - بلوغت پر فرق پڑتا ہے - عورتوں میں نسوانی علامتیں اور مردوں میں نر کی خصوصیات ابھر آتی ہیں - یہ فرق ادھیڑ پن تک رہتا ہے ، اور بعد میں مٹنا شروع ہو جاتا ہے - بڑھاپے میں مرد اپنا جوہر کھو کر عورتوں کے قریب آ جاتے ہیں - ان کی آواز بھاری ، کردار کم جارحانہ اور طور طریقے زیادہ نسوانی ہو جاتے ہیں - بوڑھی عورتیں نسوانیت کھو بیٹھتی ہیں ، ان کے چہرے اور ہونٹوں پر بال آگ آتے ہیں ، اور ان کا ڈیل ڈول مردانہ ہو جاتا ہے - ان تبدیلیوں کا سبب جنسی غدودوں کا فعل ہے - یہ فعل شباب میں

اوج پر ہوتے ہیں ، اور جنسی خصائص نمودار ہوتے ہیں ۔ بڑھاپے میں ان غدودوں کا فعل کمزور پڑ جاتا ہے ، اور بوڑھے مرد اور عورتیں اپنے اپنے جنسی خصائص کھو کر قریباً ایک جیسے ہو جاتے ہیں ۔ نہ مرد مرد رہتے ہیں اور نہ عورتیں عورت ۔

جنسی ارتقا میں پختگی اور آموزش ، دونوں عناصر موجود اور کارفرما ہیں ۔

جنسی خواہش کے علاوہ اور بھی قدرتی پسند یا نا پسند (Likes and Dislikes) اور خواہشات یا کراہتیں ہوتی ہیں ۔ بچے کے منہ میں شکر ڈالیں ، تو اس کے چہرے پر طمانیت کی علامات ظاہر ہوں گی ، اور اگر کڑوی چیز ڈالیں تو بچہ منہ بنائے گا ، اور صاف نظر آئے گا کہ کڑوی چیز اسے پسند نہیں ۔ بعض بوئیں دل کو لبھاتی ہیں اور بعض طبیعت کو منغض کرتی ہیں ۔ نرم اور گدگدی چیز جلد کو بھاتی ہے اور کرخت اور چبھنے والی چیز نفرت پیدا کرتی ہے ۔ اسی طرح دھیمی ، نرم اور سریلی آوازیں دل کو محظوظ کرتی ہیں ، اور کرخت ، بے ہنگم اور اونچی آوازیں اعصاب کے لیے بوجھ بن جاتی ہیں ۔ رنگوں میں سے کوئی ایسا نہیں جو قدرتی طور پر مکروہ قرار دیا جا سکے ، لیکن بچہ شوخ رنگوں کی طرف کھچا جاتا ہے ، اور کند رنگوں کی نسبت انھیں زیادہ پسند کرتا ہے ۔

قدرتی پسند اور نا پسند کی اپنی اہمیت ہے ۔ پسندیدہ بوؤں کے بغیر خانہ داری کا علم ترقی نہیں پا سکتا ، نہ ہی خوشبوؤں کے بغیر عطاری کا فن یا دلربا آوازوں کے بغیر گانے کا فن ترقی پا سکتا ہے ۔ اسی طرح سے اگر رنگوں کا وجود نہ ہوتا ، تو مصوری کا فن جنم نہ لیتا ۔ ہماری قدرتی کششیں اور کراہتیں مختلف فنون کو صرف بنیادیں مہیا کرتی ہیں ۔ ان بنیادوں پر عمارتیں بنانے کے لیے مشق ، آموزش اور اصول تقویت کی ضرورت ہے ، اور اس کے علاوہ ان فنون کو ناقدانہ طریقے سے سراہنے کے لیے بھی آموزش درکار ہے ۔

شیکسپیئر کا جائزہ لیتے وقت شیکسپیئر جیسی وسیع النظری اور علمی پختگی چاہیے ۔ عامی انسان شیکسپیئر کو کیا سمجھے گا ۔ پس فن کی تخلیق اور ناقدانہ جائزہ اس امر کا مقتضی ہے کہ ہماری پسندیں اور نا پسندیں قدرتی حدود سے نکل کر آموزش کے وسیع میدان میں داخل ہوں ۔

نئی پسند اور نا پسند کو سیکھنے اور حاصل کرنے میں اصول تقویت کو بڑا دخل ہے ۔ مثلاً بچے کو کافی پلائیں تو لازماً وہ عجیب سا منہ بنائے گا ، کیوں کہ کافی کا ذائقہ کڑوا ہوتا ہے ۔ لیکن اس کی بو دلکش ہوتی ہے ، اور ٹمپریچر جسم میں چستی پیدا کرتا ہے اس لیے بچہ آخری دو نتائج کی وجہ سے کافی بار بار پیتا ہے ، اور منہ بنانے کی بجائے زبان کے چٹخارے لیتا ہے ۔ اسی طرح اگر کوئی بو دل و دماغ کو تازہ کرے گی تو اسے بار بار سونگھا جائے گا ، اور جو بو طبیعت میں انتشار پیدا کرے گی ، اس سے پرہیز کیا جائے گا ۔ چونکہ پرہیز کرنے سے طبیعت میں سکون پیدا ہوتا ہے ، اس لیے یہ احساس پرہیز کے عمل کو تقویت بخشے گا ۔ اور جس بو نے طبیعت کو اپنی جانب کھینچا ہوگا ، اس کا لطف اصول تقویت کے تحت تکرار اور اعادہ کا باعث بنے گا ۔

پسند کے عمل سے توافق اور توازن پیدا ہوتا ہے ، اور کراہتیں اکثر توازن کو بگاڑتی ہیں ، لہٰذا ان سے پرہیز کیا جاتا ہے ۔ لیکن دونوں ہی فطری اور قدرتی تقاضے ہیں ۔ نوزائیدہ بچہ بھی دھیمی سروں کو پسند اور اونچی سروں کو ناپسند کرتا ہے ۔ اسی طرح وہ میٹھی اور ہلکی نمکین چیزوں کو پسند اور کڑوی اور کھٹی چیزوں کو ناپسند کرے گا ۔

زندگی میں کراہتوں کو وہ اہمیت حاصل نہیں ، جو اشتہات کو ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کراہتوں کو بڑی آسانی سے چھوڑا جا سکتا ہے ، لیکن پسند کو حاصل کرنے کے لیے خاص کوشش

چاہیے - مثلاً اگر بچے نے ٹافی لینی ہو تو ماں باپ سے پیسے مانگنے کے لیے کئی بہانے تراشے گا ، روٹھے گا ، روئے گا ، چلائے گا ، اور پھر کہیں پیسے ملیں گے - ناپسند چیزوں سے بچنے کے لیے بھی شاید ایسے ہی جتن درکار ہوں - لیکن پہلی قسم کے مواقع زندگی میں اکثر آتے ہیں ، اور دوسری قسم کے مواقع خال خال ہیں - اور جب کبھی پیش آئیں تو انھیں آسانی سے سلجھایا جا سکتا ہے - لیکن یاد رہے کہ گو کراہتیں زندگی کے زبردست اور اہم محرکات میں سے نہیں ، لیکن ان کے دکھ اور تکلیف کے پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا - کون شخص ہے جو بدبوؤں ، کڑوی دواؤں اور ٹریفک کی چیختی ، کان پھاڑنے والی آوازوں سے دکھی نہ ہو ، اور ان سے پرہیز نہ کرے - بعض دفعہ مریضوں کو مہینوں کڑوی اور بد ذائقہ دوائیاں کھانی پڑتی ہیں - اور جو لوگ شہروں کی گھنی آبادی یا ریلوے لائن کے قریب رہتے ہیں ، انھیں ٹریفک کا شور و غل اور گاڑیوں کی سیٹیاں سننی اور سہنی پڑتی ہیں - یہ ناپسند مہیجات ہیں ، لیکن انھیں برداشت کرنا پڑتا ہے ، کیوں کہ چھٹکارے کا کوئی چارہ نظر نہیں آتا -

حیاتیاتی محرکات ، فطری پسند اور فطری ناپسند کی بحث کے بعد اب تیسری قسم کے محرکات کی طرف آئیے - یہ محرکات ماحول سے تعلق رکھتے ہیں ، اور ان کی افادیت بھی اسی وجہ سے ہے - ہر شخص ماحول میں زندگی گزارتا ہے - اگر قدرت اسے ماحول سے نپٹنے کے قابل نہ بنائے ، تو یہ زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکے گا - یہ محرکات دو قسم کے ہیں ، اول ہنگامی اور دوم خارجی -

ہنگامی محرکات (Emergency Motives)

یہ محرکات ناگہانی ہیں ، اور اس وقت بروئے کار آتے ہیں جب ضرورت ہنگامی ہو ، اور کارروائی فوری مطلوب ہو - ان محرکات

کے ساتھ ہیجان (Emotions) بھی اٹھتے ہیں ۔ ووڈورتھ ان محرّ
کے مواقع ، مقاصد اور ہیجانات چارٹ کی شکل میں یوں بیان کرتا ہے

موقع	مقصد	محرک	ہیجان
۱۔ خطرہ (Danger)	حفاظت (Safety)	بچاؤ (Escape)	ڈر (Fear)
۲۔ ضبط (Restraint)	آزادی (Freedom)	مبارزت (Combat)	غصہ (Anger)
۳۔ رکاوٹ (Obstacle)	غلبہ پانا (Mastery)	کوشش (Effort)	عزم (Determination)
۴۔ شکار (Prey)	گرفتاری (Capture)	تعاقب (Pursuit)	شوق (Eagerness)

(۱) بچنے کا محرک : زندگی میں کئی مواقع ایسے آتے ہیں جہاں جان کے لیے بڑا یا چھوٹا خطرہ ہوتا ہے ۔ زخموں اور چوٹوں . عضویہ کی کارکردگی میں فرق آتا ہے ، اور شدید درد کا احساس ہ ہے ۔ لہٰذا ان سے بچنے کی تدابیر کی جاتی ہیں ۔ یہ تدابیر اضطرار سطح سے لے کر شعوری سطح تک پھیلی ہوئی ہیں مثلاً اگر انگ دفعتاً جل جائے تو فوراً پیچھے کھینچ لی جاتی ہے ، یہ اضطراری ف ہے ۔ اس میں سوچ بچار کو دخل نہیں ، مہیج کے آتے ہی رد عہ فوری طور پر ظاہر ہو جاتا ہے ، لیکن اگر درد کچھ عرصہ تً قائم رہے تو بچنے کی تدابیر کی جائیں گی ، اور اسے بچنے کا محرٗ کہا جائے گا ۔ بعض دفعہ یوں بھی ہوتا ہے کہ چوٹ لگنے کا ہوتا ہے مگر چوٹ لگی ہوئی نہیں ہوتی ۔ ایسے موقع پر بھی بً کی تدابیر کی جاتی ہیں ۔ انسان چھپ جاتا ہے یا بھاگ جاتا ہے یار احباب یا رشتہ داروں کو مطلع کیا جاتا ہے ، یا پولیس میں رپور درج کرائی جاتی ہے—وغیرہ وغیرہ ۔

چونکہ خطرات سے زندگی کے ختم ہونے یا ناقص ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے، یا کم از کم شدید کرب و الم کا احساس اٹھتا ہے، لہٰذا تمام جاندار (اس میں پرندے، حیوانات اور انسان سبھی شامل ہیں) ایسے مواقع پر عجیب سی آوازیں نکالتے ہیں۔ اس وقت ان کا کردار بھی غیر معمولی ہو جاتا ہے، اور عضویہ کی اندرونی مشینری بھی اپنے معمول سے انحراف کر جاتی ہے۔ مثلاً جب چوزوں پر چیل جھپٹا مارنا چاہے تو مرغی کی چیخ نکلتی ہے، اور چیخ سنتے ہی چوزے دبک کر بیٹھ جاتے ہیں یا مرغی کے پروں میں چھپ جاتے ہیں، اور یا ادھر آدھر بھاگ کر کسی جگہ پناہ لیتے ہیں۔ مرغی کی یہ چیخ اس کی عام آوازوں سے مختلف ہوتی ہے۔ دانہ دنکا چگنے کے لیے یا چوزوں کو اکٹھا کرنے کے لیے بھی مرغیاں آوازیں نکالتی ہیں، جن کو چوزے خوب سمجھتے ہیں اور جیسی آواز ہو ان کا ویسا ہی رد عمل ہوتا ہے۔ وہ خطرے کی آواز کو بھی پہچانتے ہیں اور اسے سنتے ہی بچاؤ کی جگہ لیتے ہیں۔ آواز کا پہچاننا اور مناسب رد عمل اختیار کرنا جبلی افعال ہیں، کیوں کہ اگر چوزوں کو یہ سب کچھ سیکھنا پڑے تو زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکیں گے۔ ہر جاندار کی خطرے کی آواز یا اشارے اپنے ہیں، اور ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ جو آواز مرغی نکالتی ہے، اگر وہی آواز انسان نکالیں یا ماں اپنے بچوں کو خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے مرغی جیسی آواز نکالے تو بچے ڈر جائیں، اور بجائے فائدے کے نقصان ہو۔ انسانوں کے خطرات کے اشارے ڈراؤنے نہیں ہوتے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دماغی اعتبار سے انسان، حیوانوں اور پرندوں کی نسبت، اعلیٰ و ارفع ہے، کیوں کہ وہ الفاظ کے ذریعہ مطالب ادا کرتا ہے، اور ان مطالب کو سیکھ بھی لیتا ہے۔ حیوان بھی اشارے سمجھ لیتے ہیں، لیکن ان کا فہم محدود ہے، اور وہ صرف ان اشاروں کا مطلب

سمجھتے ہیں جو انہیں سکھائے گئے ہوں ۔ انسانی بچہ بہت کچھ سیکھتا ہے ، اور اسی وجہ سے وہ اتنا ڈرپوک نہیں ہوتا ، جتنا حیوان یا پرندے کا بچہ ہوتا ہے ۔ لیکن یاد رہے کہ جب تک بچہ سیکھ نہیں لیتا کہ فلاں شے خطرناک ہے ، وہ ڈرتا نہیں ۔ مثلاً بچے سانپ سے نہیں ڈرتے ، اور بعض بچے اگر سانپ دیکھ پائیں تو اس کے قریب ہو جاتے ہیں ، اور پکڑنا چاہتے ہیں ۔ اور بعد میں جب انہیں بتایا جائے کہ سانپ کاٹتا ہے اور زہریلا ہے ، تو وہ ڈرنے لگتے ہیں ۔ ووڈورتھ کہتا ہے[1] کہ ایک تجربے میں پتہ چلا کہ دو سال سے کم عمر کے بچے سانپ سے مطلقاً نہیں ڈرتے ، اور دو سے چار سال کے بچے ذرا محتاط اوز چوکنے ہو جاتے ہیں ، بڑے بچے سانپ کے قریب جانے سے احتراز کرتے ہیں ، لیکن کالج کے لڑکے اور لڑکیاں سانپ سے بہت ڈرتے ہیں ۔

اس تجربے نے ثابت کر دیا کہ خطرات کو سمجھا جاتا ہے ۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خطرات سمجھنے کے کیا طریقے ہیں ؟ نفسیاتی اعتبار سے یہ طریقے اکثر تلازم (Association) یا مشروط آموزش (Conditioned Learning) پر موقوف ہیں۔ واٹسن (Watson) نے ایک ایسے بچے پر تجربہ کیا جو کتوں ، خرگوشوں اور سفید چوہوں سے کھیلا کرتا تھا ۔ تجربہ کنندہ نے بچے کو سفید چوہا دینا چاہا لیکن ساتھ ہی بھیانک آواز پیدا کی ۔ جس سے بچہ ڈر گیا ۔ اس چیز کو کئی بار دھرایا گیا ۔ یعنی سفید چوہے کو پیش کرتے وقت بھیانک آواز پیدا کی گئی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سفید چوہے اور بھیانک آواز میں تلازم ہو گیا اور مشروط آموزش کی بدولت بچہ سفید چوہے سے ڈرنے لگا۔ یعنی اگر بھیانک آواز نہ بھی پیدا کی جائے اور صرف سفید چوہا ہی دکھا دیا جاتا تو بھی بچہ ڈرنے لگتا۔ یہ ڈر صرف سفید چوہوں تک محدود

۱۔ ملاحظہ ہو ، Psychology صفحہ ۲۱۱ ۔

نہ رہا بلکہ بچہ کتوں اور خرگوشوں سے بھی ڈرنے لگا۔

یہ تجربہ ہر بچے پر کامیاب نہیں ہوتا۔ بعض بچے سمجھ جاتے ہیں کہ بھیانک آواز کا جانور سے کچھ تعلق نہیں۔ لٰہذا وہ اپنے پالتو جانوروں سے بدستور کھیلتے رہتے ہیں۔ وقتی طور پر شاید وہ ڈر کی علامت ظاہر کریں لیکن جلد ہی اپنی فہم و فراست سے کام لے کر معمول میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

گھروں میں بچوں کو کئی چیزوں سے ڈرایا جاتا ہے۔ ڈراتے وقت عجیب آوازیں نکالی جاتی ہیں۔ بچے کو کہا جاتا ہے کہ فلاں چیز مت کرو وگرنہ مائی ہلو پکڑ لے گی اور ساتھ ہی مائی ہلو کی عجیب سی ڈراؤنی آواز نکالی جاتی ہے۔ یہ چیز متعدد بار کی جاتی ہے بعد میں بچہ مائی ہلو کا نام سنتے ہی خائف ہو جاتا ہے ، ڈراؤنی آواز نکالنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اکثر بچے بجلی کی گرج اور چمک سے نہیں ڈرتے۔ لیکن گھر کے بڑے بوڑھے گرج اور چمک کے وقت عجیب حرکات کرتے ہیں۔ دوڑ کر اندر بھاگ جاتے ہیں، کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں اور کچھ پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کا جسم ڈر کے مارے کانپ رہا ہوتا ہے اور بچوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ بھاگ کر اندر آ جائیں اور کمرے کے کواڑ بند کر لیں۔ جب بچہ ایسی چیزیں بار بار دیکھتا ہے تو خود بخود بجلی کی کڑک اور چمک سے ڈرنے لگتا ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ بچے کے اکثر ڈر مشروط آموزش یا تلازم پر مبنی ہوتے ہیں ، لیکن کئی ایسے ڈر بھی ہیں جو پختگی سے پیدا ہوتے ہیں یا اس وجہ سے کہ بچہ اب ماحول کو سمجھنے لگا ہے۔ کئی بصری مہیجات کو نوزائیدہ بچہ نہیں سمجھ سکتا۔ جب اس کی بصارت میں ترقی ہوتی ہے تب اسے علم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں خطرناک ہیں۔ پیدا ہوتے ہی کوئی بچہ آگ سے نہیں ڈرے گا۔ آگ سے ڈرنا آموزش کے علاوہ اس امر پر بھی موقوف ہے کہ بچے کی بصارت ترقی پا گئی ہے اسی طرح ابتدا میں بچہ اپنے ماحول کو نہیں سمجھتا۔ آہستہ آہستہ اسے

پتہ چلتا ہے کہ ماحول کے کون سے عناصر مفید ہیں اور کون سے مضر اور خطرناک ، خطرناک عناصر سے بچہ ڈرتا ہے ۔

جب کسی شے یا موقع سے ڈرنا اور احتراز کرنا سیکھ لیا جائے ، خواہ یہ ڈر بے معنی ہی کیوں نہ ہو ، تو اسے چھوڑنا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ جب بھی بچہ اس شے یا موقع سے بھاگے گا یا پرہیز کرے گا اس کا ڈر تقویت پکڑے گا ۔ ڈرنا ایک عادت بن جاتا ہے اور عادت جیسے کہ سب کو معلوم ہے فطرت ثانیہ کی حیثیت رکھتی ہے ، اسے چھوڑنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا فطری اور جبلی میلانات کو ترک کرنا پھر بھی بعض تجربات کیے گئے ہیں ، عادتیں چھوڑی جا سکتی ہیں ۔ ڈر سے بھی نجات مل سکتی ہے ، اگرچہ یہ کام ایسا آسان نہیں ۔ لوگ افیون ، چرس اور شراب چھوڑ دیتے ہیں اس سلسلہ میں عزم اور مستقل مزاجی کی ضرورت ہے ، جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہے ۔ ووڈورتھ نے ایک تجربہ بیان کیا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ ایک بچہ خرگوشوں سے بہت ڈرتا تھا ۔ اس کا ڈر چھڑانے کی یہ ترکیب نکالی گئی کہ تجربہ کنندہ نے بچے کے کھانا کھاتے وقت پنجرہ میں بند خرگوش کو میز کے کنارے پر رکھ دیا ۔ بچہ خرگوش کو دیکھتا رہا اور کھانا کھاتا رہا ۔ دوسرے دن پنجرہ کچھ قریب لایا گیا تیسرے دن اس سے بھی قریب ۔ حتیٰ کہ پنجرہ کچھ دنوں کے بعد بالکل بچے کے قریب رکھ دیا گیا ۔ بچہ گھبرایا نہیں اور اطمینان سے کھانا کھاتا رہا ۔ اس سے اگلے روز تجربہ کنندہ نے خرگوش کو پنجرے سے نکال کر میز پر رکھ دیا ۔ بچے نے خرگوش سے کھیلنا شروع کر دیا اور اس کا ڈر جاتا رہا ۔ بچے نے اس تمام ڈرامے کو موافق حالات میں دیکھا لہٰذا اس کا ڈر دور ہو گیا ۔

(۲) مبارزت کا محرک : لڑنے کا محرک تب بیدار ہوتا ہے جب مصروفیات اور مشاغل میں رکاوٹ پیدا کر دی جائے ۔ اسے دور کرنے کے لیے انتہائی کوشش کی جاتی ہے ۔ مدعا یہ ہوتا ہے کہ مشاغل کو

آزادی سے جاری رکھ سکیں اور اپنے مقاصد کو حاصل کر سکیں۔

لڑنے کے طریقے بدلتے رہتے ہیں۔ بچوں کو کوئی کام کرنے سے روکیں یا انھیں ایسے کام پر مجبور کریں جو وہ نہیں کرنا چاہتے تو دیکھیں گے کہ وہ ہاتھ پاؤں مارتے ہیں، چیختے چلاتے ہیں، گالیوں پر اتر آتے ہیں، منع کرنے والے شخص سے ہاتھا پائی کرتے ہیں۔ مطلب ان کا یہ ہوتا ہے کہ مداخلت کرنے والے اسباب دور ہوں اور وہ آزادی سے اپنی سرگرمیوں میں لگے رہیں۔ بچے کے یہ طور اطوار بڑوں کو پسند نہیں ہوتے، وہ چاہتے ہیں کہ بچہ انھیں چھوڑ کر شریفانہ طریقے سے ناراضگی کا اظہار کرے۔ لہٰذا تہذیب اور تمدن کے تقاضوں کے تحت بچے کا کردار بدلتا ہے۔ بڑا ہو کر وہ گالیاں نہیں دیتا۔ ہاتھا پائی پر نہیں اترتا، بلکہ عدالت کا دروازہ کھٹ کھٹاتا ہے یا کوئی اور شائستہ طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اگر وہ کالج یا سکول کا طالب علم ہے تو پرنسپل سے شکایت کرتا ہے۔ غرضیکہ جیسا ماحول ہو اس کے مطابق اس کا رد عمل ہوگا۔ لیکن یہ رد عمل ابتدائی دور کی بجائے شائستگی، تہذیب اور معقولیت کے دور کی پیداوار ہوگا۔

تجربے سے نہ صرف رد عمل میں تبدیلی آتی ہے بلکہ مہیجات کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے۔ جن مہیجات سے بچہ ناراض ہوتا ہے وہ شاید بڑے آدمی کو برافروختہ نہ کر سکیں۔ بڑے آدمیوں کی ناراضگی کے اسباب بچوں سے مختلف ہوتے ہیں، اور زیادہ تر ان کا تعلق ان کے ماحول، ان کی آمنگوں اور مقاصد سے ہوتا ہے۔ یہ آمنگیں اور مقاصد بچوں جیسے نہیں۔ لہٰذا جو رکاوٹیں بچے کو ناراض کرتی ہیں وہ بڑوں کو نہیں کرتیں۔ اور جو بڑوں کو ناراض کرتی ہیں بچوں کو نہیں کرتیں۔

(۳) **کوشش کا محرک:** بندشوں اور رکاوٹوں سے نجات پانے کے لیے کوشش کی ضرورت ہے۔ بعض آدمی تو رکاوٹوں سے گھبرا جاتے ہیں، بعض آدمی ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔ ایسے لوگ شاید غصے

اور ناراضگی کا بھی اظہار کریں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس فعلیت میں جد و جہد ، کوشش اور سعی کا پہلو غالب نظر آئے گا۔ بچے کو تختی پر لکھتے دیکھئے ، قلم کو مضبوطی سے پکڑتا ہے اور خوب زور سے لکھتا ہے ، ایسا نظر آتا ہے جیسے وہ تختی سے کشتی کر رہا ہو - بچے کا مدعا یہ ہے کہ وہ آسانی سے خوشخط لکھ سکے اور اس سلسلے میں وہ کوشش کرتا ہے - اب فٹ بال کے کھلاڑی کو لیجیے - وہ مجسم توجہ ہے اور اس کی توجہ کا مرکز فٹ بال ہے - وہ شاید آگے کی طرف جھکا ہوا بال کا انتظار کر رہا ہو یا ٹھوکر لگا کر سرپٹ دوڑ رہا ہو یا فریق مخالف سے گیند چھین رہا ہو- اس کی حرکات اور سکنات کچھ ہی کیوں نہ ہوں ان سب سے اس کا عزم ، استقلال اور کوشش ترشح ہوتے ہیں ۔

بڑوں کی طرح ننھے ننھے بچے بھی کوشش کرتے ہیں - ان کے راستے میں رکاوٹ آ جائے تو سارا زور لگا دیتے ہیں - ان کے جسم میں بھی کئی عضویاتی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں جن کی بدولت وہ رکاوٹ دور کرنے کے لیے زیادہ مستعد ہو جاتے ہیں - سانس رک جاتا ہے ، کمر اکڑ جاتی ہے، پیٹ پچک جاتا ہے اور سارا بدن تن جاتا ہے - وزن اٹھاتے ہوئے بچوں اور بڑوں کو ملاحظہ کیجیے اور ان کے جسم کی حالت دیکھیے - پتہ چلے گا کہ کوشش میں دل و دماغ تعاون کرتے ہیں اگر نفسیاتی سطح پر کوشش کے آثار ظاہر ہیں تو جسمانی سطح پر بھی ہیں -

کوشش کا اظہار ہر جگہ ہوتا ہے - وزن اٹھاتے وقت بھی اور حساب کا سوال نکالتے وقت بھی - اگر کوئی طالب علم دماغی کام میں مصروف ہو اور اس کے ماحول میں کوئی وجہ انتشار پیدا ہو جائے تو وہ انتشار دور کرنے کی کوشش کرے گا اور کام میں زیادہ انہاک دکھائے گا -

بعض دفعہ کوشش غیر دلچسپ ہوتی ہے اور بعض دفعہ دلچسپ - اگر بچے کے راستے میں روڑا اٹکا دیں تو وہ کوشش کرے گا کہ روڑا

ہٹ جائے لیکن یہ کوشش دلچسپ نہیں کہلائے گی ۔ لیکن زندگی میں کئی مواقع ایسے ہوتے ہیں جب لوگ خود اپنے شوق سے کوشش کرتے ہیں ۔ مثلاً معمہ حل کرنے والوں کو دیکھیے کس شوق سے حل ڈھونڈنے میں محو ہیں ۔ یا پہاڑوں پر چڑھنے والوں کو لیجیے کیسے جان جوکھوں میں ڈال کر اوپر چڑھے جا رہے ہیں قدم قدم پر خطرات ہیں ، لیکن انھیں پرواہ نہیں ۔ کوشش پہ کوشش کیے جا رہے ہیں ۔ بعض لوگ راستے میں ختم ہو جاتے ہیں کچھ چوٹی تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ۔ آخر ان مصیبتوں کو مول لینے سے کیا فائدہ ؟ کوئی اگر چوٹی پر پہنچ بھی گیا تو کیا ہوا ؟ پہاڑوں پر چڑھنے والے مصیبتوں کو مصیبتیں نہیں سمجھتے اور چوٹی پر پہنچنا ان کے نزدیک بہت بڑا کارنامہ ہے اور ہے بھی ٹھیک ۔ ووڈورتھ کہتا ہے کہ اس سعی کے پیچھے فطری محرک کارفرما ہے جسے بعض لوگ غلبہ پانے (Mastery) کا محرک کرتے ہیں ۔ مصیبتوں ، رکاوٹوں اور بندشوں پر غلبہ پا کر انسان کو خوشی حاصل ہوتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ راستے کی تکالیف کو سر کرنے کے بعد جو شخص پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے گا وہ اپنے آپ کو نہایت ہی خوش نصیب سمجھے گا ۔ اور دوسرے لوگ بھی اسے مبارک باد دیں گے ۔ کیونکہ انھیں پتہ ہے کہ مصیبتوں کو سر کرکے جو شخص اپنی منزل مقصود پر پہنچتا ہے وہ کار نمایاں کرتا ہے ۔

یاد رہے کہ جب نامساعد حالات کا مقابلہ کیا جائے تو عضویہ اور اس کے وظائف ہمارا ساتھ دیتے ہیں ۔ اندرونی غدودیں رطوبتیں نکالتی ہیں جو جسم کو کوشش جاری رکھنے میں امداد دیتی ہیں ۔ توانائی بھی زیادہ مقدار میں بہم پہنچائی جاتی ہے ۔ غرض کہ اگر کوئی شخص کوشش پر تل جائے تو اس کا عضویہ اسے مایوس نہیں کرے گا ۔

(۳) تعاقب کرنے کا محرک : شروع شروع میں جب انسان جنگلوں یا غاروں میں حیوانوں کی طرح رہتے تھے تو پیٹ بھرنے کے لیے انھیں شکار کرنا پڑتا تھا ۔ کھیتی باڑی تو انھیں آتی نہیں تھی ۔ اس لیے

جانوروں کا شکار کرتے تھے اور ان کے گوشت پر گزارہ کرتے تھے - شکار کا پیچھا کرنا ضروری تھا کیونکہ اگر پیچھا نہ کیا جائے تو شکار ہاتھ نہیں آئے گا - شیر اور بھیڑیے کو دیکھیں ، وہ بھی شکار کا تعاقب کرتے ہیں ، اس کے پیچھے دوڑتے ہیں اور جھپٹا مارتے ہیں ، اور اگر پھر بھی قابو نہ آئے تو کچھ اور ترکیب کرتے ہیں -

بچوں کو نئے نئے کھلونے لا کر دیں تو وہ بھی جھپٹا ماریں گے - ذرا ان سے دور رکھیں تو وہ سرک کر قریب آ جاتے ہیں ، اور پھر یک دم پکڑ لیتے ہیں ، اور اس خوشی میں ان کی آنکھیں ٹمٹما اٹھتی ہیں - بڑے لوگ بھی یہی کچھ کرتے ہیں - کھلاڑی گیند کو پکڑنا چاہتے ہیں تو دوڑ کر ایک مقام پر پہنچ جاتے ہیں ، جہاں پہ انہیں گیند پکڑ لینے کا یقین ہوتا ہے ، کیونکہ اگر وہ اس مقام پر نہ پہنچیں گے تو گیند نکل جائے گا ، اور وہ موقع کھو بیٹھیں گے - شکاری کا بھی یہی حال ہے کہ اگر وہ شکار کا پیچھا نہ کرے ، تو شکار بھاگ جائے گا یا کسی اور کے ہتھے چڑھ جائے گا - ایسے موقع پر مقابلے (Competition) کا جذبہ بھی کار فرما ہوتا ہے - کھلاڑی بھی مقابلہ کر رہے ہیں ، فریق مخالف کو نیچا دکھانا چاہتے ہیں ، اور اپنی عزت اور آبرو کو بلند کرنا چاہتے ہیں- پس مقابلے کی وجہ سے تعاقب میں مزید دلچسپی پیدا ہوتی ہے- حیوان ہو یا انسان ، مقابلے کی وجہ سے اس کی سرگرمیوں میں اضافہ ہوتا ہے ، اور اس کے انہماک میں زیادہ وسعت اور گہرائی آتی ہے -

یاد رہے کہ تجربے سے تعاقب کرنے کے طریقے بدل جاتے ہیں - درندے جانور بھی اپنے شکار کا پیچھا کرتے ہیں اور انسان شکاری بھی ، لیکن ان کے طریقے ایک جیسے نہیں ، کیونکہ تہذیب و تمدن سے طریقے بھی بدل جاتے ہیں -

خارجی محرکات :

ہر انسان میں زندہ رہنے کی خواہش ہے - زندہ رہنے کا یہ مطلب

نہیں کہ عضویہ اپنا کام کرتا رہے ، اور اس میں کوئی خرابی نہ ہو
زندہ رہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے ماحول سے ہوشیاری کے
ساتھ نبرد آزما ہو ، ہر جاندار کو قدرت کی طرف سے حواس ، دماغ اور
حرکی اعضا ملے ہیں ، جن کو بروئے کار لا کر ، ہر شخص اپنے گرد و
نواح سے نپٹ سکتا ہے - جسم کو ٹھیک ٹھاک رکھنے کی بھی ضرورت
ہے ہنگامی اور فوری مواقع کے لیے میلانات بھی چاہییں ، لیکن اس
کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ماحول کو سمجھا جائے ، اشیا اور
اشخاص کا علم ہو ، اپنے پس و پیش میں دلچسپی لی جائے ، اور ماحول کی
طاقتوں میں شریک ہوا جائے یا ان کا مقابلہ کیا جائے۔ اس مطلب کے لیے
بھی کچھ قدرتی میلانات ہیں ، جنھیں بعض لوگوں نے نظر انداز کر دیا
ہے۔ لیکن ان کا ذکر نہایت ضروری ہے ، وہ محرکات حسب ذیل ہیں:

(۱) تجسس (Exploration) -

(۲) دست ورزی (Manipulation) -

(۱) **تجسس :** کھوج لگانے کا مادہ تمام جانداروں ، خصوصاً
حیوانوں اور انسانوں میں پایا جاتا ہے - چھوٹے چھوٹے بچے بھی
کھوج لگاتے ہیں ، چارپائی پر لیٹے لیٹے ہی آنکھوں سے ہر چیز کا معائنہ
کرتے رہتے ہیں - اگر اشیاء متحرک ہوں تو آنکھیں بھی ساتھ ساتھ
گھماتے ہیں - اگر چھوٹے بچے ابھی اپنی مرضی سے ہاتھ پاؤں نہیں اٹھا
سکتے ، اور ان میں چیزوں کو پکڑنے کی طاقت بھی موجود نہیں ہوتی ،
لیکن پھر بھی یہ آنکھوں سے اپنے پس و پیش کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس طرح
بیرونی دنیا سے شناسائی شروع ہوتی ہے - اصول تقویت سے شناسائی بڑھتی
ہے ، اور جب کسی شے کو ٹھیک طرح دیکھ لیا جاتا ہے ، اور اس کے
متعلق تھوڑا بہت علم بھی حاصل کر لیا جاتا ہے ، تو بچہ سکون پاتا
ہے - جوں جوں عمر بڑھتی ہے ، بچہ اپنے حواس سے زیادہ کام لیتا ہے -
اشیا کے متعلق سوالات پوچھتا ہے ، اور جب تک تسلی بخش جوابات
نہیں پاتا ، اسے چین نہیں آتا - استفسارات اور جوابات کا مطلب تجسس

کے سیلان کی تشفی ہے ۔ بچہ جو علم حاصل کرتا ہے اس کا عملی فائدہ بھی بہت ہے ، لیکن بچہ عملی فائدے کی پرواہ نہیں کرتا ۔ وہ تو صرف ماحول کو جاننا چاہتا ہے ۔

(۲) **دست ورزی :** کئی دفعہ آپ نے بلی کے بچے کو گیند سے یا چھڑی سے کھیلتے دیکھا ہوگا ۔ انسان کا بچہ بھی کئی کھیل کھیلتا ہے ، اور اس کے کھیل جانوروں اور پرندوں کی نسبت زیادہ بڑھ چڑھ کر ہوتے ہیں ، کیونکہ اس کے ہاتھ پاؤں اور دماغ ، نہ صرف ترقی یافتہ ہیں بلکہ باقی تمام جانداروں سے ارفع و اعلیٰ ہیں ۔ ماحول سے نپٹنے اور اسے سمجھنے کی صلاحیتیں بھی اسی وجہ سے بچے میں زیادہ موجودہ ہیں ۔ اگر اسے کھلونا دیں ، تو وہ اسے محض دیکھے گا نہیں بلکہ اسے الٹا سیدھا کرے گا ، زمین پر پھینکے گا اور اس سے آوازیں پیدا کرے گا ۔ جن مختلف طریقوں سے کھلونا سمجھا جا سکتا ہے یا اس کے ساتھ کھیلا جا سکتا ہے ، وہ سب طریقے استعمال کرے گا ۔

بلی یا کتے کا بچہ بھی اسی کھیل کود کے ذریعہ ماحول کو جان لیتا ہے لیکن اس کی کھیلیں انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں ۔ اس کے علاوہ قدرت نے بھی اسے انسان کے بچے جیسے چست اور پھرتیلے ہاتھ عطا نہیں کیے ۔ لہٰذا جانوروں کی شناسائی ماحول سے ہو تو جاتی ہے لیکن ابتدائی منازل سے آگے نہیں بڑھتی ۔ انسانی بچے کو فوقیت حاصل ہے ۔ پیدائش کے وقت جس انتشار میں وہ اپنے آپ کو پاتا ہے اسے آہستہ آہستہ علم کے ذریعہ دور کرتا ہے ۔ کھوج اور دست ورزی کی بدولت ماحول سے شناسائی پیدا ہوتی ہے اور بڑھتی ہے ۔ فلسفیوں نے بچوں کی کھیلوں کے بارے میں کئی نظریے گھڑے ہیں ۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ بچہ ان کھیلوں کے ذریعہ زندگی کے اہم فرائض سے آگاہ ہوتا ہے اور آئندہ زندگی کی تیاری کرتا ہے ۔ ممکن ہے اس نظریے میں کچھ صداقت ہو ، لیکن بچہ اس غرض سے قطعی نا آشنا ہے ۔ وہ کھیل کھیلنا چاہتا ہے

ر کھیل کے ذریعہ اپنی ارد گرد کی دنیا سے واقفیت چاہتا ہے اس کی
ھیلوں کو ملاحظہ کیجیے ۔ کچھ تو حرکت کرنے والی چیزیں ہیں ۔
ثلاً کتابیں ، دروازے ، دراز ، نلکہ ، صندوق کا تختہ وغیرہ ۔ کتابیں
ھولتا اور بند کرتا ہے ، دروازہ بھی کھولتا یا بند کرتا ہے اور یہی
لوک نلکے ، دراز اور صندوقوں سے کرتا ہے ۔ بچہ لچک دار چیزوں
ے بھی کھیلتا ہے ۔ مثلاً مٹی ، ریت اور برف سے ، وہ کاغذوں کو
ھی پھاڑتا ہے ۔ اینٹوں سے گھر اور پانی سے نالیاں بناتا ہے ۔ شور پیدا
کرنے والے کھلونے بھی اسے پسند ہیں ۔ باجا ، سیٹی ، جھنجھنا اسے
رغوب ہیں ۔ زور زور سے بگل بجاتا ہے ، پٹاخے چھوڑتا ہے ، بانسری
ے سریں نکالتا ہے خواہ گھر والے تنگ ہی کیوں نہ آ جائیں ۔ ایک اور
سم کے کھلونے جو وہ چاہتا ہے وہ سواری کی قسم کے ہیں ۔ گاڑی ،
ائیسکل ، ٹانگہ ، ہوائی جہاز اسے پسند ہیں ۔ دیہاتی بچے تو چھڑی پر
وار ہو کر سمجھتے ہیں کہ وہ گاڑی پر سوار ہیں ۔ اس کے علاوہ بچہ
گیند پھینکتا ہے ، تیر اندازی کرتا ہے ، شیشے سے دوسرے کی آنکھوں
ر شعاعیں ڈالتا ہے ۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جو زمان و مکان پر قابو پانے
یں مدد دیتی ہیں ۔ پھر کچھ ایسی کھیلیں ہیں جو کشش ثقل کو رد
کرتی ہیں مثلاً تیرنا ، پتنگ اڑانا ، کشتی چلانا ، جھولنا ، بچہ ان سے
ھی دلچسپی رکھتا ہے پھر کچھ ایسی کھیلیں بھی ہیں جو بڑوں کی
قلیں اتارتی ہیں ۔ مثلاً گڑیوں سے کھیلنا ، ریل گاڑی اور موٹر کار بنانا ۔
چہ یہ کھیلیں بھی کھیلتا ہے اس کے علاوہ اور بھی کئی قسم کی
کھیلیں ہیں ۔ ان سے کئی قسم کے فائدے ہیں ، بچے کا جسم بڑھتا ہے ،
س کے حواس تیز ہوتے ہیں ، پٹھے زیادہ مضبوط اور چوڑے ہو جاتے
یں اور ساتھ ہی بچے کو کھیلوں کا علم ہوتا ہے اور اپنے آس پاس کی
چیزوں سے برتاؤ کرنے کا سلیقہ بھی حاصل ہوتا ہے ۔ وہ صرف پتنگ
یتا ہی نہیں بلکہ اسے اڑاتا بھی ہے ۔ اسی طرح اینٹیں اکٹھا ہی نہیں
کرتا بلکہ انھیں جوڑ کر ریل گاڑی یا گھر بناتا ہے ۔ مٹی لے کر برتن

بناتا ہے ۔ پانی کی نہریں چلاتا ہے وغیرہ وغیرہ ۔ چنانچہ کھیلوں کے ذریعہ جہاں اس کے جسم کو تقویت اور مضبوطی ملتی ہے وہاں اسے کھلونوں کو استعمال کرنے کے ڈھب بھی آ جاتے ہیں ۔ بچہ اپنے کھیل کے سامان سے نتائج پیدا کرتا ہے ۔ اصول تقویت کے تحت تشفی بخش نتائج دھراتا ہے ۔ ان نتائج سے اسے ماحول کا علم حاصل ہوتا ہے ۔

پس دست ورزی کا میلان خارجی محرک ہے ، اس کا اصلی مقصد اشیاء اور اشخاص کا علم حاصل کرنا اور ان سے احسن طریقہ پر برتاؤ کرنا ہے ۔ بچہ جب اتنا بڑا ہو جاتا ہے کہ وہ مل جل کر ٹولیاں بنا کر ساتھیوں اور ہمجولیوں سے کھیلے تو دست ورزی کے علاوہ کئی اور محرک شامل ہو جاتے ہیں ۔ فٹ بال ، ہاکی اور کرکٹ جیسی کھیلوں میں ہنگامی محرکات بھی موجود ہوتے ہیں ۔ اس کے علاوہ قابو یا غلبہ پانے کا محرک بھی بعض کھیلوں میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے ۔ مقابلے کے بغیر تو کوئی کھیل مزے دار نہیں ہوتا ۔ جہاں مقابلہ ہوگا وہاں تصرف اور غلبہ پانے کا جذبہ کار فرما ہوگا ۔

محرکات کی طاقت کی پیمائش :

یہاں پر مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ محرکات میں سے کون سے زیادہ یا کم طاقتور ہیں ۔ اس سوال کا جواب دیتے وقت کئی راستے اختیار کیے جا سکتے ہیں ۔ ایک راستہ تو تواریخ کی طرف رجوع کرنا ہے ۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اکثر جنگیں معاشی اغراض کے لیے لڑی گئیں ۔ یورپی فوجیں تجارت کے لیے ایشیا اور افریقہ پہنچیں اور وہاں کی منڈیوں پر قابض ہو گئیں ۔ پس بھوک کے تقاضا کو اساسی محرک سمجھنا چاہیے ۔ کچھ لوگوں نے تاریخ کو دوسری روشنی میں دیکھا ۔ انہیں معلوم ہوا کہ لوگوں کی کثیر تعداد جنسی مشکلات میں مبتلا ہے اور جنسی طور پر نہایت ہی غیر متوازن ۔ پس جنسی تقاضے کو اساسی بنا لیا گیا ۔ پہلا نظریہ کارل مارکس کا ہے اور دوسرا فرائڈ کا ۔

تواریخی طریقہ چھوڑ کر ماہرین نفسیات نے تجربی طریقہ اختیار کیا ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ پہلا طریقہ لچر یا ناقابل اعتماد ہے بلکہ اس لیے کہ تجربی طریقہ زیادہ سائنسی اور قابل اعتبار ہے ۔ اس ضمن میں جو تجربات ہوئے ہیں وہ جانوروں پر ہوئے ہیں ۔ جانوروں پر تجربے کرنے کے مندرجہ ذیل فوائد ہیں :

(۱) جانوروں کا کردار ثقافتی اثرات سے پاک ہوتا ہے ۔

(۲) انسانوں کی نسبت جانوروں کی زندگیوں کو آسانی سے قابو میں لایا جا سکتا ہے ۔

(۳) جانوروں پر ایسا تجربی ضبط ممکن ہے جو انسانوں کے ضمن میں ناممکن ہے ۔

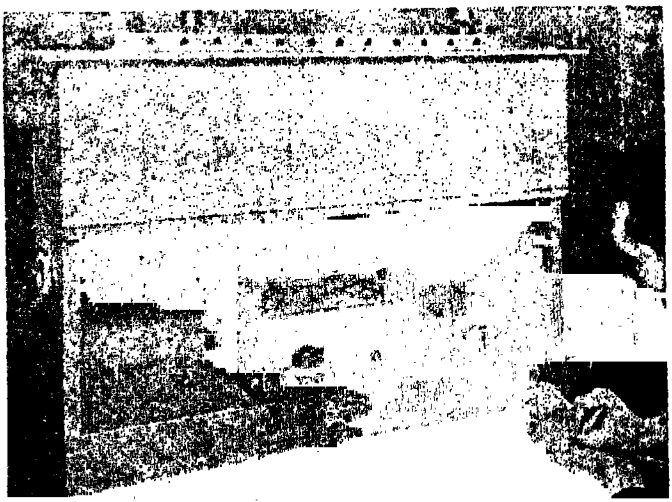
(۴) تجربے کو کامیاب بنانے کے لیے جتنے جانور چاہیں لیے جا سکتے ہیں ۔

جانوروں پر تجربے دو طریقوں سے ممکن ہیں :

(۱) محرکات کی طاقت دیکھنے کے لیے ایک محرک کا دوسرے سے مقابلہ کیا جاتا ہے یہ مقابلہ بھوک اور جنس کے درمیان کیا گیا ۔ چوہوں کو چوبیس گھنٹے تک خوراک اور جنسی خواہش سے باز رکھا گیا ۔ اس کے بعد یا تو وہ خوراک یا چوہیوں کی طرف جا سکتے ہیں ۔ دیکھا گیا ہے کہ چوہوں کی ۷۰ فی صد کوشش خوراک کی جانب تھی ۔ لیکن اس تجربے میں ایک سقم ہے کیونکہ بھوک سے جنسی خواہش کم ہو جاتی ہے ۔ اگر چوہے کو ۲۴ گھنٹے تک بھوکا رکھا جائے تو اس کی جنسی خواہش کمزور پڑ جائے گی ۔ پس تجربہ خوراک کی جانب جھکا ہوا ہے ۔ لیکن اس سقم کے باوجود بھوک کی طاقت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ بھوک جنسی خواہش کو کم کر سکتی ہے ۔

(۲) مزاحمت کا طریقہ (Obstruction Method) یہ طریقہ کولمبیا یونیورسٹی کی لیبارٹری میں جو برتا گیا محرکات کی طاقت کو نہایت

تسلی بخش طریقے سے پیمائش کرتا ہے ۔ اس طریقے میں جانور کے لیے صلہ موجود ہے لیکن راستے میں رکاوٹیں ہیں ۔ اگر جانور رکاوٹوں کے باوجود کوشش میں لگا رہے اور یہ کوشش گنی جا سکے تو اس گنتی سے محرک کی طاقت کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔



مزاحمت کا اپریٹس (Apparatus)

ایک تجربے میں بھوکے چوہے کو خوراک تک پہنچنے کے لیے ایک بجلی کی انگیٹھی سے گزرنا پڑتا تھا جو جھٹکے (Shocks) دیتی تھی ۔ چوہے کو بیس منٹ دیے گئے اور دیکھا گیا کہ جھٹکے کے باوجود وہ کتنی بار کوشش کرتا ہے ۔ اگر چوہے کو دو سے چار دن تک بھوکا رکھا جائے تو ۲۰ منٹ میں چوہا ۱۸ دفعہ کوشش کرے گا ۔ بھی

تجربہ پیاس پہ ہوا ۔ اسی قسم کا تجربہ مادری تقاضے پر ہوا ۔ چوہیا کے بچے پیدا ہوتے ہی بجلی کی انگیٹھی کی دوسری طرف رکھ دیے گئے اور چوہیا کی بچوں تک پہنچنے کی کوشش کو گنا گیا ۔ پہلے ہفتہ تک کے بچوں کے لیے تو چوہیا نے کوشش کی ۔ اس کے بعد یہ کوشش نہ رہی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چوہیوں میں مادری تقاضا جلد ختم ہو جاتا ہے ۔ جنسی خواہش کے بیدار ہونے پر چوہیا بڑی کوشش کرتی ہے کہ انگیٹھی پار کرکے چوہے تک پہنچے لیکن جب یہ خواہش پوری ہو جاتی ہے تب کوشش ختم ہو جاتی ہے ۔

اس تجربے کے نتائج مندرجہ ذیل ہیں :

محرک	کوششوں کی تعداد
مادری	۲۲۰۴
پیاس	۲۰۰۴
بھوک	۱۸۰۲
جنسی خواہش	۱۳۰۸
تجسس	٦۰۵
بغیر صلہ	۳۰۵

اس جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ مادری خواہش سب سے زیادہ طاقتور ہے اور آخری نمبر پر یعنی کمزور ترین محرک وہ ہے جس میں صلے کی اُمید نہ ہو ۔

اس تجربے کی کامیابی ذیل کے امور سے ہوئی :

(۱) تمام چوہے ایک ہی عمر کے لیے گئے ۔
(۲) تمام چوہے ایک ہی نسل سے لیے گئے ۔
(۳) ہر تجربے کے لیے ۲۹ چوہے لیے گئے پھر ان تجربوں کی اوسط نکالی گئی ۔
(۴) بجلی کی انگیٹھی ہر چوہے کو ایک ہی جیسا جھٹکا دیتی تھی ۔

یعنی ہر جھٹکے کی شدت اور مدت یکساں تھی ۔

(۵) کوئی چوہا دو تجربوں میں استعمال نہیں کیا گیا ۔ یعنی ایسا نہ ہوا کہ ایک ہی چوہا بھوک اور جنسی خواہش کے تجربوں میں استعمال ہو کیونکہ جیسا اوپر ذکر آ چکا ہے بھوک سے جنسی خواہش کمزور پڑ جاتی ہے ۔ لہٰذا ایک چوہا صرف ایک ہی تجربہ کرے گا ۔

(۶) تجربے سے پہلے ہر چوہے کو ایک جیسی تربیت دی گئی ۔

(۷) تربیت کے بعد ہر چوہے کو کوشش کے لیے ۳۰ سنٹ ملے ۔

(۸) تجربے میں سوائے چوہے کی کوشش کے باقی تمام حالات کو ضبط میں رکھا گیا ۔

ساتواں باب

محرکات کا ارتقاء

Development of Motives

پچھلے باب میں ہم پڑھ آئے ہیں کہ انسان کی نشو و نما کا دار و مدار پختگی ، مشق اور آموزش پر ہے - یہ تینوں عناصر محرکات میں بھی کار فرما ہیں - بعض محرکات پختگی سے پیدا ہوتے ہیں ، اور بعض مشق اور آموزش سے - اول الذکر کو جبلی ، قدرتی اور فطری اور مؤخرالذکر کو اکتسابی یا ماخوذ کہا جاتا ہے - لیکن انسانوں کا ہر محرک قدرتی اور اکتسابی عناصر پر مشتمل ہوتا ہے یعنی اس کی بنیاد تو فطرت میں موجود ہوتی ہے، لیکن مشق، آموزش اور اصول تقویت سے اس پر عمارت کھڑی کی جاتی ہے -

کتے کے پلے کو لیں ، اس کی بھوک غیر اکتسابی فعل ہے ، اور اسے شعوری طور پر کچھ علم نہیں کہ بھوک کیا ہے اور کیسے اس کی تشفی ہو سکتی ہے - لیکن جب اسے بھوک لگی ہو تو وہ بڑا سرگرم ہوتا ہے ، بے چین نظر آتا ہے ، اور جب تک دودھ نہیں پی لیتا ، آرام سے نہیں بیٹھتا - جب کامیابی کی صورت میں تقویت پاتا ہے ، تو جو امور بھوک مٹائیں ، انہیں دھراتا ہے اور رکاوٹوں کو پسند نہیں کرتا - انسانی بچے کا بھی یہی حال ہے ، بلکہ وہ پلے سے بھی زیادہ بے بس اور کمزور ہے - بھوک اور پیاس میں روتا ہے ، اور ہاتھ پاؤں مارتا ہے ، لیکن اسے کچھ علم نہیں ہوتا کہ وہ کس چیز کا طلب گار ہے اور وہ چیز کیسے دستیاب ہوگی ؟ ماں اس کو چھاتی سے لگاتی ہے اور وہ دودھ پینا شروع کر دیتا ہے - دودھ پینے سے اس کی چوسنے کی حرکات مضبوط

ہو جاتی ہیں ۔ اگر بچے کو ماں کا دودھ نصیب نہ ہو اور بوتل سے دودھ ملے ، تو دودھ تو بچہ ویسے ہی چوسے گا جیسے ماں کی چھاتی سے چوس رہا ہو ، البتہ بوتل پکڑنے کا ڈھنگ چھاتیوں سے لپٹنے سے مختلف ہوگا ۔ وقت گزرنے کے ساتھ بوتل پر گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جائے گی ۔ بوتل سے دودھ پینا اکتسابی فعل ہے ۔ جب بوتل چھڑائی جاتی ہے یا ماں دودھ چھڑاتی ہے ، تو بچے کو سخت تکلیف ہوتی ہے : کیونکہ ایسا اہم محرک، جس کی بنیادیں بچے کی فطرت میں ہوں اور جس کی عمارت ، آموزش اور عادت پر ہو ، یک لخت بدل جاتا ہے ، اب بچے کو دودھ کی بجائے کھانا ملے گا یا دودھ بھی ملے گا تو بوتل سے ، ماں کی چھاتی سے نہیں ۔ لہٰذا بچے کو عادت بدلنی ہوگی ، جو آسان کام نہیں ۔

غیر اکتسابی یا جبلی میلانات تعداد میں کئی ہیں ، اور ان کے وظائف بھی مختلف ہیں ، لیکن ان سب کا حیاتیاتی مقصد ایک ہی ہے ۔ یہ میلانات چاہے عضلاتی ہوں یا خالص نفسی ، ان کا مقصد عضویہ کی حفاظت اور نسل کا بقا ہے ۔ ظاہر ہے کہ عضویہ کو زندہ رہنے کے لیے آکسیجن ، پانی اور خوراک کی ضرورت ہے ، اور فضول مادے کو بھی خارج ہونا چاہیے ۔ زخموں سے بچنا بھی ضروری ہے ۔ بقائے نسل کا طریقہ ایک نہیں ، بلکہ ہر نوع کا طریقہ علیحدہ ہے ، لیکن سب انواع میں نر اور مادہ کی تقسیم ہے ، ان کے ملنے کے طریقے بھی ایک جیسے نہیں ۔ اس کے علاوہ کوئی انڈے اور کوئی بچے دیتا ہے ، لیکن ان سب کا مقصد نسل کی افزائش اور بقائے حیات ہے ۔

ان جبلات کو بیدار کرنے کے لیے مہیجات درکار ہیں ۔ جسم میں پانی اور خوراک کا ذخیرہ کم یا ختم ہو جائے تو بھوک یا پیاس لگتی ہے ، اور انھیں مٹانے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے ، لیکن ان کی تشفی کے لیے کوئی طے شدہ اور مقرر طریقہ تجویز نہیں کیا جا سکتا ۔ تمام جانوروں اور انسانوں کو بھوک پیاس لگتی ہے ، لیکن اسے رفع

کرنے کے لیے ہر نوع بلکہ ہر فرد کا اپنا طریقہ ہوگا ، اور جوں جوں زندگی پیچیدہ ہوتی جاتی ہے ، سادہ اور آسان رد عمل کی جگہ مرکب اور مشکل رد عمل معرض ظہور میں آتے ہیں ۔ ووڈورتھ کا کہنا ہے[۱] کہ جبلی افعال حیاتیاتی مقصد کو پورا نہ کر سکیں گے :

(۱) اگر جبلات میں آموزش اور تدریس کی صلاحیت نہ ہو ۔

(۲) اگر مہیج ، جو بھوک ، پیاس اور درد وغیرہ کی صورت میں محسوس ہوتا ہے ، عضویہ کو متأثر نہ کرے یا اسے کسی فعل کے لیے آمادہ نہ کرے ۔

(۳) اگر عضویہ کی عمومی فعلیت تیز نہ ہو جائے یا اس کی مقدار میں اضافہ نہ ہو جائے ۔ فرد جتنا فعال (Active) ہوگا ، اتنا ہی جلد جبلات کی تشفی کے لیے راہیں ڈھونڈ لے گا ۔

(۴) اگر کامیاب افعال کو تقویت نہ ملے اور نتائج سے بے غرضی برتی جائے ، اور ان سے اثر قبول نہ کیا جائے تو کامیاب افعال کو دھرایا نہیں جا سکتا ، اور ناسماعد افعال سے نہیں بچا جا سکتا ۔

یہ بھی یاد رکھیے کہ جبلی تقاضے کئی قسم کے ہیں ، لیکن ان سب میں آموزش اور مشق کی بدولت تبدیلیاں آتی رہتی ہیں ۔ ووڈورتھ کہتا ہے کہ ان تبدیلیوں کا پتہ چار طریقوں سے لگتا ہے :

(۱) میلانات کے اغراض و مقاصد زیادہ واضح اور معین ہو جاتے ہیں ۔ مثلاً بھوک کی اشتہا کو لیجیے ۔ شروع میں نہ تو اس کی نوعیت کا شعور ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے مقصد کا ، لیکن تجربہ بتا دیتا ہے کہ فلاں میلان ، کن اشیاء سے اور کیسے تشفی پائے گا ۔ بھوک یوں تو قدرتی امر ہے ، لیکن تہذیب و تمدن کے تحت ، ہر شخص نے سیکھ رکھا ہے کہ اسے دن میں کتنی بار اور کس کس وقت پر کھانا کھانا چاہیے ۔ بعض لوگ دن میں چار بار کھانا کھاتے ہیں ، بعض تین

۱۔ ملاحظہ ہو Psychology ، صفحہ ۳۰۴ ۔

بار اور بعض دو بار ہی کھاتے ہیں ۔ بچے کے کھانے کے اوقات اپنے ہوتے ہیں ۔ اسے دن میں کتنی بار کھانا چاہیے اور کیا کھانا چاہیے ؟ یہ ڈاکٹری ہدایت کے موافق ہوتا ہے ۔

(۲) سادہ محرکات اکٹھا ہو کر مرکب محرک بناتے ہیں ۔ یہ اس وقت ہوتا ہے، جب مختلف میلانات کی تشفی ایک ہی وقت میں ہو سکے ۔ ڈنر پارٹیوں میں صرف بھوک کی تسکین نہیں ہوتی ، اور کوئی شخص محض پیٹ بھرنے کے لیے نہیں جاتا ، بلکہ بھوک کے علاوہ پارٹیوں میں میل جول بھی ہوتا ہے ۔ معاشری تعلقات قائم ہوتے اور بڑھتے ہیں اور جنسی خواہشات کی تسلی ہوتی ہے ۔ یہ سب محرکات چونکہ ایک ہی موقع کی پیداوار ہیں اس لیے آپس میں مل جل جاتے ہیں ، اور ایک مرکب محرک کو تشکیل دیتے ہیں ۔ لہٰذا جب عشائیہ کی دعوت آتی ہے، تو بھوک کا محرک بیدار نہیں ہوتا بلکہ مرکب محرک ، جو بھوک ، میل جول اور جنسی خواہشات کے امتزاج سے بنا ہے۔ ایسے ہی آپ زندگی کے کسی شعبے پر نظر دوڑائیں ، تو آپ کو اکثر محرکات ایک ساتھ کام کرتے ہوئے ملیں گے ۔ ان کے اشتراک اور تعاون سے مرکب محرکات معرض وجود میں آتے ہیں ۔

(۳) اصلی مقصد پانے کے لیے کئی چھوٹے چھوٹے مقاصد ، جو راہ میں آئیں ، انھیں وقتی طور پر مقصد بنا لیا جاتا ہے ۔ مثلاً اگر کسی دور دراز مقام پر پہنچنا ہو تو راستے میں کئی مقام آئیں گے ۔ ان مقامات کو یاد رکھا جاتا ہے ۔ پہلے ایک مقام پر پہنچے تھے ، پھر دوسرے پر ، پھر تیسرے پر و علیٰ ہذا القیاس ۔ ہر مقام اپنی جگہ پر مقصد ہوتا ہے، اور اسے حاصل کرنے کے لیے پورا زور لگایا جاتا ہے ۔ فرض کیا کہ آپ گورنمنٹ کے کسی محکمہ میں افسر بننا چاہتے ہیں ، تو آپ کے لیے ضروری ہے کہ بی ۔ اے یا ایم ۔ اے اچھی ڈویژن میں پاس کریں ، پھر مقابلے کا امتحان دیں اور چوٹی کے امیدواروں کی فہرست میں شمار

پائیں - بی - اے یا ایم - اے کا امتحان پاس کرنا ، اور مقابلے کے امتحان میں چوٹی کے امیدواروں میں آنا مختلف مقامات یا منازل ہیں - افسر بننے کے لیے جب آپ ایم - اے میں ہوں گے ، تو پھر اسی کو اچھی ڈویژن میں پاس کرنا آپ کا مقصد بنے گا - اور جب مقابلے کا امتحان دے رہے ہوں گے ، تو پھر مقابلے کا امتحان مقصد ہوگا - یہ درمیانی مقاصد بڑے اہم ہوتے ہیں، ان کا حصول آخروی مقصد کے لیے اشد ضروری ہوتا ہے۔

(۴) محرکات کو بیدار کرنے کے لیے ، قدرتی مہیجات کی بجائے ، مصنوعی مہیجات آ جاتے ہیں - جنسی خواہش کو نہ صرف صنف مخالف کی موجودگی بیدار کرتی ہے ، بلکہ مخرب اخلاق ناول ، گانے اور فلمیں بھی جنسی خواہش کو بیدار کرتی ہیں - صنف مخالف کی موجودگی قدرتی مہیج ہے ، لیکن مخرب اخلاق لٹریچر مصنوعی مہیج ہے - اور جو احساسات اور جذبات قدرتی مہیج ابھار سکتے ہیں ، آموزش اور مشق کی بدولت مصنوعی مہیج بھی ابھار سکتے ہیں - بھوک کا مہیج ، پیٹ کا خالی ہونا ہے ، لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہوسٹل کے لڑکے کام میں مصروف ہیں، کھانے کی گھنٹی بجتی ہے - جونہی گھنٹی سنی ، انھیں بھوک لگ گئی ، کتابوں کو چھوڑ چھاڑ کر کچن کا راستہ لیا اور کھانے پر پل پڑے - گھنٹی کی آواز مصنوعی مہیج ہے ، لیکن اس کا فعل وہی ہے ، جو خالی پیٹ کا ہے - دونوں بھوک لگاتے ہیں اور مخصوص فعل پیدا کرتے ہیں - اس قسم کے رد عمل کو مشروط رد عمل (Conditioned Response) کہا جاتا ہے - اس کا تفصیلی بیان آگے آئے گا -

محرکات کا نشو و نما :

محرکات کا ذکر کرتے ہوئے پہلے پہل حیاتیاتی محرکات آئے پھر قدرتی پسند اور نا پسند - اس کے بعد ہنگامی اور خارجی محرکات بیان کیے گئے - جہاں تک طبعی اور فطری تقاضوں کا تعلق ہے ہمارا

بیان یہاں ختم ہو جانا چاہیے تھا لیکن اس کے بعد دلچسپیوں اور مقاصد کا ذکر بھی آیا ۔ یہاں سے شخصیت کا نشو و نما شروع ہوتا ہے ۔ ابتدائی محرکات سے ہم ترقی یافتہ محرکات کی طرف آتے ہیں ۔

دراصل انسان اور جانور کا کردار مماثل ہونے کے باوجود بے حد مختلف بھی ہے ، مثال کے طور پر جنسی میلان کو لیجیے چوہوں میں یہ میلان باقی سب فطری میلانات کی نسبت زیادہ غایتی (Purposive) نظر آتا ہے اور خاص قسم کا کرداری نظام پیدا کرتا ہے ۔ پختہ ہوتے ہی چوہے اور چوہیاں اس فعل میں مخصوص طریقے سے مشغول ہو جاتے ہیں انہیں کسی تجربے یا تدریس کی ضرورت نہیں ۔ یہ فعل تمام چوہیوں میں ایک ہی طریقے سے ادا ہوتا ہے ۔ جب چوہیوں سے ہم بندروں کی طرف آتے ہیں تو ان کے جنسی فعل میں تبدیلی نظر آتی ہے ۔ ان کے فعل میں مکمل یکسانیت نہیں ملتی ۔ کیونکہ انہیں جنسی فعل سے پیشتر کئی اور چیزیں کرنی پڑتی ہیں اس کے علاوہ ان کے جنسی فعل کا مرکز بھی ہر بندریا نہیں بلکہ صرف وہی ہے جو آمادگی ظاہر کرے ۔ بندر کے جنسی فعل میں طبعی عناصر کے علاوہ اکتسابی عناصر بھی موجود ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اس فریضہ کی ادائیگی میں ترقی یافتہ جانور کوئی طے شدہ کردار پیش نہیں کرتے ۔ اس بنا پر فرائڈ (Freud) کہتا تھا کہ انسانی بچہ کثیر الاشکال بے راہ (Polymorphous perverse) واقع ہوا ہے کیونکہ اس کی زندگی میں جنسی خواہش بیسیوں شکلیں اختیار کرتی ہے اور کئی طریقوں سے ظاہر ہوتی ہے ۔

پس محرکات کے نشو و نما کے سلسلے میں یاد رکھنا چاہیے کہ جب جانوروں سے انسانوں کی سطح پر آتے ہیں تو ہمیں مفرد کردار کی بجائے متغیر اور کثیر الاشکال کردار ملتا ہے اس کی وجہ عضویہ کی لچک یا شکل پزیری (Plasticity) میں ملے گی ۔ ترقی یافتہ عضویہ میں ہزار ہا تبدیلیاں آتی ہیں ۔ کرداروں کی طبعی شکلیں بدل جاتی ہیں اور ان کی جگہ

تہذیب اور تمدن کی اختیار کردہ شکلیں لے لیتی ہیں - ادنیٰ جانوروں میں جس کردار کا منبع نخاع (Spinal Cord) ہے انسانوں میں اس کا منبع مخ کبیر (Cerebrum) اور دمیغ (Cerebellum) ہے اس لیے جو کردار جانوروں میں بالکل مقرر اور طے شدہ شکل میں ملے گا وہی کردار انسانوں میں کثیر الاشکال ہو جائے گا - ارتقا کے لیے ضروری ہے کہ عضویہ میں جامد خصائص کے علاوہ حرکی خصائص بھی ہوں - ادنیٰ طبقے کے جانوروں میں جامد حصہ زیادہ اور حرکی بہت کم ہے - لیکن جوں جوں ترقی ہوتی ہے حرکی قویٰ نمایاں ہوتے جاتے ہیں حتیٰ کہ انسانوں میں حرکی قویٰ کا حصہ جامد قویٰ کے مقابلے میں بہت بڑھ چڑھ کر ہے - اسی لیے انسانی کردار تغیر پذیر اور کثیر الاشکال ہے -

عضویہ میں تبدیلیاں آموزش کے دو اصولوں کے تحت ہوتی ہیں :

(۱) الٹکل پچو حرکات میں سے جو حرکات بچے کو ماحول سے بہتر توافق (Adjustment) دیں یعنی جس سے بچہ اور ماحول میں تسویہ پیدا ہو جائے ، وہ دھرائے جاتے ہیں اور ان کا رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہو جاتا ہے -

(۲) جس وقت بچہ کسی خاص مہیج کا رد عمل پیش کر رہا ہو تو مہیج کے ساتھ اگر کوئی اور شے منسلک کر دیں تو اس شے کا بھی وہی رد عمل ہوگا جو مہیج کا ہوتا ہے -

پہلے اصول کو آموزش بہ سعی و خطا (Learning by Trail and Error) کہتے ہیں ، دوسرے کو تلازمی (Associative) یا مشروط آموزش کہتے ہیں -

پہلے اصول کے ضمن میں یاد رکھیں کہ بیرونی مہیج بھی عضویہ کو متاثر کر سکتے ہیں - مثلاً بچے کو جب بھوک لگتی ہے دودھ پیتا ہے - اگر اسے بھوک نہ ہو تو دودھ دیں ، مٹھائی دیں یا پھل دیں وہ کبھی نہیں کھائے گا - لیکن ایک دو سال کے بعد خواہ بھوک لگی

ہو یا نہ مٹھائی اور پھل شوق سے کھا جائے گا۔ یہی حال بڑوں کا۔ وہ اس لیے نہیں کھاتے کہ انھیں بھوک لگی ہے بلکہ اس لیے کہ چیز عمدہ اور لذیذ ہیں اور چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ زیادہ کھانے سے چاہے وزن بڑھ جائے۔ سوئے ہضم پیدا ہو، کھٹے ڈکار آتے رہیں، لیکن کھاتے چلے جائیں گے۔ ہوٹلوں میں لذیذ کھانے بعد میں پیش کیے جاتے ہیں کیونکہ ہوٹل والوں کو پتہ ہے کہ خواہ آدمی نے پیٹ بھر کر کھانا کھا لیا ہو جب لذیذ کھانے پیش ہوں گے تو کوئی آدمی انھیں کھانے سے رک نہیں سکے گا۔ ایک اور مثال لیجیے، بچہ جب آرام کر چکے تو ہاتھ پاؤں مارنا شروع کرتا ہے یہ ایک قسم کی ورزش ہے۔ جب جسم تھک جائے تو بچہ سو جاتا ہے۔ لیکن چار سال بعد، جسم تھکنے پر بھی وہ کھیلتا رہتا ہے۔ اور جونھی ہم جولیوں کو کھیلتا دیکھے گا چپکے سے کھسک جائے گا اور کھیلتا رہے گا۔ اس سٹیج پر اس کی سرگرمی کا منبع عضویاتی ضرورت نہیں رہی بلکہ مہیج کی نوعیت ہے علاوہ ازیں اس مہیج میں اس قدر طاقت ہے کہ خواہ عضویہ کو حیاتیاتی احتیاج ہو یا نہ ہو عضویہ متاثر ہو جائے گا اور کسی نہ کسی شغل میں مصروف ہو جائے گا۔ ہماری اکثر دلچسپیوں کی نفسیات یہیں ملے گی۔

دوسرے اصول کے ضمن میں یاد رہے کہ جو چیزیں مرغوب بن جاتی ہیں جیسے بچے کے لیے ٹافیاں، کھلونے اور پھول، یا بڑوں کے لیے ٹینس، کتابیں اور فیشن، تو ان مرغوب اشیا کی بدولت بچے اور بڑے ان امور سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں جن کا تعلق ان اشیا کے حصول سے بالواسطہ یا بلاواسطہ ہو۔ مثلاً بچے مٹھائی فروش کی دوکان کا پتہ رکھیں گے کہ وہ کہاں ہے، کب کھلتی ہے؟ پیسوں میں بھی دلچسپی لیں گے کیونکہ مٹھائی کے لیے پیسے چاہییں۔ وہ اس چچا اور ماموں کو بھی پسند کریں گے جو انھیں پیسے یا ٹافیاں لا کر دے۔

بڑے آدمیوں کے مشاغل کچھ اور نوعیت کے ہوتے ہیں لیکن وہ بھی ان امور میں دلچسپی رکھتے ہیں جو ان کے مشاغل کو فروغ دیں۔

ایک اور چیز دوسرے اصول کے تحت قابل ذکر ہے۔ بچہ شروع سے ہی الفاظ میں گھرا ہوا ہوتا ہے۔ پیدا ہوتے ہی مسلمان بچے کے کان میں اذان کی آواز پڑتی ہے۔ اس کے والدین، لواحقین، یار اغیار سب الفاظ بولتے ہیں اور الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ الفاظ کے ساتھ سر یا ہاتھوں سے اشارے ہوتے ہیں۔

بچے الفاظ اور اشاروں کو سمجھ لیتے ہیں۔ اور جو رد عمل اشیا کی موجودگی میں ہوتا تھا وہ الفاظ اور اشاروں سے ہو جاتا ہے۔ ٹافی کا لفظ سنتے ہی بچے کے منہ میں پانی آ جاتا ہے۔ بڑے آدمی بھی جب پلاؤ اور بریانی جیسے الفاظ سنتے ہیں تو ان کی زبان چٹخارے لینے لگتی ہے۔ ٹینس کا نام سنتے ہی ٹینس کا کھلاڑی تیار ہو جاتا ہے اور ٹینس کورٹ کا راستہ لیتا ہے۔

جذبات (Sentiments) : میکڈوگل (McDougall) نے اپنی کتاب Social Psychology میں اس امر پر زور دیا کہ جبلات ترقی کرتے کرتے ایک دوسرے سے مل کر جذبات بناتے ہیں۔ یہ جذبات کسی خاص شے، ماحول یا موقع سے وابستہ ہوتے اور کئی ایک جبلات کو ایک ہی وقت بیدار کر دیتے ہیں۔ مثلاً حب الوطنی کے جذبے کو لیں یہ فرد کے اپنے ملک سے وابستہ ہے۔ اس جذبے میں کئی جبلات کار فرما ہیں۔ وطن کو مادر بھی کہا جاتا ہے پس جنسی جبلت بھی موجود ہوگی۔ اس کے علاوہ گروہی، خود ادعائی، انکساری (Self Abasement)، نفرت (Repulsion) (دوسرے ممالک سے) جیسی جبلتیں بھی موجود ہوں گی۔ جب ملک کے سلسلے میں یہ ساری جبلتیں بیدار ہوتی ہیں تو ہیجانی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور رد عمل ہیجانی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ جذبات کی تشریح میں نظام شمسی کی مثال دی جاتی ہے۔ نظام شمسی میں سورج کو مرکزی حیثیت حاصل ہے دیگر اجرام

فلکی اس کے گرد گھومتے ہیں ۔ اسی طرح جذبے میں مرکزی حیثیت تو شے یا موقعہ کو حاصل ہے ۔ متذکرہ بالا مثال میں یہ حیثیت ملک کو نصیب ہے ۔ جبلات اجرام فلکی کی مانند ہیں یہ سب کی سب ملک کے گرد گھومتی رہتی ہیں کوئی اور جذبہ ہو تو اس کا محور جدا ہوگا اور جبلات بھی جدا ۔ ان جذبات سے شخصیت میں نظم اور استقلال پیدا ہوتا ہے ۔ لہٰذا جذبے سے میکڈوگل کی مراد اشیا ، اشخاص یا خیالات کے متعلق مستقل ہیجانی میلانات کا موجود ہونا ہے ۔

میکڈوگل کے نظریہ‌ٔ جذبات کو من و عن تسلیم کرنے کو کوئی ماہر نفسیات تیار نہیں ۔ جبلات پر اعتراض کیے جاتے ہیں ۔ جبلات کی فہرست کو رد کر دیا گیا ہے ۔ جذبہ کا لفظ بھی غیر سائنسی قرار دیا گیا ہے ۔ لیکن اس کے باوجود کوئی شخص اس صداقت سے انکار نہیں کر سکتا جو اس نظریے کے تحت ہے ۔ پاکستان میں جب سنیما شو شروع ہوتا ہے تو قومی ترانہ گایا جاتا ہے اور پردہ سکرین پر قومی جھنڈا لہراتا دکھائی دیتا ہے ۔ ہر شخص اپنی جگہ پر اٹھ بیٹھتا ہے اور تعظیماً کھڑا رہتا ہے ۔ یہ کیوں کیا جاتا ہے ، اس کی تہہ میں کون سی نفسیات کارفرما ہے ؟ غور کرنے سے پتہ چلے گا کہ اس فعل میں حب الوطنی کے جذبے سے کام لیا جا رہا ہے اور اسے فروغ دیا جا رہا ہے ۔ اگر اس جذبے کو ٹھیس لگے تو بعض لوگ لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں ۔ ملک کے نام پر مر مٹنے والوں کی تعداد کچھ کم نہیں ۔ حب الوطنی کے علاوہ اور بیسیوں جذبے اسی قسم کے مرکب اور ہیجانی ہیں ۔ مدعا سب کا زندگی کو منظم بنانا ہے ۔ ہر شخص کے جذبات کا محور جدا ہے ۔ محبت ہر شخص کرتا ہے لیکن محبوب ہر ایک کا اپنا اپنا ہے ۔ جہاں جذبات سے زندگی میں مستقل مزاجی آتی ہے وہاں تنوع بھی پیدا ہوتا ہے ۔ ہر شخص کا جذبہ انفرادی ہے ۔ محور الگ ہے، جبلات ایک جیسی نہیں ۔ ان کی طاقت بھی یکساں نہیں ۔ جذبہ‌ٔ محبت کو لیجیے ۔ محبوب ہر آدمی کا الگ ہے ۔ اس جذبے میں

کئی جبلات ہیں۔ لیکن ضروری نہیں کہ ہر شخص کے جذبے میں وہی جبلات ہوں جو کسی دوسرے کے جذبے میں ہیں۔ اس کے علاوہ ایک شخص کے جذبے میں ایک جبلت زیادہ طاقتور ہے دوسرے کے جذبے میں کوئی اور۔

رویے (Attitudes) : جذبات میں ہیجانی کیفیات پر زور ہوتا ہے۔ اگر ہیجانی پہلو چھوڑ کر صرف رد عمل کو دیکھیں تو رویے کا عنصر غالب نظر آئے گا۔ جیسے جذبات کم و بیش مستقل ہیں ویسے ہی رویے بھی کم و بیش مستقل ہیں۔ لہذا رویے کو ہم مستقل اکتسابی میلان کہہ سکتے ہیں۔ اس کا تعلق اشخاص، گروہوں اور مقاصد سے ہے۔ رویوں سے ہمارا ردعمل موافق بنتا ہے یا غیرموافق۔ یا تو ہمیں خاص قسم کے گروہ، اشخاص اور مقاصد پسند ہوتے ہیں یا ناپسند۔ معاشرتی علوم (Social Sciences) میں رویوں کا ذکر خاص طور پر آتا ہے۔ اور ان کے متعلق ریسرچ ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً شادی یا پردے کے بارے میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کا رویہ کیا ہے؟ امریکیوں اور روسیوں کے ایک دوسرے کے متعلق کیا رویے ہیں؟ اسمبلی کے انتخاب میں دو امیدوار کھڑے ہیں ان کے متعلق ووٹروں کے کیا رویے ہیں؟

۱۔ جب اکثر و بیشتر ردعمل ایک جیسے ہوں تو رویہ بن جاتا ہے۔ یعنی بار بار ایک ہی قسم کا تجربہ کسی گروہ یا شخص کے متعلق ہوتا ہے، تو اس تجربے سے اس گروہ یا شخص کے متعلق رویہ بن جاتا ہے۔ مثلاً پاکستانیوں اور ہندوؤں کے رویے ایک دوسرے کے متعلق سالہا سال کے تجربوں کے نچوڑ ہیں۔ اسی طرح دھریوں کے رویے خدا، روح اور کائنات کے متعلق کئی برسوں کے مطالعہ کے بعد بنتے ہیں۔

۲۔ کبھی کبھار ایک ہی جرحی (Tranmatic) تجربے کے بعد رویے بن جاتے ہیں۔ اگر بچپن میں کسی جرحی شے سے مثلاً کتے سے واسطہ پڑا ہو تو وہ ڈر تمام عمر لا شعور میں جا گزیں ہو جائے گا اور

بچہ کتوں کے متعلق ایک مستقل رویہ بنا لے گا۔
۳۔ رویے ساتھیوں سے بھی لیے جا سکتے ہیں۔ کالج کے کئی مضامی
کو مشکل یا فضول سمجھا جاتا ہے۔ یہ اس لیے نہیں کہ طلبہ نے انھی
مشکل یا فضول پایا ہے۔ بلکہ اس لیے کہ دوسروں نے انھیں مشکل ا
فضول کہہ دیا ہے۔ کوئی بچہ دوسرے بچے کو ادنیٰ یا اعلیٰ نہیں سمجھت
بڑے ہو کر نسلی اور قومی امتیازات پیدا ہو جاتے ہیں۔ کوئی اعلیٰ ا
جاتا ہے کوئی ادنیٰ، ادنیٰ کو حقیر سمجھا جاتا ہے اور اس کے خلا
نفرت کا رویہ قائم ہو جاتا ہے۔ اس نفرت کی بڑی وجہ بڑوں کی ہدایا
اور تعصبات ہیں۔ بڑے کہتے ہیں فلاں نجس ہے، فلاں شودر ہے، فلا
کالا ہے، فلاں سے پرہیز کرنا چاہیے اور ساتھ ہی جھوٹے سچے دلائل بھ
دیے جاتے ہیں۔ چونکہ بچے کا دماغ غیر پختہ ہوتا ہے اس لیے وہ ا
تمام تعصبات کو قبول کر لیتا ہے اور دوسروں کو اسی آئینے م
دیکھتا ہے۔

جب رویے مضبوط اور دیرپا ہو جاتے ہیں تو تبیک (tereotypes
کہلاتے ہیں۔ مسلمانوں میں شیعہ اور اہل السنت والجماعت ایک دوسر
کو کھٹمل اور پسو کہتے ہیں۔ پنجابیوں، پٹھانوں، پناہ گزینوں، بنگالیو
کے متعلق بھی تبیک موجود ہیں جو ایک دوسرے کے تعصبات کی غما
کرتے ہیں۔ ان تبیک کی بنیاد معقولیت پر نہیں ہوتی۔ گو ان کے ن
بڑے دور رس ہیں۔ یہ تبیک ہماری آنکھوں کے اوپر رنگین عینک کا
دیتے ہیں۔ ہم دوسرے افراد اور اقوام کو ویسے ہی دیکھتے ہیں جس ط
ان کے متعلق تبیک بنا لیے گئے ہوں۔ امن عالم کے لیے ضروری ہے
یہ تعصبات دور ہو جائیں کیونکہ خاکوں سے اصلیت پنہاں رہتی ہے
غلط فہمیاں بڑھتی رہتی ہیں۔

رویوں اور تبیک کے ساتھ ساتھ ہر فرد میں اقدار پائی جاتی ہیں۔
کا اپنا نظام اور ترتیب ہوتی ہے۔ اہمیت کے لحاظ سے کوئی قدر اول

پر آئے گی ، کوئی آخر پر اور کوئی ان کے درمیان - ہر شخص میں اقدار کا نظام ایک جیسا نہیں - کسی شخص میں کوئی قدر افضل ہے کسی میں کوئی اور - پھر کبھی کوئی قدر شعور پر چھا جاتی ہے کبھی کوئی اور - اکثر انسان متلون مزاج ہوتے ہیں - ان میں اقدار کا نظام ایک ہی وضع پر قائم نہیں رہتا بلکہ جیسا موقعہ ہوا ویسی ہی اقدار سطح شعور پر ابھرتی ہیں -

۳- **دلچسپیاں:** فطری محرکات سے بچے کو آس پاس کا علم ہوتا ہے اور اشیا کے خصائص کا پتہ چلتا ہے - لیکن اس علم سے دلچسپی پیدا نہیں ہوتی - بعض چیزیں مکروہ ثابت ہوتی ہیں، انہیں جلد بھلا دیا جاتا ہے اور دھرانے کی زحمت گوارا نہیں کی جاتی - ایسا کیوں ہوتا ہے !! بعض عالموں کا خیال ہے کہ جن اشیا یا اشخاص کا تعلق بنیادی محرکات سے قائم ہو جاتا ہے ان میں دلچسپی لی جاتی ہے - مثلاً بچے کی بھوک پیاس جن اشیا سے مٹتی ہے ان میں بچہ دلچسپی لیتا ہے - اسی طرح بعض اشیا ہنگامی اور خارجی محرکات کو تشفی دیتی ہیں - لہٰذا اس قسم کی اشیا کو اپنا لیا جاتا ہے - اور انہیں توجہ کا مرکز بنا لیا جاتا ہے اور جن اشیا کا تعلق بنیادی محرکات سے نہیں ہوتا ان میں دلچسپی نہیں لی جاتی - ووڈورتھ[1] اس بیان سے اتفاق نہیں کرتا - وہ خرگوش والے تجربے کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے کہ عام لوگ کہیں گے کہ بچے کو خرگوش سے دلچسپی قانون تلازم یا مشروط رد عمل سے پیدا ہوئی - لیکن یہ حقیقت نہیں - آپ کو یاد ہوگا کہ ہم نے ایک تجربے میں ایک بچے کا ذکر کیا تھا جو خرگوش سے ڈرتا تھا - اس کا ڈر آہستہ آہستہ دور کیا گیا - بچے کے کھانے کے وقت خرگوش کو میز پر رکھ دیا گیا - پہلے تو بچہ کچھ ٹھٹکا - جب بار بار ایسا کیا گیا تو بچہ خرگوش سے مانوس ہو گیا - ووڈورتھ کا کہنا ہے کہ اس تجربے سے یہ تو ثابت ہوا کہ

۱- ملاحظہ ہو ووڈورتھ کی Psychology ، صفحہ ۳۱۸ -

مخصوص حالات میں بچے کا ڈر جاتارہا ۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نـ
کہ بچے کو خرگوش سے دلچسپی پیدا ہوگئی ۔ جن ایام میں تجربہ جا
تھا بچے کو کوئی موقعہ نہیں ملا کہ خرگوش کے دلچسپ پہلوؤں
واقفیت حاصل کرے ۔

دلچسپی یوں ہی پیدا نہیں ہوتی ۔ بعض اوقات اس ضمن میں کوشـ
کی ضرورت ہوتی ہے ۔ بعض چہرے جاذب نظر نہیں ہوتے ۔ ہمارا
رد عمل موافق نہیں ہوتا ۔ لیکن اگر چہرے کی بد صورتی سے ہٹ
شخصیت کی کھوج لگائی جائے تو باطن کی خوبیاں اجاگر ہوتی ہیں
انسان خواہ مخواہ کھنچا جاتا ہے ۔ سقراط کا چہرہ بڑا مکروہ تھا ۔ لیـ
اس کی شخصیت بڑی حسین اور دلکش تھی ۔ یہی وجہ تھی کہ ہر و
سقراط کے اردگرد نوجوانوں کا حلقہ بندھا رہتا تھا ۔ کتابوں کے متعلق
کبھی کبھار یہی تجربہ ہوتا ہے ۔ شروع شروع میں کتابیں دلچسپ نہ
لگتیں ۔ لیکن اگر طبیعت پر زور دے کر مطالعہ جاری رکھیں تو کتـ
سے دلچسپیاں پیدا ہوتی ہیں اور پھر بڑھتی جاتی ہیں ۔

ووڈورتھ سمجھتا ہے کہ دلچسپیاں محرکات سے ہی پیدا نہیں ہوتیـ
اکثر اوقات ماحول بھی انہیں پیدا کر دیتا ہے ۔ جب ماحول اور اس
مافیہ سے ٹھیک طرح سے نپٹ سکیں تو دلچسپی پیدا ہو جاتی ہـ
جو کھیل اچھی طرح سے کھیلا جا سکے، وہ مرغوب اور پسندیدہ بن جـ
ہے ۔ اگر کوئی لڑکا فٹ بال عمدگی سے کھیلتا ہے ، یعنی فٹ بال پر ا
قابو ہے اور اس کھیل میں اس نے مہارت حاصل کرلی ہے تو وہ فٹ
کھیلے گا ۔ دھوپ کی بھی پرواہ نہیں کرے گا ۔ فٹ بال کھیلنا اب
کے لیے عزیز دلچسپ مشغلہ بن گیا ہے وہ اس سے باز نہیں رہ سکتـ
گانے میں بھی ایسے ہی دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔گوئیے کو راگ اور سر
واقفیت ہو جاتی ہے ۔ گلا پہلے ہی اچھا پایا ہوتا ہے ۔ قدرت نے کـ
استعداد بھی عطا کی ہوتی ہے ۔ لہٰذا اچھی سی سر کو بار بار دھراتا ۔

اور یہی اس کی دلچسپی کا راز ہے - بت تراش کیوں صبح شام بت سازی میں مصروف رہتا ہے ؟ اسے نہ بھوک تنگ کرتی ہے نہ پیاس ستاتی ہے - نہ اسے آرام کی پرواہ ہے نہ بال بچوں کی ، اپنے کام میں ایسے منہمک ہے جیسے دنیا اور اس کے مافیہ سے بے نیاز ہے - اس دلچسپی کی تہہ میں کچھ تو فطری صلاحیتیں ہیں کچھ مواد پر قابو پانے کے خوشگوار خیالات اور کچھ تکرار اور اعادہ کی وجہ سے فن بت تراشی میں سہارت -

دلچسپیاں جگہوں اور انسانوں میں بھی ہوتی ہیں - جگہ تب پسند آتی ہے جب اس کا حدود اربعہ سمجھ میں آ جائے - وہاں کی اشیا اور اشخاص سے محبت پیدا ہو اور اس جگہ قیام کرکے انسان اپنا کاروبار خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکے - انسانوں سے لگاؤ بھی ایسے ہی پیدا ہوتا ہے - آپ انھیں سمجھ جاتے ہیں ، ان کے طور اطوار سے واقف ہو جاتے ہیں اور جس سلوک کے خواہاں ہیں وہ آسانی سے یعنی تردد کے بغیر مل جاتا ہے - اگر مل جل کر کھیلنا یا لڑنا مقصود ہو تو اس قماش کے لوگ مل جاتے ہیں - غرض کہ دلچسپی کی اصل وجہ جگہوں اور انسانوں کو سمجھ لینے کے علاوہ اس امر میں بھی ہے کہ جگہوں اور انسانوں سے برتاؤ کی صورت نکل آتی ہے اور ان کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکتے ہیں - نہ صرف افراد کے ساتھ بلکہ گروہوں کے ساتھ دلچسپیاں پیدا ہو جاتی ہیں - کھلاڑیوں کی اپنی ٹیمیں ہوتی ہیں - ان کی عزت برقرار رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے - اسی طرح سیاست میں مختلف جماعتیں ہوتی ہیں - ہر فرد اپنی پارٹی کے لیے سرتوڑ کوشش کرتا ہے - اسے اپنی پارٹی کے ساتھ والہانہ لگاؤ ہے - پارٹی کی کامیابی اس کی کامیابی ہے اور پارٹی کی ناکامی اس کی اپنی ناکامی ہے - لٰہذا پارٹی کے لیے ہزاروں لاکھوں روپے خرچ ہوتے ہیں - پارٹی کے امیدواروں کی حمایت کی جاتی ہے - ان کی کامیابی کے لیے ہر ذریعہ خواہ جائز ہو یا ناجائز اختیار کیا جاتا ہے - آخر یہ کیوں ؟ اس کا جواب آپ کو دلچسپی کے حوالہ سے دینا ہوگا -

اوپر ذکر آ چکا ہے کہ دلچسپیوں کا دائرہ نہایت وسیع ہے - نہ صرف کھیلوں، گانوں، انسانوں اور جگہوں سے گہرا لگاؤ پیدا ہوتا ہے، بلکہ انجمنوں ، اداروں اور پارٹیوں سے بھی دلچسپی ہو جاتی ہے - بال بچوں کے لیے کیا کچھ نہیں کیا جاتا ؟ یہ سب چیزیں زندگی کو رنگین بناتی ہیں - ایک اور دلچسپی جو زندگی میں بڑی اہم ہے اس کا ذکر ابھی باقی ہے - یہ دلچسپی انسان کو اپنی ذات سے ہے اور اس کا آغاز بچپن سے ہو جاتا ہے - شروع میں بچے کو خود کا کچھ پتہ نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کی اپنی کوئی خاص دلچسپی ہوتی ہے - جوں جوں اس کی دلچسپیاں بڑھتی ہیں اسے اپنی ذات کا احساس بھی ہوتا جاتا ہے - اس کی دلچسپیوں اور مشاغل کا مرکز اور اس کی سرگرمیوں اور مصروفیتوں کا سرچشمہ اس کی ذات بن جاتی ہے - لہٰذا ذات کا اثبات اور اس کی فلاح و بہبود ایک بہت بڑی دلچسپی ہے جسے قائم رکھنا زندگی کا مقصد بن جاتا ہے - گھروں میں بڑے بوڑھے لوگ بچوں کی تعریف کرتے ہیں - کبھی کبھی انھیں جھڑکتے اور الزام دیتے ہیں - بچے کے لیے تعریف اور مذمت زبردست عوامل ہیں - دونوں سے شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے - نہ تو بچے کی بے جا تعریف ہونی چاہیے، نہ ہی بے جا مذمت - دونوں سے بچہ بگڑ جاتا ہے - تعریف اور مذمت ایک آئینہ ہے جس میں بچہ اپنے آپ کو دیکھتا ہے - جس کردار پر اسے شاباش ملتی ہے وہ دھرایا جاتا ہے - جس پر مار یا جھڑک پڑتی ہے اسے چھوڑ دیا جاتا ہے - (یاد رہے بگڑے بچے جھڑک اور مار والے کردار کو دھراتے ہیں - وہ مار کھاتے ہیں اور برے کام کرتے رہتے ہیں) بچہ خود بھی شیخی مارتا ہے، بعض دفعہ اچھے کاموں پر بعض دفعہ برے کاموں پر - لہٰذا اس کا معیار سوسائٹی سے مختلف ہوتا ہے - اس کا بدی کا معیار بھی اپنا ہے - برے کاموں پر بھی بچہ فخر کرتا ہے - لاف زنی سے بھی ذات کا احساس ہوتا ہے - اس کے علاوہ کارہائے نمایاں پر پبلک سے تحسین ملتی ہے - واہ واہ ہوتی ہے - نعرے

لگتے ہیں ۔ بگل بجائے جاتے ہیں ۔ اور کارہائے بد پر الٹا رد عمل ظاہر ہوتا ہے ۔ ہر شخص خواہش رکھتا ہے کہ دنیا کی نظروں میں چمکے ۔ اس کا کردار ایسا روشن ہو کہ لوگ خواہ مخواہ تعریف کریں ۔ لہٰذا وہ ہرممکن کوشش کرے گا کہ جن کاموں پر تحسین ملتی ہے انھیں بار بار کیا جائے ۔ وہ ایسے اداروں اور انجمنوں سے رابطہ قائم کرے گا جو نیک نامی کا موجب ہوں اور عزت و شہرت کے ضامن ۔ پبلک کی تعریف یا بد تعریفی سے اور اداروں میں شرکت یا عدم شرکت سے اور خود اپنی ذاتی کوششوں اور امنگوں سے ذات کا احساس پختہ سے پختہ تر ہو جائے گا اور زمانہ گزرنے پر ذات کا استحقاق زندگی کی سب سے بڑی دلچسپی بن جائے گا ۔

مقاصد (Purposes) : اس لفظ کے معانی متعین نہیں ۔ بعض دفعہ ہر ایسے فعل کو مقصد کہہ دیا جاتا ہے جس کا کوئی مقصود ہو ۔ اس لحاظ سے ہر فعل مقصدی کہلائے گا ۔ کیونکہ شعوری یا لاشعوری طور پر ہر فعل کا خواہ وہ اضطراری یا جبلی یا غایتی ہو کوئی نہ کوئی مقصود ضرور ہوتا ہے ۔ لہٰذا مقصد کا لفظ تب ہی متعین ہو سکتا ہے جب اس کا استعمال محدود ہو جائے ۔ اس مطلب کے لیے مقصد کا لفظ صرف ان افعال کے لیے محفوظ رکھنا چاہیے ۔ جن میں (۱) مقصود کا صاف پتہ ہو اور (۲) اس مقصود کو پانے کا عزم موجود ہو ۔ اگر ان دونوں خصائص کو مد نظر رکھا جائے تو اضطراری اور جبلی میلانات مقصدی افعال کے ضمن سے نکل جائیں گے ۔ اس کے علاوہ وہ افعال بھی اس زمرہ میں شامل نہیں ہوں گے جن میں مقصد سے بے پروائی برتی جائے ۔ یا جہاں کوئی خاص مقصود نظر نہ آئے ۔ مثلاً سڑکوں پر آوارہ گردی ۔ بعض دفعہ آوارہ گردی میں کچھ مقصد ہوتا ہے اور بعض دفعہ نہیں بھی ہوتا ۔ مقصد کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سعی کی جائے ۔ مستقل مزاجی سے کام لیا جائے اور تکالیف

سے گھبرایا نہ جائے۔ حقیقت میں مقصد ایک لائحہ عمل ہے ۔ اسے ٹھیک طرح سے بنانے میں سمجھ اور تحمل کی ضرورت ہے ۔ اس کی کامیابی کا دار و مدار صرف سوجھ بوجھ اور عقل پر ہی نہیں بلکہ مستقل ارادے ، محکم یقین اور پیہم عمل پر بھی ہے ۔ اس کے علاوہ شوق اور جوش بھی چاہیے تا کہ کوشش پوری طرح سے ہو سکے ۔

اگر مقصدی فعل کو لائحہ عمل سمجھیں تو یہ زندگی کا عظیم ترین مقصد یا عظیم ترین مقاصد میں سے ایک ضرور بن جائے گا ۔ مقصدی فعل کی تہہ میں کئی محرکات کام کرتے ہیں ۔ ضروری نہیں کہ فرد ان سب سے شناسا ہو ، مقصود بھی بدلتے رہتے ہیں ۔ کئی مقصود فوری طور پر مرتب ہوتے ہیں ، کئی دیر بعد ۔ بعض مقصود راستے میں آ جاتے ہیں ان کا حصول بھی ضروری ہو جاتا ہے ۔ مثلاً آپ نے الف سے ب کی جانب جانا ہے ۔ کیا آپ کا مقصود ب کا حصول ہے یا الف سے دوری ؟ یا اس تک پہنچنا جو الف اور ب کے درمیان آ جاتا ہے ۔ پھر یاد رہے کہ مقصد بھی کئی محرکات کی تسلی کرتا ہے ۔ عشائیہ پارٹی میں صرف بھوک پیاس کا مداوا نہیں ہوتا بلکہ گروہی اور جنسی میلانات کی تشفی بھی ہوتی ہے ۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ :

(۱) جب علم اور ذہانت میں وسعت اور گہرائی آتی ہے تو دور کے مقاصد قریب کے مقاصد پر ترجیح پاتے ہیں ۔

(۲) گروہی مقاصد کو انفرادی مقاصد پر فوقیت دی جاتی ہے ، اور

(۳) جب کوئی اہم مقصد سامنے آتا ہے تو دیگر مقاصد یا تو اس کے موافق بنا لیے جاتے ہیں یا انہیں چھوڑ دیا جاتا ہے ۔

محرکات کے بارے میں کوئی چیز وثوق سے نہیں کہی جا سکتی تجزیۂ نفسی کے ماہرین کہیں گے کہ محرکات لا شعوری ہوتے ہیں ، ان کا علم فرد کو نہیں ہوتا ۔ لہٰذا جو محرکات فرد کے علم میں ہوں ضروری نہیں کہ وہ حقیقی محرکات بھی ہوں ۔ مثال کے طور پر خیرات

کو لیں ۔ خیرات کیوں دی جاتی ہے ؟ بعض کہیں گے کہ خیرات دینے سے مطلب غریبوں کی امداد ہے لیکن عین ممکن ہے یہ بات صحیح نہ ہو ، لوگ خیرات اس لیے کرتے ہوں کہ انہیں جنت ملے ، یا لوگ ان کی خیرات سے متاثر ہو کر ان کی تعریف کریں یا اگر وہ اسمبلی کے لیے کھڑے ہوں تو لوگ ان کو ووٹ دیں ۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی محرکات ہو سکتے ہیں جن کا وجود لاشعور کو کریدنے سے مل سکتا ہے ۔ لاشعور کہنے سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کا علم ہمیں نہیں ۔ ووڈورتھ کہتا ہے کہ لاشعور کا لفظ بڑا گمراہ کن ہے ۔ یہ لا علمی چھپانے کا ایک بہانہ بن گیا ہے ۔ جہاں کوئی چیز سمجھ میں نہ آئی ، کہہ دیا ”لاشعوری ہے“۔ لاشعور کا نظریہ یوں تو بڑا مفید ہے لیکن اسے من گھڑت اور دور از قیاس توجیہات کا بہانہ نہیں بنا لینا چاہیے ۔

محرکات کے سلسلہ میں عملی ہدایات :

زمانۂ گذشتہ میں نفسیات کی بحثیں خالص نظری اور فلسفیانہ حیثیت رکھتی تھیں ۔ عملی زندگی سے ان کا تعلق بہت تھوڑا اور معمولی سا ہوتا تھا ۔ میکڈوگل (McDougall) کے خیال میں جب سے نفسیات کا علاقہ عملی زندگی سے مضبوط ہوا ، نفسیات میں بالغ النظری ، وسعت اور معقولیت آ گئی ۔ اور یہ اس علم کی ترقی کے لیے نیک شگون ہے ۔

محرکات کی نفسیات سے ہر شخص دلچسپی رکھتا ہے ۔ استاد چاہتا ہے کہ طلبہ پڑھنے لکھنے سے جی نہ چرائیں اور پورے شوق اور انہماک کے ساتھ علم کی منازل طے کرتے جائیں ۔ بیوی خواہش رکھتی ہے کہ اس کا خاوند پہلے جیسا پیار کرتا رہے ۔ فوج کا کمانڈر متمنی ہے کہ اس کی فوج کے سپاہیوں کے حوصلے بلند رہیں اور وہ پورے جوش سے لڑیں ۔ حکومت بھی عوام سے یہی توقع رکھتی ہے ۔ جنگ کے دنوں میں کوئی حکومت نہیں چاہے گی کہ لوگوں کے حوصلے پست ہو جائیں اور ان کا اعتماد اپنی حکومت سے اٹھ جائے ۔

یہ مسائل محرکات کے مسائل ہیں ۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ مشاغل کے لیے مناسب محرکات بیدار کیے جائیں اور جب وہ بیدار ہو جائیں تو انہیں قائم رکھا جائے ۔ کیونکہ اگر محرکات پیدا ہونے کے بعد ختم ہو جائیں تو سرگرمیوں میں فرق آ جائے گا اور جس دلچسپی اور شوق سے کام شروع ہوا تھا ویسا جاری نہ رہ سکے گا ۔ پڑھنے لکھنے میں بعض بچے شروع شروع میں بڑے تیز ہوتے ہیں ، بعد میں سست پڑ جاتے ہیں ۔ ایسے ہی شادیاں بڑے پیار سے کی جاتی ہیں لیکن جلد تعلقات پھیکے پڑ جاتے ہیں اور طلاق تک نوبت پہنچ جاتی ہے ۔ سپاہی بھی بد دل ہو جاتے ہیں اور عوام بھی امیدکا دامن چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ حالات بدلنے کی وجوہات تو سینکڑوں ہو سکتی ہیں لیکن ایک اہم سبب محرکات میں تبدیلی ہے ۔ جس محرک سے کام کی ابتدا ہوئی اس کی نوعیت بدل گئی یا اس کی جگہ کسی اور محرک نے لے لی ۔

اس سلسلہ میں کئی مشورے دیے جا سکتے ہیں ۔ سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ منفی اور یاس آمیز رویوں کے مقابلے میں تعمیری، رجائیت پسندانہ اور خوش کن رویے ہمیشہ بہتر رہتے ہیں ۔ اگر بچے کو ہر وقت کہا جائے کہ تو کسی کام کا نہیں ۔ تو تو کچھ نہیں بنے گا ۔ تو تو صرف گدھے چرائے گا ۔ تو بچہ یقیناً کچھ نہیں کر سکے گا ۔ اگر اس کے بر خلاف بچے کا دل بڑھایا جائے ، تو وہ کام میں دلچسپی لینی شروع کرے گا اور برے طریقے بھی چھوڑ دے گا ۔ نفرت آمیز الفاظ اور لہجے استاد اور شاگرد اور اسی طرح والدین اور بچوں کے درمیان ایک ایسی دیوار کھڑی کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے ایک دوسرے کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے ، بجائے اس کے کہ بچے کے لیے سکول یا گھر ایک مستقل میدان جنگ بنا رہے ، ضرورت اس امر کی ہے کہ تعلیمی درس گاہیں اور گھر بچے کے لیے ویسے ہی دلچسپ بنائے جائیں جیسے کھیل اور کھیل کا میدان ہوتا ہے ۔ کھیل پر بھی اگر بچوں کو مجبور کیا

جائے تو وہ نہیں کھیلیں گے ۔ اگر انھیں آزاد چھوڑ دیا جائے اور کھیل کا تعلق ان کی فطری اور اکتسابی دلچسپیوں سے وابستہ کر دیا جائے تو وہ خود بخود کھیلوں کی طرف کھچے آئیں گے ۔ کام کو کھیل میں تبدیل کر دیں تو بچے کے محرکات بیدار ہوں گے ۔ اس کی دلچسپیاں بڑھیں گی اور مضبوط ہوں گی ۔

اس سلسلہ میں ووڈورتھ نے تجربات کی بنا پر مندرجہ ذیل مشورے دیے ہیں :

۱۔ مقابلہ : دو آدمیوں کو ڈائنمو میٹر (Dynamometer) دبانے کے لیے دیں ۔ پہلے ایک دبائے پھر دوسرا ۔ اگر دوسرا پہلے سے زیادہ دبائے تو فوراً پہلا کہے گا کہ مجھے دوبارہ موقع دیں میں پھر دباؤں گا ۔ اس دفعہ وہ زیادہ زور سے دبائے گا اور بہتر نتائج پیدا کرے گا ، کیونکہ مقابلے کا جذبہ بیدار ہو گیا ہے ۔

۲۔ رفتار مقرر کرنا (Pace-making) : دوڑ لگانے والے کو دیکھیے جب وہ مقابلے میں دوڑ لگائے گا تو بہتر دوڑے گا ۔ لوگ یوں بھی دوڑتے ہیں لیکن مقابلے کی دوڑ اس سے بڑھ چڑھ کر ہوتی ہے ۔ لیکن اگر دوڑ لگ رہی ہو تو کوئی آدمی بائیسکل پر سوار ہو کر دوڑ لگانے والے کے ذرا آگے آگے چلے تو دوڑ اور بھی بہتر اور تیز ہو جائے گی ۔ بائیسکل والا مقابلہ تو نہیں کر رہا ہوتا لیکن اپنی رفتار سے دوڑ لگانے والے کے لیے کچھ ذرا آگے رہ کر نزدیک گول (Goal) مہیا کرتا ہے ۔ اس گول تک پہنچنے کے لیے انتہائی کوشش کی جاتی ہے اور نتیجہ بہتر رہتا ہے ۔

۳۔ اپنے آپ سے مقابلہ (Self-Competition) : دوسروں سے مقابلے کے بغیر بھی بہتر نتائج حاصل ہو سکتے ہیں ۔ کسی شخص کو متعدد بار آزمائیے اور آزمانے سے پیشتر پہلے نتائج سے آگاہ کیجیے ۔ وہ ضرور ترقی کرے گا ۔ اپنے آپ آگے بڑھے گا اور بہتر نتائج دکھلائے گا ۔

پہلا نتیجہ ایک قسم کا گول ہوتا ہے جسے حاصل کرکے آگے بڑھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

نتائج کی آگاہی سے جسمانی کارکردگی بڑھ جاتی ہے۔ ایک تجربے میں زیر تجربہ فرد کو بار بار ایک ہاتھ سے ایک وزنی شے اٹھانی پڑی۔ ہر کوشش پر نشان لگ جاتا تھا۔ دیکھنا یہ تھا کہ کتنی بار وہ وزن اٹھایا جائے گا۔ ہر کوشش کے لیے دو سیکنڈ تھے۔ ایک دفعہ تو زیر تجربہ فرد ریکارڈ کو دیکھتا رہا ایک دفعہ اس نے نہ دیکھا۔ جس بار وہ ریکارڈ دیکھتا رہا وہ ۲۰ سے ۳۰ فی صد زیادہ جسمانی کام کر سکا۔ اس کے نتائج بہتر رہے کیونکہ گذشتہ ریکارڈ گول کا کام دیتا رہا جسے حاصل کرکے اس شخص نے بڑھنا چاہا۔ ووڈورتھ کا کہنا ہے کہ صلے کی موجودگی نہ صرف جسمانی کارکردگی کو بڑھاتی ہے بلکہ مشاہدے کو بھی تیز کرتی ہے۔ ایک شخص نے لکیر کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرنا تھا لیکن پیمانے کی مدد نہیں لینی تھی۔ جب بھی اس کی کوشش کامیاب ہوتی گھنٹی بجی۔ اس وجہ سے دیکھا گیا کہ اس کا مشاہدہ تیز اور صحیح ہو گیا۔ لیکن جب گھنٹی نہ بجائی گئی تو مشاہدے میں کوئی خاص ترقی نظر نہ آئی۔

ان تجربات سے ثابت ہوا کہ جب مقاصد صحیح طور پر متعین ہو جائیں، قریب اور قابل حصول ہوں اور اس کے ساتھ فرد کو نتائج کے جائزہ اور پڑتال کا موقعہ بھی مل سکے تو اس کی کارکردگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر اچھے کام کی مناسب قدر ہو جائے تو حوصلہ بڑھے گا اور کام زیادہ شوق سے ہوگا۔ خراب کام پر مذمت بھی چاہیے لیکن مذمت کی تہہ میں تعمیری اور ہمدردانہ پہلو غالب رہنا چاہیے۔

ایک اور عملی مسئلہ اپنے آپ سے یا دوسروں سے کام لینا ہے۔

اپنے آپ سے کام لینے کے لیے ایسا مقصد بنائیے جو واضح ہونے کے علاوہ مستقل قریب میں ممکن الحصول بھی ہو۔ یہ مقصد ایسا ہو جو آپ

کی ذات سے گہرا تعلق رکھے اور دلچسپی کا سبب بن سکے ۔ بعض مقاصد مستقل بعید میں پورے ہو سکتے ہیں ۔ ان کے لیے درمیانی عرصے میں چھوٹے چھوٹے مقاصد بنائیں ۔ یہ مقاصد فوری اور قریبی ہوں گے ۔ جوں جوں یہ حاصل ہوتے جائیں گے حوصلہ بڑھتا جائے گا اور کوشش جاری رہے گی ۔

دوسروں سے کام لینا والدین ، اساتذہ ، افسروں اور لیڈروں کے لیے اہم مسئلہ ہے ۔ جنگ کے دنوں میں فوجیوں کے حوصلے (Morale) بلند رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اس مطلب کے لیے مندرجہ ذیل سفارشات ہیں:

۱- فوجیوں کی صحت ٹھیک رہنی چاہیے ۔ خراب غذا ، بیماری، زیادہ تھکاوٹ اور بے خوابی صحت پر برا اثر ڈالتی ہیں اور ان سے نہ صرف کار کردگی میں کمی آتی ہے بلکہ حوصلے بھی پست ہو جاتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ فوجیوں کو نہایت عمدہ خوراک دی جاتی ہے ۔ لیکن ایسی خوراک بھی نہیں دینی چاہیے جس سے تن آسانی اور سہل انگاری کی عادت پڑ جائے ۔ ناموافق حالات کے لیے بھی فوجیوں کو تیار کرنا چاہیے ۔

۲- ہر فوجی کو احساس ہونا چاہیے کہ ملک کو اس کی ضرورت ہے ۔ خواہ اس کا کام بڑا ہو یا چھوٹا ، اس کا اپنا مقام ہے اور کامیابی کے لیے ضروری ہے ۔ ہر فوجی کو کسی خاص قسم کی تربیت دی جاتی ہے ۔ وہ تربیت بھی ویسی ہی اہم ہے جیسی کوئی اور ۔

۳- فوج میں داخل ہوتے ہی کسی فوجی کا حوصلہ بلند نہیں ہو جاتا ۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ ہر فوجی اپنی یونٹ پر فخر کرے ۔ اس کے کام کاج میں ہاتھ بٹائے اور ایک دوسرے سے مل جل کر رہے ۔

۴- شروع شروع میں بھرتی ہونے والے فوجیوں کو فوج کا تحکمانہ انداز پسند نہیں ہوتا ۔ فوجی نظم و نسق کو نفرت سے دیکھا جاتا ہے ۔ آہستہ آہستہ اس رویے میں تبدیلی آ جاتی ہے ۔ لیکن جب تک یہ نفرت محبت میں نہ بدلے اور فوجی افسروں کے مقام کو نہ سمجھ لیا جائے۔

فوج کے ساتھ صحیح لگاؤ پیدا نہیں ہو سکتا - یہ ٹھیک ہے کہ افسر لوگ رعب سے کام لیتے ہیں، ان کا برتاؤ تحکمانہ ہوتا ہے لیکن افسری آسان کام نہیں - اس کی اپنی مشکلات ہیں - جب افسروں کی مشکلات کا صحیح اندازہ ہو جائے اور ان سے وفاداری اور فرماں برداری کا جذبہ پیدا ہو جائے تب حوصلہ بلند رہے گا -

۵- فوجی زندگی بڑی سخت ہوتی ہے - لہٰذا تفریح کے مواقع بھی ضرور آنے چاہئیں - فوجیوں کو گاہے گاہے چھٹی بھی ملنی چاہیے تاکہ وہ اپنے عزیز و اقارب سے مل سکیں اور جنگ کی سختیاں وقتی طور پر بھول جائیں -

جنگ کے دنوں میں شہریوں کے حوصلے بھی پست نہیں ہونے چاہییں - یہ تبھی ممکن ہے جب قوم کے سامنے کوئی واضح لائحہ عمل ہو اور ہر شہری کو احساس ہو کہ اس کی ضرورت ہے اور وہ قوم کی خدمت کر سکتا ہے - امن کے زمانے میں قوم کے سامنے کوئی مقصد نہیں رہتا اور نہ ہی عوام کو پتہ ہوتا ہے کہ وہ کس طرح ملک کی خدمت کر سکتے ہیں اس لیے ساری قوم پر جمود اور بے حسی طاری ہو جاتی ہے - پس امن کے زمانے میں لوگوں کا شوق برقرار رکھنا نہایت ہی مشکل کام ہے -

آٹھواں باب

تاثر اور ہیجان

(Feeling and Emotion)

گذشتہ باب میں محرکات کا ذکر آیا ۔ اس سلسلہ میں دیکھا گیا کہ ہر محرک کا مقصود ہوتا ہے ۔ اُسے حاصل کرنے کے لیے مستقل مزاجی (Persistence) سے کام لینا پڑتا ہے ۔ جب ایک راستہ مسدود ہو جاتا ہے تو دوسرا اختیار کیا جاتا ہے ۔ اگر دوسرا بھی منزل مقصود تک نہ لے جائے تو پھر اسے بھی چھوڑ دیا جاتا ہے حصول مطلب کے لیے کئی تجاویز کی جاتی ہیں اور کئی راہیں نکالی جاتی ہیں ۔ حیوانی اور انسانی کردار میں تغیر پزیری (Variability) ہے ۔ جب ایک قسم کا کردار ناکام ہو جاتا ہے تو اسے ترک کر دیا جاتا ہے اور کوئی اور کردار اس کی جگہ لے لیتا ہے ۔ علاوہ ازیں چونکہ محرکات کی تہہ میں فطری اور اکتسابی تقاضے کار فرما ہوتے ہیں ۔ جو حرکات و سکنات یا اعمال و افعال اس سلسلہ میں لازمی اور لابدی ہیں انہیں شوق اور انہماک سے یعنی شدید ذہنی محویت (Intensity) سے ادا کیا جاتا ہے۔

ہیجان میں یہ سارے خصائص موجود ہیں ۔ غصہ اور محبت میں مقصود ہوتا ہے ۔ دشمن اور محبوب کو پانے کے لیے مستقل مزاجی بھی دکھائی جاتی ہے ۔ اگر اس سلسلے میں ایک ترکیب کامیاب نہ ہو تو کوئی اور صورت کرنی پڑتی ہے ۔ ہیجان میں انتہا درجہ کی شدت بھی موجود ہے ۔ ہیجان تو ایسی کیفیت ہے جیسے ہنڈیا کو اُبال آ گیا ہو ۔ سارے تن من پر ایک کیفیت چھا جاتی ہے اور وقتی طور پر انسان کو اندھا کر دیتی ہے ۔

پیشتر اس کے کہ ہیجان کی نفسیات بیان کی جائے۔ تأثر (Feeling) پر بحث ضروری ہے۔ کیونکہ تأثر ہلکی اور سادہ سی ابتدائی کیفیت ہے اور ہیجان اسی صنف کی شدید کیفیت کا نام ہے۔

ہماری اپنی زبان میں تأثر کے لیے بیسیوں الفاظ موجود ہیں۔ شعر و شاعری تو انھی الفاظ سے بھری پڑی ہے۔ لیکن اگر ان الفاظ کی صف بندی کی جائے تو صرف دو نوع کے تأثرات ملتے ہیں یا تو ان کا علاقہ خوشگواری (Pleasantness) سے ہے، یا نا خوشگواری (Unpleasantness) سے۔ ٹیچنر (Titchner) کا یہی نظریہ ہے۔ اس کا خیال ہے کہ بنیادی طور پر تأثرات صرف دو انواع کے ہیں۔ تجربے سے تأثرات مرکب اور کثیر الاشکال ہو جاتے ہیں۔ اس نظرے کی مخالفت ونٹ (Wundt) نے کی۔ اس کا کہنا ہے کہ ہر تحسس (Sensation) کا اپنا تأثر ہے اور اگر تحسسات کی تعداد ہزاروں تک ہے تو تأثرات کی تعداد بھی ہزاروں تک ہوگی۔ لیکن ان تأثرات کی جماعت بندی ہو سکتی ہے۔ تحسسات کی جماعت بندی حواس کے ذریعہ کی گئی ہے۔ اسی طرح تأثرات کی جماعت بندی موٹے موٹے خصائص کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔ یہ خصائص تین اقسام کے ہیں۔ اسی لیے ونٹ کے نظریہ کو نظریۂ ابعاد ثلاثہ (Tridimensional Theory) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس نظرئیے کو سمجھنے کے لیے طبیعات کو لیجیے۔ ہر طبعی شے کی لمبائی، چوڑائی اور اونچائی ہے۔ اگر لمبائی کی لکیر کھینچیں، اوپر سب سے لمبی اور نیچے سب سے چھوٹی شے رکھیں تو ہر شے اپنے قد کے مطابق اس لکیر میں اپنی جگہ لے لے گی۔ یہی حال چوڑائی اور اونچائی کا ہے۔ جیسے لمبائی کی لکیر بُعد کو ظاہر کرے گی ایسے ہی چوڑائی اور اونچائی کی لکیریں بھی اپنے اپنے بُعد کو ظاہر کریں گی۔

ونٹ کے تین بڑے بڑے ابعاد مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) خوش گواری اور ناخوش گواری (Pleasantness and Unpleasantness)۔

(۲) تناؤ اور تسکین (Tension and Relaxation) -

(۳) جوش اور پژمردگی (Excitement and Depression) -

فرض کیا کہ لمبائی کے بعد کو ظاہر کرنے کے لیے ایک لکیر کھینچی جاتی ہے - اوپر سب سے لمبی شے رکھتے ہیں اور نیچے سب سے چھوٹی تو باقی تمام اشیا اپنے اپنے قد کے لحاظ سے اس لکیر میں سما جائیں گی - اسی طرح اگر تناؤ اور تسکین یا جوش اور پژمردگی یا خوشگواری یا نا خوشگواری کے بعد کو ظاہر کرنے کے لیے کوئی لکیر کھینچیں تو ایک سرے پر تناؤ یا جوش یا خوشگواری آئے گی اور دوسرے سرے پر تسکین یا پژمردگی یا ناخوشگواری - ان کے درمیان ہر تأثر اپنا مقام ڈھونڈے گا -

اس نظریے پر کئی اعتراضات ہوئے - ووڈورتھ کے خیال میں یہ نظریہ ناقص ضرور ہے لیکن لغو نہیں - ونٹ نے صرف تین ابعاد کا ذکر کیا ہے لیکن تین تک محدود کرنے کا کوئی جواز نہیں ملتا - یہ ابعاد چار بھی ہو سکتی ہیں اور پانچ یا چھ بھی - ووڈورتھ چاہتا ہے کہ شناسائی (Familiarity) اور اجنبیت (Strangeness) کے بعد کو بھی تسلیم کر لیا جائے - اس بعد میں بھی بے شمار تاثرات سما جائیں گے - اس کے علاوہ ووڈورتھ کہتا ہے کہ ونٹ کی دو ابعاد یعنی خوشگواری یا ناخوشگواری اور جوش یا پژمردگی کے لیے تو تجربی شواہد ملتے ہیں ، لیکن تناؤ اور تسکین کا بعد محض تکلف نظر آتا ہے -

تأثر اور حرکی فعلیت (Feeling and Motor Activity) :

یوں تو تأثر اور حرکی فعلیت کا علاقہ خارجی دنیا سے ہے، لیکن تأثر صرف خوش گواری یا ناخوش گواری کا احساس ہوتا ہے - اور حرکی فعلیت کا مدعا ماحول سے نپٹنا ہے - اگر غور سے دیکھیں تو تأثر اور حرکی فعلیت کا گہرا لگاؤ ہے - ناخوشگوار ماحول سے جب چھٹکارا پانے کی کوشش کی جاتی ہے تو ناخوشگواری کا احساس ہوتا ہے - یہ احساس

شدید بھی ہو سکتا ہے اور خفیف بھی ۔ بعض دفعہ اتنا شدید کہ ہیجان کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور بعض دفعہ اتنا خفیف کہ پتہ بھی نہیں چلتا ۔ کسی کام میں آپ اتنے منہمک ہو سکتے ہیں کہ خوشگواری یا ناخوشگواری کا احساس تک نہیں ہوتا ۔ اچھے ٹینس کھیلنے والے سے پوچھیں کہ کیا ٹینس کھیلتے ہوئے اسے کسی تأثر کا احساس ہوتا ہے ۔ وہ یقیناً نفی میں جواب دے گا کیونکہ جب وہ کھیل میں ہمہ تن مشغول ہوتا ہے تو دنیا و مافیہا کو بھولا ہوا ہوتا ہے وہ گیند پھینکتا ہے ، گیند واپس کرتا ہے ، کبھی اِدھر دوڑتا ہے کبھی اُدھر ۔ اگر شعور میں خوشگواری یا ناخوشگواری کا احساس آ جائے تو کھیل خراب ہو جائے ۔

جیسے تأثر کے بغیر حرکی فعلیت اپنا کام کر سکتی ہے ویسے ہی تأثر بھی حرکی فعلیت کے باوجود زندہ رہ سکتا ہے ۔ کئی لوگ شام کو باہر نکلتے ہیں ۔ ان سے اگر پوچھا جائے کہ وہ کس مطلب سے باہر نکلے تو جواب ملے گا کہ صرف عیش کی خاطر ۔ یعنی وہ خوشگواری چاہتے ہیں ، کوئی حرکی فعلیت مطلوب نہیں ہوتی ۔ وہ نہ تو ماحول کو بدلنا چاہتے ہیں اور نہ اسے برقرار رکھنا چاہتے ہیں ۔ ان کا مقصود صرف عیش اور خوشی ہے ۔ سردیوں میں بعض لوگ گرم پانی سے نہاتے رہتے ہیں اور گرمیوں میں اکثر وقت نہانے کے تالابوں میں گزارتے ہیں ۔ ان کا مدعا صرف حظ اٹھانا اور جسم کو سستانا ہے ۔

بعض لوگ اوپر والے بیان سے اتفاق نہیں کریں گے ۔ وہ کہیں گے کہ ہر حرکی فعلیت میں تأثر ہوگا ، خواہ شدید ہو خواہ خفیف ، اور ہر تأثر کے ساتھ حرکی فعلیت ہوگی ، خواہ تیز ہو خواہ سست ۔

تأثر اور محسسات (Feelings and Sensory Activity) :

وقوف اور تأثر میں بھی فرق لازمی ہے ۔ وقوف کا مدعا ماحول کے متعلق علم بہم پہنچانا ہے ۔ تأثر صرف خوشگواری یا ناخوشگواری کا

احساس پیدا کرتا ہے۔ حواس کو علم کا دروازہ کہتے ہیں، انھی سے بیرونی دنیا کا پتہ چلتا ہے ۔ بعض حواس عضویہ کے اندرون کا پتہ دیتے ہیں ۔ لیکن یاد رہے کہ کبھی خارجی اور باطنی دنیا سے بیک وقت بے شمار مہیجات آ جاتے ہیں، ان سب کو سمجھنا آسان کام نہیں ہوتا ۔ ان میں سے بعض محسسات تو تاثرات کی صورت اختیار کر لیتے ہیں ۔ مثلاً اگر معدے میں تکلیف ہو تو ڈاکٹر سے تشخیص کرا سکتے ہیں کہ آیا یہ درد بدھضمی کی وجہ سے ہے، یا قولنج یا ورم زائدہ (Appendicites) کی بدولت ۔ لیکن اگر غریبی کی وجہ سے ڈاکٹر کے پاس نہ جا سکیں تو پھر درد محسوس تو ہوتا رہے گا لیکن درد کی وجہ نہ معلوم ہو سکے گی ۔ اسی طرح جب تناؤ اور پژمردگی کا احساس ہو تو جسم بھی تھکا ہوا لگتا ہے ۔ اگر غور کریں تو آنکھیں، کندھے، گردن اور کہنیاں بھی ہلکا ہلکا درد کرتی ہیں لیکن اگر مختلف اعضاء کے تفاعل پر غور نہ کریں تو پژمردگی کی تہہ میں ایک دھندلا سا محسسات کا مجموعہ ملے گا اور بس ۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ہلکی سی ورزش کر لیں تو تھکاوٹ دور ہو جاتی ہے کیوں کہ ورزش سے اعضا کام کرنا شروع کر دیتے ہیں اور ان کا تناؤ جاتا رہتا ہے ۔

جس طرح شدید حرکی فعلیت میں تأثر کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے اسی طرح شدید دماغی کام میں بھی تأثر کا احساس مٹ جاتا ہے ۔ زندگی میں کئی دفعہ غور و خوض ، گہرے معائنے اور لمبے چوڑے لائحہ عمل کی ضرورت پڑتی ہے ۔ اس وقت انسان مسائل کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے اور تأثرات محسوس نہیں کرتا ۔ نیوٹن کے متعلق مشہور ہے کہ وہ تحقیقات میں ایسا غرق ہو جاتا تھا کہ اسے کھانا بھی بھول جاتا تھا ۔ جب تحقیق کا بھوت سر پر سوار ہو تو تأثرات تو تأثرات کائنات اور اس کی دلفریبیاں بھول جاتی ہیں ۔

تأثرات پر تجربی تحقیقات :

روزمرہ کی زندگی میں جن رنگوں ، بوؤں اور ذائقوں کو ترجیح

دی جاتی ہے وہ عام طور پر خوشگوار ہوتے ہیں اور جن اشیا اور مواقع سے پرہیز کی جاتی ہے یا جنھیں نفرت سے دیکھا جاتا ہے وہ ناخوشگوار ہوتے ہیں پس انسانوں کی ترجیحات (Preferences) اور کراہتوں (Aversion) کا بذریعہ تجربہ مطالعہ کرتے وقت ہمیں در اصل خوشگوار اور ناخوشگوار تأثرات کا پتہ چلتا ہے ۔

سوال یہ ہے کہ یہ کیوں کر پتہ چلے کہ فلاں رنگ یا بو یا ذائقہ سب سے زیادہ یا سب سے کم پسندیدہ یا ناپسندیدہ ہے ؟ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ سب سے زیادہ اور سب سے کم پسندیدہ یا ناپسندیدہ رنگوں، بوؤں اور ذائقوں کے علاوہ باقی رنگوں بوؤں یا ذائقوں کا کیا مقام ہے ۔ اس مطلب کے لیے تین قسم کے تجربے کیے جاتے ہیں ۔

پہلا طریقہ یہ ہے کہ افراد کا ایک نمائندہ گروہ لیا جائے اور ان کے سامنے مختلف رنگ رکھ دیے جائیں ۔ پھر انھیں کہا جائے کہ ان رنگوں میں سے سب سے زیادہ اور سب سے کم پسندیدہ رنگ چنیں اور باقی رنگوں کو پسندیدگی کے لحاظ سے ترتیب دیں ۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک لکیر کو لے کر دس حصوں میں تقسیم کیا جائے ۔ اوپر انتہا درجہ کا خوشگوار اور نیچے انتہا درجہ کا ناخوشگوار رکھیں ۔ پھر زیر تجربہ فرد کو کہیں کہ اپنی پسند کے مطابق دیے ہوئے رنگوں کو اس لکیر کے مختلف درجوں پر رکھے ۔ پہلے تو زیر تجربہ فرد رنگ کو دیکھے گا پھر درجات کو اور بعد میں رنگ کو پسندیدگی کی رو سے مختلف درجوں میں مقام دے گا ۔

تیسرا طریقہ ہر رنگ کو جوڑوں میں پیش کرنے کا ہے ۔ ہر رنگ کسی دوسرے رنگ کے ساتھ مساوی تعداد میں آتا ہے ۔ اور زیر تجربہ فرد کو ہدایت دی جاتی ہے کہ ان جوڑوں میں سے ایک رنگ کو پسند کرے ۔ ہر جوڑا دو دفعہ آتا ہے، ایک دفعہ جوڑے میں ایک رنگ بائیں آئے گا دوسری دفعہ دائیں ۔ اس طریقے کا فائدہ یہ ہے کہ

ہر رنگ کا دوسرے سے مقابلہ ہو سکتا ہے۔ اس طریقے کو فیچنر (Fechner) نے رائج کیا اور اسے جوڑوں کے مقابلے (Paired Comparison) کا نام دیا گیا ۔

جب اس طریقے سے رنگوں کا مقابلہ اور انتخاب ہوتا ہے تو بعض رنگ کثرت سے چنے جاتے ہیں ۔ اس لحاظ سے ترجیحات کی بعد میں ایسے رنگوں کو اول جگہ ملتی ہے ۔ فرض کیا کہ ہمارے پاس چھ رنگ ہیں اور انھیں ممکن طریقے سے جمع کرنا ہے ۔ ان کے اجتماعات مندرجہ ذیل فارمولا سے نکلیں گے :

N (N-1)/2 (N سے مراد نمبر ہوگا)

پس چھ رنگوں کے لیے ان کے جو ممکن اجتماعات ہوں گے وہ 6(6-1)/2 یعنی پندرہ -

چونکہ ہر رنگ کو دو دفعہ آنا پڑتا ہے ، ایک دفعہ دائیں اور ایک دفعہ بائیں ، اس لیے تمام ممکن اجتماعات تیس بنیں گے ۔ ان ۳۰ اجتماعات میں سے جو رنگ سب سے زیادہ دفعہ چنا جائے گا وہ سب سے اوپر آئے گا جو سب سے کم دفعہ چنا جائے گا وہ سب سے نیچے آئے گا اور درمیان میں باقی رنگ چناؤ کے لحاظ سے مقام پائیں گے ۔

یاد رہے کہ ہر فرد کی پسند اور ناپسند اپنی ہوتی ہے ۔ ضروری نہیں کہ جو بو ، رنگ اور ذائقہ ایک فرد کو سب سے زیادہ مقبول ہو وہ دوسرے کے لیے بھی محبوب ترین ہو ۔ لیکن جب مختلف افراد کی ترجیحات کے نتائج کو جمع کرکے اوسط لگائی جاتی ہے تو کوئی ترجیح یا کراہت ایسی نکل آتی ہے جو خاص گروہ ، قوم یا ملک کے لیے صحیح ہو ، مثلاً امریکہ میں پیدا ہونے والا شخص خواہ سفید ہو یا کالا نیلے رنگ کو پسند کرتا ہے ، پیلا رنگ سب سے کم پسند کرتا ہے ۔ یہ ترجیحات پیدائش پر تو موجود نہیں ہوتیں لیکن تجربے اور عمر سے حاصل کر لی جاتی ہیں ۔ ان ترجیحات کی بنا کلچر بھی ہے ، میکسیکو کا

باشندہ لال رنگ کو پسند کرتا ہے کیوں کہ ان کے کلچر میں لال رنگ خاص اہمیت رکھتا ہے۔

جو تجربے رنگوں کے سلسلے میں کیے گئے ہیں وہ بو اور ذائقہ پر بھی ہو سکتے ہیں۔ گیول فورڈ (Guilford) بیان کرتا ہے[1] کہ بو میں اول نمبر پر بائی سلفائڈ (Bisulphide) آیا۔ ذائقہ میں میٹھا خواہ کم ہو یا زیادہ اول نمبر پر آتا ہے۔ نمک اگر ہلکا سا ہو تو تھوڑا سا ناخوشگوار ہوتا ہے۔ جب اس کی مقدار بڑھ جائے تو ناخوشگواری بھی بڑھ جاتی ہے۔ آوازوں میں سے نیچی سریں پسند کی جاتی ہیں۔ جوں جوں سر اونچی ہوتی ہے اس کی خوشگواری ناخوشگواری میں بدل جاتی ہے۔ جیسے ترجیحات پر رنگوں کے متعلق ذاتی اور ثقافتی اختلافات اثر انداز ہوتے ہیں ویسے ہی بو، ذائقہ اور آواز کے سلسلے میں بڑے ثقافتی اختلافات ہیں۔

بیوپاری لوگ ان ترجیحات کی کھوج میں لگے رہتے ہیں۔ جو رنگ کسی قوم اور فرقے میں مقبول ہوں اسی رنگ کا کپڑا ہونا چاہیے۔ کھیل کھلونے اور موٹرکاروں کے رنگ بھی یہی ہونے چاہییں۔ مٹھائیوں اور کھلونوں کے لیے ذائقہ اہم شے ہے۔ جب تک ہوٹل والوں پبلک کے ذائقے کا علم نہ ہو ان کی بکری ناقص رہے گی۔ یہی حال گانے کا ہے۔ سنیما کے گانے مقبول سروں میں ہونے چاہییں تبھی لوگ جوق در جوق دیکھنے آئیں گے۔

جمالیاتی ترجیحات (Aesthetic Preferences):

کس قسم کی موسیقی، مصوری، نثر یا نظم کسی کو پسند ہے اور کیوں؟ ظاہر ہے کہ ہر آدمی کا مذاق مختلف ہوتا ہے کسی کو جدید شاعری پسند ہے کسی کو ناپسند۔ کسی کو کلاسیکل موسیقی سے

---

(۱) ملاحظہ ہو اس کی General Psychology، صفحہ ۳۲۷، مطبوعہ ۱۹۳۹ء۔

دلچسپی ہے کسی کو نفرت ۔ کوئی تجریدی آرٹ (Abstract Art) کو تحسین کی نظر سے دیکھتا ہے کوئی اس آرٹ کا مذاق اڑاتا ہے ۔ ان اختلافات کی وجوہ کیا ہیں ؟

۱۔ جمال کی پڑتال اور قدر شناسی کے لیے مناسب صلاحیتوں (Aptitude) کی ضرورت ہے ۔ جو آدمی ان صلاحیتوں سے بے بہرا ہو وہ حسن کی قدر نہیں کر سکے گا ۔ مثلاً رنگ کورا سبز اور سرخ میں تمیز نہیں کر سکے گا ۔ اور جو شخص ٹاپ (Pitch) اور شدت (Intensity) میں فرق نہیں کر سکتا وہ موسیقی کو نہیں سمجھ سکتا ۔

۲۔ صلاحیتوں کے علاوہ تربیت بھی ہونی چاہیے ۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جمالیاتی صلاحیتوں کی نشوونما بھی ہوتی ہے اور اس وجہ سے جمالیاتی ترجیحات قائم ہو جاتی ہیں ۔ پاکستان کے اکثر طلبہ مغربی شاعری اور موسیقی کے دل دادہ ہیں ، اس کی وجہ ان کی تربیت ہے ۔ مشرقی شاعری اور راگ و رنگ کی طرف ان کی توجہ نہیں دلائی جاتی لہٰذا ان کے سر پر مغربیت سوار رہتی ہے ۔ اکثر چیزیں جن سے پیار یا نفرت کی جاتی ہے وہ ہماری تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہوتی ہیں ۔

۳۔ ہمارے جمالیاتی نظریے اور قدر شناسی اس بات پر بھی منحصر ہے کہ ہمیں ان فنکاروں کا کتنا علم ہے جن کی مصوری ، شاعری یا بت تراشی کا جائزہ لیا جا رہا ہے ۔ موسیقی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جتنا بلند گویا ہوگا اتنا ہی تحسین سے لبریز ہمارا جائزہ ہوگا ۔ یعنی فنکار کا اپنا رتبہ اور مقام اس کے جائزے پر اثر انداز ہوتا ہے ۔ شیرف (Sherif) نے ایک تجربہ بیان کیا ہے ۔ دس تصویریں نا معلوم مصوروں کی بنی ہوئی لی گئیں ، ہر ایک کے لیے نام تجویز کیا گیا اور فرضی مصور چنا گیا ۔ ہر تصویر کے لیے دو پیرا گراف لکھے گئے ۔ ایک پیراگراف تعریف میں مبالغہ سے کام لیتا تھا دوسرا اصلیت کو گھٹاتا تھا ۔ پہلے کو + کہا گیا دوسرے کو – دونوں پیرا گراف یعنی + اور – والے

یونہی لے لیے گئے - ہر زیر تجربہ فرد کو موقعہ دیا گیا کہ وہ دس کی دس تصویریں دیکھ لے لیکن پیرا گراف وہ صرف ایک قسم کے پڑھ سکتا تھا - زیر تجربہ افراد، کالج کے ۶۹ طلبہ تھے، انھیں کہا گیا کہ وہ کاغذ پر ایک سے لے کر دس ہندسے لکھیں اور پھر تصویر کا نمبر دیکھ کر کاغذ پر وہی نمبر لے کر مندرجہ ذیل پانچ آراء میں سے ایک لکھ دیں -

(۱) بہت خوبصورت -

(۲) خوشگوار -

(۳) نہ اچھی نہ بری -

(۴) نا خوشگوار -

(۵) بہت بد صورت -

ایک تصویر کے نیچے پیرا گراف تھا کہ یہ تصویر مس ہنٹ نے بنائی ہے جو "گوشہ" گمنامی سے بام عروج پر پہنچی - یہ تصویر رنگ اور حسن کا بے نظیر عجوبہ ہے - ایک اور تصویر کے نیچے پیرا گراف تھا کہ یہ تصویر ایک امریکی لڑکی نے بنائی ہے - اس تصویر پر لڑکی کو سکول کی نمائش میں دوسرا انعام ملا -

ان دونوں تصویروں کو ان دو پیرا گراف کی وجہ سے ۱٫۵ درجہ ملا یعنی ان کا مقام بہت خوب صورت اور خوشگوار کے درمیان سمجھا گیا - لیکن جب پیرا گراف بدل دیے گئے تو ان کا درجہ ۲٫۵ تھا یعنی صرف خوشگوار رہ گیا - یعنی جب تصویر + والے پیرا گراف کے ساتھ تھی اسے سراہا گیا اور جب - والے پیرا گراف کے ساتھ تھی اس کا مقام گر گیا - یہی حال باقی تصاویر کا تھا -

من (Munn) بیان کرتا ہے[1] کہ رابرٹ لوئس سٹیونسن (Robert-Louis Stevenson) کی تحریروں میں سے کچھ ٹکڑے لیے گئے لیکن انھیں فرضی مصنفوں کو منسوب کر دیا گیا - جس ٹکڑے

۱- ملاحظہ ہو اس کی Psychology ، صفحہ ۲۸۷ -

ۃ مصنف کوئی مشہور آدمی بتایا گیا وہ درجۂ تحسین میں بڑھ گئی اور
ں کا مصنف کوئی نا معلوم شخص کہہ دیا گیا وہ درجۂ تحسین میں
ر گئی حالانکہ اصل میں یہ سارے ٹکڑے ایک ہی مصنف کی تحریر
کے تھے -

خوشگواری اور نا خوشگواری کے سر چشمے
(Sources of Pleasures and Dipleasures)

چھٹے باب میں ذکر آ چکا ہے کہ بعض پسندیں اور ناپسندیں
طری ہوتی ہیں - فطری پسندیں خوشگواری کا موجب ہوں گی -
ر فطری ناپسندیں ناخوشگواری کا - مٹھاس اور خوش بو ہمیشہ
رب انگیز ہوتی ہے - کڑوی چیزیں اور بدبوئیں ہر حالت میں نفرت
یدا کرتی ہیں - سریلا گانا ہر ایک کو مقبول ہے - شور سے ہر شخص
و وحشت ہوتی ہے -

کچھ چیزیں اس لیے پسند کی جاتی ہیں کہ وہ اساسی تقاضوں
کو تشفی بخشتی ہیں - ٹھنڈا پانی اس لیے مرغوب ہے کہ وہ پیاس
بجھاتا ہے - ہر چیز جو محرکات کو تسکین دے بھلی لگتی ہے -
ٹ بال کا میچ دیکھیں ، گول ہوتا ہے ایک ٹیم مارے خوشی
کے اچھل پڑتی ہے ، دوسرے کے چہرے اتر جاتے ہیں - یہ کیوں ؟
س لیے کہ گول ایک ٹیم کے مقصد کو پورا کرتا ہے اور دوسرے کے
قصد کو ٹھکرا دیتا ہے - پس ٹیموں کی خوشی ان کے محرکوں سے
ابستہ ہے - کامیابی کا محرک بڑا زبردست محرک ہے - کامیابی سے خوشی
یدا ہوتی ہے اور نا کامی سے حسرت و یاس -

طرب انگریز چیزیں بیشمار ہیں ، لیکن تجربی طور پر ان کی فہرست
یار نہیں کی گئی البتہ جو چیزیں نفرت اور کراہت پیدا کرتی ہیں
ن کی فہرست مرتب ہو چکی ہے - ایک ماہر نفسیات نے نفرت انگیز

چیزوں پر تجربہ کیا ۔ اس نے ۶۵۹ مرد اور عورتیں لیں جن کی عمریں دس سال سے لے کر نوے سال تک تھیں ۔ انہیں کہا گیا کہ وہ نفرت آفریں اشیا کی فہرست بنائیں ۔ انہوں نے ۱۷۸۰۰ چیزیں بنائیں کئی چیزیں دو دفعہ آ گئیں ، جب انہیں نکال دیا گیا تو ۲۵۸۱ نفرت آفریں چیزیں رہ گئیں ۔ پھر ان کی جماعت بندی کی گئی تو مندرجہ ذیل فی صد نتائج حاصل ہوئے :

جماعت	نفرت انگیز چیزوں کی تعداد	اور شمار فی صد
۱۔ انسانی کردار	۱۵۲۳	۵۹٫۰
۲۔ غیر انسانی اشیا اور مشاغل	۴۸۶	۱۸٫۸
۳۔ کپڑے اور پہننے کا طریقہ	۳۲۰	۱۲٫۳
۴۔ لوگوں کے متغیر طبعی خصائص	۱۳۸	۵٫۳
۵۔ لوگوں کے مستقل طبعی خصائص	۱۱۳	۴٫۳
مجموعہ	۲۵۸۱	۱۰۰

اس جدول سے پتہ چلتا ہے کہ نفرت انگیز اشیا کا زیادہ تر تعلق انسانی کردار سے ہے ۔ تقریباً ہر کراہت کا واسطہ انسانوں اور ان کے مشاغل سے ہے ۔

ایک تجربے میں ۵۰ نفرت انگیز اشیا کو لیا گیا اور کچھ افراد کو کہا گیا کہ سب سے زیادہ نفرت انگیز چیزوں کو منتخب کریں ۔ انہوں نے حسب ذیل اشیا کو چنا :

(۱) کسی شخص کو بغیر رومال کے ناک صاف کرتے دیکھنا ۔
(۲) دوسرے کے منہ پر کھانسنا ۔
(۳) کھیل میں دھوکا دینا (Cheating) ۔
(۴) گندے پاؤں کی بدبو ۔
(۵) بڑوں کا بچوں کو بری طرح سے پیٹنا ۔

ووڈورتھ نے بھی نفرت انگیز اعمال و افعال کی فہرست تیار کی ہے جو حسب ذیل ہے :

(۱) جو شخص ہمیشہ جھگڑتا رہے ۔
(۲) جو شخص ہمیشہ نکتہ چینی کرتا رہے ۔
(۳) جو شخص دوسرے کو بات کرنے کا موقع نہ دے ۔
(۴) جو شخص شیخی بگارتا رہے ۔
(۵) جو شخص بچے پر زبردستی کرے ۔
(۶) جو شخص اپنی بیماری کا ذکر کرتا رہے ۔
(۷) جو شخص اپنی بڑائی کرے ۔
(۸) جو شخص بغیر مانگے نصیحت کرے ۔
(۹) جو شخص بات کو کاٹ دے ۔
(۱۰) جو شخص میری بات کی طرف توجہ نہ دے ۔
(۱۱) جو شخص میری پرایئویٹ زندگی کا کھوج لگاتا رہے ۔
(۱۲) جو شخص مجھے برا بھلا کہتا رہے ۔
(۱۳) کسی شخص کا میرے ہاتھ ایسی چیز بیچنا جس کی مجھے ضرورت نہ ہو ۔
(۱۴) کسی شخص کا مجھ سے چلنے میں آگے بڑھنے کی کوشش کرنا ۔
(۱۵) کسی شخص کا وقت مقرر پر نہ آنا ۔
(۱۶) کسی شخص کا گالی بکنا ۔
(۱۷) کسی شخص کا تھوکنا ، ڈکار لینا ، ناک سے بال نوچنا ۔
(۱۸) کسی شخص کا گندے کپڑوں یا گندے کمرے میں ہونا ، یا گندے ہاتھ ہونا ۔
(۱۹) مچھر کی بھنبھناہٹ ، جب نیند آ رہی ہو ۔
(۲۰) بلیوں کا رات کے وقت میاؤں میاؤں کرنا ۔

۱۔ ملاحظہ ہو اس کی Psychology ، صفحہ ۳۳۸ ۔

(۲۱) دروازوں کا شور۔
(۲۲) مصنوعی دانت۔

بعض کراہتیں تلازم کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ کسی بری شے سے کوئی چیز وابستہ ہوئی اور نفرت کا موجب بن گئی۔ بعض آدمی یوں ہی بڑا بنتے ہیں اور شیخی بگارتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی گفتگو اور کردار نفرت سے دیکھے جاتے ہیں۔ اکثر کراہتوں کا باعث خواہ مخواہ کی فضول تعلی ہے۔ اس سے دوسروں کی خود اعائی کے جذبے کو ٹھیس لگتی ہے۔ طلبہ کے لیے سب سے زیادہ نفرت آفریں شے دھوکا اور رعونت ہے اور سب سے زیادہ پسندیدہ شے ذہانت اور خوش باشی ہے۔

اس تحقیق کا فائدہ سب لوگوں کو ہے۔ ہر شخص کو علم ہونا چاہیے کہ کون سی چیزیں طبیعت کو منغض کرتی ہیں۔ میاں بیوی میں نفرتیں کراہتوں سے پیدا ہوتے ہیں اور بعض دفعہ یہ اختلافات اتنے شدید ہو جاتے ہیں کہ طلاق تک نوبت آ جاتی ہے۔ میاں کی کوئی چیز بیوی کو پسند نہیں یا بیوی کی کوئی عادت میاں کو نہیں بھاتی، لہٰذا لڑائی جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔ اور اکٹھا رہنا محال ہو جاتا ہے۔ دوستوں کے تعلقات بھی کراہتوں سے کشیدہ ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص وقت بے وقت ناک سے بال نوچتا رہے۔ یا اس کے ناخن میلے کچیلے اور مٹی سے بھرے ہوئے ہوں تو ایسے شخص سے زیادہ عرصہ تعلقات قائم نہیں رہ سکتے۔

ہمدردی اور دروں احساسی (Sympathy and Empathy):

جب دوسرے لوگ ہنستے ہیں تو آپ بھی ہنستے ہیں، جب اور لوگ روتے ہیں تو آپ بھی روتے ہیں۔ بیاہ شادی میں ہر آدمی خوش نظر آتا ہے آپ بھی خوش ہوتے ہیں۔ موت کے وقت ہر شخص افسردہ اور غمزدہ ہے آپ پر بھی یہی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اگر آپ کا کالج

جیت جاتا ہے تو سب کے ساتھ آپ بھی تالی بجاتے ہیں ۔ اور اگر کالج کا نتیجہ برا رہے تو جہاں مارے شرم کے دوسروں کے سر جھک جائیں گے آپ کا سر بھی جھک جائےگا۔ ایسی کیفیت کو جہاں آپ کے تأثرات دوسروں کی مانند ہوں ہمدردی کا نام دیا جاتا ہے ۔ بعض لوگ ہمدردی کو نقالی (Imitation) کی شق سمجھیں گے اور بعض اسے اکتسابی فعل کہیں گے ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمدردی محض نقالی نہیں یہ اپنی ذات میں ایک طاقتور محرک ہے ہر شخص کی خواہش ہے کہ اس کے تأثرات اور احساسات دوسروں سے مطابقت رکھیں ۔ عاشق اور معشوق میں یہ جذبہ بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے ۔ اگر کچھ فرق نظر آئے تو اسے مٹانے کی کوشش کی جاتی ہے یا اس فرق کے باوجود ایک دوسرے سے محبت برقرار رکھی جاتی ہے ۔

ہمدردی کے لیے تخیل کی ضرورت ہے ۔ دوسرے کے نقطۂ نگاہ کو سمجھنا لازمی ہے۔ بعض اوقات اپنے آپ کو دوسرے کے مقام پر رکھ کر دیکھنا پڑتا ہے ۔ اس کے علاوہ ہمدردی زبانی جمع خرچ کا نام نہیں ۔ ہمدردی تبھی مفید ہو سکتی ہے جب دکھی دوست کی مدد کی جائے اور اس کے دکھ درد کو دور کیا جائے۔ اس کے لیے سوچ بچار اور ماحول کو سمجھنے اور اس سے نپٹنے کی ضرورت ہے۔ آپ کا تجربہ بھی اتنا وسیع ہونا چاہیے کہ آپ کسی کے کام آ سکیں ۔

درون احساسی (Empathy) ہمدردی سے ذرا مختلف ہے ۔ اس کا مطلب دوسروں کے تأثرات کو اپنانا نہیں بلکہ دوسروں کی ذات میں حلول کرنا اور ان سے یگانگت حاصل کرنا ہے ۔ مثال کے طور پر کوئی آدمی کھڑا ہے ۔ آپ اس کی ذات میں داخل ہو کر اپنے آپ کو اس آدمی کے ماحول میں پہنچاتے اور مخصوص تأثرات حاصل کرتے ہیں ۔ اس طرح آپ اس شخص کے ساتھ ایک ہو جاتے ہیں ۔ فٹ بال کا کھیل لیجیے ۔ فرض کیا کہ میچ آخری منزل پر ہے اور دونوں ٹیموں

اور ان کے حامیوں کے جذبات اوج پر پہنچے ہوئے ہیں ۔ کھلاڑی بڑی تیزی سے بال لیے جا رہے ہیں ۔ جب گول کے نزدیک ٹھوکر (Kick) لگنی ہوتی ہے تو ناظرین ٹھوکر لگنے سے پیشتر اپنی ٹانگ ویسے ہی اٹھا رہے ہوتے ہیں جیسے وہ خود ٹھوکر لگا رہے ہوں ۔ اس حرکت



کھیل دیکھتے وقت دوستوں کا جذبہ دروں احساسی

کو نقالی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ابھی تک کھلاڑی نے ٹھوکر تو لگائی ہی نہیں ۔ ٹھوکر کے علاوہ اور بھی کئی حرکات ہیں جو ناظرین سے سرزد ہوتی ہیں ۔ ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے ناظرین میچ کھیل رہے ہوں ۔ یہی دروں احساسی ہے ۔ دوسرے کی جگہ اپنے آپ کو رکھ دینا اور وہی حرکات کرنا جو دوسروں سے متوقع ہوں ۔

ناول پڑھتے وقت بھی یہی کیفیت ہوتی ہے ۔ ہماری ہمدردیاں ہیرو اور ہیروین کے ساتھ ہوتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہیرو یا ہیروئن کی زندگی ہماری زندگی ہے اور ان کے مسائل ہمارے مسائل ہیں ۔ لہذا جب انہیں کامیابی ہوتی ہے ہم مسرت اور شادی کے تازیانے بجاتے ہیں اور جب وہ مشکل میں پھنس جاتے ہیں تو ہم پر کرب و اضطراب کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے ۔

ہوائی جہاز پتنگ یا پرندے کو ہوا میں اڑتے دیکھ کر ہمارے دل میں خوشی کی لہر کیوں دوڑتی ہے ؟ یہ اس لیے کہ لا شعوری طور پر ہم اپنے آپ کو ہوائی جہاز ، پتنگ یا پرندے کی جگہ پر رکھ دیتے ہیں ۔ وقتی طور پر عالم تخیل میں ہم ہوائی جہاز ، پتنگ یا پرندہ بن جاتے ہیں اور جو خوشی اوپر اڑنے میں ہوائی جہاز ، پتنگ یا پرندے کو ہو سکتی ہے وہی خود محسوس کرنے لگتے ہیں ۔ اس کا نام دروں احساسی ہے ۔ دروں احساسی کے لیے ضروری نہیں کہ جس شے سے ہم ایک ہو رہے ہوں وہ بھی ان تأثرات کو محسوس کرے جو ہم کرتے ہیں ۔ ہوائی جہاز کو اڑنے میں کوئی انبساط نہیں ملتی ۔ لیکن جب اس کی جگہ کوئی فرد لے لے تو عالم خیال میں وہ ایسی انبساط محسوس کرے گا جو اس کے خیال میں اوپر اڑتے وقت ہوائی جہاز کو محسوس ہونی چاہیے ۔

ہیجان (Emotion) :

تاثرات کا مختصر سا ذکر اس لیے کیا گیا کہ ہیجان کی تفسیات آسانی سے سمجھ میں آ سکے۔ ہیجان بھی ایک قسم کا تأثر ہے لیکن بہت شدید۔ ہیجان کا انگریزی مترادف (Emotion) لاطینی زبان کے لفظ (Emovere) سے نکلا ہے، جس کا مطلب لرزنا، کانپنا یا جھنجھوڑنا ہے۔ پس ہم ہیجان کو فرد کی شدید اضطرابی کیفیت کہہ سکتے ہیں جو خالص نفسیاتی ہے اور کردار، شعور اور احشا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ کوئی سا ہیجان لیجیے، خوف، غصہ، محبت یا دونی اور، اس میں تینوں پہلو نظر آئیں گے۔ مثال کے طور پر آپ ایسے آدمی کو لیں جو اپنی محبوبہ کو موٹر میں بٹھا کر سنیما دیکھنے گیا ہو۔ راستے میں یہ شخص اپنی بہادری، ذہانت اور اثر رسوخ کے کارنامے بیان کرے گا تا کہ انہیں سن کر محبوبہ مرعوب ہو جائے۔ وہ کسی حد تک اپنے مشن میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے کیونکہ راستے میں دونوں بہت گھل مل کر باتیں کرتے ہیں۔ یہ باتیں کچھ ایسی میٹھی ہوتی ہیں کہ مرد ٹریفک کا نشان نہیں دیکھتا اور اگرچہ لال بتی جلتی ہے لیکن وہ موٹر دوڑاتا چلا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پولیس مین سیٹی بجاتا ہے اور موٹر کھڑی کر لیتا ہے۔ پولیس مین خفگی کا اظہار کرتا ہے، مرد کو سخت سست کہتا ہے، لعنت ملامت کرتا ہے، تب کہیں جا کر خلاصی ہوتی ہے۔ اس بے عزتی کے بعد مرد کا رویہ یک لخت بدل جاتا ہے۔ بہادری، جرأت اور اثر رسوخ کی جن کہانیوں سے وہ اپنا سکہ جما رہا تھا ان کا طلسم ختم ہو جاتا ہے اور جو بازی وہ تقریباً نصف سے زیادہ جیت چکا تھا وہ ساری کی ساری مات ہو جاتی ہے۔ اب اس نے پولیس پر برسنا شروع کیا اور اس کے طور اطوار پر کڑی نکتہ چینی کی۔ مرد کا ذہنی توازن بھی قائم نہ رہا۔ کار چلانا مشکل ہو گیا۔ گیئر (Gear) ٹھیک نہیں بیٹھتے تھے۔ لیکن کوشش یہ تھی کہ کوئی کار اس سے

آگے نہ نکلے ۔ راستہ میں جو پولیس کا آدمی نظر آیا اس پر طبرے کسے، غرضیکہ مرد کی بری حالت تھی ۔ اس کا ذہن جواب دے چکا تھا ۔ اس کا کردار متوازن نہیں تھا اور اس کے اندرونی اعضا معمول کے مطابق کام نہیں کر رہے تھے ۔ اس مثال سے واضح ہو گیا ہوگا کہ ہیجان میں کردار بدل جاتا ہے ، شعوری کیفیت دگرگوں ہو جاتی ہے اور اندرونی اعضا بھی معمول کے مطابق کام نہیں کرتے ۔ ہیجان کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں شعوری واردات، عضویاتی کوائف اور کردار کی تشریح کرنی ہوگی ۔ ہیجانی کیفیت میں تأثرات محسوس ہوتے ہیں ۔ اندرونی اعضا پر بھی اثر پڑتا ہے اور کچھ اعمال و افعال سرزد ہوتے ہیں جن کا تعلق دوسرے لوگوں سے ہوتا ہے ۔ ان تینوں کیفیات کو الگ الگ نہیں سمجھنا چاہیے، اصل میں یہ تین مختلف پہلو ہیں جن سے ہیجان کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے ۔ یوں تو ہیجان ایک اکائی ہے اور اس کی تحلیل خالی از علت نہ ہوگی ۔ لیکن اپنی سہولت کے لیے ماہرین سائنس ایک شے ، موقعہ یا واردہ کو مختلف پہلوؤں میں تقسیم کر دیتے ہیں تاکہ مطالعہ میں آسانی ہو ۔

اب ہم ہیجان کا مطالعہ متذکرہ بالا تین پہلوؤں سے کرتے ہیں ۔

۱۔ ہیجان ، شعوری واردات کی صورت میں : ماہرین سائنس کے لیے مواد کی صف بندی از حد ضروری ہے ۔ مواد کی فراہمی کے بعد مواد کو ترتیب دینا ، مواد کی ہر صنف کے لیے نام تجویز کرنا ، اور موزوں مواد کو غیر موزوں مواد سے الگ کرنا سائنس کا ایک اہم فریضہ ہے ۔ کیا اس فریضے کے پیش نظر ہیجانی واردوں کی صف بندی کر سکتے ہیں ؟ مختلف زبانوں کے لٹریچر کا اگر مطالعہ کریں تو ہمیں کروڑوں کی تعداد میں ایسے الفاظ ملیں گے جو ہیجانی کیفیات سے متعلق ہوں گے ۔ ان الفاظ کو ترتیب دینا اور جماعتوں میں تقسیم کرنا جوئے شیر لانے سے کم دشوار کام نہیں ۔ پھر بھی عالموں نے اس سلسلہ میں بہت سر مارا ہے اور مختلف ہیجانات کے مماثل اور مخالف

خصائص اکٹھے کیے ہیں - ہیجانات کو مضبوط یا کمزور ، خوشگوار یا ناخوشگوار ، معروضی یا خارجی ، جسمانی یا روحانی ، خود غرضانہ یا بے غرضانہ کہا گیا ہے - اس کے علاوہ اور طریقوں سے بھی ہیجانات کو تقسیم کیا گیا ہے - لیکن سائنسی لحاظ سے یہ جماعت بندی ایسی کمزور اور پریشان کن ہے کہ بعض ماہرین نفسیات جن میں ولیم جیمز (William James) کا بھی شمار ہے اس تمام کوشش کو بے کار اور عبث سمجھتے ہیں -

کیا اس سلسلے میں ماضی کی ناکامی سے ہم یہ مطلب نکال سکتے ہیں کہ ہیجانات کی صف بندی محال ہے اور شعوری واردوں کی صورت میں ہیجان کی تحلیل اور تشریح ایک بیکار سا مشغلہ ہے ؟ یہ نتیجہ صحیح نہیں ہوگا - یاد رکھیں کہ ہیجانات سے عوام کی دلچسپی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ وہ ہیجانات کو محسوس کرتے ہیں - پیشتر اس کے کہ نظم پر ناقدانہ تبصرہ کیا جائے ، نظم کا مطالعہ لطف اور حظ کی ہیجانی کیفیت پیدا کرتا ہے - اسی طرح محبت کی نفسیات سے پہلے محبت کو بطور شعوری واردہ کے محسوس کیا جاتا ہے - شعر و شاعری ہیجانی زبان سے بھرپور ہے اور اس کی مقبولیت کا راز بھی اسی امر میں مضمر ہے کہ وہ ہیجانات پیدا کرتی ہے - روزمرہ کی زندگی میں بھی ایسے مواقع کی تلاش رہتی ہے ، جو پسندیدہ ہیجانات پیدا کریں اور غیر پسندیدہ ہیجانات ابھرنے نہ دیں - کئی ذہنی بیماریوں میں ہیجانی کیفیات نہایت اہم ہوتی ہیں ، جو ہیجانات لاشعور میں دبے پڑے ہوتے ہیں وہ ذہنی بیماریوں میں سر اٹھاتے ہیں اور ذہنی اور کرداری توازن کو خراب کر دیتے ہیں -

فی زمانہ جب کہ ہر کام سائنسی نقطہ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ہیجانات کی صف بندی کو بھی اسی نقطہ نگاہ سے لیا گیا ہے - ڈبلیو - اے - ہنٹ (W. A. Hunt) نے طلبہ کی جماعت کو لیکچر دیتے ہوئے موٹر کا ہارن

بڑے زور سے بجا دیا ۔ یہ ہارن وہ لیکچر دینے سے پہلے جاعت میں چھپا کر لے آئے تھے ۔ اس کے بعد انھوں نے طلبہ کے سامنے چودہ الفاظ رکھے اور انھیں کہا کہ اس ہارن کے متعلق جو الفاظ موزوں ہوں وہ لکھ دیں۔ اگلے سال انھوں نے یہی تجربہ دھرایا اب کے طلبہ مختلف تھے ۔ ان دو گروہوں کے علاوہ انھوں نے ایک تیسرا گروہ لیا جنھیں وہی چودہ الفاظ دیے اور کہا کہ بتلائیے کہ اگر آپ کو کوئی شے چونکا دے تو ان چودہ الفاظ میں سے کون سے الفاظ آپ کی ذہنی کیفیت کو ادا کریں گے۔ تینوں نتائج حاصل کرنے کے بعد (Hunt) نے کہا کہ مطالعہ باطن سے ہمیں ہیجانات کےمتعلق قابل اعتبار مواد ملا اور اس موادکی صف‌بندی میں مدد بھی ملی۔ ہنٹ (Hunt) کے پہلے گروپ میں ۴۷ طلبہ تھےدوسرے میں ۱۹ اور تیسرے میں ۹۴ ۔ نتائج مندرجہ ذیل چارٹ میں دیکھیے یہ نتائج چونکا دینے (Startle) کے متعلق ہیں ۔ اس تجربہ کا مدعا یہ تھا کہ اس ہیجان کے مشترک توصیفی خصائص دریافت کیے جائیں ، یعنی ایسے خصائص جو اکثر زیر اثر تجربہ افراد نے بیان کیے ہوں ۔

گروپ	مشترک توصیفی الفاظ													
	خوشگوار Pleasant	ناخوشگوار Unpleasant	شوخ Bright	پھیکا Dull	جوش Excitement	پژمردگی Depression	تناؤ Tension	تسکین Relaxation	گرمجوشی Warmth	سرد مہری Cold	ستانا Ease	کھچاؤ Strain	گھناپن Dense	پھیلاؤ Spread
پہلا	۱	۷۳	۱۱	۱	۱۱	۱	۸۲	۰	۴۹	۱۱	۰	۶۷	۵	۵
دوسرا	۲	۶۲	۸	۱	۸	۰	۸۵	۰	۱۴	۷	۰	۴۵	۰	۹
تیسرا	۷	۵۴	۲۵	۰	۲۵	۲	۷۷	۰	۲۱	۲۳	۰	۶۳	۲	۷

یہی تجربہ خوف ، خوشی اور غم کے متعلق کیا گیا ۔ نتائج فی صد حسب ذیل ہیں ، اس دفعہ طلبہ کی تعداد ۳۲۲ تھی ۔

ہیجان	مشترک توصیفی الفاظ													
	خوشگوار	ناخوشگوار	شوخ	پھیکا	جوش	پژمردگی	تناؤ	تسکین	گرمجوشی	سرد مہری	سستانا	کھچاؤ	کھنا پن	پھیلاؤ
خوف Fear	۱	۷۷	۵	۶	۵۵	۱۴	۹۵	×	۸	۴۵	×	۸۳	۴	۵
خوشی Joy	۹۶	۱	۷۷	×	۸۱	۱	۹	۳۴	۷۳	×	۴۶	۵	۱	۱۹
غمی Sorrow	۲	۸۶	×	۶۴	×	۹۴	۲۱	۸	۲	۳۳	۳	۴۵	۱۳	۱۰

یہ چارٹ ظاہر کرتا ہے کہ اکثر طلبہ نے خوف کو ناخوشگوار بتایا اور جوش، تناؤ ، سرد مہری اور کھچاؤ والی کیفیت کہا ۔ خوشی کو خوشگوار ، جوش کو گرمجوشی اور سستانے والی کیفیت بتایا اور غمی کو ناخوشگوار ، پھیکا ، پژمردہ اور تناؤ والی کیفیت سے یاد کیا ۔ اس چارٹ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مطالعۂ باطن سے ہیجانات کا تجربہ ہو سکتا ہے اور ان کے مشترک توصیفی خصائص بیان کیے جا سکتے ہیں ۔ اور چونکہ یہ مطالعہ لیباریٹری شرائط کے تحت عمل میں لایا جاتا ہے اس لیے اسے لحاظ سے سائنسی [illegible]

۲۔ ہیجان بطور عضویاتی کوائف کے : اس سلسلے میں شیکسپیئر کا مندرجہ ذیل پیرا گراف دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

Some strange commotion.
Is in his brain ; he bites his lips, and starts ;
Stops on a sudden, looks upon the ground,
Then lays his fingers on his temple ; straight
Springs out into fast gate ; then stops again,
Strikes his breast hard ; and anon he casts
His eye against the moon : in most strange postures,
We have seen him set himself.

یعنی اس کے دماغ میں عجیب گھبراہٹ ہے۔ وہ ہونٹوں کو کاٹتا ہے اور چل پڑتا ہے پھر دفعتاً کھڑا ہو جاتا ہے، زمین کی طرف دیکھتا ہے، انگلیوں کو کنپٹیوں پر دھرتا ہے پھر یک لخت تیز تیز قدم اٹھاتا ہے، رک جاتا ہے ، چھاتی کوٹتا ہے اور چاند پر نگاہیں دوڑاتا ہے۔ غرض کہ ہم نے اسے عجیب انداز میں پایا ہے۔

خوشی میں لوگ محسوس کرتے ہیں کہ عضلی (Kinaesthetic) حشوی (Organic) تحسسات سر میں آمڈ آتے ہیں۔ خون سر کی طرف دوڑ رہا ہے۔ جسم گرم اور ہاتھ گیلے ہوگئے ہیں۔ چھاتی میں حشوی تحسسات پیدا ہو رہے ہیں سانس تیز ہو گیا ہے اور دل و دماغ میں مسرت کی لہر دوڑ رہی ہے۔ غصے میں جسم گرم ہو جاتا ہے۔ دل دھڑکنے لگتا ہے۔ ہونٹ کاٹے جاتے ہیں۔ معدے میں تھرتھراہٹ ہوتی ہے ، چہرے پر سوئیاں چبھتی ہیں ، بازو لرزتے ہیں ، سانس تیر ہو جاتا ہے۔ ہاتھوں اور گھٹنوں پر پسینہ آ جاتا ہے ، پاؤں کے تلوے بھی بھیگ جاتے ہیں۔ مد مخالف کو مارنے کو جی چاہتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ہیجان کا مرکز دل ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ہیجان کا احساس دل کے قرب و جوار میں ہوتا ہے۔ دل کے علاوہ پردہ شکم (Diaphragm) اور آنتوں (Bowels) کو بھی ہیجان

کا مرکز گردانا جاتا ہے ۔ غرضیکہ دھڑ کا اندرونی حصہ کسی نہ کسی شکل میں ہیجانات سے متاثر ہوتا ہے ۔ اسے سمجھنے کے لیے تھوڑی سی فعلیات آنی چاہیے فعلیات کا وہ حصہ جو خاص طور پر ہیجانات سے متعلق ہے اسے خود اختیاری عصبی نظام (Autonomic Nervous System) کہا جاتا ہے ۔ یہ وہ نظام ہے جہاں سے اعصاب دل، آنتوں، پھیپھڑوں، معدے ، خون کی نالیوں اور دوسرے احشا کی طرف جاتے ہیں ۔ یہاں سے اعصاب پسینے کی غدودوں، بالوں کےعضلات اور آنکھوں کے قرخیہ (Iris) کی طرف بھی آتے ہیں ۔ یہ اعصاب بہت ہی پتلے اعصابی دھاگوں سے بنے ہوئے ہیں ۔ ان کا مآخذ نخاع اور سر حرام مغز ہے ۔ اس لحاظ سے خود اختیاری نظام بھی عصبی نظام کا جزو ہے ۔ خود اختیاری نظام کو تین طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ ایک اوپر والا ، دوسرا درمیانی اور تیسرا نچلا طبقہ ہے ۔ اوپر والا طبقہ سر حرام مغز سے نکلتا ہے ۔ اس کا کام دل کی حرکت سست کرنا اور معدے کو تیز کرنا ہے ۔ ہاضمے کے سلسلے میں یہ طبقہ خاص طور پر فعال ہوتا ہے ۔ درمیانی طبقہ ان اعصاب کا مجموعہ ہے جو نخاع سے نکلتے ہیں ۔ ان کا کام اوپر والے طبقے کے برعکس ہے ۔ یہ طبقہ دل کی حرکت تیز کرتا ہے ، خون کا دباؤ بڑھاتا ہے اور عمل ہاضمہ کو روکتا ہے ۔ نچلا طبقہ جنسی عوامل اور بول و براز کے افعال سے تعلق رکھتا ہے ۔ اوپر والا طبقہ نچلے طبقے کے وظائف میں بھی دخل دیتا ہے ۔

پس خود اختیاری نظام دو مخالف طاقتوں کا مرکز ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ ایسا مرکز ہے جہاں ہمیشہ رسہ کشی رہتی ہے ۔ حقیقت میں دونوں طاقتیں مل جل کر کام کرتی ہیں ، کبھی ایک طاقت برسر اقتدار آتی ہے کبھی دوسری ۔

ذیل میں چند ایک عضویاتی تبدیلیوں کا ذکر کیا جاتا ہے :

معدہ پر اثر : روک مک (Ruckmick)[1] ایک بچے کا ذکر کرتا ہے جو سینٹ کلائیس (Santa Claus) سے ڈر کر کہتا ہے کہ میں تو نہیں ڈرا صرف میرا معدہ ڈر گیا ہے ، پچیس سال بعد جب یہی لڑکا آئیوو جیما (Iuo Jima) کے خوف ناک ساحل کے قریب گیا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا معدہ سیمنٹ کا ایک بلاک بن رہا ہے -

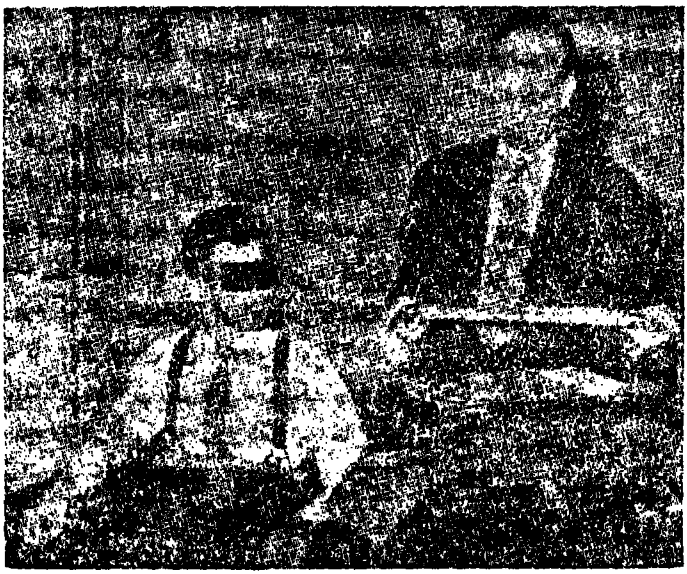
ازمنہ قدیم سے حکما کا اس پر اتفاق ہے کہ ہیجانی کیفیات میں معدہ متأثر ہوتا ہے، اس کے وظائف معمول سے ہٹ کر یا تو تیز ہو جاتے ہیں یا مدھم-ووڈورتھ اپنی کتاب[2] میں ایک تجربہ بیان کرتا ہے - وہ کہتا ہے کہ ایک پالتو بلی لیں اور اسے خوب کھانا کھلائیں - کھانے میں ایسی شے ملا دیں جو ایکس رے سے نظر آ سکے - اب اس بلی کو میز پر رکھیں اور ایکس ریز اس کے جسم سے گذاریں تاکہ اس کے معدے کے فعل کا عکس رے مشین کی پلیٹ پر نظر آئے- جب بلی اطمینان سے کھانا کھا کر بیٹھی ہو تو ایکس رے فوٹو میں اس کا معدہ حرکت کرتا دکھائی دے گا- اب اگر کتا آ جائے اور بلی کو دیکھ کر بھونکنا شروع کر دے تو بلی کو غصہ آئے گا اور اس کی معدے کی حرکت یک لخت بند ہو جائے گی - کتے کے چلے جانے کے بعد بھی یہ حرکت پندرہ منٹ تک بند رہتی ہے - معدے کے ساتھ انتڑیوں کا فعل بھی بند ہو جاتا ہے حتیٰ کہ معدے سے رطوبتیں نہیں نکلتیں، یعنی ہاضمے کا فعل بالکل جواب دے جاتا ہے - اسی لیے کہا جاتا ہے کہ کھانے کے بعد غصہ یا رنج نہیں کرنا چاہیے - ورنہ صحت خراب ہونے کا ڈر ہے -

ڈیشئل (Deshiel)[1] لکھتا ہے کہ نفسی بدنی (Psychosomatic) امراض سے پتہ چلتا ہے کہ ہیجانات میں معدہ کیسے متأثر ہو جاتا ہے - جاہ طلب اور بوالہوس انسان اگر غم و فکر کے شکار ہو جائیں تو ان کے

۱- اپنی کتاب The Psychology of Feeling and Emotion میں-
۲- Psychology ، صفحہ ۳۵۸ -

پیٹ میں پھوڑا ہو جاتا ہے ۔ یہ ضروری نہیں کہ ان کی ہوس کی تہہ میں مایوسی ہو یا انہیں لاشعوری طور پر محبت کی خواہش ہو محض فکر ہی معدہ کو خراب کر دیتا ہے اور پھوڑا پیدا کرتا ہے ۔ بعض دفعہ معدہ پھٹ جاتا ہے اور خون بہنے لگتا ہے ۔ بعض حالتوں میں قبض ہو جاتی ہے یا دست لگ جاتے ہیں ۔

سانس اور دل کی دھڑکن پر اثر: جوش سے سانس اور دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے ۔



جھوٹ معلوم کرنے والا آلہ

۱۔ اس کی کتاب Ggneral Psychology ، صفحہ ۲۰۸ ۔

ایسی مشینیں ایجاد ہو گئی ہیں جو چھاتی کی ان حرکات کو ریکارڈ کرتی ہیں جو سانس کی بدولت پیدا ہوتی ہیں ۔ ہنسنے اور رونے سے خاص قسم کی حرکات نمودار ہوتی ہیں ۔ جھوٹ بولتے وقت بھی خاص قسم کی حرکات ظاہر ہوتی ہیں ۔ ان سے پتہ چل جاتا ہے کہ شہادت دیتے وقت گواہ کہاں کہاں سچائی سے گریز کر گیا ۔ووڈورتھ کہتا ہے کہ ایک گواہ کو کہا گیا کہ وہ جھوٹی اور سچی گواہی دے اور ساتھ ساتھ اس کے سانس کا ریکارڈ رکھا گیا ۔ جب اس کے ریکارڈ کا بغور مطالعہ کیا گیا تو ماہر نفسیات ٹھیک بتا سکا کہ گواہی کہاں جھوٹی تھی اور کہاں سچی ۔ برخلاف اس کے اگر یہی گواہی جج صاحبان کے سامنے رکھی جائے تو جھوٹ اور سچ کا امتیاز کرتے وقت ان کے قیافے پچاس فی صد تک صحیح نکلتے ہیں ۔

خون کا دباؤ (Blood Pressure) تشویش اور غصے کی علامت ہوتی ہے ۔ یہ بذات خود کوئی بیماری نہیں بلکہ لاشعوری غم اور غصے اور کرب و اندوہ کی پیداوار ہے ۔ اکثر غصہ کسی برسر اقتدار رشتہ دار یا دوست کے خلاف ہوتا ہے ۔ جونہی کسی نے ان کا ذکر کیا خون کا دباؤ بڑھ گیا اور مریض کو اس امر کا مطلقاً علم نہیں ہوتا ۔ بعض اوقات خون کا دباؤ زندگی کی تلخیوں اور ناکامیوں سے بڑھ جاتا ہے ۔ جن فوجیوں کو مسلسل تین چار سال تک جنگ کی ہولناکیوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے وہ خون کے دباؤ کے شکار ہو جاتے ہیں ۔ جنگ ختم ہونے کے بعد ان کا مرض خود بخود دور ہو جاتا ہے یا اگر وہ فوج سے ڈسچارج ہو جائیں اور گھروں کو لوٹ آئیں تو خون کا دباؤ معمول پر آ جاتا ہے ۔

جھوٹ بولتے وقت بھی خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے ۔ ترقی یافتہ ممالک میں خون کا دباؤ بتلانے والے آلوں سے ، جنھیں انگریزی میں Sphygmomano-meter کہتے ہیں ، پولیس مشکوک آدمیوں کا پتہ لگا لیتی ہے ۔ یہ آلے بتا دیتے ہیں کہ مشکوک آدمی کہاں پر اور کتنے

فی صد جھوٹ سے کام لے رہا ہے ۔

یاد رہے کہ خون صرف جھوٹ بولنے سے ہی متاثر نہیں ہوتا ۔ بلکہ جب کوئی آدمی جوش میں آ جائے یا زیب داستان کے لیے کوئی جھوٹی سچی کہانی تراشے یا فحش سنیما دیکھے یا اپنی ذہانت کا امتحان کرائے خون کا دباؤ بڑھ جائے گا ۔

آزاد تلازم کا طریق : ہیجان کی ریسرچ میں آزاد تلازم کا طریقہ عموماً استعمال کیا جاتا ہے ۔ زیر تجربہ فرد کو ہدایت کی جاتی ہے کہ جونہی کوئی لفظ سنے جھٹ کوئی اور لفظ جو زبان پر آئے بول دے ۔ اگر بالفرض کرسی کا لفظ بولا جائے تو زیر تجربہ فرد کو چاہیے کہ جو لفظ تلازم سے اس کی زبان پر آئے وہ فوراً کہہ دے ۔ تجربہ کنندہ کے پاس الفاظ کی فہرست ہوتی ہے اور وہ ان الفاظ کو بولتا چلا جاتا ہے ۔ اور زیر تجربہ فرد کے رد عمل کو نوٹ کرتا رہتا ہے ۔ اس کے علاوہ وہ وقت بھی نوٹ کرتا ہے جو مہیج لفظ اور رد عمل لفظ کے درمیان گزرتا ہے ۔

چند الفاظ پر زیر تجربہ فرد کا رد عمل ہیجانی ہوتا ہے ۔ تلازم کے ذریعہ سے لاشعوری دبی ہوئی خواہشات اور ہیجانات کا پتہ چلتا ہے ۔ عصبانی (Neurotic) اپنے رازوں کو افشا نہیں ہونے دے گا ۔ اور مجرم اپنے جرم کو دبائے رکھے گا ۔ لہٰذا ان اشخاص کا لفظی تلازم چند ایک الفاظ پر غیر معمولی ہوگا ۔ اس کی علامتیں حسب ذیل ہیں :

(۱) بعض الفاظ بولنے پر وقت زیادہ لیا جاتا ہے ۔

(۲) بعض الفاظ بولنے پر وقت بہت کم لیا جاتا ہے ۔

(۳) بعض دفعہ جواب نہیں دیا جاتا یعنی کوئی لفظ بھی نہیں بولا جاتا ۔

(۴) مہیج لفظ کو دہرایا جاتا ہے ۔

(۵) وہ لفظ جو کسی اور ضمن میں بولا جا چکا ہے اسے دہرایا جاتا ہے ۔

(۶) عجیب اور احمقانہ سا رد عمل ظاہر کیا جاتا ہے -
(۷) مہیج لفظ کے متعلق غلط فہمی کا اظہار ہوتا ہے -
(۸) جب دوبارہ یہی آزمائش دی جاتی ہے تو پہلے جو لفظ رد عمل میں کہا گیا ہے اسے ناقص طریقہ سے دھرایا جاتا ہے -

آزاد تلازم سے ہیجانی خلطوں (Complexes) کا علم ہوتا ہے - زا تجربہ فرد کا ماضی اور حال آشکارا ہوتا ہے اور دیانتداری کو بھی اس طریقہ سے پرکھا جا سکتا ہے - عملی زندگی میں اس طریقے سے کئی فائدے حاصل ہوتے ہیں - تجزیہ نفس میں اس طریقے سے مریض کی چھپی ہوئی خواہشات کا پتہ لگتا ہے - عام زندگی میں بھی ، جیسا اوپر ذکر آ چکا ہے ، اس کے بے شمار فوائد ہیں -

ہیجانات کی دیگر عضویاتی نشانیاں : خوف اور غصے میں بلی کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں - انسانوں میں بھی خود اختیاری عصبی نظا کے باریک باریک پٹھے متأثر ہوتے ہیں - بعض ہیجانات میں آنکھ کی پتل پھیل جاتی ہے ، پسینہ اور غدودیں بر سر کار آتی ہیں طاقتور ہیجانات میں پسینے کے قطرے موتیوں کے دانوں کی طرح جسم پر نمودار ہو۔ ہیں - حیرانی سراسیمگی اور امید میں بھی پسینہ اور غدودیں متأثر ہوا ہیں - ان کی تہہ میں جو اعصاب کام کرتے ہیں ، وہ جلد میں تبدیل پیدا کرتے ہیں - یہ تبدیلیاں رو پیما (Galvanometer) سے ناپی سکتی ہیں -

خود اختیاری عضویاتی رد عمل کے فوائد : ووڈورتھ کا کہنا ہے کہ ڈر دو قسم کا ہوتا ہے ایک جوش سے بھرا ہوا ، دشمن کے مقابل کے لیے چاق و چوبند ، دوسرا بزدلی اور کم ہمتی پیدا کرنے والا پہلے قسم کے ڈر میں عضویاتی تبدیلیاں بعینہ ویسی ہوتی ہیں جیسے غص میں - اور یہ ان عضویاتی تبدیلیوں سے بالکل مختلف ہیں جو دوسرے قس کے خوف سے پیدا ہوتی ہیں - پہلے قسم کے خوف اور غصے سے ج

عضویاتی حرکات ظاہر ہوتی ہیں وہ مہذب آدمی کے لیے تو بیکار ہیں ، لیکن ان کا مدعا جسم کو خطرے کے لیے تیار کرنا ہے - فوری خطرات میں خون کی تیزی اور زائد توانائی چاہیے - عمل ہضم کچھ دیر انتظار کر سکتا ہے اس لیے یہ کچھ وقت کے لیے بند ہو جاتا ہے -

کھلاڑیوں اور امتحان دینے والے طلبہ کی جسمانی حالت ایک جیسی ہوتی ہے ، یعنی کھلاڑیوں کو کھیل سے پہلے اور امیدوار طلبہ کو کمرہ امتحان میں داخل ہونے سے پہلے اگر ملاحظہ کیا جائے تو ان کے خون کا دورہ تیز ہوگا - توانائی زیادہ ہوگی اور ہاضمے کا فعل تقریباً بند ہوگا - یہ حالت کھلاڑیوں کے لیے تو مفید ہے لیکن طلبہ کے لیے اس کا کچھ فائدہ نہیں - اس حالت کو ہم کھلاڑیوں یا امیدوار طلبہ کے سلسلے میں خوف یا غصے سے تعبیر نہیں کر سکتے اس کو زیادہ سے زیادہ جوش کہہ سکتے ہیں -

جوش ، مشاغل کی تیاری کا نام ہے - اس کی مختلف اشکال ہیں-کبھی تو یہ بیقراری کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور کبھی شدید محویت کی صورت میں - کھیل شروع ہونے سے پہلے کھلاڑیوں پر بیقراری کی حالت طاری ہوتی ہے - دو چار روز پہلے ہی کھیل کی تیاری شروع ہو جاتی ہے - مالش ہوتی ہے ڈنڈ بیٹھک لگائے جاتے ہیں ، دوڑیں ہوتی ہیں اور مخصوص ورزشیں کرائی جاتی ہیں ، ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ جسم مقابلے کے لیے تیار ہو جائے- جب کھیل کا وقت آتا ہے جوش ، بام عروج تک پہنچا ہوا ہوتا ہے لیکن یہ جوش یہاں پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ کھیل کے دوران بھی جاری رہتا ہے - لیکن کھیل میں اس کا احساس نہیں کیا جاتا - کھلاڑی انتہا درجے کی محویت سے کھیل میں مصروف ہوتا ہے اگر وہ تاثرات سے متأثر ہو جائے تو کھیل خراب ہو جائے گا - پس عمدہ اور مؤثر کھیل کے لیے ضروری ہے کہ جوش موجود تو رہے لیکن بطور تاثر محسوس نہ کیا جائے- تقریر کرنے والے کی حالت بھی

کھلاڑیوں جیسی ہوتی ہے۔ مقررہ وقت سے پہلے اس کی طبیعت م
کھلبلی سی موجود ہوتی ہے۔ تقریر کرتے وقت گو ان کا دھیان نف
مضمون اور طرز ادا کی طرف لگا ہوا ہوتا ہے لیکن پس منظر میں جوش
بصورت محویت دکھائی دیتا ہے۔ ووڈورتھ کا خیال ہے کہ شاید جوش
ان مختلف اشکال میں عضویاتی تبدیلیاں بھی مختلف ہوں۔ پہلی صورت م
جو اشغال سے پیشتر نمودار ہوتی ہیں ان میں اعصاب شرکی اور کظر
غدودیں سرگرم کار ہوتی ہیں دوسری صورت میں جو اشغال کے دور
پیدا ہوتی ہیں ان میں تمام خود اختیاری عصبی نظام متوازن طریقے
کام کر رہا ہوتا ہے۔

اوپر ذکر آ چکا ہے کہ جوش کو نہ تو ڈر کہہ سکتے ہیں
غصہ۔ غصے میں جوش تو آیا ہوتا ہے لیکن اس جوش کی نوعیت
والے جوش سے ذرا مختلف ہوتی ہے۔ گو دونوں کا منشاء یعنی غصے ا
ڈر کا ایک ہے اور وہ ہے خارجی مشاغل میں شرکت اور تکمیل۔ غد
سے حملہ مقصود ہوتا ہے اور ڈر سے فرار۔ یہ کیفیات مشغلے کے ا
نہایت ضروری ہیں۔ ان کے باہمی تعاون سے غصے یا ڈر کا ہیجان تشک
پاتا ہے۔

(۳) ہیجان بطور کردار کے :

(ا) چونک اٹھنا (Startle) : اس کی تہہ میں ایک مقررہ عضو
نظام ہے جو فطری ہونے کے ساتھ مستقل بھی ہے۔ ج
کوئی شدید فوری قسم کا مہیج آن نکلتا ہے جیسے بجلی
کڑک یا بندوق کی آواز تو عضویہ کا رد عمل فی الفور معر
ظہور میں آتا ہے، اس رد عمل کی لپیٹ میں چہرے کے پٹ
بلکہ سارا جسم ہوتا ہے۔ اگر کوئی کیمرا ایک سیکنڈ
دو ہزار سے تیس ہزار تک تصویریں لے سکے اور ایسی ہی
رفتار گھڑی ہو تو ان کی مدد سے ہم سارے رد عمل کو

تقریباً آدھے سیکنڈ میں ختم ہو جاتا ہے قلبا سکتے ہیں - جہاں تک چہرے کا تعلق ہے پہلے تو آنکھیں جھپکتی ہیں، پھر منہ ذرا پھیلتا ہے اور سر کو جھٹکا لگتا ہے - اس کے علاوہ مونڈھے آگے کو جھکتے ہیں، کہنیاں بھی ٹیڑھی ہوتی ہیں، انگلیاں مڑ جاتی ہیں، گھٹنے بھی قدرے خمیدہ ہو جاتے ہیں اور پیٹ اندر کو جھک جاتا ہے -

ضروری نہیں کہ ہر چونکا دینے والی کیفیت میں یہ ساری علامتیں پائی جائیں، کسی میں کوئی غالب ہوتی ہے کسی میں کوئی- لیکن عام نمونہ یہی ہے - حیوانوں اور انسانوں میں بھی یہی کردار ملے گا - ذہنی مریض اور مرگی والوں میں بھی یہی کردار ہوتا ہے - اس کردار سے کسی طرح چھٹکارا ممکن نہیں - حتیٰ کہ فوجی اور سپاہی جنھیں سالہا سال بندوق چلانے کی تربیت دی جاتی ہے اور گولی کی آواز سننے کے بیشمار مواقع ملتے ہیں وہ بھی چونکا دینے والے کردار سے رہائی نہیں پا سکتے -

(ب) طیش (Rage) : غیض و غضب میں جسم پر ایک عجیب حالت طاری ہوتی ہے دوسرے لوگ بھی اسے تاڑ لیتے اور بچاؤ کی مناسب تدبیر کرتے ہیں - طیش کا مطلب دوسرے پر حملہ کرنا ہے - ڈارون نے غصے سے مغلوب جانوروں کی تصویریں لیں جن سے طیش کے وقت جسمانی کردار کا صحیح صحیح اندازہ ہو سکتا ہے - مثلاً اگر بلی کی دم کی زور سے چٹکی لی جائے تو اس کا سر جھک جاتا ہے، پیٹھ ابھر آتی ہے، کان پیچھے کو مڑ جاتے ہیں - غرانے کی آواز نکلتی ہے، اگلے پاؤں باری باری مارتی ہے - بال کھڑے ہو جاتے ہیں، آنکھ کی پتلی پھیل جاتی ہے اور اس کے پپوٹے تن جاتے ہیں -

مہذب لوگوں کو جب طیش آتا ہے تو اوپر والی ساری

علامتیں موجود نہیں ہوتیں ۔ اکثر علامتوں کو دبا دیا جا
ہے اور باقی کو کچھ اور رنگ دے دیا جاتا ہے ۔ لیکن پھ
بھی محرومیت، نا کامی اور ہار سے جارحیت (Aggression) پید
ہوتی ہے اور دوسرے لوگ ظاہری علامتوں سے اسے بھانپ
لیتے ہیں ۔

(پ) ڈر (Fear) : ڈر بھی طیش کی مانند ہے ، دونوں کا کردار بھی
ملتا جلتا ہے ۔ ڈارون نے اس سلسلے میں تجربہ کیا ۔ وہ لکھتا
ہے کہ جونہی بلی نے بھاپ نکلنے کی اونچی آواز سنی و
پیچھے مڑی، سر کو جھکا لیا، دبک کر بیٹھ گئی، میاؤں میاؤں
کرنے لگی ، پھر ایک طرف کو بھاگی ، اس کا سر ، چھاتی
پیٹ اور دم زمین سے لگا ہوا تھا ۔ اس بھاگم دوڑ میں مختلف
اشیا سے ٹکراتی ہوئی ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئی اور
درد ناک لہجے میں میاؤں میاؤں کرتی رہی ۔ اس وقت اس
کی آنکھیں کھلی تھیں ، پتلیاں پھیلی ہوئی تھیں اور پیٹھ او
دم کے بال کھڑے تھے ۔ جب اس تجربے کو دھرایا گیا تب
بھی بلی پر یہی کیفیت طاری ہوئی ۔ اور جب بجائے بھاپ کی
آواز کے نلکے سے پانی نکلنے کی زور کی آواز آئی تب بھی بلی
اسی جسمانی انداز میں آ گئی ۔

(ت) مسکرانا اور ہنسنا (Smiling and Laughing) : گڈ اِنف
(Goodenough) نے دس سال کا اندھا اور بہرا بچہ لیا۔ چونکہ
یہ بچہ اندھا اور بہرا تھا اس کے متعلق یہ سوال نہیں پیدا ہو
سکتا کہ اس نے ہیجانی کردار کو دیکھ رکھا ہے یا سن رکھا
ہے ۔ اس بچے کو کئی ہفتوں زیر ملاحظہ رکھا گیا اور اس
کے کردار کو قلمبند کیا گیا ۔

ایک دفعہ چھوٹی سی گڑیا اس کی قمیض تلے گردن سے گرا

دی گئی - فوراً اس کا جسم تن گیا - مژگاں اٹھ گئیں اور اندھی آنکھیں کھل گئیں - چند منٹوں کے لیے گڑیا اس کے ہاتھ نہ آئی، اس نے ٹٹولنا چھوڑ دیا اور سر جھکا کر روں روں کرنے لگا - یک لخت اس نے دوبارہ جستجو کی اور گڑیا کو پکڑ لیا - تب اس نے دونوں ہاتھ اٹھائے سر کو پیچھے پھینکا، خوب مسکرایا اور پھر قہقہے لگائے - یہ تجربہ ثابت کرتا ہے کہ مسکرانا اور ہنسنا قدرتی میلانات ہیں -

(ٹ) چلانا (Crying) : ہنسنے اور مسکرانے کے سلسلے میں جو تجربہ اندھے اور بہرے بچے پر ہوا اس میں ایک مقام ایسا آتا ہے جب ناکامی کی وجہ سے یہ بچہ رونے لگتا ہے جو ثابت کرتا ہے کہ یہ فعل فطری ہے چنانچہ ہر والدین کو پتہ ہے کہ بچوں میں رونا اور چلانا ہنسنے اور مسکرانے سے بہت پہلے آتا ہے اور زندگی کے پہلے برسوں میں بچہ اکثر روتا اور چلاتا ہے - جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ عالمگیر اور فطری ہیجان ہے -

(ج) پیار اور محبت (Love) : پیار کا لفظ کئی معنوں میں مستعمل ہوتا ہے - اس کی صحیح صحیح تعبیر (Denotation) ممکن نہیں- لٹریچر اور روزمرہ کی زندگی میں اس لفظ کا اطلاق مختلف مواقع پر ہوتا ہے - جنسی ہیجانات بھی اس کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں - آج تک کوئی باضابطہ تجربہ انسانوں کے جنسی ہیجانات پر نہیں ہو سکا - البتہ حیوانوں پر ہوا ہے - جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ہیجان بھی فطری اور عالمگیر ہے - پیار اور محبت کا جو نظریہ تہذیب اور تمدن نے پیش کیا ہے اس میں بیشتر حصہ اکتسابی ہے - اگر اس حصے کو نکال دیں تو باقی حصہ وہی رہ جائے گا جو جبلی اور عالمگیر ہوگا -

ہیجان کو ظاہر کرنا اور قابو میں رکھنا :

ہیجان کے بدنی اظہار کے سلسلہ میں ہم نے چند ایک فطری ہیجانات کو لے کر ان کے مخصوص کردار کو بیان کیا ہے ۔ یوں تو ہر ہیجانی کیفیت کے ہمراہ عضویاتی تبدیلیاں ہوتی ہیں اور بدنی اظہار ہوتا ہے ۔ بچہ شروع ہی سے مسکراتا ، ہنستا ، روتا ، چیختا اور چلاتا ہے ۔ جوں جوں وہ بڑا ہوتا ہے ہیجانات کے اظہار میں اسے اعتدال سے کام لینا ہوتا ہے اور انہیں چھپانا بھی سیکھ لیتا ہے ۔ اگر وہ روئے یا ڈر جائے تو لوگ مذاق اڑاتے ہیں ۔ اس سے اس کے جذبہ خود داری کو ٹھیس لگتی ہے ۔ لہٰذا وہ رونے کا نہیں چاہے اسے کیسی ہی تکلیف ہو یا کیسا ہی خوف کیوں نہ لاحق ہو ۔ اسی طرح تہذیب و تمدن کے تحت اسے ان مواقع پر مسکرانا پڑتا ہے جو حقیقت میں تکلیف دہ ہوتے ہیں ۔ کسی کو ملتے وقت وہ مسکرائے گا اور یہ بھی کہے گا کہ مجھے آپ سے مل کر خوشی ہوئی خواہ اس کے اصلی جذبات کچھ ہی ہوں ۔ دوسرے لوگ اس ٹوہ میں لگے رہتے ہیں کہ بیرونی اظہار سے پرے جو اصلی جذبات اور احساسات ہیں وہ کیا ہیں ۔ پس ہیجانات کو چھپانے اور انہیں معلوم کرنے کے درمیان ایک رسہ کشی ہے ۔ بڑی کوشش کے باوجود بھی اصلی ہیجانات کا پتہ نہیں لگتا ۔ اکثر لوگ بہروپیے ہوتے ہیں ۔ ان کا ظاہر اور باطن ایک جیسا نہیں ہوتا ۔

عمر کے ساتھ بدنی اظہار میں کمی واقع ہو جاتی ہے ۔ بچہ جہاں چھوٹی چھوٹی باتوں پر کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے بڑے لوگ وہاں ٹس سے مس نہیں ہوتے ۔ اسی طرح بچہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے ناراض ہو جاتا ہے ، رونے لگتا ہے ۔ بڑے آدمی ان باتوں کو فضول اور بے معنی سمجھتے ہیں ۔ اور مطلقاً متأثر نہیں ہوتے ۔ پس ذہنی ارتقا اور زندگی کی بڑھتی ہوئی مصروفیات کے باعث ہیجانات کا بدنی اظہار کمزور سے کمزور تر ہو جاتا ہے ۔ لیکن اس کے برخلاف اگر ڈرامے کو

دیکھا جائے تو اس کا تمام تر زور ہیجانات کے اظہار پر ہے ۔ سٹیج پر پر ایکٹر غم و غصہ ، عشق و محبت اور حیرت و استعجاب کا اظہار تمام جسم سے کرتا ہے ۔ ہیجان کی زبان نرالی ہے ۔ شاعری ، مصوری ، بت تراشی ، ناچ گانا ، ہیجانات کے اظہار کے مختلف ذرائع ہیں ۔ اداکاروں کو جسم اور الفاظ کے ذریعہ ہیجانات کو ظاہر کرنا ہوتا ہے ۔ جتنا بڑا اداکار ہوگا اتنا ہی وہ ہیجانات کے اظہار میں ماہر ہوگا ۔ یاد رہے کہ معاشرتی تقاضوں کے تحت ہیجانات کے اظہار نے ایک طے شدہ طریقہ اختیار کر لیا ہے، اداکار اس میں تھوڑا بہت تصرف کر سکتا ہے لیکن انھیں بالکل نہیں بدل سکتا ۔ .شلاً محبت اور نفرت کا اظہار اپنا اپنا ہے ۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ جو اظہار نفرت کا ہے وہ محبت کا ہو جائے یا جو اظہار محبت کا ہے وہ نفرت کا بن جائے ۔ تجربہ کرنے کے لیے لوگوں کو مختلف تصویریں دکھائی جاتی ہیں ۔ یہ تصویریں ہیجانی کیفیات کی عکاسی کرتی ہیں، دیکھنے والوں سے استدعا کی جاتی ہے کہ وہ بتائیں کہ فلاں تصویر کس ہیجان کو ظاہر کر رہی ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس تجربے میں اتفاق ممکن نہیں ، کوئی کسی تصویر کو ایک طریقے سے لیتا ہے کوئی دوسرے طریقے سے ۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ کسی نے نفرت کے چہرے کو محبت کے چہرے سے اور محبت کے چہرے کو نفرت سے تعبیر کیا ہو ۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہیجانات کا مخصوص اظہار تو نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود کئی ایک موٹی موٹی نشانیاں ہیں جن کی وجہ سے متضاد اور مخالف ہیجانات کو گڈ مڈ نہیں کیا جا سکتا ۔ چہرے کے علاوہ آواز ہاتھ اور پاؤں بھی ہیجانات کے اظہار میں اہم کردار ادا کرتے ہیں ۔ دشمن انہی سے دشمنی کا اندازہ کرتے ہیں اور محبت کرنے والے بھی آواز اور جسم کی اداؤں سے پیار کی گہرائیوں کو ناپ لیتے ہیں ۔ ایک ہی فقرے کو اگر مختلف لب و لہجے سے پڑھا جائے تو اس سے نفرت ، محبت یا غصے کا اظہار ہوتا ہے ۔ ایکٹروں کے پاس آواز اور طرز ادا

دو زبردست ہتھیار ہیں ۔ ان کے ذریعہ وہ اپنا مافی الضمیر دوسرا
عیاں کرتے ہیں ۔

جیمز لینگ کا نظریہ ہیجانات
(James lange Theory of Emotions)

ہیجانات اور ان کے بدنی اظہار میں اس قدر گہرا تعلق ہے کہ
ماہرین نفسیات نے ان دونوں کو ایک سمجھ لیا اور دعویٰ کیا
ہیجان صرف اس بدنی اظہار کے شعور کا دوسرا نام ہے جو کسی مخص
ماحول کے ادارک سے جھٹ پٹ پیدا ہوتا ہے ۔ یہ نظریہ علیحدہ علی
ولیم جیمز اور لینگ نے ۱۸۸۰ء کے قریب پیش کیا اور اس اعتبار
جیمز لینگ کے نظریہ سے موسوم ہوا ۔ اس نظریے کی رو سے یہ
ہوتا کہ پہلے ہیجانات وارد ہوتے ہیں اور بعد میں عضویاتی تبدیلیاں
بدنی اظہار ۔ بلکہ پہلے عضویاتی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اور بعد میں
سے متعلقہ ہیجان ، کیونکہ ہیجان تو صرف عضویاتی تبدیلیوں کے ش
کا نام ہے ۔ ولیم جیمز لکھتا ہے ''اب میں اپنے نظریے کا اہم ترین ؛
پیش کرتا ہوں ۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ اگر میں کسی ہیجان کے شعور
تمام بدنی علامتیں نکال دوں تو باقی کچھ بھی نہیں بچتا ۔ کوئی ذ
مواد نہیں رہتا جس سے ہیجان تشکیل پا سکے ۔ جتنا زیادہ میں اپنے
کو ٹٹولتا ہوں اتنا ہی مجھے زیادہ یقین ہوتا ہے کہ جو بھی جذ
احساسات اور ہیجانات مجھ میں اٹھتے ہیں وہ درحقیقت ان عضویاتی اور ؛
تبدیلیوں کے نتائج ہیں جنھیں عام طور پر ہیجانات کا اظہار کہہ دیا ؛
ہے''۔ ولیم جیمز کا کہنا ہے کہ ہم افسردہ اس لیے ہوتے ہیں کہ چلا
ہیں ۔ غصہ اس لیے کرتے ہیں کہ مارتے ہیں اور خائف اس لیے ہو
ہیں کہ کانپتے ہیں ۔

عام آدمیوں کو یہ نظریہ عجیب سا لگے گا ۔ وہ کہیں گے '

حقیقت اس کے برعکس ہے ۔ لیکن اس نظریے نے ہیجانات کے مطالعہ پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ اور اگرچہ اکثر نفسی عالموں نے اسے رد کر دیا ہے لیکن ہیجانات کے تجربی اور سائنسی مطالعہ کو جو مدد اس کی بدولت ملتی ہے اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا ہے ۔

ولیم جیمز اپنے نظریے کی تائید میں دو شواہد پیش کرتا ہے ۔

۱۔ اگر ہیجانات میں سے تمام عضویاتی اور بدنی تبدیلیوں کو منہا کر دیا جائے تو باقی جو بچے گا اسے ہیجان نہیں کہہ سکتے، اگر کسی کی مڈبھیڑ شیر سے ہو جائے اور نہ تو اس کے چہرے کا رنگ فق ہو، نہ ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہوں ، نہ ہی اس کا دل دھڑکے اور نہ اس کی ٹانگیں کانپیں تو وہ شخص ڈر یا خوف میں مبتلا نہ ہوگا بلکہ صرف ٹھنڈے دل سے فلسفیانہ انداز میں کہے گا کہ یہ شیر ہے ۔ چونکہ کسی آدمی کا رنگ پیلا پڑ جاتا ہے ، اس کا دل دھڑکتا ہے ، ٹانگیں کانپتی ہیں اس لیے کہا جاتا ہے کہ فلاں آدمی ڈر گیا ۔ اگر ان جسمانی کیفیات کو باہر نکال پھینکا جائے تو ڈر بھی غائب ہو جائے گا ۔

۲۔ ولیم جیمز کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر جسمانی کیفیات کو مصنوعی طریقے سے پیدا کر دیا جائے تو جس حد تک ہم اس امر میں کامیاب ہوں گے اس حد تک متعلقہ ہیجان ظاہر ہو جائے گا ۔ میلے کچیلے کپڑے پہنیں ، بال بکھیریں ، رونا اور چلانا شروع کریں ، چہرے کو لٹکا لیں تو آپ غم محسوس کریں گے ۔ اس کے برعکس ہنسیں ، سیٹی بجائیں ، عمدہ کپڑے پہنیں ، خوش خوش باتیں کریں ، تو آپ خوشی محسوس کریں گے ۔

اس دلیل کی بہترین تصدیق ایکٹروں سے حاصل ہو سکتی ہے کیونکہ وہ سٹیج پر اکثر مصنوعی طریقے سے غم و غصہ یا شادی و مسرت کی جسمانی کیفیات پیدا کرتے ہیں۔ لیکن اداکاروں کی شہادت ایک جیسی نہیں

بلکہ متضاد ہے ۔ بعض کہتے ہیں کہ جن ہیجانات کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں انہیں وہ محسوس بھی کرنے لگتے ہیں ۔ دوسرے کہتے ہیں کہ گو وہ سٹیج پر آنسو بہاتے ہیں لیکن دل میں افسوس محسوس نہیں کرتے اور گو وہ سٹیج پر گرجتے ہیں لیکن دل میں غصہ محسوس نہیں کرتے۔

جیمز لینگ کے نظریہ پر تنقید : خود جیمز کو پتہ نہیں کہ وہ کیا ثابت کرنا چاہتا ہے ۔ بعض اوقات ایسا نظر آتا ہے جیسے جیمز کا منشا تحسس پسندی (Sensationism) کے نظریے کو تقویت دینا ہے ۔ کسی اور جگہ یہ گمان ہوتا ہے کہ جیمز صرف بدنی کیفیات کی اولیت پر زور دے رہا ہے ۔ یہ دونوں خیالات غلط ہیں کیونکہ اور جیمز نے جن شواہد کو اکٹھا کیا ہے وہ ان خیالات میں سے کسی ایک کو بھی ثابت نہیں کرتے ۔ یہ قدرے صحیح ہے کہ اگر غصے سے عضویاتی تبدیلیاں نکال دی جائیں تو غصہ غائب ہو جائے گا ۔ اگر ہم آنسو نہ بہائیں ۔ دل میں افسردگی پیدا نہ ہونے دیں اور نظام عصبی میں خون کی سپلائی کم نہ ہونے دیں تو تأسف کا ہیجان غائب ہو جائے گا ۔ لیکن اگر جیمز سے اتفاق بھی کر لیں اور یہ تسلیم کر لیں کہ عضویاتی کیفیات کی عدم موجودگی میں ہیجانات ختم ہو جاتے ہیں ، تو بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہیجان محض عضویاتی تبدیلیوں کا دوسرا نام ہے ۔ یا اس شعور کا جو ان عضویاتی تبدیلیوں سے پیدا ہوتا ہے ۔ یا یہ کہ ہیجان عضویاتی تبدیلیوں کا نتیجہ ہے ۔ میرے تأسف کے ہیجان کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے اس امر کا علم ہو رہا ہے کہ میرے آنسو بہہ رہے ہیں ۔ میری چھاتی پر بوجھ ہے میرا سانس مشکل سے نکل رہا ہے اور میری غدودیں مختلف قسم کی رطوبتیں خون میں پھینک رہی ہیں ۔ ان میں سے اکثر بدنی کیفیات کا تو مجھے علم بھی نہیں ہوتا ۔ زور دار ہیجانات میں مجھے بدنی کیفیات

نا علم ہیجان ختم ہونے کے بعد ہوتا ہے ۔ انتہائی غصے میں کسی کو
تل بھی کر دیا جاتا ہے اور قتل کے بعد علم ہوتا ہے کہ کیا ہو گیا ۔
س لیے جذبات کو محض عضویاتی تبدیلوں میں تحویل نہیں کیا جا سکتا ۔

ووڈورتھ نے اس نظریے کے خلاف تجربی شہادت اکٹھی کی ہے ۔
ہ کہتا ہے کہ شیرنگٹن (Sherrington) نے ایسا کتا لیا جو تمام
ہیجانات رکھتا تھا ۔ اس میں پیار بھی تھا اور غصہ بھی ۔ شیرنگٹن نے
س کے اعصاب کچھ اس طریقے سے کاٹے کہ وہ اندرون جسم سے
احساسات قبول نہیں کر سکتا تھا ۔ لیکن اس کے باوجود کتے کے
ہیجانات میں کوئی فرق نہ آیا ۔ وہ بدستور غصے ، خوشی ، نفرت اور
خوف کا اظہار کرتا رہا ۔

ایک اور تجربہ کینن (Cannon) نے کیا ۔ ایک بلی لی گئی جس کا
خود اختیاری عصبی نظام کاٹ دیا گیا ۔ اس طرح سب عضویاتی کیفیات
ختم ہوگئیں ۔ لیکن اس کے باوجود بھی بلی ہیجانات کا اظہار کرتی رہی ۔
غصے میں اسی طرح غراتی تھی ، دانت نکالتی تھی ، کان پیچھے کو
کھینچتی تھی اور مارنے کے لیے ٹانگیں اٹھاتی تھی ۔

ووڈورتھ نے ایک چالیس سالہ عورت کا ذکر کیا ہے جو گھوڑے
سے گر پڑی اور گرنے سے اس کی گردن ٹوٹ گئی ۔ لہٰذا اس کے دماغ
اور نخاع کا رابطہ منقطع ہو گیا ۔ جیمز لینگ کے نظریے کے بموجب اس
عورت کی جذباتی زندگی ختم ہو جانی چاہیے تھی ۔ لیکن حقیقت میں
ایسا نہیں ہوا ، وہ اس حادثہ کے بعد ایک سال تک زندہ رہی اور اس کے
ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ وہ بدستور پیار ، خوشی اور غم کا اظہار
کرتی رہی ۔

ووڈورتھ نے عضویاتی کیفیات کو مصنوعی طریقے سے پیدا
کرنے کے مسئلے پر بحث کی ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ اگر کظری رطوبت
(Adrenin) کی ایک خوراک کسی آدمی کو پلا دی جائے تو اس کی

نبض تیز ہو جائے گی - ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جائیں گے ، بازو ، ٹانگیں اور آواز کانپنے لگیں گی - وہ شخص بے قرار نظر آئے گا اور کہے گا کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی ہیجان وارد ہونے والا ہے نیز اس دوائی کے اثر سے وہ معمول سے زیادہ ڈرنے لگے گا -

وڈورتھ کا خیال ہے کہ عضویاتی تبدیلیاں ہیجانات کی جانب مائل تو ضرور کرتی ہیں لیکن ہیجانات کی پوری تشریح کرنے سے قاصر ہیں -

نواں باب

انفرادی اختلافات اور ذہانت

(Individual Differences and Intelligence)

گذشتہ چند صدیوں میں نفسیات کا فریضہ ایسے اصول وضع
کرتا تھا جو تمام انسانوں کے لیے صحیح ہوں ۔ اس مطلب کے لیے
شعور کو لے کر اس کا تجزیہ کیا جاتا تھا ۔ عناصر بتائے جاتے تھے ۔
عناصر کے باہمی تفاعل سے جو مرکب اور پیچدار نفسی کیفیات
معرض ظہور میں آتی تھیں ان کی تشریح کی جاتی تھی ۔ اس سارے
پروگرام کا ماحصل یہ تھا کہ نفس اور نفسی کردار کے بارے میں
ایسے اصول بنائے جائیں جن کا اطلاق تمام انسانوں پر یکساں طریقے سے
ہو سکے ۔ اس پروگرام میں شخصی اور انفرادی اختلافات کو دریافت
کرنے کی کوئی گنجائش نہ تھی ۔ اس لحاظ سے یہ پروگرام ناقص تھا ۔
کیونکہ مماثلت کے باوجود انسانوں میں اختلافات بھی ہیں ۔ جہاں زید
اور بکر انسان ہونے کی حیثیت سے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں
وہاں قابلیتوں ، مہارتوں اور صلاحیتوں کی بنا پر وہ ایک دوسرے سے
مختلف بھی ہیں ۔ بعض اوقات مماثلت کے مقابلے میں انفرادی اور شخصی
تفاوت زیادہ اہم بن جاتی ہے ۔ مثال کے طور پر بھائی بہن ایک ہی گھر
میں رہنے کے باوجود مختلف دلچسپیاں کیوں رکھتے ہیں ؟ کیوں ایک
شخص ایک پیشے کے لیے موزوں ہے ۔ دوسرا شخص کسی اور
پیشہ کے لیے ؟ کیوں سکول کے ہم عمر اور ہم جماعت طلبہ میں سے
کوئی تو ہر جماعت مقررہ وقت پر پاس کر لیتا ہے اور دوسرا آئے سال
فیل ہوتا رہتا ہے ؟ اس قسم کے سوالات روزمرہ کی زندگی میں خاص

اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کا جواب پرانی نفسیات میں نہیں ملتا۔ کیونکہ پرانی نفسیات تو تعمیات میں الجھی ہوئی تھی۔ انسانی اختلافات کی طرف اس کی توجہ کم جاتی تھی۔ جدید نفسیات میں جہاں تعمیات سے گریز نہیں کیا جاتا وہاں یہ بھی کوشش ہوتی ہے کہ شخصی اور انفرادی خصائص کو اجاگر کیا جائے۔

فی زمانہ مماثلت کے مقابلے میں انفرادی اختلافات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ ہزارہا پیشے نکل آئے ہیں، کوئی ایک پیشے کے لیے موزوں ہے کوئی دوسرے کے لیے۔ ذات پات کے بندھن ٹوٹ چکے ہیں۔ جمہوریت کا زمانہ ہے لہٰذا ہر شخص اپنی قابلیتوں کے مطابق پیشے کا انتخاب کر سکتا ہے اور اپنی دلچسپیوں کو فروغ دے سکتا ہے۔ علاوہ ازیں سوسائٹی میں لاکھوں کروڑوں انسان شامل ہیں کوئی بھلا مانس ہے کوئی بدمعاش۔ کوئی غبی ہے کوئی ذہین، کوئی خدا ترس ہے کوئی غنڈا اور جیب کترا، کوئی سلیم العقل ہے کوئی ذہنی مریض۔ غرضیکہ قسم قسم کے لوگ موجود ہیں۔ لیکن ہر کوئی دوسرے سے الگ ہے۔ ان تمام اشخاص کو سمجھنے کے لیے ایک نئی نفسیات کی ضرورت ہے۔ اس نفسیات کو انفرادی نفسیات (Individual Psychology) کہا جاتا ہے۔ اس کتاب کے کئی ایک باب اسی قسم کی نفسیات سے تعلق رکھیں گے۔ خصوصاً وہ ابواب جو قابلیتوں اور استعداد کی پیمائش کا ذکر کرتے ہیں یا وہ ابواب جو ایک شخص کو دوسرے سے ممیز کرتے ہیں۔

مہارت (Achievement) اور قابلیت (Ability) : انگریزی میں Ability کا لفظ اور اردو میں اس کا مترادف قابلیت، ابہام سے خالی نہیں۔ انگریزی میں اس سے مراد یا تو مہارت لی جاتی ہے یا استعداد (Capacity)۔ مہارت کے معنی میں Ability سے مراد یہ ہوگی کہ فرد کی حاصل شدہ اور موجودہ قابلیت کیا ہے یعنی وہ اس وقت

کیا کچھ کر سکتا ہے ۔ استعداد سے مراد موجودہ قابلیت نہیں بلکہ وہ قابلیت جو انسان میں بالقوہ موجود ہے اور جسے پریکٹس یا پختگی سے بالفعل بنایا جا سکتا ہے ۔ مثلاً ہر پاکستانی بچہ فرانسیسی زبان سیکھ سکتا ہے گو وہ اس وقت فرانسیسی میں بات چیت یا لکھت پڑھت نہ بھی کرے ۔ فرانسیسی بولنے کی استعداد تو ہر پاکستانی بچے میں موجود ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ آیا وہ یہ زبان بول بھی سکتا ہے یا نہیں ۔ فرانسیسی بولنا مہارت ہو گی جو کسی بچے کو حاصل ہو سکتی ہے کسی کو نہیں ۔ لیکن فرانسیسی بولنے کی استعداد ہر بچے میں موجود ہوگی ۔

اس ابہام سے بچنے کے لیے ہمیں دو الفاظ استعمال کرنے ہوں گے ۔ بالفعل قابلیت کو مہارت کہا جائے گا اور بالقوہ قابلیت کو استعداد ۔ یاد رہے کہ کسی آدمی کی استعداد اس کی مہارت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے ۔ مثال کے طور پر آپ اپنے آپ کو لیں ۔ جس قدر علم آپ کو اس وقت حاصل ہے وہ آپ کی مہارت ہے اس علم کو کوشش اور محنت سے بڑھایا جا سکتا ہے ۔ جن لوگوں نے علم کے میدان میں ناموری حاصل کی ہے ۔ انھوں نے اپنی استعداد کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا ۔ جس اونچے سے اونچے مقام تک کوشش اور مہارت سے استعداد کو ترقی دی جا سکتی ہے وہ استعداد کا بالا ترین مقام ہوگا ۔ ظاہر ہے کہ بہت کم لوگ اس مقام پر پہنچتے ہیں ۔ اکثر لوگ تو تھوڑی بہت محنت کے بعد تھک کر بیٹھ جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی استعداد کی انتہا تک پہنچ گئے ۔ لیکن حقیقت میں ایسا ہوتا نہیں ۔ ہاں اگر آپ نے انتہا درجہ کی کوشش کر لی ہو اور اپنی استعداد سے کماحقہ فائدہ اٹھا لیا ہو تو اس سے آگے نہیں بڑھ سکیں گے ۔ جیسے قابلیتوں کے لحاظ سے ہر شخص مختلف ہے ویسے ہی استعداد کے لحاظ سے بھی اختلافات موجود ہیں ۔ باوجود رات دن ورزش کے ایک عام جسم

والا آدمی رستم نہ بن سکے گا اور نہ ہی معمولی سمجھ والا انسان بہترین تعلیم اور کتب خانہ کے باوجود افلاطون جیسا فلسفی بن سکے گا۔

یوں تو ہر انسان میں مختلف قسم کی استعدادیں موجود ہیں لیکن ان استعدادوں کو ناپنا ممکن نہیں۔ کوشش اور محنت سے ہر طالب علم زیادہ سے زیادہ ریاضی، سائنس یا لسانیات سیکھ سکتا ہے لیکن اگر یہ پوچھا جائے کہ ایک طالب علم میں ریاضی کے لیے کس قدر استعداد موجود ہے تو اسے صحیح طور پر یعنی ریاضیاتی طور پر بتانا ممکن نہ ہوگا۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو عملی زندگی بڑی آسان ہو جاتی۔ ہم ہر ایک بچے کو کہہ سکتے کہ تم میں فلاں مضمون کے لیے اس قدر استعداد ہے ابھی تم اس مقام پر پہنچے ہو آگے بڑھنے کی اتنی گنجائش موجود ہے۔ لہٰذا ماہرین نفسیات نے مہارتوں کی پیمائش کے لیے تو کئی آزمائشیں (Tests) تجویز کی ہیں لیکن استعداد کو بلاواسطہ ناپنے کے لیے کوئی نہیں۔ البتہ مہارتوں کی آزمائشوں سے استعداد کا بالواسطہ تعین ہو سکتا ہے۔

مہارتوں کی آزمائش (Achievement Test):

ہر مہارت کی آزمائش کارکردگی سے کی جاتی ہے۔ اس امر کے لیے ضروری ہے کہ کارکردگی کو صحیح طریقہ سے ناپا جائے اور زیر تجربہ فرد انتہائی کوشش سے کام لے۔ 'کارکردگی' کا لفظ مبہم سا ہے، اسے سائنسی بنانے کے لیے مختلف معیاری کام لیے جاتے ہیں جنھیں معیاری حالات میں ادا کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً اگر ٹائپسٹ کی مہارت کو ناپنا ہو تو اسے مقررہ وقت میں کچھ ٹائپ کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ اسی سے اس کی قوت رفتار (Speed) اور صحت (Accuracy) کے متعلق اندازہ ہوتا ہے۔ یا اگر کار ڈرائیونگ کے متعلق کسی کو لائسنس دینا ہو تو اسے کار چلانے کے لیے کہا جاتا ہے۔ راستے میں موڑ آتے ہیں، کار کو موڑنا ہوتا ہے۔ یا راستے میں اونچائی آتی ہے تو کار کا مناسب گیئر بدلنا

ہوگا یا اگر منزل مقصود آ گئی ہے تو کار کو ایک طرف پارک کرنا ہوگا ۔ اس آزمائش کی تمام مدات (Items) معیار کے مطابق ہونی چاہیے ۔ یعنی ان کی نوعیت اس قسم کی ہونی چاہیے کہ اگر کسی شخص کو ان میں کامیابی ہو جائے تو اس شخص کو کار کا لائسنس بلا خوف و خطر دیا جا سکے ۔ یہ آزمائشیں نہ تو ضرورت سے زیادہ مشکل اور نہ ہی ضرورت سے زیادہ آسان ہونی چاہییں ۔ علاوہ ازیں یہ آزمائشیں اس قابل ہونی چاہییں کہ جو چیز وہ ناپنا چاہتی ہیں ناپ سکیں ۔ لہٰذا آزمائشیں بنانا آسان کام نہیں ۔ اس کے لیے خاص قابلیت اور تربیت درکار ہے ۔ آزمائش بنانے کے بعد ہر مد کا امتحان لیا جاتا ہے اور جو مدات اعلیٰ اور ادنیٰ کارکردگی میں تمیز نہ کر سکیں انہیں آزمائش سے خارج کر دیا جاتا ہے ۔ اگر کہیں ابہام رہ گیا ہو تو اسے دور کیا جاتا ہے ۔ اس کے علاوہ ہر آزمائش کے لیے وقت متعین کیا جاتا ہے تشریح طلب امور کی تشریح کی جاتی ہے اور اس تشریح کے لیے بھی وقت مقرر کیا جاتا ہے ۔

آزمائشیں کئی طرح کی ہیں ۔ مثلاً تعلیمی مہارتوں کی آزمائش میں طلبہ کے موجودہ حاصل کردہ علم کا اندازہ کیا جاتا ہے یعنی کسی طالب علم نے ریاضی یا سائنس یا واقفیت‌عامہ یا کسی اور مضمون میں کیا مقام حاصل کیا ہے۔ قوت رفتار کی آزمائشوں میں آسان کام دیے جا سکتے ہیں اور مشکل بھی ۔ منشا یہ ہوتا ہے کہ زیر تجربہ فرد کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ وہ کس سرعت سے کوئی کام سر انجام دیتا ہے اور کس صحت کے ساتھ ۔ صحت کی آزمائشوں (Accuracy Tests) مثلاً نشانہ لگانے میں یا چلتی گاڑی کی رفتار کا اندازہ کرنے میں یا ایک لکیر کو بغیر فٹ رول کے دو یا تین برابر حصوں میں تقسیم کرنے میں غلطی کی پیمائش ہو سکتی ہے ۔ مشکلات کی آزمائشوں (Difficulty Tests) میں کچھ مدات تو بالکل آسان ہوتی ہیں کچھ نہایت مشکل ۔ یہ آزمائشیں

آسان مدات سے شروع ہو کر بتدریج مشکل ہوتی جاتی ہیں ۔ آسان مدات تو ہر کوئی کر لیتا ہے ۔ لیکن مشکل کوئی کوئی ۔ ان آزمائشوں کا مقصد یہ جانچنا ہے کہ کوئی شخص کتنا مشکل کام کر سکتا ہے ۔ فرض کیا آپ سے الفاظ کے مترادفات یا اضداد پوچھے جائیں ۔ شروع شروع میں ایسے الفاظ آئیں گے جن کے ہم معنی یا الٹ الفاظ آپ جھٹ پٹ بتا دیں گے ۔ بعد میں ایسے الفاظ آئیں گے جو مشکل ہوں گے اور جن کے مترادفات یا اضداد آسانی سے نہیں بتائے جا سکیں گے ۔

صلاحیتوں کی آزمائشیں (Aptitude Tests) :

ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں کہ استعداد کو ناپنے کی آزمائشیں تیار نہیں ہو سکیں ۔ کیونکہ استعداد بالقوہ قابلیت ہے نہ کہ بالفعل ۔ اگر کوئی ایسا طریقہ نکل آئے کہ ہم انہیں صحیح طور پر دریافت کر سکیں اور ناپ سکیں تو بیشمار روپیہ اور وقت بچ سکتا ہے ۔ کئی لوگ ہوا بازی کی تربیت حاصل کرنے میں وقت اور روپیہ خرچ کرتے ہیں ۔ بعد میں پتہ چلتا ہے کہ ان میں اس پیشے کی صلاحیت موجود نہ تھی اور جو روپیہ اور وقت صرف ہوا ہے ، وہ ضائع چلا گیا ۔ اس طرح کئی لڑکے اور لڑکیاں کالج میں داخلہ لے لیتے ہیں اور آئے سال فیل ہوتے ہیں ظاہر ہے کہ ان میں اعلیٰ تعلیم کی صلاحیت موجود نہیں ہوتی ۔ یہی حال دیگر پیشوں کا ہے ۔ لوگ انہیں اختیار کر لیتے ہیں ۔ جب پے در پے ناکامی ہوتی ہے تو انہیں پتہ چلتا ہے کہ جو پیشہ انہوں نے اختیار کیا ہے وہ اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا ۔ ہمارے ملک میں چونکہ پیشوں کی تعداد محدود ہے اور صلاحیتوں کی آزمائش نہیں کی جاتی ، بیشمار ایسے لوگ دفتروں ، یونیورسٹیوں اور کارخانوں میں بھرتی ہو جاتے ہیں جو ان کاموں کے اہل نہیں ہوتے ۔ وہ خود بھی ناخوش رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی ناخوش رکھتے ہیں ۔

استعداد کی آزمائش تو نہیں ہو سکتی ۔ البتہ صلاحیتوں کو ناپا

جا سکتا ہے ۔ اس ناپ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مستقبل میں فلاں شخص سے فلاں شعبے میں کسی کامیابی کی توقع کی جا سکتی ہے ۔ اس آزمائش میں موجودہ مہارت کو جانچا جاتا ہے اور اس کی بنا پر پیشگوئی کی جاتی ہے کہ آئندہ اس ضمن میں کیا امید کرنی چاہیے ۔ مثلاً داخلے کے وقت بچوں کی صلاحیت کی آزمائش ہو سکتی ہے اور ان کی موجودہ کارکردگی کی بنا پر مستقبل میں ان کی کارکردگی کے متعلق اندازہ ہو سکتا ہے ۔

اوپر والے بیان سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ ان آزمائشوں سے جو پیشگوئیاں کی جاتی ہیں وہ سو فی صد صحیح ہوتی ہیں ۔ بعض بچے جن میں واقعی صلاحیت ہوتی ہے ۔ آزمائش دیتے وقت خائف ہو جاتے ہیں یا خود شعوری کا شکار بن جاتے ہیں لہٰذا آزمائش میں کم نمبر پاتے ہیں یا فیل ہو جاتے ہیں ۔ اگرچہ بعض ذہین بچوں میں زیر آزمائش فن کی کوئی صلاحیت نہیں ہوتی لیکن پھر بھی وہ اچھے نمبر حاصل کر لیتے ہیں ۔ اس کی وجہ ان کی ذہانت ، یادداشت اور کام کرنے کا ڈھنگ ہے نہ کہ صلاحیت ۔ لہٰذا صلاحیتوں کی آزمائش میں جو نمبر پائے جائیں اور جو مقام حاصل کیا جائے اسے حرف آخر نہیں سمجھ لینا چاہیے ۔ مہارتوں کا ناپنا کئی درجے آسان ہے بہ نسبت صلاحیتوں کے ناپنے کے ۔

کچا شمار اور بامعنی شمار (Raw scores and Meaningful scores):

جب کسی شخص کو آزمائش دی جاتی ہے تو اسے نمبر ملتے ہیں خواہ تھوڑے ہوں یا زیادہ ۔ جیسے کوئی طالب علم یونیورسٹی کا امتحان دیتا ہے ۔ اس کے پرچے دیکھے جاتے ہیں اور نمبر دیے جاتے ہیں ۔ یہ نمبر کچا شمار کہلائے گا ۔ اس کچے شمار سے فرد کے متعلق کچھ پتہ نہیں چلتا ۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے امتحان دیا اور نمبر پائے لیکن ان نمبروں سے نتیجہ اخذ کرنے یا انہیں بامعنی بنانے کے دو طریقے ہیں ۔

۱۔ ان نمبروں کا کسی قطعی معیار کے ساتھ مقابلہ کیا جائے

اور معلوم کیا جائے کہ اس معیار کے مقابلے میں اس کچے شمار کا کیا مقام ہے - مثلاً اگر یونیورسٹی میں پاس ہونے کے لیے ۳۳ فی صد نمبر درکار ہوں تو کسی طالب علم کے نمبروں کا فی صد نکال کر دیکھ لیا جائے کہ آیا ۳۳ فی صد ہیں یا نہیں اگر ۳۳ فی صد یا اس سے زیادہ نمبر ہوں تو وہ طالب علم پاس ہوگا وگرنہ فیل - دفتروں میں جب کارکنوں کو بھرتی کیا جاتا ہے تو ٹائپ اور شارٹ ہینڈ کے متعلق کچھ معیار بنا لیا جاتا ہے یعنی ٹائپ اور شارٹ ہینڈ کی ایک منٹ میں کیا رفتار ہونی چاہیے، جو اشخاص اس معیار پر پورے اترتے ہیں انہیں رکھ لیا جاتا ہے - باقی کو جواب مل جاتا ہے - یاد رہے کہ یہ معیار اٹل نہیں ہوتا - یونیورسٹی میں پاس ہونے کے فی صد نمبر گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں - دفتروں میں بھی ٹائپ اور شارٹ ہینڈ کے متعلق رفتار اور صحت کی شرائط تبدیل ہوتی رہتی ہیں لیکن جب تک ایک معیار قائم ہے اسی کی مدد سے کچے شمار کو با معنی شمار بنا لیا جاتا ہے -

۲- عموماً کسی شخص کے کچے شمار کو با معنی شمار بنانے کے لیے اس کا مقابلہ دوسرے افراد کے شمار سے کیا جاتا ہے - مثلاً اگر دوڑ میں شریک ہونے والے اشخاص کی تعداد بیس ہو تو ہر شخص کا مقام ایک دوسرے کے مقابلے میں متعین ہو سکتا ہے کوئی ان میں اول ہوگا کوئی دوم اور کوئی سوم - اسی طرح بیس تک ہر دوڑ میں شریک ہونے والا اپنا مقام دیکھ لے گا - مقابلے کے امتحانات میں بھی ہوتا ہے - ہر امیدوار اپنا مقام دوسرے امیدواروں کے مقابلے میں حاصل کرتا ہے - ان کی تقرری خالی آسامیوں کی بنا پر ہوتی ہے - جتنی جگہیں پر کرنی ہوتی ہیں اتنے اوپر والے امیدوار چن لیے جاتے ہیں -

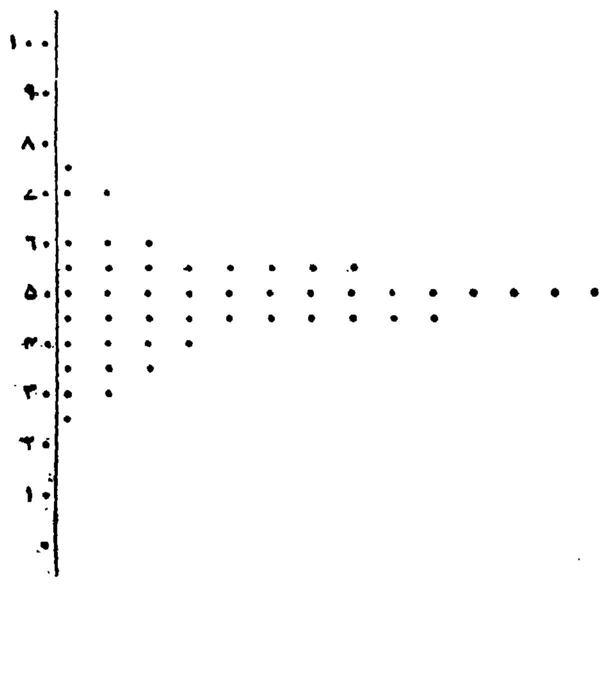
پس کچے شمار کو با معنی بنانے کے لیے یا تو اس کا مقابلہ کسی معیار سے ہونا چاہیے یا اس آزمائش میں شرکت کرنے والے اصحاب کے شمار کو دیکھ کر کرنا چاہیے - اس شمار کو ترتیب دینے کے بعد اس

کچہ شمار کا مقام دریافت کیا جا سکتا ہے۔

دوسرے طریقے کے متعلق کئی ایک دلچسپ امور ہیں جن کا ذکر
سروری ہے :

ہارات کی درجہ بندی (Distribution of Scores):

انفرادی اختلافات کا بہترین نقشہ شمارات کی درجہ بندی سے حاصل
ِتا ہے - ان شمارات کا گراف بنایا جاتا ہے اور گراف ایک گھنٹی جیسی
کل میں ظاہر ہوتا ہے۔ درمیان میں ابھرا ہوا۔ اطراف کی طرف جھکا ہوا۔
ض کیا ایک جماعت میں اکاون لڑکے ہیں - پندرہ تو ۱۰۰ میں سے ۵۰
ر لیتے ہیں، دس ۴۵، آٹھ ۵۵، پانچ ۶۰، چار ۴۰، دو ۷۰، تین ۳۵،
ے ۶۵، دو ۳۰ اور ایک ۲۵، اس نتیجہ کو مندرجہ ذیل شکل میں
ہر کر سکتے ہیں :



اس گراف سے جسے خط منحنی بھی کہا جاتا ہے مندرجہ ذیل امور
نکشف ہوں گے :

۱۔ اگر مختلف اشخاص کو آزمائش دی جائے تو ان لوگوں کے
ہارات ایک بعد میں ظاہر ہو سکتے ہیں ۔ اس بعد کی نچلی اور اوپر والی
ہد ہوگی ۔ تمام اشخاص ان دونوں حدود کے درمیان سما جائیں گے ۔
ندرجہ بالا مثال میں اوپر والی حد ۷۵ ہے اور نچلی ۲۵ ۔ تمام اشخاص
نے شمار کے لحاظ سے حدود میں اپنا مقام حاصل کریں گے ۔

۲۔ سب سے زیادہ لوگوں کی تعداد وسط کے قریب آئے گی ۔ طلبہ کی
کثریت نے پچاس نمبر پائے ۔ یعنی جماعت میں اوسط درجہ کی قابلیت کے
لبہ کثرت سے پائے جاتے تھے ۔ یہی حال دیگر قابلیتوں میں ہے۔ کثرت
میشہ ان لوگوں کی ہوتی ہے جو اوسط درجہ کی قابلیت رکھتے ہیں ۔

۳۔ وسط میں چونکہ اشخاص کی کثرت ہوتی ہے ۔ گراف بناتے وقت
وٹی یہاں دکھائی دے گی ۔ جوں جوں چوٹی سے پرے ہٹتے ہیں، شمارات
، تعداد گھٹتی جاتی ہے ۔ اطراف کی طرف گراف کی لکیر گرتی ہوئی
مین کی طرف آتی ہے ۔ اس طرح گراف کی شکل گھنٹی کی مانند بن جاتی
ہے ۔ یہی عموماً اس کی شکل ہوتی ہے ۔

۴۔ اگر اشخاص کا گروہ نارمل ہو تو اوسط کا فرق ادنیٰ اور اعلیٰ
ہ بہت زیادہ نہیں ہوتا ۔ اوسط سے دونوں جانب گھٹنا اور بڑھنا ایک
ناسب سے ہوتا ہے ۔ بیچ میں تو پہاڑی کی چوٹی ہے، دونوں جانب
ھلوان ہے جو زمین سے ملی ہوئی ہے ۔

درجہ بندی کی پیائش (Measuring a Distribution) :

درجہ بندی بیان کرتے وقت دو چیزوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے ۔
ک تو اس کا مرکز ہوتا ہے اور دوسرے مرکز سے پھیلاؤ (Scatter)۔
مرکز کا تعین آسانی سے ہو سکتا ہے ۔ کیونکہ مرکز اوسط کا دوسرا

نام ہے۔ گراف کی چوٹی مرکز کو ظاہر کرتی ہے، پھیلاؤ معلوم کرنے کے لیے یہ دیکھا جاتا ہے کہ ہر شخص اوسط سے کتنا انحراف کرتا ہے۔ مثلاً اوپر والے گراف میں اول لڑکا ۲۵ نمبروں سے انحراف کرتا ہے دوم ۲۰ سے وغیرہ وغیرہ۔ جب ان تمام انحرافات کو جمع کرکے اوسط نکال لی جائے تو معیاری انحراف (Standard Deviation) حاصل ہو جاتا ہے۔

مرکز اور پھیلاؤ کو ایک اور طریقہ سے بھی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس طریقہ کو فی صد میزانیں (Centiles) کہتے ہیں۔ پچاسواں فی صد نقطہ وسط کہلائے گا اور اس وسط کو مرکز بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کا پھیلاؤ ۲۵ سے لے کر ۷۵ نقطہ تک ہوگا۔

اگر کسی شخص کا شمار اوسط سے اوپر ہے تو + کہا جاتا ہے اور اگر کم ہے تو – کسی فرد کا انحراف اوسط سے نکال کر اسے معیاری انحراف سے تقسیم کریں، تو درجہ بندی میں اس فرد کا صحیح مقام نکل آئے گا۔ فی صد میزانوں میں بھی فرد کے شمار کو رکھا جا سکتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ گروہ میں اس کی کامیابی کتنے فی صد ہوئی ہے۔

ذہانت (Intelligence) :

ذہانت کا لفظ زبان زد عام ہو چکا ہے۔ ہر شعبے میں ذہانت کے پرکھنے پر زور دیا جاتا ہے۔ فوج میں، سول سروس میں، ذہانتی آزمائشوں کو استعمال کیا جاتا ہے اور جو نتائج ان آزمائشوں سے برآمد ہوتے ہیں انہیں قابل اعتبار سمجھا جاتا ہے۔ ملازمتوں میں بھرتی انھی کے بنا پر ہوتی ہے۔ بچوں کے داخلے کا انحصار بھی ان آزمائشوں پر ہے۔ لیکن اس عام مقبولیت کے باوجود ماہرین نفسیات ذہانت کی کوئی ایسی تعریف نہیں پیش کر سکے جو منطقی لحاظ سے جامع اور مانع ہو اور جسے ہر کوئی قبول کرنے کے لیے تیار ہو۔ ٹرمن (Terman) کے مطابق ذہانت تجریدات (abstraction) میں سوچنے کی قابلیت کا نام ہے۔ کولون (Colvin) اسے ماحول

سے مطابقت حاصل کرنے کی قابلیت بناتا ہے ۔ ووڈرو (Woodrow) اسے سیکھنے کی استعداد کہتا ہے ۔ سٹرن (Stern) کے خیال میں یہ ایسی عام قابلیت ہے جو شعوری طور پر ہمارے سوچ بچار کو نئے مسائل اور نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرتی ہے ۔ پیٹرسن (Peterson) اسے حیاتی نظام کہتا ہے جس کی بدولت مہیجات کو منظم کیا جاتا ہے اور مناسب متحدہ رد عمل پیش کیے جاتے ہیں ۔ ووڈورتھ اسے کارکردگی کا طرز کہتا ہے، اس کے خیال میں ذہانت کسی شے کا نام نہیں جو کسی شخص کے پاس زیادہ یا کم ، بلکہ یہ تو کام کرنے کا ڈھنگ ہے ۔ وہ شخص ذہین ہوگا جو سمجھ سے ماحول پر قابو پائے ۔ وہ شخص احمق ہوگا جو احمقانہ طریقہ سے مسائل کا حل ڈھونڈے ۔

لفظ ذہانت کو صاف اور بین کرنے کے لیے ووڈورتھ اسے ان الفاظ سے جدا کرتا ہے جو اس کی مثل نظر آتے ہیں ۔ لیکن درحقیقت مترادف نہیں ۔ مثلاً ذہانت کا عقل (Intellect) کے ساتھ گہرا لگاؤ ہے ۔ عقل کا لفظ مشاہدے، فہم و فراست، سمجھ، یادداشت اور ہر وقوف فعل کے لیے استعمال کیا جاتا ہے ۔ عقل سے علم حاصل ہوتا ہے ۔ ذہانت میں یہ ساری چیزیں شامل ہیں لیکن اس کے علاوہ ذہانت منفعت رساں ملکہ بھی ہے ۔ اس کی بدولت مسائل کو حل کیا جاتا ہے اور منزل تک پہنچا جاتا ہے ، مثلاً خالی گنتی ایک تعقلی فعل ہے ۔ لیکن اگر آپ نے لوگوں کو دعوت پر بلایا ہو اور کرسیاں اس نیت سے گنیں کہ مہمانوں کے لیے کافی بھی ہیں یا نہیں تو یہ ذہانت ہوگی ۔ ذہانت کا مطلب ہے عقل کا استعمال اور اس کا عملی فائدہ ۔

گو ذہانت کا انحصار علم پر ہے ۔ لیکن علم اور ذہانت ایک شے نہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص کے پاس علم تو بے شمار ہے ۔ لیکن وہ اس علم سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا ۔ اس کی مثال ایسے گدھے کی ہے جس کی پیٹھ پر کتابیں لدی ہوں لیکن یہ کتابیں محض بوجھ ہوں گی

ان کا کسی کی ذات کو کچھ فائدہ نہ پہنچے گا۔ جو شخص کتابیں پڑھ لے وہ عالم تو بن جائے گا لیکن جب تک وہ اس علم کو عملی زندگی میں استعمال نہ کر سکے وہ ذہین نہیں کہلائے گا۔ کسی آدمی کو بہترین اوزار دے دیں اور ان کا استعمال بھی سمجھا دیں لیکن جب تک وہ شخص ان اوزاروں کو فائدہ مند طریقے سے استعمال نہ کر سکے گا کسی کی نظر میں بھی ذہین نہ ہوگا۔

ان امتیازات سے ذہانت کی کچھ تشریح ہوتی ہے۔ لیکن صاف طور پر پتہ نہیں چلتا کہ یہ ہے کیا؟ ماہرین نفسیات نے ذہانت کے مختلف پہلوؤں کو اپنی تعریفات میں اجاگر کیا ہے۔ لیکن کوئی ایک تعریف بھی ایسی نہیں جو ذہانت کے ہر پہلو پر حاوی ہو۔ اس لیے بجائے منطقی تعریف ڈھونڈنے کے ذہانت کی آزمائشوں کی طرف آنا چاہیے کہ ان آزمائشوں میں کس چیز کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ ووڈورتھ کہتا ہے کہ ذہانت کی آزمائشوں میں تین چیزیں نمایاں ہیں:

۱۔ اکثر آزمائشیں اس علم کا استعمال چاہتی ہیں جو زیر تجربہ فرد کو ماضی میں حاصل ہو چکا ہو۔ مثلاً اگر الفاظ کے مترادف یا اضداد بتانے ہوں تو گزشتہ تجربے کی مدد کے بغیر یہ سوال حل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح تصویر کشی یا مماثلت ڈھونڈتے وقت گذشتہ علم کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ہاں اگر بھول بھلیاں ہوں یا کوئی مسئلہ بالکل نیا ہو تو گزشتہ تجربات مدد نہ دے سکیں گے۔

۲۔ کئی آزمائشیں اس قسم کی ہیں جو گزشتہ تجربات کا اعادہ نہیں چاہتیں، بلکہ زیر تجربہ فرد کو انوکھے ماحول میں رکھ کر اس کا حل چاہتی ہیں۔ نمبر ایک میں بھول بھلیوں کا ذکر کیا گیا۔ اس میں صحیح راستہ ڈھونڈنا ہوتا ہے۔ یہ ماحول انوکھا اور نرالا سا ہوتا ہے۔ کیونکہ اس جیسے ماحول سے زیر تجربہ فرد کو ماضی میں واسطہ نہیں پڑا ہوتا۔ ایک لحاظ سے اکثر ماحول انوکھے ہوتے ہیں۔ ریاضی کے فارمولے تو

ہر ایک نے سیکھ رکھے ہوتے ہیں لیکن جب ان کا اطلاق مختلف مسائل پر کرنا ہوتا ہے تب ان کا نرالا پن واضح ہو جاتا ہے۔ کالج میں پرنسپل کا کام نظم و نسق برقرار رکھنا ہے۔ جب کبھی لڑکے ہڑتال کر دیتے ہیں، پرنسپل کے لیے نیا مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ پہلی ہڑتال ہو جو پرنسپل کو پیش آئی ہو۔ پرنسپل کی ذہانت کا امر اس سے پتہ چلے گا کہ وہ اس نئے مسئلے کو کس طرح سلجھاتا ہے۔ زندگی میں اکثر مسائل نئے ہوتے ہیں، ذہانت کا پتہ ان سے نبرد آزما ہونے پر ہی چلتا ہے۔

۳۔ اوپر والے بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ ذہانت وظیفہ ہے نئے ماحول اور نئے مسائل کو گزشتہ تجربات سے سمجھنے یا سلجھانے کا۔ لیکن ذہانت کا یہ کام بھی ہے کہ مسائل کو ہر پہلو سے لے اور پوری طرح سے سمجھے۔ مثلاً اگر کسی مسئلہ میں دس پہلو ہوں تو دس پہلوؤں کا حل ڈھونڈا جائے نہ کہ سات آٹھ کا۔ ہڑتال کے وقت اگر پرنسپل بعض اسباب پر قابو پا لے اور بعض کو نظرانداز کر دے تو اس نے مسئلے کو پوری طرح نہیں سلجھایا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نئے ماحول پر کیسے قابو پایا جا سکتا ہے۔ اس سوال کا جواب ووڈورتھ نے سلباً دیا ہے۔ یعنی وہ کون سے اسباب ہیں جو نئے ماحول پر قابو پانے کے مانع ہیں:

(ا) مسئلے کو سمجھا نہ جائے اور مقصد کے لیے کوشش نہ کی جائے۔ مثلاً بچے کو فارم بورڈ دیا جائے لیکن بجائے اس کے کہ وہ بلاکوں کو مناسب سوراخوں میں رکھے وہ ان سے کھیلنا شروع کر دے۔ بعض لوگ ماحول کو نہیں سمجھتے اور ناکام رہتے ہیں۔

(ب) مسئلے کو ٹھیک طرح نہ سمجھا جائے اور صحیح مقصد کے لیے کوشش نہ کی جائے۔ مثلاً ہڑتال کے وقت پرنسپل کچھ باتو

پاؤں تو مارے، لیکن صحیح اسباب کو نہ سمجھ سکے ۔ لہٰ
اس کی تمام کوششیں اکارت چلی جائیں گی ۔

(ج) تمام کے تمام مسئلے کو سمجھا نہ جائے ۔ یعنی مسئلے کو ہر پہلو سے نہ لیا جائے اور اس کی کل وسعت سے واقفیت حاصل نہ کی جائے ۔ مثلاً بھول بھلیوں میں راستہ ڈھونڈتے وقت ہم ایک راستہ تو لے لے ۔ لیکن دور تک نہ دیکھے کہ آیا وہ راستہ بند تو نہیں ہو جاتا ۔ زندگی میں کئی مسائل پیدا ہوتے ہیں ان کا جزوی طور پر حل ڈھونڈا جاتا ہے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مسائل ہمیشہ تنگ کرتے رہتے ہیں ۔

(د) اپنے جوابات کی پڑتال نہ کرنا اور اپنے پہ نکتہ چینی نہ کرنا. مثلاً اگر فقروں کی خالی جگہوں کو پر کرنا ہو تو بعض بچے الفاظ بھرتے جاتے ہیں، لیکن پھر فقرے کو نہیں پڑھتے ۔ اگر وہ فقرے پڑھیں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ آیا ان الفاظ کے بھرنے سے فقرے کا کچھ مطلب بھی نکلتا ہے یا نہیں ۔

ووڈورتھ کہتا ہے کہ جب مندرجہ بالا نقاط کو سامنے رکھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ذہانت والا شعار وہ ہوگا جو مسائل کو صاف اور پوری طرح سے لے، جو گزشتہ تجربات کی بنا پر موجودہ مسائل کے حل ڈھونڈے اور جو کسی حل کو بغیر پڑتال کیے ہوئے قبول نہ کرے ۔ دوسرے الفاظ میں ذہانت ایک عام قابلیت ہے جو تعقلی مسائل کا حل ان کو سمجھنے کے بعد اور گزشتہ تجربات کی بنا پر پیش کرتی ہے ۔

ذہانت کی آزمائشیں (Intelligence Tests) :

ذہانت کی تشریح کرتے وقت ہم نے ذہانت کی آزمائشوں کا ذکر کیا ۔ آج کل آزمائشوں کا چرچا ہر چھوٹے بڑے ادارے میں ہے ۔ پاکستان میں بھی آزمائشوں اور ہدایت کا ادارہ (Bureau of Testing and Guidance)

موجود ہے ۔ اس کا مقصد پاکستانی حالات کے مطابق قابل اعتبار آزمائشوں کی تشکیل و تعمیر ہے ۔

اگر آپ کسی مرض میں مبتلا ہوں تو آپ ڈاکٹر کے پاس تشخیص اور علاج کے لیے جائیں گے ۔ پیشتر اس امر کے کہ ڈاکٹر تشخیص کرے وہ کہے گا کہ خون، بلغم، پیشاب، پاخانے کا ٹسٹ (Test) کرائیں ۔ خون کا دباؤ بھی معلوم کریں ۔ چھاتی کا ایکس رے فوٹو لیں وغیرہ وغیرہ ۔ ان آزمائشوں (Tests) کی بنا پر وہ مرض کی تشخیص کرے گا۔ مرض زیادہ الجھاؤ والا یا مخدوش ہو تو اس کے لیے مزید آزمائشوں کی ضرورت پڑتی ہے ۔ ان آزمائشوں سے ڈاکٹر کا منشا یہ ہوتا ہے کہ مرض کا ٹھیک پتہ لگ جائے۔ اس کے خیال میں اگر خون، بلغم، پیشاب اور پاخانہ خاص نوعیت کا ہو تو فلاں مرض لاحق ہو سکتا ہے ۔ اور چونکہ اس کا خیال تجربات پر مبنی ہوتا ہے اس کی تشخیص قابل اعتبار سمجھی جاتی ہے ۔ یہی حال ذہانت کی آزمائشوں کا ہے ۔ اگر کسی فرد کی ذہانت معلوم کرنی ہو تو اسے مختلف ٹسٹ یعنی آزمائشیں دی جاتی ہیں ۔ ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ اگر خاص قسم کے ٹسٹ پاس کر لیے جائیں تو ذہانت ثابت ہو جاتی ہے ۔ لیکن ان آزمائشوں سے صرف ذہانت کا پتہ نہیں چلتا بلکہ اس کی مقدار کا بھی علم ہو سکتا ہے ۔ جب کوئی آدمی بیمار پڑتا ہے تو جسم کو ہاتھ لگانے سے بخار کا علم ہو جاتا ہے ۔ لیکن ڈاکٹری تھرمامیٹر بخار کی مقدار بتا دیتا ہے ۔ یعنی یہ کہ بخار کتنے درجے کا ہے ۔ اسی طرح ذہانت کی آزمائشوں سے ذہانت کی صحیح مقدار کا اندازہ ہو جاتا ہے ۔

یہ ٹسٹ کیسے شروع ہوئے ؟ یوں تو ذہانت کو پرکھنے کے لیے ہر زمانے میں اور ہر ملک میں کچھ نہ کچھ آزمائشیں رہی ہیں ۔ پہیلیاں اور بجھارتیں تو ہر ملک کے لٹریچر میں پائی جاتی ہیں ۔ پہیلیوں اور بجھارتوں کے حل سے ذہانت کا ثبوت ملتا تھا اور حل کرنے والا انعام و

اکرام بھی پاتا تھا ۔ بعض لوگ تو صحیح حل پیش کرنے پر بادشاہ بن گئے یا شہزادیوں کو بیاہ لیا یا کسی ھیوبھر قبضہ کر بیٹھے یا ملک کو کسی آفت سے چھٹکارا دلا دیا ۔ غرض کہ آپ جن، بھوت، پریوں کے قصے پڑھیے یا رات کے وقت بڑے بوڑھے لوگوں کے پاس بیٹھیے تو طرح طرح کی بجھارتیں جو ایک قسم کے ذہنی پیائش کے سوالات ہوتے ہیں آپ کے علم میں آئیں گی ۔ اگر آپ ٹھیک ٹھیک جواب دیں گے تو واہ واہ ہوگی وگرنہ کچھ ہرجانہ دینا ہوگا ۔

یہ پہیلیاں فہم عامہ (Common-sense) کی طرح غیر سائنسی ، غیر منظم اور بے ربط ہوتی ہیں ۔ ان سے ذہانت کے متعلق قابل اعتبار نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا ۔ اور نہ ان سے ذہانت کی مقدار کا علم ہوتا ہے ۔ ان خامیوں کو دور کرنے کا بیڑا نفسیات نے اٹھایا ۔

سائنسی طریقے پر ذہانتی آزمائشوں کی بنا ۱۹۰۰ع میں پڑی ۔ پیرس کے ایک سکول میں کئی ایک طالب علم تعلیمی لحاظ سے بہت پست تھے ۔ آئے سال فیل ہوتے تھے اور تعلیم سے بہت کم فائدہ اٹھا رہے تھے ۔ کارکنان سکول کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ یہ بچے نالائق اور کند ذہن ہیں یا کام کی طرف دھیان نہیں دیتے اور شرارتوں میں وقت ضائع کرتے ہیں ۔ یہ مسئلہ اس زمانے کے ماہر نفسیات بنے (Binet) کے سپرد کیا گیا ۔ بنے کے ہمعصروں کا خیال تھا کہ اگر بچے فطری طور پر کند ذہن نہ ہوں تو ان کی ذہانت معمول کے مطابق ہونی چاہیے اور اگر ذہانت معمول کے مطابق ہے تو بچے کو مضامین آنے چاہییں ۔ انھیں اس چیز کا علم نہ تھا کہ ذہانت کے کئی درجے ہوتے ہیں اور نہایت ذہین بچے سے لے کر کم سے کم ذہین بچے تک سینکڑوں مدارج ہیں ۔ یہ مدارج مسلسل وار گھٹتے بڑھتے ہیں ۔

چونکہ بنے (Binet) ماہر نفسیات ہونے کی حیثیت سے سائنسی منہاج سے بھی واقف تھا ، اس کی خواہش تھی کہ کوئی ایسا طریقہ تجویز کیا

جائے جو ذہانت کو سائنسی رو سے ناپ سکے اور اس کی صحیح مقدار متعین کر دے۔ اس نے تجربے کرنے شروع کیے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ایک کارکردگی کی بنا پر ذہانت کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ بچے کو کئی کام کرنے کے لیے دے جائیں اور کئی قسم کے مواقع، تاکہ وہ اپنی ذہانت کو ظاہر کر سکے۔ بنے (Binet) کے ساتھ ایک اور نفسیاتی ماہر سائمن (Simon) بھی شامل تھا۔ دونوں نے مل کر ذہنی پیمائش کا طریقہ نکالا جو دونوں کے نام سے موسوم ہے۔ ذہنی پیمائش کی مدات (Items) ایک جیسی آسان یا مشکل نہ تھیں بلکہ آسان سے مشکل اور مشکل سے مشکل تر ہوتی جاتی تھیں۔ اس کی تہہ میں مفروضہ یہ تھا کہ جوں جوں بچے عمر میں بڑھتے ہیں ان کی قابلیتیں ترقی کرتی جاتی ہیں۔ تین سال کے بچے کے لیے سوال آسان تھے، چار سال کے بچے کے لیے ذرا اس سے کم آسان۔ اس طرح جوں جوں زیادہ عمر کے لیے سوالات آتے تھے وہ زیادہ مشکل ہوتے جاتے تھے۔ ہر عمر کے لیے موزوں سوال بنانا کوئی آسان بات نہیں۔ بنے نے سوالات بنا کر بچوں پر آزمائے۔ مثلاً چار سال کے بچوں کے سوالات ہزارہا چار سال کی عمر رکھنے والے بچوں کو دیے۔ جو سوال اس عمر کے لیے مشکل یا آسان نظر آئے انہیں نکال دیا گیا۔ بنے (Binet) سال ہا سال تک اس کام پر لگا رہا اور جب اس کا انتقال ۱۹۱۱ء میں ہوا تو آزمائشوں کا کام ابھی تک ادھورا تھا۔ دوسرے ماہرین نفسیات نے اس کام کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔ بنے (Binet) کی آزمائشوں پر نظر ثانی ہوئی اور بچوں سے لے کر بالغوں تک ان آزمائشوں کا اطلاق ہونے لگا۔

سٹینفورڈ (Standford) نظرثانی میں جو حال ہی میں ہوئی ہے، ماہرین نفسیات نے ابتداء میں ہزاروں مدات لیں اور کوئی ڈیڑھ ہزار بچوں پر انہیں آزمایا، ان میں طفولیت سے لے کر شباب تک کے بچے شامل تھے جو مد بچے یا بالغ کے لیے دلچسپ نہ تھی اسے نکال دیا گیا۔ کیونکہ

بچوں کا تعاون تب ہی حاصل ہو سکتا ہے جب کام ان کی پسند اور دلچسپی کا ہو۔ اس کے علاوہ جو مدات مبہم تھیں یا جن کا جواب خارجی طریقے سے ہاں یا نہ میں نہیں دیا جا سکتا تھا انھیں بھی خارج کر دیا گیا ۔ اس طرح مدات کی تعداد ۴۰۰ رہ گئی ۔ ان مدات کو تین ہزار بچوں پر جن کی عمریں دو سال سے اٹھارہ سال تک تھیں آزمایا گیا ۔ یہ بچے امریکہ کی مختلف ریاستوں سے لیے گئے اور ان کے والدین یا بچے خود مختلف پیشوں سے تعلق رکھتے تھے ۔ علاوہ ازیں کچھ بچے دیہاتی تھے اور کچھ شہری ۔ اس طرح دو آزمائشیں بنیں، ہر ایک میں ۱۲۹ مدات تھیں ، دونوں آزمائشوں پر ایک بچے کا شمار ایک ہی آتا تھا ۔

مندرجہ ذیل مدات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بنے (Binet) اور اس کے بعد آنے والے ماہرین نفسیات نے کس قسم کے مواد سے ذہانت پرکھنے کی کوشش کی ۔ ہر عمر کے لیے عام طور پر چھ مدات تھیں ۔

سطح عمر	مدات کی تفصیل
چار ماہ :	بچے کو سہارا دے کر کمر کی ٹیک سے ۳۰ سیکنڈ بٹھانا ۔
چھ ماہ :	بچے کا کسی سامنے لٹکتی ہوئی چمکیلی چیز کو پکڑنا ۔ یہ چیز اس کی پہنچ میں ہونی چاہیے ۔
بارہ ماہ :	جھنجھنا یا گھنٹی ، جو تجربہ کنندہ بجا رہا ہے ، بچے کا اس کی نقالی کرنا ۔
دو سال :	ٹافی منہ میں ڈالنے سے پہلے ٹافی کا کاغذ اتارنا ۔
ڈھائی سال:	پانچ مانوس کھلونوں میں سے کوئی سے چار کے نام بتانا ۔
تین سال :	دانے پرونا ، دو منٹ میں کم از کم چار دانے پرونا ۔
چھ سال :	چہرے کی تصویروں کی خامیاں بتانا ۔ ان تصویروں میں ناک یا آنکھ غائب ہوتی ہے ۔
نو سال :	لکڑی اور کوئلے کی مماثلت اور فرق بیان کرنا ۔ تجربہ کنندہ چار ایسے جوڑے بتاتا ہے ان کی مشابہت اور فرق

بیان کرنا پڑتا ہے۔

بارہ سال : تصویر جو کسی واقعہ کی عکاسی کر رہی ہو ، اس کی صحیح تشریح کرنا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی عمر کے لیے تو پانچ میں سے چار مدات حل کرنی ہیں اور کہیں چار میں سے چار۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہوگا کہ ماہر نفسیات اپنی مدات کو ہزار ہا بچوں پر آزماتا ہے۔ اور جو قاعدہ اس نے مقرر کیا ہے وہ اس کے اور دوسروں کے تجربے کا نچوڑ ہے۔ اس تجربے کی تہہ میں سائنسی منہاج کار فرما ہے۔

ذہنی عمر اور سنی عمر (Mental Age and Chronological Age):

بچوں کی ذہانت کے سلسلے میں تحقیقات کرتے ہوئے بنے (Binet) نے دنیا کے سامنے ایک نہایت ہی کارآمد تصور پیش کیا۔ وہ تصور ذہنی عمر کا تصور تھا۔ بچے کی ایک عمر تو طبعی ہے جسے برسوں ، مہینوں اور دنوں میں بتایا جا سکتا ہے۔ دوسری اس کی ذہنی عمر ہے جس کی تعیین ذہنی آزمائشوں سے ہو سکتی ہے۔ فرض کیا کہ کوئی بچہ اگست ۱۹۵۵ء میں پیدا ہوا ، اس کی سنی عمر اگست ۱۹۶۲ء میں سات سال ہوگی۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کی ذہنی عمر بھی اس وقت ۷ سال ہی ہو۔ اگر یہ بچہ چھ سال کے بچے کی آزمائشیں حل کر سکتا ہے لیکن سات سال والے بچے کی نہیں، تو اس کی ذہنی عمر چھ سال ہوگی نہ کہ سات سال۔ اور اگر یہ بچہ اپنے سال والی آزمائشیں بھی حل کر سکتا ہے اور آٹھ سال والی بھی۔ تو اس کی ذہنی عمر آٹھ سال ہوگی نہ کہ سات سال۔ اور اگر یہ صرف اپنے سال والی آزمائشیں حل کر سکتا ہے تو اس کی طبعی اور ذہنی عمر ایک ہوگی۔ پس سنی عمر اور ذہنی عمر میں فرق کرنا ہوگا۔ جماعت میں تمام بچوں کی سنی عمر کم و بیش ایک جیسی ہوتی ہے لیکن ان کی ذہنی عمروں میں تفاوت ہوتا ہے۔ جن بچوں کی ذہنی عمر کم ہوگی وہ تعلیم سے استفادہ نہیں کر سکیں گے۔

ذہانتی حاصل قسمت (Intelligence Quotient):

ذہنی اور سنی عمر کے فرق سے ہمیں ایک فارمولا ملتا ہے ۔ جس کا بے شمار عملی فائدہ ہے۔ اس فارمولے کی رو سے ہمیں ذہانت کی صحیح مقدار کا علم ہو جاتا ہے۔ کسی بچے کی ذہنی عمر (Mental Age) کو اس کی اپنی سنی عمر (Chronological Age) سے تقسیم کریں ۔ اور فی صد معلوم کرنے کے لیے ۱۰۰ سے ضرب دے دیں ۔ اگر بچے کی سنی عمر ۸ سال ہے اور ذہنی عمر ۴ سال تو اس کا ذہانتی حاصل قسمت یعنی .I. Q (یہ مخفف ہے Intelligence Quotient کا) مندرجہ ذیل طریقے سے معلوم ہو سکتا ہے :

$$I.Q. = \frac{M.A.}{C.A.} \times 100$$

(.M. A مخفف ہے Mental Age یعنی ذہنی عمر کا اور .C. A مخفف ہے Chronological Age یعنی سنی عمر کا) ۔ مندرجہ بالا بچے کا .I. Q

$\frac{4}{8} \times 100 = 50$ ہوگا

یعنی .I.Q پچاس فی صد ہوگا ۔ حالانکہ اگر اس کی ذہنی عمر طبعی عمر کے برابر ہوتی، جو ہونی چاہیے تھی، تو اس کا .I.Q سو فی صد ہوتا ۔ اس حساب سے یہ بچہ کند ذہن ہوگا ۔ اگر بالفرض اسی بچے کی ذہنی عمر ۹ سال ہوتی تو اس کا .I.Q

$\frac{9}{8} \times 100 = 112.5$ ہوتا

یعنی معمول سے، جوکہ سو فی صد ہے، 12.5 درجہ بڑا ہوا ۔ اس فارمولے سے بچوں کی ذہنی عمر کا محاسبہ ہو سکتا ہے اور ذہانت کی ٹھیک مقدار معلوم ہو سکتی ہے ۔ اس فارمولے کی مدد سے کئی نتائج نکلتے ہیں ۔ ایک تو یہ ہے کہ ذہنی حاصل قسمت کی بدولت بچوں کو مختلف درجوں میں رکھا جا سکتا ہے، ملاحظہ ہو :

ذہنی قسمت	درجہ
۱۴۰ سے زیادہ	فطین (Genius)

ذہنی قسمت	درجہ
۱۲۰ سے ۱۳۰	بہت ہی زیادہ ذہین
۱۱۰ سے ۱۱۹	بہت ذہین
۹۰ سے ۱۰۹	اوسط یا معمولی ذہین
۸۰ سے ۸۹	غبی
۷۰ سے ۷۹	کند ذہن
۶۹ سے نیچے	احمق
۲۵ سے ۴۹	بے وقوف
۲۵ سے نیچے	بدھو

اس چارٹ سے پتہ چلتا ہے کہ ذہنی کمزوری ۶۹ فی‌صد ذہنی حاصل قسمت سے نیچے شروع ہو جاتی ہے اور فطانت ۱۴۰ فی‌صد ذہنی حاصل قسمت سے اوپر -

ذہنی کمزوری (Feeble-Mindedness) :

ذہنی حاصل قسمت کے ذریعے سے ذہنی ضعف ۶۹ سے نیچے شروع ہو جاتا ہے اور صفر تک اس کے تین مدارج ہیں - جن بچوں کا I. Q. ۲۵ سے نیچے ہے، یعنی ۲۵ اور صفر کے درمیان، انھیں بدھو (Idiot) کہا جاتا ہے - یہ لوگ اپنے آپ کو معمولی خطرات سے نہیں بچا سکتے - یہ اپنا ہاتھ آگ میں ڈال لیتے ہیں - گہرے پانی میں کود پڑتے ہیں یا چلتی گاڑی کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں - ہاتھ منہ نہیں دھو سکتے اور نہ ہی کپڑے پہن سکتے ہیں - بعض بدھو تو خود کھانا بھی نہیں کھا سکتے - بول و براز بھی ٹھیک طرح سے نہیں کر سکتے - چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ سے زیادہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتے -

بے وقوفوں (Imbeciles) کا ذہنی حاصل قسمت ۲۵ اور ۴۹ کے درمیان ہے - یہ لوگ عام خطرات سے تو بچاؤ کر لیتے ہیں، کچھ بول بھی لیتے ہیں لیکن پڑھ نہیں سکتے - اور نہ ہی کوئی مفید کام کر سکتے ہیں -

ان میں سے جو ۲۵ کے قریب ذہانت کا درجہ رکھتے ہیں کوئی کام نہیں کر سکتے - جو ذرا اوپر کے درجے میں ہیں وہ دوسروں کی نگرانی میں کچھ کام کر لیتے ہیں اور جن کا درجہ ۴۵ کے قریب ہے وہ خود کپڑے پہن لیتے ہیں - لیکن عام طور پر بے وقوف لوگ کوئی چھوٹا سا کام بھی نگرانی کے بغیر ٹھیک طرح سے نہیں کر سکتے -

احمقوں (Morons) کا ذہنی حاصل قسمت ۵۰ سے ۶۹ تک ہے - یہ لوگ معمولی کام خود بخود کر لیتے ہیں، انہیں نگرانی کی ضرورت نہیں ہوتی - گھروں میں بستر کر لیتے ہیں - سودا سلف لا دیتے ہیں، بچوں کو کھلا لیتے ہیں - لوہار ترکھان کا کام بھی کر لیتے ہیں - یعنی ان کو گھروں میں ملازم رکھا جا سکتا ہے لیکن ان کے ذمہ ضروری کام نہیں دینے چاہییں - چھوٹے چھوٹے سادہ کام سرانجام دے لیں گے - لیکن اہم کام بگاڑ دیں گے - انہیں ملازم رکھتے ہوئے ان کی ذہنی مجبوریوں کو سمجھ لینا چاہیے اور اگر یہ کوئی کام خراب کر دیں تو خفا نہیں ہونا چاہیے - انہیں ہدایت کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے ورنہ یہ روپیہ پیسہ اور اپنی کمائی بیہودہ طور پر صرف کر دیتے ہیں - اپنے فارغ وقت سے کچھ فائدہ نہیں اٹھاتے - احمق لڑکے چوری کرنا سیکھ جاتے ہیں اور احمق لڑکیاں بے حیائی کی جانب رجوع کرتی ہیں - لہٰذا معمولی کاموں میں تو انہیں نگران کی ضرورت نہیں لیکن اہم ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لیے کوئی شفیق رہنما چاہیے -

فطین اور غیر معمولی ذہانت کے لوگ
(Genius and Exceptional Intelligence)

ذہنی لحاظ سے ایک سرے پر تو ضعیف العقل لوگ ہیں، دوسرے سرے پر فطین اور غیرمعمولی ذہانت کے لوگ ہیں - یہ کسی نہ کسی شعبہ میں ضرور غیرمعمولی طور پر کامیاب رہتے ہیں - زندگی کا کوئی شعبہ ہو، اس کا تعلق لٹریچر، موسیقی، مصوری، فلسفہ سائنس یا کھیل سے

ہو، ان لوگوں نے کارہائے نمایاں کیے اور نام پیدا کیا ۔ اگر ان لو
کو ذہنی آزمائش دی جاتی تو یقیناً ان کا شمار (Score) بہت زیادہ ہو
جو مشاہیر ازمنہ گزشتہ میں ہو گزرے ہیں ان کو ذہنی آزمائش
دی جا سکتی ۔ البتہ ان کے کارناموں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ
ذہانت کے مالک ہوں گے ۔ پوپ (Pope) اور ایمرسن (Emerson)
متعلق مشہور ہے کہ ان لوگوں نے دس سال کی عمر میں شعر کہ
ان اشعار کی خوبی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں کی ذہانت
ہوگی ۔ اسی طرح اگر دیگر مشاہیر کی زندگیوں کا مطالعہ کریں تو مع
ہو جائے گا کہ چھوٹی عمر میں انھوں نے کون کون سے معرکے
کیے ۔ ماہرین نفسیات نے چند ایک مشاہیر کی ذہنی حاصل قسمت
اسی طرح متعین کیا ہے ۔ ایمرسن کی ذہنی حاصل قسمت ۱۸۰ کے قر
ہے اور نپولین کی ۱۴۰ کے قریب ۔ لیکن یاد رہے کہ زندگی میں کام
کا دارومدار خالی ذہانت پر نہیں ۔ جن لوگوں نے نام پیدا کیا ہے
یقیناً غیرمعمولی طور پر ذہین تھے ۔ لیکن ذہانت کے علاوہ ان میں کیر
کی خوبیاں بھی تھیں ۔ ان میں استقلال، خود اعتمادی، جوش، امنگ
مقصد سے والہانہ شوق تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ تواریخ کے اوراق
نپولین کا نام ایمرسن سے زیادہ درخشندہ ہے ۔ ہر کامرانی یا ناکامی
جائزہ لیتے وقت ذہانت کی مقدار کے علاوہ کیرکٹر کی خوبیوں کو
مد نظر رکھنا چاہیے ۔

ذہنی حاصل قسمت کا مستقل رہنا (Constancy of I.Q.) :

آپ نے کئی طلبہ دیکھے ہوں گے جو یونیورسٹی کے ہر امتحان
سیکنڈ یا فرسٹ ڈویژن پاتے ہیں ۔ میٹریکولیشن میں ان کی سیکنڈ ڈو
تھی ۔ ایف ۔ اے، بی ۔ اے اور ایم ۔ اے میں بھی یہی رہی ۔ بعض
ہر امتحان میں تھرڈ ڈویژن پاتے ہیں ۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا
کہ ذہانت غیرمتغیر اور غیرمتبدل عنصر ہے ۔ عمر خواہ کچھ ہو،

ذہانت کی مقدار کسی انسان کو عطا ہوئی ہے وہ قائم رہتی ہے ۔ عمر کے ساتھ ذہانت نہیں بدلتی ۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ ذہانت فطری عنصر ہے ، اس کی مقدار بڑھ نہیں سکتی ۔ ذہانت انسانوں کے بالوں یا آنکھوں کی رنگت کی طرح ہے ۔ جیسے ان کا رنگ اکتسابی نہیں بلکہ فطری ہے ویسے ہی ذہانت بھی خداداد عطیہ ہے، اکتسابی نہیں ۔ ذہانت کی مثال قد سے بھی دی جاتی ہے ۔ جتنا کسی کا قد ہو اس سے بڑھانا ممکن نہیں ۔ کوئی پست قد ہوتا ہے کوئی دراز قد، پست قد والا دراز قد نہیں ہو سکتا اور دراز قد والا پست قد نہیں ہو سکتا ۔ قد کی لمبائی فطری عمل ہے ۔ کوشش کے باوجود بھی اس کی لمبائی میں نمایاں فرق نہیں پڑتا ۔ ہاں اگر کسی شخص کو مناسب غذا نہ ملے یا وہ خود ہی باقاعدہ ورزش نہ کرے یا متواتر نامساعد حالات میں زندگی گزارے تو اس کا قد مقررہ حد تک نہیں بڑھے گا ۔ اب اسی شخص کو متوازن غذا دیں ۔ مناسب ورزش کرائیں اور حالات خوشگوار بنا دیں تو قد بڑھ جائے گا ۔ لیکن بڑھے گا اس لیے کہ جو رکاوٹیں اس کے راستے میں تھیں وہ دور ہو چکی ہیں ۔

ذہانت کا بھی یہی حال ہے ۔ اگر بچے کو برے سکول میں داخل کرا دیں جہاں روشنی کا انتظام نہ ہو ۔ بیٹھنے کے لیے چٹائی نہ ہو اور استاد ہر وقت ڈنڈا لیے کھڑا ہو تو بچے کی ذہانت دب جائے گی ۔ جتنا اس کا اظہار ہونا چاہیے نہیں ہوگا ۔ اب اگر اسی بچے کو اچھے سکول میں داخل کرا دیں، جہاں نفسیاتی اصولوں پر تعلیم دی جاتی ہو ، تو بچے کی ذہانت بڑھے گی ، بڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ ذہانت کے اظہار کے راستے میں جو رکاوٹیں تھیں انھیں ہٹا دیا گیا اور ذہانت اب اتنی چمکی ہے جتنا اسے چمکنا چاہیے تھا ۔ پس ذہانت کا اظہار مناسب ماحول کا متقاضی ہے ۔ ماحول کے سدھرنے سے ذہانت اپنی پوری آب و تاب سے چمکے گی ۔ لیکن اس کی چمک اتنی ہوگی جتنی فطری طور پر مقرر ہو چکی ہے ۔

وڈورتھ نے دو لڑکیوں کے کیس بیان کیے ہیں - جن کی ذہانت چھ سال کے عرصہ میں پانچ پانچ دفعہ آزمائش کی گئی - ان کا ذہانتی حاصل قسمت بہت تھوڑا بدلا - پہلی لڑکی کے نتائج حسب ذیل تھے :

آزمائش	سنی عمر	ذہنی عمر	ذہانتی حاصل قسمت
پہلی	۶ سال ۸ ماہ	۵ سال ۶ ماہ	۸۳
دوسری	۷ سال ۱ ماہ	۵ سال ۴ ماہ	۷۵
تیسری	۸ سال ۲ ماہ	۶ سال ۱۰ ماہ	۸۴
چوتھی	۸ سال ۷ ماہ	۷ سال ۱۰ ماہ	۸۲
پانچویں	۱۲ سال ۱۰ ماہ	۹ سال ۱۰ ماہ	۷۷

اس لڑکی کا .I.Q ۸۰ کے لگ بھگ رہتا ہے - بالکل تھوڑا بدلتا ہے - اب دوسری لڑکی کے نتائج دیکھیں :

آزمائش	سنی عمر	ذہنی عمر	ذہانتی حاصل قسمت
پہلی	۸ سال ۰ ماہ	۹ سال ۹ ماہ	۱۲۲
دوسری	۹ سال ۱ ماہ	۱۱ سال ۵ ماہ	۱۲۶
تیسری	۱۰ سال ۰ ماہ	۱۱ سال ۴ ماہ	۱۱۳
چوتھی	۱۰ سال ۱۱ ماہ	۱۱ سال ۷ ماہ	۱۰۵
پانچویں	۱۲ سال ۰ ماہ	۱۳ سال ۶ ماہ	۱۱۳

اس لڑکی کا .I.Q ۱۱۵ کے قریب قریب رہتا ہے - چار پانچ درجے فرق اتفاقیہ سمجھا جاتا ہے - بعض دفعہ بچے کا موڈ (Mood) صحیح نہیں ہوتا وہ کسی دن اچھا کام کرتا ہے کسی دن نسبتاً کم اچھا - اسی طرح ممتحن بھی بعض دن ذرا سخت اور بعض دن ذرا نرم ہوتا ہے لہٰذا تھوڑا سا فرق اگر پڑ جائے تو اس کا خیال نہیں کرنا چاہیے -

حقیقت میں ذہانتی آزمائش ایک قسم کی صلاحیتوں کی آزمائش ہوتی ہے - چونکہ .I.Q یعنی ذہانتی حاصل قسمت بدلتا نہیں - لہٰذا ان آزمائشوں کی بنا پر بچوں کے متعلق جو پیشگوئی کی جاتی ہے وہ قابل اعتبار ہوتی

ہے۔ اگر پانچ سال کی عمر کے بچے کا I.Q. ۱۲۵ ہے تو ۱۰ سال کی عمر میں بھی یہی ہوگا۔ اگر یہ حاصل قسمت ہر سال بدلتا رہے تو کوئی پیشگوئی نہ ہو سکے گی۔ اور ذہانتی آزمائشیں بے کار ثابت ہوں گی۔

بلوغت میں ذہانت (Adult Intelligence):

بچوں کی ذہانت کی پیمائش کرنے کی مختلف آزمائشیں ہر ترقی یافتہ ملک میں موجود ہیں۔ لیکن بالغوں کی ذہانت کے لیے تسلی بخش اور قابل اعتبار آزمائشیں نہیں بنائی گئیں۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو بالغوں کے لیے خاطر خواہ آزمائشیں بنانا آسان کام نہیں۔ دوسرے بالغوں کا نمونہ (Sample) بھی دستیاب نہیں ہوتا۔

پہلی مشکل کو لیجیے۔ بالغوں نے مختلف اقسام کی مہارتیں حاصل کی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان سب کے لیے ایسی آزمائشیں بنانا جو نہ آسان ہوں نہ مشکل اور ہر ایک کے ساتھ ایک جیسا پورا پورا انصاف بھی کریں، بہت مشکل ہے۔ کوئی بالغ قانون میں، کوئی انجینئرنگ میں، کوئی طب میں مہارت رکھتا ہے۔ ان مضامین کے لیے یقیناً مشکل آزمائشیں بن سکتی ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آیا یہ آزمائشیں سب کے ساتھ ایک جیسا انصاف بھی کریں گی؟ اس مشکل کے پیش نظر ماہرین نفسیات نے بالغوں کے لیے بھی وہی مدات (Items) لی ہیں جو بچوں کے لیے لی جاتی ہیں۔ البتہ یہ مشکل ضرور ہوتی ہیں۔

اب دوسری مشکل کو لیجیے۔ بچے جب سکول میں پڑھ رہے ہوں ان کا سیمپل لیا جا سکتا ہے۔ جب سکول چھوڑ جائیں تو سیمپل محال ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر ۲۱ سال کے لڑکوں یا لڑکیوں کے سیمپل لینے ہوں تو یہ کس بنیاد پر لیے جائیں گے۔

جنگ کے دنوں میں امریکہ نے ریکروٹ بھرتی کرنے کے لیے ۲۰ اور ۳۰ سال کے جوان لیے اور انھیں الفا اور بیٹا ٹیسٹ (Alpha and Beta Tests) دیا۔ ان لوگوں کی ذہنی عمر ۱۳ سال نکلی۔ اس سے

نتیجہ یہ نکالا گیا کہ ذہانت کی ترقی ۱۳ سال تک ہوتی رہتی ہے - بعد میں نہیں ہوتی -

یہ نتیجہ بڑا حوصلہ شکن ہے - اس کا دوبارہ محاسبہ کیا گیا - سٹینفورڈ بنے ٹسٹ (Stanford Binet Test) میں ۱۸ سال کی عمر تک کے بچوں کے سیمپل لیے گئے اور آزمائشوں کی مدات کو ایسے تبدیل کیا گیا کہ ۱۸ سال کا بچہ بھی اپنی ذہانت کے جوہر دکھا سکے - اس طرح سے اوسط شمار ۱۳ سال سے بڑھ کر ۱۵ تک پہنچ گیا - جس کا مطلب یہ ہوا کہ ذہانت کی تکمیل پندرہ سال میں ہوتی ہے، بعد میں اس کا بڑھنا محال ہے - ووڈورتھ کا کہنا ہے کہ بعض آزمائشوں میں ذہانت کی ترقی ۱۸ سال تک ثابت ہوتی ہے -

ان تجربات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ ذہانت ۱۵ سے ۱۸ سال کی عمر میں معراج تک پہنچتی ہے - اس امر کی وضاحت کے لیے دوبارہ انسانی قد کی مثال دی جا سکتی ہے - انسان کا قد بیس بائیس سال کی عمر تک بڑھتا ہے، بعد میں بڑھنا ختم ہو جاتا ہے - بعینہ اسی طرح ذہانت زیادہ سے زیادہ اٹھارہ سال کی عمر تک بڑھتی ہے، بعد میں نہیں بڑھتی - اور یہ ایک لحاظ سے بہت اچھی چیز ہے - ذہانت کی تکمیل چونکہ بلوغت میں ہو جاتی ہے اس لیے ہر شخص اپنی بساط کے مطابق پوری آب و تاب سے نئے خیالات حاصل کر سکتا ہے - نئے مسائل سے نپٹ سکتا ہے اور نئے ہنر اور فن سیکھ سکتا ہے - عمر کے ساتھ ذہانت تو نہیں بڑھے گی البتہ علم اور تجربہ بڑھے گا - اس علم اور تجربے کی وجہ سے زیادہ عمر والا شخص، تھوڑی عمر والے شخص کے مقابلے میں دنیا اور اس کے مسائل سے بہتر طریقے سے نبرد آزما ہو سکے گا - اگرچہ بڑی عمر والے شخص کی ذہانت وہی رہی جو اٹھارہ برس کی عمر میں تھی - فرق علم اور تجربہ کی وجہ سے پڑا -

دیہاتی اور شہری ذہانت (Urban and Rural Intelligence) :

عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ذہانت میں شہری لوگ دیہاتیوں سے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں - امریکہ میں جو تجربات اس ضمن میں ہوئے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہروں کا I.Q. تو اوسط ۱۰۰ فی صد ہوتا ہے لیکن دیہاتیوں کا ۹۰ سے ۹۵ تک - اس فرق کو مندرجہ ذیل طریقے سے سمجھا جاتا ہے -

۱- یہ فرق ورثہ کی بدولت بھی ہو سکتا ہے - کیونکہ اچھے اچھے لوگ ملازمتوں کی تلاش میں شہروں میں آن بستے ہیں - پاکستان میں بھی شہروں کی طرف رجوع ہے - روزگار کی تلاش میں لوگ دیہاتوں کو چھوڑ کر شہروں میں آباد ہو رہے ہیں - اس کے علاوہ شہروں میں ترقی کے ایسے مواقع دستیاب ہوتے ہیں جو دیہاتوں میں نصیب نہیں ہوتے جب اعلیٰ دماغ والے لوگ دیہاتوں کو چھوڑ کر شہروں میں آن بسیں گے تو ان کے بچے شہروں میں پیدا ہوں گے اور ورثہ میں دیہاتیوں کی نسبت ذرا بہتر دماغ پائیں گے - نتیجہ یہ ہوگا کہ شہریوں کا اوسط I.Q. دیہاتیوں کے مقابلہ میں بہتر ہوگا -

۲- شہروں میں دیہاتوں کی نسبت ماحول بھی بہتر ہوتا ہے - کالج اور سکول بدرجہا بہتر ہوتے ہیں - ہسپتال جدید آلات سے آراستہ ہوتے ہیں اور زندگی کی سہولتیں، جو موجودہ سائنس نے پیدا کی ہیں، وہ شہروں میں ملتی ہیں - لہٰذا اس ماحول میں ذہانت چمکتی ہے اور پوری آب و تاب سے ظاہر ہوتی ہے اگر دیہات کو بہتر بنا دیا جائے اور ان کا ماحول بھی شہروں جیسا روح پرور اور خیال افروز بن جائے تو دیہات میں بھی اچھے اچھے لوگ رہنے لگ جائیں گے اور دیہاتی اور شہری بچوں کا ذہانتی فرق ختم ہو جائے گا -

۳- ذہانتی آزمائشیں عموماً شہری لوگ بناتے ہیں - بڑی بڑی یونیورسٹیاں جہاں ماہرین نفسیات بیٹھ کر آزمائشیں وضع کرتے ہیں

شہروں میں پائی جاتی ہیں ۔ لہٰذا ان آزمائشوں کا جھکاؤ شہری کلچر کی طرف ہوتا ہے ۔ دیہاتیوں کو اس جھکاؤ کی وجہ سے بھی کچھ نقصان رہتا ہے ۔

ملک کی تقسیم سے پہلے بڑے بڑے سیاست دان، ڈاکٹر، انجینئر، پروفیسر اور حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز لوگ دیہاتوں سے آتے تھے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دیہاتی بچے کا دماغ بھی ویسا ہوشیار اور روشن ہوتا ہے جتنا شہری بچے کا ۔ لہٰذا ذہانتی آزمائشیں بناتے وقت اس چیز کا خیال رکھنا چاہیے کہ مدات (Items) ایسی ہوں جو شہری اور دیہاتی بچوں کو ایک جیسا فائدہ پہنچائیں ۔ ووڈورتھ کا خیال ہے کہ ایسی آزمائش بنانا گو محال تو نہیں لیکن مشکل ضرور ہے ۔

نسلی ذہانت (Race Intelligence) :

ہٹلر کے زمانے میں جرمن قوم کا خیال تھا کہ وہ دیگر اقوام سے اعلیٰ و ارفع ہے ۔ لہٰذا اسے تمام دنیا پر حکومت کرنی چاہیے اور اپنے نسلی جوہر کی حفاظت کرنی چاہیے ۔ یورپی قومیں بھی، جن میں انگریز، پرتگالی اور ولندیزی شامل ہیں ، اس وہم کی شکار تھیں ۔ وہ خیال کرتی تھیں کہ ان کے کندھوں پر کالے لوگوں کو مہذب بنانے کی خاص ذمےداری آن پڑی ہے ۔ اس ذمےداری کو انگریزی میں Whiteman's burden کہتے تھے ۔ ہندوستان میں جہاں ذات پات کی تمیز منو کے وقت سے، بلکہ اس سے بھی پہلے سے آ رہی ہے ، برہمن سمجھتے تھے کہ نسلی اعتبار سے وہ شودروں سے بدرجہا فائق ہیں ۔ امریکہ میں حبشیوں کو نیچ سمجھا جاتا ہے اور ان سے ملنا جلنا کسر شان خیال کیا جاتا ہے ۔ مسلمانوں میں بعض سید لوگ بھی اپنے آپ کو دوسروں سے ممتاز سمجھتے تھے ۔

سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ نسلی برتری کے دعوے تعصبات اور توہمات سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے ۔ نسلی برتری سے مراد یہ ہوتی

چاہیے کہ ساری کی ساری نسل میں بہتر جواہر تخلیق (Gene) پائے جاتے ہیں - لیکن چونکہ اس دعوے کا سائنسی ثبوت نہیں مل سکتا ، اس لیے نسلی برتری سے مراد کلچرل برتری لی جاتی ہے - یہ سچ ہے کہ جو قوم بہتر لٹریچر، سائنس، فلسفہ، مصوری اور بت تراشی پیدا کرے گی، اس کے تہذیب و تمدن بھی بہتر ہوں گے - موجودہ علم الانسان (Anthropology) نے نسلی برتری کے واہمہ کو پاش پاش کر دیا ہے - ہر کلچر اپنے حالات کی عکاسی کرتا ہے اور اتنا ہی اچھا یا برا ہوگا جتنا کوئی اور - اگر اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو بہت سی لڑائیاں بھڑائیاں ختم ہو جائیں گی اور کوئی قوم نسلی برتری کے زعم میں دوسروں پر حملہ آور نہیں ہوگی -

آئیے ذہانتی آزمائشوں کو لیں، کیا وہ نسلی برتری کو ثابت کرتی ہیں ؟ نسلی آزمائشوں کے سلسلہ میں دو مشکلات ہیں :

۱- ایسی آزمائشیں بنانا جو مختلف کلچروں سے یکساں انصاف کریں یا جو کلچر سے بالکل آزاد ہوں، قریب قریب ناممکن ہے -

۲- مختلف کلچروں سے ایک جیسے نمونے (Samples) لینا بھی کارے دارد والا معاملہ ہے -

امریکہ میں حبشیوں اور سفید رنگ کے باشندوں پر تجربے ہوئے - اگر حبشیوں کو ویسی ہی تعلیم دلائی جائے جو سفید لوگوں کو ملتی ہے - یعنی ان کے لیے سکول اور کالج ویسے ہی اچھے ہوں جیسے سفید لوگوں کے لیے ہوتے ہیں تو حبشیوں کا .I.Q دوسروں سے کم نہیں ہوتا۔ ووڈورتھ کا کہنا ہے کہ :

۱- اگرچہ نسلوں میں ذہانت کا فرق ہے لیکن وہ اس قدر نہیں جتنا کہ خیال کیا جاتا ہے -

۲- اگرچہ نسلوں کی اوسط ذہانت ایک نہیں ، کسی کی زیادہ کسی کی کم ہے - لیکن افراد اس اصول سے مستثنیٰ ہیں - کئی حبشیوں

کا .I.Q امریکیوں کے اوسط .I.Q سے زیادہ ہوتا ہے -

ذہانت میں جنسی بنا پر اختلاف (Sex Differences) :

اس سلسلے میں جو تحقیق ہوئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ مردوں اور عورتوں کی ذہانت میں بہت کم فرق ہے - ماضی میں کئی نامور عورتیں گزری ہیں - مثلاً نور جہاں کا نام حکمرانوں کی فہرست میں اول نمبر پر آئے گا - کئی عورتیں شاعر ہو گزری ہیں - امریکہ اور یورپ میں کئی عورتوں کے نام لٹریچر اور حکمرانی کے میدان میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں - وکٹوریہ اور رضیہ سلطانہ کا نام تو ہر طالب علم نے سن رکھا ہے - مشرق لٹریچر میں کئی عورتیں نثر اور نظم میں مردوں کے دوش بدوش نظر آتی ہیں - سائنس کے میدان میں عورتوں کا شمار کم ہے اس کی شاید یہ وجہ ہو کہ عورتوں کو لٹریچر سے قدرتی لگاؤ ہوتا ہے اور سائنس کے ساتھ نہیں ہوتا -

ذہانتی آزمائشوں میں لڑکے اور لڑکیاں ایک جیسے نمبر پاتے ہیں - ان کا اوسط .I.Q ۱۰۰ ہے، بعد بھی ایک جیسا ہے - البتہ کچھ مدات میں لڑکے بڑھ جاتے ہیں کچھ میں لڑکیاں - اگر چہرے کی تصویروں سے خوبصورتی یا عمر کا اندازہ لگانا ہو تو لڑکیاں بڑھ جاتی ہیں - لیکن اگر مکان (Space) کے متعلق سوالات ہوں تو لڑکے بڑھ جاتے ہیں - زبان دانی (Language) میں لڑکیاں بہتر ثابت ہوتی ہیں اور لڑکے میکانکی سوالات میں - لیکن بحیثیت مجموعی لڑکوں اور لڑکیوں کے شمار (Score) میں کوئی فرق نہیں -

پرائمری جماعتوں میں لڑکیاں زیادہ ہوشیار ہوتی ہیں اور زیادہ شوق سے کام کرتی ہیں اور لڑکوں کی نسبت زیادہ نمبر پاتی ہیں - عام طور پر لڑکیاں پڑھنے میں بہتر ہوتی ہیں، لڑکے ریاضی میں - ہائی سکولوں میں لڑکیاں زبان دانی میں بدستور بڑھی رہتی ہیں - لڑکے جیومیٹری اور سائنس میں بڑھ جاتے ہیں - کالج میں بھی لڑکیاں زبان دانی میں لڑکوں

سے بہتر رہتی ہیں اور لڑکے ریاضی میں بہتر رہتے ہیں ۔

جہاں تک پیشوں کا تعلق ہے، عورتیں بہترین کلرک بنتی ہیں ۔ لیکن مرد مشین کا کام بہت اچھا کرتے ہیں ۔ اس کی کیا وجہ ہے ؟ کیا ہم اپنے رسم و رواج کو اس تفاوت کا ذمہ دار قرار دے سکتے ہیں ؟ یوں آزمائشوں میں دیکھا گیا ہے کہ مشکل سے ۲۵ فی صد لڑکے ناموں اور گنتی کو صحیح اور جلدی پڑھنے میں لڑکیوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور مشکل سے ۴ فی صد لڑکیاں ہوائی جہازوں ، کشتیوں ، گاڑیوں والی مدات میں لڑکوں کا مقابلہ کر سکتی ہیں ۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ بچپن سے ہی لڑکے لڑکیوں کی دلچسپیاں اور مشاغل علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں ۔ لہٰذا ذہنی آزمائشوں میں ان کی کارگزاری مختلف مدات میں ایک جیسی نہیں ہوتی ۔

لڑکیاں جلدی بولنے لگتی ہیں اور لڑکوں کی نسبت لمبے فقرے بولتی ہیں ۔ ان میں لکنت بھی کم ہوتی ہے ۔ کیا اس چیز کے اسباب ماحول میں ملیں گے یا ورثہ میں ؟

ورثہ کے لحاظ سے ہر بچہ ۴۸ اجسام لونیہ (Chromo-some) اپنے والدین سے پاتا ہے ۔ ان اجسام کے ۲۴ جوڑے ہوتے ہیں ۔ ان میں سے ۲۳ جوڑے تو لڑکے لڑکیوں کے لیے ایک جیسے ہیں ۔ صرف ایک جوڑا مختلف ہے ۔ جس کی بدولت ایک مؤنث دوسرا مذکر بنتا ہے ۔ ۲۳ جوڑوں میں جو جوہر تخلیق (Genes) لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں وہ مرد اور عورت میں ایک ہی طرح کے ہیں ۔ صرف ایک جوڑا جو جنس کا فرق ڈالتا ہے مختلف ہے ۔ یہ جوڑا یوں تو ۲۴ میں سے ایک ہے لیکن ہے بہت اہم اور ضروری ۔ اس سے جنسی غدودیں (Sex glands) تولد پاتی ہیں ۔ ان کی رطوبتیں مردوں اور عورتوں میں ثانوی جنسی کیریکٹر پیدا کرتی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ لڑکے مردوں کی شکل اختیار کرتے ہیں اور لڑکیاں عورتوں کی ۔ مرد اور عورت بنانے میں کلچر اور

رسم و رواج کو بڑا دخل ہے -

اس کے علاوہ لڑکوں اور لڑکیوں میں عضویاتی فرق بھی ہیں - لڑکوں میں جسمانی توانائی زیادہ ہوتی ہے اور ان میں لال خون کے اجزا لڑکیوں کی نسبت دس گنا زیادہ ہوتے ہیں - اسی لیے لڑکے نچلے نہیں بیٹھ سکتے - وہ اچھلیں کودیں گے، کبڈی، فٹ بال یا ہاکی کھیلیں گے - ان کی ہم عمر لڑکیاں گڑیوں سے ہی دل بہلا لیتی ہیں - اس وجہ سے بھی ان دونوں کی دلچسپیاں مختلف ہو جاتی ہیں -

لڑکوں کی نسبت لڑکیاں دو ایک سال پہلے جوان ہو جاتی ہیں - اسی لیے وہ مردوں اور عورتوں میں زیادہ دلچسپی لیتی ہیں - ووڈورتھ کا کہنا ہے کہ اگر ہم لڑکیوں کی دیگر اشخاص میں دلچسپی مد نظر رکھیں اور ساتھ ہی اس امر کو یاد رکھیں کہ لڑکیاں گھر بیٹھ کر دل بہلا سکتی ہیں ، تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ کیوں وہ لڑکوں کی نسبت پڑھنے اور بولنے میں زیادہ شوق رکھتی ہیں -

اوپر جو کچھ بیان ہوا ہے وہ اوسط مرد اوسط عورت کے لیے صحیح ہے، لیکن استثنیٰ کئی ہوتے ہیں - لڑکیاں عام طور پر لڑکوں سے دو تین انچ چھوٹی ہوتی ہیں لیکن بعض عورتیں مردوں سے لمبی ہوتی ہیں یعنی ان کی لمبائی مردوں کی اوسط لمبائی سے زیادہ ہوتی ہے -

آزمائشوں کی قسمیں (Kinds of Intelligence Tests) :

یوں تو ذہانتی آزمائشیں سینکڑوں قسم کی ہیں - لیکن موٹی موٹی قسمیں کچھ زیادہ نہیں - یا تو آزمائشیں انفرادی (Individual) ہوتی ہیں یا گروہی (Group) یا پھر لفظی (Verbal) ہوتی ہیں یا کارکردگی (Performance) کی - ان کا مختصر سا ذکر کیا جاتا ہے -

(i) انفرادی اور گروہی آزمائشیں : انفرادی آزمائشوں میں ہر شخص کو فرداً فرداً بلایا جاتا ہے اور آزمائش دی جاتی ہے - مثلاً سول سروس کے مقابلہ کے امتحان میں ماہر نفسیات ہر امیدوار کو فرداً فرداً بلاتا ہے

اور باتوں باتوں میں اس کی دلچسپیوں، تعصبات، تسبیط، خوبیوں اور خامیوں سے آگاہی پا لیتا ہے - یہ طریقہ بہت وقت چاہتا ہے - کیونکہ ہر امیدوار کم و بیش آدھ گھنٹہ لے لیتا ہے - اس لیے جہاں بس چلے گروہی آزمائشیں دی جاتی ہیں - امیدواروں کو اکٹھا بٹھا کر انہیں سوالنامہ دے دیا جاتا ہے - ان کے جوابات سے ان کی ذہانت، شخصیت، مزاج اور رویوں کا علم ہو جاتا ہے -

دونوں آزمائشیں اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں - انفرادی آزمائشوں کے اپنے فائدے ہیں، گروہی آزمائشوں کے اپنے -

(ب) لفظی اور کارکردگی کی آزمائشیں : لفظی آزمائشوں میں الفاظ اور فقرات کا استعمال ہوتا ہے - لیکن کئی بچے بولنے سے جھجکتے ہیں یا ممتحن کی زبان نہیں سمجھتے یا گونگے بہرے اور اندھے ہوتے ہیں - انہیں لفظی یا لسانی آزمائشیں نہیں دی جا سکتیں - ان کے لیے کارکردگی کی آزمائشیں ہیں - مثلاً ایک فارم بورڈ میں مختلف سائزوں کے سوراخ ہیں اور اس کے پاس ہی مختلف سائزوں کے بلاک پڑے ہیں - بچے سے کہا جاتا ہے کہ بلاکوں کو اپنے اپنے سوراخ میں رکھے - ممتحن دیکھتا ہے کہ بچہ کتنی غلطیاں کرتا ہے اور کتنا وقت لیتا ہے - اس سے بچے کی ذہانت کا پتہ لگ جاتا ہے -

دسواں باب

ذہانت اور پیشہ ورانہ رہنمائی

(Intelligence and Vocational Guidance)

ذہانت کی مختصر سی تعریف اور اس کے خصائص پچھلے باب میں بیان ہو چکے ہیں - اس باب میں ذہانت کی ماہیت پر بحث ہوگی - سوال یہ ہے کہ آیا ذہانت کسی عام قابلیت کا نام ہے یا مختلف خود مختار قابلیتوں کا، جن کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ؟

تاریخ میں کچھ ایسے آدمی ملتے ہیں جو کسی ایک شعبہ میں تو ید طولیٰ رکھتے تھے لیکن یوں وہ بدھو اور احمق تھے۔ ان کو انگریزی میں (Idiot Savants) کہتے ہیں - جس کا مطلب ذہین بدھو ہوتا ہے - کئی لوگ موسیقی میں تو یکتائے روزگار تھے - جیسے اندھا ٹام تھا - لیکن اس فن کے علاوہ باقی تمام چیزوں میں وہ اول درجے کا بے وقوف تھا - ووڈورتھ دو ایسے لڑکوں کا ذکر کرتا ہے' جن میں سے ایک تو پچھلے پانچ سالوں میں کسی تاریخ کا دن بتا دیتا تھا اور دوسرا پچھلے ایک ہزار سال میں سے کسی تاریخ کا - ویسے یہ دونوں لڑکے بڑے کند ذہن تھے۔

کچھ لوگ ریاضی میں عجوبۂ روزگار (Prodigies) تھے - ضرب اور تقسیم دینے، جزر اور مربع نکالنے میں محیرالعقول کام کرتے تھے - لمبی لمبی رقموں کی ضرب منہ زبانی دے لیتے اور کئی کئی رقمیں بھی زبانی جمع کر لیتے تھے - ان لوگوں کی سوانح عمریاں بتاتی ہیں کہ یہ لوگ بچپن سے ہی ریاضی سے دلچسپی رکھتے تھے اور جمع تفریق سے انہیں خاص لگاؤ تھا - لیکن اور کسی کام میں انہیں مہارت حاصل نہ تھی -

---

۱- ملاحظہ ہو Psychology، صفحہ ۶۱ -

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو یوں تو نارمل (Normal) ہوتے ہیں۔ لیکن کسی ایک شعبہ میں انہیں کوئی قابلیت نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک طالب علم تمام مضامین میں تو اچھا ہے۔ لیکن ریاضی میں ہر امتحان میں فیل ہوتا ہے۔ بعض بچوں کو پڑھنے میں دقت ہوتی ہے اور پریکٹس اور تربیت کے باوجود اس دقت کو رفع نہیں کیا جاسکتا۔

یہ چند ایک مثالیں ثابت کرتی ہیں کہ قابلیتوں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ اندھا ٹام موسیقی میں تو اول درجے کی قابلیت رکھتا تھا، لیکن دوسری قابلیتوں میں اس کا شمار کہیں بھی نہ تھا۔ اس دعوے کے خلاف یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید جن حقائق کا ذکر اوپر کیا گیا ہے وہ استثنیٰ کی حیثیت رکھتے ہوں اور عام آدمی کی قابلیتوں میں کچھ نہ کچھ باہمی تعلق ضرور ہو۔

فرض کیا آپ دو قابلیتیں لیتے ہیں اور بیس آدمیوں کو دو آزمائشیں دیتے ہیں۔ اگر ایک شخص پہلی آزمائش میں بھی اول رہتا ہے اور دوسری میں بھی، تو ان دو قابلیتوں میں جہاں تک اس شخص کا تعلق ہے، مثبت (Positive) باہمی تعلق (Co-relation) ہوگا۔ اگر یہ شخص ایک ٹسٹ میں تو اول رہتا ہے اور دوسرے میں آخر پر آتا ہے تو باہمی تعلق منفی (Negative Co-relation) ہوگا۔ اور اگر یہ شخص پہلے ٹسٹ میں تو اول رہا لیکن دوسرے میں اس کا مقام کسی مقررہ جگہ پر نہیں آتا تو ان دو قابلیتوں کا باہمی تعلق صفر (Zero) ہوگا۔ آخری صورت میں قابلیتوں کا باہمی تعلق کچھ نہ ہوگا۔ فرض کیا کہ ایک لڑکا تاریخ میں بھی اپنی جماعت میں اول رہتا ہے اور جغرافیہ میں بھی تو ان دو کا باہمی تعلق مثبت ہوگا۔ اگر وہی لڑکا تاریخ میں تو اول نمبر پر ہے لیکن ریاضی میں تمام جماعت کے آخر پر، تو تاریخ اور ریاضی کا باہمی تعلق منفی ہوگا۔ اور اگر وہی لڑکا جو تاریخ میں سرفہرست ہے، انگریزی میں کبھی تھوڑے کبھی زیادہ نمبر پاتا ہے تو تاریخ اور انگریزی میں باہمی تعلق

صفر ہوگا۔

ذہنی آزمائشوں میں مثبت یا منفی کا باہمی تعلق تو شاذ ہی ہوتا ہے، اکثر صفر یا صفر کے قریب باہمی تعلق ملتا ہے۔ قابلیتوں میں تھوڑا بہت تعلق تو ہوتا ہے لیکن اسے مثبت یا منفی نہیں کہا جا سکتا۔ باہمی تعلق کی مقدار معلوم کرنے کے لیے مثبت باہمی تعلق کو 1+ ، منفی باہمی تعلق کو 1− اور صفر باہمی تعلق کو 0 سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ شماریاتی طریقوں (Statistical Methods) سے معلوم ہوا ہے کہ بعض چیزوں میں باہمی تعلق کی مقدار کیا ہے۔ مندرجہ ذیل چارٹ ملاحظہ کیجیے:

جسمانی اور طاقت کی آزمائشیں

قد اور بازو کا پھیلاؤ	۰٫۸۲
قد اور وزن (مردوں میں)	۰٫۵۹
قد اور پنجہ کی گرفت (مردوں کی)	۰٫۴۳
پنجہ کی گرفت (دائیں کی بہ مقابلہ بائیں کے)	۰٫۷۸
پنجہ کی گرفت اور ۱۰۰ میل کی دوڑ (عورتوں کی)	۰٫۱۶

تعلیمی آزمائشیں:

الفاظ اور پیراگراف کے مطالب	۰٫۸۰
حساب، گنتی اور استدلال	۰٫۷۰
اوقاف و اعراب (Punctuation) اور ہجا	۰٫۶۰
مجموعہ الفاظ (Vocabulary) اور ہجا	۰٫۵۰
پڑھنا اور واقفیت عامہ	۰٫۵۰

ہائی سکول کے مضامین

الجبرا اور جیومیٹری	۰٫۶۵
انگریزی اور فرانسیسی	۰٫۵۰
انگریزی اور آرٹ	۰٫۱۵

کالج کے مضامین

دو انگریزی کے کورس	۷۷.
انگریزی اور تاریخ	۷۸.
انگریزی اور طبیعیات	۳۷.
انگریزی اور ریاضی	۳۹.
انگریزی اور ڈرائنگ	۲۵.
ریاضی اور طبیعیات	۷۸.
ریاضی اور تاریخ	۳۳.
ریاضی اور ڈرائنگ	۳۸.

اس چارٹ سے ظاہر ہوگا کہ کوئی بھی دو ایسی قابلیتیں نہیں جن میں 1.00+ یا 1.00− یعنی مثبت یا منفی کا باہمی تعلق ہو۔ جس سے ثابت ہوا کہ عام قابلیت کا تصور غلط ہے۔ کیونکہ اگر عام قابلیت ایک ہی ہو تو جو مقام ایک شخص کا ایک قابلیت میں ہوگا وہی دوسری میں ہوگا۔ یعنی اگر کوئی لڑکا انگریزی میں اول ہے تو اسے تاریخ میں بھی اول رہنا چاہیے، لیکن ایسا ہوتا بہت کم ہے۔ ایک اور نظریہ جو اس چارٹ سے غلط ہو جائے گا وہ خود مختار اور الگ الگ قابلیتوں کا نظریہ ہے۔ اگر ہر قابلیت الگ الگ ہو یعنی ایک قابلیت کو دوسری سے کچھ تعلق نہ ہو تو باہمی تعلق کی مقدار نہیں نکل سکے گی۔ لیکن اس چارٹ سے پتہ چلتا ہے کہ کئی ایک قابلیتوں میں خاصہ باہمی تعلق ہے۔

اب اگر نہ تو کوئی عام قابلیت ہو اور نہ مخصوص الگ الگ قابلیتیں تو ذہانت کی تشریح کیسے کی جا سکتی ہے۔ بعض لوگوں نے ان دونوں نظریوں کو ملانے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عام قابلیت بھی ہے اور مخصوص قابلیتیں بھی۔ عام قابلیت کی بدولت تو باہمی تعلق پیدا ہوتا ہے۔ لیکن مخصوص قابلیتوں سے فرق کا پتہ چلتا ہے۔ پس کسی

شخص کی کارکردگی کا انحصار دو عناصر پر ہوگا - یعنی اس کی عام قابلیت اور مخصوص قابلیت پر - مثلاً ایک گوتے کی مخصوص قابلیت تو موسیقی ہوگی لیکن اس کے علاوہ اس کی عام قابلیت بھی ہوگی جس کی مقدار مخصوص قابلیت سے مل کر موسیقی کی کارکردگی کو متعین کرے گی -

یہ نظریہ ووڈورتھ کے نزدیک صحیح نہیں کیونکہ مندرجہ بالا چارٹ سے کسی عام قابلیت کی اطلاع نہیں ملتی اور نہ ہی مخصوص قابلیتوں کا پتہ چلتا ہے - اس سے ایسی وسیع قابلیتوں کا علم ہوتا ہے جنھیں عام قابلیت نہیں کہا جاسکتا اور نہ ہی یہ قابلیتیں اتنی تنگ ہیں کہ انھیں مخصوص قابلیتوں کا نام دیا جائے - اس چارٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ قابلیتیں مل جل کر جھنڈ (Clusters) بنا لیتی ہیں - یہ جھنڈ کئی ہوتے ہیں - جو قابلیتیں ایک جھنڈ سے تعلق رکھتی ہوں ان میں باہمی تعلق بہ نسبت ایسی قابلیتوں کے زیادہ ہوگا جو دو مختلف جھنڈوں سے متعلق ہوں - مثلاً جمع، تفریق، ضرب اور تقسیم ایک جھنڈ بناتی ہیں - ان کا باہمی تعلق 60· + ہے - اضداد، مترادفات، پڑھائی اور مجموعہ الفاظ ایک اور جھنڈ بناتے ہیں ان کا باہمی تعلق 55· + ہے - لیکن ان دو جھنڈوں کی قابلیتوں کا باہمی تعلق 20· + ہے -

یہ جھنڈ تین قسموں کے ہیں - لفظی، عددی اور مکانی (Verbal, Numerical, Spatial) - لفظی قابلیتوں کا تعلق الفاظ سے نہیں بلکہ الفاظ کے ذریعے اشیا اور ان کے خواص سے ہے - مثلاً فقرے کی خالی جگہوں کو پر کرتے وقت مطلب کی طرف دھیان رکھنا پڑتا ہے - فقرے کا مطلب تب ہی بنے گا جب فقرے سے کوئی بات بنے - یعنی کسی واقعہ کی طرف اشارہ ہو یا شے اور اس کے خواص منکشف ہوں -

عددی قابلیتوں کا تعلق اعداد اور ان کے آپس کے رشتوں سے ہے - جمع، تفریق اور عددوں کے سلسلے کی تکمیل کے بارے میں سوالات پوچھے جاتے ہیں - مثلاً مندرجہ ذیل سلسلہ پورا کرنے کو کہا

جا سکتا ہے ۔

۲ ، ۴ ، ۶ ، ۸ ، ۱۰ ——— ۱۴

۱۰ ، ۹ ، ۸ ، ۷ ، ۶ ——— ۳

۱ ، ۴ ، ۹ ، ۱۶ ، ۲۵ ——— ۴۹

مکانی قابلیتوں میں مکانی حقائق اور ان کے باہمی تعلق کا ذکر آتا ہے ۔ مثلاً بھول بھلیوں میں سے راستہ دریافت کرنا یا جگہوں کو یاد رکھنا ، مکانی آزمائشوں کی مدات ہیں ۔

ان جھنڈوں کے علاوہ کیا کسی عام قابلیت کا بھی پتہ چلتا ہے ؟ ووڈورتھ کا کہنا ہے کہ سائنسدانوں کا اس مسئلہ پر اتفاق نہیں۔ لیکن اگر کوئی عام قابلیت ہے تو اس کا مطلب ہوگا (۱) جلد یاد کر لینا اور اچھی یاد داشت رکھنا ۔ جو آدمی جلد سیکھ لیتا ہے اور سیکھے ہوئے مواد کو دیر تک یاد رکھتا ہے ، وہ یقیناً اس آدمی سے بہتر ہوگا جو دیر سے سیکھتا ہے اور جلد بھول جاتا ہے ۔ اگر علم جلدی حاصل ہو اور دیر تک محفوظ رہے تو زندگی کے مسائل بہتر طریقے سے سمجھے جا سکتے اور حل ہو سکتے ہیں ۔ (۲) باہمی رشتوں اور علائقوں کو جلد اور ٹھیک طرح سے سمجھ لینا ۔ واقعات کو جوڑنا اور ان سے نتائج نکالنا ، زندگی میں بڑا ضروری فعل ہے ۔ جب تک حقائق کو جوڑا نہ جائے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا ۔

اگر عام قابلیت کو مندرجہ بالا معانی میں لیا جائے تو چھوٹے بچوں میں اس کا وجود ملتا ہے ۔ بڑے بچوں میں یہ صفت کم ہو جاتی ہے ۔ جوں جوں عمر بڑھتی ہے یہ قابلیت گھٹتی جاتی ہے اور مخصوص قابلیتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں ۔ زندگی میں ایک ایسا وقت آ جاتا ہے جب مخصوص قابلیتیں تو رہ جاتی ہیں ، لیکن عام قابلیت مفقود ہو جاتی ہے ۔

پیشہ ورانہ انتخاب اور رہنمائی :

ذہانتی آزمائشوں کو زندگی کے ہر شعبہ میں استعمال کیا جاتا ہے ۔

جو شمار (Score) کوئی شخص حاصل کرتا ہے اس کی بنا پر اس کی آئندہ کامیابی یا ناکامی کے متعلق پیشگوئی کی جا سکتی ہے ۔ ایسی آزمائشیں جو مستقبل کے متعلق پیش گوئی کر سکیں صلاحیتوں کی آزمائشیں (Aptitude Tests) کہلاتی ہیں ۔ ان آزمائشوں کے لیے دو شرائط ہیں :

(۱) معتبری (Reliability) :

آزمائشوں کو قابل اعتماد ہونا چاہیے ۔ فرض کیا کسی شخص کو ایک آزمائش دی جاتی ہے اور پھر دوبارہ وہی آزمائش کچھ عرصہ بعد ۔ اگر پہلی دفعہ اس کا شمار کچھ آتا ہے دوسری دفعہ کچھ اور ، تو یہ آزمائش قابل اعتبار نہ ہوگی ۔ پہلی اور دوسری آزمائش میں شمار ایک ہی ہونا چاہیے ۔ ان کا باہمی تعلق کسی صورت بھی ۰۹ء+ سے کرنا نہیں چاہیے ۔ اگر کوئی آدمی تندرست ہو اور اسے تھرمامیٹر لگائیں تو جتنی بار تھرمامیٹر لگائیں گے ٹمپریچر ایک ہی ہوگا ۔ اگر ٹمپریچر ہر بار مختلف ہو تو تھرمامیٹر قابل اعتماد نہ ہوگا ۔ بعینہٖ یہی حال آزمائشوں کا ہے ۔ اگر یہ ایک ہی شخص کے بارے میں مختلف وقتوں پر ایک ہی شمار نہ دیں تو بھروسے کے قابل نہ ہوں گی ۔

(۲) صحت (Validity) :

وہ آزمائش صحیح ہوگی جو اس قابلیت کی پیمائش کر سکے جسے آپ پیمائش کرنا چاہتے ہیں ۔ ڈائنموميٹر سے گرفت کی مضبوطی کا پتہ لگ سکتا ہے ۔ لیکن اس سے یہ علم نہیں ہوتا کہ کوئی ۱۰۰ گز کی دوڑ کس تیزی سے بھاگے گا ۔ کیونکہ ڈائنموميٹر اس مطلب کے لیے نہیں بنا ۔ یاد رہے کہ ہر شعبہ کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں ۔ سپاہی کا پیشہ سیاست دان سے مختلف ہے ۔ لہٰذا ان دونوں کے لیے آزمائش ایک جیسی نہیں ہونی چاہیے ۔ صحت جانچنے کا طریقہ یہ ہے کہ جن لوگوں کی صلاحیتیں متعین کی جاتی ہیں ، بعد میں ان کی حاصل کردہ مہارتوں کا جائزہ لیا جائے ۔ مثلاً اگر صلاحیتوں کی آزمائش کی بنا پر کسی شخص کو کامیاب حکمران

قرار دیا جاتا ہے تو بعد میں جب عنانِ حکومت اس کے ہاتھ میں آتی ہے تو یہ دیکھا جائے کہ آیا وہ کامیاب ہوتا ہے یا نہیں۔ یا جس بچے کے متعلق پیشگوئی کرتے ہیں کہ وہ پڑھائی لکھائی میں اچھا رہے گا اس کی ترقی ملاحظہ کی جائے اور دیکھا جائے کہ وہ توقعات پوری کر رہا ہے یا نہیں اگر توقعات اور کارکردگی کے درمیان ۱.۰۰+ سے ۰.۷۵+ تک کا باہمی تعلق ہو تو آزمائش معقول ہوگی۔

سکول کامیابی اور ذہانت:

اگر ذہانتی آزمائشوں سے بچوں کی سکول میں کامیابی یا ناکامی کے متعلق پیش گوئی ہو سکے تو یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔ پھر ان آزمائشوں سے بچوں اور ان کے والدین کی رہنمائی کر سکیں گے اگر کوئی بچہ ذہانتی آزمائش میں تھوڑا شمار (Score) پاتا ہے تو اس کو سکول یا کالج میں داخلہ لینے سے منع کر دیں گے۔ مشورہ دیتے وقت نفسیاتی ماہر ذہانت کے علاوہ کیرکٹر شخصیت اور ماحول کو بھی مد نظر رکھے گا۔

تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ بچے کی ذہانتی حاصل قسمت .I.Q اور اس کی سکول میں کامیابی کے مابین گہرا رشتہ ہے۔ چھوٹی جماعتوں میں ادنیٰ .I.Q رکھنے والے بچے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ آٹھویں جماعت کے لیے ۹۰ درجے کا .I.Q درکار ہے۔ دسویں کے لیے ۱۰۰ اور ایف۔اے کے لیے ۱۱۰ چھوٹی جماعتوں میں ترقی کا انحصار سراسر ذہانت پر ہے۔ ہائی سکول میں قدرے کم ہو جاتا ہے اور کالج میں اور بھی کم۔ چھوٹی جماعتوں میں ذہانت اور کامیابی کا باہمی تعلق ۰.۷۵+ ہے۔ ہائی سکول میں ۰.۶۳+ سے ۰.۵۳+ تک اور کالج میں ۰.۵۰+۔ کالج میں لیاقت کے علاوہ محرکات (Motivation) کی بھی ضرورت ہے۔ بعض لڑکے اور لڑکیاں جو میٹریکولیشن میں بہت اچھی فرسٹ ڈویژن حاصل کرتے ہیں وہ کالج میں آ کر گر جاتے ہیں۔ منجملہ اور وجوہات کے اس تنزل کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ داخلہ کے بعد ان کے محرکات (Motivation) صحیح اور

مناسب نہیں رہے - پڑھائی میں شوق کم ہو جاتا ہے اور دیگر مشاغ
میں بڑھ جاتا ہے -

پس ذہانتی شمار کی بنیادوں پر ہم سکول کی کامیابی پہلے سے ہی ؛
سکتے ہیں - یہ پیشین گوئی ہائی سکول تک تو وثوق سے کی جا سکتی -
لیکن کالج میں ذہانت کے علاوہ کئی اور عناصر کو بھی اہمیت دینی ہوگ

ہوا بازی اور ذہانت -

عالمی جنگوں کے دوران میں بے شمار ہوا بازوں (Pilots) کی ضرور
تھی - شروع شروع میں تو انہیں یونہی بھرتی کر لیا گیا - لیکن ان مہ
سے ایک تہائی کے قریب ناکام رہے - لہذا ماہرین نفسیات کو کہا گ
کہ وہ ہوا بازوں کے لیے صلاحیت کی آزمائشیں بنائیں - آزمائش بناتے وقہ
پتہ چلا کہ اس مطلب کے لیے ایک آزمائش کافی نہیں کیونکہ ہوا باز
کے لیے ذہانت کے علاوہ کئی اور قابلیتیں بھی درکار ہیں - پس اٹھا
آزمائشیں بنائی گئیں - کسی ایک آزمائش کا ہوا بازی کے ساتھ بہت ک
تعلق تھا - لیکن سب کا ۰۶۰ + تھا - ان آزمائشوں کے مجموعہ ک
انگریزی میں بیٹری (Battery) کہتے ہیں -

ملازمین کا انتخاب -

ترقی یافتہ ممالک میں ملازمین کا انتخاب آزمائشوں سے ہوتا ہے
کاروبار میں کئی شعبے ہوتے ہیں اور ہر شعبہ کی ضرورتیں الگ الگ
ہوتی ہیں - جو آزمائش ایک شعبہ کے لیے مناسب ہوگی وہ شاید دوسر
کے لیے مناسب نہ ہو - پس آزمائش بناتے وقت پہلے ہر شعبہ کی ضرورتو
کا اندازہ لگایا جاتا ہے پھر اس آزمائش کو کامیاب اور ناکام ملازمین ؛
آزمایا جاتا ہے - بعد میں یہی آزمائش نئے ملازمین کو دی جاتی ہے او
ان کی ترقی دیکھی جاتی ہے - اس طرح آزمائش معتبر اور صحیح ؛
جاتی ہے -

پیشہ ورانہ (Vocational) رہنمائی :

پیشہ ورانہ رہنمائی پیشہ ورانہ انتخاب سے ملتا جلتا فعل ہے۔ پیشہ ورانہ انتخاب میں ہمارا منشا بہترین ملازمین چننا ہے۔ پیشہ ورانہ رہنمائی میں ہر شخص کو اس کے حسب حال بہترین مشغلہ سے آگاہ کرنا ہوتا ہے۔ امریکہ میں پچیس ہزار پیشے ہیں، ان میں سے کسی ایک کو اپنے لیے انتخاب کرنا آسان نہیں۔ اگر امیدوار ذہانتی آزمائشیں لے لے تو کئی پیشے خارج ہو جائیں گے۔ پھر اسے اپنی شخصیت، اقدار اور دلچسپیوں کا اندازہ لگانا چاہیے۔ اس سے بھی کئی پیشے اس کے لیے غیر مناسب ہو جائیں گے۔ جو باقی بچیں ان کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔

یاد رہے کہ نفسیاتی ماہر پیشے کے بارے میں صرف مشورہ دیتا ہے۔ پیشے کے انتخاب کی ذمہ داری سراسر امیدوار کے کندھوں پر ہے۔

گیارھواں باب

شخصیت (Personality)

شخصیت سے کیا مراد ہے :

نفسیات کا فعلیات اور معاشریات سے تعلق بیان کرتے ہوئے یہ کہا گیا تھا کہ فعلیات کا موضوع ہر عضو کو علیحدہ علیحدہ لے کر اس کے وظائف کی تشریح کرنا ہے۔ معاشریات کا مقصد افراد کو گروہوں کا رکن دیکھنا اور ان کی اجتماعی زندگی کا ذکر کرنا ہے لیکن نفسیات کا منشاء افراد کو بحیثیت فرد لے کر اس کے اعمال و افعال بہ حیثت مجموعی بیان کرنا ہے ۔ اس مطلب کے لیے پرانی نفسیات میں خودی (Self) کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا ۔ مفروضہ یہ تھا کہ ہر شخص کی خودی ہے جو ایک قسم کی روحانی اکائی ہے اور اس کی تحلیل (Analysis) ممکن نہیں ۔ حقیقت میں خودی کا تصور وہی پرانا روح کا تصور ہے اور اس عقیدے کا نتیجہ بھی ہے کہ ہر جان دار اور بے جان شے میں روح موجود ہے ۔ اس عقیدے کو روحیت (Animism) کہا جاتا ہے ۔ تجربی نفسیات نے روح کا نظریہ مسترد کر دیا ہے ۔ کیونکہ ایک تو یہ ماورائی نظریہ ہے اور دوسرا سائنسی مقاصد کے لیے بے کار ہے نہ تو اس کا مشاہدہ ممکن ہے اور نہ ہی مشاہدات سے اس کا وجود استنباط کیا جا سکتا ہے ۔ اگر اس کا وجود تسلیم بھی کر لیا جائے تو نفسی زندگی کا سمجھنا آسان ہونا تو در کنار کئی ایک ایسی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں جن کا سلجھانا ممکن نہیں ۔ ماورائی حقائق اور ان کی تشریح احاطۂ نفسیات سے باہر ہیں ۔ ان کا مطالعہ کسی اور علم کا موضوع ہے ۔ ان کی حقانیت

کا معاملہ نفسیات کا مسئلہ نہیں بلکہ فلسفے اور مذہب کا مسئلہ ہے۔ ہر علم اپنے موضوع کو چند ایک مسائل تک محدود کر لیتا ہے اور جو شے اس حدود سے باہر ہو اس سے سروکار نہیں رکھتا۔ چونکہ روح ایک ماورائی حقیقت ہے لہٰذا نفسیات کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

جدید نفسیات نے خودی کا تصور رد کر دیا ہے اور اس کی جگہ شخصیت کا تصور اختیار کر لیا ہے۔ خودی کے مقابلہ میں شخصیت زیادہ ٹھوس اور حقیقی تصور ہے۔ خودی تو تجریدی اور غیر مرئی شے ہے کیونکہ جب فرد کی انفرادیت کو اس سے علیحدہ کر دیں، یعنی اس کے مخصوص کردار کو نظر انداز کر دیں تو باقی جو رہ جائے گا وہ اس کی خودی ہوگی۔ یعنی اگر جبلات، میلانات اور تجربات جو ایک شخص کو دوسرے سے ممیز کرتے ہیں اور اسی طرح سے تخیلات جذبات اور رویے جو کسی فرد کا خاصہ ہیں، چھوڑ دیے جائیں تو ہم ایک تہہ کو پہنچیں گے جو مستقل اور غیر متغیر ہونے کے علاوہ تمام نفسی واردات کا منبع اور سرچشمہ قرار دی جانے کی یہ تہہ خودی کہلانے کی ظاہر ہے کہ یہ تہہ تجریدی ہوگی۔ اس کے برخلاف شخصیت کا تصور بالکل حقیقی ہے۔ جب تک کسی شخص کے تمام رجحانات، اور جذبات کو سمجھ نہ لیا جائے شخصیت کا تصور بے معنی رہتا ہے۔ شخصیت فطری اور اکتسابی میلانات کے متوازن امتزاج کا نام ہے۔ لہٰذا جب تک فرد کی فطرت اور ماحول کے باہمی تفاعل سے پیدا شدہ شعار کو اچھی طرح سمجھ نہ لیا جائے۔ شخصیت کا مسئلہ صاف نہیں ہوتا۔ شخصیت کو مختلف فطری اور اکتسابی میلانات کا ''مجموعہ'' نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ اس سے مراد تو فرد کے تمام میلانات کا ''منظم'' اور مدون سلسلہ ہے۔

خودی اور شخصیت میں ایک اور فرق بھی ہے۔ خودی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کا وجود بچے کی ذات میں ولادت کے وقت سے پایا جاتا ہے اور تمام زندگی اس کی حقیقت اور ماہیت میں فرق نہیں

آتا ۔ یعنی جیسے خودی پیدائش کے وقت تھی ویسے ہی تادم مرگ رہتی ہے ۔ شخصیت کے بارے میں یہ خیال صحیح نہیں ۔ شخصیت ایک حرکی تصور ہے۔ یہ پیدا ہوتی ہے، پھلتی پھولتی ہے اور پایہٗ تکمیل تک پہنچتی ہے ۔ بعض دفعہ اس کا وجود مسخ ہو جاتا ہے، اس کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور اس کی اکائی ختم ہو جاتی ہے ۔ پس شخصیت ایک تجربی حقیقت ہے۔ اس کی تخلیق ، فروغ اور کمال کو اور اسی طرح سے اس کے انتشار ، زوال اور خاتمے کو شواہد اور تجربات سے ثابت کیا جا سکتا ہے ۔ خودی تو ایسی بسیط اور غیر مرئی شے ہے جو ورثہ اور ماحول کی دسترس سے باہر ہے اور جس پر کسی چیز کا اثر نہیں پڑ سکتا ۔ اس کے برعکس شخصیت کا وجود ورثہ اور ماحول کا مرہون منت ہے ۔ طبعی اور سماجی عناصر اس کی تعمیر کرتے ہیں ۔ اگر اندرونی اور بیرونی اثرات کو خارج کر دیا جائے تو شخصیت کا وجود مٹ جائے گا ۔ جب مجھے اپنا یا ہمسایوں کا خیال آتا ہے تو میں انہیں اور اپنے آپ کو شخص تصور کرتا ہوں ، دوسرے اشخاص کو محبت یا نفرت کے قابل گردانتا ہوں ، انہیں دوست یا دشمن پاتا ہوں ، قنوطی یا رجائی دیکھتا ہوں ۔ غرض کہ انہیں فرد سمجھ کر جائزہ لیتا ہوں ۔ آپ بھی لوگوں کو اسی طرح سمجھتے ہیں ۔ کسی کو آپ چڑچڑا پاتے ہیں ۔ کسی کو چست و چالاک ، کسی کو سست ، الغرض طرح طرح کے انسان ہیں ۔ جب ہم انسان کو بحیثیت مجموعی دیکھتے ہیں اور اس کے کردار کی مجموعی خاصیت پالیتے ہیں تو یہ اس کی شخصیت ہے ۔ کیونکہووڈورتھ کے مطابق شخیصت ، کردار کی مجموعی خاصیت کا نام ہے [1]۔

انسان کی شخصیت اس کے افکار و کردار ، اس کی دلچسپیوں اور رویوں اور نیز اس کے فلسفۂ حیات اور اقدار میں جلوہ فگن ہوتی ہے ۔ زندگی میں شخصیت سے زیادہ دلچسپ کوئی موضوع نہیں ۔ میاں بیوی ،

۱۔ ملاحظہ ہو Psychology، صفحہ ۷۸ ۔

افسر ماتحت ، آقا غلام ، سرمایہ دار مزدور ، الغرض ہر شخص ایک دوسرے کی شخصیت معلوم کرنے کے درپے ہے ۔ اسی پر ان کی کامیابی کا دار و مدار ہے۔ بہت سی ناکامیاں جو عملی زندگی میں لوگوں کو ہوتی ہیں ان کا سبب ایک دوسرے کو ٹھیک طور پر نہ سمجھنا ہے ۔ اگر شخصیت کا صحیح نفسیاتی جائزہ ہو سکے تو گھریلو ، کاروباری اور سماجی زندگی کے اکثر دکھ درد کا مداوا ہو سکتا ہے ۔ شخصیتوں کا تصادم غلط فہمی یا نافہمی سے ہوتا ہے ۔ اسے دور کرنے کے لیے شخصیت کے تولد اور ارتقا یا اس کے انتشار اور تنزل کی نفسیات آنی چاہیے۔

شخصیت کی تعریف :

انگریزی میں شخصیت کے لیے Personality کا لفظ ہے ۔ اس کا ماخذ لاطینی زبان کا لفظ Persona ہے جس کا مطلب ہے بہروپ یا شبیہ جو اداکار سٹیج پر پہنتے ہیں ۔ آج کل Personality کا لفظ وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ اس کا مطلب صرف وہ شبیہہ یا ذات نہیں جو آپ دوسروں کو دکھلاتے ہیں بلکہ وہ ذات بھی ہے جو فی الحقیقت آپ کی ہے ۔ مثال کے طور پر کسی فرد کو لیں آپ ، دیکھیں گے کہ اس کا ہر خیال ، احساس اور خواہش انفرادی رنگ میں رنگا ہوا ہے ۔ میکڈوگل (McDougall) کے خیال میں[1] ہر عضویہ چند ایک غایتی (Hormic) میلانات کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور اس میں اس امر کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ماحول سے توافق پیدا کرے اور گزشتہ تجربات سے فائدہ اٹھائے ۔ اس صلاحیت کو یادداشتی (Mnemic) کہا جاتا ہے ۔ میکڈوگل کا کہنا ہے کہ غایتی اور یادداشتی میلانات کا ظہور ہر شخص کی ولادت پر جبلات اور ذہانت کی شکل میں ہوتا ہے ۔ یہ فطری بنیادیں ہیں جن کے بل بوتے پر شخصیت کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے ۔ فطری میلانات اور ماحول کے باہمی تفاعل سے ایک ثانوی

۱۔ ملاحظہ ہو اس کی Social Psychology۔

عمارت تیار ہوتی ہے (اولین عمارت تو جبلات کی ہے) جو عادات ارادی افعال، عقائد اور عواطف پر مشتمل ہے۔ شخصیت سے مراد یہی نفسی جسمانی عضویہ ہے جو فطری بنیادوں پر ثانوی عمارت کھڑی کرتا ہے۔ یعنی اس سے ہماری مراد فطری اور اکتسابی میلانات کی تنظیم اور جمعیت ہے۔

شخصیت کے خصائص:

۱۔ وحدت: یہ تو شخصیت کی بنیادی نشانی ہے۔ ایک شخص محض میلانات اور رجحانات کا مجموعہ نہیں ہوتا بلکہ شخص وہ ہوتا ہے جو قابل اعتبار اور قابل اعتماد خوبیوں کا مالک ہو اور جو دیگر اشخاص، اشیا اور حالات کے بارے میں مستقل رویے رکھے۔ جو شخص مرغ باد نما کی طرح ہوا کا رخ دیکھے، جو کسی اصول اور ضابطہ کا پابند نہ ہو، جس کا نہ پیار مستقل ہو نہ نفرت، ایسے آدمی کی شخصیت نہایت کمزور ہوگی۔ وہ آدمی جو اپنی بات پر اڑا رہے، جس کی دوستی اور دشمنی پر اعتماد ہو، جس کے خیالات، احساسات اور کردار میں یک رنگی ہو، ایسا آدمی مضبوط شخصیت کا مالک ہوگا۔ اس لیے شخصیت کو نفسی میلانات کی تنظیم اور جمعیت کہا جاتا ہے۔ ایسی تنظیم جو یک رنگ اور مستقل ہو، آسانی سے حاصل نہیں ہوتی۔ مختلف اشخاص میں اس کی مقدار مختلف ہے۔ کسی میں جمعیت زیادہ ہے کسی میں کم۔ جس حد تک یہ تنظیم مکمل ہوگی۔ اسی حد تک کسی فرد کو شخص کہا جائے گا۔

شخصیت میں تمام میلانات کو شامل نہیں کرنا چاہیے۔ بعض میلانات تو غیر اہم اور فضول ہوتے ہیں۔ انہیں شخصیت کا جائزہ لیتے وقت نظرانداز کر دینا چاہیے۔ مثلاً کوئی شخص کون سی کھانے کی چیز پسند کرتا ہے، کس قسم کا لباس پہنتا ہے، بالوں کی مانگ درمیان میں نکالتا ہے یا اطراف پر۔ یہ سب غیرضروری باتیں ہیں ان کا خیال نہیں کرنا چاہیے۔ بعض دفعہ یہ چیزیں ضروری بھی ہو جاتی ہیں۔ مثلاً لباس

چست یا ڈھیلا پہننا یا خاص قسم کی خوراک پسند کرنا ، ذہنی کشمکشوں میں اہم امور ہیں - انہیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا - لیکن اگر یہ محض رواجی ہوں اور شخصیت پر کوئی خاص اثر نہ ڈالیں تو ان کا ذکر فضول ہوگا - بدقسمتی سے ہر سوسائٹی میں شخصیت جانچنے کے اصول مختلف ہیں - موجودہ سوسائٹی میں شخصیت کا اندازہ فضول اور بے ہودہ چیزوں سے ہوتا ہے نہ کہ ضروری اور اہم عناصر سے -

۲- حرکی (Dynamic) : شخصیت جامد نہیں بلکہ حرکی ہے - یہ زندہ اور فعال حقیقت ہے - ہر شخص کی خواہش ہے کہ وہ طبعی اور سوشل ماحول میں اپنے آپ کو برقرار رکھے - اسی جد و جہد میں اس کی نفسیاتی زندگی مالا مال ہوتی ہے - جو شخص اپنے خیالات ، احساسات اور کردار میں اٹک گیا ہو اور کوئی ترقی نہ کر رہا ہو وہ تو محض مشین ہے اور عادات کا بے جان مجموعہ - اس کے اعمال و افعال میں تنظیم اور استقامت تو ضرور ہوگی لیکن چونکہ اس کا رد عمل میکانکی ہے ، اسے ہم زندہ انسانوں میں شمار نہیں کریں گے ، اسے صرف چلتی پھرتی لاش کہیں گے - جس قدر کسی انسان کی دلچسپیاں وسیع ہوں ، جس قدر اس کے تعلقات گہرے ہوں اتنی ہی اس کی شخصیت پر بہار ہوگی - لیکن اس امر کی احتیاط رکھنی چاہیے کہ کہیں دلچسپیوں اور تعلقات کی وسعت زندگی کو بے کیف اور بناوٹی نہ بنا دے - مشاغل کے تنوع اور دلچسپیوں کی گہرائیوں کے درمیان توازن قائم کرنا تہذیب نفس کا خاصہ ہے -

شخصیت کا آغاز کہاں ہوتا ہے :

ادنیٰ جانوروں ، ننھے بچوں اور کم سن اطفال کو شخصیت کا حامل نہیں سمجھا جاتا - جب تک کوئی انسان مستقل اور قابل اعتبار رویے نہ بنا لے وہ شخص نہیں کہلائے گا - البتہ یہ کہنا نہایت مشکل ہے کہ شخصیت کی ابتدا کس وقت ہوتی ہے - یوں یہ عمل غیر ضروری بھی ہے کیونکہ شخصیت ایک ذاتی تصور ہے اور اس کی کئی سطحیں ہیں -

جب تک جبلات، عوائد اور ہیجانات کا دور دورہ رہتا ہے شخصیت تولد نہیں پاتی۔ جب کسی کے اعمال و افعال ارادی ہو جاتے ہیں تب شخصیت نمودار ہوتی ہے۔

شخصیت اور بلوغت:

سن بلوغت تک شخصیت کے آثار نظر نہیں آتے۔ جب لڑکے اور لڑکیاں سن بلوغ کو پہنچتے ہیں، ان میں جنسی خواہشات پیدا ہو جاتی ہیں۔ لڑکا آدمی بن جاتا ہے اور لڑکی عورت کا روپ دھار لیتی ہے۔ اس وقت نہ صرف جنسی آلات پختہ ہو جاتے ہیں اور حیاتیاتی وظائف کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، بلکہ انسان کی ذات میں عمیق عضویاتی اور نفسیاتی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ لڑکے اور لڑکیاں قد نکال لیتے ہیں۔ ان کا جسم بھر جاتا ہے، طاقت اور توانائی آ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر لڑکوں میں ثانوی خصائص، ظاہر ہوتے ہیں۔ جیسے ٹھوڑی اور لبوں پر بالوں کا اُگ آنا، عضویاتی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ نفسیاتی ارتقا عمل میں آتا ہے۔ بالغوں کے ہیجانات زیادہ طاقتور ہوتے ہیں اور ان کا اکثر تعلق دیگر اشخاص اور معاشری ماحول سے ہوتا ہے۔ یہ شدید دوستیوں اور شدید دشمنیوں کا وقت ہوتا ہے۔ جنسی شعور پیدا ہوتا ہے، حیا اور شرم محسوس ہوتے ہیں۔ دوسری جنس میں دلچسپی بڑھ جاتی لیکن اس کا مظاہرہ الٹ ہوتا ہے یعنی دوسری جنس سے بے حد بے پرواؤ اور بے نیازی برتی جاتی ہے۔ شروع شروع میں محبت کے متعلق خیالی پلاؤ پکائے جاتے ہیں۔ لڑکوں کو پریوں اور شہزادیوں کے خواب آتے ہیں۔ لڑکیاں خوبرو شہزادوں کا تصور جاتی رہتی ہیں۔

لڑکیوں میں لڑکوں سے پہلے سن بلوغت آ جاتا ہے۔ یورپ میں لڑکیوں کے لیے اوسط سن بلوغت ۱۴ اور ۱۵ سال کے درمیان ہے۔ پاکستان کے لیے اعداد و شمار موجود نہیں۔ لیکن چونکہ گرم ملکوں میں سرد ملکوں کے مقابلے میں بلوغت کی عمر جلد آ جاتی ہے اس لیے ہم کہ

سکتے ہیں کہ پاکستان میں سن بلوغت ۱۳ اور ۱۴ سال کے درمیان ہوگی۔ شباب کا زمانہ بلوغت سے شروع ہوتا ہے اور تین چار سال تک قائم رہتا ہے۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ شخصیت کا آغاز اس زمانہ میں ہوتا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ بلوغت کا سن شخصیت کے ارتقا میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وقت ہے جب کہ ذہنی رویے اور عواطف، جو شخصیت کے اہم عناصر ہیں، خاص شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

ورثہ اور ماحول کا شخصیت پر اثر:

شخصیت کا سرچشمہ تو عضویہ ہے جس کی ابتدا جسمانی اور نفسی میلانات سے ہوتی ہے۔ یہ عضویہ پیدائش سے شروع نہیں ہوتا اور نہ ہی حمل سے۔ اس کی جڑیں آبا و اجداد اور اپنی نوع میں بلکہ تمام ارتقا کی تاریخ میں ملیں گی۔ ہر عضویہ کو کچھ ورثہ اپنی تاریخ سے یعنی آبا و اجداد یا نوع سے ملتا ہے۔ یہ ورثہ ہماری شخصیت کا اہم عنصر ہے اور شخصیت پر اثرانداز ہوتا ہے۔ جس فرد کی وراثت صحیح ہو اس کی شخصیت عام طور پر صحیح ہوتی ہے۔ عام طور کا لفظ ہم نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ بعض اوقات نامساعد حالات اچھے ورثہ کے اثرات کو خراب کر دیتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ایک عام انسان ورثہ کو بڑا اہم سمجھتا ہے۔ شخصیت کا جائزہ لیتے وقت وہ پوچھتا ہے کہ اس کا باپ کون تھا، اس کی ماں کس نسل سے تھی۔ اگر دونوں والدین امتیازی خصوصیات رکھتے ہوں تو خوشگوار اثر لیا جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ عام درجہ کے انسان ہوں یا نامی مجرم اور بدکار، تو برا اثر پڑتا ہے۔ لیکن یہ جائزے غلط بھی نکلتے ہیں۔ کیوں کہ ورثے کا تعین اس قدر آسان نہیں۔ ورثے کے قوانین اس قدر پیچیدہ ہیں کہ کوئی شخص وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ فلاں نے والدین سے وراثت میں کیا پایا ہے اور آبا و اجداد یا نوع سے کیا حاصل کیا ہے۔ لہٰذا عام انسانوں کے اندازوں کو احتیاط سے

قبول کرنا چاہیے ۔ اچھی نسل کا فائدہ ہوتا ہے لیکن عمومی حیثیت سے ۔

جو کچھ کسی شخص کو ورثے میں ملتا ہے اس پر ماحول کا گہرا اثر ہوتا ہے ۔ لیکن ماحول کے اثرات کو بھی ورثہ کے اثرات کی طرح ٹھیک ٹھیک متعین نہیں کیا جا سکتا ۔ شخصیت کا دار و مدار تو ثانوی ساخت (Secondary Structure) پر ہے ۔ یہ ساخت اکتسابی میلانات پر مشتمل ہوتی ہے گو ان میلانات کی بنیاد فطری تقاضوں پر ہے ۔ لیکن فطری ساخت میں ایک گونہ یک رنگی اور استقرار ہے، جو ثانوی ساخت میں مفقود ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ماحول کے عناصر ورثہ کے عناصر کے مقابلہ میں زیادہ تغیر پذیر ہوتے ہیں ۔ شخصیت کی تعمیر ورثے اور ماحول کے باہمی تفاعل سے ہوتی ہے ۔ ورثہ تو ہمارے قابو سے باہر ہے ۔ البتہ ماحول ہمارے حیطۂ اقتدار میں ہے ۔ ماحول کے عناصر کا علم ہو سکتا ہے اور ان پر قابو بھی پایا جا سکتا ہے ۔ جو لوگ انسانی فطرت کو بہتر بنانا چاہتے ہیں وہ دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں ، یا تو وہ ورثے کو بہتر بنانا چاہتے ہیں یا ماحول کو ۔ نسلیات (Eugenics) ایسا علم ہے جو ورثے کو بہتر بنانا چاہتا ہے ۔ تعلیم اور معاشری تعمیر کے ادارے ماحول کو سنوارنا چاہتے ہیں ۔ ان دونوں پروگراموں کے درمیان کوئی تصادم نہیں ہونا چاہیے ۔ نسلیات کے ذریعہ سے منفی کام ہو سکتا ہے ۔ یعنی مریض اشخاص کو شادی سے باز رکھا جائے تا کہ دماغی اور جسمانی لحاظ سے کمزور بچے پیدا نہ ہوں ۔ لیکن تعلیمی اور سماجی تعمیر کی تحریکیں مثبت کام کر سکتی ہیں ۔ ماحول کو بہتر بنا کر صحت مند اور صحیح العقل افراد کی تعداد بڑھائی جا سکتی ہے ۔ ہماری گورنمنٹ نے بھی پنج سالہ ترقی کے منصوبے بنا رکھے ہیں ، کئی پنج سالہ منصوبے ختم ہو چکے ہیں ، اور بن رہے ہیں ان منصوبوں کا منشا معاشی، سماجی اور اخلاقی ماحول کو سدھارنا ہے ۔

ان منصوبوں کی پشت پر فلسفہ یہ ہے کہ ماحول کو سدھارنے سے ہی تو انسان سدھر جاتا ہے ۔

شخصیت کی تشریح (Describing Personality) :

ووڈورتھ کے نزدیک شخصیت کے متعلق دو سوال اٹھائے جا سکتے ہیں :

(۱) شخصیت کا اندازہ کیسے ہو سکتا ہے ؟

(۲) شخصیت کو کیسے بہتر بنایا جا سکتا ہے ؟

پیشتر اس کے کہ ان سوالات کا جواب دیا جائے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شخصیت کا تجزیہ کیا جائے ۔

شخصیت کی تشریح کرتے وقت عام آدمی کسی سائنسی قاعدے یا اصول کا پابند نہیں ہوتا ۔ لیکن ماہر نفسیات اس مطلب کے لیے شخصیت کی اہم امتیازی خصوصیات لے لیتا ہے اور انھیں سائنسی طریقے سے بیان کرتا ہے ۔ شخصیت کی امتیازی خصوصیات وہ ہوں گی جو فرد کے اکثر مشاغل پر حاوی ہوں اور دیر تک قائم رہیں ۔ مثلاً خوش باشی یا خود اعتمادی شخصیت کے لیے امتیازی نشانیاں ہوں گی کیوں کہ ایک تو یہ خصائص دیرپا ہیں دوسرے بیشتر مشاغل میں ان کا ظہور ہوتا ہے ۔ کئی خصائص کا پتہ صرف سوسائٹی میں لگتا ہے ۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں آدمی بہت خوش مذاق ہے تو اس کی خوش مذاقی کی شہادت لوگوں کے سلوک سے ملتی ہے ۔ وہ الف ، ب یا س کے ساتھ جب بھی ملتا ہے ، خندہ پیشانی سے پیش آتا ہے ، ہنس کر بولتا ہے ، لطیفہ گوئی کرتا ہے یا گپ شپ لگاتا ہے ۔ ضروری نہیں کہ اگر وہ الف ، ب یا س کے ساتھ خوش گوار تعلق رکھتا ہو تو اس کا رویہ ج ، د کے ساتھ بھی بھی ہو ۔ شخصیت کے امتیازی خصائص کا مظاہرہ انسانوں کے باہمی تفاعل سے ہوتا ہے ۔ فرض کیا کہ شادی سے پہلے کوئی لڑکا اور لڑکی دونوں خوش باش سلیم الطبع اور سمجھدار ہیں لیکن شادی کے بعد

چونکہ حالات بدل جاتے ہیں ، ممکن ہے ان کے آپس کے تعلقات ویسے
رہیں جن کی توقع کی گئی ہو ۔ دو انسانوں کے اکٹھے رہنے سے ایک
گسٹالٹ (Gestalt) معرض ظہور میں آتا ہے اس گسٹالٹ کے اپ
خصائص ہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ خصائص ابتدائی خصائص کے مثل ہوں
بعض دفعہ گسٹالٹ کے خواص باہمی تفاعل سے پیدا ہوتے ہیں ، ان
وجود شادی شدہ جوڑے کے انفرادی کیرکٹر میں نہیں ملتا ۔ لہٰذا
قسم کے جوڑے کامیاب اور نا کام نظر آتے ہیں ۔ باہمی تفاعل سے ج
خصائص پیدا ہوتے ہیں ان کا پیش از وقت صحیح صحیح اندازہ لگا
محال ہے ۔

کئی لوگ متذکرہ بالا بیان سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جب ما
نفسیات شخصیت کا اندازہ لیبارٹری میں لگاتا ہے تو وقت ضا
کرتا ہے ۔ کیونکہ شخصیت انسانوں کے باہمی تفاعل کی پیداوار ہے
ووڈورتھ یہاں پر اختلاف رکھتا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ شادی کے متعل
بھی قیافے لگ سکتے ہیں ۔ امریکہ اور یورپ میں شادی کے بیو
(Marriage Bureau) شادی سے پہلے اور شادی کے بعد ضرورت م
اشخاص کو مفید مشورے دیتے ہیں ۔ وہ یہاں تک کہہ دیتے ہیں
فلاں جوڑے کی شادی کے کامیاب ہونے کے کتنے فی صد امکانات ہیں
ووڈورتھ کہتا ہے کہ اگر ہر قسم کے خصائص شادی کے لیے موز
یا غیر موزوں ہوں تو ہر قسم کا جوڑا کامیاب یا ناکام رہے گا ۔ لیکن
حقیقت میں ایسا ہوتا نہیں ۔ علاوہ ازیں ووڈورتھ اس امر کو بھی ما
نہیں کرتا کہ شخصیت کے خصائص کا مظاہرہ صرف معاشری ماحول م
ہوتا ہے ۔ بعض دفعہ انسان خوش ہوتا ہے اور ہوا میں سیٹی بجاتا ج
جاتا ہے یا خفا ہے تو راستہ میں جو آیا اس کو ٹھوکر لگاتا چلا گ
ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا ایک مشہور مثل ہے ۔ انسان خود کسی
کے اہل نہیں ہوتا اور خواہ مخواہ ہر شے سے لڑتا جھگڑتا ہے ۔

شخصیت کے خصائص کا پتہ بھی قابلیتوں کی طرح چلتا ہے۔ جب تک قابلیتیں بیدار نہ ہوں ان کا علم نہیں ہوتا۔ اسی طرح جب تک خوش مذاق آدمی خوش مذاق کا مظاہرہ نہ کرے اس کی خوش مذاق کا علم نہیں ہوتا۔ گویّے میں موسیقی کی قابلیت ہوتی ہے۔ جب وہ گائے گا اس کی قابلیت کا پتہ چلے گا۔ ماہر نفسیات کو شخصیت کی پیمائش کرتے وقت ان خصائص کو بیدار کرنا چاہیے ورنہ ان کا پتہ نہیں چلے گا۔

یاد رہے کہ خصائص اضداد میں ملتی ہیں۔ مثلاً خوش باشی کے مقابلہ میں محزونیت اور شفقت کے مقابلہ میں ظلم، حاکمیت کے مقابلہ میں محکومیت اور بہادری کے مقابلہ میں بزدلی ہے۔ شخصیت کا جائزہ لیتے وقت ہمیں افراط اور تفریط سے احتراز کرنا چاہیے۔ یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ اگر کوئی آدمی شفیق نہیں تو ظالم ہوگا یا اگر وہ بہادر نہیں تو بزدل ہوگا۔ کیونکہ یہ خصائص ابعاد (Dimension) بناتے ہیں مثلاً بہادری اور بزدلی یا شفقت اور ظلم کی ابعاد بنیں گی اگر ایک سرے پر بہادری ہو تو دوسرے سرے پر بزدلی ہوگی۔ بہادری آہستہ آہستہ گھٹے گی، درمیان میں نہ بہادری رہے گی نہ بزدلی۔ پھر بزدلی بڑھتی چلی جائے گی اور بہادری گھٹتی جائے گی اور سرے پر صرف بزدلی رہ جائے گی۔ لہٰذا بہادری اور بزدلی کی بُعد میں ہزاروں لوگ سما سکتے ہیں کیونکہ اس میں سینکڑوں مدارج ہیں۔ یہی حال دوسری ابعاد کا ہے۔

ہر بُعد کو الگ اور خود مختار ہونا چاہیے اس کا علم باہمی تعلق (Correlation) کے طریقے سے ہو سکتا ہے اگر دو ابعاد میں باہمی تعلق زیادہ ہو تو وہ حقیقت میں ایک ہی بُعد ہوں گی۔ فرض کیا ایک بُعد تو خوش باشی اور محزونیت کا ہے اور دوسرا شفقت اور ظلم کا۔ ان دو ابعاد پر لوگوں کو پرکھنے کے بعد اگر یہ معلوم ہو کہ جو مقام ان کا ایک میں ہے وہی دوسری میں ہے ، تو اس سے نتیجہ نکلے گا کہ دونوں ابعاد اصل میں ایک ہی ہیں۔ لیکن اگر ایک بُعد کا دوسری سے کوئی

تعلق نہ ہو تو ابعاد علیحدہ علیحدہ ہوں گی ۔ اس طرح ہمیں پتہ چل جاتا ہے کہ کونسی ابعاد کو شخصیت کا جائزہ لیتے وقت خیال میں رکھنا ضروری ہے ۔

ووڈورتھ کہتا ہے[۱] کہ بارہ خود مختار بنیادی ابعاد ہیں ۔

بنیادی خصائص	اضداد
۱۔ سہل انگاری ، خوش باشی ، گرم جوشی ۔	سخت مزاجی، مخالفت ، شرمیلاپن۔
۲۔ ذہین ، خود مختار اور قابل اعتماد ۔	بے وقوف ، سوچ اور فکر سے عاری ، بیہودہ ۔
۳۔ ہیجانات میں پختگی ، حقیقت پسندی ، منفعل مزاجی ۔	عصبانی، متلون مزاجی، حیلہ جوئی۔
۴۔ اقدار پسندی، خوداثباتی،غلبہ۔	منکسر مزاجی ، خاکساری ۔
۵۔ باتونی ، ہنس مکھ ، ملنے جلنے والا ، پرسکون ۔	غمزدہ ، افسردہ ، الگ تھلگ رہنے والا ، بے چین ۔
۶۔ حساس، نرم دل والا، ہمدرد۔	بے حس ، غیر جذباتی ، صاف دل ۔
۷۔ تربیت یافتہ اور تہذیب یافتہ جمالیاتی ۔	غیر مہذب ، ناشائستہ ، ہیجانی ۔
۸۔ ذمہ دار، محنتی، پابند اصول۔	غیر ذمہ دار ، دست نگر ۔
۹۔ مشفق ، غم اور فکر سے آزاد ، باہمت ۔	ہچکچاہٹ کا مریض ، کم بات کرنے والا ، محتاط ، تارک الدنیا ۔
۱۰۔ قوی ، طاقتور، بات کا پکا ، جلد باز ۔	سست ، کاہل ، خیالی پلاؤ پکانے والا ۔
۱۱۔ بہت زیادہ ہیجانی، زود حس، جوشیلا ۔	بلغمی مزاج والا ، بردبار ۔
۱۲۔ دوستانہ برتاؤ کرنے والا ۔ قابل اعتبار ۔	شکی ، عداوت رکھنے والا ۔

۱۔ ملاحظہ ہو اس کی Psychology ، صفحہ ۹۱ ۔

ینگ (Jung) کا نظریہ :

ینگ کے خیال میں شخصیت کے دو پہلو ہیں یا تو دروں بینی کا رجحان غالب ہوتا ہے یا بروں بینی کا ۔ پہلے کو وہ (Introversion) کا نام دیتا ہے دوسرے کو (Extraversion) کہتا ہے ۔ بروں بین (Extravert) زمانہ حال اور اس کی دلچسپیوں میں منہمک رہتا ہے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں شاداں و کامراں رہے ۔ اس کا مزاج عملی ہوتا ہے ۔ عمل سے اس کو لگاؤ ہوتا ہے وہ لوگوں کے ساتھ مل کر خوش رہتا ہے ۔ ٹھٹھا مخول اس کا شیوہ ہے ۔ اداروں میں منصب چاہتا ہے ۔ الیکشن لڑتا ہے ۔ کامیابی کے لیے ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے ۔ اخباروں میں اپنے متعلق مضامین نکلواتا ہے ، دعوتیں اور پارٹیاں دیتا ہے ۔ یاروں کا یار اور دشمنوں کا دشمن ہوتا ہے ۔ دروں بین (Introvert) اس کے برعکس ہے ۔ وہ مستقبل کے متعلق ہوائی قلعہ بناتا ہے ، اقدار پہ مرتا ہے ۔ علم کا خواہاں ہے ۔ باطنی مطالعہ میں مصروف رہتا ہے ۔ تخیلات اور وجدانیت میں یدطولیٰ رکھتا ہے ۔ عمل سے گریز کرتا ہے ۔ غور و فکر کے سمندر میں ڈوبا رہتا ہے ۔ غرض کہ بروں بیں تو عمل کا شیدا ہے ۔ دروں بیں علم کا متمنی ہے ۔

ووڈورتھ کہتا ہے کہ مندرجہ بالا خصائص دروں بینی (Introversion) کو تعقلی طور پر بروں بینی سے علیحدہ کرتے ہیں لیکن ان دونوں کا فرق گروہی (Social) طریقہ سے بھی بیان ہو سکتا ہے ۔ مندرجہ ذیل سوالات دیکھیے :

کیا آپ لوگوں کے ہجوم کے سامنے کلام کرنا پسند کریں گے ؟

کیا آپ کی ہمیشہ خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے آپ سے متفق ہوں؟

کیا آپ آسانی سے دوست بنا لیتے ہیں ؟

کیا اجنبیوں میں آپ گھبراتے تو نہیں ؟

کیا معاشری اجتماعات میں آپ پیش قدمی چاہتے ہیں ؟
کیا آپ کو یہ تشویش ہے کہ لوگ آپ کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں ؟
کیا آپ دوسروں کی نیت پر شک کرتے ہیں ؟
کیا آپ احساس کمتری کے شکار ہیں ؟
کیا آپ جلد پریشان ہو جاتے ہیں ؟
کیا آپ کے احساسات کو جلد ٹھیس لگ جاتی ہے ؟

پہلے پانچ سوالوں کا جواب اگر مثبت میں دیا جائے تو اس سے خارجی دنیا میں دلچسپی ظاہر ہوگی اور اگر آخری پانچ کے جواب 'ہاں' میں ہوں تو اس سے دروں بینی ظاہر ہوتی ہے ۔ ان سوالات سے دروں بینی اور بروں بینی کا سوشل پہلو اجاگر ہوتا ہے ۔ پچھلے پانچ سوالات کا تعلق جذباتی پختگی ، نفسی وحدت اور جمعیت سے بھی ہے ۔

اس تشریح کے پیش نظر ووڈورتھ کو ینگ سے اتفاق نہیں ۔ وہ کہتا ہے کہ ینگ ، دروں بینی اور بروں بینی میں ایک بُعد پیش کر رہا ہے حالانکہ یہاں پر تین ابعاد ہیں ۔ ایک تو ہے عمل کے مقابلہ میں خیالات سے دلچسپی ۔ دوسرا ہے سوسائٹی کے مقابلہ میں تنہائی سے دلچسپی اور تیسرا ہے زندگی میں مصیبتوں کی طرف دھیان ۔ یہ ابعاد ایک دوسرے سے الگ اور خود مختار ہیں ان کو اکٹھا کر دینا اور ایک ہی بُعد میں ملا دینا ٹھیک نہیں ۔ ایک اور نقص جو ینگ کی جماعت بندی میں ہے وہ یہ ہے کہ ہر آدمی کو یا تو بروں بین یا دروں بین سمجھا جاتا ہے ۔ حالانکہ یہ دونوں خصائص انتہا پر ہیں ۔ ہم پہلے پڑھ آئے ہیں کہ لوگوں کی اکثریت کبھی انتہا پر نہیں ہوتی ان کا مقام تو وسط میں یا وسط کے قریب ہوتا ہے۔ لہٰذا بروں بین اور دروں بین کے درمیان ایک تیسرا درجہ تسلیم کرنا پڑا ہے جسے دوبینی (Ambiversion) کہتے ہیں یہ دونوں انتہاؤں کے درمیان ایسی منزل ہے جہاں وہ لوگ ہوں گے جو

کچھ خصائص تو دروں بینی کے رکھیں گے اور کچھ خصائص بروں بینی کے - اس منزل پر اکثر لوگ پائے جائیں گے -

شخصیت کا جائزہ کیسے لیا جاتا ہے ؟

شخصیت کو سمجھنے اور اس کا جائزہ لینے کے مختلف طریقے بیان کیے جاتے ہیں - بعض لوگ ستاروں سے کریکٹر کا اندازہ کرتے ہیں - وہ دیکھتے ہیں کہ جب کوئی شخص پیدا ہوا تھا اس وقت کون سا برج اور ستارہ غالب تھا - اس علم کو علم النجوم کہتے ہیں - بھارت میں اس علم کا بڑا رواج ہے ، لوگوں کی جنم پتریاں تیار کی جاتی ہیں - ساری زندگی کا زائچہ تیار ہوتا ہے اس جنم پتری میں پیشگوئیوں کے علاوہ متعلقہ شخص کے کریکٹر کی تشریح بھی ہوتی ہے - علم النجوم کے حامیوں کا دعویٰ ہے کہ ستاروں سے کریکٹر کا صحیح صحیح اندازہ ہو جاتا ہے - اگر یہ دعویٰ سچ ہو تو اس کا مطلب ہوگا کہ کریکٹر بنانے میں خود انسان کو اتنا دخل نہیں جتنا ستاروں کو ہے اور یہ بظاہر غلط نظر آتا ہے - کچھ لوگ ہاتھوں کی لکیروں سے شخصیت کا علم حاصل کرتے ہیں - لکیروں کے علاوہ انگلیوں کی ساخت پر بھی غور کرتے ہیں - لکیروں کی لمبائی ، گہرائی یا کٹا پھٹا ہونا شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو عیاں کرتا ہے - اس سائنس کو دست شناسی (Palmistry) کہتے ہیں - اس میں کچھ شک نہیں کہ دست شناسی کی کچھ پیش گوئیاں ٹھیک نکل آتی ہیں - لیکن ہمارے ملک میں کوئی ایسے اعداد و شمار نہیں جن سے پتہ لگ سکے کہ کتنے فی صد پیش گوئیاں صحیح نکلیں اور کتنے فی صد غلط -

سائنسی لحاظ سے علم النجوم اور علم دست شناسی بہت کمزور ہیں - لہٰذا ان کی پیش گوئیوں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا ہے -

ایک اور طریقہ جو شخصیت معلوم کرنے کا اختیار کیا گیا ہے وہ جسمانی حالت سے نفسی خصائص کی طرف جانے کا ہے - از منہ گزشتہ سے

لوگوں کا خیال ہے کہ جسم کی بناوٹ سے مزاج اور طبیعت کا پتہ چل سکتا ہے ملاحظہ ہو شیکسپیئر کا ڈرامہ جولیس سیزر جہاں کیسیس (Cassius) کے متعلق کہا گیا ہے :

Let me have men about me that are fat
Sleek headed men and such as sleep o'night
Yond Cassius has a lean and hungry look.
He thinks *too much* : such men are dangerous.

شیکسپیئر کہتا ہے "موٹے چمکتے سر والے اور ایسے آدمی جو رات کو جی بھر کر سوئیں میرے گرد ہونے چاہییں ۔ کیسیس کی دبلی ، پتلی وضع قطع ہے ۔ وہ سوچتا زیادہ ہے ۔ ایسے آدمی خطرناک ہوتے ہیں۔"

مندرجہ بالا خیال کو ایک جرمن نے جس کا نام کریچمر (Kretschmer) تھا جامہ عمل پہنایا ۔ اس کا دعویٰ تھا کہ (۱) جسم انسانی کے بعض حصوں کی پیمائش سے ہر انسان کو تین جاعتوں میں سے ایک میں ضرور رکھا جا سکتا ہے ۔ (۲) انسان کی طبیعت کا اندازہ اس کی جاعت سے لگ سکتا ہے ۔

اس مقصد کے پیش نظر کریچمر نے مریضوں کو تین جاعتوں میں تقسیم کیا ۔ پہلی قسم جسے منہوک (Asthenic) کہا گیا ، اس کا سر لمبا ، دھڑ چھوٹا ، ٹانگیں لمبی ، مونڈھے اور کولھے تنگ اور جسم پر چربی کم تھی ۔ دوسری قسم جسے ورزشی (Athletic) کہا گیا ہے اس کا سر قدرے لمبا، دھڑ اور ٹانگیں سڈول، کولھے تنگ لیکن چوڑے تھے۔ پٹھے بھی خاصے مضبوط تھے۔ تیسری قسم جسے فربہاندام (Pyknic) کا نام دیا گیا ہے ، اس میں سر چوڑا ہوتا ہے ۔ دھڑ لمبا ، ٹانگیں چھوٹی مونڈھے تنگ ، کولھے فراخ اور گوشت کثرت سے ہوتا ہے ۔ ان تین قسموں کے علاوہ ایک چوتھی قسم بھی ہے جس میں ایسے لوگوں کو شامل کیا گیا ہے جو پہلی تین قسموں میں نہیں آتے ۔ اس چوتھی قسم

کو غیر طبعی نمو (Dys-Plastic) کہا گیا ۔

کریچمر نے شخصیت کی قسموں کا اندازہ مریضوں سے کیا ۔ اس نے دیکھا کہ پہلی دو اقسام سے تعلق رکھنے والے مریض تنہائی پسند اور اپنے خیالوں کی دنیامیں بسنے والے ہیں۔ یہ دونوں علامتیں انشقاقِ ذہنی (Schizophrenia) کے مریضوں کی ہیں۔ تیسری قسم کے لوگ معاشرہ پسند ہوتے ہیں لیکن جذبات کا اتار چڑھاؤ ان کی زندگی میں ضرور ہوتا ہے ۔ کبھی بے حد غمگین ہوتے ہیں۔ یہ علامتیں جنون وافسردگی (Depressive Manic) میں نمایاں ہوتی ہیں ۔

کریچمر نے بڑی کاوش سے حقائق کو اکھٹا کیا ۔ مندرجہ ذیل چارٹ ملاحظہ ہو ۔

جسمانی اور نفسی النتاد (Physical and Psychical Dispositisns)

جسمانی	نفسی: جنون و افسردگی	نفسی: انشقاقِ ذہنی
منہوک (Asthenic)	۴	۸۱
ورزشی (Athletico)	۳	۳۱
ضعفی ورزشی (Athenico Athletico)	۲	۱۱
فربہ اندام (Pyknic)	۵۸	۲
فربہ اندام مخلوط (Pyknic mixture)	۱۴	۳
غیر طبعی نمو (Dysplastic)	۵	۳۴
جن کی درجہ بندی ممکن نہیں (Un-cataloguable)	۴	۱۳

اس چارٹ سے جسمانی اور نفسی افتاد میں باہمی تعلق تو ملتا ہے لیکن اس تحقیق میں نقص یہ ہے کہ زیرتجربہ افراد کی تعداد بہت کم ہے صرف سو اشخاص کو لے کر کوئی نظریہ نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کے علاوہ جن اشخاص کو غیرطبعی نمو (Dys-plastic) جماعت میں رکھا گیا ہے وہ مشکوک ہیں۔

لیکن کریچمر کو اپنے دعویٰ کی صداقت کا کبھی یقین نہیں ہوا۔ وہ تو کہتا تھا کہ میں نے صرف ایک مشورہ دیا ہے اور مجھے توقع ہے کہ سائنسی طریقے سے لوگ اس کا سچ یا جھوٹ معلوم کریں گے۔ اب جن لوگوں نے نارمل انسانوں پر تجربات کیے ہیں انھیں کریچمر کے مفروضہ کی صداقت میں شواہد نہیں ملتے۔ لیکن جن لوگوں نے صرف ذہنی مریضوں کا معائنہ کیا ہے وہ کریچمر کے مفروضہ کو لغو نہیں سمجھتے، بلکہ اس میں کسی حد تک سچائی دیکھتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ نارمل انسانوں پر یہ مفروضہ کیوں غلط ثابت ہوتا ہے اور ذہنی مریضوں پر کیوں صحیح بیٹھتا ہے؟ اس کی وجہ، جسے مکمل طور پر سائنسی تو نہیں کہا جا سکتا، یہ ہو سکتی ہے کہ مریضوں میں بعض علامتیں مبالغہ کی حد تک پہنچی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس لیے جو خصائص نارمل انسانوں میں مدھم اور دھندلے نظر آتے ہیں وہ مریضوں میں غالب دیکھے جائیں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ مریضوں کے طبعی خصائص اور نفسی خصائص کا باہمی تعلق آسانی سے معلوم ہو جائے گا۔ لیکن نارمل انسانوں میں یہ تعلق مشکل سے دکھائی دے گا۔ جن خرابیوں کو کریچمر نے مریضوں میں دیکھا اور جن کی بنا پر اس نے نفسی خصائص کو شناخت کیا وہ خرابیاں ایسی علامتوں کی حامل ہیں جو مریضوں میں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہیں۔ لیکن نارمل انسانوں میں ہلکے پھیکے رنگ میں پائی جاتی ہیں۔

اسی مضمون کا ایک اور نظریہ حال ہی میں شیلڈن (Sheldon)

اور سٹیونس (Stevens) نے پیش کیا ہے۔ اس نظریے میں ہر انسان کو تین ابعاد سے بیان کیا جاتا ہے اور اس کا مقام متعین کیا جاتا ہے۔ پہلی بُعد کو دروں شکلی (Endomorphy) کہتے ہیں۔ دوسری کو بین شکلی (Mesmorphy) اور تیسری کو بروں شکلی (Ectomorphy) پہلی بعد میں جسمانی حالت نرم، گول اور چربی دار ہوتی ہے۔ دوسری میں عضلاتی (Muscular)، تیسری میں دبلی پتلی۔ ہر بُعد کے سات درجے ہوتے ہیں اور ہر انسان کو تینوں ابعاد میں پرکھا جاتا ہے۔ فرض کیا کہ ایک شخص پہلی بُعد میں ۲، دوسری میں ۷ اور تیسری میں ۳ کا شمار (Score) حاصل کرتا ہے۔ ایسا آدمی یقیناً بین شکلہ (Mesmorph) ہوگا۔

ان جسمانی ابعاد کے ساتھ تین قسم کے طبائع (Temperament) ہیں۔ پہلی کو احشائی (Viscertonia) دوسری کو قوائی (Somatotonia) اور تیسری کو مخیخی (Cerebrotonia) کہتے ہیں۔ پہلی طبیعت میں ہاضمہ خوب کام کرتا ہے۔ دوسری میں طاقت اور ادعائیت ہوتی ہے۔ تیسری میں ضبط ہوتا ہے اور معاشری معاملات سے بے اعتنائی برتی جاتی ہے۔

شیلڈن اور سٹیونس نے جسمانی ابعاد اور طبائع میں باہمی تعلق معلوم کیا ہے لیکن معترضین کا کہنا ہے کہ انہوں نے سیمپل (Sample) بہت تھوڑا لیا ہے۔ لہٰذا نتائج پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اوپر ہم نے دو نظریوں کا مطالعہ کیا ہے۔ ایک تو کریچمر کا تھا اور دوسرا شیلڈن اور سٹیونس کا یہ دونوں نظریے شخصیت کا اندازہ جسمانی بنیاد دن پر کرتے ہیں۔ ان سے پہلے ینگ کا نظریہ بیان کیا گیا جو نفسیاتی لحاظ سے شخصیت کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔

یہ تینوں نظریے سائنسی لحاظ سے تو غلط ہیں، لیکن دو سچائیوں کو اجاگر کرتے ہیں:

۱۔ ہر انسان میں کوئی ایسی اہم اور نمایاں صفت ہوتی ہے جو شخصیت کو عیاں کر دیتی ہے اس صفت کی حیثیت باقی تمام خصائص کے

مقابلہ میں بنیادی اور مرکزی ہوتی ہے۔ مثلاً ہم کسی آدمی کو حریص، کسی کو منکسرالمزاج، کسی کو دنیادار، کسی کو معاملہ فہم، کسی کو پاکباز، کسی کو ابن الوقت، کسی کو خوشامدی، کسی کو مغرور اور کسی کو خود سر کہتے ہیں۔ ان لوگوں میں ایسی صفات موجود ہیں جو باقی تمام پر غالب ہیں اور شخصیت کے نہایت اہم اور عمومی پہلو کو اجاگر کرتی ہیں۔ کارٹونسٹ (Cartoonist) ایسی ہی صفات کو لے کر انھیں بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے۔ اس کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ شخصیت کی مصوری اس صفت سے کرے جو اس کی نظر میں باقی تمام صفات پر حاوی ہو۔

۲- نمایاں صفات کی بنیاد پر انسانوں کی موٹی موٹی قسمیں بنائی جا سکتی ہیں۔ روزمرہ کی زندگی کو لیجیے، اس میں اشخاص کو ابعاد کے ذریعہ سے نہیں پرکھا جاتا اور نہ ہی ان کا مقام کسی بُعد میں متعین کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ اخلاقی طور پر کوئی انسان برا ہے یا اچھا۔ اسی طرح سے مکان خوب صورت ہے یا بد صورت۔ اشیائے خوردنی مہنگی ہیں یا سستی۔ فلم دلچسپ ہے یا پھیکی۔ یعنی عام طور پر ہر چیز کے لیے موٹی موٹی دو قسمیں بنا رکھی ہیں اور جائزہ لیتے وقت یا تو کسی چیز کو ایک جماعت میں رکھتے ہیں یا دوسری میں۔

کئی طریقوں سے شخصیت کی پیمائش ہو سکتی ہے لیکن من (Munn) کے نزدیک سات طریقے ہیں :

۱- مطالعۂ احوال کا طریقہ (Case History)۔

۲- درجہ بندی (Rating)۔

۳- پنسل اور کاغذ سے شخصیت ناپنے کے طریقے
(Pencil and Paper personality measuring devices)

۴- کرداری آزمائشیں۔

۵- انٹرویو۔

۶۔ آزاد تلازم اور خوابوں کا تجزیہ۔

۷۔ تظلیلی تکنیک (Projective Techniques)۔

(۱) مطالعۂ احوال :

اس قاعدے کی رو سے فرد کی گزشتہ زندگی، اس کے والدین، اس کے یار و احباب، اس کی دوستیوں، اس کی بیماریوں اور جنسی تجربات کے متعلق مناسب مواد اکٹھا کرنا ہے۔ ذہنی بیماریوں میں تو ایسا مواد نہایت ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی بدولت کئی الجھنوں کا پتہ چل جاتا ہے۔ شخصیت جانچنے کے لیے بھی فرد کے متعلق ہر قسم کا علم چاہیے۔اس لیے ہر سریرہ (clinic) میں ماہر نفسیات کی مدد کے لیے سوشل ورکر موجود ہوتے ہیں، جن کا کام باضابطہ طریقے سے فرد کے بارے میں ہر قسم کی معلومات اکٹھا کرنا ہوتا ہے۔ سوشل ورکر کو اس مقصد کے لیے تربیت دی جاتی ہے۔ اس کے پاس مختلف اقسام کے چارٹ اور سوال نامے ہوتے ہیں۔ وہ والدین، دوستوں، عزیزوں اور دشمنوں سے معیاری سوالات پوچھ کر مواد اکٹھا کرتا ہے۔ خود زیر تجربہ فرد سے گزشتہ زندگی کے متعلق استفسارات کرتا ہے۔ اس کی بیماریوں کا پتہ لگاتا ہے، دلچسپیوں کے متعلق سوالات اٹھاتا ہے۔ غرض کہ جدھر سے بھی مناسب مواد ملے اسے لے لیتا ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا اس مطالعہ کا منشا فرد کے متعلق ہر قسم کی معلومات جمع کرنا ہے اور جمع کرنے کے بعد شخصیت کا اندازہ لگانا ہے۔ بعض دفعہ فراہم شدہ مواد کی روشنی میں مریض کے لیے ایسے اسباب پیدا کیے جاتے ہیں، جن سے اس کا ذہنی توازن دوبارہ قائم ہو جائے۔ عموماً کوئی آدمی پسند نہیں کرتا کہ اس کا ماضی کریدا جائے۔ ہاں جب اسے کوئی کاوش یا الجھن ہو تو وہ اپنا ماضی دوسروں کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اگر دو طالب علم جو ایک دوسرے سے ہمدردی رکھتے ہوں؛ لیکن عشق نہ

کرتے ہوں ، ایک دوسرے کا مطالعہ احوال کریں تو خواہ ان کا مطالعہ بہت گہرا نہ ہو ، انہیں ایک دوسرے کی دلچسپیوں ، رویوں ، مقاصد اور امتیازی خصائص کا علم ہو جائے گا ۔ خود طالب علم اپنا مطالعہ احوال کر سکتا ہے ۔ وہ اپنی امیدوں، امنگوں اور دلچسپیوں کو گزشتہ زندگی کی روشنی میں دیکھ سکتا ہے ۔ اپنا جائزہ لیتے وقت اسے سکول ، کالج یا دیگر مشاغل کو فراموش نہیں کر دینا چاہیے ۔ ایسی خود نوشت سوانح عمریاں نفسیاتی لحاظ سے بہت دلچسپ ہوتی ہیں ۔

(۲) درجہ بندی (Rating) :

کسی شخص کو بہت اچھا یا بہت برا کہنے کی بجائے کیوں نہ ہم کوئی ایسا قاعدہ ڈھونڈیں، جس کی مدد سے 'بہت یا کم' کا لفظ چھوڑ دیا جائے اور حسابی طریقہ سے جائزہ ہو سکے ۔ ایسا جائزہ ہر لحاظ سے بہتر ہوگا ۔ ہمیں استادوں کی پڑھانے کی قابلیت کا اندازہ لگانا ہوتا ہے ۔ یا طلبہ کے متعلق کہنا ہوتا ہے کہ آئندہ ان سے کیا توقعات کی جا سکتی ہیں یا فوجی افسروں کے بارے میں رپورٹ کرنی ہوتی ہے کہ ان کی کتنی ضرورت ہے ۔ اگر ہماری رپورٹیں حسابی ہوں گی تو ہم ٹھیک ٹھیک کہہ سکیں گے کہ آیا ان لوگوں کو ملازمت میں رکھنا چاہیے یا نہیں ۔ یا انہیں ترقی ملنی چاہیے یا نہیں ۔ یا ان طلبہ کی سفارش اعلیٰ تعلیم یا ملازمت کے لیے کرنی چاہیے یا نہیں ۔

بچوں کی بھی درجہ بندی ہو سکتی ہے ۔ ایسی آزمائشیں لیجیے جس میں کئی مدات ہوں ۔ ہر مد کے ساتھ درجے ہوں ۔ ان درجوں میں سے ایک درجے پر نشان لگانا ہوگا ۔ درجوں کی تفصیل حسب ذیل ہے :

خاصیت موجود ہے ۔

خاصیت بہت ہلکی موجود ہے ۔

خاصیت ہلکی موجود ہے ۔

خاصیت اوسط درجہ کی ہے ۔

خاصیت نمایاں ہے۔
خاصیت بہت نمایاں ہے۔
خاصیت حد درجہ کی نمایاں ہے۔

ہر مد کا جائزہ لیتے وقت ممتحن کو کہنا ہوگا:
مجھے شک ہے۔
مجھے قدرے یقین ہے۔
مجھے پورا یقین ہے۔

ایک آزمائش کے چند سوالات ملاحظہ ہوں:
کیا وہ دوسرے بچوں کو تنگ کرتا ہے؟
کیا وہ کھانا کھاتے ہوئے شور مچاتا ہے؟
کیا وہ چیزیں لینے کے لیے اوپر چڑھتا ہے؟
کیا اس کا چہرہ خوب صورت ہے؟

بالغوں کے لیے بھی پیمانے ہیں، مثلاً جذباتی پختگی کے لیے ایسے سوالات ہوں گے:

کیا وہ لائحہ عمل اپنی زیادہ سے زیادہ تشفی کے پیش نظر بناتا ہے؟
کیا وہ جلدی جلدی ایک دلچسپی یا دلبستگی سے دوسری کی طرف چلا جاتا ہے؟
کیا وہ بہت زیادہ متفکر رہتا ہے کہ کہیں قانون اور ضابطہ کو نہ توڑ بیٹھے؟

اس پیمانے میں ساٹھ مدات ہیں، اس کی مدد سے اپنے آپ کو یا کسی دوسرے کو ناپ سکتے ہیں۔ مندرجہ ذیل پیمانے سے آپ دوستوں اور آشناؤں کا اندازہ بلحاظ ان کی شکل و شباہت اور افعال و کردار کے لگا سکتے ہیں۔

شکل اور اطوار

لوگ اس کی ملاقات کے طلب گار ہیں۔ مقبول ہے۔

اسے کوئی نہیں پوچھتا ۔	دوسرے اسے گوارا کرتے ہیں ۔

دوسرے اس سے پرہیز کرتے ہیں ۔

اس طرح قابل تعریف خصائص کا پیمانہ بھی بن سکتا ہے اور نیز ان خصائص کا بھی جنہیں بہتر بنانا چاہیے ۔

قابل تعریف خصائص	سدھرنے کے لائق خصائص
صحت بہت اچھی ہے ۔	سانس بدبودار ہے علاج کرنا چاہیے
جوش سے پر ہے ۔	سنگار (Cosmetic) کا استعمال کم کرنا چاہیے ۔
غور سے سنتا ہے ۔	لچر الفاظ کم استعمال ہونے چاہییں ۔
غصہ پر قابو ہے ۔	سوشل معاملات کی طرف زیادہ دھیان چاہیے ۔

وڈورتھ کا کہنا ہے کہ ہر خاصیت کا پیمانہ بن سکتا ہے اسے سو میں تقسیم کرکے ہر آدمی کا مقام ظاہر کیا جاتا ہے مثلاً :

	۱۰	۲۰	۳۰	۴۰	۵۰	۶۰	۷۰	۸۰	۹۰	۰۰
سرگرمی										
دلیری										
تصرف پزیری[۱]										
تعاون										
متلون مزاجی										
جذباتی										

۱- Adaptable

اس پیمانے پر کسی آدمی کو ناپنے سے اس کا مقام معلوم ہو جائے گا لیکن ناپنے والے اشخاص کئی ہونے چاہییں اور انہیں ناپنا بھی علیحدہ علیحدہ چاہیے تا کہ صحیح اندازہ ہو سکے ۔

اس درجہ بندی میں دو خطرات ہیں :

۱۔ خطائے خوش فہمی (Generosity Error) : ممتحن عموماً اپنی جان پہچان کے لوگوں کو اچھے مقام پر رکھتے ہیں ۔ مثلاً استاد اور پروفیسر اپنے طلبہ کو نہایت شان دار سارٹیفیکیٹ دیتے ہیں ۔ اور ان کے متعلق بڑی خوش فہمی رکھتے ہیں ۔ شماریاتی قاعدوں سے اس غلطی کا پتہ چل جاتا ہے ۔ اگر بہت سے لوگوں کو ناپنا ہو تو ان کی درجہ بندی (Distribution) کا معمولی درجہ بندی سے مقابلہ ہو سکتا ہے ۔ اگر ممتحنوں کی درجہ بندی اور معمولی درجہ بندی میں بہت زیادہ اختلاف ہو تو ممتحنوں کی درجہ بندی مشکوک ہوگی ۔

۲۔ بالائی اثر (Halo Effect) : اگر ایک آدمی کسی ایک خاصیت میں بہت اچھا مقام حاصل کرتا ہے ، یا ممتحن کو متأثر کر لیتا ہے ، تو ممتحن اس کو باقی خصائص میں بھی عمدہ مقام دے دیتا ہے ۔ اگر وہ ایک خاصیت میں اونچے مقام پر ہے تو دوسری خصائص میں بھی اسے اونچے مقام پر رکھ دیا جاتا ہے۔ اور اگر اس نے اپنے متعلق برا اثر دے دیا ہو تو ہر خاصیت میں اسے ادنوا مقام پر رکھا جاتا ہے۔

ان اغلاط سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ممتحن کئی ہوں ۔ ان کے جائزوں کی اوسط نکال لینی چاہیے ۔ یہاں بھی دو احتیاطوں کی ضرورت ہے :

۱۔ مختلف ممتحن ایک ہی خیال کے نہیں ہونے چاہییں ۔ مثلاً اگر سب کے سب ممتحن طالب علم کے استاد ہوں یا اس کے سکول سے تعلق رکھتے ہوں تو ہر ایک کا تعصب ایک جیسا ہوگا ۔ اوسط سے تعصب بڑھ جانے کا کم ہونے کے امکان نہیں ۔

۲۔ اوسط وہاں مفید رہے گی جہاں ایک ممتحن کی رائے صائب ہو۔ مثلاً اگر ہیڈ ماسٹر دیانتداری سے صحیح رپورٹ لکھے تو صورت میں کسی اور سے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

جب ایک ہی شخص کی صفات کا جائزہ مختلف ممتحن لیں ان کے شمار (Score) کو جمع کرکے اوسط نکال لینی چاہیے۔ یا کے بعد ممتحنوں کو اکٹھا بیٹھ کر بات چیت کرنی چاہیے ت ایک دوسرے کے نقطہ نگاہ کا پتہ چل سکے اور یہ معلوم ہو جا کہ کیوں فلاں نے زیادہ یا کم نمبر دیے ہیں۔ پہلا طریقہ کالجوں ، عام استعمال ہوتا ہے۔ مقابلے کی تقریروں میں مختلف جج ہوتے ہیں ، نمبر دیتے ہیں اور بعد میں اوسط نکال کر اول ، دوم ، اور سوم کا اعل کر دیا جاتا ہے۔ دوسرا طریقہ ترقی یافتہ اداروں میں استعمال کیا ج ہے۔ یہ طریقہ یوں تو بڑا مفید ہے ، لیکن اس میں ایک خطرہ ہے۔ شخص اس بحث میں مرکزی حیثیت رکھے گا یعنی چیئرمین ہوگا، کالج پرنسپل ہوگا یا گورنمنٹ کا افسر ہوگا وہ اپنی بات منوا لے گا اور دوسر کی آراء کو متأثر کر دے گا۔

۳۔ پنسل اور کاغذ سے شخصیت ناپنے کے طریقے ، سوال نامے :

سوال ناموں میں کئی سوالات دیے ہوتے ہیں ، ان کا جواب ہاں نہ میں دینا ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ نشان لگانے والی فہرس (Checklists) ہوتی ہیں جن میں کئی ایک اختیاری (Options) اشیا ذکر ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک پر نشان لگانا ہوتا ہے۔ آج کل پنس اور کاغذ سے ناپنے کے بے شمار طریقے ایجاد ہو چکے ہیں ان میں سے ایک کا ذکر کیا جائے گا۔

فرض کیا کہ آپ کسی شخص کو ایسی بُعد پر ناپنا چاہتے جس کے ایک سرے پر تو ہر موقع پر مصیبت کا اظہار ہے اور دوسر پر کسی جگہ بھی مصیبت کا اظہار نہیں۔ اس مطلب کے لیے آپ تکال

اور مصائب کی ایک فہرست تیار کرتے ہیں اور کسی شخص کو کہتے ہیں کہ جو تکالیف وہ اپنی زندگی میں پاتا ہے انہیں نشان کر دے۔ یہ تکالیف حسب ذیل ہو سکتی ہیں :

خراب صحت	بے چینی	مخلص دوست نہ پانا
جسمانی کمتری	مستقل تھکاوٹ	شرم و حیا
تھوڑی بھوک	مستقل سر درد	عدم خود اعتمادی
شب بیداری	مستقل فکر	سر گردانی
برے خواب	مستقل چڑچڑا پن	لا یعنی خوف
نامعلوم درد	تنہائی	پشیمانی
سر گرانی	بیزاری	نکتہ چینی کا شکار ہونا
بے عزت کیا جانا	نا واجب سلوک	زندگی کی سختیاں
غلط فہمی کا شکار ہونا	مستقل ناکامی	لوگوں کی بدکاریاں
بد قسمتی	زندگی میں عدم تحفظ	زندگی میں عیش کا فقدان

یاد رہے کہ ان مصائب کا انحصار ماحول پر نہیں بلکہ فرد کی ذات پر ہے۔ اگر مصائب کا شمار (Socre) بہت زیادہ ہو تو فرد کو نفسیاتی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ووڈورتھ بیان کرتا ہے کہ کالج کے لڑکوں کو دو سو مصائب کی فہرست نشان لگانے کے لیے دی گئی۔ طلبہ کا شمار (Score) مختلف تھا۔ یہ صفر سے لے کر ایک سو تک جاتا تھا۔ اوسط تقریباً ۳۵ تھی۔ ضروری نہیں کہ زیادہ مصائب بتانے والا شخص عصبانی (Neurotic) ہو۔ عصبانی تو اصل میں وہ ہے جو خواہ مصائب زیادہ ہوں یا کم ان سے گھبرا جاتا ہے اور جی چھوڑ دیتا ہے[1]۔

سوال ناموں سے دلچسپیوں کا بھی تعین ممکن ہے۔ ایک آزمائش میں ۱۶۸ سوالات ہیں ان کے جوابات سے میکانکی، حسابی، سائنسی،

۱۔ ملاحظہ ہو ووڈورتھ کی سائیکالوجی، صفحہ ۱۰۲۔

جمالیاتی ، ادبی ، موسیقی ، خدمت خلق ، کلرکی ، لیڈری وغیرہ کی دلچسپیاں معلوم کی جاتی ہیں ۔ یہ آزمائشیں پیشہ ورانہ رہنمائی میں بڑے کام کی چیز ہیں ۔ فرد کا شمار بتا دے گا کہ کون سا پیشہ اس کے لیے مناسب رہے گا ۔ ایک اور قسم کی آزمائش میں فرد کی دلچسپیوں کا مقابلہ کسی پیشہ میں کامیاب لوگوں کی دلچسپیوں سے کیا جاتا ہے ۔ ان آزمائشوں کے دو فوائد ہیں ۔

۱۔ اکثر فرد کو خود بھی پتہ نہیں ہوتا کہ اس کی قابلیتیں اور دلچسپیاں کیا ہیں ۔ لہٰذا ان آزمائشوں سے صحیح صحیح پیشہ ورانہ رہنمائی ہو سکتی ہے ۔ والدین کا صلاح مشورہ بھی غیر سائنسی اور جذباتی ہوتا ہے اس لیے اعتبار کے قابل کم ہی ہوتا ہے ۔ پاکستان میں موجودہ حالات کے پیش نظر ہر والد اپنے بچے کو ڈاکٹر یا انجنیئر بنانا چاہتا ہے۔ اسے یہ پتہ نہیں ہوتا کہ آیا اس کا بچہ ان دو پیشوں کی قابلیتیں اور دلچسپیاں بھی رکھتا ہے یا نہیں ۔ اگر اس بچے میں ان دلچسپیوں کا فقدان ہو تو آئے سال فیل ہوگا یا اگر پاس بھی ہوگا تو ناکام اور ناخوش رہے گا ۔

۲۔ ان آزمائشوں سے ایک فرد کا دوسرے افراد سے مقابلہ ہوتا ہے۔ ہر پیشے میں کامیاب اور ناکام لوگ ہوتے ہیں ۔ کسی فرد کی دلچسپیوں کو پیشے کے کامیاب اور ناکام لوگوں کی دلچسپیوں سے مقابلہ کرکے صحیح مشورہ دیا جا سکتا ہے ۔

بعض سوال ناموں سے مذہبی اور سیاسی دلچسپیوں کا پتہ لگ جاتا ہے ۔ چند سوالات نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں ۔

— کیا مستقل امن کی خواہش ایک واہمہ ہے ؟

— کیا لوگوں کا جوش برقرار رکھنے کے لیے کبھی کبھی جنگیں لڑنی چاہییں ۔

— کیا امن پسند شہریوں کا فرض ہے کہ وہ ہر قسم کی جنگ میں

شریک ہونے سے انکار کر دیں ؟

من (Munn) نے جارج واشنگٹن آزمائش کا ذکر کیا ہے ، جسے
اشری ذہانت کی آزمائش کہا جاتا ہے ۔ معاشری ذہالت سے مراد ہے
ہ کیا ایک فرد میں دوسروں کے ساتھ گزارہ کرنے کی استعداد موجود
ہ ؟ اس آزمائش کے چار پہلو ہیں :

(۱) معاشری مسائل حل کرنا ۔
(۲) مقرر کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانا ۔
(۳) ناموں اور چہروں کی یادداشت رکھنا ۔
(۵) حس ظرافت (Sense of Humour) ۔

ان کی مثالیں ملاحظہ کیجیے ۔

۱۔ ایک نوجوان کسی لڑکی کو سنیما کی دعوت دیتا ہے ۔ وہاں
نچ کر اسے پتہ چلتا ہے کہ وہ بٹوا بھول آیا ہے ۔ اب اس کے لیے بہتر
کا کہ :

(ا) اپنی گھڑی گروی رکھ کر ٹکٹ خریدے ۔
(ب) کسی دوست کو دیکھے جو اسے قرض دے دے ۔
(ج) لڑکی سے مشورہ کرے کہ اب کیا کیا جائے ۔
(د) کوئی بہانہ ڈھونڈے اور گھر جا کر بٹوا لے آئے ۔

ان چار جوابات میں سے اس جواب پر نشان کرنا ہوگا جو صحیح ہو
د رہے کہ آزمائش میں کئی مسائل ہوتے ہیں ۔ انہیں مقررہ وقت میں
تم کرنا ہوتا ہے ۔

۲۔ اٹھارہ ذہنی کیفیات کی فہرست بنائی جاتی ہے ۔ اس فہرست
ں ہر کیفیت کا اپنا نمبر ہے اور یہ نمبر ہر بیان کو دینا ہوتا ہے مثلاً
نگ ، مایوسی ، تعریف ، محبت ، حسد ، شک وغیرہ ذہنی کیفیات
سکتی ہیں اور بیانات حسب ذیل ہیں :

(ا) کیا میں نے اس پارٹی کا انتظار اس لیے کیا تھا ۔

(ب) کاش کہ تم میری ہوتیں۔
(ج) جب کوئی دوسرا اسے دیکھتا ہے تو میرا خون کھولتا ہے۔
(د) خدا کے احسانات ان گنت ہیں۔

خطوط وحدانیوں کے درمیان نفسی کیفیت کا نمبر دینا ہوتا ہے۔

کچھ بیانات دیے جاتے ہیں ان کے سامنے T (درست ہے) یا F (غلط ہے) لکھا ہوا ہوتا ہے۔ اگر بیان غلط ہو تو T کاٹ دیں اگر بیان درست ہو تو F کاٹ دیں۔

T F دو دشمنوں سے دوستی رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان میں صلح کرا دی جائے۔

T F لوگوں کی اکثریت اپنے متعلق دیانتدارانہ نکتہ چینی کو پسند کرتی ہے۔

۳۔ اس مطلب کے لیے بارہ تصویریں لی جاتیں ہیں، ہر تصویر کا اپنا نام ہے۔ زیر تجربہ فرد کو یہ تصویریں کچھ عرصہ کے لیے دکھائی جاتی ہیں۔ پھر ان تصویروں کو اور تصویروں میں ملا دیا جاتا ہے اور زیر تجربہ افراد کو کہا جاتا ہے کہ وہ تصویروں کو پہچانیں اور ان کے نام بتائیں۔

۴۔ بارہ کہانیاں بیان کی جاتی ہیں۔ ان کے ساتھ چار چار واقعات لگا دیے جاتے ہیں۔ کسی ایک واقعہ کو اگر کہانی سے چسپاں کریں تو بہترین مذاق بن جاتا ہے۔ فرد کو بتانا ہوتا ہے کہ وہ کون سا واقعہ ہے۔ مثلاً

جانی، اگر تم ایک اور کیک کھاؤ تو پھٹ جاؤ گے۔
(ا) کیوں؟ اتنا تو میں پہلے بھی کھا چکا ہوں۔
(ب) نہیں میرا معدہ بڑا سخت ہے۔
(ج) پھر میں اور بھی زیادہ کھا سکوں گا۔
(د) بہت اچھا! مجھے تھوڑا سا اور دے دو اور راستے سے ہٹ جاؤ۔

آلپورٹ (Allport) نے A—S ردعمل کی آزمائش بنائی A سے مراد Ascendency یعنی غلبہ ہے اور S سے مراد Submission یعنی اطاعت ہے۔ اس آزمائش سے علم ہوتا ہے کہ آیا کسی، مرد یا عورت میں غلبہ پانے کی خواہش ہے یا اطاعت قبول کرنے کی۔ اس آزمائش میں کئی تمک مدات ہیں۔ دو مدات حسب ذیل ہے:

عام طور پر تمہارا دوستانہ ہے۔
—اپنے سے عمر میں چھوٹوں کے ساتھ۔
—اپنوں سے عمر میں بڑوں کے ساتھ۔
—اپنے ہم عمروں کے ساتھ۔

کسی پھیکی اور بے کیف پارٹی میں جان ڈالنے کے لیے تمہیں کوئی خیال سوجھتا ہے۔ کیا اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے تم پہل کرتے ہو۔

—ہمیشہ۔
— کبھی کبھی۔
— کبھی کبھی نہیں۔

جو جوابات حسب حال ہوں وہاں نشان لگانا پڑتا ہے۔

روٹ (Root) نے دروں بینی (Introverison) اور بروں بینی (Extraverison) کے لیے آزمائش بنائی ہے۔ اس میں ایسے سوالات ہیں:

(۱) کیا معاشری معاملات میں لیڈر بننا چاہتے ہیں؟
—نہیں! میں اس سے پرہیز کرتا ہوں۔
—لیڈر نہ بننا، لیڈر بننے سے بہتر خیال کرتا ہوں۔
—کبھی اس معاملہ پر نہیں سوچا۔
—معاشری معاملات میں لیڈری لوں گا۔
—معاشری معاملات میں لیڈری ملنے پر خوش ہوں گا۔

(ب) آپ فارغ وقت کیسے استعمال کریں گے ۔

—پڑھنے اور پلان بنانے میں فارغ وقت صرف کرتا ہوں۔

—میں چاہوں گا کہ فارغ وقت پڑھنے اور پلان بنانے میں گزرے ۔

—فارغ وقت کو پڑھنے اور جسمانی مشاغل میں آدھا آدھا بانٹ دوں گا ۔

—میری خواہش ہوگی کہ فارغ وقت جسمانی مشاغل میں گزرے ۔

—فارغ وقت کھیل کود میں گزارتا ہوں ۔

اگر نشانات پہلے دو پر لگیں تو باطنی دلچسپی ظاہر ہوگی ۔ اگر آخری دو پر تو خارجی دلچسپی اور اگر نمبر ۳ پر ہو تو حالت بین بین ہوگی ۔

۴۔ کرداری آزمائشیں :

جن آزمائشوں کا اب تک ذکر ہوا ہے ۔ ان میں فرد یہ بتاتا ہے کہ کسی خاص ماحول میں وہ کیا کرے گا ؟ کرداری آزمائشوں میں ماحول پیدا کیا جاتا ہے ۔ اور فرد کا رد عمل اس ماحول میں دیکھا جاتا ہے ۔ مثلاً باطنی دلچسپی اور خارجی دلچسپی کے لیے مواقع بنائے جا سکتے ہیں ۔ بچوں کے ایک گروہ کو نمائش میں لے جایا گیا ۔ اس میں مختلف نمائشی اشیاء قطار در قطار لگی تھیں ۔ کوئی قطار سیدھی تھی کوئی ٹیڑھی، کوئی ایک دوسرے کے آگے پیچھے ۔ نمائش میں ہر بچے کا کردار دیکھا گیا ۔ جو بچہ آہستہ آہستہ ایک چیز سے دوسری چیز کی طرف جاتا تھا ۔ یا چیزوں کو غور سے نہیں دیکھتا تھا ۔ وہ باطنی دلچسپی والا تھا ۔ لیکن جو بچہ ہر چیز کو شوق سے دیکھتا تھا ، اس کی تفصیل معلوم کرتا تھا اور بار بار لوٹتا تھا ۔ اسے خارجی دلچسپی والا کہا گیا ۔

دیانتداری کی آزمائش کے لیے بھی مواقع پیدا کیے جا سکتے ہیں ۔

لڑکوں کو ہجوں (Spelling) کا ٹسٹ دیا گیا ۔ اس میں کچھ الفاظ کے ہجے درست تھے کچھ کے غلط ۔ لڑکوں سے کہا گیا کہ وہ غلط ہجے والے الفاظ پر پنسل سے نشان لگا دیں ۔ اگلے دن بچوں کو ٹسٹ واپس کیا گیا اور ساتھ ہی درست حل دے دیا گیا ۔ ان سے کہا گیا کہ وہ خود اپنا شمار (Score) لگائیں ۔ کئی بچوں نے اپنا شمار بہتر بنانے کے لیے پنسل کے نشانات مٹا دیے ۔ انھیں یہ علم نہ تھا کہ ممتحن نے ہر بچے کے حل کو نقل کرکے رکھ لیا ہوا ہے ۔ دونوں کا مقابلہ کرنے سے بچوں کی بد دیانتی کا پتہ چل گیا ۔

دیانتداری کی ایک اور آزمائش ہے ۔ بچوں کو الفاظ کی ایک لمبی چوڑی فہرست دی گئی ۔ اس فہرست میں چند ایک الفاظ بالکل فرضی تھے ۔ بچوں کو کہا گیا کہ جو الفاظ وہ جانتے ہیں ان پر نشان لگا دیں ۔ بعض بچوں نے فرضی الفاظ پر بھی نشان لگا دیے جہاں وہ پکڑے گئے ۔ ایسی آزمائش کتابوں کے سلسلے میں بھی ہوسکتی ہے ۔ کتابوں کی فہرست میں کچھ اصلی اور کچھ جعلی نام لکھ دیجیے اور بچے کو کہیے کہ جو کتابیں اس نے پڑھ رکھی ہیں ان پر نشان لگا دے ۔ بچہ جتنے نشانات جعلی کتابوں پر لگائے گا اتنی ہی اس کی بے ایمانی ہوگی ۔

مستقل مزاجی کی بھی کرداری آزمائش ہو سکتی ہے ۔ بچوں یا بڑوں کو کوئی کام کرنے کو دیں اور دیکھیں کہ وہ کتنا وقت لیتے ہیں ، اور کس دلچسپی سے کرتے ہیں ۔ مثلاً انھیں کہیں کہ دیے ہوئے حروف سے جتنے الفاظ وہ بنا سکتے ہیں، بنائیں یا اپنے پنجوں پر جتنی دیر کھڑا رہ سکتے ہیں رہیں ۔ ان آزمائشوں میں ضروری ہے کہ بچوں کو پتہ نہ لگے کہ وہ آزمائش دے رہے ہیں ۔ یا جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس کا کیا مطلب ہے ۔

فوجی انتخاب میں بھی کرداری آزمائشیں دی جاتی ہیں ۔ کچھ فوجیوں کو خفیہ خدمت کے لیے بھرتی کرنا تھا ۔ اٹھارہ امیدوار تھے ۔

یہ لوگ چار دن تک ماہرین نفسیات کے ساتھ رہے - ان کا انٹرویو ہوا - انہیں صلاحیت کی آزمائشیں دی گئیں اور ان سے سوال نامے پر کرائے گئے اور اس کے علاوہ انہیں ایسے ماحول میں رکھا گیا جہاں انہیں کچھ کرنا پڑتا تھا - ماحول کئی قسم کے تھے - ان سے تعاون، جذباتی پختگی، لیڈرشپ، پیش قدمی اور کام کرنے کی صلاحیتوں کا پتہ چلتا تھا - مثلاً ان لوگوں کو بانسوں اور اینٹوں سے گھر بنانا ہوتا تھا - دو ان کے ساتھی تھے، جن کا کام روڑا اٹکانا اور امیدواروں کو پریشان کرنا تھا - ایک اور ماحول میں انہیں ۱۰۰ پونڈ کا پتھر ندی کے پار کرنا تھا - ندی پر چھلانگ نہیں لگائی جا سکتی تھی - کچھ رسے اور ڈھول تھے - انہیں استعمال کیا جا سکتا تھا - ان امیدواروں کو کارکردگی کی بنا پر نمبر ملتے ہیں اور اسی لحاظ سے درجہ بندی کی جاتی ہے -

ایک اور کرداری آزمائش کا طریقہ اداکاری (Role Playing) ہے - مثلاً امیدواروں کو کہیں کہ ان میں سے ایک اپنے آپ کو شیعہ مولوی سمجھ لے اور دوسرا اہل سنت والجماعت کا مولوی، دونوں کا جھگڑا مسجد کے متعلق ہے۔ دونوں مولوی صاحبان اپنی اپنی جماعتوں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک قسم کے لیڈر بنے ہوئے ہیں، اور جذبات بھڑکا رہے ہیں۔ ایک تیسرے امیدوار کو ڈپٹی کمشنر کا رول (Role) دے دیا جاتا ہے۔ اور یہ دونوں امیدوار یعنی شیعہ اور اہل سنت والجماعت کے نمائندے وفد کی صورت میں ڈپٹی کمشنر کے پاس آتے ہیں - دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ مولوی صاحبان اپنا کیس کیسے پیش کرتے ہیں - اور ڈپٹی کمشنر کیسے معاملے کو سلجھاتا ہے -

کچھ اداکاری میں تعاکس (Reversal) رول دیے جاتے ہیں - مثلاً لڑکیوں کو لڑکوں کا اور لڑکوں کو لڑکیوں کا پارٹ دیا جاتا ہے - یا میاں کو بیوی بنا دیا اور بیوی کو میاں - یا استاد کو شاگرد اور شاگرد کو استاد - اس اداکاری سے شخصیت کے عجیب عجیب پہلو اجاگر

ہوتے ہیں ۔

ووڈورتھ اداکاری کا ایک اور طریقہ پیش کرتا ہے[1] ۔ مثلاً الف کو یہ کہا گیا کہ ب نے الیکشن میں تمھاری مدد کی ۔ اور ب کو کہا گیا کہ تم نے الف کی مخالفت کی ۔ لیکن دونوں کو ایک دوسرے کے کردار کا کچھ علم نہیں - یہ تحقیق کرنے کے لیے کہ آیا ب نے واقعی اس کی مدد کی ہے ۔ الف اس کے گھر آتا ہے ۔ دونوں ایک میز پر بیٹھتے ہیں ۔ جو امیدوار ب کا پارٹ ادا کرتے ہیں وہ عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہیں ۔ تھوڑا سا جھوٹ بول دیتے ہیں ۔ تھوڑی پہلو تہی کرتے ہیں اور کچھ سچ بول دیتے ہیں ۔ اس آزمائش سے ہر لڑکے کے متعلق انکشافات ہوتے ہیں ۔ انھی کی بنا پر امیدواروں کی درجہ بندی ہوتی ہے ۔

(۵) انٹرویو :

زندگی کے ہر شعبہ میں خصوصاً کاروبار، طب اور صنعت و حرفت میں جب ملازمین کے انتخاب کا موقعہ آتا ہے تو امیدواروں کو انٹرویو کے لیے بلایا جاتا ہے ۔ ان سے سوالات پوچھے جاتے ہیں ۔ جوابات کی چھان بین ہوتی ہے ۔ جواب دیتے وقت امیدواروں کا جو رویہ ہوتا ہے ، اسے نوٹ کیا جاتا ہے ۔ اس انٹرویو سے مدعا امیدواروں کی شخصیت کو پرکھنا اور کام کرنے کی اہلیت جانچنا ہوتا ہے ۔

ہم اس سے پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ موجودہ زمانے میں ہر پیشہ کے تقاضوں کی تشریح کی گئی ہے ۔ اور ملازمین کو بھرتی کرتے وقت یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ آیا امیدواروں کی صلاحیتیں اور قابلیتیں ایسی ہیں جن کی اس پیشے کو ضرورت ہے ؟ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اگر درزی کے پاس سوٹ کے لیے کپڑا لے کر جائیں تو وہ آپ کے جسم کا ناپ لیتا ہے اور کپڑے کو بھی ناپتا ہے ۔ اگر کپڑا تھوڑا ہو تو واپس کر دیتا ہے ۔ اگر زیادہ ہو تو جتنا کپڑا درکار ہو وہ رکھ لیتا ہے ۔ بدن کا ناپ اور

۱- ملاحظہ ہو اس کی Psychology صفحہ ۱۰۲ ۔

کپڑے کی لمبائی چوڑائی ہم پلہ ہونی چاہییں - اسی طرح پیشے کے تقاضے اور امیدوار کی صلاحیتیں ہم پلہ ہونی چاہییں - اس امر کا کچھ پتہ تو آزمائشوں سے چل جاتا ہے ، جو باقی رہ گیا ہو اس کا پتہ انٹرویو میں لگ جاتا ہے -

یہاں پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ کیریکٹر سرٹیفیکیٹوں کی موجودگی میں انٹرویو کی کیا ضرورت ہے ؟ یہ سچ ہے کہ ہر طالب علم اپنے پرنسپل سے اور ہر ملازم اپنے آقا سے کیریکٹر سرٹیفیکیٹ حاصل کر لیتا ہے - لیکن ان سرٹیفیکیٹوں میں سے کتنے ایسے ہوتے ہیں جو دیانت دارانہ طریقے سے دیے جاتے ہیں ؟ ہر سرٹیفیکیٹ طالب علم کی مدح میں ایک قصیدہ ہوتا ہے اور جو قصیدہ نہ ہو اسے کسی جگہ پیش نہیں کیا جاتا - لہٰذا جب تک سرٹیفیکیٹ دیتے وقت ایمانداری سے کام نہ لیا جائے تب تک ان سرٹیفیکیٹوں کو قابل اعتبار نہیں سمجھا جا سکتا علاوہ ازیں ان سرٹیفیکیٹوں میں صرف اچھی چیزوں کا ذکر ہوتا ہے - طالب علم کے نقائص کا ذکر نہیں کیا جاتا - یہ اخفا نہ تو طالب علم کے لیے مفید ہے اور نہ ہی اس کے ہونے والے آجر کے لیے- یہ سرٹیفیکیٹ آجر (Employer) کو دھوکا دیتے ہیں اور طالب علم کو دھوکے میں رکھتے ہیں - اگر ان سرٹیفیکیٹوں پر یقین کرکے کوئی آجر طالب علم کو جگہ دے دے اور اس طالب علم میں وہ صلاحیتیں موجود نہ ہوں جن کا ذکر سرٹیفیکیٹوں میں ہے ، تو آجر کو بھاری نقصان ہوگا اور خود ملازم ناخوش رہے گا-

انٹرویو کے مقاصد تین ہیں :

۱- پیشہ ورانہ رہنمائی -

۲- امیدوار کو مشورہ دینا -

۳- امیدوار کے متعلق معلومات حاصل کرنا -

آخری مقصد بڑا اہم ہے - انٹرویو میں امیدوار سے مندرجہ ذیل مدات

کے بارے میں سوالات کیے جاتے ہیں :

۱- بچپن میں گھر کا ماحول -
۲- سکول اور کالج کی زندگی -
۳- کوئی خاص ٹریننگ -
۴- جو ملازمتیں کی گئی ہوں -
۵- جنگی خدمات (اگر کوئی ہوں) -
۶- بغیر ملازمت کے جو وقت کٹا -
۷- موجودہ حالات -

کچھ مدات کے بارے میں معلومات تو درخواست میں ہوتی ہیں ، جو باقی رہ گئی ہوں ان کے متعلق استفسارات ہوتے ہیں - چونکہ ہر ملازمت کی نوعیت جدا ہوتی ہے ، لہٰذا ہر ملازمت کے لیے انٹرویو ایک ہی ڈھب کا نہیں ہوگا - مثلاً لوجائے (Lovejoy) جو آئل کمپنی کا منیجر ہے وہ مندرجہ ذیل سوالات سیلزمین (Salesman) کی اسامی کے امیدواروں سے پوچھتا ہے :

۱- صحت کیسی ہے ؟
۲- کیا لوگوں میں دلچسپی ہے ؟
۳- کیا ہونہار ہے اور کیا جو کچھ وہ کر رہا ہے اس کا جواز پیش کر سکتا ہے ؟
۴- کیا وہ دوسروں کو ترغیب دلا سکتا ہے ؟

انجینیئرنگ کے لیے استفسارات کی نوعیت حسب ذیل ہوگی :

(۱) کس پیشہ کے لیے بنیادی دلچسپیاں اور صلاحیتیں امیدوار میں موجود ہیں ؟ امیدوار کو چار چیزیں دی جاتی ہیں - تصورات ، اشخاص ، اشیا اور اشارات (Symbols) اور کہا جاتا ہے کہ اپنی دلچسپیوں کے پیش نظر انہیں ترتیب دے -

(۲) کالج کے زمانے میں کون سے مضامین امیدوار کو پسند آئے ؟

امیدوار کو مضامین کی فہرست دی جاتی ہے ۔ یہ مضامین سات قسـ
ہیں ۔ تھیوری، اوزاروں کا استعمال (Manipulation) ، نقشے (sign
عمل کے طریقے انسانوں کی مدد سے ، عمل کے طریقے اوزاروں
انجینئرنگ میں آمدنی اور خرچ ، ادبی دلچسپیاں ۔ امیدوار کو کہا جا
کہ وہ ان سات میں سے تین ایسے مضامین چن لے جو کالج کے زمانـ
اسے مرغوب رہے ۔

(۳) امیدوار کے فیصلہ پر کس قسم کے نفسی اور جسمانی خـ
اثرانداز ہوں گے ؟ امیدوار کو دو اسامیاں بتائی جاتی ہیں، ان کی تنـ
ایک جیسی ہیں، لیکن ذمہ داریاں الگ الگ ۔ امیدوار سے پوچھا جا
کہ وہ کس اسامی کو پسند کرے گا اور کیوں ؟

بڑے بڑے صنعتی اداروں میں دو قسم کے انٹرویو ہوتے ہیں

۱۔ ابتدائی ۔

۲۔ اصلی ۔

ابتدائی انٹرویو کسی کلرک یا اسسٹنٹ سے ہوتا ہے ، اس کلر
اسامی کی ضرورتوں کا علم ہوتا ہے ۔ لہٰذا ان کے مطابق دو تین منـ
وہ ضروری معلومات اکٹھی کر لیتا ہے ۔ ان معلومات کی بنا پر وہ
کر لیتا ہے کہ آیا امیدوار کو اصلی انٹرویو میں جانا چاہیے یا
کیونکہ اگر امیدوار پیشے کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکتا ہو تـ
افسر کے پاس بھیجنا محض تضیع اوقات ہوگا ۔ اگر اسامی ٹائپسٹ
اور امیدوار کو ٹائپ نہ آتا ہو یا ٹائپ میں کم رفتار ہو تو اسے آفیـ
پاس نہیں جانے دینا چاہیے ۔

اصلی انٹرویو میں مدات ہوتی ہیں ۔

۱۔ معیاری فارم، جس میں پہلے سے ہی وہ سوالات درج ہوـ
جو پوچھے جاتے ہیں ۔ امیدوار کے جوابات قلم بند کر لیے جاتـ
سوالات حسب ذیل ہو سکتے ہیں :

(ا) اپنے گزشتہ آجروں کے نام دو اور یہ بتاؤ کہ کیسے ملازمت ملی اور کیوں چھوڑی ؟

(ب) گزشتہ آجر تمھارے ساتھ کیا سلوک روا رکھتے تھے ؟

(ج) تمھیں ہر ملازمت سے کون سا مفید تجربہ ملا ؟

(د) کیا تم نے کبھی ایسا کام کیا جس پر خوش ہوکر تمھارے آجر نے تمھاری سفارش کی ہو ؟

(س) کیا کبھی تمھارے آجر نے تمھارے نقص نکالے؟ اپنی غلطیوں اور ناکامیوں کی فہرست بناؤ ؟

(ش) اپنی کامیابی کی مثال بتاؤ ؟

(ع) کون سا کام تمھیں سب سے زیادہ پسند آیا ؟ کیا وہ میکانکی تھا ، معاملات سلجھانے کا تھا ، تفصیل دریافت کرنے کا تھا یا لوگوں سے میل جول رکھنے کا تھا ۔ یا تمھیں کچھ یاد نہیں ؟

۴۔ اصل انٹرویو ہر امیدوار کے لیے مختلف ہے ۔ اس کی کامیابی کا دار و مدار اس امر پر ہے کہ :

(۱) انٹرویو کے لیے دوستانہ اور خوش‌گوار ماحول پیدا کر لیا گیا ہے ؟

(۲) جو معلومات چاہییں انھیں سوچ لیا گیا ہے اور

(۳) جس قسم کے سوالات ایسی معلومات بہم پہنچا سکیں ، انھیں ذہن میں پہلے تیار کر لیا گیا ہے ؟

اگر انٹرویو لینے والا پہلے سے تیار نہ ہو اور جو منہ میں آئے کہہ دے تو اس انٹرویو سے کچھ فائدہ نہ ہوگا ۔

۹۔ آزاد تلازم اور خوابوں کا تجزیہ :

تجزیہ نفس میں آزاد تلازم سے خوابوں کا تجزیہ کر کے بھولی بسری اور دبی ہوئی یادوں کو دوبارہ تازہ کیا جاتا ہے ۔ لیکن

اس طریقے کو مریض اور تندرست اشخاص کی شخصیت کے بارے
معلومات اکٹھا کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے - یہ
ایک قسم کا انٹرویو ہے -

تجزیہ نفس میں مریض کو آرام دہ صوفے پر لٹا کر
جاتا ہے کہ وہ کوئی بات چھیڑے اور اس کے متعلق کہتا چلا جا
عام طور پر اس بات کا تعلق مریض کی بیماری سے ہوتا .
وہ اس کی ابتدا بتاتا ہے - اس کے اسباب بیان کرتا ہے اور
اس نے علاج معالجہ کیا ہو اس کا ذکر کرتا ہے - دوران گ
وہ کئی ایسی باتیں کہہ جاتا ہے جو ماہر نفسیات کو اہم نظ
ہیں - ان امور پر مزید گفتگو کے لیے کہا جاتا ہے - پھر کچ
ضروری باتیں نکل آتی ہیں - ان کے متعلق مزید بات چیت ہوتی .
اس آزاد تلازم میں کبھی کبھی ماہر نفسیات کوئی بات کہہ دیتا
وگرنہ مریض کو موقع دیا جاتا ہے کہ جو کچھ اس کے منہ میں
آزادی سے کہہ دے - مریض کو کئی بار ذہنی معالج کے پاس آنا
ہے - ہر دفعہ اسے آزاد تلازم کا موقع دیا جاتا ہے - اس آزاد تلازم
مریض گزشتہ زندگی کی طرف لوٹتا ہے ، یادیں تازہ کرتا ہے ، حتیٰ
وہ ایسی یاد تک پہنچتا ہے جس نے مرض کو پیدا کیا - جب و
تازہ ہوتی ہے تو مرض کافور ہو جاتا ہے -

بھولی بسری یاد کو دوبارہ تازہ کرنا کوئی آسان بات نہیں
میں مہینے بلکہ سال لگ جاتے ہیں - مریض بھی بعض چیزیں چ
رہتے ہیں - اس کی مزاحمت (Resistance) کو دور کرنے کی ضر
ہوتی ہے - یہ بھی کچھ وقت چاہتی ہے - آہستہ آہستہ مریض کو م
پر اعتماد ہو جاتا ہے اور اپنا مافی‌الضمیر اس کے حوالے کر دیتا
بعض دفعہ لاشعور مزاحمت پیش کرتا ہے - اس کو توڑنا جوئے
لانے سے کم کٹھن کام نہیں - اس وقت معالج کئی ترکیبیں زیر

لاتا ہے ۔ ایک ان میں سے خوابوں کا تجزیہ ہے خواب کی تعبیر کیسے ہوتی ہے ؟ اس کا بیان آگے آئے گا یہاں پر اتنا کہنا کافی ہو گا کہ خوابیں لاشعور کی پیداوار ہیں اور لاشعور کی اطلاع دیتی ہیں۔ لٰہذا ان کے تجزیے سے لاشعور میں دبی ہوئی اغراض اور الجھنوں کا پتہ چل جاتا ہے۔

تجزیہ نفس کے متعلق کئی نظریات ہیں ۔ خوابوں کا تجزیہ کرتے وقت ہر معالج کسی نظریے کو پیش نظر رکھتا ہے اور اس کی رو سے خوابوں کی تشریح کرتا ہے قطع نظر اس امر کے کہ کون سا نظریہ صحیح ہے ہمیں یہ بات ماننی پڑے گی کہ آزاد تلازم اور خوابوں کے تجزیے سے جو معلومات ملتی ہیں وہ شخصیت کے کئی پہلوؤں کو نہایت احسن طریقے سے اجاگر کرتی ہیں ۔

(ے) اظلالی طریقے (Projective Techniques) :

اظلالی طریقے کئی قسم کے ہیں ۔ انہیں اظلالی اس لحاظ سے کہا جاتا ہے کہ آزمائشی ماحول میں فرد اپنے نفسی کوائف کو بغیر جانے اظہار کر دیتا ہے۔ اس کا اظہار شخصیت کی گہرائیوں کا پتہ دیتا ہے ۔

سب سے پرانا اور سب سے مشہور اظلالی طریقہ رورشاہ (Rorschach) کا ہے ۔ دس سیاہی کے دھبے (Ink blots) لیے جاتے ہیں ۔ ہر دھبہ، باری باری زیر تجربہ فرد کو دکھایا جاتا ہے اور اس سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ دھبہ کیا ہو سکتا ہے یا تم اس دھبے میں کیا دیکھتے ہو ۔ فرد کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ دھبے کو اوپر نیچے دیکھے یا دائیں بائیں ۔ غرض کہ جس طرح اسے پسند ہو وہ دھبے کو دیکھ سکتا ہے ۔ مختلف لوگ ان دھبوں میں مختلف اشیاء دیکھتے ہیں ۔ من (Munn) دو افراد کے دھبہ دیکھنے پر رد عمل کو بیان کرتا ہے ۔ ایک کہتا ہے کہ مجھے تو دو جادوگرنیاں آمنے سامنے کھڑی دکھائی دیتی ہیں۔ دونوں نے کمبلوں میں اپنے آپ کو لپیٹا اور ڈھانپا ہوا ہے ۔ دوسرا کہتا ہے کہ مجھے تو پرندے کی کھوپری نظر آتی ہے ۔ کھلا سرا اس کی چونچ ہے ۔

کٹی پھٹی جگہیں دانتوں کو ظاہر کرتی ہیں ۔ نیچے سے چاقو کا دستہ نظر آتا ہے ۔ مرکز سے کالی لکیر جو نیچے کو آتی ہے وہ چاقو کی دھار ہے ۔ کھوپری چوڑی ہے جیسے پچک گئی ہو ۔

دھبوں کے رد عمل کی تشریح کرتے وقت فرد کے متعلق مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھا جاتا ہے ۔

(۱) کتنی بار وہ انسانی شکلیں دیکھتا ہے اور کتنی بار جانوروں یا قدرتی مناظر کی ۔

(۲) کیا وہ شکل کو بہ ہیئت مجموعی دیکھتا ہے یا تفصیلات میں اٹکا رہتا ہے ۔

(۳) کیا اس کے تاثرات دھبے کی شکل سے پیدا ہوتے ہیں یا رنگوں سے ۔

(۴) کتنی بار وہ اشیاء خصوصاً انسانوں کو حرکت میں دیکھتا ہے ۔

(۵) جو شکلیں اسے دکھائی دیتی ہیں وہ کتنی صاف ہیں ۔

(۶) کتنا نیا اور غیر معمولی اس کا تخیل ہے ۔

اگر دھبے کو بہ ہیئت مجموعی دیکھا جائے تو اس سے تجریدی اور ترکیبی قابلیت کا پتہ چلتا ہے ۔ اگر تفصیلات پر زور ہو تو اس سے ٹھوس چیزوں کی طرف رجحان نظر آتا ہے ۔ رنگوں کو دیکھنا جوش کو ظاہر کرتا ہے ۔ انسانی شکلیں اگر چلتی پھرتی نظر آئیں تو اس سے باطنی خیالات کی طرف جھکاؤ ظاہر ہوتا ہے ۔ زیادہ جانوروں کو دیکھنا خیالات کی تنگی ظاہر کرتا ہے ۔ اچھی طرح سے صاف شکلیں دیکھنا ضبط کی نشانی ہے ۔

تمام نشانوں کو جمع کرکے کسی فرد کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ ظاہرا طور پر تو پرسکون ہے ، لیکن اس کے ہیجانات دبے پڑے ہیں ۔ اس کے اندر زبردست کشمکش ہے ، لیکن وہ ضبط سے کام

رہا ۔ اس کے کارنامے اور مہارتیں بھی صلاحیتوں سے کم ہیں ۔
سرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی ذہنیت با ثروت ہے ۔ یا خیالات
شر اور غیر منطقی ہیں ۔ یا علائق سمجھنے کا سلیقہ موجود ہے یا
ق صلاحیتیں پائی جاتی ہیں یا دلچسپیاں وسیع ہیں، یا وہ شخص خیالات
دنیا میں ڈوبا رہتا ہے یا قوت ارادی کا مالک ہے وغیرہ وغیرہ۔
من (Munn) کا کہنا ہے کہ رورشاہ نتائج کا حل باضابطہ اور
اری طریقے سے پیش نہیں کیا گیا ۔ لہٰذا مختلف ماہرین ایک ہی ردعمل
مختلف تشریحات پیش کرتے ہیں ۔ کوشش ہو رہی ہے کہ نتائج کو
ری بنایا جائے لیکن ابھی تک یہ کوششیں مکمل طور پر بار ور نہیں
ں ۔ ان کوششوں کو خود رورشاہ پسند نہیں کرتا ۔ اس کا خیال
کہ اس کی آزمائشیں شخصیت کے وہ پہلو عیاں کرتی ہیں جو
اتی دسترس سے باہر ہیں ۔ ووڈورتھ کو بھی ان کی صداقت پر شک
۔ وہ کہتا ہے کہ رورشاہ کے نتائج پرکھنے کا بہترین طریقہ یہ
کہ جو کچھ رورشاہ اپنی آزمائشوں سے کسی فرد کی شخصیت کے
ق کہتا ہے اس کا مقابلہ ان نتائج سے کریں جو اور طریقوں
حاصل کیے گئے ہوں ۔ بعض مقابلے رورشاہ آزمائشوں کے حق میں
ہوئے ہیں بعض اس کے مخالف ۔ ووڈورتھ کا کہنا ہے کہ ان
ے سے مقابلوں کی بنا پر ہم نہیں کہہ سکتے کہ رورشاہ آزمائشوں
حامیوں کا ہر دعویٰ صحیح ہے ۔ مزید شہادت کی ضرورت ہے ۔
سیاہی کے دھبوں کے علاوہ ایک اور اظلالی طریقہ بھی ہے جو
ے۔ٹی(T-A-T) کہلاتا ہے۔ یہ مخفف ہے Thematic Apperception
کا جس کا مطلب ہے نفس مضمون کے ادراک کی آزمائشیں ۔ ان
شوں میں تین سلسلے (Series) ہوتے ہیں ۔ ہر سلسلے میں دس
ریں ہوتی ہیں ۔ یہ تصویریں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتی

۱۔ ملاحظہ ہو اس کی Psychology ، صفحہ ۱۱۰ ۔

ہیں ، فرد کو کہا جاتا ہے کہ وہ ہر تصویر کے متعلق کہانی بنائے ، اس کا ماحول بیان کرے ۔ واقعات کی تشریح کرے ۔ نتیجہ بتائے اور اداکاروں کے خیالات اور کردار نمایاں کرے ۔ اس آزمائش کا مدعا فرد کی شخصیت کی ترجمانی کرنا ہے ۔ اس لیے جو کہانی وہ بناتا ہے ، ایک تو اس کی صوری حیثیت کا جائزہ لیا جاتا ہے ، اور دوسرے اس کے مضامین کی تشریح کی جاتی ہے ۔

صوری حیثیت میں یا تو بین فردی توافق (Inter-individul Consistency) دیکھا جاتا ہے یا دروں فردی توافق (Intra-individual Consistency) ۔ رش (Ruch) ان کی مثالیں یوں دیتا ہے[1] ۔ اگر تصویر میں کسی لیٹی ہوئی شے کو جس کا منہ دکھائی نہ دے رہا ہو عام لوگ تو عورت کہیں لیکن زیر تجربہ فرد اسے مرد کہے تو اس کا ادراک عام لوگوں کے ادراک سے مختلف ہوگا اور اس لحاظ سے اس پر غور کرنا چاہیے ۔ یہاں پر دوسرے افراد سے توافق موجود نہیں ۔ اور اگر کسی فرد نے ہر تصویر میں پس منظر بیان کیا ہے اور ایک میں نہیں کیا، تو یہ فروگزاشت بھی قابل غور ہوگی کیونکہ یہاں پر فرد کی اپنے آپ سے مطابقت نہیں پائی جاتی ۔

آئیے ایک تصویر لے کر اس کے گرد جو کہانی بنائی گئی ہے، اس کا تجزیہ کریں ۔ رش (Ruch) ایک دس سالہ بچی کی کہانی ایک تصویر کے متعلق بیان کرتا ہے[2] ۔ وہ کہتی ہے اوہو ! اوہو ! یہ تو بوڑھی جادوگرنی ہے اور وہ اس کی لڑکی ہے۔ گاؤں کے ہر بچے کو جادوگرنی قتل کرنا چاہتی تھی ۔ ایک بچے کو تو وہ نہایت آسانی سے قتل کر سکتی تھی۔ اس کا نام جو Joe تھا۔ اس کے والدین نیو انگلینڈ گئے ہوئے تھے۔ وہ عورت

۱۔ ملاحظہ ہو اس کی Psychology and Life، تیسرا ایڈیشن صفحہ ۵۵۹ ۔

۲۔ ملاحظہ ہو اس کی Psychology and Life، صفحہ ۵٦۰ ۔

ماں کو قتل کرتے ہوئے پکڑی گئی۔ وہ اپنے لوگوں کے ہاتھوں قتل
گئی اس طرح ۵۰۰۰ بچے بچ گئے۔ صرف یہی ان دو جادو گرنیوں کے
ق مجھے کہنا ہے۔

اس کہانی کی تشریح ماہر نفسیات کی زبانی سنیے۔

چونکہ اس کہانی میں قتل کا ذکر کئی دفعہ آیا ہے۔ ایک چھوٹی
کے لیے یہ کہانی عجیب سی ہے اور اہم بھی ہے۔ کیونکہ اس
انی کا خیالی مضمون اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ بچی کا حقیقت سے
ں تک ہلکا سا رابطہ موجود ہے (پانچ ہزار بچوں کا قتل، عورت کا بچوں
قتل کرنے پر پریشانی اور عورت کا اپنی ماں کو قتل کر ڈالنا) اس
انی سے ماں کے خلاف سخت نفرت اور عداوت کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن
جوداً اس امر کے کہ لڑکی خیال کرتی ہے کہ ماں اسے قبول نہیں کر
، گمان ہے کہ وہ ماں سے بری طرح بندھی ہوئی ہے اور اس کی
ت نگر ہے۔

ماں کے قتل کا ذکر اور اس سے پہلے اسی عورت کا بچے کو قتل کرنا
امر کی دلیل ہے کہ گھر میں تین نسلیں موجود ہیں۔ شاید نانی یا
ی ہے جسے یہ بچی پسند کرتی ہے پھر یہ بچی یہ بھی کہتی ہے کہ ماں
اپنے لوگوں نے قتل کر دیا۔ اس جگہ بھی ماں سے نفرت نکلتی ہے۔

یہ کہانی کے سلبی پہلو ہیں۔ لیکن کہانی میں ربط اچھا ہے۔ اور
ب الفاظ کی کثرت ظاہر کرتی ہے کہ بچی اپنے پس و پیش میں دلچسپی
ھتی ہے۔ اس نے دنیا کو بالکل نہیں چھوڑا۔ جادوگرنی کی کہانی
ے عام قصہ ہے، یہ قصہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ بچی کا دنیا سے ابھی
ب رابطہ موجود ہے۔

یہ کہانی ایسے بچے کا پتہ دیتی ہے جو پریشان حال ہو۔ اس کا جلد
ج ہونا چاہیے، یہ بچہ علاج کے قابل ہے اور ٹھیک ہو سکتا ہے اس
بچ کو دوسرے ذرائع سے بھی تقویت پہنچتی ہے۔

۱۔ گھر کے حالات : بچی کی ماں کا دماغ خراب تھا ۔ اس نے اپنے پہلے خاوند کو چھوڑ رکھا تھا اس سے بچی پیار کیا کرتی تھی ۔ یہ خاوند گھر کا بوجھ نہیں اٹھا رہا تھا ۔ جب یہ عورت پہلی بار کلینک آئی تو اپنی بچی اور ایک مرد کے ساتھ رہ رہی تھی اور محنت مشقت کرتی تھی ۔ پھر اس مرد سے علیحدگی ہو گئی اور بچی نانی کے پاس رہنے لگی جس سے وہ بے حد پیار کرتی تھی ۔

۲۔ سکول رپورٹ : بچی پریشان حال ہے ۔ کام میں دلچسپی نہیں لیتی ۔ کام ٹھیک کر نہیں کرتی استادوں پر زیادہ بھروسہ کرتی ہے ۔ خیالی پلاؤ پکاتی ہے ۔ بے حس ہے ۔ دنیا سے بے تعلقی رکھتی ہے ۔ احساس کمتری کی شکار ہے ۔ بہت زیادہ جھینپتی ہے ۔

۳۔ کھیل کا کمرہ : بچی ایسی گڑیا سے کھیلتی ہے جو اپنی ماں کے پیچھے صلاح مشورے کے لیے دوڑتی دکھائی دیتی ہے ۔ لیکن باپ کی پروا نہیں کرتی ۔

۴۔ رورشاہ آزمائش : اس آزمائش سے پتہ چلا کہ بچی کو بہت جلد انشقاق ذہنی (Schizophrenia) کا مرض ہونے والا ہے ۔ تصویروں کو چھوٹا دیکھا گیا جو اس امر کی دلیل ہے کہ حقیقت کو غلط سمجھا جا رہا ہے ۔ رد عمل کی لغویت کو بھی نہیں سمجھا جا رہا ۔ اور نہ ہی اسے دور کرنے کی کوشش موجود ہے ۔ خیالی پلاؤ میں خود کاری (autistic) کے پہلو ہیں ۔ تسلسل خراب ہے اور جذبات کے اتار چڑھاؤ میں کوئی ترکیب نہیں ۔ مطابقت ادنیٰ قسم کی ہے تعقلی رابطہ نارمل نہیں ۔ چونکہ بچی میں عصبانیت کے کوئی آثار نہیں اس لیے اوپر والے نتائج ثابت کریں گے کہ انشقاق ذہنی کا مرض ترقی پا رہا ہے ۔ علاج کی بڑی سخت ضرورت ہے ۔ کہیں بچی بالکل ہی پاگل نہ ہو جائے ۔

۵۔ بعد کی رپورٹ : دو سال بعد بچی کو ذہنی ہسپتال میں رکھا

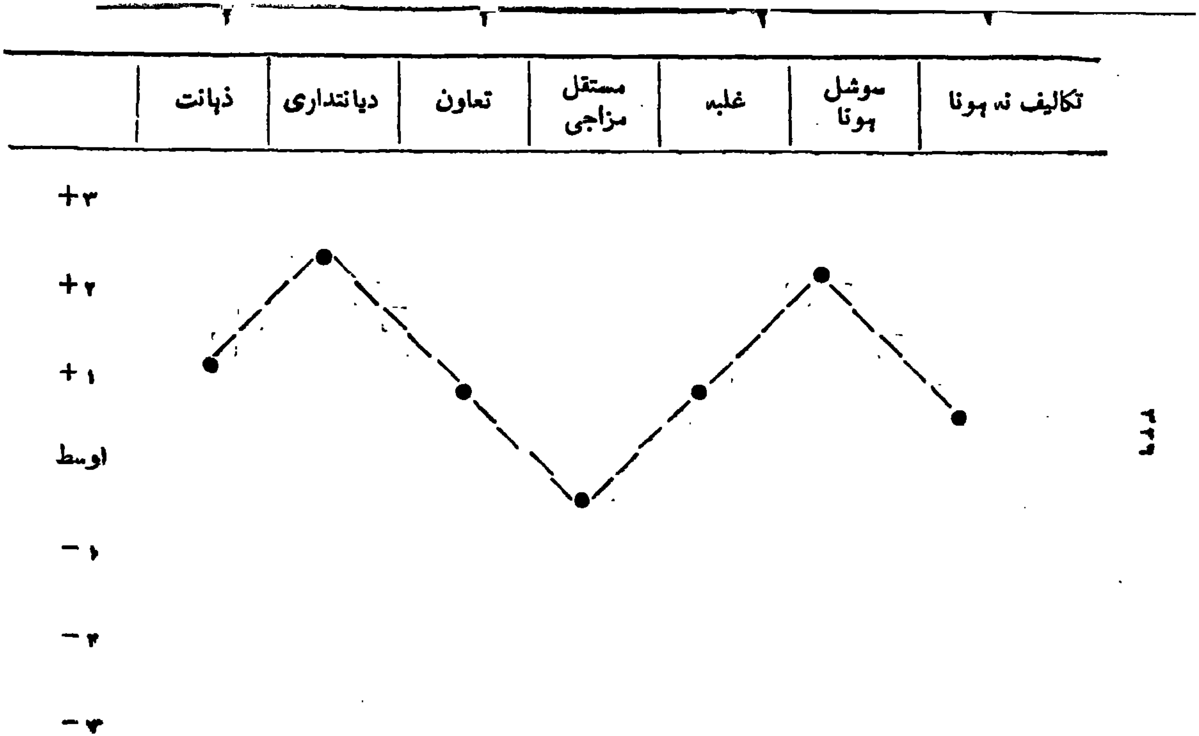
گیا جہاں اسے بجلی کے جھٹکے (Electric Shocks) دیے گئے - اس کے بعد پتہ چلا کہ بچی اپنی نانی کے ہاں چلی گئی جہاں اس کی حالت قدرے بہتر ہو گئی - (یہ رپورٹ T-A-T آزمائش کو تقویت پہنچاتی ہے کیونکہ اس کے مطابق بچی قابل علاج تھی) -

روورشاہ آزمائش کی طرح ٹی - اے ٹی آزمائش بھی بڑے کام کی شے ہے لیکن اسے معیاری بنانے میں ابھی وقت لگے گا -

شخصیت کا خاکہ (Personality Profile) :

شخصیت کو ناپنے کے لیے سات طریقے زیر بحث لائے گئے ہیں :

جب کسی فرد کو ساتوں طریقوں سے جانچ لیا جائے اور مختلف خصائص میں اس کا مقام متعین ہو جائے تو اس کی شخصیت کا خاکہ کھینچا جا سکتا ہے - مندرجہ ذیل چارٹ ملاحظہ کریں - جو مثال کی خاطر فرضی بنایا گیا ہے -


تکالیف نہ ہونا
موشل ہونا
غلبہ
مستقل مزاجی
تعاون
دیانتداری
ذہانت
+۳
+۲
+۱
اوسط
-۱
-۲
-۳

یہاں یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس خاکے میں جن خصائص کا ذکر کیا گیا ہے اور جن میں کوئی شخص اوپر ہو سکتا ہے یا نیچے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر شخصیت بناتے ہیں۔ ان میں اتحاد، جمعیت اور تعاون ہے لہٰذا اگر ایک خاصیت بدل جائے تو ساری شخصیت پر اثر پڑتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی آدمی ہنس مکھ اور پیار محبت والا ہو تو یہ دونوں صفات علیحدہ علیحدہ نہیں بلکہ مل جل کر شخصیت کا عنصر بنتی ہیں۔ اگر ان میں سے ایک غائب ہو جائے تو دوسری کی مقدار اور خاصیت پر اثر پڑے گا۔ فرض کیا کہ آدمی زمانے کی چیرہ دستیوں سے ہنس مکھ نہیں رہتا تو اس کا پیار محبت والا پہلو بھی کمزور پڑ جائے گا۔

اس لحاظ سے شخصیت کا خاکہ صحیح حالات پیش نہیں کرتا۔ خاکے سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے جیسے ہر صفت الگ الگ وجود رکھتی ہے اور اسی حیثیت سے شخصیت میں موجود ہے۔ لیکن دراصل معاملہ اس کے برعکس ہے۔ شخصیت ایک اکائی یا وحدت ہے اس میں جمعیت اور اتحاد (Integration) ہے۔ لہٰذا ہر صفت دوسری سے مل کر کام کرے گی۔

بعض دفعہ شخصیت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ اتحاد کی بجائے انتشار (Disintegration) آ جاتا ہے۔ شخصیت کئی حصوں میں بٹ جاتی ہے اور یہ حصے الگ الگ اور خود مختار طریقے سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر صرف دو ہی حصے ہوں تو اسے دوہری شخصیت (Double Personality) کہا جاتا ہے۔ ووڈورتھ ایک چھوٹی بچی ڈورس کا ذکر کرتا ہے جسے تین سال کی عمر میں اس کے شرابی باپ نے زمین پر دے مارا۔ لڑکی اس وقت سے حد درجہ کی خاموش، محنتی اور ایماندار بن گئی لیکن کبھی کبھی اسے دورے پڑتے تھے۔ جن میں وہ حد درجہ کی وحشی اور شرارتی بن جاتی تھی۔ اس کے متین حصے کو شرارتی حصے کی کوئی خبر نہ تھی اگرچہ شرارتی حصے کو متین حصے کا علم تھا اور اسے

حقارت آمیز الفاظ سے یاد کرتا ہے ۔ ووڈورتھ ایک اور عورت کا ذکر کرتا ہے جو حد درجہ کی مذہبی ، ایماندار اور منکسرالمزاج تھی ، لیکن کبھی کبھار اسے دورے پڑتے تھے جب کہ وہ انتہا درجے کی شریر ہو جاتی تھی ۔ منکسر مزاجی والے حصے کو شرارتی حصے کا علم نہ تھا ۔ جب اس عورت کا علاج شروع ہوا تو ایک تیسرا حصہ نکل آیا جسے طفلانہ کہا جا سکتا ہے ۔ اس میں جارحانہ اور خود غرضی کے میلانات تھے ۔ منکسر المزاجی والے حصے کو اس کا بھی کوئی علم نہ تھا ۔ معالج کا کام ان تین حصوں کو جوڑ کر متحدہ شخصیت بنانا تھا ۔ اس مطلب کے لیے اس نے نومیت (Hypnotism) کا طریقہ استعمال کیا ۔

آیا اس معالجے سے یادداشتوں میں دوبارہ اتحاد پیدا کیا جاتا ہے یا فرد کے مقاصد اور میلانات میں یکجہتی پیدا کی جاتی ہے ۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا حل دور حاضرہ کی نفسیات نہیں دے سکتی ۔ مستقبل میں جب نفسیاتی علم ترقی کرے گا ، تو شاید اس کا حل مل جائے ۔

بارہواں باب

شخصیت کے عناصر

تعلیاتی اور معاشری

Factors of Personlity

پچھلے باب میں شخصیت کا مفہوم واضح کیا گیا اور شخصیت ناپنے کے مختلف طریقے بیان کیے گئے ۔ زیر نظر باب میں ہماری بحث کا موضوع شخصیت کے علل و اسباب ہیں اور نیز یہ امر کہ شخصیت بہتر بنانے کے لیے کون سی تدابیر اختیار کرنی چاہییں ۔

شخصیت کے خصائص بیان کرتے وقت شخصیت کی وحدت کا ذکر آیا تھا ۔ جس کا مطلب ہے کہ شخصیت کے مختلف عناصر مل جل کر ایک وحدت اور جمعیت کی تشکیل کرتے ہیں ۔ لہٰذا جب ان عناصر کو الگ الگ لے کر ان پر بحث ہوتی ہے تو اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ ان عناصر کی خود مختارانہ ہستی ہے ۔ وحدت کے تمام عناصر وحدت کے قیام و بقا کے لیے کام کرتے ہیں اور جب ایسا نہیں ہوتا تو شخصیت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور طرح طرح کے ذہنی امراض گھیرا ڈال لیتے ہیں ۔ اس احتیاط کے بعد اب عناصر کا ذکر آتا ہے جو حسب ذیل ہیں :

(۱) طبعی ساخت اور شکل و شباہت ۔

(۲) ذہانت اور لیاقتیں ۔

(۳) طبائع ۔

(۴) عقاید اور رویے ۔

(۵) جذبات اور کیریکٹر ۔

۱- طبعی ساخت اور شکل و شباہت

یہ دونوں شخصیت پر گہرا اثر ڈالتے ہیں ۔ انسان جسم اور نفس کا مجموعہ ہے ۔ لہٰذا اس کی نشو و نما اور شخصیاتی ترقی میں جسم بھی ویسا ہی ضروری ہوگا، جیسا نفس۔ اگر جسم کو شخصیت سے خارج کر دیا جائے جیسے بعض مفکروں اور اہل مذاہب نے کیا ہے تو شخصیت کا مفہوم ادھورا رہ جائے گا - فلسفی اپنے ماورائی نظریوں کی بنا پر ٹھوس حقائق سے چشم پوشی کر سکتے ہیں ۔ لیکن نفسیاتی ماہر جس کا مؤقف سراسر اثباتی اور تجربی ہے ۔ ایسی غلطی کا مرتکب نہیں ہو سکتا ۔ نفسیاتی لحاظ سے عضویاتی عناصر کا وہی رتبہ ہے جو نفسی عناصر کا ہے ۔

آپ ہی بتائیے کیا آپ اپنے دوست کا تصور اس کی شکل و شباہت اور جسمانی ساخت کے بغیر کر سکیں گے ؟ کیا اس کا وجود آپ کے لیے محض نفسی کوائف کا مجموعہ ہے ؟ کیا وہ دوست پھر بھی وہی شخص رہے گا، اگر وہ دگنا موٹا ہو جائے، اگر اس کا چہرہ مسخ ہو جائے، اس کی ناک کی شکل بگڑ جائے یا وہ اندھا ہو جائے؟ یہ صحیح ہے کہ چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں شخصیت کو نہیں بدلتیں، لیکن شدید اور دور رس فعلیاتی انقلابات (جیسے لڑکی سے لڑکا یا لڑکے سے لڑکی بن جانا) شخصیت کو بدل ڈالتی ہیں ۔

خود شعوری جسم کے شعور سے شروع ہوتی ہے۔ بچہ جب 'میں' 'میرا' یا 'مجھے' جیسے الفاظ استعمال کرتا ہے تو اس کی مراد جسمانی 'میں' کی ہوتی ہے ۔ اسے اپنے نفس کا علم تو نہیں ہوتا البتہ اپنے ہاتھوں، ٹانگوں، آنکھوں وغیرہ یعنی اپنے جسم کو خوب پہچانتا ہے اور جسم کی وجہ سے ہی اپنے آپ کو دوسروں سے علیحدہ سمجھتا ہے ۔ محسسات (Sensations) میں سے ایک قسم حشوی تحسس (Organic Sensation) کی ہے ۔ اس تحسس سے پتہ چلتا ہے کہ آیا ہمارا جسم بہ حیثیت مجموعی

ٹھیک ٹھاک ہے یا اس میں کچھ ضعف یا نقص آ گیا ہے۔ بعض نفسیاتی ماہروں کا کہنا ہے کہ ان محسسات کو شخصیت کا مرکزی عنصر سمجھنا چاہیے ۔ اگر یہاں گہرے تغیرات رونما ہوں تو ذات کے تصور میں بھی فرق پڑ جاتا ہے۔ لہٰذا جب کوئی شخص کہتا ہے کہ میں اپنے آپ کو جانتا، پہچانتا ہوں تو اس کا حوالہ شعوری یا لاشعوری طور پر ان ہی حشوی محسسات (Organic Sensations) کی طرف ہوتا ہے۔ جنھیں بعض لوگ زندگی کا مقیاس المطر بھی کہتے ہیں ۔ کیونکہ ان کے ذریعہ جسم کی عام حالت کا علم ہوتا ہے ۔

جوں جوں بچہ عمر میں بڑھتا ہے، وہ طبعی اور نفسی خصائص میں امتیاز کرتا ہے ۔ لیکن در اصل یہ دونوں شخصیت کے عناصر ہیں ۔ جب کبھی میں اپنے آپ کو علیحدہ شخص سمجھتا ہوں تو اس وقت میرے ذہن میں ایسا عضویہ آتا ہے جو جسم اور نفس دونوں کا مجموعہ ہے ۔

ووڈورتھ فعلیاتی عناصر کے تحت سب سے پہلے جسمانی ساخت کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے خیال میں جسم کا سائز اس معاملہ میں بڑا ضروری عنصر ہے ۔ اسی سے دوسروں کے لیے ہمارا رویہ اور دوسروں کا ہماری طرف رویہ متعین ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ جسیم آدمی ہمیشہ رعب نہیں گانٹھتا اور نہ ہی مختصر جسم والا آدمی ہمیشہ دب کے رہتا ہے ۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ معاشری معاملات اور میل جول میں بڑے اور چھوٹے جسم کا اثر ضرور پڑتا ہے ۔ جسمانی لحاظ سے برتری یا کمتری کا احساس الفرڈ ایڈلر (Alfred Adler) کے نزدیک ایک زبردست عنصر ہے اور شخصیت کے لیے محور کا رتبہ رکھتا ہے ۔ ایڈلر شروع شروع میں تو فرائڈ (Freud) کا حاشیہ بردار تھا ۔ بعد میں اس سے علیحدہ ہو گیا ۔ اس نے اپنی نفسیات کی بنیاد احساس برتری اور احساس کمتری پر رکھی ہے ۔ اس احساس کا منبع طبعی ساخت ہے ۔ ایڈلر کا کہنا ہے

کہ جو بچہ جسمانی لحاظ سے چھوٹا یا منحنی ہوگا یا جس کوئی میں طبعی کمی یا کمزوری پائی جائے گی ۔ وہ احساس کمتری کا شکار ہو جائے گا ۔ جو بچہ ہمیشہ مدافعت پر رہے گا اور خیال کرے گا کہ لوگ مجھے دیکھ کر ہنس رہے ہیں، میرا مذاق اڑا رہے ہیں، میرے ساتھ بے انصافی کرتے ہیں کیونکہ میرا جسم دوسروں کے مقابلے میں ناقص ہے ۔ اسے اپنی کمتری چھپاتے ہوئے شدید درد کا احساس ہوتا ہے ۔ لہٰذا وہ کوشش کرتا ہے کہ کسی طور پر وہ دوسروں سے بڑھے تا کہ جسمانی عیب کی تلافی ہو سکے ۔ یہی وجہ ہے کہ چھوٹے قد والے آدمی بہت سیدھا چلتے ہیں، اونچی سیدھی پشت والی کرسیوں پر اکڑ کر بیٹھتے ہیں، بڑے بڑے ہیٹ (Hat)، اونچی ایڑی والے جوتے اور سخت کالر والی قمیض پہنتے ہیں ۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کا چھوٹا پن چھپ جائے یا اس کی تلافی (Compensation) ہو جائے ۔ کبھی کبھی کمتری کا احساس انسان کو گمراہ کر دیتا ہے اور اسے ظلم اور ہوس کے راستے پر ڈال دیتا ہے ۔ مثلاً نیرو (Nero) اور نپولین جو پست قد تھے جاہ و حشم اور ہوس کے پتلے بن گئے ۔ ہر آدمی جو اقتدار کا بھوکا ہے اور اس مطلب کے لیے حد سے زیادہ ظلم کرنے کو تیار ہے ۔ وہ ایڈلر کے مطابق احساس کمتری کا شکار ہے، جسمانی عیب یا نقص اسے مجبور کرتا ہے کہ تلافی کے بہانے (لاشعوری طور پر) مظالم روا رکھے اور ہوس اقتدار کی تشفی کے لیے ہر جارحانہ قسم کا قدم اٹھائے ۔

گو اس نظریے کو مکمل طور پر صحیح نہیں سمجھا جا سکتا ۔ لیکن اس نظریے میں کئی ایک صداقت کے پہلو ہیں ۔ ایک تندرست آدمی جس کا جگر ٹھیک طور پر کام کر رہا ہو زندگی کے متعلق رجائی (Optimistic) نقطۂ نگاہ رکھے گا اور خود بھی خوشی خوشی زندگی بسر کرے گا ۔ برخلاف اس کے جس شخص کا جگر ہمیشہ خراب رہے، جیسے سر درد ہمیشہ پریشان رکھے اور جیسے اعصابی خرابیاں چین نہ لینے دیں ۔ وہ اگر

قنوطی (Pessimist) نہ ہوگا تو کیا ہوگا۔

آج کل کے فعلیاتی ماہر اندرونی غدودوں پر زور دے رہے ہیں۔ یہ غدودیں اندر ہی اندر رطوبتیں پھینکتی ہیں جو خون میں داخل ہوکر جسم کی توانائی کو بڑھا دیتی ہیں یا گھٹا دیتی ہیں۔ مثلاً لبلبہ (Pancreas) سے ایک مادہ نکل کر خون میں ملتا ہے۔ یہ شکر کو جلا کر توانائی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اگر کسی صورت یہ مادہ نہ نکلے یا کم نکلے تو ذیابیطس کا مرض لگ جاتا ہے۔

اب ان اندرونی غدودوں کا مختصر ذکر آتا ہے۔

درقیہ غدود (The Thyroid Gland) :

اس کا مقام حلق کے قریب ہے۔ اگر کسی بیماری سے ان غدودوں کو نقصان پہنچ جائے تو عضویہ کی ہوشیاری اور جوش ختم ہو جاتا ہے۔ انسان پر سستی طاری ہو جاتی ہے اور وہ ایک مرض کا شکار ہوجاتا ہے جسے میکسوڈیما (Mexodema) کہتے ہیں۔ اس میں جلد خشک ہوجاتی ہے۔ دماغ اور پٹھے سست پڑ جاتے ہیں۔ انسان عقل و خرد کھو بیٹھتا ہے۔ کسی چیز کی طرف دھیان نہیں دے سکتا اور اس کی یادداشت کمزور پڑ جاتی ہے۔ اگر بچپن سے یہ غدود خراب ہو تو قد نہیں بڑھتا اور ذہانت رک جاتی ہے۔ شدید صورتوں میں انسان بونا، بد شکل اور بدھو بن جاتا ہے۔ اس کی حالت شاہدولے شاہ کے چوہوں جیسی ہو جاتی ہے۔ درقیہ مادہ (Thyroxin) سے اس مرض پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ یہ دوائی درقیہ غدودوں سے کشید کی جاتی ہے۔

اگر یہ غدود ضرورت سے زیادہ فعال ہو تو بے چینی، فکر، چڑچڑا پن پیدا ہوتا ہے اور مریض توازن کھو بیٹھتا ہے۔ اس کا قد بے تحاشہ بڑھ جاتا ہے۔ البتہ ذہانت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن اگر یہ غدود سست پڑ جائے تو بچوں کی کارکردگی میں فرق آجاتا ہے۔

کظری غدود (The Adrenal Gland):

اس کا مقام گردے کے قریب ہے۔ ایک اس کا اوپر کا حصہ ہے ایک درمیانی۔ درمیانی حصے سے جو رطوبت خارج ہوتی ہے اسے کظریہ مادہ (Adrenin) کہتے ہیں۔ اس رطوبت سے دل کی حرکت تیز ہو جاتی ہے خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے، معدے کا فعل رک جاتا ہے، پھیپھڑوں کی ہوا کی نالیاں کھل جاتی ہیں، جگر سے شکر نکلتی ہے، تھکاوٹ دور ہوتی ہے، پسینہ خوب آتا ہے اور آنکھ کی پتلی پھیل جاتی ہے۔ اوپر والے حصے سے قشریں (Cortin) نکلتا ہے۔ اس کا تعلق پٹھوں اور جنسی وظائف سے ہے۔ تپ دق سے یہ بالکل خراب ہو جاتا ہے اور ایک مہلک مرض پیدا کرتا ہے جس سے مریض کمزور ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کی جنسی خواہش مٹ جاتی ہے اور وہ بیماریوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کا مزاج چڑچڑا ہو جاتا ہے، لوگوں سے تعاون نہیں کرتا۔ فیصلہ کرنے کی قوت ختم ہو جاتی ہے۔ اگر یہ حصہ زیادہ کام کرنا شروع کر دے تو عورت یا مرد میں جنسی خواہش بڑھ جائے گی۔ عورتیں اپنی نسوانی خوبیاں کھو بیٹھیں گی۔ ان کی آواز بھاری ہو جائے گی۔ بعض دفعہ ان کے چہرے پر داڑھی مونچھ اگ آتی ہے۔

جنسی غدود (The Gonad):

ان سے جو رطوبتیں خارج ہوتی ہیں وہ مرد کو مرد اور عورت کو عورت بنا دیتی ہیں۔ ان ہی کی وجہ سے بلوغت میں جنسی آلات اپنے فریضے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور ثانوی جنسی خصائص پیدا کر دیتے ہیں۔ عورتوں کی چھاتیاں ابھر آتی ہیں اور مردوں میں داڑھی مونچھ نکل آتی ہے۔ اگر یہ غدود کام نہ کرے تو نہ مرد، مرد ہوں گے نہ عورتیں عورت، صرف مخنث ہی رہ جائیں گے۔

بلغمی غدود (The Pituitary Gland):

یہ غدودوں کا بادشاہ ہے کیونکہ باقی تمام غدودوں کو قابو میں

رکھتا ہے ۔ اگر بچپن میں یہ زیادہ کام کرنے لگے تو ہڈیاں اور پٹھے جلد بڑھنے لگتے ہیں اور قد نو فٹ تک بڑھ جاتا ہے ۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد یہ غدود سست پڑ جاتی ہے اور بچہ نوعمری میں مر جاتا ہے ۔ اگر عالم شباب میں یہ غدود تیز ہو جائے تو قد تو نہیں بڑھتا البتہ ہاتھ پاؤں، ناک اور جبڑے بہت بڑھ جاتے ہیں ۔ اگر یہ غدود سست ہو جائے تو انسان بونا رہ جائے گا ، گو اس کی ذہانت نارمل ہوگی ۔

غدودوں میں توازن :

عضویاتی ماہروں کا خیال ہے کہ بعض دفعہ امراض اس وجہ سے پیدا نہیں ہوتے کہ کوئی غدود تیز یا سست ہو گئی ہے بلکہ اس وجہ سے ہوتے ہیں کہ غدودوں میں توازن قائم نہیں رہا ۔ لیکن عام طور پر غدودوں کا توازن خراب نہیں ہوتا ۔ البتہ ان کی کارکردگی میں فرق آ جاتا ہے ۔ جس سے طرح طرح کی شخصیاتی مشکلیں پیدا ہو جاتی ہیں ۔

۲۔ ذہانت اور لیاقتیں

یہ دونوں ہی شخصیت کے اہم ارکان ہیں ۔ اکثر لوگوں کو ذہین یا بدھو، شوخ یا کند ذہن، دانشمند یا بے وقوف کہا جاتا ہے ۔ فطری قویٰ کو بدلنا اور ان کی جگہ پر ثانوی اکتسابی خصائص پیدا کرنا ذہانت پر منحصر ہے اور چونکہ شخصیت ثانوی میلانات پر مشتمل ہے لہذا شخصیت کی تعمیر میں ذہانت نہایت ضروری کردار ادا کرتی ہے ۔ صرف ذہانت ہی نہیں بلکہ ہماری تمام خصوصی اور اکتسابی مہارتیں خواہ جسمانی ہوں یا نفسی، ہماری شخصیت کا حصہ ہیں ۔ مثال کے طور پر عمدہ ٹینس کھیلنے والے کو لیجیے اسے رات دن ٹینس کی فکر لگی رہتی ہے ۔ وہ بات کرتا ہے تو ٹینس کے متعلق، ملتا جلتا ہے تو ٹینس کے کھلاڑیوں سے، اور اگر خبریں پڑھتا ہے تو ٹینس کے بارے میں ۔ اس کی دنیا اگر ہے تو ٹینس کی ہے ۔ یہی حال فن کار کا ہے ۔ رات دن وہ اپنے فن میں غرق رہتا ہے ۔ اس کی دنیا مصوری، بت تراشی،

شعر گوئی یا کوئی اور فن ہے جو اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔ اگر ٹینس کے کھلاڑی سے ٹینس چھین لی جائے یا مصور سے اس کی تصویر کشی، تو نہ ٹینس کا کھلاڑی صحیح معنوں میں زندہ رہے گا اور نہ ہی مصور۔ دونوں کی جان ان کے اپنے اپنے فن میں ہے۔ جب فن کو علیحدہ کر دیا جاتا ہے تو فن کا دلدادہ شخصیت کے لحاظ سے مر جاتا ہے۔ دوسرے لوگ فن کار کو اس کے پیشے سے یاد کرتے ہیں۔ کوئی شاعر ہے، کوئی بڑھئی ہے، کوئی ٹیکسی ڈرائیور ہے، کوئی پروفیسر ہے، وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا انسان کا پیشہ اس کی قابلیتیں، لیاقتیں اور مہارتیں اس کی شخصیت کا جزو لاینفک ہیں۔ انھی سے انسان کے تہذیب و تمدن کا پتہ چلتا ہے کیونکہ تہذیب سے مراد ہے انسان کی نفسی صلاحیتوں کا پروان چڑھنا ہے۔ تمام فن کاروں، شاعروں اور علم دوستوں کی زندگیوں پر ان کے فن کا رنگ چڑھا ہوا ہوتا ہے۔ اس رنگ کو اتار دیں تو شخصیت غائب ہو جائے گی اور انفرادیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔

۳- طبع (Temperament)

ووڈورتھ نے طبائع کو طبعی عناصر میں شامل کیا ہے۔ طبع سے مراد انسان کی عام ہیجانی ساخت ہے یا اس سے مراد جنسی خواہش، تجسس اور تملک جیسے ہیجانات سے اثر پزیری ہے۔ ہم اکثر لوگوں کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ اشتعال پزیر یا حلیم ہیں، پرجوش یا سرد مہر ہیں۔ پریشان یا قادر علی النفس ہیں۔ یہ الفاظ طبائع کو ظاہر کرتے ہیں۔ ہم نسل سے متعلق تمام فطری قویٰ اپنی وراثت میں پاتے ہیں۔ ان قویٰ کے ساتھ ہیجانات وابستہ ہیں لہٰذا ہر انسان چند ایک ہیجانات سے اثر پزیری کے لیے یوم پیدائش سے تیار ہوتا ہے لیکن یاد رہے کہ فطری قویٰ ہر انسان کے ورثہ میں آتی ہیں لیکن ہر انسان میں ان کی طاقت ایک جیسی نہیں ہوتی۔ بعض میں عدائی (Combat) جبلت بہت تیز ہوتی ہے۔ بعض میں خطرے سے فراری کی اور بعض میں تملک (Acquisitiveness) کی۔

چونکہ ہر شخص میں فطری قویٰ کی طاقت مختلف ہوتی ہے لہٰذا ان کے امتزاج سے جو خلط یا مرکب بنتا ہے وہ ایک انسان کو دوسرے انسان سے الگ کر دیتا ہے۔ ہیجانی انفرادیت کو مزید اجاگر کرنے والے عناصر ماحول سے پیدا ہوتے ہیں۔ خصوصاً اس ماحول سے جو ایام طفولیت میں ملتا ہے۔ بعض دفعہ ماحول کی بدولت ہیجانی انفرادیت کمزور پڑ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی بچہ ورثے میں نہایت ہی مضبوط اور طاقت ور لڑنے بھڑنے کی جبلت پائے اور ماحول بھی ایسے ایسا نصیب ہو جو تخریبی اور تباہی کے طرف مائل ہو تو وہ تنک مزاج بن جائے گا غصیلہ اور وحشی ہو جائے گا اس کے میلانات کبھی بھی تعمیری رخ اختیار نہیں کریں گے۔ لیکن اگر یہی بچہ شروع سے نظم و نسق میں رہے اس کے ساتھ مشفقانہ اور ہمدردانہ سلوک ہو تو لڑائی بھڑائی کی جبلت اپنی طاقت کھو بیٹھے گی اس کا ترفیع (Sublimation) ہو جائے گی اور تخریبی رجحان چھوڑ کر عدائی جبلت، اخلاقی مقاصد کی پختگی، راسخ الاعتقادی اور مضبوط اور قابل اعتبار لیڈر شپ کی شکل میں ظاہر ہوگی۔

پرانے زمانے سے خیال چلا آتا ہے کہ طبائع کا انحصار فعلیاتی عناصر پر ہے۔ یونانیوں نے چار قسم کی طبائع کو تسلیم کیا۔ یہ ہیں صفراوی (Choleric) دموی (Sanguine) سوداوی (Melancholic) اور بلغمی (Phelgmatic)۔ حکیم بقراط (Hippocrates) کا خیال تھا کہ انسان کے جسم میں چار قسم کی رطوبتیں ہیں۔ کسی ایک رطوبت کی زیادتی مخصوص طبع کو پیدا کر دیتی ہے۔ آج کل کے ڈاکٹر اس تقسیم کو قبول نہیں کرتے کیونکہ اس کی تہہ میں کوئی سائنسی اصول نہیں۔ لیکن تشریحی نقطہ نگاہ سے اس تقسیم کا فائدہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس تقسیم سے ہماری توجہ اس امر کی طرف جاتی ہے کہ طبعی امتیازات کی بنیاد فعلیاتی اختلافات پر ہے۔ مثلاً صفراوی کی تہہ میں صفرا کی زیادتی کارفرما ہے۔ دموی میں خون کی کثرت ہوتی ہے بلغمی میں بلغم

زیادہ ہوتی ہے اور سوداوی میں بھی صفرا ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے ۔

گو یہ نظریہ اپنی پرانی شکل میں مر چکا ہے ۔ لیکن ایک نئی شکل میں اس نے جنم لے لیا ہے ۔ ہم اوپر اندرونی غدودوں کا ذکر کر آئے ۔ ان کا تفاعل ہیجانی زندگی سے گہرا تعلق رکھتا ہے ۔ ان کی تیزی اور سستی سے زبردست شخصیاتی انقلابات رونما ہوتے ہیں ۔ بعض غدودوں کی تیز رفتاری ہیجانی میلانات کو تقویت بخشتی ہے اور ان کی سستی ہیجانات کی قوت کو ختم کر دیتی ہے ۔ فعلیاتی تحقیق سے یہ تو ثابت ہوگیا کہ طبائع کا غدودوں سے گہرا تعلق ہے لیکن ابھی تک اس تحقیق کی بنیادوں پر طبائع کی تقسیم ممکن نہیں کیونکہ غدودوں کا علم ابھی تک ابتدائی منازل پر ہے ۔

عقاید اور رویے:

شخصیت میں عقاید اور نظریات کا اہم مقام ہے ۔ کائنات ، روح اور خدا کے متعلق جو عقاید صدق دل سے مانے جائیں وہ خیالات ، محرکات اور اعمال پر گہرا اثر ڈالتے ہیں ۔ عقاید بکھرے نہیں رہتے بلکہ ایک سلسلے میں منسلک ہو کر نظام بنا لیتے ہیں ۔ جب ان کا نظام بن جائے تو ان میں مضبوطی اور استواری آ جاتی ہے ایسی صورت میں ان کو بدلنا یا ان کے غلبہ سے آزاد ہونا قریباً قریباً ناممکن ہو جاتا ہے ۔ ہمارے آبا و اجداد کے اعمال و افکار پر ، اسی طرح ان کے نظریات اور ہیجانات پر روحیت (Animism) کا گہرا چربہ چڑھا ہوا تھا ۔ اس عقیدے کے تحت جو شخصیت بنی اس میں توہمات ، خوف اور جادو کا دور دورہ تھا ۔ قدیم انسان کو مظاہر قدرت سے ڈر لگتا تھا لہٰذا وہ تابو (Taboos) کو بڑی سختی سے نافذ کرتا تھا اور ہر نئی چیز سے گریزاں تھا ۔ مذہبی عقاید نے بھی مختلف قسم کی سختیاں پیدا کیں ۔ صوفیوں اور غیر صوفیوں کو لیجیے دونوں کے طریقۂ زندگی میں بُعدالمشرقین ہے اور اس فرق کی وجہ سے ان کی شخصیتوں کی ساخت و پرداخت ایک دوسرے سے الگ

ہے۔ اسی لیے متعصب اور آزاد خیال مرد اور عورتیں نہ صرف عقاید میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ سیرت و کردار میں بھی او، احوال اور افعال میں بھی مختلف ہوتی ہیں۔

عقاید کا دار و مدار محض عقل پر ہی نہیں بلکہ ہیجانات پر بھی ہوتا ہے۔ دوسرے لوگوں کے افکار اور آرا انھیں متأثر کرتے ہیں اور بعض اوقات صرف متأثر ہی نہیں کرتے بلکہ انھیں پیدا بھی کر دیتے ہیں۔ کچھ حد تک طبائع بھی عقاید پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ لیکن اگر عقاید پختہ ہو جائیں تو پھر شخصیت کو اپنے رنگ میں رنگ دیتے ہیں۔ جو سلوک ہم انسانوں سے روا رکھتے ہیں اور جو رویہ ہمارا کائنات اور زندگی کے بارے میں ہوتا ہے، وہ عقاید ہی کی بدولت ہے۔

جذبات (Sentiments) :

انسانوں اور کائنات کے بارے میں ہمارے جو رویے ہیں انھیں جذبات کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ پہلے پہل شانڈ (Shand) نے ان معنوں میں استعمال کیا۔ اس کا کہنا ہے کہ جذبہ کسی خاص موضوع یا اشیاء کے گرد ہمارے ہیجانات کی تنظیم کا نام ہے۔ مثلاً مجنوں کا لیلیٰ کے لیے عشق ایک جذبہ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ مجنوں کی ہیجانی زندگی کا محور لیلیٰ ہے۔ اسی کے گرد اس کی ہیجانی زندگی گھومتی ہے۔ جو کچھ وہ محسوس کرے گا وہ اس بات پر منحصر ہے کہ لیلیٰ کا اس بارے میں کیا رویہ ہے۔ اگر لیلیٰ اس کے قریب ہوگی تو وہ خوش ہوگا اور اگر اس کی طرف مسکرا کر دیکھے تو اس کی خوشی دوگنی بلکہ چوگنی ہو جائے گی۔ اور اگر بالفرض وہ تیوری چڑھا کر بات کرے تو وہ مایوس ہو جائے گا۔ عشق ایک اکتسابی فعل ہے اسی لیے بجائے جبلت کے اسے جذبہ کہیں گے۔ مجنوں اس جذبے سے پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس نے لیلیٰ کو دیکھا اس کے حسن سے متأثر ہوا۔

آہستہ آہستہ یہ خیال جنون کی حد تک پہنچ گیا - شاید مجنوں لیلیٰ ء
ملا ہو ، لیلیٰ نے پیار و محبت سے بات کی ہو ، ملنے کے وعدے وع
ہوئے ہوں اور یہ محبت بڑھتے بڑھتے دونوں پر چھا گئی ہو - اس حالہ
میں مجنوں کو تو دنیا پاگل کہے گی اور لیلیٰ کے لیے بھی کچھ نا
دھرے گی ، لیکن نفسیات میں اس کیفیت کو جذبہ کہا جائے گا -

ہم نے جذبے کا لفظ شانڈ (Shand) کی نسبت وسیع معانی میں
استعمال کیا ہے - جذبے سے ہماری مراد محض ہیجانی افتاد نہیں جو ایک
فرد کو کسی شے سے ہو بلکہ اس سے مراد وہ نفسیاتی رویہ ہے ج
کسی شے کی جانب ہو - مثلاً اگر عشق کو ہی لے لیا جائے تو عشق
میں صرف ہیجانات ہی شامل نہیں بلکہ وقوف (Cognition) اور طلب
(Conation) بھی شامل ہیں - مجنوں لیلیٰ کے بارے میں صرف احساسات
ہی نہیں رکھتا بلکہ اس کے لیے زمین آسمان کے قلابے ملا دیتا ہے او
اس کی ذات سے کئی توقعات وابستہ کیے ہوئے ہے - اس لحاظ سے
جذبات کا مقام شخصیت میں نہایت اونچا ہے -

جذبات بن چکنے کے بعد ہماری زندگی تغیرات سے بچ جاتی ہے
اس میں نظام اور استقامت آ جاتا ہے - ہماری خواہشات بھی جذبات کے
زیر اثر کام کرتی ہیں اور چونکہ عقاید پر ہیجانات اور خواہشات کا اثر
پڑتا ہے - اس لیے عقاید کو بھی جذبات کے تابع سمجھنا چاہیے -

یاد رہے کہ ہماری زندگی میں ایک جذبہ نہیں بلکہ کئی جذبات
ہوتے ہیں - ان میں تصادم بھی ہوتا ہے لیکن عام انسانوں کی زندگیوں
میں تصادم کے مواقع بہت کم ہوتے ہیں - اس کی وجہ یہ ہے کہ جذبے
الگ الگ نہیں رہتے بلکہ مل جل کر رہتے ہیں - ایک جماعت یا
نظام کی صورت میں زندگی بسر کرتے ہیں - یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے
کہ یہ نظام کیسے بنتا ہے ؟ اس کے لیے ہمیں میکڈوگل (McDougall
سے مدد لینی پڑے گی -

خود ادعائی کا جذبہ :

ہمارے جذبات صرف دوسرے انسانوں اور اشیاء کے لیے ہی نہیں ہوتے بلکہ اپنی ذات کے لیے بھی ہوتے ہیں ۔ یہ سچ ہے کہ ہماری جبلات ، ہیجانات اور خواہشات دوسرے انسانوں اور اشیاء سے بیدار ہوتی ہیں ۔ لیکن ہماری اپنی ذات بھی نفسی واردات کا مرکز اور محور بن جاتی ہے اور جبلی اکتسابی میلانات کو انگیختہ کرتی ہے ۔ ابتدا میں فرد کی ضرورتیں حیاتیاتی ہوتی ہیں ۔ لیکن ساتھ ساتھ خود اثباتی اور انکساری کی جبلتیں بھی سرگرم کار ہوتی ہیں ۔ انھی سے خود نمائی کا جذبہ بنتا ہے ۔ جلد ہی بچہ سمجھ جاتا ہے کہ بعض لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں اور بعض لعن طعن ۔ جیسے دوسرے لوگ اسے سمجھتے ہیں ویسے ہی وہ اپنے آپ کو دیکھنے لگتا ہے ۔ اگر گھر والے ضرورت سے زیادہ لاڈ پیار کرتے ہوں تو وہ بگڑ جائے گا اور اپنے آپ کو بچہ سقہ سمجھنے لگے گا ۔ لیکن یہی بچہ جب سکول جائے گا تو بڑے لڑکے اس کی پرواہ نہیں کریں گے ۔ اس کا مذاق اڑائیں گے ، تب اس کا طلسم ٹوٹ جائے گا اور ساتھ ہی شاید اسے صدمہ ہوگا ۔ اگر یہ بچہ سمجھ دار ہے تو بدلے ہوئے حالات دیکھ کر اپنا طرز حیات بھی بدل لے گا ۔ اپنے جذبۂ خود ادعائی میں مناسب رد و بدل کر لے گا وگرنہ خود بھی ناخوش رہے گا اور دوسروں کو بھی ناخوش رکھے گا ۔

جب بچے سن بلوغت کو پہنچتے ہیں تو ان کا خود ادعائی کا جذبہ موضوعی رخ اختیار کرتا ہے ۔ طبعی اور معاشری ماحول سے کنارہ کش ہو کر ان کی توجہ ذات کی طرف منعطف ہو جاتی ہے ۔ ان کی زندگی کا مرکز ذات بن جاتی ہے ۔ خواہ کامیابی ہو یا ناکامی، تشفی ہو یا غیر تشفی، ستائش ہو یا مذمت اس کا تعلق ان کی ذات سے ہے ۔ جو کچھ بچہ سوچتا ہے یا محسوس کرتا ہے یا خواہش رکھتا ہے اس کا تعلق خود ادعائی کے جذبے سے ہے اور اسی کے تحت اس کی نفسیاتی زندگی کی تنظیم ہوتی ہے ۔

جب جذبہ خود ادعائی کا مرکز ذات بن جائے تو یہ جذبہ باقی جذبات کے مقابلہ میں غیرمعمولی طاقت کا مالک بن جاتا ہے۔ اس کی حیثیت حکمران اور ناظم جیسی ہو جاتی ہے۔ تمام جذبات کا تعلق ذات سے ہے اور خود ادعائی کا جذبہ ذات کا جذبہ ہے۔ لہٰذا یہ جذبہ باقی تمام جذبات کے مقابلے میں ممتاز حیثیت رکھے گا اور ان پر حکمرانی کرے گا۔ مجنوں کا جذبہ عشق اس کی ذات کا حصہ ہے۔ یعنی جذبہ خود ادعائی کا جزو۔ اس لیے اس کی تمام زندگی پر چھایا ہوا ہے اور ہر ذہنی مظاہر پر حکمرانی کرتا ہے۔

خود ادعائی کا جذبہ بہت ہی پیچیدہ جذبہ ہے۔ فرد کے تمام جذبات اسی کے تحت ہوتے ہیں اور اسی کی بدولت ان کی تنظیم ہوتی ہے۔ جب میں اپنے متعلق سوال کرتا ہوں کہ میں کون ہوں یا کیا ہوں؟ تو اس کا جواب ہوگا میں وہ ہوں جس کا الف سے پیار ہے، ب سے نفرت ہے، د سے دوستانہ ہے۔ جو فلاں فلاں مقاصد حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہے وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا میرا خود ادعائی کا جذبہ میری محبت، نفرت، عقاید، امیدوں اور امنگوں کو شامل کیے ہوئے ہے۔

پس اگر شخصیت کو فطری اور اکتسابی میلانات کی ثانوی ساخت تسلیم کر لیا جائے تو شخصیت ایک ٹھوس تصور بن جائے گا لیکن اگر ان تمام میلانات کو خارج کر دیا جائے تو شخصیت جیسا تجریدی اور غیرتجربی تصور شاید ہی کوئی اور ہو۔

شخصیت کی وحدت:

ابھی ابھی کہا گیا ہے کہ شخصیت مختلف جذبات کی تنظیم کا نام ہے۔ لیکن بعض جذبات ایک دوسرے سے تعاون نہیں کرتے۔ بسا اوقات ایک شخص اپنے آپ سے کہتا ہے کہ فلاں اصول یا جذبے کو قربان کر کے میں نے اخلاقی گراوٹ کا ثبوت دیا ہے۔ شاید میرا الف سے دوستانہ اس

اس کا مقتضی ہو کہ ب سے دوستانہ نہ رکھوں یا مجھے اپنے کنبے کی محبت، ملک کی محبت سے باز رکھے ۔ وحدت کا منشا ہے کہ شخصیت کے مختلف عناصر اور تقاضوں میں یک رنگی پیدا ہو اور جہاں کہیں بھی تصادم کا ڈر ہو اسے دور کر دیا جائے ۔ اس مطلب کے لیے ضروری ہے کہ تمام جذبات ایک دوسرے سے متوافق ہوں اور تعاون سے کام لیں ۔

شخصیت کو دو طریقوں سے وحدت نصیب ہو سکتی ہے :

۱۔ اگر شخصیت میں کوئی غالب جذبہ ہو تو وہ دیگر جذبات پر حکمرانی کرے گا اور تصادم کے مواقع ختم کر دے گا ۔ مثلاً کنجوس کا غالب جذبہ روپیہ پیسہ ہے ۔ وہ ہر چیز روپے کے لیے نثار کر دے گا ۔ حتیٰ کہ دوستانے، پیار محبت، عزت آبرو سب کچھ دولت کے لیے بھلا دے گا ۔ مجنوں اور لیلیٰ کے قصے میں غالب جذبہ عشق ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جب عشق کو ٹھیس پہنچتی ہے تو عاشق اور معشوق خودکشی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں ۔ کنجوس کی زندگی کو روپیہ پیسہ وحدت بخشتا ہے اور عاشق کی زندگی کو اس کا جذبۂ عشق، ان کے اعمال و افعال، ان کے ہیجانات اور احساسات کا سرچشمہ یہی غالب جذبات ہیں ۔ لیکن یاد رہے کہ ایسی وحدت ہمیشہ خطرہ میں ہوتی ہے ۔ اس کا خاتمہ اس وقت ہوجاتا ہے جب حالات بری طرح سے نا مساعد ہو جائیں ۔ ان جذبات کا مرکز کوئی شخص یا شے ہوتی ہے جب وہ شخص یا شے ناموافق حالات کی بنا پر ہاتھ نہ آ سکے یا چھن جائے تو جذبات کا قلعہ مسمار ہو جاتا ہے ۔

۲۔ ایک اور طریقہ جس سے شخصیت میں وحدت آ جاتی ہے وہ ذات کو کسی ٹھوس شے سے نہیں بلکہ کسی عالمگیر مقصد حیات سے منسلک کرنے سے ہے ۔ تہذیب اخلاق اور کیریکٹر کا نشو و نما اس امر پر منحصر ہے کہ عمومی اور عالمگیر اصول حیات اپنائے جائیں ۔ اگر ہمارا لگاؤ انصاف، سچائی اور نیکی سے ہو جائے تو ہماری ذات میں ایسی وحدت آ جائے گی جو خارجی امور سے ٹوٹ نہ سکے گی ۔ اگر کوئی تصادم ہوگا

تو عمومی اصولوں اور مخصوص احوال میں ہوگا۔ اس تصادم کو
طور پر دور کیا جائے گا۔ کیونکہ تمام جذبات کی تنظیم عالمگیر اصو
کے تحت ہو چکی ہوگی۔ ارادی کردار میں بھی ہوتا ہے۔ لیکن یاد ر
کہ بعض اوقات سوچ بچار سے بھی زبردست الجھنیں پیدا ہو جاتی ہ
بے شمار توانائی خرچ ہوتی ہے اور کئی ایک مقبول اور پسندیدہ جذب
کو نثار کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا اصولوں کے تصادم کو دور کرنا آس
کام نہیں۔ اگر یہ دور بھی ہو جائے تو بھی طبیعت پر بڑا بوجھ رہتا ہ
اپنے فیصلے پر افسوس کیا جاتا ہے۔ بسا اوقات فرد اپنے آپ سے کہتا
کہ فلاں اصول یا جذبے کو قربان کرکے میں نے اخلاقی گراوٹ کا ثبوت
دیا اور اگر فرد کی شخصیت مضبوط نہ ہو یا اس میں توازن نہ ہو تو اس
کی تنظیم ختم ہو جائے گی اور شخصیت دوہری (Double) ہو جائے گی۔

پس ہمیں شخصیت کو متوازن بنانا چاہیے ایسی شخصیت تبھی حاصل ہوگی جب کوئی غالب جذبہ باقی جذبات پر حکمرانی کے قابل ہو۔

ووڈورتھ کا نظریہ:

ووڈورتھ کے نزدیک شخصیت کے دو عناصر ہیں:

(۱) فعلیاتی۔

(۲) معاشری۔

فعلیاتی عناصر:

فعلیاتی عناصر میں کئی قسم کی طاقتیں شامل ہیں۔ اس میں طبعی ساخت اور کیمیاوی عوامل کو دخل ہے۔ کون ہوگا جو صحت، قد اور شکل و صورت سے متأثر ہوئے بغیر رہ سکے اس کے علاوہ طبائع جن کا انحصار کیمیائی فعل پر ہے شخصیت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ووڈورتھ کا کہنا ہے کہ جسم کی کمزوری یا توانائی سے طبع کی کیفیت میں فرق آتا ہے۔ اس سلسلے میں جو تجربے ہوئے ہیں وہ دوائیوں

خوراک، بیماریوں اور خون میں شکر کے ذریعہ ہوتے ہیں ۔

دوائیوں کے ضمن میں نیند آور گولیاں قابل ذکر ہیں ۔ یہ جسم کی طاقت گھٹا دیتی ہیں ۔ پہلے غنودگی اور بالآخر نیند لے آتی ہیں ۔ شراب بھی تفاعل کو سست کر دیتی ہے ۔ اس لیے شراب کے نشہ میں لوگ باتیں زیادہ کرتے ہیں اور دنگے فساد کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں ۔ کیفین (Caffeine) جسم کی تھکاوٹ دور کر کے طاقت کا فریب دیتی ہے، وقتی طور پر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بے جان جسم میں دوبارہ جان پڑ گئی ہو ۔

شکر کی مقررہ مقدار خون میں ضرور موجود ہونی چاہیے، وگرنہ دماغ سست اور اعضا ڈھیلے ہو جائیں گے ۔ اگر شکر کی مقدار مناسب حد سے گر جائے تو دماغی فعل میں فتور آ جائے گا ، مزاج چڑچڑا ہو جائے گا ، اور ایک بے معنی سا خوف دل و دماغ پر چھایا رہے گا ۔

خوراک : فاقہ کشی سے نفسیاتی مشکلیں بڑھ جاتی ہیں ۔ تجربے کے طور پر امریکہ میں ۳۲ آدمیوں کو چھ ماہ کے لیے بھوکا رکھا گیا ۔ ان کے عقلی قوا بدستور رہے لیکن شخصیت میں کئی تبدیلیاں آ گئیں ۔ بھوک کی حالت میں وہ لوگ اکثر خوراک کے متعلق ہی سوچتے رہے ۔ کھیل کود، سنیما اور جنس میں ان کا شوق کم ہو گیا ، عموماً وہ مایوس دکھائی دیتے تھے ۔ مزاج میں چڑچڑا پن تھا میل جول سے احتراز کرتے تھے ۔

بیماری میں مزاج تبدیل ہو جاتا ہے ۔ مریض میں خود اعتمادی کم ہو جاتی ہے، دوسروں پر اعتماد بڑھ جاتا ہے ۔ اسے غصہ بھی زیادہ آتا ہے ۔ پیار اور محبت کی بھوک بڑھ جاتی ہے، وہ ہر شخص سے رحم اور شفقت چاہتا ہے ۔ ایک قسم کی بیماری میں جسے ورم دماغ (Encephalitis) کہتے ہیں، دماغ اور جسم دونوں متأثر ہوتے ہیں ۔ اس بیماری سے بچے بے راہ رو ہو جاتے ہیں اور ذہانت کھو بیٹھتے ہیں ۔

آج کل اندرونی غدودوں (Endocrine glands) پر زیادہ زور دیا جاتا ہے ۔ ان کا مفصل ذکر اسی باب میں آ چکا ہے ۔

معاشری عناصر:

ہر بچہ سوسائٹی میں پیدا ہوتا ہے، وہیں سے اپنے لیے کردار (Role) اور ضابطہ (Code) حاصل کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کردار اور ضابطہ اسے کیسے ملتا ہے؟

ضابطہ:

ہر گروہ کا تقاضا ہے کہ اس کے ممبر خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے کسی قاعدے کے تحت زندگی بسر کریں۔ ضروری نہیں کہ یہ قاعدہ اعلیٰ اقدار کا حامل ہو۔ یہ قاعدہ تو صرف رہنے سہنے کے طریقوں سے متعلق ہوتا ہے اسی لیے ہر معاشرے کا اپنا اپنا ضابطہ ہے۔ اور پھر یہ ضابطہ کوئی طے شدہ امر نہیں۔ نئے تقاضوں کے زیر اثر اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن خواہ ضابطہ کچھ ہی ہو، ہر بچے کو اسے اختیار کرنا ہوگا۔ اس ضابطے کے بعض اصول تو بچہ خوشی خوشی قبول کر لیتا ہے اور جن اصولوں کی وہ مخالفت کرتا ہے وہاں اسے ڈانٹ ڈپٹ ہوتی ہے، اس کا تمسخر اڑایا جاتا ہے، سزا دی جاتی ہے، اور بعض دفعہ نوبت یہاں تک آتی ہے کہ اسے گھر سے نکال دیا جاتا ہے، اس سختی کا نتیجہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ بچہ مخالفت چھوڑ کر اپنے اطوار و کردار معاشرے کے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق بنا لیتا ہے۔

اخلاق اور تمدنی اصولوں کے علاوہ ہر بچہ اپنے کنبے یا گھرانے کا طرز گفتگو اور لہجہ سیکھتا ہے۔ ذرا ملتانی بولی اور جھنگ والی بولی کا مقابلہ کریں اور دیکھیں کہ ان علاقوں کے بسنے والے لوگ کیسے الفاظ ادا کرتے ہیں، تو آپ کی سمجھ میں آ جائے گا کہ بچے کس طرح اپنے لوگوں کا لہجہ سیکھ لیتے ہیں۔ مغربی اور مشرقی پاکستان میں کئی ایسے گاؤں ہیں جو شہروں سے دور پہاڑوں کے دامن میں واقع ہیں۔ وہاں کے لوگ کبھی گھروں سے باہر نہیں جاتے۔ انھوں نے کبھی ریل گاڑی نہیں دیکھی۔ انھوں نے کبھی ریڈیو نہیں سنا۔ انھوں نے

کبھی اخبار نہیں پڑھا - ان جگہوں کے بچے صرف اپنے ہاں کا لب و لہجہ اختیار کرتے ہیں - اور جو طور طریقے اپنے گھروں میں دیکھتے ہیں انہیں ہی زندگی کا بہترین سرمایہ سمجھتے ہیں -

ہر سوسائٹی میں ایسے لوگ بھی ہیں، جو قاعدے اور قانون کی پرواہ نہیں کرتے- تھوڑا سا انحراف تو ہر معاشرے میں برداشت کیا جاتا ہے لیکن اگر کوئی شخص معاشرے کے اصولوں کی بالکل پرواہ نہ کرے تو معاشرہ اسے معاف نہیں کرتا - محض اپنی بقاء اور سلامتی کی خاطر معاشرہ ہر ایسے فرد کو کچل کر رکھ دے گا جو معاشرے کی بنیادیں کھوکھلی کرے -

آج کل جب کہ ذرائع رسل و رسائل عام اور سستے ہوگئے ہیں- لوگ اپنی زندگی بہتر بنانے کے لیے دیہاتوں سے دور دراز کا سفر طے کرکے شہروں میں آن بسے ہیں - یہاں وہ صنعت و حرفت کی مہارتیں حاصل کرکے اور اعلیٰ تعلیم پا کر اپنی زندگی کو بہتر سے بہتر بنا رہے ہیں - موجودہ دور مقابلے کا دور ہے - مقابلے میں وہی بڑھے گا جو دوسروں سے جسمانی اور دماغی لحاظ سے بہتر ہوگا - لہٰذا آج کل لوگوں پر وہ جمود طاری نہیں جو پہلے تھا - لوگ اپنی آبائی جگہوں کو چھوڑ کر جہاں زندگی بہتر نصیب ہو چلے جاتے ہیں - اسی طرح لوگ اپنا آبائی معاشرہ چھوڑ کر نئے معاشروں کے رکن بن جاتے ہیں - اور وہاں کے طریقے اختیار کر لیتے ہیں -

اگر کسی شخص میں نہ تو اتنی طاقت ہو کہ معاشرے کو ہم‌خیال بنا لے اور نہ ہی اس قابل ہو کہ کسی اور جگہ جا کر زندگی بسر کر سکے ، تو لامحالہ اسے اپنے معاشرے میں رہنا ہوگا اور اگر وہ شخص صدق دل سے سماج کے بندھنوں کو قبول نہیں کرتا، تو یا تو وہ باغیانہ زندگی بسر کرے گا یا ذہنی طور پر سوسائٹی سے کنارہ کشی کرکے اپنے خیالات کی دنیا میں مگن رہے گا- باغی بن کر اسے جیل خانے کا مزہ

چکھنا ہوگا، اور ذہنی کنارہ کشی سے اسے پاگل خانے کا مکین بننا ہوگا۔

اوپر ذکر آ چکا ہے کہ بچہ، قاعدہ اور قانون گھر سے سیکھتا ہے۔ شروع شروع میں وہ خیال کرتا ہے کہ یہ قاعدہ آسمانوں سے آترا ہوا ہے۔ اس میں رد و بدل نہیں ہو سکتا لیکن بعد میں وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ یہ سب قاعدے انسان نے اپنی سہولت اور بہبودی کے لیے بنا رکھے ہیں۔ اس لیے اگر یہ بدلے ہوئے حالات میں زندگی کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکیں تو انہیں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ پیاجے (Pigat) نے چند ایک چھوٹے بچوں سے جو کسی کھیل میں مشغول تھے پوچھا کہ اس کھیل کے قاعدے کہاں سے آئے۔ بچوں نے جواب دیا کہ یہ قاعدے ان کے آبا و اجداد نے بنائے اور ان میں رد و بدل ممکن نہیں۔ لیکن بڑے بچوں نے مختلف جواب دیا انھوں نے یہ نہیں کہا کہ کھیلوں کے قاعدے بدل نہیں سکتے۔ ان کے خیال میں یہ قاعدے تو زمانہٗ ماضی سے چلے آتے ہیں، لیکن اگر کوئی شخص مختلف قاعدے بنا دے تو کھیل ان قاعدوں کے مطابق بھی کھیلی جا سکتی ہے۔

اکثر والدین کے قول اور فعل میں فرق ہوتا ہے وہ اپنے بچوں سے وعدے کرتے ہیں اور پورا نہیں کرتے۔ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ بچے ان کی چالیں نہیں سمجھتے، حالانکہ بچے کو جھوٹ کا سبق وہیں سے ملتا ہے۔ شروع شروع میں بچہ جھوٹ کی ماہیت کو نہیں سمجھتا۔ وہ تو جھوٹ میں فائدہ دیکھتا ہے۔ مٹھائی چرائی، جھوٹ بول دیا اور مار سے بچ گئے۔ سکول کا کام نہیں کیا ماسٹر صاحب کو کوئی بہانہ بتا دیا، جرمانے سے بچ گئے۔ بچے کو بڑا ہو کر پتہ چلتا ہے کہ جھوٹ سے شخصیت کی بنیادیں کیسے کمزور پڑ جاتی ہیں اور خود اپنے اور معاشرے کے لیے کیسے طرح طرح کی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس جھوٹ کی عادت اور نفسیاتی مشکلات

پیدا کرنے میں والدین کا بڑا ہاتھ ہے۔

کردار (Role) :

معاشرے کے بندھن خواہ کیسے ہی مضبوط کیوں نہ ہوں ہر فرد کے لیے اتنی گنجائش ضرور ہوتی ہے کہ وہ دوسروں سے ذرا ہٹ کر اپنی زندگی کو بنائے۔ ہر انسان کا اپنا مقام ہے۔ اس کے اپنے فرائض اور ذمہ داریاں ہیں۔ وہ کسی کا بیٹا یا بیٹی ہے۔ کسی کا بھائی یا بہن ہے۔ کسی کا خاوند یا بیوی ہے۔ پھر وہ زمیندار یا مزارع ہے۔ بڑھئی یا سنار ہے۔ طاقت میں دوسروں کے برابر ہے یا کم۔ کبڈی میں اول درجہ کا کھلاڑی ہے، یا درمیانہ درجہ کا یا کچھ بھی نہیں۔ ان تمام چیزوں سے اس کے مقام کا پتہ چلتا ہے۔ یہی مقام اس کا رول یا کردار ہے۔

کردار کے متعلق دو نظریے ہیں ایک فرائڈ کا اور دوسرا ایڈلر کا۔

فرائڈ کے نزدیک جنس ایک زبردست فطری رجحان ہے اور شروع سے ہی بچہ جنسی چکر میں پھنسا ہوا ہوتا ہے۔ اوڈیپسی تعقید (Oedipus Complex) کا لفظ آج کل زبان زد عام ہے۔ اس کا اشارہ اسی جنسی چکر کی طرف ہے۔ اوڈیپس کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے نادانستہ اپنی والدہ سے شادی کر لی اور علم ہونے پر خود کشی کر لی۔ فرائڈ کا کہنا ہے کہ ہر نر بچے کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی والدہ کو حاصل کر لے لیکن اپنے راستے میں باپ کو حائل پاتا ہے۔ اسی طرح ہر مؤنث بچے کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے والد کو حاصل کر لے لیکن اس کے راستے میں اس کی ماں حائل ہے۔ اپنی جسمانی اور ذہنی کمزوری کی وجہ سے نہ لڑکا اور نہ لڑکی اس قابل ہیں کہ اپنے والدین سے لڑیں جھگڑیں اور جس شے کو وہ دل و جان سے (گو لاشعوری طور پر) چاہتے ہیں، اسے پا لیں۔ لہٰذا عالم بیداری سے ہٹ کر وہ عالم خواب کی جانب آتے ہیں۔ عالم بیداری میں تو طرح طرح کی پابندیاں اور رکاوٹیں ہیں۔

انہیں دور کرنا ان کے بس کا روگ نہیں لیکن عام تخیلات میں وہ اپنی دنیا کے خود خالق ہیں - جیسی دنیا وہ چاہتے ہیں ویسی بن جاتی ہے - لہٰذا لڑکا جو والدہ کو چاہتا ہے عالم تخیلات میں والد کا کردار ادا کرتا ہے اور جو لڑکی والد کی خواہاں ہے وہ والدہ کا روپ دھار لیتی ہے - اس طرح خیالات کی دنیا میں انہیں وہ بات نصیب ہو جاتی ہے جو عالم بیداری میں ان کے لیے محال تھی -

فرائڈ کہتا ہے کہ یہی وجہ ہے کہ لڑکے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہیں اور انہی کے طور طریقے اختیار کرتے ہیں اور لڑکیاں والدہ کی پیروی کرتی ہیں ، اور اس کا طریقہ سلیقہ سیکھ لیتی ہیں - غرضیکہ جنسی چکر کے تحت ہر بچہ خواہ نر ہو یا مادہ اپنا اپنا رول یا کردار سیکھ لیتا ہے -

ایڈلر (Adler) کا نظریہ ترتیب پیدائش (Birth order) پر مبنی ہے- اس کا کہنا ہے کہ جس ترتیب سے بچے پیدا ہوتے ہیں اسی طرح سے ان کی شخصیت بنتی ہے اور ترتیب کے مطابق ان کے شخصیاتی مسائل اور مشکلات پیدا ہوتی ہیں - مثلاً پہلا بچہ ماں باپ کے پیار کا پہلا پھل ہوتا ہے- اس لیے وہ ان کی توجہ کا خاص مرکز بنا رہتا ہے ، اس کی ہر خواہش پوری ہوتی ہے - وہ اگر روتا ہے تو ماں باپ پریشان ہو جاتے ہیں ، اگر وہ ہنستا ہے تو ان کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے - لہٰذا وہ سمجھنے لگتا ہے کہ تمام کائنات اس کی تشفی کے لیے بنی ہے - دنیا کی ہر شے اس کی مطیع و فرماں بردار ہے - یہ رویہ نفسیاتی طور پر بہت بڑی مشکلات کا پیش خیمہ ہے - پہلا بچہ مغرور ، خود سر اور حریص ہوگا - وہ اپنی ذات کو دوسروں سے اعلیٰ و ارفع شمار کرے گا ، اور ذرا سی مخالفت پر دماغی توازن کھو بیٹھے گا - جب گھر میں دوسرا بچہ پیدا ہوتا ہے تو پہلے بچے کو بڑا دھچکا لگتا ہے پہلے تو وہ ماں باپ کی شفقت کا مرکز تھا اب ایک شریک پیدا ہوگیا ، اس کا دل حسد اور بغض سے بھر جاتا ہے- وہ چھوٹے بچے کو مارتا ہے تنگ کرتا ہے اور والدین کو اپنی مصیبت

کا ذمہ دار قرار دیتا ہے ۔ اس کے تخت و تاج کو چھیننے والے اور اس کی محبت میں ایک اور دعویدار پیدا کرنے والے اگر والدین نہیں تو اور کون ہیں ؟ لہٰذا وہ والدین کو نفرت سے دیکھتا ہے ۔ والدین کو نفرت کرنے سے مراد معاشرے سے نفرت کرنا ہے ، کیونکہ ابتدا میں والدین ہی معاشرے کی نمائندگی کرتے ہیں ۔ چھوٹا بچہ بھی خوش نہیں رہتا ۔ اسے والدین بھی جھڑکتے ہیں اور بڑے بھائی اور بہن بھی لہذا اس کی شخصیت گھٹی گھٹی رہتی ہے ۔ سب سے آخری بچہ ماں باپ کی زندگی میں لاڈلا بنا رہتا ہے ۔ چونکہ اس کے بعد کوئی اور بچہ پیدا نہیں ہوتا لہٰذا ماں باپ اسے بچہ ہی سمجھے چلے جاتے ہیں ۔ زیادہ پیار کی وجہ سے یہ بچہ بگڑ جاتا ہے اور خود اعتمادی جیسا جوہر کبھی پیدا نہیں کرتا ۔

ایڈلر کے مطابق ہر بچے کو ترتیب پیدائش کی وجہ سے کسی نہ کسی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ ہر بچہ تکالیف اپنے ساتھ لاتا ہے ۔

ووڈورتھ کے خیال میں یہ دونوں نظریے شخصیت کے اہم پہلوؤں کو آشکارا کرتے ہیں ۔ لیکن مبالغے سے کام لیتے ہیں ۔

فرائڈ کے نظریے میں بڑی صداقت موجود ہے ۔ بچہ دانستہ یا نادانستہ طور پر بڑوں کی نقالی کرتا ہے ۔ لڑکا باپ جیسا بننا چاہتا ہے اور لڑکی ماں جیسی ۔ گھر میں باپ کی حیثیت اول درجہ کی ہوتی ہے ۔ طاقت اس کے پاس ہوتی ہے ۔ تجربہ اس کا وسیع ترین ہوتا ہے ۔ گھر میں عقل اور سمجھ میں اس کا جواب نہیں ہوتا ۔ علاوہ ازیں وہ روزی کماتا ہے اور کنبے کو پالتا ہے ۔ وہ گھر کے تمام افراد سے محبت کرتا ہے لیکن کبھی کبھی بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتا ہے ، مارتا پیٹتا بھی ہے ۔ بچے اس رویے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ۔ پس باپ کے متعلق بچوں کے رویے ملے جلے ہوتے ہیں ۔ وہ باپ سے پیار بھی کرتے ہیں اور نفرت بھی ۔ فرائڈ کے مطابق لڑکا اپنے آپ کو باپ کی مثل بنا لیتا ہے اور اس طرح جو اضداد اس کے اپنے رویے میں ہوتے ہیں وہ مٹ جاتے ہیں ۔ ایک اور فائدہ یہ ہوتا

ہے کہ ضابطۂ حیات اب اس کا اپنا ہو جاتا ہے ۔ خیر و شر کے معیار اب اس کے ذاتی بن جاتے ہیں ۔ جب معاملہ اس حد تک پہنچ جاتا ہے تب ضمیر رونما ہوتی ہے ۔ بجائے اس کے کہ بچہ اچھائی کو اچھائی اس لیے کہے کہ والدین اسے پسند کرتے ہیں یا برائی کو برائی اس لیے کہے کہ والدین اسے ناپسند کرتے ہیں وہ کہتا ہے کہ اچھائی اس لیے اچھائی ہے کہ معیار تک پہنچتی ہے اور برائی اس لیے برائی ہے کہ وہ معیار تک نہیں پہنچتی ۔

فرائڈ کی طرح ایڈلر نے بھی کئی مفید باتوں کی طرف ہماری توجہ دلائی ہے ۔ ترتیب پیدائش سے کئی مشکلات پیدا ہونے کا ڈر ہے ۔ اس لیے والدین کو محتاط رہنا چاہیے اور بچوں کی صحیح رہنمائی کرنی چاہیے ۔ کئی تجربے ایڈلر کے نظریے کے بارے میں کیے گئے ہیں ۔ کوئی تجربہ بھی ایڈلر کی پوری طرح تائید نہیں کرتا ۔ بچوں کو شخصیاتی مشکلیں ضرور ہوتی ہیں ۔ لیکن کوئی خاص مشکل یا مشکلات کسی ایک ترتیب یا درجے سے وابستہ نہیں ۔ بچے کے درجۂ ترتیب سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس قسم کی مشکلات اسے آ سکتی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ مشکلات واقعی موجود ہیں ۔

ووڈورتھ کا کہنا ہے[1] کہ یہ دونوں نظریے ایام طفولیت کو بڑی اہمیت دیتے ہیں ۔ اور بعد کے اثرات کو نظر انداز کر دیتے ہیں ۔ فرائڈ اور ایڈلر نے اپنے اپنے نظریوں کی تائید میں عصبانی لوگوں سے مواد اکٹھا کیا لیکن یہ مواد ہر نوع کی نمائندگی کرنے سے قاصر ہے ۔ عصبانی لوگوں کی شخصیت پھلتی پھولتی نہیں کیونکہ اس کی نشو و نما رک جاتی ہے ۔ نارمل آدمیوں کی شخصیت بڑھتی اور تبدیل ہوتی رہتی ہے ۔ سکول کالج ، یونیورسٹی اور دیگر اداروں سے جو اثرات آتے ہیں وہ ان کی زندگیوں پر گہرا اثر چھوڑ جاتے ہیں ۔

۱۔ ملاحظہ ہو اس کی Psychology ، صفحہ ۱۳۹ ۔

چار پانچ سال کے بچے گلیوں میں کھیلنا شروع کر دیتے ہیں، ٹولیاں بنا لیتے ہیں، لیڈر چن لیتے ہیں، اکٹھے مل کر شرارتیں کرتے ہیں۔ سکول میں بھی ٹیمیں ہوتی ہیں، یارانے دوستانے چلتے ہیں۔ یہ خلط ملط، میل جول، پارٹی بازی زبردست اثرات ہیں اور شخصیت کو تبدیل کیے بغیر نہیں چھوڑتے۔ ان پارٹیوں اور ٹولیوں سے بچہ اچھا یا برا کردار سیکھ لیتا ہے۔ ڈاکو، قاتل اور باغی کا رول یہیں سے پیدا ہوتا ہے۔ فلموں سے بھی رول لیے جاتے ہیں کئی بچے قاتلوں، ڈاکوؤں اور باغیوں کی فلمیں دیکھ کر ویسا ہی خود کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح ادب کا بھی اثر ہے۔ کتابوں سے ہیرو مل جاتے ہیں اور بچے ان کی تقلید کرتے ہیں اور اپنے آپ کو ویسا ہی بنا لیتے ہیں۔

سن بلوغت اور شباب کو پہنچ کر بچے کی دنیا بڑی وسیع ہو جاتی ہے۔ اسے کھیلوں، پڑھنے لکھنے اور معاشری اداروں میں کوئی نہ کوئی جگہ ضرور حاصل ہوتی ہے۔ یہ مقام اس کی شخصیت کو بلند کر دیتے ہیں یا گھٹا دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ہر قسم کی کتابیں پڑھتا ہے، ہر قسم کے لوگوں سے ملتا ہے اور ہر قسم کے فیصلے کرتا ہے۔ یہ تمام چیزیں شخصیت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

ووڈورتھ کا کہنا ہے کہ شخصیت کی تعمیر پہلے پانچ سال میں مکمل نہیں ہو جاتی۔ بعد کے اثرات بھی بڑے اہم ہیں یہ پہلے اثرات کو تقویت بھی دے سکتے ہیں اور انہیں کسی حد تک تبدیل بھی کر سکتے ہیں۔ شخصیت جامد نہیں بلکہ حرکی اور ارتقائی شے ہے۔ یوم پیدائش سے لے کر آخری دم تک اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اس لیے ہر قسم کے عوامل کو اہمیت دینی ہوگی۔

شخصیت کو کیسے سدھارا جا سکتا ہے؟

شخصیت کو سدھارنا آسان کام نہیں اور اس سلسلے میں کوئی سکہ بند ہدایت یا تجویز پیش نہیں کی جا سکتی مثال کے طور پر ہمدردی اور فراخدلی

عمدہ فضائل ہیں - چڑچڑاپن اور حساسیت خطرناک خصائص ہیں - لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ ہمدردی اور فراخدلی کو کیسے پیدا کیا جا سکتا ہے یا چڑچڑے پن اور حساسیت سے کیسے پیچھا چھڑایا جا سکتا ہے -

اس سلسلے میں دوستوں کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں کیونکہ دوست دوستوں کی تعریف بھی کرتے ہیں اور انہیں ان کی برائیاں بھی بتاتے ہیں - لیکن برائیاں جتاتے وقت احتیاط کی ضرورت ہے - اگر برائی کی طرف بار بار توجہ دلائی جائے یا توجہ دلاتے وقت سختی سے کام لیا جائے تو بجائے فائدے کے نقصان کا ڈر ہے - نقص دور نہیں ہوگا بلکہ اسی شکل میں یا کسی اور شکل میں موجود رہے گا -

برائیوں کا پتہ عام طور پر اس وقت لگتا ہے جب شخصیت کئی منازل طے کرکے پختگی کے قریب پہنچ چکی ہوتی ہے - اس وقت عادتیں راسخ ہو چکتی ہیں ، ان کا بدلنا آسان کام نہیں ہوتا - لیکن اگر کسی شخص میں اصلاح کا ارادہ مصمم ہو تو اسے کامیاب لوگوں کی زندگیاں دیکھنی چاہییں یا تہذیب اخلاق کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے - اس مطالعہ سے ضرور فائدہ ہوتا ہے - لیکن بعض خوبیاں ایسی ہیں جو پیدا نہیں کی جا سکتیں - مثال کے طور پر خود اعتمادی کو لیجیے اسے پیدا نہیں کیا جا سکتا - یہی حال تفوق (Ascendency) کا ہے گو اسے کسی حد تک پیدا کیا جا سکتا ہے -

تفوق کے سلسلے میں چند ایک تجربے ہوئے ہیں - نرسری سکول میں چار سال کے ایسے بچے لیے گئے جو بہت جھینپنے والے تھے انہیں دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے کا موقع دیا گیا - تجربہ کنندہ ان بچوں کو چھپ کر دیکھتا رہا، جس طرح یہ بچے دوسروں سے کھیلے ، جس قسم کا کھیل کا سامان انہوں نے استعمال کیا، جو کچھ انہوں نے ساتھیوں سے کہا یا جو ساتھیوں نے انہیں کہا، ان تمام باتوں کو نوٹ کرتا رہا - اس مشاہدے کے بعد جن بچوں کا تفوق کا شمار (Score) بہت کم نکلا

انہیں تربیت دی گئی ، جن کھیلوں کو وہ کھیل نہیں سکتے تھے وہ کھیل انہیں سکھائے گئے اور پھر انہیں ان بچوں کے ساتھ کھلایا گیا جو ان کھیلوں کو نہیں کھیل سکتے تھے ۔ اب تربیت یافتہ بچوں کو استادی اور لیڈری کا موقع ملا کیونکہ وہ تو کھیل کھیلنا جانتے تھے اور دوسروں کو نہیں آتی تھیں ۔ اس موقعہ کے بعد دوبارہ ان بچوں کو تفوق کی آزمائش دی گئی ، اب ان کا شمار پہلے سے بڑھا ہوا تھا ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سازگار حالات میں تفوق کا جذبہ بڑھ جاتا ہے ۔

ایک اور تجربے میں ایسے لڑکے لیے گئے جو خود کام کرنے سے گریز کرتے تھے ۔ انہیں آسان سوالوں سے شروع کرایا گیا آہستہ آہستہ سوالات مشکل ہوتے گئے ۔ پروفیسر دل بڑھانے کے لیے ساتھ تھا وہ حوصلہ افزائی تو کرتا تھا لیکن لڑکوں کو سوال نکال کر نہیں دیتا تھا ۔ سوال تو انہیں خود حل کرنے تھے ۔ اس طرح لڑکوں میں سوالات خود حل کرنے کا جذبہ پیدا ہو گیا ۔

لڑائی کے دنوں میں چند ایک فوجیوں کو چوٹیں آ گئیں ، وہ بازو نہیں ہلا سکتے تھے ۔ علاج معالجے کے باوجود ان کے بازو آہستہ آہستہ ٹھیک ہو رہے تھے ۔ ان کی رفتار تیز کرنے کے لیے ایسا آلہ لیا گیا جو ٹھیک ٹھیک بتاتا تھا کہ بازو کتنا اونچا چلا گیا ۔ اب ہر روز فوجیوں کو علم ہوتا تھا کہ کتنی ترقی ہوئی اس وجہ سے ترقی کی رفتار تیز سے تیز تر ہو گئی ۔

شخصیاتی مشکلات دور کرتے وقت دو امور پیش نظر رکھنے چاہییں:

۱۔ علاج معالجے کے لیے مریض کا پورا تعاون حاصل ہونا چاہیے ۔ بعض مریضوں کا اعتماد کسی شے پر نہیں رہتا ۔ ان حالات میں معالج کو بڑی کوشش کرنی پڑتی ہے - مریض کا اعتماد حاصل کرنا آسان کام نہیں ۔ بعض دفعہ مہینے بعض دفعہ سال لگ جاتے ہیں تاکہ مریض کی مزاحمت (Resistance) دور کرکے اس کا اعتماد حاصل کیا جائے ۔

۲۔ بعض دفعہ مریض کا ماحول بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے
وہ پہلے گھر میں ہی رہے یا پہلے سکول میں ہی تعلیم پاتا رہے تو
وہی مشکلات اور مسائل پیدا ہو جائیں گے ۔ والدین اور بھائی بہنو
رویے سے کئی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں ۔ کنبے کے بعض افراد بچے
پسند ہوتے ہیں اور بعض ناپسند ۔ ان سب افراد کو بچے کی حسب
تبدیل کر دینا بڑا مشکل امر ہے۔ لیکن ایسا گھر یا سکول ضرور ڈھ
چاہیے جو بچے کو زیادہ آرام اور سکون دے سکے جہاں اس کے م
دور ہو جائیں اور جہاں کے لوگ اس سے زیادہ مشفقانہ رویہ رکھ
اس نئے ماحول میں بچہ صحت یاب ہوگا اور شخصیت کو بہتر بنا لے

تیرہواں باب

نظام عصبی (Nervous System)

شخصیت کو بیان کرتے ہوئے اس امر کا ذکر کیا گیا تھا کہ ہر شخص اپنے ماحول سے مہیجات وصول کرتا ہے اور مناسب رد عمل پیش کرتا ہے - عضویہ میں یہ مہیجات درآور اعصاب کی بدولت داخل ہوتے ہیں اور عضویہ کا رد عمل برآور اعصاب کے ذریعہ ہوتا ہے - درآور اور برآور اعصاب ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں- اس لیے جسم کا ایک حصہ دوسرے حصے سے وابستہ ہے - اگر یہ تعلق کہیں ٹوٹ جائے تو اس رقبہ میں مہیجات اور رد عمل کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا - نظام عصبی کا مقابلہ آج کل کے ٹیلیفون ایکسچینج سے کیا جا سکتا ہے - آج کل تجارتی شہروں میں ٹیلیفون کا جال پھیلا ہوا ہے - اسی کی بدولت شہر کا ایک کونہ دوسرے کونے سے وابستہ ہے - اگر ٹیلیفون لائن خراب ہو جائے تو نہ تو پیغام جا سکیں گے اور نہ ہی سنے جائیں گے - جسم میں اعصاب بھی ایک قسم کی برقی لائنیں ہیں جو خارجی دنیا کے پیغامات عضویہ کے مخصوص علاقوں میں لے جاتے ہیں اور عضویہ کا پیغام یعنی رد عمل خارجی دنیا تک لے آتے ہیں -

یہ تعلق جو درآور اعصاب کا برآور اعصاب سے ہے ، اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتا ہے - تعلق خراب ہونے یا ٹوٹ جانے پر کوئی پیغام ایک جانب سے دوسری جانب نہیں جا سکتا - بجلی موجود بھی ہو لیکن اگر جوڑ ٹھیک نہ ہو تو بجلی نہ آ سکے گی - اسی طرح ٹیلیفون کی تاریں لگی ہوئی ہوں ، بجلی کی رو جاری ہو لیکن اگر جوڑ نہیں لگا ہوا تو کوئی آواز نہیں سنائی دے گی - بے وقوف اور احمق آدمی کے پٹھے

اور غدودیں نارمل آدمی کی مانند ہوتے ہیں ۔ اس کی آنکھوں ، کانوں ، جلد اور عضلاتی حواس میں بھی چنداں نقص نہیں ہوتا ۔ اگر اس میں خامی ہے تو اعصاب کے باہمی تعلق میں ۔ اسی وجہ سے اس کی شکل بوزنے جیسی رہ جاتی ہے اور اس کے کردار میں تناقص اور ضد ہوتی ہے ۔ کسی انسان کی انگلیاں بندروں سے زیادہ پھرتیلی نہیں ہوتیں اور نہ ہی کسی انسان کا صوتی آلہ طوطے سے بہتر ہوتا ہے ۔ اسی طرح سے کسی انسان کی بینائی عقاب سے تیز نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کی قوت شامہ کتے سے بڑھ چڑھ کر ہے ۔ لیکن ان تمام خامیوں کے باوجود انسان کی توافق اور فہم کی صلاحیتیں تمام جانوروں سے ارفع و اعلیٰ ہیں ۔ یہ کیوں ؟ اس کا سبب آپ کو اعصاب کے باہمی تعلق میں ملے گا۔ یہ تعلق چرندوں اور پرندوں کی نسبت انسانوں میں نہایت عمدگی سے پایا جاتا ہے ۔ حرکی اور حسی آلات خواہ کتنے ہی عمدہ کیوں نہ ہوں جب تک ایک آلے کا جوڑ دوسرے سے موجود نہ ہو ان سے کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا ۔

جوڑ کی اہمیت سمجھانے کے لیے ڈیشیل (Dashiell) چند ایک مثالیں دیتا ہے[1] ۔ جو حسب ذیل ہیں :

۱۔ الکوحل پینے کے بعد ایک طالب علم کی بینائی جاتی رہی اگرچہ اس کی آنکھیں صحیح سالم تھیں ۔

۲۔ لڑائی میں ایک آدمی کو کہنی سے ذرا اوپر چوٹ آئی تو وہ بے ہوش ہو گیا ۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ بازو نہیں ہلا سکتا تھا اور نہ ہی بازو سے کوئی حس آتی تھی ۔

۳۔ ایک انیس سال کا لڑکا پانی میں تیرتے ہوئے ڈوب گیا ۔ اسے گھسیٹ کر باہر نکالا گیا ، وہ ہوش میں تو تھا لیکن ٹانگیں نہیں ہلا سکتا تھا اور نہ ہی اس جگہ سے کوئی حس آ رہی تھی ۔

۱- Fundamentals of General Psychology ، صفحہ ۳۰۶ ۔

۴- جو شخص تحرکی پرجلہ (Locomotor Ataxia) کا شکار ہو جائے تو وہ چل پھر نہیں سکتا ۔ ٹانگوں کی مسلسل اور مربوط حرکات نہیں کر سکتا البتہ ٹانگوں کو ہلا جلا لیتا ہے ۔

۵- ایک بچہ گرم پتیلی کو ہاتھ لگا لیتا ہے ۔ اس کا ہاتھ جلدی سے پیچھے ہٹ جاتا ہے ۔ بچے کو اس فعل کا علم بھی نہیں ہوتا ۔

۶- بوڑھی عمر میں جس شخص کے دماغ کے نقوش مٹ جاتے ہیں وہ شخص لفظ بول نہیں سکتا، نہ ہی چل پھر سکتا ہے اور نہ ہی اپنا نام لکھ سکتا ہے ۔

۷- ایک عورت کو سر کے بائیں طرف چوٹ آئی اور دائیں ہاتھ اور بازو کی حس جاتی رہی ۔

۸- جنگ کے دوران ایک فوجی کو کان سے ذرا اوپر سر پر گولی لگی ۔ اس سے ہڈی ٹوٹ گئی لیکن گولی دماغ تک نہیں گئی ۔ فوجی کے حواس اور حرکات بدستور رہے ۔ لیکن الفاظ بولنے میں غلطیاں کرنے لگا اور الفاظ سننے پر کوئی رد عمل پیش نہیں کر سکتا تھا ۔

۹- ایک ذہین آدمی کو پیشانی پر چوٹ آئی ۔ صحت یاب ہونے کے بعد اس نے بچوں والی حرکات شروع کر دیں ۔

۱۰- ایک بیاہی ہوئی عورت ہمیشہ مغموم رہتی تھی ۔ اس کی کھوپری کا بائیں طرف کا آپریشن ہوا تو وہ ہنس مکھ اور خوش باش ہو گئی ۔

اس قسم کی بے شمار مثالیں فراہم کی جا سکتی ہیں ۔ یہ مثالیں کردار ، افکار اور حسیات کی بدنظمی ظاہر کرتی ہیں ۔ ان کی تہہ میں کوئی نہ کوئی اعصابی خرابی ہوتی ہے۔ لہٰذا نفسیات کا مطالعہ اس امر کا مقتضی ہے کہ نظام عصبی کو سمجھا جائے اور اس کے اہم اجزا کے وظائف کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔

اعصابی (Transmission) گزر کی حقیقت:

اعصاب کی دو قسموں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اعصاب یا تو باہر سے پیغامات لاتے ہیں یا باہر لے جاتے ہیں۔ باہر سے پیغامات لانے والے اعصاب درآور یا حسی کہلاتے ہیں اور اندر سے باہر پیغامات لے جانے والے اعصاب برآور یا حرکی اعصاب کا نام پاتے ہیں۔ پیغامات وصول کرنے کے لیے کئی درآور اعصاب مصروف کار ہوتے ہیں۔ اسی طرح مناسب رد عمل پیش کرنے کے لیے بھی کئی برآور اعصاب سرگرم کار ہوتے ہیں۔ درآور اور برآور کے درمیان رشتہ قائم کرنے کے لیے اعصابی مراکز ہیں۔ پیغامات مراکز تک پہنچتے ہیں اور ان مراکز سے برآور اعصاب نکلتے ہیں جو پیغامات کا جوابی عمل دیتے ہیں۔ یہ مراکز انسان کے دماغ اور نخاع (Spinal Cord) میں موجود ہیں۔ درآور اور برآور اعصاب کے درمیان سلسلہ اور نظام قائم کرتے ہیں۔ مراکز کی عدم موجودگی میں حسی اور حرکی اعصاب میں کوئی رابطہ نہ ہوگا اور کوئی باضابطہ، معقول اور موزوں حرکت نہ ہو سکے گی۔

انسان کی نسوں میں بے رنگ پانی (Lymph) اور خون بہتا ہے یہ نسیں نالیوں کی مانند ہیں۔ اس لیے خون ایک جگہ سے چل کر دوسری جگہ پہنچ جاتا ہے۔ اعصاب کے ذریعے پیغامات ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتے ہیں۔ لیکن اعصاب کو نالیاں نہیں سمجھنا چاہیے۔ بلکہ یہ مخزمایہ (Protoplasm) کے ریشے ہیں جو پیغامات ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں۔ جیسے بجلی کی تاریں نہیں ہوتیں، ویسے ہی مخزمایہ کے ریشے نالیاں نہیں۔ ہر عصب تھوڑی سی آکسیجن خرچ کرتا ہے۔ کاربن ڈائی آکسائڈ چھوڑتا ہے، گرمی پیدا کرتا ہے اور بجلی بناتا ہے۔ جب اسے کوئی پیغام وصول کرکے آگے پہنچانا ہوتا ہے تو یہ کیمیاوی عمل تیز ہو جاتا ہے۔

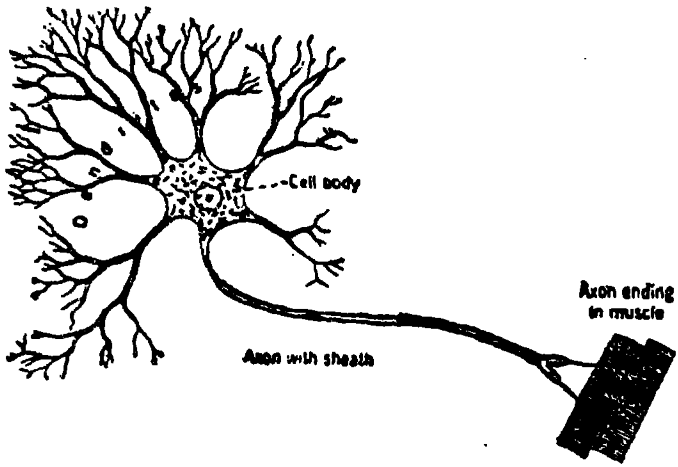
جب ایک تارگھر سے تار دیا جاتا ہے تو تار بابو اپنی انگلیوں سے

خاص مشین کی کلیدیں دباتا ہے جس سے تاثر پیدا ہوتا ہے۔ یہ تاثر دوسرے تار گھر پہنچتا ہے جہاں اسے سمجھا جاتا ہے۔ یہی حالت اعصاب کی ہے۔ مہیجات ایک قسم کا تاثر پیدا کرتے ہیں جو اعصاب کے ذریعے مراکز تک پہنچتا ہے وہاں اسے سمجھ کر (شعوری یا لاشعوری طور پر) مناسب ردعمل کے لیے مناسب برآور اعصاب کو بیدار کیا جاتا ہے۔ یہاں پر ایک فرق نوٹ کر لینا چاہیے۔ جب تاروں میں بجلی چلتی ہے تو اس کا سلسلہ لگاتار ہوتا ہے۔ جو درمیان میں کہیں نہیں ٹوٹتا۔ لیکن جب اعصاب میں سے پیغامات کا گزر ہوتا ہے تو اس کی مثال مشین گن سے گولیوں کی بوچھاڑ سے دی جا سکتی ہے۔ یہ گولیاں بہت جلدی جلدی یکے بعد دیگرے نکلتی ہیں۔ ان کا سلسلہ لگاتار نہیں ہوتا۔ گو ایک گولی اور دوسری گولی کے درمیان وقفہ بہت ہی کم ہوتا ہے۔

ٹیلیفون یا بجلی کی حقیقت تاروں سے سمجھ نہیں آ سکتی۔ تاروں کا جال تو ضرور بچھا ہوا ہوتا ہے لیکن محض اس جال کو دیکھنے یا باہر سے بجلی یا ٹیلیفون گھر کا ملاحظہ کرنے سے یہ سمجھ میں نہیں آ سکتا کہ بجلی کیا ہے اور اس کا عمل کیسے ہوتا ہے۔ اس کے لیے آپ کو مشین دیکھنی ہوگی اور مختلف پرزوں کی کارکردگی ملاحظہ کرنی ہوگی۔

اعصابی نظام میں پہلی چیز اعصابی خلیے (Nerve Cells) ہیں جو جسامت میں اس قدر چھوٹے ہیں کہ انہیں خوردبین کے بغیر نہیں دیکھا جا سکتا ہے۔

عصبانیہ (Neuron) : اس میں عصبی خلیے بمعہ اپنی شاخوں کے ہوتے ہیں۔ یہ شاخیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ محوریہ (Axon) اور شجریہ (Dendrite)۔ شجریے چھوٹی شاخیں ہیں اور ان کی شکل درخت سے ملتی جلتی ہے۔ محوریے لمبی شاخیں ہیں ان کی لمبائی کئی فٹ ہوسکتی ہے۔ محوریے کے گرد حجز (Insulation) لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ بجلی کی تاریں



شجرے ، محورے اور خلیے

بھی حجز سے ملفوف ہوتی ہیں تاکہ بجلی ٹھیک راہ پر چلے اور راستے میں ضائع نہ ہو۔

شاخوں کی وجہ سے ایک عصبانیہ کا دوسرے عصبانیے سے تعلق پیدا ہوتا ہے۔ یہ شاخیں ایک دوسرے کے بہت قریب آ جاتی ہیں۔ ایک عصبانیے کے محوریہ کی شاخیں دوسرے عصبانیے کے شجریہ کی شاخوں سے لپٹ جاتی ہیں۔ اور ایک عصبانیے سے برق رو دوسرے میں پہنچ جاتی ہے۔ اس تعلق کو قران عصبی (Synapse) کہا جاتا ہے۔ یہ مت خیال کیجیے کہ ایک عصبانیے کا تعلق صرف ایک ہی عصبانیے سے ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک عصبانیے کا تعلق کئی عصبانیوں سے ہو سکتا ہے۔ لیکن مخصوص پیغامات پہنچانے یا لے جانے کے لیے مخصوص تعلقات کو بیدار کیا جاتا ہے۔ عصبانیہ میں ہمیشہ یک طرفہ گزر ہوتا ہے۔ یعنی ایک عصبانیے کے محوریہ سے دوسرے عصبانیے کے شجریہ تک۔ محورے موصل (Conductor) ہوتے ہیں اور شجرے قبول

کرنے والے۔

عصبی رو کے متعلق چند ایک ضروری امور یہ ہیں:

۱۔ جب کوئی عصب متاثر ہوگا، تو اپنی پوری طاقت سے متاثر ہوگا۔ اس اصول کو all or none یعنی کل یا صفر کا اصول کہتے ہیں۔ فرض کیا بندوق میں گولی بھری ہوئی ہے۔ جب یہ گولی چلے گی تو پوری طاقت سے چلے گی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ گولی چلے بھی لیکن پوری طاقت سے نہ چلے۔ اسی طرح اگر بارود پڑا ہو خواہ اسے چھوٹی سی تیلی سے آگ لگائیں یا بڑی آگ سے جلائیں بارود اپنی پوری طاقت سے پھٹے گا۔ لہٰذا جب کوئی عصب بیدار ہوتا ہے تو پوری طاقت سے بیدار ہوتا ہے۔ عضویاتی ماہروں کا کہنا ہے کہ ہر عصب میں توانائی ہے اور جتنی توانائی کسی عصب میں ہوتی ہے وہ فعال ہونے پر سب خرچ ہو جاتی ہے۔ خرچ کرنے کے بعد اس عصب کو فوراً ہی اور توانائی مل جاتی ہے۔ پس اگر کوئی عصب بیدار ہوتا ہے تو اپنی ساری توانائی خرچ کر دے گا۔ وگرنہ متاثر نہیں ہوگا۔ ہر عصب کے لیے تہییج کی دہلیز (Threshold of excitation) ہے۔ جب تک کوئی مہیج اتنا طاقتور نہ ہو کہ دہلیز سے گزر جائے تب تک عصب فعال نہیں ہوگا۔ دہلیز سے مراد ہے مہیج کی کم سے کم مقدار جو عصب کو بیدار کر سکے۔ لہٰذا اگر مہیج بہت کمزور ہوگا تو دہلیز سے گزر نہیں سکے گا۔ لیکن اگر وہ دہلیز سے گزر جائے تو عصب اپنی تمام توانائی خرچ کر ڈالے گا اور پوری قوت سے فعال ہوگا۔

۲۔ ہر ریشہ کا متمرد پہلو (Refractory phase) ہے۔ جب ریشہ سے پیغام گزر جاتا ہے تو کچھ عرصہ کے لیے اس ریشہ کی برانگیختگی رک جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغام کا گزر لگاتار مسلسل طریقے پر نہیں ہوتا اور عصبی مہیج کا تعدد گنا جا سکتا ہے۔ مختلف

اعصاب میں تعدد بھی مختلف ہے۔ مثلاً اگر کمر کے اعصاب کو متأثر کیا جائے تو کمر کے مختلف اعصاب میں مہیج کا تعدد مختلف ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ اعصاب کل یا صفر کے اصول پر عمل کرتے ہیں، لیکن ایصال (Conduction) کی شدت میں کمی بیشی ضروری ہے۔ مثلاً سوئی چبھنے پر درد اتنا شدید نہیں ہوتا جتنا بھڑ کے کاٹنے پر۔ اس سلسلے میں دو حقائق مد نظر رکھنے چاہییں :

(ا) عصبانی فعلیت کی شدت کا دار و مدار ان خود مختار ریشوں پر ہے جو فعلیت میں حصہ لے رہے ہیں۔ جتنا زوردار مہیج ہوگا، اتنے ہی زیادہ ریشے متأثر ہوں گے۔

(ب) مہیج کی شدت کا دار و مدار مہیج کے تعدد پر ہے۔ جتنا زوردار مہیج ہوگا، اتنی ہی زیادہ مہیج کی تعداد ہوگی۔ بعض صورتوں میں مہیج کی تعداد فی سیکنڈ پانچ تک ہوتی ہے۔ اور بعض دفعہ فی سیکنڈ دو سو تک پہنچ جاتی ہے۔

دونوں حقائق کو ملا کر کہا جاتا ہے کہ رد عمل کی طاقت کا انحصار اس امر پر ہے کہ ایک سیکنڈ میں کل کس قدر مہیجات ہیں۔ شمار لیتے وقت دو امور کو دیکھنا ہوگا ایک تو ریشوں کی تعداد کو اور دوسرے ہر فعال ریشہ میں تہییج کے تعدد کو۔

مہیج، رد عمل کا فعل (Stimulus-Response Mechanism) :

جس وقت ایک عصبانیہ کا محوریہ دوسرے عصبانیے کو متأثر کرتا ہے یا حرکی محوریہ عضلات کو برسر کار لاتا ہے تو اس میں مہیج اور رد عمل کے فعل کی سادہ سی ساخت کا پتہ چلتا ہے - ایک خلیہ دوسرے خلیے کو فعال کر دیتا ہے۔ درآور اعصاب سے عضویہ میں پیغامات داخل ہوتے ہیں اور حرکی اعصاب کو بیدار کر دیتے ہیں۔ سب سے سادہ فعل اضطراری فعل ہوتا ہے۔

ایک سادہ رد عمل (Simple Reaction) میں (جیسے ہم اضطراری

فعل نہیں کہہ سکتے) زیر تجربہ فرد کو تیار رہنے کا سگنل دے کر اس کے کان کو متأثر کیا جاتا ہے۔ یہ تأثر دماغ کے نیچے سے چل کر نخاع اور پٹھوں تک پہنچ کر ہاتھوں کو حرکت میں لے آتا ہے۔ رد عمل کا وقت ۱۵ء سیکنڈ ہے۔ یہ ردعمل خاصہ جلد واقع ہوتا ہے۔ لیکن آنکھوں کے جھپکنے کا اضطراری فعل اس سے بھی جلد ہوتا ہے۔ اس کا وقت ۰۵ء سیکنڈ ہے۔ گھٹنے کے جھٹکے کا اضطراری فعل تو اس سے بھی کم وقت لیتا ہے اس کا وقت ۰۳ء سیکنڈ ہے۔ روشنی کی مقدار کے مطابق آنکھ کی پتلیوں کے بڑھنے یا گھٹنے کا اضطراری فعل ایک یا دو سیکنڈ لے لیتا ہے۔

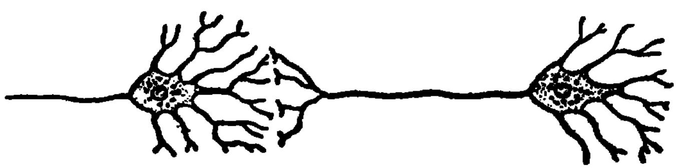
اضطراری افعال کئی اور بھی ہیں۔ مثلاً جلنے سے ہاتھ کھینچ لینا، کھانسنا، چھینکنا، معدے اور انتڑیوں کی حرکات، خون کی نالیوں کا سکڑنا یا پھیل جانا جس سے جلد زرد یا سرخ ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ کسی مزے دار شے کو کھا کر منہ میں پانی آ جانا یا آنکھ میں کوئلہ پڑ جانے سے آنسو نکل آنا۔ سادہ ردعمل اور اضطراری فعل میں فرق اس وجہ سے ہے کہ ردعمل میں فرد کو تیار ہونے کا اشارہ دیا جاتا ہے لیکن اضطراری فعل میں تیار ہونے کے اشارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اضطراری افعال غیرارادی اور فطری ہوتے ہیں۔

اضطراری قوس (Reflex arc) کا دار و مدار عصبانیوں کے جوڑ پر ہے۔ سادہ سے سادہ اضطراری قوس میں دو عصبانیے ہوں گے۔ ایک درآور اور دوسرا برآور۔ حقیقت میں کوئی اضطراری قوس ایسی نہیں جس میں کم از کم تین عصبانیے نہ ہوں۔

ہر عصب میں کئی ریشے ہوتے ہیں۔ جب عصب متأثر ہوتا ہے، تو اس کے تمام ریشے فعال ہو جاتے ہیں۔ چونکہ ہر عصب نظام عصبی کا جزو ہے اس لیے ہر اعصابی مرکز پر مختلف سمت سے اثرات آتے ہیں۔ مثلاً سانس کے مرکز صرف پھیپھڑوں سے اثرات نہیں لیتے بلکہ اور کئی

حسی اعصاب سے بھی اثر پذیر ہوتے ہیں ۔ یہ تمام اثرات ایک مرکز پر جمع ہو جاتے ہیں اور مناسب ردعمل پیدا کرتے ہیں ۔ لیکن یاد رہے کہ ایک طرف تو محورے ایک ہی نقطہ پر مجتمع ہو جاتے ہیں ، دوسرے ہ اسی نقطے سے پھیلتے بھی ہیں اور مختلف عصبانیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ردعمل میں کئی پٹھے ایک ہی وقت میں مل جل کر کام کرتے ہیں ۔ کوئی چیز اٹھانی ہو تو ہاتھ پیر اور کمر مل کر زمین کی طرف جھکتے ہیں اور چیز اٹھا لیتے ہیں ۔ باقی اعضا بھی تعاون کرتے ہیں ۔

اضطراری قوس سے یہ نہیں خیال کرنا چاہیے کہ جب تک مہیج نہیں آتا عضویہ آرام کر رہا ہوتا ہے ۔ عضویہ تو ہر وقت فعال ہے ۔ زندگی کا مطلب ہی یہی ہے کہ جسم کا ہر حصہ کسی نہ کسی فعلیت میں مصروف ہو ۔ دل ، پھیپھڑے ، معدہ ، آنکھیں ، کان ، ناک وغیرہ سبھی اپنا اپنا کام کرتے ہیں ۔ لیکن جب کوئی مہیج آتا ہے تو جسم کی حالت میں ایک گونہ تبدیلی آ جاتی ہے ۔ کیونکہ اگر تبدیلی نہ آئے تو مناسب ردعمل ظاہر نہ ہوگا ۔



عصبانیوں میں جوڑ

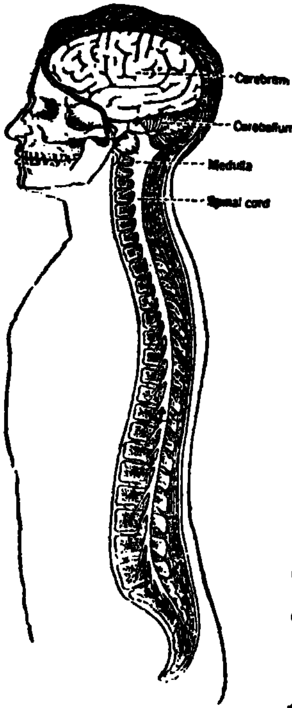
دو عصبانیوں کے درمیان جوڑ پر مزاحمت (Resistance) ہوتی ہے جسے دور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ جب تک افعال عادتوں کی شکل اختیار نہیں کر لیتے مزاحمت موجود رہتی ہے ۔ عادت بن جانے پر افعال

آسان اور تیز ہو جاتے ہیں ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مدافعت دور ہو کر راستے ہموار بن گئے ہیں ۔ جوں جوں عمر بڑھتی ہے راستے ہموار ہوتے جاتے ہیں اور عادتیں پختہ سے پختہ تر ہو جاتی ہیں ۔ اضطراری فعل میں راستے قدرت نے ہموار کیے ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ ردعمل کا وقفہ بہت ہی کم ہوتا ہے ۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگرچہ مہیج آنے پر کئی ردعمل اختیار کیے جا سکتے ہیں لیکن ہر فرد وہی ردعمل پیش کرتا ہے جو مزاحمت سے خالی ہو یا جس میں مزاحمت کم سے کم موجود ہو ۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اس کے ردعمل بدلتے رہتے ہیں ۔ بچپن اور شباب کے ردعمل کا مقابلہ کریں تو معلوم ہوگا کہ گو اشیا یا مواقع وہی ہیں لیکن ردعمل وہی نہیں رہا ۔ اس کی تشریح بھی مزاحمت کے اصول سے کی جاتی ہے ۔ شے یا موقعہ سے جو مہیج اٹھتا ہے وہ مختلف وقتوں میں مختلف ردعمل پیدا کرتا ہے ۔ کیونکہ جو راستے اب ہموار ہو چکے ہیں وہ پہلے ہموار نہ تھے ۔ اس لیے موجود ردعمل ماضی کے ردعمل سے مختلف ہوگا اور مستقبل کا ردعمل حال کے ردعمل سے مختلف ہوگا ۔

نخاع (Spinal Cord):

عام طور پر نخاع کو اضطراری افعال کا مرکز قرار دیا جاتا ہے ۔ درآور اعصاب پیغامات کو نخاع کے مراکز میں لاتے ہیں اور دماغ کو اطلاع دیے بغیر یہیں سے احکام جاری ہو جاتے ہیں کہ ان پیغامات کا جوابی عمل کیا ہونا چاہیے ۔ کیونکہ اگر دماغ کو اطلاع دی جائے تو وقت لگے گا اور اضطراری افعال میں وقت کی گنجائش نہیں ہوتی ۔ ان افعال کا مقصد عضویہ کی صحت اور بقا کو قائم رکھنا ہے لہٰذا جو مہیج عضویہ کو نقصان پہنچانے کا اس کے خلاف جوابی عمل چاہیے ۔ اس عمل کو فی الفور ہونا چاہیے تاکہ عضویہ کو مہیج سے نقصان نہ

پہنچ سکے اگر دیر لگ جائے تو جوابی عمل کے معرض ظہور میں آنے سے پیشتر عضویہ کو نقصان پہنچ چکا ہوگا۔ لہذا اضطراری افعال کے لیے اعصابی راستے شروع سے تیار ہو چکتے ہیں۔ یہ راستے نخاع میں ملتے ہیں اور فی الفور ردعمل کا موجب بنتے ہیں۔



۹۔ مخ اکبر، مخیخ، سر حرام مغز اور نخاع

پس سادہ ترین فعل جسے اضطراری کہا جاتا ہے اس کے مراکز عام طور پر نخاع میں پائے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے نخاع کا فریضہ اضطراری افعال کی بجا آوری ہے۔ اس فریضہ کے علاوہ نخاع کا ایک اور فریضہ بھی ہے۔ وہ ہے دماغ کا پٹھوں اور حواس کے ساتھ رشتہ قائم کرنا۔ اس طرح اعلیٰ (Higher) اور ادنیٰ (Lower) درآور اور برآور اعصاب کا باہمی تعلق بھی ان ریشوں سے ہوتا ہے جن کا مقام نخاع میں ہے۔ پس نخاع کا کام:

(۱) اضطراری افعال کی حالت میں درآور اور برآور اعصاب میں جوڑ قائم کرنا ہے اور

(۲) دماغ کا رشتہ پٹھوں وغیرہ سے قائم کرنا ہے۔

اس امر کے ثبوت کے لیے ہمیں بعض بیماریوں کی طرف رجوع کرنا ہوگا، مثلاً پولیو (Poliomyeletis) مریض اپنی ٹانگیں نہیں ہلا سکتا۔ اس کی ٹانگوں کے پٹھے مر جاتے ہیں۔ جب اس مریض کے نخاع کا پوسٹ مارٹم کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اکثر برآور اعصاب کے

خلیے تباہ ہو چکے ہیں، اسی لیے اس کی ٹانگیں کام نہیں کرتیں ۔ ایک اور بیماری لیجیے جسے تحرکی ہرجلہ (Locomotor ataxia) کہا جاتا ہے ۔ اس مرض میں مریض مشکل سے کھڑا ہو سکتا یا چل پھر سکتا ہے ۔ اور بعض دفعہ سیڑھیاں بھی تب ہی چڑھ سکتا ہے جب پاؤں کو دیکھتا رہتا ہے اگر آنکھیں بند کرکے ہاتھ سے ناک کو چھونا چاہے تو نہیں چھو سکے گا ۔ اور اگر آنکھیں بند کرکے منہ میں کچھ ڈالنا چاہے تو نہیں ڈال سکے گا۔ ویسے مریض اپنے ہاتھ اور ٹانگیں خوب ہلا جھلا سکتا ہے۔ لہٰذا حرکی یا برآور اعصاب میں نقص نہیں ہوتا ۔ اس مریض کے حسی اور عضلی حواس خراب ہو جاتے ہیں ۔ خوردبین سے پتہ چلتا ہے کہ درآور اعصاب کام نہیں کرتے اس لیے مریض کو پٹھوں کی حرکات پر قابو نہیں رہتا ۔

نخاع یا حرام مغز کا مقام ریڑھ کے ستون کی نالی میں ہے ۔ اس نالی کے دو تہائی حصہ میں حرام مغز بھرا ہوا ہے ۔ یہاں سے برآور اور درآور اعصاب پھوٹتے ہیں ان کی تعداد کم و بیش ۲۰ لاکھ ہے ۔ اگر نخاع کا حصہ کاٹ کر خوردبین سے ملاحظہ کیا جائے تو تیتری کی شکل کا بھورا مادہ ملے گا جو سفید مادے سے گھرا ہوا ہوگا ۔ بھورا مادہ تقریباً خلیوں سے بھرپور ہوتا ہے اور سفید مادہ ریشوں خصوصاً محوریوں سے ۔ یہ محوریے سفید غلاف میں لپٹے ہوئے ہوتے ہیں ۔ نخاع تقریباً ۱۸ انچ لمبا ۱/۲ انچ چوڑا اور وزن میں ڈیڑھ اونس ہوتا ہے ۔

دماغ

اعصاب کو محیطی نظام عصبی (Peripherel Nervous System) یا ادنیٰ نظام عصبی (Lower Nervous System) کہا جاتا ہے ۔ اور دماغ اور نخاع کو مرکزی نظام عصبی (Central Nervous System) کہا جاتا ہے ۔ دماغ کے دو حصے ہیں ایک بڑا جسے مخ اکبر

(Cerebrum) کہتے ہیں اور ایک چھوٹا جسے دمیغ (Cerebellum) کہا جاتا ہے ۔ ان کے علاوہ نخاع کے خاتمہ پر اور دمیغ کے نیچے ابھرا ہوا مادہ ہے جسے سر حرام مغز (Medulla Oblongata) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ چھوٹے دماغ کے ساتھ مخ اکبر کے نیچے چھوٹے چھوٹے کئی اجسام ہیں ان سب کے لیے ایک ہی نام زیر عرشہ (Hypothalamus) ہے ۔

زیر عرشہ کے وظائف:

سادہ افعال کے لیے نخاع میں مراکز موجود ہیں لیکن دقیق افعال کے لیے دماغ کی ضرورت پڑتی ہے ۔ اضطراری فعل میں جونہی مہیج آتا ہے جوابی عمل معرض ظہور میں آ جاتا ہے ، دماغ کو خبر بھی نہیں ہوتی ۔ لیکن انسانی زندگی میں اضطراری افعال کا بہت تھوڑا حصہ ہے ۔ ہمارے اکثر افعال غیر اضطراری ہوتے ہیں ۔ جانوروں میں اضطراری افعال کی کثرت ہے لہٰذا دماغ کے مقابلے میں ان کی نخاع خاصی بڑی ہوتی ہے ۔ لیکن جوں جوں ارتقائی منازل طے ہوتے جاتے ہیں دماغ کا حجم بڑھتا جاتا ہے ۔ اور نخاع اس کے مقابلے میں چھوٹی رہ جاتی ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس قدر کوئی جانور ارتقائی منازل میں اونچا ہوگا اتنا ہی اسے فطری افعال پر کم بھروسہ کرنا ہوگا اور اکتسابی افعال زیادہ کرنے ہوں گے ۔

اضطراری افعال سے اب ذرا اونچے آئیے ، فرض کیا کہ آپ اپنے دوست سے شکوہ شکایت کر رہے ہیں ۔ معاملہ طول پکڑ جاتا ہے باتیں تیز تلخ ہونے لگتی ہیں ۔ اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے آپ کا چہرہ بھی سرخ ہو جاتا ہے ۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ ہیجانات کے ساتھ عضویہ بھی کام کر رہا ہے ۔ گفتگو کے دوران آپ کا سانس چلتا رہتا ہے ۔ دل دھڑکتا رہتا ہے ، کھانا ہضم ہو رہا ہے اور شاید تھوڑا سا پسینہ بھی آ رہا ہو ۔ سانس لینا ، دل دھڑکنا ، کھانا ہضم ہونا ، چہرے کا رنگ بدلنا اور پسینہ آنا فعلیاتی عمل ہیں اور زندگی کے لیے نہایت

ضروری ہیں ۔

جن اعصاب پر زندگی کی بقا منحصر ہے ۔ ان کے مراکز نخاع کے علاوہ دیگر مقامات پر بھی پائے جاتے ہیں ، مثلاً پھیپھڑوں ، دل ، گلے ، معدے، غدودوں اور پٹھوں کے برآور اور درآور ریشے، سرحرام مغز اور زیر عرشہ میں یہ دونوں ہی نخاع سے زیادہ ترقی یافتہ اور دقیق ہیں ۔ اس لیے غیراضطراری افعال کے لیے زیادہ موزوں ہیں ۔

اوپر والی مثال میں اس امر کا ذکر کیا گیا ہے کہ باتیں کرتے ہوئے آپ کے دوست کا چہرہ سرخ ہو گیا جس سے مراد ہے کہ اسے غصہ آ گیا ۔ آپ دیکھیں گے کہ غصے سے چال میں فرق آ جائے گا ، سانس کی رفتار بدل جائے گی اور چہرے کی طرف خون دوڑے گا ۔ عمل انہضام میں بھی تبدیلیاں آ جائیں گی ۔ اگر ان تمام تبدیلیوں کو سائنسی طریقے سے ملاحظہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ غصے کی حالت میں ہمارا عضویہ نارمل طریقے پر کام نہیں کرتا ۔ اس بیان کی تصدیق میں دو شہادتیں پیش کی جا سکتی ہیں :

جن لوگوں کے ہیجانات غیر معمولی طور پر بدل جاتے ہیں ان کے زیر عرشہ سالم نہیں ہوتے ۔ بعض مریض اس قابل نہیں رہتے کہ چہرے کے ایک رخ سے ہیجانات کا اظہار کر سکیں ۔ اگرچہ یہ مریض چہرے کے پٹھوں کو ہلا جھلا سکتے ہیں۔ بعض مریض بالکل بے حس ہو جاتے ہیں ۔ لوگ انھیں برا بھلا کہتے ہیں، گالیاں دیتے ہیں لیکن انھیں پرواہ نہیں ہوتی ۔ برخلاف اس کے بعض مریض ایسے بھی ہیں جو حد سے زیادہ جذباتی ہو جاتے ہیں ۔ کسی نے سوئی چبھو دی انھوں نے رونا شروع کر دیا یا کسی نے ذرا سی گدگدی کی وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے ۔ ایسے مریضوں کے زیر عرشہ کا پوسٹ مارٹم کیا گیا تو اس میں جگہ جگہ خرابیاں نظر آئیں ۔ اگر بلی کے زیر عرشہ کو بجلی کی سوئی سے متأثر کیا جائے تو کمر اٹھا لیتی ہے ، دم مارتی ہے اور غراتی ہے اور ساتھ ہی

کان پیچھے کو کھینچ لیتی ہے۔

۲۔ جب سریر (Thalamus) اور مخ کبیر کے سامنے والے حصے پر آپریشن کرکے ان دونوں کا رابطہ ختم کر دیا جائے تو ذہنی مریض کی تشویش (Anxiety) دور ہو جاتی ہے اس کی افسردگی چلی جاتی ہے لیکن عقل پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ طریقہ بعض ذہنی امراض میں فائدہ مند رہتا ہے۔

فعلیاتی تجربوں نے ثابت کر دیا ہے کہ:

(ا) اگر زیر عرشہ میں کوئی نقص آ جائے تو ہیجانات کا خاتمہ ہو جاتا ہے لیکن

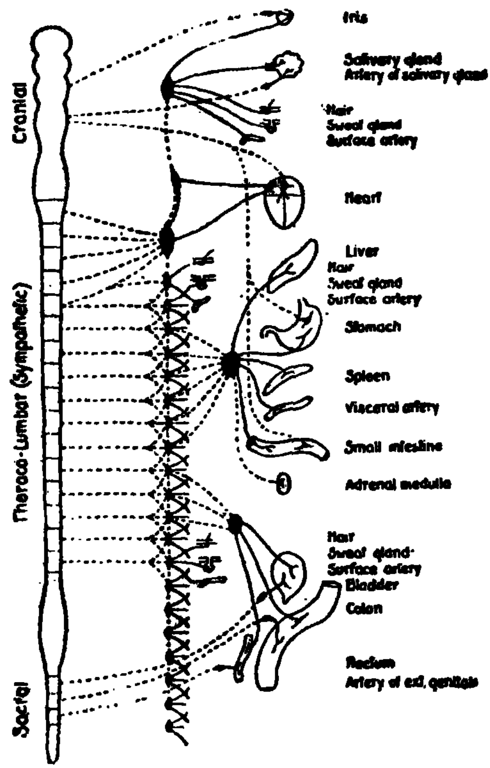
(ب) اگر مخ کبیر سے زیر عرشہ تک آنے والے اعصاب میں فتور آ جائے تو ہیجانات قوی تر ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا زیر عرشہ میں ایسی شاہراہیں اور جوڑ موجود ہیں جو غصہ یا خوف لانے والے احشا کو بیدار کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ عمل ان تأثرات سے رک سکتا ہے جو مخ کبیر سے زیر عرشہ کی طرف آتے ہیں۔ پس زیر عرشہ کو نقصان پہنچائیں تو ہیجانات کم ہو جائیں گے لیکن مخ کبیر سے زیر عرشہ کی طرف آنے والے راستے بند کیجیے یا مخ کبیر کو نقصان پہنچائیے تو ہیجانات بڑھ جائیں گے۔ یہ تجربات ثابت کرتے ہیں کہ تہذیب و تمدن کے تقاضے ہیجانات اور جذبات کو مناسب کنٹرول میں رکھتے ہیں کیونکہ زیر عرشہ سے اٹھنے والے ہیجانات مخ کبیر سے رک سکتے ہیں۔

خود اختیاری عصبی نظام

(The Autonomic Nervous System)

نخاع کے دونوں طرف لٹکتی ہوئی چند چھوٹی چھوٹی اعصاب کی لڑیاں ہیں جنھیں شرکی عقد (Ganglia) کہا جاتا ہے۔ ان کے ریشے لڑیوں کے

اوپر نیچے جا کر ان ریشوں سے مل جاتے ہیں جو نخاع کے اعصاب میں سے گزر کر پٹھوں اور جلد کی غدودوں تک پہنچ جاتے ہیں - بعض



شرکی نظام عصبی

ریشے لڑیوں کو چھوڑ کر دور عقد تک چلے جاتے ہیں اور اپنا رابطہ احشا کے ساتھ قائم کر لیتے ہیں - اگرچہ یہ ریشے نخاع کے درمیانی دس بارہ حصوں سے پھوٹتے ہیں لیکن ان کا رشتہ جسم کے تمام اعضا سے ہے-

یہی وجہ ہے کہ خود اختیاری نظام کی بہت زیادہ اہمیت ہے ۔

شرکی نظام عصبی کے ساتھ ایک چھوٹا شرکی نظام (Parasympa-thetic) بھی ہے ۔ یہ نخاع کے نچلے حصوں اور دماغ کی ڈانڈی (Brain-stem) سے نکلتا ہے۔ اس کے ریشے بھی احشا سے مل جاتے ہیں ۔ اس نظام کا مقام مرکزی نظام عصبی کے اوپر اور شرکی نظام عصبی کے نیچے ہے اسی لیے اس کو چھوٹا شرکی نظام کہتے ہیں ۔ دونوں نظام کے ریشے چھاتی اور معدے میں پہنچ جاتے ہیں لیکن ایک نظام کا عمل دوسرے نظام کے الٹ ہے ۔ ایک سے عضو کی فعلیت بہتر ہو جاتی ہے دوسرے سے کمزور پڑ جاتی ہے ۔ اس لحاظ سے خود اختیاری نظام میں ایک تو ایکسلریٹر (Accelerator) یعنی تیز کرنے والا آلہ ہے اور دوسرا بریک (Brake) یعنی روکنے والا آلہ ۔ دونوں کی مدد سے احشا پر مکمل کنٹرول حاصل ہو سکتا ہے ۔ یہاں یہ نہ سمجھ لیں کہ ایک نظام کا کام محض تیز کرنا ہے اور دوسرے کا کام محض روکنا ہے۔ کیونکہ اس امر کا فیصلہ کہ آیا کسی فعل کو چھوٹا شرکی نظام روکے گا یا نہیں اس بات پر منحصر ہے کہ عضو کس فعل میں مصروف ہے ۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کب شرکی نظام اور کب چھوٹا شرکی نظام غالب ہوتا ہے ؟ چھوٹا نظام معمولی حیاتیاتی وطائف ادا کرتا ہے ۔ شرکی نظام کی یہاں ضرورت نہیں ۔ کئی جانوروں کا شرکی نظام نکال دیا جاتا ہے لیکن ان کے معمولی وظائف قائم رہتے ہیں ۔ مثلاً آنکھ کی پتلی کو سکیڑ کر تیز روشنی سے آنکھ کی حفاظت کرنا یا آنکھ کے شیشے کو حالات کے موافق بنانا یا خوراک کو ہاضمہ کی نالیوں سے گزارنا اور ہضم کرنا یا فضلہ کو باہر نکالنا یہ سب کے سب چھوٹے نظام کے وظائف ہیں ۔ جنسی خواہش میں آلات کو متحد کرنا اسی نظام کا وظیفہ ہے ۔ بس زندگی کے چھوٹے چھوٹے کام تو چھوٹا نظام سرانجام دیتا ہے ، لیکن جب ہنگامی حالات پیدا ہوں یعنی زندگی خطرے میں پڑ جائے تو شرکی

نظام تمام قوتوں کو مجتمع کر کے خطرے کا مقابلہ کرتا ہے ۔ شرکی نظام تین مواقع پر فعال نظر آتا ہے ۔

(۱) جب انتہائی سردی سے جان خطرے میں پڑ جائے۔

(۲) تند و تیز جوش میں یا غیرمعمولی کسرت میں ۔

(۳) خوف اور غیض و غضب کی حالت میں ۔

ہیجانات میں شرکی نظام کا فعل قابل غور ہے ۔ اس سے آنکھ کی پتلی پھیل جاتی ہے، بھویں چڑھ جاتی ہیں، آنکھیں باہر نکل آتی ہیں، دل کی رفتار تیز ہو جاتی ہے، خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے اور جنسی آلات سست پڑ جاتے ہیں ۔ شدید ہیجانات میں جگر اس قابل بن جاتا ہے کہ پٹھوں میں جلنے کے لیے شکر کی مقدار زیادہ کر دے اور تلی سے خون کے خلیے آکسیجن لے جانے کے لیے بڑھا دے اور اسی طرح پھیپھڑوں کو زیادہ ہوا سے بھر دے ۔ بعض اوقات معدہ کا فعل ختم ہو جاتا ہے اور ہاضمہ کے لیے جو رطوبتیں درکار ہیں ان کا اخراج بند ہو جاتا ہے ۔ اسی لیے خون پٹھوں کی طرف عود کر آتا ہے کیونکہ ہنگامی حالات میں کھانا ہضم کرنے کی بجائے خطرے سے بھاگ نکلنا زیادہ ضروری ہے ۔

یہاں پر دو غلط فہمیاں پیدا ہونے کا امکان ہے ۔ ان سے بچنا ضروری ہے :

(۱) گو دونوں نظاموں میں تضاد ہے لیکن یہ تضاد اصول اور ضابطہ کے خلاف نہیں کیونکہ یہ نظام خودمختار نہیں بلکہ زیر عرشہ کے ماتحت ہیں ۔

(۲) ان نظاموں پر مخ اکبر کا بھی کنٹرول ہے ۔ لہٰذا بیرونی تقاضے اس امر کا فیصلہ کرتے ہیں کہ اندرونی وظائف کیا اور کیسے ادا ہوں ۔

دمیغ (Cerebellum) :

شرکی یا خود اختیاری نظام کے بعد دمیغ کی طرف آئیے ۔ اس کا مقام

سر کی پچھلی طرف ہے اور اسے مخ اکبر نے تقریباً ڈھانپ رکھا ۔
اعصاب کے بڑے بڑے گچھے دماغ کی ڈانڈی سے دمیغ کی طرف آتے
ان کی بدولت تاثرات میں ربط پیدا ہوتا ہے اور دقیق حرکات میں
آسانی سے کام کر لیتے ہیں ۔ دوڑنے، چلنے پھرنے، تیرنے اور گانے
کئی پٹھے مل جل کر کام کرتے ہیں ۔ ان تمام پٹھوں کے وظائف
یکجا کرکے ان میں ربط پیدا کرنا دمیغ کا کام ہے ۔ اگر دمیغ میں
آ جائے تو پٹھوں کے وظائف میں ربط قائم نہیں رہے گا ۔ انسان دوڑ
سکے گا، گا نہیں سکے گا، تیر نہیں سکے گا وغیرہ وغیرہ ۔ آپ نے لو
کو رقص کرتے ہوئے دیکھا ہوگا ان کی تمام حرکات میں گہرا ربط
ہے ۔ اگر ہاتھ اور پاؤں مل کر رقص نہ کریں تو ہاتھ ایک طرف جائیں
اور ٹانگیں دوسری طرف ۔ اگر گویے یا رقاصہ کا دمیغ خراب ہو جائے
نہ گویا گا سکے گا اور نہ ہی رقاصہ ناچ سکے گی ۔ بعض پرندوں کو
پر چوٹ آ جاتی ہے، وہ اڑ نہیں سکتے کیونکہ اڑنے میں کئی پٹھے
کرتے ہیں اور جب تک ان میں ربط نہ ہو، اڑنے جیسا دقیق فعل ادا
ہو سکتا ۔ بعض نفسی ماہروں کے خیال میں عادتوں کا مرکز یہی
ہے ۔ جب اعادہ اور تربیت سے کوئی فعل اس قدر آسان اور تیز ہو
کہ خود بخود ادا ہو سکے تو عادت بن جاتا ہے ۔ گانا گویے کے لیے
رقص رقاصہ کے لیے عادت ہے ۔ اگر دمیغ کام کرنا چھوڑ دے تو عاد
کے مرکز خراب ہو جائیں گے، گانا بھی بھول جائے گا اور ناچنا بھ

بعض لوگ دمیغ کو جنسی خواہشات کا مرکز خیال کرتے
لیکن اس کی تائید میں کوئی شہادت نہیں ملتی ۔

مخ کبیر (Cerebrum):

نظام عصبی کے وظائف بیان کرنے کے لیے سب سے پہلے ہم نے
افعال یعنی اضطراری افعال کو لیا، ان کے مراکز نخاع میں پائے گ
اس کے بعد ذرا مشکل افعال لیے ان کے مراکز شرکی نظام اور دمیغ

انے گئے ۔ اب زیادہ مشکل افعال کی طرف آتے ہیں ۔ آنکھ کا جھپکنا اضطراری فعل ہے اس کا عمل اضطراری قوس سے سمجھ میں آ سکتا ہے ۔ پھر ہیجانات اور عادتیں لی گئیں ان کے مراکز شرکی نظام اور دمیغ میں ملے ۔ لیکن اضطراری افعال، ہیجانات اور عادات سے انسان کے خاصے کا پتہ نہیں چلتا ۔ انسان کی تعریف ذی عقل حیوان کی جاتی ہے اور عقل کا استعمال نہ اضطراری افعال میں ہے نہ ہیجانات میں ۔ آج کل کے نفسی ماہر عقل کے لفظ سے گھبراتے ہیں کیونکہ انسان میں بےعقلی اور غیرعقلی کا دائرہ عقلی دائرے سے کہیں زیادہ وسیع ہے ۔ آج کل عقل کی بجائے ادراک، شناخت، تجربہ جیسے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں ۔ لیکن کوئی شخص اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ کئی دفعہ انسان خود اپنے آپ سے بحث کرتا ہے یا بین‌الاقوامی سیاست پر تنقید کرتا ہے یا فلسفہ کا ذکر کرتا ہے ۔ یہ سب عقل کے وظائف ہیں ان بحث مباحثوں کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ موجودہ حالات کا رابطہ مستقبل سے قائم کیا جائے یا پیچیدہ معاملات کی گتھیاں سلجھائی جائیں یا دقیق ماحول سے توافق پیدا کیا جائے۔

فہم و فراست اور ذہین کردار کے مراکز مخ اکبر میں پائے جاتے ہیں ۔ ضعیف‌العقلی میں دیکھا گیا ہے کہ دماغ کے بعض حصے کمزور ہوتے ہیں اور ان کا نشو و نما رک گیا ہوتا ہے ۔ احمقوں اور بے وقوفوں کا دماغ اور خصوصاً ان بچوں کا جنھیں 'شاہ دولے شاہ کے چوہے' کہا جاتا ہے بہت ہی چھوٹا ہوتا ہے اور ان کے اعصاب کے جوڑ نہایت ہی ناقص اور ضعیف ہوتے ہیں ۔ پاگل پن کی ایسی قسمیں بھی ہیں جن میں اعصاب کے جوڑ بڑھاپے، سوزاک یا کہنہ شراب نوشی سے خراب ہو جاتے ہیں اور اسی وجہ سے جنون پیدا ہو جاتا ہے ۔

مخ کبیر کی ساخت بہت ہی پیچیدہ ہے ۔ ہیرک (Herrik) لکھتا ہے کہ اگر کوئی ایسا تعلیم یافتہ آدمی مل جائے جسے بجلی کے متعلق کوئی واقفیت نہ ہو اور جس نے تار اور ٹیلیفون کا نام تک نہ سنا ہو اور اس کے

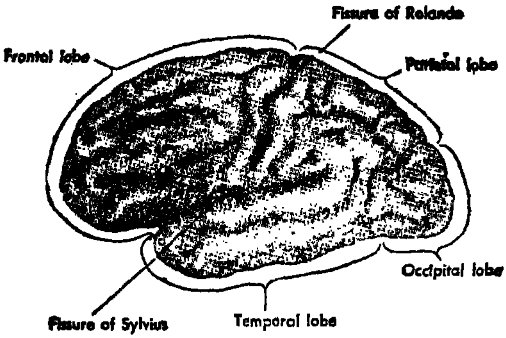
ذمہ یہ کام لگا دیا جائے کہ بغیر کسی مدد کے کسی بڑے شہر کے تار اور ٹیلیفون کے نظام کا مطالعہ کرے اور پھر تمام برق آلات، برق سٹیشنوں اور برق دور کی رپورٹ تیار کرے اور نیز یہ بھی بتائے کہ ان کا عمل کیا ہے تو اس آدمی کا کام بڑا دقیق اور وقت طلب ہوگا۔ کیونکہ صرف انسانی کھوپری میں ہی ۹۲۸۰ ملیون اعصابی خلیے ہیں۔ یہاں سے ایسے اعصابی ریشے پھوٹتے ہیں جو مختلف سمتوں میں دور نکل جاتے ہیں جس کی وجہ سے ہر خلیے کا تعلق بے شمار اعصابی مراکز سے ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ممکن اعصابی شاہراہوں کا مجموعہ انسانی فہم و فراست سے بالا ہے۔

مخ کبیر کا نظام اعصابی نظام کے بالا ترین حصہ میں ہے۔ اسے جزوی طور پر ایک درز دو کروں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ ان کروں کو ملانے والا سفید مادہ ہے جسے حجم ثفنی (Corpus Collosum) کہا جاتا ہے۔ مخ کبیر کی سطح بڑی کٹی پھٹی ہے، باہر والا سفید مادہ قشر (Cortex) بناتا ہے جو تین ملی میٹر کے قریب موٹا ہوتا ہے۔ اس میں عصبانیوں اور ان کے ریشوں کی کئی تہیں ہوتی ہیں۔ قشر کے نیچے کا سفید مادہ محورے (Axons) بناتا ہے جو قشر کو نظام عصبی کے زیریں مراکز سے ملا دیتے ہیں اور قشر کے کروں میں باہمی تعلق قائم کرتے ہیں۔

گو مخ کبیر کو دو کروں میں تقسیم کرنے والی ایک لمبی سی درز ہے لیکن اس تقسیم کو مکمل نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ کرے نیچے سے مل جاتے ہیں۔ مخ اکبر کے بڑے بڑے حصے جنھیں فصوص (Lobes) کہا جاتا ہے، ان کا بھی یہی حال ہے۔ جبہی فص (Frontal Lobe) کا مقام پیشانی میں ہے لیکن یہ درمیانی خلیج تک پہنچ جاتا ہے، جس کی پشت پر فص جداری (Parietal Lobe) موجود ہے۔ اس کے پیچھے دماغ کے عقب میں فص مؤخری (Occipital Lobe) ہے۔ کروں کے دونوں جانب

سلویس کی درز (Fissure of sylveus) ہے جو صدعی فص (Temporal Lobe) کو جبہی فص سے جدا کر دیتی ہے ۔

A longitudinal cross section of the brain



دماغ کے فصوص

مرکزی درز سے ذرا آگے جبہی فص میں حرکی رقبہ (Motor area) پایا جاتا ہے ۔ بدنی حسی رقبہ (Somaesthetic area) جس کا تعلق جلدی (Cutaneous) اور عضلی (Muscle) حواس سے ہے اس کا مقام فص جداری میں مرکزی درز کے عقب میں ہے ۔ صدعی فص کے اوپر والے حصہ میں سمعی رقبہ (Auditory area) ہے اور بصری رقبہ (Visual area) دماغ کے پیچھے فص مؤخری میں موجود ہے ۔

دماغ کے حجم کا تعلق ذہانت سے بہت کم ہے ۔ ان پڑھ لوگ سمجھتے ہیں کہ بڑا دماغ زیادہ عقل کی نشانی ہے اور چھوٹا دماغ کم عقلی کی ۔ لیکن تجربوں نے ثابت کر دیا ہے کہ دماغ کی جسامت اور ذہانت کا باہمی تعلق (Corelation) صرف ۰۱. + یا ۰۱۵ + ہے ۔ پس ذہانت کا دار و مدار اور عناصر پر ہے ۔ دماغ کی اندرونی ساخت ، عصبانیوں کا باہمی تعلق اور کیمیائی عمل اس ضمن میں نہایت اہم ہیں ۔

وظائف دماغ کی تعمیر (Localisation of Brain Function) :

آیا دماغ کے مختلف حصے مختلف فرائض ادا کرتے ہیں، یہ ایک پرانا مسئلہ ہے - ۱۸۰۰ء کے قریب گال (Gall) نے اپنا مشہور و معروف نظریہ کاسۂ سر بیان کیا، جب سے اس مسئلہ نے سائنسی صورت اختیار کی ہے - گال ایک سائنس دان تھا - جب وہ کسی کے سر میں کوئی خاص بات دیکھتا تو اس شخص کے نفسی کوائف کا مطالعہ کرنے بیٹھ جاتا - اس کا خیال تھا کہ سر کے ابھار (Bumps) کا تعلق شخصیت سے ہے - ان ابھاروں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دماغ کا کون سا حصہ ترقی یافتہ ہے - اس مطالعہ سے گال کو پتہ چلا کہ تعقلی قویٰ کا مقام پیشانی میں دماغ کے سامنے کے حصہ میں ہے - اخلاقی خصائص کے مراکز دماغ کے پچھلے حصہ دمیغ میں پائے جاتے ہیں -

گال کا نظریہ سائنسدانوں میں کبھی بھی مقبول نہیں ہوا کیونکہ اس کی تہہ میں تجربی شواہد موجود نہیں - اب ایک، اور نظریہ لیجیے جو اتفاقاً دریافت ہوا - فرانس اور پرشیا کی جنگ میں[1] ایک فوجی سرجن نے جس کا نام فرش (Fritsch) تھا، زخمی سپاہی کے ننگے دماغ سے بجلی کی رو گزاری - اس نے دیکھا کہ بعض پٹھے خود بخود جنبش میں آ گئے - فوراً ہی اس نے کتوں پر تجربات شروع کر دیے - اس طرح معلوم ہوا کہ قشر کے بعض مخصوص رقبوں کا تعلق جسم کے دوسری جانب کے مخصوص عضلات سے ہے - فرش کے بعد اور لوگوں نے اسی قسم کے تجربات کیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قشر کا اچھا خاصا نقشہ تیار ہو گیا ہے - اس نقشہ میں مختلف فصوص درج ہیں - اور حرکی اور حسی رقبوں کو علیحدہ علیحدہ دکھایا گیا ہے -

---

۱- ملاحظہ ہو ڈیشیل (Dashiel) کی کتاب Fundamentals of General Psychology، صفحہ ۳۲۹ -

اس طریقے کے علاوہ اور بھی طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ وڈورتھ[1] چار طریقوں کا ذکر کرتا ہے:

۱- استیصال (Extirpation) : جانور کے دماغ کا کوئی حصہ ضائع کر دیا جاتا ہے اور اس سے جن وظائف کو نقصان پہنچتا ہے انھیں نوٹ کر لیا جاتا ہے۔

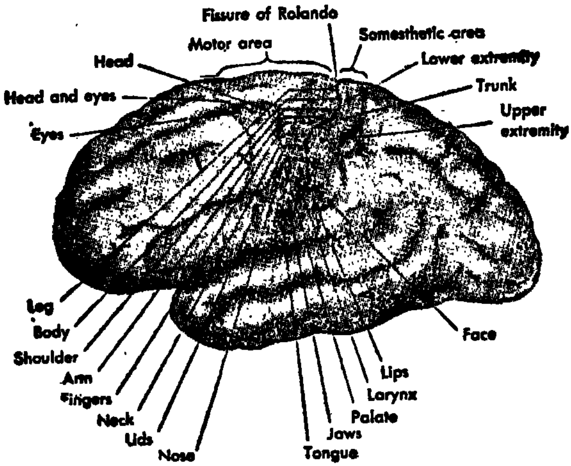
۲- امراضیاتی طریقے (Pathological method) : مریض کے بگڑے ہوئے وظائف کو دیکھا جاتا ہے اور پوسٹ مارٹم پر پتہ لگایا جاتا ہے کہ دماغ کے کس مخصوص حصہ میں نقص آ گیا تھا۔

۳- تہییج (Stimulation) : قشر کے ننگے حصوں کو بجلی کی رو سے متأثر کیا جاتا ہے اس سے جو حرکتیں پیدا ہوتی ہیں انھیں ملاحظہ کیا جاتا ہے۔

۴- ریشوں کا کھوج لگانا (Fibre tracing) : جو ریشے دماغ سے نکل کر نچلے مراکز تک جاتے ہیں ان کا پیچھا کیا جاتا ہے۔ اس طرح سے پتہ چلتا ہے کہ دماغ کا کون سا حصہ آنکھ، کان یا پٹھوں سے وابستہ ہے۔ یہ طریقہ بڑا قابل اعتبار ہے۔ فرض کیا ریشوں کا تعاقب کرتے ہوئے ہم اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ بازوؤں کے پٹھوں کے حرکی اعصاب نخاع سے مونڈھوں کے بالمقابل نکلتے ہیں تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ ان حصوں کا آپس میں تعلق ہے۔ اسی طرح اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ دماغ کے ایک حصے سے محورے نخاع سے مونڈھوں کے بالمقابل مل جاتے ہیں، تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ بازوؤں کے لیے بالائی مراکز یہاں موجود ہیں۔ یاد رہے کہ اگرچہ یہ طریقہ بڑا کامیاب ہے، لیکن ریشوں کا تعاقب کرنا آسان کام نہیں۔ یہ نہ خیال کریں کہ ریشے کوئی رسیاں ہیں جنھیں آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ ریشے ہر طرف سفید مادے سے گزرتے ہیں ان کا پیچھا خاص اوزاروں اور خاص

۱- ملاحظہ ہو اس کی Psychology، صفحہ ۲۵۲ -

طریقوں سے ہو سکتا ہے - ایک طریقہ رخاوت نسیج (egeneration
ہے کسی محوریہ کو عصبی خلیہ سے کاٹ دیں - محوریہ جہاں ج
جائے گا سوکھ جائے گا یا اس کا رنگ بدل جائے گا - رنگ بدلنے سے
پتہ چل جائے گا کہ اس کی ابتدا کہاں سے ہوئی اور انتہا کہاں ہ



وظائف دماغ کی تصویر

آن چاروں طریقوں کے مشترکہ استعمال سے حسب ذیل نتائج بر
ہوتے ہیں :

حرکی رقبہ (Motor Area) :

ریشوں کے تعاقب سے پتہ چلتا ہے کہ دماغی کروں کا کون
حصہ جسمانی حرکات سے متعلق ہے - مرکزی درز کے سامنے قشر
ایک حصہ جسے پیش مرکزی تزرید (Precentral Gyrus) کہتے ہیں،
فریضہ کے لیے مخصوص ہے - یہاں پر بڑے بڑے خلیے ہیں جہاں
نخاع اور دماغ کی ڈانڈی کے نچلے مراکز کو جانے والے محوریے پھو

ہیں ۔ اگر دماغ کے اس رقبہ کو ہلکی سی بجلی کی رو سے متاثر کیا جائے تو جسم کے مختلف حصے حرکت میں آ جاتے ہیں ، دماغ کی چوٹی کو متاثر کرنے سے پاؤں اور ٹانگیں ہلتی ہیں ۔ اس سے ذرا نچلے حصہ کو متاثر کریں تو کمر ہلتی ہے ۔ اور اس سے نیچے متاثر کرنے سے بازو ہلنے لگتے ہیں ۔ سب سے نچلے حصہ کو متاثر کریں تو سر ، چہرہ اور منہ ہلتا ہے ۔ اگر دماغ کے اس حصہ کو چوٹ آ جائے تو متعلقہ وظائف ختم ہو جاتے یا خراب ہو جاتے ہیں ۔

حرکی رقبہ کے علاوہ ایک اور قبل حرکی رقبہ (Premotor area) ہے ، اس کا تعلق حرکی رقبہ سے ہے اور نخاع اور دماغ کی ڈانڈی کے نچلے حرکی مراکز سے بھی ۔ اگر اس رقبہ کو برقی رو سے متاثر کیا جائے تو پیچیدہ حرکات ظاہر ہوتی ہیں ۔ خیال ہے کہ حرکی رقبہ کا تعلق سادہ حرکات سے ہے اور قبل حرکی رقبہ کا تعلق دقیق اور پیچیدہ حرکات سے ۔ ووڈورتھ کا کہنا ہے کہ جرکی اور قبل حرکی رقبوں کے علاوہ کچھ اور رقبوں کا تعلق بھی حرکات سے ہے ۔ مثلاً آنکھ اور سر کی حرکات فصوص مؤخری ، صدغی اور جبہی کے زیر تابع بھی ہیں ۔

قشر کے ہر حصہ سے دماغ کی ڈانڈی کو ریشے جاتے ہیں ۔ ان میں سے کئی ریشے دمیغ کا رشتہ مخ کبیر سے قائم کر دیتے ہیں ۔ جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے ، دمیغ کا کام حرکات میں تناسب اور توازن قائم کرنا ہے ۔ لیکن اس مطلب کے لیے دمیغ اور مخ کبیر دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں ۔ مثلاً فٹ بال کے کھلاڑی کو لیجیے مخ کبیر سے نہ صرف مہارت بلکہ فیصلہ اور پہل کرنے کی صلاحیتیں بھی اسے ملتی ہیں ۔ کھلاڑی کے لیے ضروری ہے کہ وہ بال کو صحیح وقت پر ٹھوکر لگائے اور صحیح سمت پھینکے ۔ دمیغ سے وہ اپنے جسم کا توازن قائم رکھتا ہے اور ٹھوکر لگاتے وقت اس کے تمام جسم کی حرکات متحدہ طور پر کام کرتی ہیں ۔

حسی رقبہ (Sensory Area) :

کسی حواس سے قشر کا براہ راست تعلق نہیں ۔ لیکن حواس کے نچلے مراکز تمام کے تمام درمیانی دماغ (Inter brain) میں واقع ہیں اور قشر کا تعلق درمیانی دماغ سے ہے ۔ اس دماغ کے حصے کو ڈانلڈی کا سرا کہنا چاہیے اور اس کا مقام دمیغ کے بائیں جانب ہے ، آنکھ ، کان اور دوسرے حواس سے اعصابی ریشے درمیانی دماغ تک پہنچتے ہیں اور وہاں سے قشر کے مختلف حصوں کو ۔ پس درمیانی دماغ ایک قسم کا جنکشن ہے جو قشر کی شاہراہوں کو حواس کی شاہراہوں سے ملا دیتا ہے اور قشر ان تحسسات کی بنا پر اشیا کا ادراک کرتا ہے ۔ لیکن اس خیال کی تاحال تصدیق نہیں ہوئی ۔ ذیل میں بعض حسی رقبوں کا ذکر کیا جاتا ہے ۔

۱۔ بدنی حسی رقبہ (Somesthetic Area) : رو لینڈو کی درز (Fissure of Rolando) کے پیچھے یہ رقبہ واقع ہے ۔ جب یہ رقبہ تباہ ہو جاتا ہے تو تحسسات کو زک پہنچتی ہے ۔ مریض یہ نہیں بتا سکتا کہ کوئی چیز اسے کس جگہ چھو رہی ہے ۔ اسے دباؤ کا احساس ہوگا لیکن دباؤ کا مقام نہیں بتا سکے گا ۔ آنکھیں بند ہونے پر وہ یہ نہیں بتا سکتا کہ اس کے ہاتھ پاؤں کس حالت میں ہیں ۔ یا کوئی انہیں کیسے ہلا رہا ہے ۔ جب اس رقبہ کی ایک جانب خراب ہو جاتی ہے تو جسم کا مخالف حصہ تحسسات سے بے بہرہ ہو جاتا ہے ۔ اگر مریض کے جسم کو چھوا جائے تو وہ دیکھ کر بتا سکے گا کہ کون سا حصہ چھوا جا رہا ہے ۔ وہ چیزوں کو اٹھا سکتا ہے لیکن بن دیکھے نہیں بتا سکتا کہ وہ کیا ہیں ۔ وہ کاغذ اور ریشم میں فرق نہیں کر سکتا گو وہ یہ کہہ دے کہ ایک سے طرب یا خوشی اور دوسرے سے انقباض یا درد کے احساسات آ رہے ہیں ۔

لیکن یاد رہے کہ اس رقبے کے مکمل تباہ ہو جانے پر بھی مریض

کو کچھ نہ کچھ جسم کا احساس رہتا ہے کیونکہ سریر (Thalamus) بھی بدنی حس میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے ۔ ادنیٰ جانوروں میں بھی تمام تحسسات سریر کی بدولت ہوتے ہیں ۔ اگرچہ انسانوں میں اکثر حسی وظائف قشر نے لے لیے ہیں لیکن پھر بھی درد اور ہلکا پھلکا سا طرب اور انقباض کا احساس سریر کے ذریعہ ہوتا ہے ۔ بندروں پر کچھ تجربے ہوئے ہیں ۔ انہیں پہلے اوزان کے چھوٹے چھوٹے فرق جانچنے کی تربیت دی گئی ۔ جب اچھی طرح سے سیکھ گئے تب ان کے قشر کے رقبے کو مختلف جگہوں پر نقصان پہنچایا گیا ، بعد میں بندروں کو جو آزمائشیں دی گئیں ان سے معلوم ہوا کہ حرکی ، بدنی حسی اور فص جداری کے نقصانات سے بندروں میں فرق کرنے کی تمیز جاتی نہیں رہی ۔ جب فص جداری کو مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا تو بندروں کی کار کردگی میں فرق ضرور آیا لیکن ان کی امتیاز کی قابلیت بالکل غائب نہیں ہوئی ۔ تجربہ کنندگان اس نتیجے پر پہنچے کہ بندروں میں قشر کے وسیع رقبے ، جن میں جبہی فص کے حصے بھی شامل ہیں ، تمیز کرنے میں ممد و مددگار ہوتے ہیں ، لیکن سریر بھی اس سلسلے میں اہم کردار ادا کرتا ہے ۔

۲۔ بصری رقبہ (Visual Area) : یہ رقبہ دماغ کی پچھلی طرف ہے ۔ جس طرح جلد کے مختلف حصوں کا تعلق قشر کے حسی رقبہ سے ہے اسی طرح سے آنکھ کے جال دار پردے (Retina) کا تعلق قشر کے فص مؤخری سے ہے ۔ جال دار پردے سے آنکھ کے پردے بصری اعصاب کے کچھ گچھے ایک دوسرے کو قطع کرتے ہیں ، قطع کرنے کا مقام دماغ کے نیچے ہے ۔ بائیں آنکھ کے آدھے ریشے قشر کی دائیں طرف اور دائیں آنکھ کے آدھے ریشے قشر کی بائیں طرف جاتے ہیں ۔ باقی آدھے ریشے اپنی اپنی طرف جاتے ہیں ۔ اگر بصری عصب کو دماغ اور متقاطع (Cross) کے درمیان کاٹ دیا جائے تو عجیب قسم کا اندھا پن نمودار

ہوتا ہے ، اس سے دونوں آنکھوں کی کار کردگی میں فرق آئے گا لیۃ
آنکھوں کا صرف ایک حصہ خراب ہوگا۔ دونوں جال دار پردوں
بائیں آدھے حصے اندھے ہو جائیں گے اور اگر دائیں طرف سے کاٹا جا
تو دونوں جال دار پردوں کے دائیں آدھے حصے اندھے ہو جائیں گے
ایسا اندھا الٹی جانب کی چیزیں نہ دیکھ سکے گا۔ اس قسم کے اندھے
کو نیم بصری Hemianopsia کہتے ہیں جس کا مطلب ہے نیم کوری
ریشوں کا تعاقب کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ آنکھ کا دایاں حصہ ق
کے بائیں حصے سے اور آنکھ کا بایاں حصہ قشر کے دائیں حصے سے تع
رکھتا ہے۔

ہلکی برق رو گزارنے سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ فص مؤخری ہ
اگر پھوڑا ہو تو اسے کاٹنے کے لیے کھوپڑی کو کھولا جاتا ہے ا
وقت قشر کے مختلف حصوں کو بجلی سے متأثر کریں۔ اگر بصری ر
کا آخری حصہ متأثر کیا جائے تو سامنے سفید روشنی دکھائی دے
اور اگر بصری رقبے کا اوپر والا حصہ متأثر کریں تو نیچے جھلما
روشنی نظر آئے گی۔ جب بصری رقبے سے باہر لیکن فص مؤخری
ملحقہ حصوں کو بجلی سے متأثر کریں تو شعلے ، ستارے ، چمکتے گین
تیتریاں ، اشیا اور اشخاص نظر آئیں گے۔ لہٰذا فص مؤخری کو اگر گز
پہنچ جائے تو انسان اندھا نہیں ہو جاتا البتہ وہ چیزوں کو شناخت نہ
کر سکتا ، پڑھ نہیں سکتا رنگوں میں تمیز نہیں کر سکتا اور محض بینا
سے گھر کا راستہ نہیں پا سکتا۔

۴۔ سمعی رقبہ (Auditory Area) : اندرونی کان سے اعصابی ریشے
سمعی رقبے کو پہنچتے ہیں۔ یہ رقبہ صدغی فص میں پایا جاتا ہے۔
کے ریشے الٹی طرف بھی اتنے ہی جاتے ہیں جتنے سیدھی طرف۔ اسی ا
اگر ایک طرف کا سمعی رقبہ تباہ ہو جائے تو سماعت پر بہت کم
پڑتا ہے۔ لیکن اگر دونوں طرف کے رقبے خراب ہو جائیں تو انسا

ره ہو جائے گا ۔ یوں دونوں رقبے شاذ ہی خراب ہوتے ہیں ۔

۴۔ ایتلاف اور منظم کرنے والے رقبے (Combining and Organi-zing arc) : اگر قشر پر حرکی اور حسی رقبوں کا نشان لگائیں تو دماغ کا بہت سا رقبہ بچ جاتا ہے ۔ یہ رقبہ تلازم اور ترتیب دینے کے فرائض سر انجام دیتا ہے ۔ حسی اور حرکی رقبوں کا کام مہیجات وصول کرنا اور مناسب رد عمل پیش کرنا ہے لیکن جب تک ان دونوں رقبوں میں اتفاق اور تعاون نہ ہوگا مہیجات اور رد عمل میں کوئی نسبت نہ ہوگی ۔ لہٰذا قشر کا بیشتر حصہ اسی کام میں لگا ہوا ہے ۔ مثلاً بصری رقبے کا قریبی حصہ بصری مہیجات کو یکجا کرنے اور ان کے مطالب سمجھنے میں کارآمد ہے ۔ سمعی رقبے کا قریبی قشری حصہ سمعی مہیجات کو پر معنی بناتا ہے ۔ حرکی رقبے کا قریبی قشری حصہ حرکات کو اس طرح مجتمع کرتا ہے کہ مفید نتائج برآمد ہوں لیکن ان کے علاوہ دو اور تلازمی رقبے ہیں ۔ ایک رقبہ حسی رقبوں کے درمیان جداری ، صدعی اور مؤخری لختوں میں اور دوسرا جبہی فص میں حرکی رقبے سے ذرا ہٹ کر پایا جاتا ہے ۔

منظم اور ترتیب دینے والے رقبوں کے وظائف امراض سے مطالعہ کیے گئے ہیں ۔ چند ایک خرابیوں کا ذکر کیا جاتا ہے ۔

حبسہ (Aphasia) :

دماغ کے ایک خاص حصے کو نقصان پہنچنے سے بولنے اور الفاظ کہنے میں مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں ۔ یہ نقصان نہ تو حسی رقبوں میں ہوتا ہے اور نہ ہی حرکی رقبوں میں ۔ اس کا مقام عام طور پر صدعی اور جداری فصوص میں سمعی رقبے کے قریب پایا جاتا ہے اور یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں کیونکہ بولنے کا تعلق سماعت سے ہے ۔ پیشتر اس کے کہ بچہ بات چیت کر سکے ، وہ دوسروں کو بولتے ہوئے سنتا ہے ۔ بہرے بچوں کو اگر خاص تربیت نہ دی جائے تو بول نہیں سکیں گے ۔ سمعی رقبے کے قرب میں جب گزند پہنچتا ہے تو انسان گفتگو نہیں

سمجھ سکتا اور جب خود گفتگو کرنا چاہتا ہے تو صحیح الفاظ استعمال نہیں کرتا ۔ ایک شخص بار بار کہہ رہا تھا مجھے باہر جانا چاہیے اور چھاتا دھلانا چاہیے ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے ۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ شخص حجامت بنوانا چاہتا تھا ۔ لفظ غلط استعمال کر رہا تھا لہٰذا چاہتا کچھ تھا اور کہتا کچھ تھا ۔

جسہ کی ایک قسم حرکی ہے ۔ اس مرض میں الفاظ منہ سے نہیں نکلتے ۔ مریض ایک یا دو لفظ بول لے گا ۔ مثلاً ہاں یا نہ کہے گا ، لیکن فقرہ نہیں کہہ سکے گا ۔ اس صورت میں نقصان قبل حرکی (Premotor) رقبہ میں ہوتا ہے ۔ دیگر جگہوں پر بھی نقصان ہوتا ہے ۔ اسی لیے مریض کے فہم و فراست میں اختلال آ جاتا ہے ۔

گو حسی اور حرکی رقبے دونوں کروں میں پائے جاتے ہیں ۔ لیکن زباندانی اور زبان فہمی کو صرف ایک ہی کرہ کنٹرول کرتا ہے ۔ مثلاً راست دستوں (Right handed persons) میں بایاں کرہ اس کام کے لیے مخصوص ہے ۔ ان لوگوں کا اگر بایاں کرہ خراب ہو جائے تو زبان کی مشکلات نمودار ہوں گی لیکن اگر دائیں کرے کو نقصان پہنچے تو جسہ پیدا نہیں ہوگا ۔

ناکارہ پن (Apraxia) :

اس بیماری میں مریض کچھ کر نہیں سکتا ۔ مثلاً اسے دیا سلائی اور سگریٹ دیجیے تو وہ جلا نہیں سکے گا ۔ مختلف حرکات کو مجتمع کرنے کی صلاحیت اس میں موجود نہیں ہوتی ۔ اس سلسلے میں حرکی رقبہ کے قریب دماغ کو نقصان پہنچتا ہے ۔

لا ادراکی (Agnosia) :

اس مرض میں شناخت خراب ہو جاتی ہے ۔ مثلاً بصری لاادراکی میں ان چیزوں کو شناخت نہیں کیا جاتا جو دیکھی جا رہی ہوں ۔ مریض پڑھ نہیں سکتا اور نہ ہی رنگوں اور شکلوں کو پہچان سکتا ہے ، اس مرض میں فص مؤخری خراب ہو جاتا ہے ۔ سمعی لاادراکی میں

آوازوں کی پہچان ختم ہو جاتی ہے ۔ گانا سمجھ نہیں آتا اور اس سے حظ نہیں اٹھایا جا سکتا ۔ جب بدنی حسی رقبہ کے قرب کو گزند پہنچتا ہے ۔ تو مریض ہتھیلی پر رکھی ہوئی اشیا کو پہچان نہیں سکتا اور نہ ہی ان کا وزن بتا سکتا ہے ۔ لاادراکی خواہ کسی قسم کی ہو مریض دیکھتا ، سنتا اور محسوس کرتا رہتا ہے ۔ اس کی تکلیف یہ ہے کہ وہ مہیجات کو مجتمع کرکے انہیں پر معنی نہیں بنا سکتا ۔

ووڈورتھ کا کہنا ہے کہ زباندانی اور زبان فہمی اولاً سمعی اور ثانیاً حرکی معاملہ ہے ۔ زباندانی محض آوازیں پیدا کرنا نہیں ۔ زبان کا اہم وظیفہ ایک سے دوسرے تک خیالات پہنچانا ہے ۔ لہٰذا جب تک آوازیں پر معنی نہ بنیں ، خیالات کی ترسیل کا ذریعہ نہ بن سکیں گی ۔ زبان ہمیشہ اشاراتی (Symbolic) ہوتی ہے اور جسہ میں تکلیف یہ ہوتی ہے کہ مریض اشاروں کو استعمال نہیں کر سکتا ۔ لاادراکی میں بھی نشانات اور اشاروں کو سمجھا نہیں جاتا ۔ ناکارہ پن میں ارادے اور فعل کا تعلق ٹوٹ جاتا ہے ۔ للہذا جو کچھ مریض کرنا چاہتا ہے وہ نہیں کر سکتا ۔ پر مطلب کردار میں اشاروں کا استعمال ضروری ہے ۔ حرکی اور حسی رقبے مہیجات کو وصول کر لیتے ہیں رد عمل بھی پیش کر سکتے ہیں لیکن مناسب اور موزوں کردار کے لیے ضروری ہے کہ سب چیزوں کو اکٹھا کیا جائے اور اس مطلب کے لیے تقریباً سارا قشر مصروف کار نظر آتا ہے ۔

جبہی لختے (Frontol Lobes) :

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ گال (Gall) نے کاسۂ سر کا مطالعہ کرکے اس کے ابھاروں کا تعلق مزاج سے جوڑنا چاہا ۔ لیکن اس کی کوشش بے سود ثابت ہوئی کیونکہ ابھاروں اور مزاج کا باہمی تعلق (Correlation) حال کی تحقیق کے مطابق بہت کم ہے ۔ جبہی لختے انسانوں میں جانوروں کی نسبت بڑے ہیں ۔ کیا ابھاروں

۱۔ ملاحظہ ہو اس کی Psychology صفحہ ۲۶۱ ۔

کی طرح ان کی نسبت بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا تعلق ذہانت اور سیرت سے بالکل نہیں ؟ اس سوال کا جواب نفی میں دینا ہوگا کیونکہ انسان کی برتری جانوروں پر محض فہم و فراست سے نہیں بلکہ اس وجہ سے بھی ہے کہ وہ اپنے معاملات کو بہتر طریقے سے نپٹاتا ہے - دور کے مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے اور زندگی کے منصوبے بناتا ہے - جبہی لختے کا تعلق علم سے نہیں بلکہ ترتیب اور ربط سے ہے - اس کا وظیفہ افعال و کردار کو مجتمع کرکے کسی بڑے منصوبے کے لیے تیار کرنا ہے - اس کی تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ جب جبہی لختے کو ضرب آتی ہے تو مریض کے علم میں فرق نہیں آتا - البتہ اس کی انتظامیہ قابلیت اور کیریکٹر میں کمزوری آ جاتی ہے -

فری مین - ڈبلیو - واٹس(Freeman W. Watts) نے ایک دلچسپ تجربہ بیان کیا ہے- وہ کہتا ہے ایک کامیاب دلال جس کی عمر چالیس برس کی تھی ، شدید سر درد، غیر حاضر دماغی (Absent-Mindedness) اور یادوں کی فراموشی کے مرض میں مبتلا ہوگیا - جب یہ مرض بڑھ گیا تو اس پر مسلسل بے ہوشی طاری ہو گئی - ایکس رے سے پتہ چلا کہ اس کے دونوں جبہی لختوں پر پھوڑا ہے - آپریشن سے دونوں لختے کاٹ دیے گئے اور مریض جلد صحتیاب ہو گیا - اس کا درد سر جاتا رہا - غیر حاضر دماغی دور ہوگئی اور یاد داشت بھی معمول پر آ گئی - لیکن ایک عجیب بات جو صحت کے بعد ظاہر ہوئی وہ یہ تھی کہ اب اس شخص کا کام کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا - اب وہ بالکل بدلا ہوا انسان تھا - دوسروں کی اسے مطلقاً پرواہ نہ تھی اور وہ کوئی کام لگاتار نہیں کر سکتا تھا - ایک سال تک اس شخص کو زیر معائنہ رکھا گیا - علاج معالجہ کیا گیا ، تھوڑی سی اصلاح بھی ہوئی، لیکن اتنی نہیں کہ وہ دوبارہ اپنا کام کاج کر سکے - اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب وہ کسی کام کے اہل نہیں رہا تھا - وہ چھوٹے چھوٹے کاموں میں بڑی سرگرمی دکھاتا تھا -

کمرے کے ارد گرد بھاگتا ، ناچتا اور گاتا تھا ۔ ہر وقت چلتا رہتا تھا ۔ البتہ منظم اور باضابطہ کام نہیں کر سکتا تھا ۔

مریض کو اب اپنا پرانا ضبط بھی نہیں رہا تھا ۔ جنسی اور دوسروں پر غلبہ پانے کی خواہشات کو کنٹرول میں نہیں رکھ سکتا تھا ۔ جنسی گفتگو بڑے مزے سے کرتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی مضحکہ خیز جنسی حرکات بھی کر بیٹھتا تھا ۔ لیکن سنجیدہ جنسی تعلقات سے عاری ہو گیا تھا ۔ کسی عورت کی طرف سنجیدگی سے قدم نہیں بڑھا سکتا تھا ۔ غلبہ پانے کی خواہش بھی مضحکہ خیز ہو گئی تھی ۔ عام طور پر کھیلوں کے میدان میں یا ناچنے میں یا کاروبار میں شیخیاں مارتا تھا ۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ ہر چیز کر سکتا ہے لیکن کرتا کچھ بھی نہ تھا ۔

نفسیاتی تحقیق کے کمرے میں اس کا کردار عجیب و غریب تھا۔ وہ ضرورت سے زیادہ پرجوش،ظریف اور بدحواس تھا۔ کسی چیز پر دھیان نہیں دیتا تھا ۔ آزمائش ختم کرنے کے لیے اسے بار بار کہا جاتا تھا ۔ لیکن ان نقائص کے باوجود اس کی ذہانت معمول پر تھی۔ البتہ فقروں اور تصویروں کو مکمل نہیں کر سکتا تھا اور اس قسم کی دیگر آزمائشیں جن میں اجزا کو اکھٹا کر کے بامعنی اشیاء بنانا تھا وہ کرنے سے قاصر تھا ۔ ایسا نظر آتا تھا کہ اس میں فہم و فراست تو ہے لیکن وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا کیونکہ اجزا کو مجتمع کرنے کی قابلیت کافور ہو چکی تھی ۔

اس مریض کا غور سے معائنہ کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کی توجہ یاد داشت ، استدلال اور ادراک میں کوئی فرق نہیں آیا ۔ اس کی بیماری فہم و فراست میں نہ تھی ۔ وہ صرف اجزا کو یکجا نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی ان سے کوئی مطلب نکال سکتا تھا ۔ وہ حقائق کو ترتیب نہیں دے سکتا تھا اور اجزا کو مجتمع کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھا تھا ۔ اس صلاحیت کے بغیر منصوبے نہیں بنائے جا سکتے اور نہ ہی جذبات پر قابو پایا جا سکتا ہے ۔ آپریشن کے بعد یہ شخص ہیجانی زیادہ نظر آتا تھا

لیکن در حقیقت اس کے ہیجان میں اضافہ نہیں ہوا ۔ صرف اسے ہیجان پر قابو نہیں رہا ۔ قابو نہ ہونے کی وجہ سے جذبات اور بدحواسی کا وجود نمایاں ہو گیا تھا ۔

آج کل بعض ذہنی بیماریوں میں جبہی لختوں کے چند ایک اعصاب کو کاٹ دیا جاتا ہے ۔ اس سے پریشانی ، بے حسی اور افسردگی دور ہو جاتی ہے۔ یعنی تعقلی قویٰ صحیح سالم رہتے ہیں۔ ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

ترتیب اور امتزاج کی دو قسمیں :

اوپر ہم نے دیکھا ہے کہ جبہی اور حرکی رقبوں کے علاوہ ایسے رقبے بھی ہیں جن کا کام مہیجات اور رد عمل کو ترتیب دینا اور ان کو اعلیٰ مقاصد کے لیے تیار کرنا ہے ۔ جب تک اجزا کو اکٹھا کرکے ان سے بامعنی مرکب نہ بنا لیے جائیں زندگی کے اہم تقاضے پورے نہیں ہوتے ۔

ووڈورتھ کا خیال ہے کہ مہیجات اور رد عمل میں دو طریقوں سے تنظیم اور رابطہ ممکن ہے ۔ یہ تو ظاہر ہے کہ یا تو پیغامات اور تأثرات اندر آتے ہیں یا پیغامات رد عمل کی صورت میں باہر جاتے ہیں ۔ پس یا تو تنظیم کا رخ درآور یا برآور ہوگا ۔ مثلاً کسی شے کو دیکھ کر مختلف تحسسات آتے ہیں ۔ ان کو یکجا جمع کرکے با معنی ادراک بنا لیا جاتا ہے، گانا سنتے ہیں، مختلف آوازیں آتی ہیں ۔ ان کو مجتمع کرکے سر کا احساس ہوتا ہے پردہ سکرین پر تصویر دیکھتے ہیں ، مختلف حرکات سے ایک چلتی پھرتی شے کا تخیل ہوتا ہے ۔ ان مثالوں میں منتشر تحسسات کو ایک لڑی میں پرو کر بامعنی ذہنی کیفیات بنا لی جاتی ہیں ۔ یہ تنظیم درآور پیغامات کی ہے ۔

اب برآور پیغامات کو لیجیے ۔ ان کا تعلق حرکات و سکنات سے ہے ۔ کوئی سا فعل لیں یہ بے شمار چھوٹی چھوٹی حرکات کا مجموعہ ہوگا ۔ اٹھنا ، بیٹھنا، دوڑنا، سائیکل چلانا، لکھنا، ٹائپ کرنا یہ سب کے سب ایسے فعل

ہیں جن کی اگر تشریح کی جائے تو جسم کی کئی حرکتیں مصروف کار نظر آئیں گی ۔ لکھنے میں ہی دیکھیے کس طرح انگلیوں ، ہاتھوں ، بازوؤں ، مونڈھوں، کمر، سر، آنکھوں کی حرکات شامل ہیں ۔ کرکٹ کے کھلاڑی کو دیکھیے جب وہ ہٹ (hit) لگانا چاہتا ہو تو اس کا سارا جسم ایک خاص انداز میں ہوتا ہے اور ہٹ لگاتے وقت سارے جسم کی حرکتیں تعاون کرتی ہیں ۔ لہٰذا اس تنظیم کا تعلق برآور پیغامات سے ہے اس کا رخ محسوسات کی طرف نہیں بلکہ افعال و کردار کی طرف ہے ۔ لیکن اس کی اہمیت بھی اتنی ہی بلند ہے ، جتنی پہلی کی ۔

تنظیم کی ان دو اقسام کے لیے اعصابی مشینری بھی مختلف ہوگی ۔ درآور تنظیم کے لیے وصول کرنے والی (collecting) مشینری کی ضرورت ہے اور برآور تنظیم کے لیے تقسیم کرنے والی (distributing) کی ۔ ابتدائی سطح پر عصبی مراکز میں دونوں قسموں کی تنظیم دکھائی دیتی ہے ۔ کئی ریشے ایک ہی مرکز پر جمع ہو جاتے ہیں اور جمع ہو جانے کے بعد محورے انہیں پھیلا دیتے ہیں ۔ پہلی درآور تنظیم ہے دوسری برآور ۔ دماغ کے دو بڑے ایتلافی رقبوں میں سے پچھلا رقبہ ، جو کہ حسی رقبوں کے درمیان واقع ہے ، وصول کرنے کا کام کرتا ہے ۔ لہٰذا اس کا وظیفہ علم حاصل کرنا اور فہم و فراست ہے ۔ سامنے والا ایتلافی رقبہ تقسیم کرنے کا کام کرتا ہے اس کا وظیفہ منصوبہ بندی، تنظیم اور ضبط قائم رکھنا ہے ۔

قشر عام کے وظائف

(General Functions of the whole Cortex)

قشر کا ایک عام وظیفہ آموزش (learning) اور یاد داشت (remembering) ہے ۔ گو ان دونوں کے لیے ادنیٰ اعصابی مراکز بھی موجود ہیں لیکن قشر بھی اس سلسلے میں نہایت ضروری ہے ۔ اس کی تصدیق تجربات سے ہوتی ہے ۔ ایک بندر کو دروازہ کھولنا اور صحیح راستہ ڈھونڈنا سکھایا گیا بعد میں اس کے جبھی لختے آپریشن سے نکال

دیے گئے - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کچھ بندر نے سیکھا تھا وہ بھول گیا - اسے دوبارہ سب کچھ سکھایا گیا اور وہ سیکھ گیا - اگر سیکھنے کا فعل صرف جبہی لختوں پر منحصر ہو تو بندر دوبارہ نہیں سیکھ سکتا تھا دوبارہ سیکھ جانا اس بات کی علامت ہے کہ قشر بھی آموزش کا وظیفہ ادا کر سکتا ہے -

اس قسم کا تجربہ سفید چوہے پر ہوا - اس کو سکھایا پڑھایا گیا پھر اس کے قشر کو آپریشن سے کاٹ دیا گیا - جتنا زیادہ قشر کا حصہ کاٹا گیا اتنا ہی اصلی کارکردگی میں نقص آ گیا - اس چوہے کو دوبارہ سکھایا گیا - اب کی دفعہ اس کی غلطیوں کی مقدار کا تعلق اس امر پر مبنی تھا کہ قشر کا کتنا حصہ کاٹا گیا - مندرجہ ذیل نقشہ دیکھیے :

فی صد قشر کاٹا گیا	آپریشن کے بعد آموزش غلطیوں کی تعداد
۱—۹	۳۳
۱۰—۱۹	۵۳
۲۰—۲۹	۱۴۳
۳۰—۳۹	۲۹۳
۴۰—۴۹	۴۴۹
۵۰—۵۹	۹۵۰

اس سے ثابت ہوا کہ آموزش کا وظیفہ سارے قشر کے سپرد ہے - یوں ووڈورتھ اس نتیجے کے خلاف ہے - کیونکہ اس طرح تو قشر کا صرف ایک ہی وظیفہ ہوگا، جو کہ غلط ہے - ہمیں یہ نہیں کہنا چاہیے کہ سارا قشر اس کام میں مصروف ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ دماغ کی کئی وسیع تنظیمیں ہیں جو بہت سے رقبوں اور تلازمی حصوں پر حاوی ہیں - دماغ کی فعلیتیں لحظہ بہ لحظہ بدلتی رہتی ہیں اور ایک سیکنڈ میں قشر کے بے شمار حصوں کو مصروف کار کر سکتی ہیں -

قشر کا دوسرا عام وظیفہ ماحول کو سمجھنا اور مقاصد کو حاصل کرنا ہے، جن چوہوں کا قشر زیادہ خراب ہو جاتا ہے وہ نئی جگہوں کو معلوم کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں ۔ ان میں استقلال غائب ہو جاتا ہے اور وہ کسی قسم کی کوشش نہیں کر سکتے ۔ وہ اِدھر آدھر چکر لگاتے ہیں لیکن ماحول کو نہیں سمجھتے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب قشر کا بہت سا حصہ خراب ہو جاتا ہے تو ماحول اور اس کے مقاصد کو نہیں سمجھا جاتا ۔ یہ فعل سارے دماغ کا ہے کسی خاص حصے کا نہیں ۔ گو جبہی لختیے افعال کو مقاصد سے ملاتے ہیں اور قشر کا پچھلا حصہ ماحول کو سمجھتا ہے لیکن چونکہ ماحول اور مقاصد کا ساتھ چولی دامن کا ہے لہٰذا دونوں حصوں کو یعنی سامنے والے اور پیچھے والے حصے کو مل جل کر کام کرنا پڑتا ہے ۔

چودھواں باب

محسسات (Sensations)

محسسات کا مطالعہ کیوں ضروری ہے ؟ اس سوال کے جواب میں تین بڑے بڑے وجوہ بیان کیے جا سکتے ہیں :

۱- اگر ہماری دلچسپی کا مرکز انسانی ذات ہو اور ہمارا مقصد اس کے متعلق پیش گوئی کرنا اور کنٹرول کرنا ہو تو ہمارے لیے از بس ضروری ہے کہ جو عوامل انسانی ذات کو متأثر کرتے ہیں انھیں اچھی طرح سمجھ لیں ۔ ہمیں ان عوامل کی شدت سے واقفیت ہونی چاہیے ۔ نیز اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ یہ عوامل جسم کے کس حصے کو بالخصوص متأثر کرتے ہیں ۔ کئی عملی مسائل عوامل کی تشخیص اور شدت سے وابستہ ہیں ۔ مثلاً سوچ لائٹ (Switch Light) اور سڑکوں کے موڑوں پر روشنی کس رنگ کی ہونی چاہیے اور کس مقدار میں ؟ کیا ہر آدمی ایک جیسا دیکھتا ہے ؟ فیکٹریوں میں روشنی کا رنگ کیا ہونا چاہیے ؟ جب ہوائی جہاز بادلوں سے گزر رہا ہو تو اوسط درجہ کا ہوا باز کس قدر فرق ہوائی جہاز کی حرکتوں میں دیکھ سکے گا ؟ کیا سب ہوا باز ایک سا فرق دیکھتے ہیں اور کیا اس فرق کو ناپا جا سکتا ہے ؟ کامیاب گویا بننے کے لیے کیسا اور کتنا عمدہ کان چاہیے؟ اچھی سر کن چیزوں پر منحصر ہے ؟ مختلف سازوں سے جو سریں نکلتی ہیں ان میں کس قسم کا فرق ہوتا ہے ؟ بحری جہاز میں متلی کیوں اور کیسے آتی ہے ؟ جب کوئی ٹائپ سیکھتا ہے تو کون سی چیز رفتار (Speed) کو کنٹرول کرتی ہے ؟ ٹائپ میں چھونے (Touch) کے

طریقے کو کیوں ترجیح دی جاتی ہے ۔ فٹ بال یا کرکٹ کھیلتے وقت کون سے پٹھے سرگرم کار ہوتے ہیں اور ان کی کارکردگی کو کیسے بڑھایا جا سکتا ہے ؟ القصہ ہمیں اس وقت تک اسباب سمجھ میں نہیں آ سکتے جب تک ہمیں اس امر کا علم نہ ہو جائے کہ تأثرات کیسے نمودار ہوتے ہیں اور کس طرح کردار کو کنٹرول کرتے ہیں ۔

۲- پرانی نفسیات میں شعور اور اس کے تجزیے پر بہت زور دیا جاتا تھا ۔ شعور کا تجزیہ کرتے وقت آخروی عناصر تحسسات نکلتے ہیں ۔ خواہ کسی شے کا ادراک کیا جائے یا کسی واقعہ کو از سر نو یاد کیا جائے، یا کسی مسئلہ کے متعلق غور و فکر کیا جائے یا کوئی ہیجانی کیفیت طاری ہو ان کی تہہ میں رنگ، ذائقہ، آواز، دباؤ، کھچاوٹ جیسے تحسسات نکلیں گے ۔ مطالعۂ باطن اس امر کی تصدیق کرتا ہے ۔ کوئی شخص کوکا کولا پینا چاہتا ہے تو دیکھے گا کہ آیا وہ صحیح طور پر میٹھا اور ترش ہے یا وہ کھانا چکھتا ہے تاکہ نمک اور مرچ کا اندازہ ہو سکے یا وہ مری جاتا ہے تاکہ جسم کو ٹھنڈک حاصل ہو اور آنکھوں کو طراوت پہنچے وغیرہ وغیرہ ۔ پس جب مطالعۂ باطن کی رو سے کسی شعوری کیفیت کا تجزیہ کریں تو آخری عنصر جس کے بعد تجزیہ نہ ہو سکے گا تحسسات نکلیں گے ۔

۳- تحسسات کے سلسلے میں بڑا مفصل کام ہو چکا ہے - عالمی جنگوں میں فوجیوں کو کئی قسم کی مشکلات پیش آئیں ان کا مطالعہ کرتے وقت ماہر نفسیات کو تحسسات کی اہمیت کا احساس ہوا ۔ پس تحسسات کو اچھی طرح سے سمجھنا ضروری ہو گیا ۔ نفسیات کا مطالعہ تحسسات کے بغیر ادھورا رہ جائے گا ۔

تحسسات کی قسمیں (Kinds of Sensations) :

مہیجات	آخذات Recepters	اقسام
۱- ماحول میں توانائی کا فرق	خارجی اعضائے تحسسات (Extracepters)	
روشنی	آنکھ میں	باصرہ
آواز	کان میں	سامعہ
گرمی سردی	جلد میں	لامسہ
دباؤ	جلد میں	لامسہ
نقصان دہ حالات	جلد میں	لامسہ
کیمیائی	ناک میں	شامہ
کیمیائی	زبان میں	ذائقہ
۲- عضویہ کی حالت اور پوزیشن میں تبدیلیاں	عضوی اعضائے تحسسات (Proprioceptors)	
جزوی	پٹھوں ، رباط (Tendons) اور جوڑوں میں	عضلی
کلی	کان میں سمعی نالی اور دھلیز (Vestibule) میں	سکونی (static)
۳- عام عضویاتی حالت خصوصاً ادرک کی نالی اور دیگر احشا کا خالی ہونا یا پھیلاؤ	اندرونی اعضائے تحسسات (Introceptors) خوراک کی نالی اور دیگر بافتوں (Tissue) میں	حشوی

اس تقسیم کو مکمل نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ ہمیں تیسری قسم کے محسسات کے متعلق کچھ زیادہ علم نہیں۔کان اور آنکھ کے تأثرات کا مطالعہ کرنا زیادہ آسان ہے بہ نسبت ان تأثرات کے جو باطن کے اندرونی حصہ میں ظاہر ہوں ۔

علاوہ ازیں یہ بھی یاد رہے کہ جن مہیجات کا ذکر کیا گیا ہے ان کے علاوہ اور مہیجات بھی آخذات کو متأثر کر سکتے ہیں ۔ مثلاً آنکھ کے لیے روشنی کو مہیج قرار دیا گیا ہے لیکن اگر آنکھ میں انگلی لگ جائے تو یہ مہیج بھی روشنی جیسا کام کرے گا ۔ اگر آنکھ ، کان ، اور جلد کو بجلی سے متأثر کیا جائے تو ہمیں ، سننے ، ذائقے اور چھونے کے محسسات آئیں گے ۔ لیکن یاد رہے کہ جن ہیجانات کا ذکر نقشے میں کیا گیا ہے عام طور پر ان آخذات کے لیے یہی ہیجانات ہیں اسی لیے ان کو مکتفی ہیجانات (Adequate Stimulus) کہا جاتا ہے ۔ جو محسس کسی اعضائے حس سے پیدا ہوتا ہے قطع نظر اس امر کے کہ کس قسم کا مہیج اسے پیدا کر رہا ہے وہ اس حس کے لیے مخصوص ہے۔ یہاں پر ہم ملر (Muller) اور ہیلم ہوز (Helmhotz) کا نظریہ تسلیم کر رہے ہیں ۔ اس نظریہ کو اعصاب کی مخصوص توانائی (Specific Energy of Nerves) کا نظریہ کہتے ہیں ۔

مہیج تب محسوس ہوتا ہے جب وہ ماحول سے ذرا مختلف ہو۔ مہیج کو ماحول سے ضرور مختلف ہونا چاہیے مثلاً وہ آواز کان کو متأثر کرے گی جو بہ نسبت ان آوازوں کے ، جو ساتھ آ رہی ہوں یا پہلے ہو چکی ہوں ، ذرا زیادہ اونچی یا نیچی ہو یا زیادہ شدید یا نرم ہو ۔ اسی طرح وہ شے دیکھی جائے گی جو اپنے گرد و پیش اور پس منظر سے ذرا مختلف ہو ۔ اس اصول کا الٹ جنگی جہازوں کو چھپانے میں اور بعض جانوروں کے رنگوں میں ملے گا ۔ جہازوں کو دشمن سے چھپانے کے لیے اس طرح ڈھانپا جاتا ہے کہ ان کا رنگ بالکل ماحول سے مل جاتا ہے

اور دور سے جہاز صرف ماحول کا حصہ دکھائی دیتا ہے ۔ اسی طرح سائبیریا کا ریچھ سفید رنگ کا اور صحرا کا ریچھ بھورے رنگ کا ہوتا ہے۔ سائبیریا کا ریچھ برف میں بیٹھا ہوا برف کا تودا دکھائی دے گا اور صحرا کا ریچھ مٹی پر بیٹھا ہوا مٹی کا ڈھیر نظر آئے گا اور اپنے ماحول کے رنگ سے اس مطابقت کی بدولت دونوں ریچھ دشمن کی دستبرد سے بچ جائیں گے ۔

ہر مہیج میں حسی تطبیق (Sensory Adaptaion) پائی جاتی ہے ۔ کسی دوآور اعصاب کو لگاتار متأثر کرنے کے بعد مہیج اپنا اثر کھو بیٹھتا ہے حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آتا ہے جب مہیج بالکل محسوس نہیں ہوتا ۔ یہ تقریباً ہر حس کے لیے صحیح ہے ۔ خواہ سونگھنے کو لیں یا ٹمپریچر یا درد کو ' ان کا اثر بتدریج زائل ہو جاتا ہے ۔ سائنس کی لیبارٹری میں جائیں طرح طرح کی بوئیں آئیں گی لیکن اگر وہاں ٹھہرے رہیں تو کچھ عرصہ بعد ان کا اثر گھٹ جائے گا اور پھر بالکل ہی مٹ جائے گا ۔ درد کا بھی یہی حال ہے ۔ ان سے اگر انسان خو گر ہو جائے تو ان کا احساس جاتا رہتا ہے ۔

محسسات کی اقسام سے (جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے) یہ گمان ہوتا ہے کہ ہر حس علیحدہ اور خود مختار ہے ۔ اور یہ ہے بھی کسی حد تک صحیح ۔ لیکن اس امر کا ثبوت بھی موجود ہے کہ حسیں آپس میں مل جل جاتی ہیں ۔ مثلاً گانے کو رنگین پھیکا یا کڑوا اور احساسات کو مزیدار یا بے مزہ کہا جاتا ہے ۔ بعض اوقات آواز کی مختلف ٹھاپوں کو رنگدار دیکھا جاتا ہے ایسے سننے کو رنگدار سامعہ (Coloured hearing) کہتے ہیں ۔ مثلاً بیان کیا جاتا ہے کہ ایک طالب علم کو انسانی آوازیں رنگدار لگتی تھیں جتنی ٹھاپ اونچی ہوتی تھی اتنا ہی رنگ زیادہ ہوتا تھا ۔ ایک اور طالب علم کے ذہن میں ہر کیمیائی نام ذائقے سے وابستہ تھا ۔ اس سلسلے میں کچھ تجربات ہوئے ہیں یہ تجربات بتاتے ہیں

کہ اگر دیکھتے وقت معمول سیٹی سنیں یا ناک سے خوشبو سونگھیں تو بینائی بہتر ہو جاتی ہے اور اگر پٹی بندھی ہوئی آنکھوں سے منتشر روشنی گزاریں تو اس سے چھونے کی قوت بڑھ جاتی ہے -

تحسسات کی عام خصوصیات :

حسی خاصہ (Sensory Modality) : ہر اعضائے حس سے خاص قسم کا تحسس پیدا ہوتا ہے - کسی شے کے رنگ کا اس کی آواز سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا - دونوں چیزیں مختلف النوع ہیں - قدماء کے نزدیک حواس کی تعداد پانچ تھی - اسی لیے حواس خمسہ کا لفظ مشہور ہے - جدید تحقیق کی رو سے حواس کی تعداد اس سے تیس گنا ہے - لہذا تحسسات بھی کئی قسم کے ہوں گے - موٹے موٹے تحسسات بصارت، سمع، ذائقہ، شامہ، ٹمپریچر، چھونا، دباؤ، درد، حرکی، سکونی اور حشوی ہیں -

حسی خصوصیات (Sensory Attributes) تحسس کی ہر نوع میں کئی اختلافات معائنہ کیے جا سکتے ہیں - مثلاً روشنی کو لیجیے اس کے رنگ تابانی (Brightness) اور سیری (Saturation) میں فرق ہو گا - آوازوں کی ٹھاپ (Pitch) زمانیت (Duration) اور بلندی (Loudness) ایک جیسی نہیں ہوتی - ہر تحسس میں شدت یا کمیت (Intensity or Quantity) کی کمی بیشی ہوتی ہے - آواز بلند بھی ہو سکتی ہے پست بھی، ذائقہ تیز بھی ہو سکتا ہے پھیکا بھی، درد شدید بھی ہو سکتا ہے خفیف بھی -

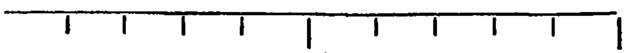
حسی خواص (Sensory Qualities) : اگر روشنی کی لہروں کو بدل دیں تو مختلف رنگ یعنی سرخ، نیلا، سبز، پیلا وغیرہ دکھائی دیں گے - یہ رنگ گو ایک ہی نوع سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ہیں الگ الگ - اسی طرح ذائقہ کڑوا، کھٹا، میٹھا یا نمکین ہو سکتا ہے - یہ

---

۱ - ملاحظہ ہو ڈیشیل کی Fundamentals of General Psychology صفحہ ۲۳۴ -

ذائقے بھی الگ الگ ہیں۔ ایک دوسرے میں تحلیل نہیں ہو سکتے
میں زمانیت اور امتداد (Extensity) کا فرق ہو سکتا ہے - زمانیۃ
مراد مہیج کی مدت ہے - مثلاً ذائقہ ایک منٹ کے لیے بھی ہو سکا
آدھ گھنٹے کے لیے بھی - امتداد سے مراد پھیلاؤ یا مکانی پہلو ہے -
دیوار کی سفیدی ، کاغذ کے ٹکڑے کی سفیدی کے مقابلے میں زیادہ
نظر آتی ہے - ایسے ہی سارے ہاتھ کا دباؤ انگلی کے دباؤ کی نسبت
وسیع محسوس ہوتا ہے -

حسی سلسلہ کا اصول (The Continuum Principle) : حسِ
بعد میں ظاہر کیا جاتا ہے - مثلاً روشنی کو لیجیے - اسے بہت د
سے لے کر بہت شوخ تک بعد میں دکھایا جا سکتا ہے - ایسے ہی
کو بھی بہت دھیمی سے لے کر بہت بلند تک ظاہر کیا جا سکتا ہے



بہت دھندلی　　　　اوسط درجہ　　　　بہت

رنگوں میں حسی سلسلہ کا اصول بعض اوقات ناکام ہو جاتا ہے۔ کہ
بصری لہروں کے بدلنے سے سرخ سے نارنگی رنگ اور نارنگی رنگ
پیلا رنگ پیدا ہو جاتا ہے -

دہلیز (Threshold) : جب کسی حس کو بعد میں دکھایا
تو پھر ہم اس کے متعلق یہ جاننا چاہتے ہیں کہ رد عمل پیدا
کے لیے مہیج کی کم سے کم کیا مقدار ہونی چاہیے اور مہیج کی تبد
اور محسسات کے گھٹنے بڑھنے میں کیا نسبت ہے -

مہیج کی تھوڑی سے تھوڑی مقدار ، جو رد عمل پیدا کرنے
کافی ہو ، مطلق دہلیز (Absolute Threshold) کہلاتی ہے - آنَ
کان کی مطلق دہلیزیں روشنی اور آواز ناپنے کی عمدہ ترین مشینو
کہیں زیادہ ہیں - ہمارے سونگھنے کی طاقت اتنی تیز ہے کہ اگر
کی بوند کمرے میں گر جائے تو اس کا احساس ہو جاتا ہے - اسی

سڑک پر کہیں گندگی پڑی ہو تو دور سے اس کی بو آ جاتی ہے - اتنی تیز مشین ابھی تک نہیں بنائی گئی -

جیسے روشنی یا آواز کے بعد میں نچلی حد ہے جسے مطلق دھلیز کہا گیا ہے - ویسے ہی اوپر والی حد بھی ہے ، جسے حد انتہا (Acme) کہا جاتا ہے - انسان کے سننے کی حد انتہا تیس ہزار ارتعاش (Vibrations) ہے - شکاری جانتے ہیں کہ انسانوں کی نسبت کتے بہت دور سے سیٹی کی آواز سن لیتے ہیں - چمگادڑ پچاس ہزار فی سیکنڈ تک آواز کی تعدد (Frequency) سن لیتا ہے - حد انتہا آسانی سے نہیں ناپی جا سکتی کیونکہ ہر زور دار مہیج درد پیدا کرتا ہے - لہذا مہیج کی شدت کو بہت زیادہ بڑھایا نہیں جا سکتا -

تحسس ناپنے کا ایک بہترین طریقہ اختلافی دھلیز (Difference Threshold) ہے - مثلاً کسی شخص کے متعلق یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ ٹھاپ کا فرق معلوم کرنے میں اس کا کان کس قدر تیز ہے - بعض لوگوں کے خصوصاً گویوں کے کان بڑے تیز ہوتے ہیں بعضوں کے کم -

تحسسات میں فرق معلوم کرنے کا مسئلہ ابتدا سے ہی دلچسپی کا مرکز بنا ہوا ہے - شروع میں تحسسات کی پیمائش کے لیے نفسی طبعی طریقے (Psycho-physical Methods) استعمال ہوتے تھے - مثلاً اگر کسی کو عینک کی ضرورت ہو اور جیب میں اتنے پیسے نہ ہوں کہ سند یافتہ ماہر چشم کی فیس ادا کر سکے تو وہ سیدھا چشمے بیچنے والے کی دکان پر چلا جائے گا - دکان دار کے پاس چارٹ ہوتا ہے جس میں چھوٹے بڑے الفاظ مختلف قطاروں میں لکھے ہوئے ہیں - پہلے بڑے بڑے لفظوں کی قطاریں پھر چھوٹے چھوٹے لفظوں کی قطاریں آتی ہیں - عینک کے خریدار کو وہ چارٹ پڑھایا جاتا ہے - بڑے لفظوں سے شروع ہو کر جہاں تک وہ چارٹ پڑھ سکے گا وہ اس کی حد ہو گی - یہاں سے بینائی کے نقص کا پتہ چلتا ہے اور عینک اس کے مطابق لگا دی جاتی ہے -

روشنی کی مطلق دہلیز دریافت کرنے کے لیے سٹیگنر (ner
دو تجربے بیان کرتا ہے[1] ۔ اندھیرے کمرے میں ایک سوراخ سے
کی چوڑائی دو ملی میٹر ہوتی ہے ، روشنی گزاری جاتی ہے ۔ اس
کے سامنے معمول کو بٹھا دیا جاتا ہے ۔ آہستہ آہستہ روشنی کو
کیا جاتا ہے اور فرد کو بتانا ہوتا ہے کہ کب اسے روشنی د
نہیں دیتی ۔ جہاں وہ کہتا ہے کہ روشنی نظر آنی ختم ہو گئی
نشان لگایا لیا جاتا ہے ۔ یہ اس فرد کے لیے دہلیز ہے ۔ اس
الٹ طریقے سے بھی ناپا جا سکتا ہے ۔ اسی سوراخ میں سے ہلکی
سے شروع کریں ۔ اس کی مقدار بڑھاتے جائیں اور فرد سے پوچ
کب روشنی دکھائی دینے لگی ہے ۔ جہاں وہ ہاں کہہ دے ا
نشان لگا دیں ۔ یہ اس شخص کے لیے دہلیز ہوگی ۔ دونوں طریق
جو شمار (Score) حاصل ہو اس کی اوسط نکال لیں ۔ پہلا طریقہ گھٹ
(Descending) اور دوسرا بڑھنے والا (Ascending) ہے ۔

یہ دونوں طریقے اختلافی دہلیز معلوم کرنے میں استعمال ہو
ہمیں یہ بھی علم ہونا چاہیے کہ رد عمل کے لیے مہیج کی تھوڑ
تھوڑی مقدار کیا ہو سکتی ہے اور یہ بھی کہ کس قدر مہیج کی
کو محسوس کیا جا سکتا ہے ۔ اس مطلب کے لیے ہمیں معیاری
(Standard Stimulus) ڈھونڈنا ہوگا ۔ مثلاً موسیقی میں معیاری
۴۳۵ ڈی وی (435 D.V.) ہے ۔ مہیج ایسا لینا ہوگا جو معیاری
سے کم و پیش ہو سکے ۔ ٹھاپوں کا فرق معلوم کرنے کے لیے اید
لیے جاتے ہیں جن کا مقرر تعدد ۴۳۵ ڈی وی سے اوپر یا نیچ
چونکہ مہیجوں کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے اس لیے مہیجوں کو یکے بعد د
پیش کیا جاتا ہے ۔ یہاں پر گھٹنے اور بڑھنے والے دونوں طریقے
میں آئیں گے ۔ بڑھنے والے طریقے میں مہیج کو معیاری مہیج ے

۱۔ ملاحظہ ہو اس کی Psychology ، صفحہ ۱۳۰ ۔

کمزور ہونا ہوگا اور گھٹنے والے میں اس سے الٹ ۔ جس جگہ معمول کہہ دے کہ وہ ٹھاپ سن رہا ہے اور فرق کر رہا ہے وہاں نشان لگا دینا چاہیے ۔ پھر دونوں طریقوں کے شمار (Score) کی اوسط نکال لیں ۔ جس میں تھوڑی سے تھوڑی مہیج کی تبدیلی پر ٹھاپ کا فرق معلوم ہو جائے وہ اختلافی دھلیز ہے ۔

یہ تجربات کئی طرح مفید ہیں ۔ ان سے پتہ چل سکتا ہے کہ انسانی آنکھ کس قدر رنگ دیکھ سکتی ہے ۔ اگر ہر مختلف رنگ کے چھوٹے سے چھوٹے فرق کو جو محسوس کیا جا سکے لون (Hue) کہا جائے تو عکس شعاعی (Spectrum) میں ۱۵۶ الوان نظر آتے ہیں ۔ پہلے رنگ میں فرق جلد محسوس ہوتا ہے ۔ البتہ سرخ اور بنفشئی (violet) رنگوں کا فرق بمشکل سے دکھائی دیتا ہے ۔ رنگوں کی فیکٹریوں میں یہ معلومات بڑی کارآمد ثابت ہوتی ہیں ۔ اعصابی خرابیوں میں اختلافی دھلیزوں سے ڈاکٹر مرض کی تشخیص اور شدت معلوم کرتے ہیں ۔ اس کے علاوہ نفسیات کا ایک بڑا اصول اختلافی دھلیز پر مبنی ہے ۔ اس اصول کو ویبر (Weber) کا اصول کہتے ہیں ۔

ویبر کا قانون (Webers Law) : یہ اصول اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اکثر محسسات کے لیے جب اختلافی دھلیز کو مہیج کی شدت سے تقسیم کیا جائے تو نسبت نہیں بدلے گی ۔ حسابی طریقے پر اس کا فارمولا ہوگا :

$$\frac{\Delta S}{S} = C$$

Δ سے مراد اختلافی دھلیز ، یعنی کم سے کم مہیج ہے جو تحسس پیدا کرنے کے لیے ضروری ہو C سے مراد Constant یعنی مستقل حاصل تقسیم ہے ۔ فرض کیا کہ ایک سو موم بتیاں جل رہی ہیں اور ان کی روشنی میں فرق ڈالنے کے لیے ایک بتی درکار ہے (یعنی ایک بتی

سے کم پر فرق محسوس نہیں ہوتا اور ایک بتی پر ہونے لگتا ہے) تو پانچ سو بتی پر فرق ڈالنے کے لیے پانچ بتیوں کی ضرورت پڑے گی - یعنی ویبر کے اصول کے مطابق $\frac{1}{100}$ کی کسر ہر حالت میں صحیح رہے گی -

اس قانون کو ایک اور طریقے سے سمجھا جاتا ہے - فرض کیا کہ ہاتھ سے کسی چیز کا وزن بتانا ہے تو جتنا وزن زیادہ ہوگا اتنا ہی غلطیوں کا زیادہ امکان ہوگا - سیروں بوجھل وزن کا ہاتھ سے اندازہ کرتے وقت زیادہ غلطیاں ہوں گی بہ نسبت آدھ پاؤ کے - سیروں بوجھل وزن میں ایک دو سیر کا فرق ہو سکتا ہے لیکن پاؤ بھر وزن میں چھٹانک آدھ چھٹانک کا ہی فرق ہوگا - اسی طرح اگر ایک دو انچ لمبی لکیر کی لمبائی بتانی ہو تو فرق بہت تھوڑا ہوگا بہ نسبت اس کے کہ لکیر کئی فٹ لمبی ہو - ویبر کے اصول کی رو سے غلطی کی مقدار کا انحصار اشیا کی کمیت (Quantity) پر ہے - یعنی جتنی بڑی شے ہوگی اتنی ہی زیادہ غلطی اس کے متعلق ہوگی - مثلاً اچھے سے اچھا مشاہدہ کرنے والا بھی بیس فٹ لمبی چیز کو انچوں تک صحیح نہیں بتا سکے گا لیکن پندرہ سے بیس انچ لمبی چیز کو انچوں تک ٹھیک بتا سکے گا - لیکن غلطی کی کسر جو بڑی چیزوں میں ہوگی وہی چھوٹی میں رہے گی -

اوپر ہم نے کسر کا ذکر کیا ہے جو غیر متغیر ہے - یہ کسر ہر تحسس میں جدا جدا ہے - مثلاً بصری تابانی میں $\frac{1}{100}$ ہے اور سمعی بلندی میں $\frac{1}{5}$ -

ووڈورتھ کے خیال میں[1] ویبر کا قانون اونچی اور درمیانی مقداروں میں صحیح ثابت ہوتا ہے لیکن دھیمی مقداروں میں ناکام ہو جاتا ہے - یہ اعتراض ہر حس کے بارے میں صحیح ہے - لیکن اس نقص کے باوجود اس قانون کا عملی فائدہ بہت ہے - ہم دور سے دو اشخاص دیکھتے ہیں

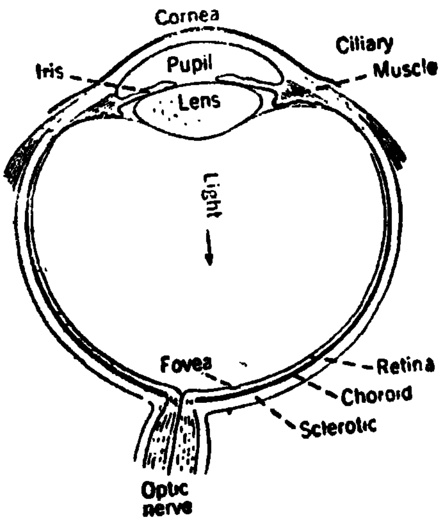
۱- ملاحظہ ہو اس کی Psychology ، صفحہ ۳۲۱ -

ایک لمبا ، ایک چھوٹا ، دوری کی وجہ سے دونوں اپنے قد کی نسبت چھوٹے نظر آتے ہیں - جوں جوں وہ قریب آتے ہیں اپنے اصلی قد میں نظر آنے لگتے ہیں - لیکن ان کا جو اختلافی فرق دوری پر تھا وہ اب بھی ہے - ویبر کے اصول کے مطابق یہ لوگ خواہ دور ہوں یا نزدیک وہی آدمی ہوں گے - اسی طرح دو آدمیوں کو مدھم روشنی میں دیکھیں پھر تیز روشنی میں ، ان دو آدمیوں کا مدھم روشنی میں اضافی فرق تیز روشنی میں بھی قائم رہے گا اور دونوں پہچانے جائیں گے -

۱- بصری تحسسات (Visual sensation) - ہماری آنکھ کی ساخت کیمرے سے ملتی جلتی ہے - یہاں پر پلیٹ (Plate) کی بجائے شبکیہ (Retina) ہے جو ہر تصویر کے بعد دوسری تصویر کے لیے خود بخود تیار ہو جاتا ہے - آنکھ کے سامنے جہاں سے روشنی داخل ہوتی ہے ، رنگین قزحیہ (Iris) موجود ہے اس کے درمیان جو سوراخ ہے اسے پتلی کہتے ہیں - آنکھ کے سامنے مڑا ہوا شفاف قرنیہ (Cornea) ایک زبردست عدسہ (Lens) ہے - پتلی کے عصب میں ایک اور عدسہ ہے جو مژگانی عضلات (Ciliary Muscles) سے ماسکہ (Focus) پر آ جاتا ہے یہاں شفاف آبی رطوبتیں ہیں جن سے روشنی گزر کر شبکیہ تک پہنچ جاتی ہے -

شبکیہ میں دو قسم کے خلیے ہیں ایک مستقیم (Rods) دوسرے مخروطی (Cones) - روشنی سے دونوں متاثر ہوتے ہیں - پتلی کے پیچھے شبکیہ میں ایک چھوٹا سا نشیب ہے جسے قعر (Fovea) کہا جاتا ہے یہ صاف اور بین بصارت کا مرکز ہے (Centre of clear vision) - کسی چیز کو صاف دیکھنے کے لیے آنکھ کو اس طرح گھماتے ہیں کہ وہ چیز قعر کے سامنے آ جائے - قعر میں صرف مخروطی خلیے پائے جاتے ہیں - اس سے باہر مستقیم اور مخروطی خلیے ملے جلے ہیں - جوں جوں قعر سے پرے جاتے ہیں مستقیم خلیوں کی

کثرت ہوتی جاتی ہے حتیٰ کہ شبکیہ کے کناروں پر صرف مستقیم خلیے رہ جاتے ہیں۔



آنکھ کی بناوٹ

آنکھوں کی حرکات:

یہ دو قسم کی ہیں۔ جب کسی میدان، وادی یا گزرگاہ کو دیکھتے ہیں تو دونوں آنکھیں دو گھوڑوں کی مانند، جو ایک دوسرے کے ساتھ آگے جا رہے ہوں، اکٹھی مل کر کام کرتی ہیں۔ اس حرکت کو آنکھوں کی مزدوج (Conjugate) حرکت کہا جاتا ہے۔ لیکن جب آنکھ دور سے نزدیک کسی چیز پر لائی جائے تو دونوں آنکھیں ایک ہی نقطہ پر شدق (Converge) جاتی ہیں تاکہ وہ شے دونوں آنکھوں کے قعر کے سامنے آ جائے۔

مزدوج حرکت دو قسم کی ہے یا تو آنکھ جست (Saccadic movement) لگائے گی یا تعاقب (Pursuit movement) کرے گی۔ مثلاً

اگر کوئی شخص سبزہ زار میں کھڑا ہو نظارے سے مستفید ہو رہا ہو تو اس کی آنکھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ پھلانگیں گی ۔ وہ ایک چیز دیکھے گا پھر دوسری پھر تیسری علیٰ ہذالقیاس ۔ پڑھنے میں بھی آنکھ ایک جگہ ٹکتی ہے پھر جست لگا کر دوسری جگہ پہنچ جاتی ہے ۔ جست کا وقفہ ایک سیکنڈ کا تیسواں یا پچاسواں حصہ ہوتا ہے ۔ کتاب کی ایک سطر پر وقت کا دسواں حصہ جست لگانے میں صرف ہوتا ہے ۔ آنکھ کی تعاقبی حرکات (Pursuit movements) کا پتہ چلتی پھرتی اشیا کے دیکھنے سے ہوتا ہے ۔ مثلاً کوئی ستارہ ٹوٹے تو ہماری آنکھ اس کا پیچھا کرتی ہے ۔ بچے جب کوئی اڑتی شے دیکھتے ہیں تو لیٹے لیٹے آنکھ سے اس کا تعاقب کرتے ہیں ۔

بصری تطبیق (Visual adaptation) : تیز یا مدہم روشنی میں آنکھ کی پتلی سکڑ جاتی ہے یا پھیل جاتی ہے ۔ جالدار پردے کو بھی روشنی کی مقدار کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا پڑتا ہے ۔ مثلاً اگر آپ تاریک کمرے میں جائیں تو پہلے ہر چیز تاریک دکھائی دے گی ۔ پھر آہستہ آہستہ چیزیں نظر آئیں گی ۔ شبکیہ نے تاریکی سے تطبیق پیدا کر لی ہے ۔ اب تاریکی سے روشنی میں آئیے کچھ عرصے تک کوئی چیز دکھائی نہ دے گی ۔ آہستہ آہستہ آنکھ روشنی سے مانوس ہو جاتی ہے اور پھر سب کچھ دکھائی دینے لگتا ہے ۔

تاریکی سے تطابق حاصل کرنے پر اندھیرے میں کوئی رنگ دکھائی نہیں دے گا صرف کالا اور سفید نظر آئے گا ۔ ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ آنکھ کا قعر تاریکی سے تطابق پیدا نہیں کر سکتا ۔ اس میں صرف مخروطی خلیے ہیں مستقیم کوئی بھی نہیں ۔ ان دونوں حقائق سے پتہ چلتا ہے کہ تاریکی اور دھندلکے میں صرف مستقیم خلیے کام کرتے ہیں اور یہ خلیے صرف کالا اور سفید دیکھ سکتے ہیں رنگوں کو نہیں دیکھ سکتے ۔

ہر انسان کا بصری تطابق ایک جیسا نہیں ۔ جن لوگوں کی خ
میں وٹامن اے کی کمی ہوتی ہے ان کا شبکیہ تاریکی سے تا
پیدا نہیں کر سکتا ۔ ایسے لوگوں کو رات کے وقت کچھ دکھائی
دیتا ۔ تجربے کے طور پر ایک نوجوان کو ۲۳ روز تک ایسی خو
دی گئی جس میں وٹامن اے نہیں تھا ۔ یعنی اسے دودھ ، مکھن یا
سے بنی ہوئی چیزیں ، سبزیاں ، جگر ، گردے اور ایسی دوسری چیز
جن میں وٹامن اے ہو کھانے کے لیے نہیں دی گئیں ۔ نتیجہ یہ ہوا
اس کی تاریکی سے تطبیق کم ہو گئی ۔ مخروطی خلیوں کی طاقت $\frac{1}{3}$ ا
مستقیم کی $\frac{1}{9}$ رہ گئی ۔ بعد میں اسے کثرت سے وٹامن اے کھلایا
اور بصری تطبیق جلد ہی معمول پر آ گئی ۔

بصری تحسسات (Visual sensation) : ان کے متعلق مندرجہ ذیل
امور قابل غور ہیں ۔

۱۔ بصری تحسسات کے ابعاد (Dimensions of visual sensation)
بصری مہیجات کا آپس میں تین طرح کا فرق ہو سکتا ہے ۔

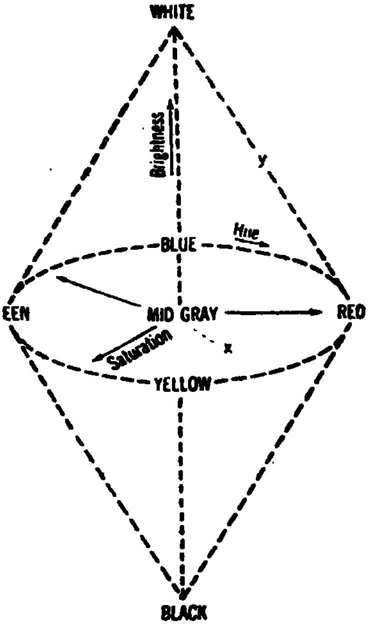
(۱) روشنی کی لہروں کی لمبائی میں (Wavelength)

(۲) توانائی میں (Energy)

(۳) آمیزش میں (Mixture)

اگر توانائی کا فرق ہو تو بصری تحسسات کا بعد چمک (brilliance)
کی بنیاد پر بنے گا ۔ یہ بعد مکمل تاریکی سے مکمل روشنی کی طرف
جائے گا ۔ اگر لہروں کی لمبائی میں فرق ہو تو الوان (hucs) پیدا
ہوں گے ، یہ سلسلہ سرخ سے شروع ہو کر پیلے اور عکس شعاعی
(spectrum) کے دیگر رنگوں میں سے ہوتے ہوئے بنفشہ (violet)

۱۔ ملاحظہ ہو ووڈورتھ کی Psychology ، صفحہ ۵۳۸ ۔



تک پہنچ جائے گا اور پھر اودے رنگ (purple) سے گزر کر سرخ تک واپس آ جائے گا۔ اس طرح ایک چکر بن جاتا ہے۔ اگر آمیزش کی بعد ہو تو سیری (saturation) کو بنیاد بنانا پڑے گا۔ جتنی زیادہ آمیزش ہوگی اتنی ہی کم سیری ہوگی۔ خالص پورا رنگ بہ نسبت پھیکے اور ہلکے رنگ کے زیادہ سیر ہوگا۔ ضروری نہیں کہ ہر سیر رنگ زیادہ شوخ ہو یا ہر زیادہ شوخ رنگ سیر ہو۔ سیر رنگ میں تعدد (frequency) کے لحاظ کے ارتعاش (vibrations) ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں۔ غیر سیر رنگ میں یہ ارتعاش مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً روشنی جس میں فی سیکنڈ ۴۷۲ ٹریلیون (trillion) ہم جنس ارتعاش ہوں سیر رنگ کہلائے گی لیکن اگر اس میں اور قسم کے ارتعاش بھی مل جائیں تو غیر سیر رنگ ہو جائے گی۔ ان تینوں ابعاد کو مندرجہ بالا شکل میں دکھایا گیا ہے۔

اس نقشہ میں الوان کو محیط کے اوپر دائرہ میں دکھایا گیا ہے۔ سیری کو نصف قطروں اور تابانی کو شکل کے اوپر اور نیچے حدود پر۔

۲۔ آمیزش رنگ (Colour mixing) : اوپر کہا گیا ہے کہ الوان کا انحصار روشنی کی طول موج پر ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہر طول موج کے رد عمل سے لون پیدا ہوتا ہے۔ لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے

کہ لون کو اس کی اپنی طول موج کے علاوہ دیگر لہروں کی آمیزش سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ۶۵۰ کی طول موج سے نارنگی رنگ ملتا ہے لیکن یہی رنگ ۷۰۰ اور ۶۰۰ کی طول امواج کی آمیزش سے بھی پیدا کیا جا سکتا ہے یعنی اگر سرخ اور پیلے رنگ کو ملا دیا جائے تو نارنگی رنگ بن جاتا ہے۔

یہاں پر یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ جن چیزوں کو ملایا جاتا ہے وہ رنگ نہیں جو بازار سے خریدے جا سکتے ہیں بلکہ طول موج ہیں۔ روشنی کی لہروں کو آنکھ یا سکرین کے پردے پر پھینکا جاتا ہے ان کی آمیزش سے نیا رنگ معرض ظہور میں آتا ہے۔ رنگ کی چرخی (colour wheel) سے بھی آمیزش پر تجربے ہوتے ہیں۔ یہ چرخی بہت جلد جلد رنگوں کو یکے بعد دیگرے آنکھ پر پھینکتی ہے۔ روشنی کی لہریں گڈ مڈ ہو کر اپنا اپنا رنگ تو کھو بیٹھتی ہیں اور ایک نئے رنگ کی تخلیق کرتی ہیں۔ سفید اور کالے، سرخ اور پیلے، اور سبز اور نیلے کو ملا کر کئی قسم کے رنگ حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن اگر نیلے اور پیلے کو ملا دیا جائے یا سرخ اور سبز کو تو کوئی رنگ نظر نہیں آئے گا صرف تابانی رہ جائے گی اور وہ بھی سفید یا مٹیالی (grey) سی۔ ایسے دو رنگ جن کی آمیزش سے سفید یا مٹیالی تابانی بنے متمم رنگ (complementary colours) کہلاتے ہیں۔ پیلا اور نیلا، اسی طرح سرخ اور نیلگوں سبز، اور سبز اور اودھا متمم رنگ ہیں۔ بعض رنگوں کے جوڑے معدوم جوڑے (disappearing colour pair) کہلاتے ہیں، مثلاً سبز اور سرخ یا پیلے اور نیلے کو اگر ملایا جائے تو رنگ غائب ہو جاتے ہیں اور سفید رنگ کا تحسس پیدا ہوتا ہے۔

ابتدائی (elementary) اصل (primary) اور نمایاں (salient) الوان:
الوان کی تعداد بے شمار ہے یوں ہر لون ابتدائی نظر آتا ہے کیونکہ اس میں کوئی اور رنگ دکھائی نہیں دیتا۔ مثلاً نارنگی کو دیکھیے اس

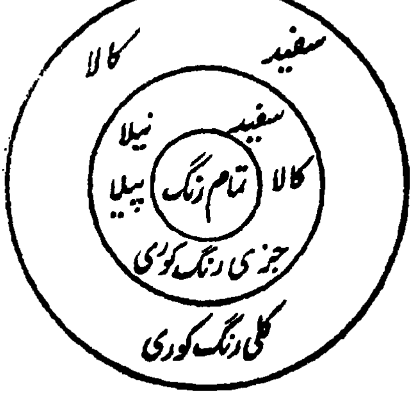
میں سرخ اور پیلے کی آمیزش ہے ۔ گو نارنگی میں سرخ اور پیلے رنگ کی جھلک ہے لیکن اپنی ذات میں نارنگی دوسرے رنگوں سے جدا اور نرالا رنگ رکھتی ہے ۔ اس لحاظ سے ہر رنگ کو ابتدائی کہا جا سکتا ہے لیکن کچھ رنگ بہت نمایاں اور اہم ہیں ۔ سفید اور کالے کو لیجیے یا سرخ ، پیلے ، سبز اور نیلے رنگ کو لیجیے ۔ یہ دوسروں کی نسبت بہت زیادہ اہم ہیں ۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ رنگ اصلی ہیں ، باقی سب رنگ ان کی ملاوٹ سے بنے ہیں ۔

آمیزش رنگ سے پتہ چلتا ہے کہ اصلی رنگ کی تعداد زیادہ نہیں ۔ کیونکہ تمام الوان جن میں سفید اور مٹیالا بھی شامل ہیں ، سرخ ، پیلے ، سبز اور نیلے رنگوں کی طول امواج کی آمیزش سے حاصل ہو جاتے ہیں ۔ پیلے رنگ کو بھی اصل نہیں کہنا چاہیے کیونکہ اسے بھی سرخ اور سبز کی ملاوٹ سے پیدا کیا جا سکتا ہے ۔ پس تمام رنگ سفید سمیت سرخ ، سبز اور پیلے کی آمیزش سے حاصل ہو جاتے ہیں اور انہی تین رنگوں کو اصلی کہنا چاہیے ۔

۴۔ **رنگ کوری** (Colour Blindness) : یہ دو قسم کی ہوتی ہے کلی (Total) اور جزوی (Partial) ۔ کلی رنگ کوری مستقیم خلیوں کی روئیت ہے ۔ ان خلیوں سے صرف سفید اور کالا نظر آتا ہے ۔ عکس شعاعی کا کوئی رنگ دکھائی نہیں دیتا ۔ جال دار پردوں کے بیرونی کونے جہاں مخروطی خلیے بہت کم پائے جاتے ہیں ، کلی رنگ کورے ہوتے ہیں ۔ بہت کم لوگ ایسے نکلیں گے جن کا سارا شبکیہ مخروطی خلیوں سے محروم ہو ۔ اگر کوئی ایسا آدمی مل جائے تو وہ دن کو بھی صرف سفید اور کالا ہی دیکھ سکے گا ۔

جزوی رنگ کوری میں تمام رنگ دکھائی نہیں دیتے ۔ اس کی کئی قسمیں ہیں لیکن عام قسم وہ ہے جس میں سرخ اور سبز رنگ کی پہچان نہیں رہتی ۔ عورتوں میں یہ نقص کم پایا جاتا ہے لیکن چھ سے

آٹھ فی صد مرد اس کمزوری کے شکار ہوتے ہیں۔ اس کمزوری
بیماری نہیں کہنا چاہیے کیونکہ یہ پیدائشی نقص ہے اور دوائیوں
ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ سرخ اور سبز میں تمیز نہیں کر سکتے
یا ان رنگوں کو بالکل نہیں دیکھ سکتے انہیں اندھا نہیں کہنا چا
کیونکہ سرخ اور سبز کی بجائے وہ کچھ اور رنگ دیکھتے ہیں۔
سفید، کالا، نیلا اور پیلا بدستور دیکھتے ہیں۔ سبز اور سرخ ان
ہلکا پیلا نظر آتا ہے۔ ایسے لوگ ٹریفک کے سگنل نہیں پہچان سک
گے، کپڑوں کا رنگ نہیں دیکھ سکیں گے کیونکہ سبز اور سرخ
تمیز نہیں کر سکتے۔



ہر آدمی کی آنکھ کا درمیانی حصہ جزئی رنگ کورا ہے۔ عی
سامنے حصہ سے سارے رنگ دکھائی دیتے ہیں اور آنکھ کے کونوں پ
صرف سفید اور کالا نظر آتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان صرف کالا، سفید
نیلا اور پیلا دکھائی دیتا ہے سبز اور سرخ نہیں دکھائی دیتا۔ ان حقائق

کو اوپر والی شکل میں دیکھیے ۔

یہ شکل شبکیہ کی ہے ۔ مرکز میں تمام رنگ دکھائی دیتے ہیں ۔ درمیانی حصہ جو جزئی رنگ کورا ہے وہاں سے صرف نیلا ، پیلا ، سفید اور کالا رنگ نظر آتا ہے بالکل بیرونی حصہ جو کلی رنگ کورا ہے صرف سفید اور کالے کا تحسس پیدا کرتا ہے ۔

ان حصوں کو بالکل الگ الگ نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ تیز خالص رنگ کو قعر سے پرے بھی دیکھا جا سکتا ہے ۔ اسی طرح تیز سرخ ، پیلے اور نیلے رنگ کو بھی آنکھ کے کونوں سے دیکھ سکتے ہیں ۔

۳۔ تضاد بصری (Visual contrast) : تیز روشنی کے بعد معمولی روشنی تاریک دکھائی دیتی ہے لیکن یہی معمولی روشنی تاریکی کے بعد تیز روشنی لگے گی ۔ کسی رنگ کو ٹکٹکی لگا کر دیکھیے اور پھر متمم رنگ کو دیکھیے تو متمم رنگ زیادہ شوخ نظر آئے گا ۔ اگر مٹیالے کاغذ کے دو ٹکڑے لیے جائیں اور ایک ٹکڑا کالے پس منظر پر اور دوسرا سفید پس منظر پر رکھا جائے تو کالے پس منظر والا ٹکڑا زیادہ شوخ دکھائی دے گا ۔ اس تضاد کو متواتر تضاد (Successive contrast) کہتے ہیں ۔

اب ہم وقت تضاد (Simultaneous Contrast) کو لیں ۔ اس کے متعلق ایک عجیب بات ہے ۔ اگر ایک رنگ شبکیہ کے محدود حصے کو متأثر کر رہا ہو تو یہی رنگ شبکیہ کے باقی حصے پر اپنے متمم جیسا رنگ چھوڑے گا ۔ اگر کوئی نیلی شے دیکھی جائے جس کے گردا گرد مٹیالی جھالر ہو تو جالدار پردے کا وہ حصہ جو مٹیالی جھالر سے متأثر ہوگا وہ نیلے کے متمم کا رنگ پکڑے گا ۔ لہٰذا مٹیالا رنگ پیلا سا رنگ نظر آئے گا ۔ اودے رنگ پر مٹیالا پیلا سبز لگے گا ۔ گہرے سبز پر معمولی مٹیالا شوخ شوخ دکھائی دے گا پیلے رنگ پر

لیلی لکیر شوخ نیلی نظر آئے گی ۔

۵۔ **بعد شبیہ (After image) :** مہیجات کے ختم ہونے کے بعد بھ
رد عمل کچھ دیر تک قائم رہتے ہیں ۔ یہ قریب قریب ہر حس کے ا
صحیح ہے ۔ کان سے بعد شبیہ نہیں پیدا ہوتا کیونکہ کان بہت جلد معمو
پر آ جاتا ہے ۔ سب سے زیادہ دلچسپ بصری بعد شبیہ ہیں ۔ اگر تیز بج
کے بلب کو کچھ دیر دیکھیں اور پھر یک لخت آنکھیں بند کر لیں
کچھ عرصہ تک روشنی دکھائی دے گی گو یہ روشنی اصل کے مقاب
میں بہت کمزور ہوگی ۔ یہاں پر چونکہ بعد شبیہ میں روشنی نظر آ
رہتی ہے اور پہلے بھی روشنی تھی ۔ یعنی بعد شبیہ اصلی مہیج کی مان
ہے اس کو مثبت بعد شبیہ (Positive After Image) کہتے ہیں ۔ ا
سفید اور کالی یا رنگ دار شے کو پندرہ سیکنڈ کے لیے دیکھیں اور پ
مثیالی شے کو تو بعد شبیہ الٹ دکھائی دے گی ۔ اس میں کالا
سفید کی جگہ لے گا اور سفید کالے کی اور ہر رنگ کا متمم نظر آئے گا
اس بعد شبیہ کو منفی بعد شبیہ (Negative After Image) کہتے ہیں
کیونکہ اس میں مہیج کے غائب ہونے پر بعد شبیہ اصلی حس کے ال
نظر آتی ہے ۔

تجربوں میں آنکھیں بند کرنے یا کالے پس منظر کو استعمال کر
سے منفی بعد شبیہ کو مثبت میں بدلا جاتا ہے پھر مثبت کو منفی م
اور پھر منفی کو مثبت میں بدلا جا سکتا ہے اور یہ کئی بار ہو سکتا ہے

۶۔ **بصری نقائص (Visual Defects) :**

(۱) اندھا پن ۔ اس کے پانچ اسباب ہو سکتے ہیں : ۱۔ آنکھ
ڈھیلے نکال دینا ۔ ۲۔ آنکھ کے عدسے (Lens) یا رطوبتو
کا گاڑھا ہو جانا ۔ ۳۔ شبکیہ کی تلفی ۔ ۴۔ شبکیہ سے دم

۱۔ ملاحظہ ہو Dashiell کی Fundamentals of General
Psychology ، صفحہ ۲۶۶ ۔

تک اعصابی شاہراہوں کی تلفی - ۵- ذہن میں بصری مراکز کی تباہی -

تباہی کے کئی اسباب ہیں حادثوں یا زخموں سے یا زہر اور بیماریوں سے آنکھ ، اس کے پردے ، اعصابی شاہراہیں اور بصری مراکز خراب ہو جاتے ہیں اور کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں - یہ نقصان عارضی یا مستقل ہو سکتا ہے اس کی پہلی صورت میں صحت کی امید کی جا سکتی ہے دوسری صورت میں اندھا پن ناقابل علاج ہے - درد شقیقہ (Migraine) سے عارضی اندھا پن پیدا ہو جاتا ہے -

اندھے پن کا کوئی سبب ہو اس سے اہم نفسیاتی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں - اندھا آدمی ایک تو خود روزی نہیں کما سکتا دوسرے جذباتی اور طبعی لحاظ سے اوروں کا محتاج ہو جاتا ہے - لوگوں سے رحم اور شفقت کی بھیک مانگتا ہے - یہ مقام اندھے اور سوسائٹی کے لیے نہایت پریشان کن ہے - اندھے کو خود اعتمادی نہیں کھو دینی چاہیے - وگرنہ وہ کئی ایک نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جائے گا -

(ب) ضعف البصری (Myopia) : اس کا سبب عدسہ کا زیادہ محدب ہو جانا ہے اس کی وجہ سے روشنی کا عکس شبکیہ تک نہیں پہنچتا - یا یہ سمجھیے کہ عدسہ ذرا دور پھیلتا ہے اس لیے عکس کا ماسکہ شبکیہ کی سطح کے سامنے آ جاتا ہے اور دھندلا پن پیدا ہو جاتا ہے - ضعف البصری کا مریض کاغذ کو آنکھ کے نزدیک رکھتا ہے تا کہ ماسکہ ٹھیک ہو - عینک سے یہ نقص دور ہو جاتا ہے - اس مرض کا علاج مجوف (Concave) شیشوں کا استعمال ہے -

(پ) دراز نظری (Farsightedness) : اس مرض میں عکس کا

ماسکہ شبکیہ کے پیچھے ہوتا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے
عدسہ میں لچک نہیں رہی اور نزدیک کی چیز کے لیے
نہیں سکتا ۔ دراز نظر دور کی چیزیں تو خوب دیکھ لیتا
لیکن نزدیک کی چیزیں دھندلی ہو جاتی ہیں ۔ اخبار پڑ
وقت اخبار کو دور رکھے گا تا کہ نزدیک چیز کو دور
لیے ۔ عینک سے یہ نقص بھی دور ہو جاتا ہے محدب (onvex
شیشوں کا استعمال چاہیے ۔

(ت) بصر الشیوخ (Presbyopia یا Oldsightedness) بڑھاپے
عدسے سخت ہو جاتے اور دراز نظری پیدا ہو جاتی ہے اس
علاج بھی عینک سے ممکن ہے ۔

عمر کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ پڑھتے وقت کت
کو آنکھ کے کتنے قریب رکھا جاتا ہے مثلاً کتاب
آنکھوں کے سامنے رکھیے اور نزدیک لاتے جائیں جب ا
مقام آ جائے کہ سب کچھ دھندلا ہو جائے اور کوئی
بھی پڑھا نہ جا سکے تو اس مقام کا فاصلہ آنکھ سے ناپ لی
اس سے عمر کا پتہ لگ جائے گا ۔

عمر	فاصلہ دھندلے مقام سے آنکھوں
۱۰	۳ انچ سے نیچے
۲۰	۴ "
۳۰	۵۰۵ "
۴۰	۵۰۸ "
۵۰	۱۵۰۲۵ "
٦۰	۳۹ " یا اوپر

چالیس سال کے بعد بہت تبدیلی آ جاتی ہے یہاں عینک کا ز
شروع ہو جاتا ہے ۔

(ٹ) لاماسکیت (Astigmatism) : یہ آنکھوں کی ساخت کا نقص ہے اس کی وجہ سے سب شعاعیں شبکیہ پر ایک ہی مرکز پر نہیں آ سکتیں ۔ لہٰذا اشیا کا بعض حصہ تو ماسکہ میں ہوگا اور بعض حصہ دھندلا ۔

(ث) دوہری بصارت (Double Vision) : بصری عضلات میں توازن قائم نہیں رہتا ۔ لہٰذا ایک ہی شے کے مختلف عکس دماغ تک پہنچ جاتے ہیں اور مریض ایک ہی شے کو دوہرا دیکھتا ہے ۔ اس مرض کا سبب صرف عضلات کی کمزوری ہی نہیں بلکہ شراب بھی ہو سکتی ہے اور زہریلی چیزوں کا استعمال بھی ۔ اس کا علاج زہر کو دور کرنا ہے اور چند ایک بصری ورزشیں ۔

(ج) تاریک نقطہ (Scotoma) : یوں تو تاریک نقطہ ہر انسان کی آنکھ میں موجود ہے ۔ لیکن عام طور پر اس کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ یہ کوئی مشکل پیدا نہیں کرتا ۔ لیکن بعض دفعہ زیادہ تمبا کو نوشی ، شراب نوشی یا تیز روشنی میں رہنے سے تاریک نقطے مستقل یا عارضی طور پر پیدا ہو جاتے ہیں اور بینائی پر بہت برا اثر ڈالتے ہیں ۔ درد شقیقہ (Migraine) میں یہ تکلیف محسوس کی جاتی ہے ۔ اس میں شبکیہ خراب ہو سکتا ہے یا بصری رقبے یا ذہن میں کوئی خرابی ہو سکتی ہے ۔

(چ) سرنگ بصارت (Tunnel Vision) : اس بیماری میں بصارت کا رقبہ تنگ ہو جاتا ہے ۔ مریض ایسے دیکھتا ہے جیسے نالی یا سرنگ سے دیکھ رہا ہو ۔ اس کی وجہ سے مریض کو سر اور آنکھوں کی حرکتیں بہت زیادہ کرنی پڑتی ہیں تا کہ ماحول کے مختلف حصے بصارت کے رقبے میں آ جائیں ۔

کبھی یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ نقص اختناق الرحم (Hysteria)

سے پیدا ہوتا ہے لیکن اب پتہ چلتا ہے کہ اس کی کئی وجوہات ہیں
چند ایک وجوہات وہی ہیں جو تاریک نقطے کو پیدا کرتی ہیں ۔

سمعی تحسسات (Auditory Sensations) :

ہوا کے مجتمع اور منتشر سالمات (Molecules) کی سلسلہ وار لہر
سماعت کے لیے مہیج کا کام دیتی ہیں ۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے ا
سارنگی کو دیکھیے ۔ اگر سارنگی کی تاروں کو چھیڑا جائے تو
تھرتھراتی ہیں یا آگے پیچھے حرکت کرتی ہیں ۔ جب یہ تار ایک سم
جاتی ہے تو ہوائی سالمات کو اپنے سامنے اکٹھے کرکے انہیں ٹھو
لگاتی ہے اور آگے کو روانہ کر دیتی ہے ۔ جب تار دوسری طرف
ہے تو اپنے پیچھے ایک طرح کا خلا چھوڑ جاتی ہے کیونکہ اس م
بہت تھوڑے سالمات رہ جاتے ہیں ۔ یہ سالمے بھی حرکت میں ہوتے ہ
اور مجتمع سالمات کے پیچھے اپنی لہریں چھوڑتے ہیں ۔ ہوا سے بھی سالم
تھرتھراتی تاروں کے پیچھے آتے ہیں اور جب تار دوبارہ اصلی مقام
پہنچ کر جنبش میں آتی ہے تو ایک ہوائی دباؤ (Compression)
لہر اٹھتی ہے ۔ یہ لہریں اوپر نیچے نہیں بلکہ پھیلتی چلی جاتی ہیں
کان میں آوازیں بھی اسی طرح پیدا ہوتی ہیں ۔

اب پیانو لیں اس کی لمبی اور بھاری تاروں سے مدھم سریں نک
ہیں ۔ یہ تاریں ایک سیکنڈ میں بتیس دفعہ آگے پیچھے حرکت کرتی ہیں
مدھم سروں میں ایک ہوائی دباؤ اور دوسرے ہوائی دباؤ کی لہروں م
پینتیس فٹ کا فاصلہ ہوتا ہے ۔ جس قدر مجتمع لہروں اور پھیلاؤ و
لہروں میں زیادہ تضاد ہوگا اسی قدر آواز شدید اور بلند ہوگی ۔

جب آواز ساز کے اوپر سنتے ہیں تو صرف اس کی ٹھاپ اور بلند
کا احساس نہیں ہوتا ، بلکہ اس کی خاصیت (Timbre) کا بھی پتہ چلتا ہے
مثلاً وائلن اور سارنگی پر ایک ہی سر بجائیں ان کی خاصیت الگ الگ ہو
شور (Noise) میں کوئی تسلسل نہیں ہوتا ۔ چھڑی کو زمی

میز اور کرسی پر ماریں ۔ ایک شور پیدا ہوگا ۔ اس میں نہ کوئی ٹھاپ ہے اور نہ کوئی ترنم یا تناسب ۔ غور سے سنیں تو شاید ٹھاپ نکل آئے کیونکہ ہر شور میں صوتی لہروں کا تعدد ہے جو ٹھاپ کی جان ہے ۔

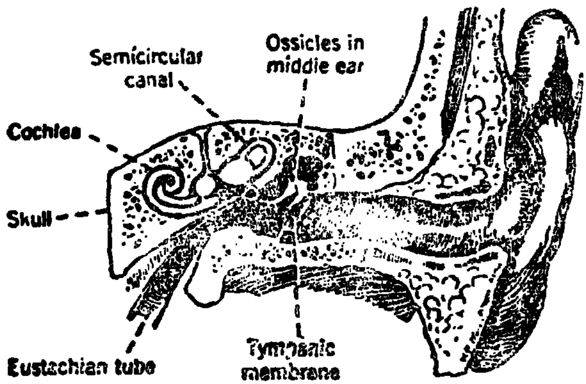
بنیادی سروں کے علاوہ زائد سرتیاں (Overtones) ہوتی ہیں ۔ ہر ساز کی اپنی زائد سرتیاں ہیں ۔ آواز کی خاصیت (Timbre) ان زائد سرتیوں اور آواز کے غیر مسلسل شور سے پیدا ہوتی ہے ۔ ہر ساز کی زائد سرتیوں کی تعداد اور بلندی علیحدہ ہوتی ہے ۔ اسی وجہ سے اس کی خاصیت الگ ہے ۔ لیکن کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو مختلف گویے ایک ہی ساز کو بجا رہے ہیں اور دونوں کی زائد سرتیوں میں فرق ہے ۔ وائلن کی صورت میں یہ خاص طور پر صحیح ہے کیونکہ انگلی کا دباؤ خواہ کتنا ہی ہلکا کیوں نہ ہو اور کمان کا استعمال بھی خواہ کیسا ہی ہو زائد سرتیاں پیدا کر دیتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ ہر گویے کی انگلی کا دباؤ یکساں نہ ہوگا اور نہ ہی وہ کمان سو فی صد ایک ہی نہج پر استعمال کر سکے گا ۔

کان کی ساخت : کان کے تین حصے ہوتے ہیں ۔

۱۔ بیرونی کان Outer ear ۔
۲۔ وسطی کان Middle ear ۔
۳۔ درونی کان Inner ear ۔

بیرونی کان کی شکل سیپی کی مانند ہے ۔ اس میں سمعی نالی ہے جو طبل گوش (Ear drum) تک پہنچتی ہے ۔ سمعی لہریں نالی سے گزر کر طبل گوش کو متاثر کرتی ہیں اور طبل تین ہڈیوں کو حرکت میں لاتا ہے ان ہڈیوں کو بناوٹ کی وجہ سے ہتھوڑا نما (Hammer Bone) ایرن نما (Anvil) اور رکاب نما (Stirrup Bone) ہڈیاں کہا جاتا ہے ۔ ہڈیوں کی حرکت سے درون کان کی بیضوی کھڑکی پر رکاب نما ہڈی کا دباؤ پڑتا ہے ۔ جس سے کھڑکی کبھی

اندر کبھی باہر آتی ہے - بیضوی کھڑکی کی حرکت سے ہوائی
قاقلیہ (Coachlea) میں داخل ہوتی ہیں - یہاں سے سمعی اعصاب
ذریعہ دماغ تک پہنچتی ہیں -



انسانی بول چال : انسانی بولی بڑی مرکب شے ہے اس
شور (Noise) اور سر (Tones) دونوں موجود ہیں - نغموں کا مر
اوتار صوت (Vocal cords) ہے - یہ ایک قسم کی جھلی ہے جو حنـ
میں پائی جاتی ہے - خود حنجرہ ہوا کی نالی کے بالائی سرے پر واقع
اور اوتار صوت کو حرکت میں لا کر آوازیں پیدا کرتا ہے - جو
پھیپھڑوں سے ہوا آوپر آئی ، اوتار صوت متأثر ہوئیں اور اونچے یا مد
نغمے پیدا ہوئے - لیکن جب یہ سریں گلے یا سر کے جوف (ivity
سے گزرتی ہیں تو کچھ نہ کچھ بدل جاتی ہیں - حروف صحیح اور حر
علت کو پیدا کرنے والے لب ، زبان ، دانت ، جبڑے اور تالو
مثلاً ب اور پ منہ سے ہوا نکلنے پر پیدا ہوتے ہیں اور س اور ژ جـ
الفاظ جب آواز ، زبان اور دانتوں سے نکلے -

الفاظ کو سمجھنا : جنگ کے دنوں میں اس امر پر اکثر تجربے ہوئے ہیں کہ کون سے الفاظ زیادہ سے زیادہ سمجھے جاتے ہیں۔ کوئی لفظ بھی ایسا نہیں پایا گیا جو سو فی صد سب کی سمجھ میں آ سکے ۔ لیکن کچھ لفظ ۹٦ فی صد تک قابل فہم نکل آئے ہیں انگریزی زبان میں امریکی لوگوں کے لیے مندرجہ ذیل نو لفظوں کا عامۃ الناس کی سمجھ میں آنا دس سے نوے فی صد تک ہے ۔

Voil (وائل کا کپڑا) ۱۰%	Tower (قلعہ) ٦۰%
Bimbo (شراب) ۲۰%	Puppy (پلا) ۷۰%
Ranch (مویشی خانہ) ۳۰%	Equal (مساوی) ۸۰%
Creak (چرچراہٹ) ۴۰%	Agree (مان جانا) ۹۰%
Court (کچہری) ۵۰%	

ہماری اپنی زبان میں بھی کچھ ایسے الفاظ نکل آئیں گے جو زیادہ سے زیادہ سمجھے جاتے ہوں ۔ اس کو دریافت کرنے کا طریقہ بڑا آسان ہے ۔ ٹیلیفون کے اوپر الفاظ کی فہرست بولیے اور لوگوں سے کہیے کہ جو لفظ وہ سمجھ لیتے ہیں انھیں نوٹ کرتے جائیں ۔

حروف تہجی کے الفاظ کوڈ لفظوں کے طور پر فوج اور کاروباری اداروں میں استعمال ہوتے ہیں ۔ ان کے متعلق یہ معلوم کرنا ہوتا ہے کہ کون سے حروف صاف صاف سمجھ میں آتے ہیں ۔ تجربے سے پتہ چلتا ہے کہ بعض حروف ایک دوسرے سے گڈ مڈ ہو جاتے ہیں اور سمجھ میں نہیں آتے ۔ لیکن بعض حروف اس قسم کے ہیں کہ وہ صاف صاف سنائی دیتے ہیں اور سمجھے جاتے ہیں ۔ فوج کے پاس ایسے حروف کی فہرست ہے اور اسے صیغۂ راز میں رکھا جاتا ہے ۔

آواز کی ساخت : ہر انسان کی آواز دوسرے انسان سے مختلف ہے اور ایک ہی انسان کی آواز مختلف وقتوں میں بدلتی رہتی ہے ۔ آوازوں کی بنا پر ہم لوگوں کو اجڈ یا مہذب یا خوشگوار یا ناخوشگوار کہتے ہیں ۔ آوازوں سے ذہانت کا بھی پتہ چلتا ہے اور لوگوں کو ذہین یا بدھو بھی

آواز کی خاصیت پر کہا جاتا ہے ۔ سازوں کی طرح لوگوں کی آوازوں کی خاصیت بھی اپنی ہوتی ہے ۔ بعض آوازیں شیریں اور بھدی ہوئی ہوتی ہیں بعض پتلی اور کرخت اور بعض ناک سے نکلتی ہیں ۔ سازوں میں آواز کی خاصیت زائد سرتیوں سے پیدا ہوتی ہے ۔ لیکن انسانی آواز میں یہی چیز گلے اور سر کے جوف سے پیدا ہوتی ہے ۔

بولی کو ایک حد تک سدھارا جاتا ہے اور آواز کی خاصیت بڑھ سکتی ہے ۔

بہرہ پن (Deafness) : اندھے پن کی طرح بہرہ پن بھی زندگی میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ جس ڈاکٹر کی سماعت ناقص ہوگی وہ مریض کے دل کی دھڑکن سٹیتھوسکوپ(Stethoscope)سے ٹھیک طور پر نہیں سن سکے گا اس سلسلے میں صرف ایک استثنیٰ ہے۔ اونچا سننے والے ڈرائیور ان ڈرائیوروں سے بہتر رہتے ہیں جن کی سماعت نارمل ہوتی ہے ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اونچا سننے والا ڈرائیور گاڑی کو زیادہ احتیاط سے چلائے گا ۔

عام طور پر بہرہ بڑے نقصان میں رہتا ہے۔ اندھے کی نسبت بہرہ گفتگو میں کم حصہ لے گا اور سننے میں خاصا زور لگائے گا اور صبر سے کام لے گا ۔ دوسروں کو بھی چلانا پڑے گا ، ہر بات کا اعادہ کرنا ہوگا تب بہرہ پوری بات سمجھ سکے گا ۔ مکمل بہرے پن میں نہ صرف بہرے سنتے ہی نہیں بلکہ بات کرنے کی قابلیت بھی کھو بیٹھتے ہیں ۔ اندھوں کی طرح بہروں کی بھی نفسیاتی مشکلات ہیں۔ ان کا تعلق بھی عامۃ الناس سے ٹوٹ جاتا ہے ۔ الفاظ سننے میں نہ صرف انہیں زیادہ جد و جہد کرنی پڑتی ہے بلکہ لوگوں کی بے صبری اور چڑچڑے پن کو بھی برداشت کرنا ہوتا ہے یہ صورت حال کئی نفسیاتی مسائل پیدا کر دیتی ہے ۔ بہرے آدمی کو کوشش کرنی چاہیے کہ اس کا رابطہ عام لوگوں سے قائم رہے ان کے چڑچڑے پن اور بے صبری سے نہ گھبرائے۔

مکمل بہرے دنیا میں بہت کم ہیں ۔ جزئی بہروں کے لیے صوتی آلے

نکل آتے ہیں جو آواز کو بڑھا دیتے ہیں ۔ اونچا سننے والے اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں ۔ بعض لوگ ان آلوں سے گریز کرتے ہیں ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر انھوں نے صوتی آلوں کو استعمال کرنا شروع کر دیا تو لوگ انھیں بہرہ کہیں گے ۔ لیکن اس خدشہ سے وہ ایک بڑی نعمت سے محروم ہو جاتے ہیں ۔ صوتی آلے عینک کی طرح ہیں ۔ ایک کا کام کان کی مدد کرنا ہے دوسرے کا آنکھ کی ۔

بہرہ پن کی شدت (Intensity of Deafness) : بعض لوگ ہلکی آوازیں نہیں سن سکتے اگرچہ دوسرے لوگ انھیں آسانی سے سن لیتے ہیں ۔ ایسے لوگوں کے سامنے چیخنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر یہ سنتے ہیں ۔ اس بہرے پن کو شدت کا بہرہ کہتے ہیں ۔ یہ نقص بعض پیشوں سے پیدا ہو جاتا ہے ۔ مثلاً ہوا باز اور شور و غل والے کارخانوں میں کام کرنے والے لوگ اونچی آوازیں نہیں سنتے ۔ ان کے پیشے اس قسم کے ہیں کہ اونچی آوازوں کو ان سنی کرنا پڑتا ہے ۔

سروں کا بہرہ پن (Tone Deafness) : بعض لوگ سروں میں تمیز نہیں کر سکتے ۔ وہ نہیں بتا سکتے کہ کون سی سر اونچی ہے کون سی نیچی ۔ انھیں سروں کا بہرہ پن ہے ۔ ایسے لوگ گویے نہیں بن سکتے ۔

یاد رہے کہ سب لوگوں میں سروں میں تمیز کرنے کی قابلیت یکساں نہیں ۔ کسی میں زیادہ کسی میں کم اور کسی میں اوسط درجے کی ہے ۔ اوسط درجے کا آدمی ٹھاپوں میں تربیت یافتہ موسیقار کی طرح تمیز نہیں کر سکتا ۔ تجربوں سے ثابت ہوتا ہے کہ تربیت اور پریکٹس کے باوجود لوگوں کی آہنگ میں تمیز کرنے کی صلاحیت ایک حد پر آ کر رک جاتی ہے ۔ اس حد کا انحصار کان کی ساخت پر ہے ۔

تحسسات جلد (Skin Sensation) : خشک ، گرم ، سرد ، کھجلی ، گدگدی وغیرہ جلد کی تحسسات ہیں ۔ ان میں سے کچھ بسیط اور کچھ مرکب ہیں ۔ بسیط اور سادہ تحسسات کا پتہ جلد کے تھوڑے سے حصے

کو کمزور مہیجات سے متاثر کرنے سے چل سکتا ہے۔ مثلاً باریک سکہ والی پنسل کو جلد کے مختلف مقامات پر لگائیں، بعض جگہ دباؤ کا احساس ہوگا بعض جگہ ٹھنڈک کا۔ جلد کے آدھ انچ کے رقبہ میں کئی سرد مقامات نکل آئیں گے۔ اگر قدرے گرم مہیج سے جلد کو متاثر کیا جائے تو کئی مقامات پر درد کا احساس ہوگا، یہ مقامات درد کے ہیں۔ درد اور دباؤ کے مقامات ٹمپریچر کے مقامات سے کہیں زیادہ ہیں اور گرم مقامات کے مقابلے میں سرد مقامات کہیں زیادہ ہیں۔

پس ابتدائی جلد کے تحسسات صرف چار ہیں یعنی دباؤ (Pressure) درد (Pain) گرمی (Warmth) اور سردی (Cold)۔ باقی جلد کے تحسسات ان ابتدائی تحسسات کی آمیزش سے بنتے ہیں۔

دباؤ: ہاتھ سے کام کرنے والوں کے لیے یہ حس بڑی کارآمد ہے۔ عورتیں انگلیوں کے دباؤ سے پتہ لگا لیتی ہیں کہ ہنڈیا پک گئی ہے یا نہیں۔ اندھوں کو بھی حس لامسہ سے بڑا فائدہ پہنچتا ہے۔ دباؤ ان کے لیے آنکھ کا بدل بن جاتا ہے انہیں بریل سسٹم (Braille System) سے پڑھنا سکھایا جاتا ہے اس سسٹم میں ابھرے ہوئے نقطے ہوتے ہیں جو حروف اور اوقاف (Punctuation) کو ظاہر کرتے ہیں۔ اندھے ان ابھرے ہوئے نقطوں سے پڑھتے ہیں۔ اندھے بچوں کو پنچنگ بورڈ (Punching Board) سے لکھنا سکھاتے ہیں یہ بورڈ بھی بریل سسٹم پر بنایا جاتا ہے۔ اس طریقے سے پڑھنا لکھنا ویسا آسان اور جلد نہیں ہو جاتا جیسا دیکھنے سے ہوتا ہے، لیکن پھر بھی اندھوں کے لیے بریل سسٹم نعمت غیر مترقبہ ہے۔ نارمل آدمی بھی دباؤ کی حس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مثلاً اگر انہیں ریشمی کپڑا ملاحظہ کرنا ہو تو وہ دیکھیں گے بھی اور ہاتھ سے بھی چھوئیں گے۔

ان پڑھ لوگوں کا خیال ہے کہ انگلیوں کی نوک کا ہر مقام دباؤ کی حس پیدا کرتا ہے۔ حقیقت میں ایسا نہیں جب انگلیوں سے کسی چیز

کو دباتے ہیں تو کافی رقبہ متاثر ہو جاتا ہے ۔ اس رقبہ میں دباؤ کے مقامات بھی ہیں اور دوسرے بھی ۔ لیکن دباؤ کے مقامات اس قدر قریب قریب ہیں کہ انسان یہی سمجھتا ہے کہ اس رقبہ میں سوائے دباؤ کے مقامات کے اور کوئی مقام نہیں ۔ مثلاً انگوٹھے کے ایک مربع سینٹی میٹر میں ۳۵ دباؤ کے مقامات ہیں ہاتھ کی پشت پر ۳۰ اور بازو پر ۱۰ فی مربع سینٹی میٹر ہیں ۔

درد : جسم کے کسی عضو کو زور سے متاثر کریں تو درد کا احساس ہوگا ۔ اگر کوئی چیز جسم کے کسی ایسے حصے کو گزند پہنچائے جہاں اعصاب ختم ہوتے ہوں یا کسی بافت کو نقصان دے تو فی الفور درد کے تحسسات پیدا ہوں گے ۔ درد کے مقامات دباؤ جیسے ہیں ۔ البتہ تعداد میں دباؤ کی نسبت کہیں زیادہ ہیں ۔ ایک مربع سینٹی میٹر میں پاؤں کے تلے پر ۵۰ ، انگوٹھے پر ۶۰ ، پلکوں پر ۱۶۰ اور گردن پر ۳۲۰ درد کے مقامات ہیں ۔ جب ڈاکٹر کو خون ٹسٹ کرنا ہوتا ہے تو وہ انگھوٹھے کی گدی سے خون نکال لیتا ہے کیونکہ اس حصے میں درد کے مقامات نسبتاً کم ہوتے ہیں ۔

جسم کے اندرونی حصہ کے مقابلے میں جسم کے بیرونی حصے پر درد کے مقامات بہت زیادہ ہیں ۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ عضویہ تکلیف دہ حوادث سے بچ جاتا ہے ۔ کیوں کہ جب کوئی مہیج جلد سے گزر کر جسم میں داخل ہو جائے تب درد کے مقامات کو متاثر کرنے سے کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا ۔ کیونکہ جو نقصان ہونا ہوتا ہے وہ تو ہو چکتا ہے ۔ لہٰذا جسم کے اوپر تو درد کے مقامات نہایت ضروری حیاتیاتی فریضہ ادا کرتے ہیں لیکن جسم کے اندر ان کی موجودگی چنداں ضروری نہیں ۔

یاد رہے کہ درد کا احساس بافتوں یا اعصاب کے نقصان پر ہی موقوف نہیں بلکہ جب بھی مہیج ضرورت سے زیادہ تیز ہو ، عضو کو درد ہوتا ہے ۔ مثلاً اگر آنکھ پر روشنی کی بوچھاڑ کر دی جائے تو

آنکھ کو درد ہوگا۔ ایسے ہی تیز اور اونچی آوازوں سے کان کے پردے پھٹ جاتے ہیں اور درد محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح بہت ٹھنڈا یا بہت گرم پانی جلد کو تکلیف دیتا ہے۔

درد کا احساس ایک قسم کا خطرے کا سگنل ہے۔ جب کوئی چیز عضویہ کو نقصان پہنچانا چاہتی ہے تو درد کا بگل بجتا ہے۔ عموماً عضویہ کو نقصان پہنچنے سے پہلے درد کا احساس ہوتا ہے۔ کچھ اس میں استثنیٰ بھی ہیں مثلاً دھوپ میں سونلانے (Sunburn) سے پہلے درد کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے جسم میں کوئی ایسی مشینری نہیں جو سورج کی بالائے بنفشہ شعاعوں (Ultra Violet Rays) کو وصول کر سکے۔

سرد اور گرم، دونوں کے لیے علیحدہ علیحدہ مقامات ہیں۔ جن مقامات سے سردی کا احساس ہوتا ہے وہاں سے گرمی کا نہیں ہوتا۔ اور جہاں سے گرمی کا احساس ہوتا ہے وہاں سے سردی کا احساس نہیں ہوتا۔ یوں جسم میں سردی کے مقامات گرمی کے مقامات سے بہت زیادہ ہیں۔ گرم مقامات جلد سے قدرے گرم مہیجات اور سرد مقامات جسم سے گرمی خارج ہونے پر متأثر ہوتے ہیں۔ جن چیزوں کا درجۂ حرارت جسم کے برابر ہوتا ہے وہ نہ گرم نہ سرد مقامات کو متأثر کرتے ہیں۔ عام طور پر یہ درجہ ۹۰ درجہ فارن ہائٹ ہے۔ اس درجہ کو نفسیاتی صفر نقطہ (Psychological Zero Point) کہتے ہیں۔ یہ نقطہ کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتا۔ اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً اپنے بائیں ہاتھ کو ٹھنڈے پانی میں ڈالیں اور دائیں کو گرم پانی میں۔ کچھ دیر اسی طرح رکھے رہیں۔ آپ محسوس کریں گے کہ ہاتھ کو نہ گرمی لگ رہی ہے نہ سردی۔ جس سے ثابت ہوا کہ حسی تطبیق سے ایک نیا نفسیاتی صفر نقطہ پیدا ہو گیا ہے۔ اب دونوں ہاتھوں کو عام پانی میں جو نہ سرد ہو نہ گرم ڈال دیجیے تو ٹھنڈے پانی والے ہاتھ

کو یہ پانی گرم لگے گا اور گرم پانی والے ہاتھ کو ٹھنڈا۔

تپش (Heat) کے متعلق ایک عجیب بات ہے۔ اسے صرف گرمی کا احساس نہیں کہنا چاہیے کیونکہ اسے پیدا کرنے کے لیے درد، گرمی اور سردی کے مقامات کو ایک ہی وقت سرگرم کار ہونا چاہیے۔ عموماً سردی کے مقامات تب متاثر ہوں گے جب ٹمپریچر نفسیاتی صفر نقطے سے نیچے ہو۔ لیکن بعض اوقات جب ٹمپریچر اس نقطہ سے اوپر ہو تب بھی سرد مقام کام کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ تجربوں سے ثابت ہوا کہ سرد مقامات پر ۹۰ درجے سے لے کر ۱۱۰ درجہ فارن ہائٹ تک کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لیکن ۱۱۰ درجے سے اوپر بہت زیادہ سردی کا احساس ہوتا ہے۔ گرم مقامات کے متعلق بھی یہی بات ہے۔ انہیں بھی ۷۵ درجے سے لے کر ۸۸ درجے فارن ہائٹ کے مہیجات سے، جو نفسیاتی صفر نقطہ سے نیچے ہوں گے اور اس لحاظ سے سرد ہوں گے، متاثر کیا جا سکتا ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ گرمی اور سردی کا احساس گرم اور سرد مقامات کے علاوہ کسی اور جگہ سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ فرض کیا کہ میز کے اوپر اونی ٹائی، قلم اور چشمہ پڑا ہے۔ کمرے کا ٹمپریچر سب اشیا کے لیے ایک جیسا ہے۔ لیکن اگر گرمیوں کا موسم ہو اور ان چیزوں کو گالوں سے لگایا جائے تو اونی ٹائی تو گرم لگے گی۔ قلم نہ ٹھنڈا لگے گا نہ گرم، چشمہ شاید تھوڑا سا ٹھنڈا محسوس ہو۔ یہ فرق کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیشہ اور دھات گرمی چوستے ہیں اور جسم کو ٹھنڈا کرتے ہیں۔ لیکن اون جسم کی گرمی کو خارج نہیں ہونے دیتی۔ اس لیے گرم لگتی ہے۔ پس گرمی اور سردی کے لیے یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ آیا آخذات سے گرمی خارج ہوئی ہے یا الٹا انہیں گرمی سے بھر دیا گیا ہے۔

محسسات ذائقہ: جلد کی محسسات کی طرح اکثر ذائقے کے محسسات مرکب ہوتے ہیں۔ ابتدائی ذائقے تو چار ہیں۔ میٹھا، کھٹا،

کڑوا اور نمکین - باقی تمام ذائقے انہی کی آمیزش سے بنے ہیں - منہ کے اندرونی حصے میں ذائقہ اور جلد دونوں کے حواس موجود ہیں - خوراک کا ٹمپریچر ذائقہ کو گھٹاتا بڑھاتا ہے ، بعض کھانے ٹھنڈے پسند کیے جاتے ہیں ، بعض گرم - چائے گرم اور کوکا کولا ٹھنڈا مانگا جاتا ہے - حس شامہ بھی ذائقہ میں مدد دیتی ہے - زردے اور پلاؤ کی خوشبوئیں ہاضمہ کو تیز کرتی ہیں اور زیادہ مزے دار بناتی ہیں -

محسات جلد کی طرح زبان پر ذائقوں کے مختلف مقامات ہیں - زبان کے پچھلے حصے سے کڑواہٹ ، اس کی نوک سے مٹھاس اور اس کے کناروں سے ترشی کا احساس ہوتا ہے - نمکین کے مقامات تمام زبان پر پائے جاتے ہیں - ووڈورتھ کا کہنا ہے کہ اگر میٹھے اور کڑوے کے محلل (Solution) کو برش سے زبان کی نوک پر لگایا جائے تو یہاں میٹھے کا ذائقہ آئے گا اور زبان کے نیچے لگایا جائے تو یہاں کڑوا لگے گا -

باقی محسسات کی مانند ذائقہ میں بھی حسی تطبیق (Sensory Adaptation) کو دیکھا جا سکتا ہے - بہت سی شکر کھانے کے بعد ہلکی سی میٹھی چیز میٹھی نہیں لگتی اور ہر لقمہ کے بعد نمکین کھانا کم نمکین ہوتا جائے گا -

ذائقہ میں حسی تضاد (Contrast effect) بھی موجود ہے - زبان کے ایک طرف اتنا ہلکا میٹھا لگائیں کہ اس کی مٹھاس کا احساس نہ ہو - اب اگر زبان کی دوسری طرف ترش لگا دیا جائے تو مٹھاس جو پہلے محسوس نہیں ہوتی تھی اب محسوس ہونے لگے گی - اسی قسم کا تضاد کھٹے اور نمکین یا نمکین اور میٹھے میں بھی پایا جاتا ہے -

ذائقے کے آخذات محلول سے متأثر ہوتے ہیں - ان آخذات کا مقام منہ کے چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں ہے جنہیں شگوفہ ہائے ذائقہ (Tastbuds) کہتے ہیں - ان شگوفوں کی تعداد پیدائش پر مکمل ہو جاتی ہے اگر ان کی گنتی کی جائے تو یہ تعداد میں تقریباً ۲۴۵ نکلیں گے -

جوں جوں عمر بڑھتی ہے یہ شگوفے کم ہوتے جاتے ہیں ۔ بڑھاپے میں بعض اوقات یہ شگوفے بالکل ہی ختم ہو جاتے ہیں ۔ تب بوڑھے آدمیوں کا ذائقہ مر جاتا ہے اور کسی کھانے میں انھیں مزہ نہیں آتا ۔ اس لیے جب بوڑھے آدمی شکایت کریں کہ کھانا بے مزہ ہے تو انھیں معذور سمجھنا چاہیے کیونکہ ان کے ذائقے کے شگوفے مر گئے ہوتے ہیں اور وہ کسی ذائقے کے اہل نہیں رہتے ۔ تمباکو نوشی سے بھی ذائقہ کی حس کمزور پڑ جاتی ہے ۔ بعض لوگ کھانے سے پہلے ، درمیان اور بعد میں سگریٹ پیتے رہتے ہیں ۔ انھیں یہ علم نہیں ہوتا کہ ذائقہ پر اس کا کیا برا اثر پڑ رہا ہے ۔ بعض ہوٹلوں میں سگریٹ پینا منع ہوتا ہے ۔ بعض گھروں میں بھی روٹی کے درمیان سگریٹ نہیں پیا جاتا ۔ یہ دستور نفسیاتی اصول کے عین مطابق ہے ۔

حسسات شامہ : چھوٹے جانوروں کے لیے سونگھنے کی بڑی اہمیت ہے ۔ انسانوں کے کاروبار اور دیگر مشاغل زیادہ تر بصارت اور سماعت کی بدولت سر انجام پاتے ہیں ۔ لہٰذا ان کے لیے سونگھنے کی چنداں اہمیت نہیں ۔ لیکن پھر بھی کئی اشغال ایسے ہیں جن میں حس شامہ کی ضرورت پڑتی ہے ۔ ذائقے کو گھٹانے یا بڑھانے میں بوؤں کا عنصر بڑا غالب ہوتا ہے ۔ بوؤں سے بھی علم ہوتا ہے کہ کھانا کھانے کے قابل ہے یا نہیں ۔ تعفن اور بدبو سے بچے بوڑھے ناک منہ چڑھاتے ہیں اور ایسے کھانے سے پرہیز کرتے ہیں جو گلا سڑا ہو اور جس سے بدبو آرہی ہو ۔ من (Munn) نے ہوزری والوں کی ایک چال بیان کی ہے[1] ۔ ان لوگوں نے بعض لیڈیز سٹاکنگس (عورتوں کی جرابوں) کو ہلکا سا عطر لگا دیا اور چند ایک جرابیں اسی طرح بغیر عطر لگائے دوکان میں رکھ دیں ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عطر بیز جرابوں کو دوسری جرابوں کے مقابلے میں چھ گنا زیادہ پسند کیا گیا اور ۲۵۰ خریداروں

---

۱ ۔ ملاحظہ ہو اس کی Psychology ، صفحہ ۳۷۹ ۔

میں سے صرف چھ کو شبہ ہوا کہ جرابوں کو عطر لگا دیا گیا ہے۔ عطر فروشوں کا دعویٰ ہے کہ مرد خوشبوؤں سے عورتوں کی طرف کھچے آتے ہیں اور بدبوئیں دوستوں کو متنفر کر دیتی ہیں اور زندگی میں ترقی کے مواقع کم کر دیتی ہیں۔

اکثر بوئیں مرکب ہیں ۔ کروچر (Crocher) کے مطابق صرف چار ابتدائی بوئیں ہیں ۔ اس کا دعویٰ ہے کہ سب بوئیں ان چار ابتدائی بوؤں سے بنائی جا سکتی ہیں ۔ بوئیں یہ ہیں :

(۱) خوشبو (Fragrant) ، جیسے کستوری کی

(۲) سرکہ (Acid) ، جیسے سرکے (Vinegar) ، کی

(۳) جلی ہوئی (Burnt) ، جیسے جلی ہوئی کافی کی

(۴) پسینہ والی (Sweaty) ، جیسے پسینہ سے لبریز کپڑوں کی

بوؤں کے سلسلے میں ماہرین نفسیات نے ہننگ (Henning) ، کی جماعت بندی کو پسند کیا ہے ۔ اس میں چھ ابتدائی بوئیں تسلیم کی گئی ہیں ۔

(۱) گرم مصالحے والی (Spicy) مثلاً زنجبیل کی ۔

(۲) خوشبو (Fragrant) مثلاً ونیلا کی

(۳) نہایت لطیف تیل جیسی (Ethereal) مثلاً لیموں کے تیل کی ۔

(۴) بروزے جیسی (Resinous) مثلاً وارنش کی ۔

(۵) بدبو (Putrid) جیسے گوبر یا ہائیڈروجن سلفائڈ کی ۔

(۶) جلی ہوئی (Burnt) مثلاً کول تار کی ۔

لوگوں میں قوت شامہ مختلف مقدار میں ہوتی ہے ۔ بعض میں بالکل ختم ہو جاتی ہے ۔ اس مرض کو فقدان شامہ (Anosmia) کہتے ہیں ۔ علاوہ ازیں بعض بوؤں کو جلد سونگھ لیا جاتا ہے بعض کو دیر میں مثلاً کستوری کی تھوڑی مقدار سے حس شامہ بہت زیادہ متأثر ہو جاتی ہے ۔ حالانکہ دیگر بوؤں کی کثیر مقدار بھی ایسا تأثر

پیدا نہیں کرتی۔

قوت شامہ کی تیزی (Acuity) ناپنے کا آلہ شامہ پیا (Olfactometer) کہلاتا ہے اس کا ایک سرا ناک میں دے دیا جاتا ہے۔ دوسرے سرے پر کسی بو سے بھرا ہوتا ہے۔ اس سلنڈر کی بو پمپ سے گھٹائی بڑھائی جاتی ہے تجربہ کنندہ بو کو آہستہ آہستہ بڑھاتا ہے اور معمول کو یہ بتانا ہوتا ہے کہ اسے کب بو کا احساس پیدا ہوا۔ مختلف لوگوں کو بو کا احساس مختلف مقدار میں ہوتا ہے۔ اس سے ان کی قوت شامہ کی تیزی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

بعض شامہ پیا دوہرے ہوتے ہیں۔ ان میں دو بوئیں ایک ہی وقت میں سونگھی جا سکتی ہیں۔ ان کی مقدار بھی تبدیل ہو سکتی ہے۔ یہ آلہ کبھی ایک دوسری بو کو منسوخ کر دیتا ہے۔ کبھی بوؤں کو یکے بعد دیگرے پیدا کر دیتا ہے۔ زیر تجربہ فرد کو بتانا ہوتا ہے کہ کب بو تبدیل ہوئی یا کب کوئی بو نہیں آ رہی وغیرہ وغیرہ۔ اس سے حس شامہ کی طاقت کا اندازہ ہوتا ہے۔

شامہ کی تطبیق (Olfactory Adaptation) : تیز سے تیز خوشبوئیں اور بدبوئیں کچھ عرصے کے بعد اپنی طاقت کھو بیٹھتی ہیں اور ناک کو ویسا متأثر نہیں کرتیں جیسے پہلے کرتی تھیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص بدبودار ماحول میں کچھ عرصے کے لیے ٹھہرے تو شروع میں وہ گندگی کو برداشت نہیں کر سکے گا لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد اس کا ناک اس ماحول سے مانوس ہو جائے گا اور بدبو محسوس نہیں کرے گا۔ فیکٹریوں میں کام کرنے والے لوگ کئی بوؤں کے عادی ہو جاتے ہیں اور ان سے متأثر نہیں ہوتے۔ لیکن یاد رہے ایک بو سے تطبیق دوسری بو سے تطبیق نہیں پیدا کر سکتی۔ اس ضمن میں ایک تجربہ بیان کیا جاتا ہے۔ دو ایسے سیال (Liquids) لیں جن کی بوئیں تو مختلف ہوں لیکن جو مل کر ایک جان ہو جائیں۔ اس کے

بعد معمول کو یہی مختلف بو والے سیال سے بھری ہوئی بوتلیں سونگھنے کو دیں۔ پھر ایسی دو بوتلیں سونگھنے کو دیں جن میں وہی سیال ہوں جن سے محلول تیار کیا گیا ہے، معمول کو سونگھ کر بتانا ہوتا ہے کہ تیار کردہ محلول میں کون کون سے سیال ہیں۔ یہ معمول کسی ایک بوتل کو اس وقت تک سونگھتا رہتا ہے جب تک اس کی بو بالکل غائب نہیں ہو جاتی (یعنی جب تک اس بو سے تطبیق پیدا نہیں ہو جاتی) پھر وہ محلول سونگھتا ہے۔ اگر وہ بو جس سے تطبیق حاصل کی گئی ہے (یعنی جو بو سونگھتے سونگھتے غائب ہو گئی ہو) اس محلول میں موجود ہو تو محلول کی بو میں فرق آ جائے گا یعنی جو بو تطبیق سے پہلے محلول سے آتی تھی وہ اب نہیں آئے گی اور اگر یہ بو جس سے تطبیق حاصل کی گئی ہے محلول میں موجود نہ ہو تو محلول کی پہلی بو اور اس کی موجودہ بو میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ بو کے فرق سے معمول کو محلول کے اجزا کا پتہ چل جاتا ہے۔ یہ تجربہ یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ اگر ایک بو سے تطبیق پیدا ہو جائے تو دوسری سے تطبیق خود بخود پیدا نہیں ہو جاتی۔

حشوی تحسسات (Organic Sensations) **:** یہ تحسسات اندرونی اعضا اور احشا سے اٹھتے ہیں ان میں معدہ، آنتیں، گردے اور جنسی آلات شامل ہیں۔ ان کے علاوہ گلا، پھیپھڑے اور دل سے بھی حشوی تحسسات آتے ہیں۔ بھوک، پیاس، متلی (Nausea)، آنتوں کے کھچاؤ، جنسی خواہشات حشوی تحسسات کی مثالیں ہیں۔ بعض ماہرین نفسیات نے ان احساسات کو دباؤ، درد اور ٹمپریچر کی حسوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ مثلاً پیاس کا تعلق حلق سوکھنے سے ہے۔ بھوک کا تعلق خالی معدہ کے دباؤ اور درد سے، متلی اور سر گرانی کا تعلق بھی درد سے ہے۔

عضویاتی محرکات میں حشوی تحسسات نہایت ضروری ہیں خصوصاً

بھوک ، پیاس اور جنس میں تو یہ بہت ہی اہم کردار ادا کرتے ہیں ۔ ہر قسم کی متلی میں خواہ وہ بحری یا ہوائی جہازوں کی حرکات سے پیدا ہو احشا کا ہاتھ ہوتا ہے ۔ فوراً اوپر چڑھنے سے ، جیسے ہوائی جہاز چڑھتا ہے ، احشا میں خلل پیدا ہو جاتا ہے ۔ جھلیوں کو کھچاوٹ لگتی ہے جس سے آنتیں اپنے مقام پر رہتی ہیں جب جہاز نیچے اترتا ہے تو کھچاوٹ الٹی طرف لگتی ہے اور آنتیں اپنے مقام سے ہل جاتی ہیں اس قسم کی کھچاوٹ جب پیٹ کے آپریشن میں محسوس ہو تو مریض کو قے اور متلی ہو جاتی ہے ۔ یہاں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جہازوں یا گاڑیوں کی تیز رفتاری یا ہچکولوں سے جب قے آتی ہے تو اس کی تہہ میں احشا کار فرما ہوتی ہیں ۔

ہیجانات میں حشوی تحسسات کا عنصر بڑا غالب ہے ۔ اس کا بیان ہیجانات میں آ چکا ہے ۔

عضلی تحسسات (Kinaesthetic Sensation) : اگر آنکھیں بند کرکے کوئی شخص سستا رہا ہو اور اس کا دوست چپکے سے اس کی ٹانگیں ادھر اُدھر کر دے یا بازو اوپر نیچے کرے تو فوراً رباط (Tendons) ، عضلات اور جوڑوں سے تحسسات اٹھیں گے جو اطلاع دیں گے کہ ٹانگیں یا بازو کدھر سے کدھر جا رہے ہیں ۔ ایسے ہی اگر آنکھیں بند کرکے اپنے ناک یا جسم کے کسی دوسرے حصہ کو ہاتھ لگائیں تو بخوبی لگا سکیں گے ۔ اپنے ہاتھ پاؤں جدھر موڑنا چاہیں گے موڑ سکیں گے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں دیکھی بھالی جگہ پہنچ جائیں گے ۔ بغیر جانے ہوئے کہ حلق اور گلے کا کون سا حصہ سرگرم کار ہے آپ بات چیت بھی کریں گے وغیر وغیرہ ۔ ڈرائیور گاڑی چلاتے چلاتے بھی مسافروں سے باتیں کرتا رہتا ہے ۔ ہوا باز بھی مشین کو چلاتے چلاتے اخبار پڑھ لیتا ہے یا دوسروں سے علیک سلیک کر لیتا ہے ۔ آپ نے دیکھا ہو گا عورتیں سویٹر بھی بنتی رہتی ہیں اور ساتھ ساتھ باتیں بھی

کرتی ہیں - ان سب افعال کا سرچشمہ رباط ، عضلات اور جوڑ ہیں -

ہماری توجہ عموماً عضلی تحسسات کی طرف کم جاتی ہے لیکن جوڑوں یا پٹھوں کو حرکت میں لائیں تو ان تحسسات کا پتہ چل جاتا ہے - تکان ، دباؤ ، درد اور کھچاوٹ عضلی تحسسات ہیں ۔ ان تحسسات کو خاص شکل میں اس وقت محسوس کیا جا سکتا ہے جب جلد مکمل طور پر بے حس ہو جائے۔ کیونکہ اگر جلد بے حس نہ ہو تو مہیجات جو رباط ، عضلات اور جوڑوں کو متأثر کرتے ہیں وہ جلد کو بھی متأثر کر دیتے ہیں -

جب تک کوئی آدمی سل ظہری (tabes dorsalis) کا مریض نہ ہو جائے یا دوسروں کو اس مرض میں مبتلا نہ دیکھے اسے محسوس نہیں ہوتا کہ عضلی تحسسات کس قدر ضروری ہیں ۔ نخاع یا دماغ کے ڈانڈی کے پٹھے جب تباہ ہو جاتے ہیں تب اس مرض کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ پٹھے عضلی آخذات سے سریر تک تأثرات لے جاتے ہیں۔ لیکن جب یہ تباہ ہوجاتے ہیں تو عضلی تأثرات پیدا نہیں ہو سکتے ۔ یوں نخاع اور دماغ کی ڈانڈی تک تو تأثرات پہنچ جاتے ہیں لیکن اس سے آگے دماغ تک نہیں پہنچتے ، لہٰذا جب سل ظہری کے مریض کی آنکھیں بند ہوں تو وہ ادھر اُدھر جھولتا ہے رکاب سے بن دیکھے قدم نہیں اٹھا سکتا ۔ چلتا بھی عجیب طرح سے ہے اور اگر نخاع کے بالائی پٹھے تباہ ہو چکے ہوں تو آنکھیں بند کرنے پر ناک اور کان کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا ۔ اگر دماغ کی ڈانڈی ماؤف ہو تو بولنے میں بھی دقت محسوس کرتا ہے اور بعض اوقات اس کی بولی سمجھ میں ہی نہیں آتی -

سکونی تحسسات (Static Sensitivity) : اگر بالفرض تمام کے تمام متذکرہ بالا تحسسات ختم ہو جائیں تو بھی ہم بتا سکیں گے کہ ہم کس سمت میں ہیں اوپر ہیں یا نیچے ہیں ، گر رہے ہیں یا چل رہے ہیں ، اپنے گرد گھوم رہے ہیں یا چپ کھڑے ہیں ، آگے جا رہے ہیں یا پیچھے

جا رہے ہیں ، دائیں مڑ رہے ہیں یا بائیں - ان چیزوں کے آخذات تین نیم دائری نالیوں (Semi Circualr Canals) میں ہیں جو کان میں پائی جاتی ہیں - اس لیے کان کو صرف عضو سماعت ہی نہیں کہتے بلکہ عضو لرزش (Shake Organ) بھی کہتے ہیں - ٹیچنر کہتا ہے کہ کان کی نیم دائری نالیاں ایسے اعضا ہیں جن کے باعث ہم چلتے وقت اپنا توازن قائم رکھتے ہیں - گھومنے ، مڑنے اور راستے کی رکاوٹوں سے بچنے میں بھی یہی اعضا ممد ہوتے ہیں - اگر ہم ایڑیوں پر تیزی سے گھومیں تو ہم سرگرانی سی محسوس کرتے ہیں -

ہر نیم دائرہ نالی دوسری نالی پر قائمہ زاویہ بناتی ہے- ہم اپنے جسم کی پوزیشن کا احساس تب کھو بیٹھتے ہیں جب اوپر نیچے ، دائیں بائیں اور آگے پیچھے میں تمیز نہ کر سکیں اور یہ نالیاں انھی تین سمتوں میں ہیں - ایک نالی تب متأثر ہوگی جب سر ساعت وار (Clockwise) چلے - دوسری جب سر آگے پیچھے چکر لگائے اور تیسری جب سر دائیں بائیں حرکت کرے - نالیوں کی تہہ میں پھکنے (Ampulla) ہیں جہاں بال پائے جاتے ہیں - جب سر حرکت کرتا ہے تو بال جھک جاتے ہیں جھکاؤ سے اعصابی ریشے متأثر ہوتے ہیں ، اور سمعی اعصاب اس تأثر کو دمیغ اور سر حرام مغز تک پہنچا دیتے ہیں -

سر کے گھومنے سے یہ بال متأثر ہوتے ہیں - اگر اچانک سر دائیں لے جایا جائے تو پہلی نالی کا پانی پیچھے رہ جائے گا اور بال بائیں طرف مڑ جائیں گے - ایسے ہی جب سر فوراً جھکایا جائے تو دوسری نالی کے بال اوپر کھڑے ہو جائیں گے - یا اگر سر فوراً سامنے کیا جائے تو تیسری نالی کے بال پیچھے جھک جائیں گے - اگر حرکت قائم رہے ، جیسے گھومنے والی کرسی سے ہو سکتی ہے تو بال ایک طرف بدستور جھکے رہتے ہیں - اور کرسی پر بیٹھا ہوا انسان محسوس کرتا ہے کہ حرکت بند ہو گئی ہے - جب کرسی کی رفتار سست کر دی جاتی ہے

تو بال اس طرف جھک جاتے ہیں جدھر حرکت کا رخ ہو اس وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم اُلٹے جا رہے ہیں ۔

چکر کاٹنے کے بعد آنکھیں آگے پیچھے جاتی ہیں ۔ ایسے شخص کو دیکھیے جو کئی چکر کاٹ کر ابھی بیٹھا ہو وہ جلد جلد آنکھیں آگے پیچھے کرتا ہوا پایا جائے گا ۔ اگر گھومنے کے بعد یہ حرکت ظاہر نہ ہو تو نالیوں یا ان کے اعصابی جوڑوں میں نقص کا خدشہ ہوتا ہے ۔ لیکن بازی گروں ، رقاصوں اور ہوا بازوں کی نالیاں چونکہ اکثر بار متاثر ہوتی رہتی ہیں ۔ ان لوگوں کی آنکھیں چکر کاٹنے پر آگے پیچھے نہیں ہوتیں یا اگر ہوتی ہیں تو بہت کم عرصے کے لیے ۔ جانوروں پر جو تجربے ہوتے ہیں ان سے بھی اس امر کی توثیق ہوتی ہے ۔ بار بار چکر دینے سے ان جانوروں کی آنکھیں بھی آگے پیچھے ہونا چھوڑ دیتی ہیں ، لیکن ان کے سکونی تحسسات میں کوئی فرق نہیں آتا ۔ ایسے ہی چکر کاٹنے کے بعد جو سرگرانی محسوس ہوتی ہے اسے بھی کم کیا جاتا ہے ۔

نالیوں کے نیچے ایک دھلیز (Vestibule) ہے جو نالیوں کے ساتھ ہی متاثر ہوتی ہے ۔ ان دونوں کی حرکت کو مجتمع کرنے والا دماغ کا حصہ دمیغ ہے انھی سے جسم کا توازن قائم رہتا ہے ۔ بلی کہیں سے چھلانگ لگائے زمین پر پاؤں کے بل گرتی ہے ۔ یہ دھلیز اور نالیوں کی مشترکہ کارکردگی کا نتیجہ ہے ۔

نالیوں اور دھلیز کو اگر غیر معمولی طور پر متأثر کر دیا جائے تو متلی اور قے کا اندیشہ ہوتا ہے ۔ جن لوگوں کو ہوائی جہاز ، کار یا جھولے پر متلی ہوتی ہے ان کی تکلیف کا سبب منجملہ اور اسباب کے نالیوں اور دھلیز کا زیادہ متأثر ہونا بھی ہے ۔ ہوائی جہاز کے ملازمین کو اس تکلیف سے بری ہونا چاہیے اسی لیے بھرتی کرتے وقت امیدواروں کو جھولوں پر سوار کیا جاتا ہے ۔ گھومنے والی کرسیوں پر بٹھایا جاتا ہے اور کئی کئی گھنٹے چکر دیے جاتے ہیں ۔ کچھ لوگ

زرد پڑ جاتے ہیں ۔ بعض کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں ۔ اور بعض بیمار پڑ جاتے ہیں ۔ ان لوگوں کو ملازم نہیں رکھا جاتا ۔ بعض لوگ بالکل ٹھیک ٹھاک رہتے ہیں ۔ انھیں ہوائی جہازوں کی ملازمت دی جاتی ہے ۔

ہوائی جہاز یا کشتی کے لمبے سفر کے بعد کئی لوگ کچھ عرصے کے لیے لڑکھڑاتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ عمارتیں مختلف سمتوں میں بھاگی جا رہی ہیں ۔ یہ کیفیت ان لوگوں پر طاری ہوتی ہے جو گردش کو برداشت نہیں کر سکتے ۔

پندرہواں باب

ادراک (Perception)

پچھلے باب میں محسسات کی علیحدہ علیحدہ تشریح کی گئی ہے۔ اس تشریح کا منشا اعضا اور ان کی ساخت بیان کرنا نہیں تھا (یہ کام تو عضویات کا ہے) اصل منشاء تو یہ تھا کہ جس طریقے سے انسان کو اپنے ماحول اور جسم کا پتہ چلتا ہے اسے واضح کیا جائے۔ حواس سے اشیا کے خواص کا علم ہوتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ محض خواص کا علم بے کار ہوگا جب تک ان خواص سے اشیا کی طرف نہ جائیں جو ان خواص کی حامل ہیں۔ مثلاً چائے پیتے وقت ہمیں مٹھاس، گرمی، بو اور دباؤ کے محسسات آتے ہیں۔ یہ محسسات اپنی جگہ پر نہایت کام کے نفسیاتی کوائف ہیں لیکن یہ سب محسسات چائے کی پیالی سے اٹھتے ہیں جب تک چائے کے محسسات سے چائے کی طرف نہ جائیں ہماری ذہنی کیفیت مکمل نہیں ہوتی۔ اشیا کا علم ادراک کہلاتا ہے۔ ادراک ایسے فعل کا نام ہے جس سے حواس کے ذریعے اشیا اور خارجی ماحول کا علم ہوتا ہے۔

ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ نفسیاتی فرد ماحول میں زندگی گزارتا ہے۔ یہ ماحول طبعی اور سوشل مہیجات کی آمیزش سے بنتا ہے۔ اس ماحول سے تأثرات اٹھتے ہیں جنھیں حواس وصول کرتے ہیں اور جن کا رد عمل عضویہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس مطلب کے لیے ووڈورتھ نے فارمولا پیش کیا ہے جس کی تشریح گزشتہ ابواب میں آ چکی ہے۔ یہ فارمولا ہے:

$$W - S - O_w - R - W$$

W سے مراد ماحول ہے جہاں سے مہیجات (S) اٹھتے ہیں، جو آخذات کے

ذریعہ عضویہ (O) میں داخل ہوتے ہیں - یہ عضویہ پہلے سے ہی ماحول (O_w) میں لپٹا ہوا ہے - عضویہ برآور اسباب کے ذریعہ رد عمل (R) پیش کرتا ہے - یہ رد عمل بھی ماحول (W) میں ہوتا ہے -

تحسسات میں ہمارا سروکار مہیجات سے ہوتا ہے - لیکن ادراک میں مہیجات سے زیادہ ہماری دلچسپی کے مرکز اشیا اور خارجی ماحول ہیں- مہیجات سے اشیا کا پتہ چلتا ہے اور ماحول کا علم ہوتا ہے - کامیاب اور آسودہ زندگی کے لیے نہایت ضروری ہے کہ اشیا کو بعینہ ان کے خواص کے سمجھا جائے اور اسی طرح ماحول بعینہ اس کے عناصر اور عوامل ہماری سمجھ میں آ جائیں -

ادراک کے متعلق کئی ضروری باتیں ہیں :

۱- ادراک کو ذہن کا انفعالی (Passive) فعل نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ جو کچھ مشاہدے میں آتا ہے ، یعنی جو تاثرات حواس کے ذریعے پیدا ہوتے ہیں ، ان میں اضافہ کیا جاتا ہے اور ان کے مطالب بیان کیے جاتے ہیں - فرض کیا کہ کوئی ہوا باز اوپر سے زمین پر ہوائی جہاز دیکھتا ہے - وہیں سے اسے پتہ چل جاتا ہے کہ جہاز کتنی توپوں والا ہے - وہ جہاز کی ساخت سے توپوں کا اندازہ کر لیتا ہے ، حالانکہ اس نے توپیں نہیں دیکھیں - ایسے ہی اگر کھڑکی سے کوئی سر بھاگتا دکھائی دے تو ہم کہتے ہیں کوئی آدمی سائیکل پر سوار جا رہا ہے - نہ ہم نے سائیکل دیکھی ہے نہ آدمی کا دھڑ ، صرف سر نظر آیا تھا - باقی تمام چیزیں خود شامل کی گئی ہیں - بچے کو انسان کی تصویر بنانے کے لیے کہیں وہ تصویر بناتے وقت دو آنکھیں ضرور بنائے گا- خواہ جو آدمی اس کے سامنے کھڑا ہو اور جس کی تصویر وہ کھینچ رہا ہو اس کی ایک آنکھ دکھائی دیتی ہو- یہ مثالیں بصارت سے تعلق رکھتی ہیں لیکن جو چیز بصارت کے متعلق صحیح ہے وہ دوسرے تحسسات کے لیے بھی صحیح ہے- کمرہ میں بیٹھے ہوئے اوپر سے گڑ گڑ کی آواز آتی ہے - فوراً آپ کہہ دیتے ہیں کہ

بادل یا ہوائی جہاز کی آواز ہے یا دوسرے کمرے سے شور اٹھتا ہے تو آپ کہتے ہیں کتا بھونک رہا ہے۔

صحیح مشاہدہ آسان کام نہیں۔ کئی دفعہ بار بار دیکھنے یا سننے کے باوجود سمجھ نہیں آتا تھا کہ کیا چیز دیکھی جا رہی ہے یا کس چیز کو سن رہے ہیں۔ بعض دفعہ ایک شکل کو دوسری اشکال میں اس طرح چھپا دیا جاتا ہے کہ اصلی شکل معلوم کرنا نہایت مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی بعض دفعہ کوئی آواز کان میں پڑتی ہے تو سمجھ نہیں آتا کہ یہ آواز کس کی ہوگی اور اس کا کیا مطلب ہوگا۔ جب یہ حالت ہو تو ذہن کو تین مدارج سے گزرنا پڑتا ہے۔

(ا) حسی منزل (Sensory Stage) : یہ ابتدائی منزل ہے اس میں اشیا کے تمام خواص سمجھے جاتے ہیں۔ یعنی ان کا حجم، تعداد، جگہ، آواز کی خاصیت، بو وغیرہ۔ ہر محسس جس کا احساس ہو رہا ہے اس کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

(ب) تفتیش اور تلاش کی منزل (Exploratory Stage) : محسسات وصول کرنے کے بعد کوشش کی جاتی ہے کہ ان محسسات کا مطلب معلوم کیا جائے۔ یہاں پر عموماً سعی و خطا (Trail and Error) کا طریقہ استعمال ہوتا ہے۔ کبھی خیال ادھر جاتا ہے کبھی ادھر، کبھی محسسات کو ایک طرح لیا جاتا ہے کبھی دوسری طرح سے۔ الغرض کئی جتن کیے جاتے ہیں۔ ان سب کا منشا یہ ہوتا ہے کہ کسی طرح چیز سمجھ میں آ جائے۔

(ج) توضیحی منزل (Interpretative Stage) : تفتیش اور تلاش کے بعد کوئی راہ سوجھ جاتی ہے اور محسسات کا مطلب واضح ہو جاتا ہے، یعنی صحیح چیز کا علم ہو جاتا ہے۔ اگر آواز ہو تو اس کا مطلب پتہ چل جاتا ہے۔ اگر بصری محسسات ہوں تو

جس شے سے ان کا تعلق ہو اس کا ٹھیک ٹھیک علم ہو جاتا ہے۔

۲- انسان کا رد عمل مہیجات سے اتنا وابستہ نہیں ہوتا جتنا ان کے روابط سے ہوتا ہے ۔ مثلاً کسی آدمی کو مختلف لباس میں مختلف مقامات پر اور مختلف وقتوں میں دیکھیں تو اختلافات کے باوجود آپ اسے پہچان لیں گے ۔ مہیجات تو ہر دفعہ مختلف ہیں لیکن ان کی تہہ میں جو حقیقت پوشیدہ ہے وہ وہی ہے ۔ لہٰذا ایسے شناخت کر لیا جاتا ہے ۔ ایسے ہی مختلف سازوں پر مختلف آہنگوں (Keys) میں ایک سر بجائیں ۔ باوجود سازوں اور آہنگوں کے اختلافات کے ہر تربیت یافتہ کان سر کو پہچان لے گا۔ لہٰذا اگر نظام یا سسٹم کو نہ بدلا جائے تو چھوٹے موٹے اختلافات کے باوجود صحیح چیز کو شناخت کر لیا جاتا ہے ۔

ادراک کو متعین کرنے والے عناصر :

کون سے عناصر پر ادراک کا انحصار ہے ؟ ''کون سے عوامل ادراک کو تشکیل دیتے ہیں ؟''

۱- ابتدائی تشکیل دینے والے میلانات (Primary Configural Tendencies) : فرض کیا ایک گھڑی ٹک ٹک کر رہی ہے اور آپ آواز سن رہے ہیں ۔ اس آواز میں کوئی اتار چڑھاؤ نہیں اور نہ ہی کوئی شدت کا فرق ہے ۔ ایک ٹک دوسری ٹک کے مثل ہے اور ایک ہی وقفہ کے بعد آتی ہے ۔ لیکن جب ہم اس ٹک ٹک کو سن رہے ہوتے ہیں تو خود بخود یہ لگاتار اور مسلسل ٹک ٹک ہمارے لیے کچھ گروہوں میں بٹ جاتی ہے ۔ کہیں کہیں قافیہ اور ردیف آ جاتا ہے اتار چڑھاؤ بھی پیدا ہو جاتا ہے ۔ اس قسم کے گروپ بنائے بغیر آپ ٹک ٹک کی طرف زیادہ دیر تک توجہ نہ دے سکیں گے ۔ پہلے چھوٹے چھوٹے گروپ بنتے ہیں۔ پھر ان کی آمیزش سے بڑے گروپ پیدا ہوتے ہیں۔ شاعری اور موسیقی میں وزن ہوتا ہے ۔ اس سے کچھ الفاظ مل کر ایک ہلکا سا گروپ بناتے ہیں ۔ پھر ایسے ہلکے گروپ مل کر شعر کا وزن

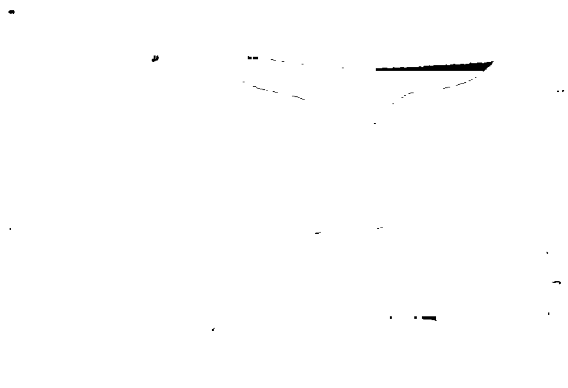
متعین کر دیتے ہیں ۔ سوتے وقت تاروں بھرے آسماں کو دیکھیں ، کئی قسم کے ستارے ہیں ، کچھ بڑے کچھ چھوٹے ، کچھ ایک لکیر میں ، کچھ ٹیڑھے ، ان کے گروپ بن جاتے ہیں ۔ کوئی سپت رشی بنتا ہے ، کوئی کہکشاں ، بعض ستارے مستطیل بناتے ہیں ، بعض تکون ، یہ گروپ کیوں بنتے ہیں ؟ گھڑی کی ٹک ٹک میں وزن نہیں تھا ۔ قافیہ اور ردیف نہ تھا ، یہ وزن ، قافیہ اور ردیف کہاں سے آ گیا ؟ اسی طرح ستارے تو یونہی اِدھر اُدھر لٹک رہے تھے انھیں کیوں اکٹھا کرکے سپت رشی یا کہکشاں جیسے گروپ بنا دیے گئے ۔ ان سوالوں کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک قدرتی امر ہے ۔ دوسرے الفاظ میں اس تنظیم کے ذمے دار یا تو حواس ہیں یا اعصابی مراکز یا عضویہ بحیثیت مجموعی ۔ بہر حال گروہوں کا بنانا ایک فطری خاصہ ہے ۔ بچہ ، جوان ، بوڑھا ، مرد ، عورت سبھی لوگ تحسسات کو وصول کرتے وقت انھیں گروہوں میں تقسیم کر لیتے ہیں ۔

ووڈورتھ کے خیال میں ادراک کا کام زمین (Ground) سے شکل (Figure) تمیز کرنا ہے ۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو کائنات ایک بے تفریق تودہ سا ہوتا ہے آہستہ آہستہ وہ اسے توڑتا ہے ۔ توڑنے سے مراد مختلف اشیا اور حوادث الگ الگ کرنا اور ان کے درمیان روابط قائم کرنا ہے ۔ تحسسات کے ذریعے وہ اشیا کے خواص سے واقفیت حاصل کرتا ہے ۔ اس کے الگ الگ زمرے اور گروہ بناتا ہے ۔" وہ مختلف آوازیں سنتا ہے لیکن چند ایک آوازیں وہ دوسروں سے الگ کر لیتا ہے ۔ یہ آوازیں اس کی ماں کی ہوں گی ، پھر ماں کی آوازوں میں بھی تمیز کرتا ہے ۔ کوئی پیار کی آواز ہوگی کوئی جھڑک کی ، کوئی دودھ پلانے کی ، کوئی سلانے کی ، غرض کہ وہ ایک وسیع پس منظر سے مختلف اشکال کی بنا ڈالتا ہے ۔

اس سلسلہ میں کئی تجربات ہوئے ہیں ۔ زمین اور شکل کا تعین آسان

کام نہیں ۔ کبھی زمین شکل میں بدل جاتی ہے اور کبھی زمین شکل اختیار کر جاتی ہے ۔ مثلاً مندرجہ ذیل تصویر میں سفید جگہ بھی شکل بن سکتی ہے اور کالی جگہ بھی ۔

شکل کے لیے ضروری ہے کہ اس کی صورت متعین ہو سکے ۔ اگر زمین کے خدوخال واضح اور بین نہ ہوں تو اس کا شکل کی حیثیت اختیار کرنا آسان کام نہیں ۔ گانے کے ساتھ ساز بھی بجتا ہے ۔ ساز پس منظر کا کام دیتے ہیں ۔ کئی لوگوں کو سازوں کا احساس بھی نہیں ہوتا وہ صرف گانے سے حظ اٹھاتے ہیں ۔ ہاں جب گانا بند ہو جائے تو پھر ساز سنائی دیتے ہیں ۔ تب ساز شکل کی صورت اختیار کر لیتے ہیں ۔



ووڈورتھ کہتا ہے کہ ادراک کا اہم فریضہ زمین سے اشکال کو التباس اور اجاگر کرنا ہے ۔ مشاہدے کا مطلب ہی پس منظر سے اردات اور اشیا کو علیحدہ کرکے ان کے وقوف حاصل کرنا ہے ۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر تحسسات کے گروپ بنانا ادراک کا خاصہ ہے تو یہ گروپ بندی کن اصولوں کے تحت معرض ظہور میں

آتی ہے ۔ اس ضمن میں کوہلر (Kohler) اور ورديمر (Wertheimer) نے بیش بہا کام کیا ۔ ان کے خیال میں مہیجات میں مندرجہ ذیل عناصر گروپ بندی کا باعث بنتے ہیں ۔

(ا) قرب : جو ستارے ایک دوسرے کے قریب ہوں گے ان کا گروپ بہ نسبت ان ستاروں کے جو ایک دوسرے سے دور ہوں آسانی سے بن جائے گا ۔

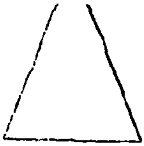
(ب) مشابہت : جو چیزیں ایک دوسرے سے ملتی ہوں گی ان کا گروپ آسانی سے بن جائے گا ۔ اگر نقطے دو قسم کے ہوں تو نقطوں کی مشابہت کی بنا پر دو گروپ بنیں گے ۔

(ج) تسلسل : جو نقطے سیدھی لکیر میں آئیں یا ایک مسلسل منحنی بنائیں ۔ ان کا بھی آسانی سے گروپ بن جاتا ہے ۔

یہ عناصر بصری اور سمعی تحسسات دونوں میں کام کرتے ہیں اگر نقارہ یا ڈھول تین دفعہ جلد جلد بجے تو ان آوازوں کا ایک گروپ بنے گا۔ لیکن اگر ٹھہر ٹھہر کر آدہ آدہ گنٹے کا وقفہ دے کر تین دفعہ بجایا جائے تو پھر ان آوازوں کا گروپ نہیں بن سکے گا ۔ آرکسٹرا سنتے ہوئے اونچی سروں کا ایک گروپ بن جاتا ہے ۔ عورتوں اور مردوں کی مخلوط پارٹیوں میں عورتوں کا گروپ (ادراکی لحاظ سے) مردوں سے علیحدہ بن جائے گا ۔ جن گانوں میں سروں کا سلسلہ بنتا ہے وہاں اونچے سلسلے کی سریں نیچے سلسلے کی سروں سے علیحدہ گروپ بناتی ہیں ۔

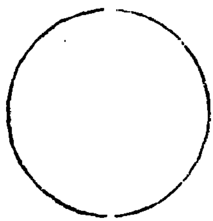
مندرجہ بالا تین عناصر کے علاوہ کافکا (Koffka) دو اور عناصر کا ذکر کرتا ہے ۔

(د) تکمیل (Closure) : اگر کوئی شکل ادھوری ہو تو اسے مکمل کر لیا جاتا ہے۔ مثلاً شکل نمبر ۱ کو دو زاویوں کی حیثیت سے نہیں دیکھا جائے گا اور نہ ہی اسے تنگ منہ والا برتن کہا جائے گا بلکہ اسے منہ کھلی تکون کہا جائے گا۔ اسی طرح سے



شکل نمبر ۱

شکل نمبر ۲ کو دو قوسین نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ ٹوٹا ہوا گول دائرہ کہا جائے گا۔ ہر انسان میں فطری میلان موجود ہے کہ وہ گسٹالٹ کو مکمل کر دے۔



شکل نمبر ۲

(س) یگانہ پن (Uniqueness) : ادراک میں یگانہ پن کا عنصر بھی بہت نمایاں ہے۔ مثلاً ایک پرندے کو سدھایا گیا کہ خوراک لیتے وقت اسے الٹے گملے سے ہو کر جانا ہوگا۔ اس گملے کو مختلف اشیا میں رکھ دیں اگر الٹا ہوگا تو پرندے کو خوراک تک پہنچنے میں کوئی دقت نہ ہوگی۔ لیکن اگر یہ ٹھیک طرح اُلٹا نہ ہو یا سیدھا ہی رکھ دیا گیا ہو تو پرندہ ادھر اُدھر تلاش میں مارا مارا پھرے گا۱۔

۲۔ **عادات کا اثر :** نمبر ایک میں گروپ بندی پر زور دیا گیا اور خارجی ماحول میں اس امر کے اسباب پائے گئے۔ قرب، مشابہت اور تواتر، ایسے عناصر میں جن کا تعلق مہیج سے ہے۔ لیکن ادراک کا دار و مدار بیرونی تأثرات کے علاوہ عضویہ کی اندرونی کیفیات پر بھی

۱۔ ملاحظہ ہو ڈیشیئل Dashiel کی کتاب Fundamental of General Psychology، صفحہ ۹۴۴ -

ہے - اس سلسلے میں فرد کی گزشتہ زندگی اور عادات بڑے زبردست عوامل ہیں - ہر شے کو گزشتہ تجربات کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے - اگر بچے اور جوان ایک ہی آواز سنیں تو ان دونوں کے ادراک مختلف ہوں گے - کیونکہ ان کے تجربات ایک جیسے نہیں - اسی طرح دیہاتیوں اور شہریوں کے ادراک میں فرق ہوگا کیونکہ ان کی زندگیاں مختلف ماحول میں گزرتی ہیں اور مختلف طریقوں پر پرورش پاتی ہیں - اس حقیقت کو زیر تجربہ لانے کے لیے ایک روشنی اور سایے کی پلیٹ کو لے کر مختلف طریقوں سے گھمایا جاتا ہے - ہر معمول اس کے مختلف پہلوؤں کو اپنی گزشتہ زندگی اور تجربات کی روشنی میں دیکھتا اور بتاتا ہے - اسے پتہ ہوتا ہے کہ روشنی اوپر سے نیچے آتی ہے اور سایہ چھوڑتی ہے - اسی طرح روشنی اور سایے سے محدب اور مجوب شکلوں کا اسے علم ہے - اس کے علاوہ اور بیسیوں تجربات اسے حاصل ہیں جو روشنی اور سایے کی پلیٹ کو مختلف حالتوں میں دیکھنے میں ممد ثابت ہوتے ہیں -

جنگ کے دنوں میں چرچل اپنی انگلیوں سے وی (V) بناتا تھا اور لوگ سمجھ جاتے تھے کہ (V) سے مراد وکٹری (Victory) یعنی فتح ہے - گونگوں کے اشارے ان کی ماں سمجھ جاتی ہے - گزشتہ تجربوں سے اسے پتہ ہوتا ہے کہ کون سا اشارہ کس مطلب کے لیے استعمال ہو رہا ہے -

عادتوں کا اثر ادراک پر دیکھنے کے لیے جو تجربات ہوئے ہیں ان میں سے ایک استقلال (Constancy) پر ہے - اشیا کو مختلف حالات میں رکھیے ان کا رنگ بدل دیجیے لیکن انھیں اسی طرح (یعنی عادت کے بموجب) دیکھا جائے گا - جس رنگ اور سائز میں کسی شے کو دیکھا ہے وہ رنگ اور سائز قائم رہے گا خواہ موجودہ رنگ اور سائز کچھ ہی ہو - مستطیل میز کو دیکھیں خواہ دیکھنے میں

مستطیل نہ لگے لیکن ہم اسے مستطیل ہی کہیں گے کیونکہ دراصل اس کا ہر زاویہ ۹۰ درجے کا ہے ۔ ایسے ہی بجلی کی تیز روشنی میں خواہ کمرے کی چیزیں کیسی ہی لگیں ہم انھیں صحیح طور پر پہچان لیتے ہیں ۔

استقلال کا اثر دیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ مشاہدہ کرنے والے کو علم ہو کہ وہ اشیا کو غیر معمولی حالات میں دیکھ رہا ہے ۔ اگر دھوپ کی روشنی میں کوئلے کو ایک سوراخ سے دیکھا جائے تو وہ مٹیالے رنگ کی کوئی چیز دکھائی دے گا ممکن ہے سفید کاغذ ہی لگے ۔ لیکن اگر زیر تجربہ فرد کو علم ہو کہ وہ کوئلے کو غیر معمولی حالات میں دیکھے گا تو اسے مٹیالے رنگ کی بجائے کالا رنگ دکھائی دے گا ۔

عادتوں کا اثر ان مواقع پر غالب نظر آتا ہے جب غیر معمولی حالات میں جانے پہچانے مہیجات آ جائیں ۔ مثلاً ایک شخص کے دونوں کانوں پر صوتی آلے لگا دیے گئے ان کی نالیاں ایک دوسرے کو کاٹتی تھیں ۔ اس لیے بائیں طرف کی آوازیں دائیں کان میں جاتی تھیں اور دائیں طرف کی آوازیں بائیں کان میں ۔ ان صوتی آلوں کو پہن کر وہ سڑک پر جا رہا تھا ۔ اچانک اس نے دو عورتوں کی آوازیں سنیں جو اس کے پیچھے آ رہی تھیں ۔ اسے خیال ہوا کہ وہ دائیں جانب سے آ رہی ہیں ۔ اس لیے وہ بائیں جانب ہو گیا تا کہ وہ عورتیں گزر جائیں ۔ جب اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اسے پتہ چلا کہ وہ عین عورتوں کے سامنے آن کھڑا ہوا ہے ۔ ایسا ہی تجربہ آنکھوں پر کیا گیا ۔ دونوں آنکھوں پر عدسے پہنا دیے گئے تا کہ بائیں ہاتھ والی چیزیں دائیں ہاتھ دکھائی دیں اور اوپر والی چیزیں نیچے ۔ اس طرح بھی بے شمار غلطیاں ہوئیں کیونکہ لوگ اپنی عادت کے بموجب رد عمل کرتے ہیں ۔ بندر پر بھی ایسا تجربہ کیا گیا ۔ پہلے اسے خوراک تک

پہنچنے کی تربیت دی گئی پھر اس کی آنکھوں پر ایسے عدسے لگا دیے گئے کہ اسے آوپر کی چیز نیچے اور نیچے کی چیز آوپر دکھائی دے ۔ اور ایسے ہی بائیں ہاتھ والی چیز دائیں ہاتھ اور دائیں ہاتھ والی چیز بائیں ہاتھ دکھائی دے ۔ عدسے پہننے کے بعد شروع میں بندر بالکل خاموش بیٹھ گیا کھانا تک چھوڑ دیا ۔ دوسرے دن اس نے آنکھیں کھولیں ہاتھ پاؤں مارے لیکن ان میں کوئی ربط نہ تھا ۔ وہ خوراک نہیں پکڑ سکتا تھا ۔ ایک ہاتھ کی حرکات دوسرے ہاتھ کی حرکات میں دخل دیتی تھیں ۔ کئی دفعہ بندر اچھلا کودا لیکن کچھ بن نہ آئی ۔ سات دن کے بعد کچھ توافق پیدا ہوا ۔ وہ کمرے میں ادھر آدھر گیا ، سیڑھیاں چڑھا ، پنجرے کا دروازہ کھولا ، الماری پر چڑھ گیا اور نارمل دکھائی دینے لگا ۔ ہفتہ کے بعد عدسے اتار دیے گئے ، بندر نے آنکھیں جھپکیں اچھلا کودا اور حسب معمول دیکھنا شروع کیا ۔

ان تجربوں سے تین امور کا پتہ چلتا ہے :

(ا) جب آنکھوں پر عدسے چڑھا کر معمول (یعنی عادتی ادراک) کو خراب کیا گیا تو جانوروں اور انسانوں کا نظام (یعنی مہیج اور رد عمل کا عادتی طریقہ) درہم برہم ہو گیا ۔

(ب) آہستہ آہستہ ایک نیا نظام معرض ظہور میں آیا جو ان بدلے ہوئے حالات میں عضویہ کا معاون ثابت ہوا ۔

(پ) جب پرانا نظام واپس لایا گیا تو پرانی عادتوں نے فوراً ہی قبضہ جما لیا اور دوبارہ مہیج اور رد عمل کا پرانا طریقہ عمل میں آ گیا ۔

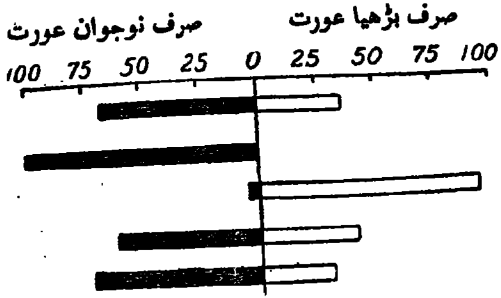
لیشلی (Lashley) اور اس کے رفقائے کار نے ایک تجربہ بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ چند بندر کے بچوں کو اندھیرے میں کچھ مہینوں کے لیے پالا گیا ۔ جب انھیں روشنی میں لایا گیا تو وہ بڑے پریشان ہوئے ۔ ان کی آنکھیں صحیح سالم تھیں لیکن آنکھوں سے کچھ مدد نہیں

لے رہے تھے یہ تجربہ بھی عادت کا اثر ظاہر کرتا ہے۔

۳۔ عارضی ذہنی حالت (Temporary Set) کا ادراک پر اثر : جس شغل میں کوئی شخص عارضی طور پر مصروف ہو۔ اس کا ادراک پر اثر پڑتا ہے۔ تأثرات کو بامعنی بنانے کے لیے جہاں عادات کو دخل ہے وہاں عارضی اشغال کی بڑی اہمیت ہے۔ مصروفیت خواہ مستقل ہو یا عارضی ہر شے پر اثر چھوڑتی ہے۔ اگر سرگرمیوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو ادراک کی توضیح ادھوری رہ جاتی ہے۔ مندرجہ ذیل تجربہ اس امر کی تشریح کرے گا۔

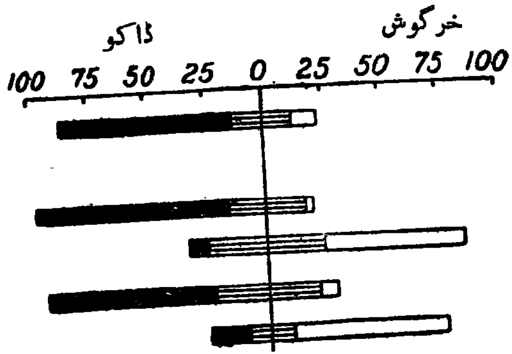
چند طلبا کو ایک مبہم مرکب شکل (Ambiguous Composite Figure) پردہ سکرین پر دکھائی گئی اور انہیں کہا گیا کہ جو کچھ وہ دیکھتے ہیں اسے صیغہ تحریر میں لے آئیں۔ ان طلبا کو کنٹرول گروپ بنایا گیا۔ پھر اور طلبا لیے گئے انہیں ان مبہم مرکب اشکال میں چھپی ہوئی تصویریں علیحدہ دکھا دی گئیں یہ چھپی ہوئی تصویریں بڑھیا، خرگوش، نوجوان عورت اور ڈاکو کی تھیں۔ ان تصویروں کے بعد وہی مبہم مرکب اشکال ان طلبا کو پردہ سکرین پر دکھائی گئیں اور کہا گیا کہ جو کچھ وہ دیکھتے ہیں لکھ دیں۔ اس کے بعد اور طلبا لیے گئے، جنھیں زبانی بتا دیا گیا کہ وہ نوجوان لڑکی یا بڑھیا یا مرد یا خرگوش دیکھیں گے۔ پھر انہیں بھی وہی مبہم تصویریں دکھائی گئیں اور حسب سابق ہدایت کی گئی کہ وہ جو دیکھیں لکھ دیں۔ نتائج حسب ذیل تھے :

بڑھیا اور نوجوان عورت کی مبہم تصویر :



جس گروپ کو تیار نہیں کیا گیا
,, ,, ,, نوجوان عورت دکھائی گئی
,, ,, ,, بڑھیا ,, ,, ,,
,, ,, ,, زبانی نوجوان عورت کے متعلق بتایا گیا
,, ,, ,, ,, بڑھیا ,, ,, ,, ,, ,,

خرگوش اور ڈاکو والی مبہم تصویر :



جس گروپ کو تیار نہیں کیا گیا
,, ,, ,, ڈاکو دکھا دیا گیا
,, ,, ,, خرگوش ,, ,,
,, ,, ,, زبانی ڈاکو کے متعلق بتا دیا
,, ,, ,, ,, خرگوش ,, ,, ,, ,, ,,

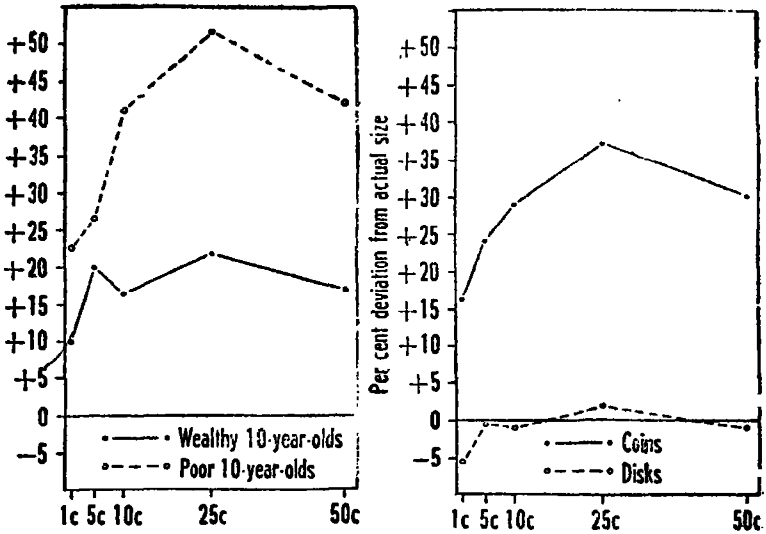
اس تصویر میں ▬ سے مراد فی صد ڈاکو دیکھنے والے۔
[ ] سے مراد فی صد خرگوش دیکھنے والے اور [☰] سے مراد
فی صد خرگوش اور ڈاکو کے علاوہ کچھ اور دیکھنے والے ہیں۔

اس تجربے سے ثابت ہوا کہ جس شے کی دید کے لیے کوئی شخص تیار ہو وہ آسانی سے دیکھی جا سکتی ہے۔ یوں بھی جو شخص کسی شے کی تلاش میں ہو وہ شخص دوسروں کی نسبت اس شے کو جلد دیکھ لیتا ہے۔ جو سائنسدان جڑی بوٹیوں کی تلاش میں پہاڑوں پر چکر لگاتا ہو اسے وہ جڑی بوٹیاں مل جائیں گی دوسرا آدمی جو ان کی تلاش میں نہ گیا ہو انھیں نظر انداز کر جائے گا۔ عید کا چاند بھی متلاشیوں کو دکھائی دیتا ہے۔ دوسرا اگر آسمان پر نگاہ بھی ڈالے لیکن چاند کی تلاش میں نہ ہو تو اسے شاید چاند دکھائی ہی نہ دے۔

۴۔ اقدار (Values) کا ادراک پر اثر: پہلے تینوں نقاط نے ادراک کے متعلق چند امور واضح کیے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کیسے دیکھتا اور سوچتا ہے۔ مہیجات، عادات اور مصروفیت کس طرح ادراک کو متاثر کرتی ہیں۔ لیکن ابھی ایک اور پہلو رہتا ہے، جس کا اثر بھی ادراک پر نمایاں ہے۔ انسان صرف وقوف اور تعقلی حیوان ہی نہیں بلکہ اقدار اور مقاصد بھی رکھتا ہے۔ یہ بھی ادراک پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ اس امر کی وضاحت مندرجہ ذیل تجربے سے ہوتی ہے۔

دس دس سال کے بچوں کے دو گروپ لیے گئے۔ ایک گروپ امیر گھرانے اور دوسرا غریب گھرانے کے بچوں پر مشتمل تھا۔ انھیں کہا گیا کہ وہ قرص (Disc) کا سائز پیسے، ادھنے، اٹھنی اور روپے کے برابر بنائیں۔ یہ قرص ایک دھبے سے بنتی تھی جو سکرین پر روشنی سے بنتا تھا۔ اس دھبے کو ۱/۸ سے لے کر ۲ انچ تک چھوٹا بڑا کیا جا سکتا تھا۔ سکے کو بائیں ہاتھ میں پکڑ کر ہر بچہ دائیں ہاتھ سے بٹن دبا کر کوشش کرتا تھا کہ دھبے کا سائز سکے کے برابر بن جائے۔ ان کے علاوہ

ایک کنٹرول گروپ بنایا گیا جسے سکوں کی بجائے گتے کے گول گول ٹکڑے جو سکوں کے برابر تھے دیے گئے - انھوں نے بھی دھبے کا سائز[1] ٹکڑوں جتنا بنانا تھا - نتائج حسب ذیل ہیں :



(ب) B A (الف)

الف (A) چارٹ یہ ظاہر کرتا ہے کہ بچوں کو روپیہ پیسہ بڑا نظر آتا ہے - گتے کے ٹکڑوں کا گراف نیچا چل رہا ہے اور سکوں والا بہت اونچا جا رہا ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ بچہ روپے پیسے کو اصلی سائز کی نسبت ہمیشہ بڑا دیکھتا ہے -

ب (B) چارٹ بتاتا ہے کہ امیر بچوں کی نسبت غریب بچوں کا روپیہ پیسہ بہت بڑا دکھائی دیتا ہے - گراف کو دیکھیے غریب بچوں کا

۱- یہ تجربہ ایف - ایس برنر (F. S. Burner) اور سی سی گڈمین (C. C. Goodman) نے کیا ہے -

لٰہذا محسسات کو ترتیب دیتے ہوئے اور ان کی توضیع کرتے وقت صرف انہی تأثرات کو نہیں دیکھا جاتا جو خارج سے آ رہے ہوں ، بلکہ ادراک کی تعمیر میں انسان کی ساری شخصیت حصہ لیتی ہے۔ یہ مفروضہ رورشا (Rorschah) آزمائشوں کی تہہ میں ہے اور تمام ماہر نفسیات نے اسے تسلیم کر لیا ہے۔

ادراک میں مختصر اشارے (Reduced Cues) :

گو ادراک کی بنیاد محسسات پر ہے لیکن شاذ ہی کوئی ادراک (Percept) ہوگا جس میں شے یا واردے کو مکمل دیکھا جاتا ہے اکثر کچھ اشارے دیکھے جاتے ہیں ، انہیں بامعنی بنا لیا جاتا ہے۔ یہ اشارے خود بھی بڑے کمزور ہوتے ہیں اور انہیں شناخت کرنا بھی آسان کام نہیں ہوتا۔ ضروری نہیں کہ جو شخص اشارے وصول کر رہا ہو وہ انہیں صحیح طور پر تشخیص بھی کر لے۔ تجربے کے طور پر ایک آدمی کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے کرسی پر بٹھا دیا جاتا ہے۔ تجربہ کنندہ اس شخص کے کان سے پرے لیکن ایک جیسے فاصلہ پر مختلف سمتوں سے ٹک ٹک کی آوازیں پیدا کرتا ہے۔ اس آدمی نے یہ بتانا ہوتا ہے کہ آواز کس طرف سے آ رہی ہے۔ اس سلسلے میں معمول سے بے شمار غلطیاں ہوتی ہیں۔ اگر معمول سے دریافت کیا جائے کہ وہ آواز کا مقام کیسے متعین کرتا ہے ، تو وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے گا۔ وہ جواب میں صرف یہ کہتا ہے کہ اسے محسوس ہوتا ہے کہ آواز فلاں سمت سے آ رہی ہے۔ لیکن نہ تو وہ آواز کے خواص بیان کر سکتا ہے اور نہ ہی اشاروں کو متعین کر سکتا ہے۔

صوتی آلوں سے متذکرہ بالا خامیوں کو دور کیا جا سکتا ہے۔ ایک تجربے میں ہوائی نالیوں کے ذریعہ صوتی آلہ (Ear-phone) کا تعلق گھٹنے بڑھنے والی آواز سے قائم کر دیا گیا۔ اس لیے کان تک پہنچنے والی لہروں کی شدت میں کمی بیشی ممکن تھی۔ لہروں کی کیفیت میں

بھی تبدیلی کی جا سکتی ہے ۔ اگر آواز کو متعین کرتے ہوئے معمول سے غلطی سرزد ہو تو معلوم ہوجاتا ہے کہ لہروں میں کون سی خامی یا تبدیلی آ گئی جن کی وجہ سے غلطی ہوئی ہے ۔ اس آلہ سے صاف صاف پتہ چل جاتا ہے کہ آواز کا مقام کیسے متعین ہوتا ہے فوج میں بڑے بڑے صوتی آلے ہوتے ہیں ، جن سے دشمن کے ہوائی جہازوں کا مقام ، جہازوں کی آواز سے معلوم کیا جاتا ہے ۔ انسانی کان کے پاس وہ سہولتیں نہیں جو صوتی آلے کو نصیب ہیں ، اس لیے کان کو تھوڑا سا پتہ تو چل سکتا ہے کہ آواز کدھر سے آ رہی ہے لیکن غلطی کا امکان رہتا ہے ۔

کسی ڈاکٹر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب وہ مریض کے کمرے میں داخل ہوتا تھا تو اُسے مرض کا علم ہو جاتا تھا ۔ جو ٹسٹ بعد میں لیے جاتے تھے وہ اس کے قیافے کی توثیق کرتے تھے ۔ ڈاکٹر یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اس کا قیافہ کیسے پیدا ہوا یا اس کی تعمیر میں کون سے عناصر شامل ہیں ۔ لیکن اگر نفسیاتی لحاظ سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر کا قیافہ چند ایک ادراکی اشاروں پر مبنی ہونا چاہیے گو یہ اشارے کیسے ہی مبہم اور کمزور کیوں نہ ہوں ۔

انگلینڈ میں پہلے پہل تحلیلی (Analytic) طریقے سے جہازشناخت کرنے کی تربیت دی جاتی تھی یعنی پہلے بازو (Wings)، پھر انجن (Engine) پھر بدنہ (Fuselage) پھر دم (Tail) کو پہچاننا ضروری تھا۔ ان چاروں انگریزی لفظوں کے پہلے حروف ملانے سے لفظ W-E-F-T بن جاتا ہے ۔ کچھ عرصہ کے بعد پتہ چلا کہ تحلیلی طریقہ بالکل بے کار ہے جہاز کو بہ ہیئت مجموعی چند اشاروں کی بنا پر شناخت کرنا چاہیے ۔ پھر یہ لفظ (W-e-f-t)ٹھٹھے مخول کے لیے "Wrong every fool time" بن گیا ۔

گزشتہ باب میں ہم نے ایک گھوڑے کا ذکر کیا جو سوالوں کے صحیح جواب بتا دیتا تھا لیکن اس کا صحیح جواب بتا دینا اس امر پر

موقوف تھا کہ صحیح جواب جاننے والا شخص گھوڑے کے سامنے موجود ہو ، کوئی ایسا آدمی وہاں موجود نہ ہو تو گھوڑا صحیح جواب نہیں دے سکتا تھا ۔ یہ عقدہ کیسے کھلا اس کا بیان آ چکا ہے ۔ گھوڑا کچھ اشارے سمجھ لیتا تھا اور ان سے صحیح جواب کا اندازہ لگا لیتا تھا ۔ ایسے ہی دل کی بات بتانے والے بھی چند ایک اشاروں پر کام کرتے ہیں ۔ چہرے سے ، جسمانی حرکات سے اور شاید الفاظ سے جو سائل کے منہ سے اتفاقاً نکل پڑتے ہیں ، نجومی دل کی بات بوجھ لیتے ہیں ۔ سودا بیچنے والوں (Salesman) کو بھی علم ہو جاتا ہے کہ اب گاہک خریدنے پر آمادہ ہو گیا ہے ۔ شاید گاہک کے چہرے پر کچھ خاص قسم کے آثار نمودار ہوتے ہیں ۔ یا وہ کرسی پر خاص انداز سے بیٹھ جاتا ہے یا اشیائے مطلوبہ کو للچاتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا ہے ۔ یہ سب اشارے ہیں (ناکافی اور کمزور) جن کی بنا پر سیلزمین اندازہ لگا لیتا ہے کہ اب گاہک پھنس گیا ۔

اشاروں کا ذکر کرتے ہوئے ابھی تک انہی اشاروں کو بیان کیا گیا ہے جو حسی ہیں یا حسیات سے تعلق رکھتے ہیں ۔ گھوڑا جواب جاننے والوں کے چہرے دیکھ کر جواب دیتا ہے ۔ سیلزمین گاہکوں کے چہرے کے آثار اور دیگر حرکات سے قیافہ لگاتا ہے کہ چیز خریدی جائے گی وغیرہ وغیرہ ۔ لیکن ان اشاروں کے علاوہ ایک اور قسم کے اشارے بھی ہیں ، جنہیں علامتی اشارے (Symbols) کہا جاتا ہے ۔ الفاظ ایک قسم کے علامتی اشارے ہیں ، پلاؤ کا لفظ اصل پلاؤ نہیں لیکن اس لفظ سے منہ میں پانی آ جاتا ہے اور وہ سارا رد عمل ظاہر ہوتا ہے جو اصل پلاؤ کھانے پر ہونا چاہیے ۔ الفاظ میں بڑی طاقت ہے ۔ اصل پلاؤ خراب ہو سکتا ہے لیکن لفظ پلاؤ خراب نہیں ہوتا ۔ اسی طرح پلاؤ ختم ہو سکتا ہے کیونکہ یہ ایک عارضی شے ہے ۔ لیکن پلاؤ کا لفظ عارضی نہیں ، اس کے ختم ہونے کا کوئی امکان نہیں ۔ الفاظ سے

ہم ماضی ، حال اور مستقبل پر قابو پالیتے ہیں ۔ دیکھی اور ان دیکھی دونوں قسم کی اشیا ہمارے احاطۂ اقتدار میں آ جاتی ہیں ۔

علامتیں سوشل حالات میں تولد پاتی ہیں ۔ زبان سوسائٹی کی پیداوار ہے ، اس سے لوگوں کے درمیان رشتے استوار ہوتے ہیں ۔ جب کوئی شخص اپنا مافی‌الضمیر الفاظ سے عیاں کرتا ہے تو اس کا رابطہ سامعین کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے ۔ اشاراتی مہیجات کا رد عمل بھی اشاراتی ہوتا ہے ۔ اشیا کی جگہ الفاظ لے لیتے ہیں ۔ اور ان الفاظ سے خیالات میں بے اندازہ وسعت پیدا ہوتی ہے ۔ علامتوں کے بعد ہمارا ادراک علامتی ہو جاتا ہے ۔ اشاروں کا تعلق کچھ نہ کچھ اشیا سے ضرور ہوتا ہے لیکن علامتوں کا کچھ بھی نہیں ہوتا ۔

ٹیچنر (Titchner) کے مطابق ادراک کے ارتقا میں پہلی منزل جسے وہ خالص ادراک (Pure Perception) کہتا ہے اشیا کو خارجی حواس سے درک کرنا ہے ۔ دوسری منزل جسے مخلوط ادراک (Mixed Perception) کہا جاتا ہے یہاں پر کچھ اشارے اشیا سے آتے ہیں اور کچھ مطالب ذہن سے نکلتے ہیں ۔ ان کے امتزاج سے اشیا کا علم ہوتا ہے ۔ تیسری منزل جسے اشاراتی ادراک (Symbolic Perception) کہا جاتا ہے ، الفاظ کی منزل ہے ۔ اشیا کی بجائے الفاظ کا ادراک کیا جاتا ہے ۔ تیسری منزل اعلیٰ ترین منزل ہے اور یہ صرف انسانوں کو نصیب ہے ۔ ادنیٰ حیوان پہلی منزل تک رہ جاتے ہیں ۔ اعلیٰ حیوان دوسری منزل تک پہنچ جاتے ہیں ۔ صرف انسان تیسری منزل تک پہنچتے ہیں اور اسی میں انسانوں کی برتری ہے ۔

بصری ادراک (Visual Perception)

کھڑکی سے باہر دیکھیں تو طرح طرح کی اشیا نظر پڑتی ہیں ۔ یہ اشیا مختلف رنگوں کی، مختلف سائزوں کی اور مختلف شکلوں کی ہیں ۔ ان کا ادراک ان کے محسوسات سے بہت مختلف ہے ۔ محسوسات میں صرف

اشیا کے خواص کا پتہ چلتا ہے، رنگوں ، بوؤں ، آوازوں وغیرہ کا علم ہوتا ہے۔ لیکن ان محسسات کو مجتمع کرکے انھیں اشیا کی طرف منسوب کرنا انسانی ذہن کا ایک بہت بڑا کرشمہ ہے۔ منتشر حسی تجربات کے درمیان ربط قائم کرنا اور پھر ان سے اشیا کی طرف جانا ذہن کا اہم فریضہ ہے۔ بعض دفعہ ادراک سے حسوں کی طرف بھی جاتے ہیں۔ مثلاً مصور کا کام نیچر کو اس طرح پیش کرنا ہے جیسے وہ آنکھ کو دکھائی دیتی ہے۔ نہ صرف رنگوں کو بلکہ فاصلہ، دوری، روشنی اور سایہ اور تناظر (Perspective) کو بھی قدرتی طریقہ پر پیش کرنا ہوتا ہے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لیے بڑے تجربے اور سوچ و بچار کی ضرورت ہے۔ ذیل میں چند ایک امور کی تشریح آتی ہے۔

فاصلے کا ادراک کیسے کیا جاتا ہے:

اس سوال کے جواب میں کئی چیزوں کا ذکر آئے گا کیونکہ فاصلے کا تعین مختلف عوامل کا متحدہ فعل ہے، عناصر یہ ہیں۔ (۱) دیکھنے میں کسی شے کی اضافی اونچائی۔ (۲) ایک شے کا دوسری سے پہلے آ جانا (۳) ظاہری سائز (۴) واضح اور بین ہونا۔ مبہم اور دھندلی شے کو صاف اور بین شے کے مقابلے میں دور خیال کیا جاتا ہے (۵) رنگ، جب رنگ کی لہریں کرۂ ہوائی سے گزرتی ہیں تو ان کا رنگ بدل جاتا ہے۔ مثلاً جو درخت نزدیک سے سبز نظر آتے ہیں وہ دور پہاڑوں پر نیلگوں نظر آئیں گے۔ (٦) روشنی اور سایہ، سائے سے فاصلے کا پتہ چلتا ہے۔ روشنی کی مقدار بھی فاصلہ بتاتی ہے (۷) ظاہری حرکت، مہیجات کی سمت بدل جانا بھی فاصلے کی اطلاع دیتا ہے۔

یہ ساتوں اصول مصوری، فوٹوگرافی اور اسٹیج تیار کرنے میں استعمال ہوتے ہیں۔ کسی مصور سے پوچھیے کہ وہ فاصلہ کیسے دکھاتا ہے تو وہ ان اصولوں کو بیان کرے گا۔ ان کے علاوہ دو اور اصول دیکھیے (۸) عدسہ کا ماسکہ پر آنا۔ یہ ہر پچاس فٹ

پر بدل جاتا ہے اسی طرح مژگانی عضلات (Ciliary Muscles) جو آنکھ کو ماسکہ پر لے آتے ہیں، عضلی تحسسات پیدا کرتے ہیں۔ ان سے بھی فاصلے کی اطلاع وصول ہوتی ہے (۹) دو چشمی بصارت میں ڈھیلوں کا سکڑنا اور پھیلنا (Convergence and Divergence of Eyeballs in Binocular Vision)۔ ہر ڈھیلے کے ساتھ کچھ عضلات ہیں جو مل کر آنکھوں کو اس مقام پر لے آتے ہیں کہ اشیا خواہ دور ہوں یا نزدیک آنکھوں کے مرکز پر آ پڑیں۔ ان سے جو تحسسات اٹھتے ہیں ان سے بھی فاصلے کا علم ہوتا ہے۔ ہماری دو آنکھیں ایک ہی شے کی دو قدرے مختلف تصویریں لے لیتی ہیں۔ ان کی آمیزش سے چیزوں کے ٹھوس ہونے کا علم ہوتا ہے۔ حجم بین (Stereoscope) سے اس امر کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ اس سے ایک ہی شے کی دو مختلف تصویریں شبکیہ پر پڑتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ شے صرف لمبی چوڑی دکھائی نہیں دیتی جیسے تصویر ہوتی ہے بلکہ ٹھوس نظر آتی ہے، ایسے ہی اگر دو کیمروں سے ایک ہی شے کی دو تصویریں لیں اور کیمروں کے عدسوں کا فاصلہ آنکھوں جتنا ہو تو ٹھوس تصویر آئے گی اگر فاصلہ زیادہ ہوگا تو ٹھوس پن زیادہ ہو جائے گا۔ ہوائی جہازوں سے جب نیچے کی عمارتوں کی تصویر لینی ہوتی ہے تو کیمرے کے عدسوں کا فاصلہ آنکھوں کے فاصلے سے زیادہ کر دیا جاتا ہے تاکہ عمارتوں کی بلندی اچھی طرح نظر آئے۔

چیزیں سیدھی کیسے دیکھتے ہیں؟

ہمارے شبکیہ پر چیزوں کا عکس الٹا آتا ہے اگر درخت کو دیکھیں تو پتے اور شاخیں تو نیچے آئیں گی اور جڑیں اوپر۔ لیکن ہم چیزوں کو الٹا نہیں دیکھتے بلکہ ان کے صحیح انداز میں دیکھتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ سٹریٹن (Stratten) نے ایک شخص کو عجیب سے عدسے پہنا دیے۔ ان سے ہر چیز الٹی دکھائی دیتی تھی۔ پہلے پہل

تو اسے بڑی تکلیف ہوئی - اس کے مہیج اور رد عمل کا سارا نظام بگڑ گیا - چیزیں پکڑنے کے لیے وہ غلط سمت بھاگ پڑتا تھا - جس چیز سے وہ بچنا چاہتا تھا اسی میں جا گرتا تھا - ایک ہفتے کے بعد یہ شخص کچھ سنبھل گیا - پرانے نظام کی جگہ نیا نظام پیدا ہو گیا - اب وہ چل پھر سکتا تھا اور اپنا کام کاج کر لیتا تھا - ہفتے کے بعد اس کے عدسے اتار دیے گئے - پہلے تو کچھ حیران ہوا لیکن جلد ہی پرانا نظام عود کر آیا - اس تجربے سے ثابت ہوتا ہے کہ چیزوں کو سیدھا دیکھنا دو امور پر منحصر ہے ایک بصارت اور دوسرا حرکات پر[1]۔

اشیا کی صورت اور سائز کیسے دیکھی جاتی ہے :

یہاں پر بھی فاصلہ دیکھنے والے اصول کام دیتے ہیں - دو آدمیوں کو دیکھیں جو ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہوں - چاہے ان کا قد ایک جیسا ہو لیکن دیکھنے میں ایک بڑا اور دوسرا چھوٹا دکھائی دے گا - کس نسبت سے اس فرق کو تصور میں ظاہر کرنا ہوگا ، اس کے لیے تربیت اور مہارت کی ضرورت ہے - یہی حال دوسری چیزوں کا ہے دیکھنے میں گول دائرہ گول نہیں ہوتا - تھوڑا سا بیضوی ہوگا - تصور میں اگر دائرے کو گول دکھائیں تو غلط ہوگا ، دائرہ جیسے دکھائی دیتا ہے ویسا ہی کھینچنا چاہیے -

یاد رہے کہ فاصلہ ، صورت اور سائز دیکھتے وقت انسان ایک سٹ (Set) یا ذہنی حالت میں ہوتا ہے - اور باوجود اس امر کے کہ رنگ اور سائز فاصلے سے بدل جاتے ہیں وہ اشیا کو اصلی روپ میں دیکھتا ہے لیکن ہر آدمی اس معاملے میں ایک جیسا درست نہیں ہوتا - چھبیس لڑکیوں کو دو قرص دکھائے گئے ، ایک میز کے کنارے سے پانچ فٹ پرے تھا دوسرا دس فٹ - نزدیک والے کا قطر ۴ انچ تھا ، دور

۱- ملاحظہ ہو ووڈورتھ کی Psychology، صفحہ ۲۵۱ -

والے ۵ قطر بھی ۴ انچ - لڑکیوں نے یہ بتانا تھا کہ کب دونوں قرص سائز میں برابر ہوتے ہیں - دور والے قرص کو چھوٹا بڑا کیا جا رہا تھا برابر ہونے کے لیے ضروری تھا کہ دور والے قرص کا قطر بھی ۴ انچ ہو - لڑکیوں نے اس معاملے میں بڑی غلطیاں کیں ان کا اوسط جواب 4½ انچ تھا - یعنی نصف انچ زیادہ -

رنگوں کو کیسے دیکھتے ہیں :

تیز یا مدھم روشنی میں چیزوں کے رنگ بدل جاتے ہیں ، لیکن اس کے باوجود ہم چیزوں کو اصلی رنگ میں دیکھ لیتے ہیں - اسے رنگوں کا استقلال (Constancy of Colours) کہا جاتا ہے - اس کا مفصل بیان پہلے آ چکا ہے اگر ایک ہی رنگ کے کاغذ کے دو ٹکڑے لیے جائیں اور ایک کو روشنی کے سامنے رکھیں اور دوسرے کو یونہی ، تو دونوں ٹکڑوں کے رنگ مختلف نظر آئیں گے - لیکن اس کے باوجود اصول استقلال کے تحت دونوں ٹکڑوں کے رنگ ایک ہی خیال کیے جائیں گے - اشیا سے شعاعیں آتی ہیں اور دوسرے ماحول میں روشنی ہوتی ہے - ہر انسان گھٹتی یا بڑھتی روشنی کا لحاظ کرکے اشیا کا ادراک کرتا ہے - جیسے فاصلہ جانچتے وقت ایک ذہنی حالت (Set) ہوتی ہے - ویسے رنگ جانچتے وقت بھی ذہنی سٹ ہوتا ہے - ان ذہنی سٹوں کی بدولت اصلی فاصلے اور رنگ کا احساس ہوتا ہے -

حرکت کیسے دیکھی جاتی ہے :

متحرک اشیا کو بھی ہماری آنکھ ویسے ہی آسانی سے دیکھ لیتی ہے جیسے ساکن کو - شبکیہ کے بیرونی حصے حرکت کو بھانپ لیتے ہیں اور آنکھوں کی جست لگانے والی (Saccadic) خاصیت جھٹ پٹ اشیا کو ماسکہ پر لے آتی ہے - لیکن متحرک تصویروں (Movies) سے حرکت کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے - پردہ سکرین پر ساکن تصویریں پھینکی

جاتی ہیں ۔ ان تصویروں میں حرکت کہاں سے آتی ہے ؟ ووڈورتھ کا کہنا ہے کہ حرکت کا ردعمل انسان کا اپنا ہے ۔ تصویروں میں اس کا وجود نہیں پایا جاتا کیونکہ تصویریں تو ساکن ہیں ۔ حرکت دیکھنے کا ایک سبب تو مثبت بعد شبیہ ہے ۔ ایک ہی حالت کی سینکڑوں تصویریں لی جاتی ہیں مثلاً بازو کو نیچے سے اوپر لے جانے تک بیسیوں تصویریں لے لی جائیں گی ان تصویروں کو جلد جلد یکے بعد دیگرے دکھایا جائے گا ہر تصویر بعد شبیہ چھوڑتی ہے اور پیشتر اس کے کہ بعد شبیہ کلیتاً ختم ہو جائے دوسری تصویر آ جاتی ہے ۔ یہ تصویر بھی بعد شبیہ چھوڑے گی اور پیشتر اس کے کہ یہ بالکل ختم ہو جائے تیسری تصویر آ جائے گی اعلیٰ ہذالقیاس ۔ اس طرح ایک تصویر کا دوسرے سے رابطہ پیدا ہو جائے گا اور تصویریں بجائے ساکن کے متحرک نظر آئیں گی ۔ ایک اور سبب جو پہلے سے زیادہ اہم ہے وہ ذہنی سٹ کا ہے ۔ ہر سنیما دیکھنے والا اس ذہنی کیفیت میں ہوتا ہے کہ وہ حرکت دیکھے گا لہٰذا وہ حرکت دیکھتا ہے ۔ بعض دفعہ جب ایک ہی پوزیشن کی بیسیوں ساکن تصویروں پر اس کی نظر پڑتی ہے تو اسے حیرانی ہوتی ہے کہ کیسے وہ ان تصویروں کو متحرک دیکھ سکا ۔ اس حیرانی کا حل تصویروں میں نہیں ملے گا ۔ کیونکہ تصویریں تو ساکن ہیں ۔ اس کا حل اسے اپنے ذہنی سٹ میں ڈھونڈنا ہوگا ۔

کئی دفعہ حرکت یونہی پیدا کر لی جاتی ہے ۔ ایک آنکھ بند کر کے چاند کو دیکھیے ، پھر اسے کھول کر دوسری آنکھ بند کر لیجیے ۔ چاند ایک طرف سے دوسری طرف جاتا دکھائی دے گا ۔ پھر اسے کھول کر دوسری آنکھ بند کر لیجیے ۔ اب چاند دوسری سمت جائے گا ۔ اسی طرح انگلی کو ناک کے سامنے رکھیے ۔ کبھی ایک آنکھ کھولیے کبھی دوسری آنکھ ، انگلی حرکت کرتی نظر آئے گی ۔ آنکھیں کھولنے اور بند کرنے میں زیادہ فرق نہیں ہونا چاہیے ۔

پس فاصلہ ، سائز ، صورت ، رنگ اور حرکت کا انحصار منجملہ
عناصر کے ذہنی سٹ پر بھی ہے -

سمعی ادراک (Auditory Perceptien) :

بصری ادراک کا ذکر کرتے وقت یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ
دیکھتے کیا ہیں ؟ یوں تو ہمیں تحسسات آتے ہیں - رنگوں اور تابانی
احساس ہوتا ہے لیکن ہم ان تحسسات سے پرے گزر کر ان اشیا
طرف جاتے ہیں جو ان تحسسات کا سرچشمہ ہوں گی - یہی حالت سمع
ادراک کی ہے - ہم مختلف آوازیں سنتے ہیں لیکن ان آوازوں کی تہہ ،
جو اشیا ہیں ان کا کھوج لگانا ہمارا اصل مطلب ہوتا ہے - کڑکڑ کی آ
تے ہیں تو بادل یا ہوائی جہاز کی طرف ذہن جاتا ہے - گفتگو کی آ
اتی ہے تو گفتگو کرنے والوں کا خیال آتا ہے - لہٰذا سمعی ادراک
مختلف آوازوں کو مجتمع کرکے ان میں ربط قائم کیا جاتا ہے اور
ان کا رشتہ اشیا سے قائم کیا جاتا ہے -

کبھی کبھی آوازیں بھی ہماری دلچسپی کا مرکز بن جاتی ہیں
گانا سنتے وقت ہم آنکھیں بند کرکے صرف نغمہ کا حظ اٹھاتے ہیں
ہمیں ساز یا معانی سے سروکار نہیں ہوتا ہے - صرف سروں کی شرینی ا
دلفریبی کا احساس ہوتا ہے - دریا کے کنارے اگر ڈوبتے سورج
پانی میں دیکھیں تو عجب لطف آئے گا - اس وقت بھی سورج کا احساس
نہیں ہوتا جتنا روپہلی اور سنہرے رنگ کا جو فضا کی جاذبیت بڑھا رہا -

جب لوگوں کی آوازیں سنتے ہیں تو ہمارے کانوں تک آواز
پہنچتی ہیں - لیکن ہمارا مقصد آوازیں سننا نہیں بلکہ ان کا مطلب ا
معانی معلوم کرنا ہوتا ہے - لہٰذا ہم آوازوں سے جھٹ پٹ ان کے مطا
کی طرف چلے جاتے ہیں اور کبھی یہ کام اتنا تیزی سے ہوتا ہے
مطالب سمجھنے میں غلطی لگ جاتی ہے - جہاز پر بیٹھے ہوئے مس
کئی دفعہ بول اٹھتے ہیں ، وہ دیکھیے سامنے خشکی ! لیکن جہازراں

پتہ ہوتا ہے کہ یہ سب آنکھ کا دھوکا ہے ، خشکی ابھی بہت دور ہے ، جو وہ دیکھ رہے ہیں وہ صرف بادل کا ٹکڑا ہے ۔ آدھی رات کو گھر میں شور ہوتا ہے ۔ ہم کہتے ہیں کہ چور گھس آیا ۔ غور کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ چوہے کود رہے تھے انھوں نے چند چیزیں گرا دیں ۔

آواز کے مقام کو کیسے متعین کیا جاتا ہے ؟

یہ تو ہر خاص و عام کو علم ہے کہ سمعی ادراک ویسا صحیح نہیں جیسا بصری ادراک ہے ۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آواز کی سمت یا شدت کا پتہ نہیں چلتا ۔ تقریباً ہر شخص بتا سکتا ہے کہ آواز کدھر سے آ رہی ہے اور اس کی شدت کیا ہے ۔ اس نکتہ کا ذکر اسی باب میں کسی اور جگہ آ چکا ہے ۔ تجربوں سے ثابت ہے کہ اگر آواز کھلے میدان سے آئے جہاں گونج وغیرہ کا امکان نہ ہو تو اوسط درجے کا آدمی یہ بتا سکے گا کہ یہ آواز دائیں سے آ رہی ہے یا بائیں سے ۔ لیکن اس سے زیادہ اسے کچھ پتہ نہیں ، نہ ہی وہ آواز کے خصائص بیان کر سکتا ہے اور نہ ہی ان عوامل کا جو آواز کے مقام کو متعین کرتے ہوں ۔

آواز کی سمت کی پہچان کا پہلا ذریعہ دو کان ہیں ، ایک بائیں طرف اور دوسرا دائیں طرف ۔ آواز نزدیک کان کو پہلے پہنچے گی ۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ آیا آواز کا مہیج بائیں جانب ہے یا دائیں جانب ۔ لیکن اس علم پر زیادہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا ۔ آواز ایک سیکنڈ میں ۱۱۰۰ فٹ کی رفتار سے چلتی ہے اور ایک کان سے دوسرے کان تک جانے کے لیے اسے $\frac{1}{1000}$ سیکنڈ چاہیے ۔ اگر مہیجات کے درمیان اس وقفہ کو مٹا دیا جائے یا ایسا انتظام کیا جائے کہ دونوں مہیجات خواہ ایک بائیں ہو اور دوسرا دائیں ، ایک ہی وقت میں کانوں تک پہنچیں تو ایسا معلوم ہوگا جیسے مہیج سامنے سے آ رہا ہے لیکن جب یہ $\frac{1}{1000}$ سیکنڈ والا وقفہ قائم ہو تو نزدیک کان جلد سن لیتا ہے ۔ شدت سے بھی

سمت کا علم ہوتا ہے ۔ جس سمت سے شدید آواز آ رہی ہو اس ۔
احساس شدت کی بدولت ہو جاتا ہے ۔

بصری ادراک کے سلسلے میں بصری استقلال (nstancy
ذکر کیا گیا ۔ سمعی ادراک میں بھی یہ اصول کام کرتا ہے ۔
آواز کا استقلال معلوم کرنے کے لیے دو لاؤڈ سپیکر لیجیے ۔ ایک
تین فٹ اور دوسرے کو تیس فٹ کے فاصلہ پر رکھیے ۔ ایک
لے کر اسے تھوڑا ایک پر بجائیے پھر تھوڑا دوسرے پر ، گو آو
وسعت (Amplitude) میں فرق پڑے گا لیکن معمول دونوں لاؤڈ سپ
کی وسعت میں ہم آہنگی پیدا کرے گا اور کوئی فرق محسوس نہیں کو
اس کی توجیہ بھی ذہنی حالت (Set) میں ملے گی ۔ جیسے حرکت ،
صورت وغیرہ میں ذہنی سٹ نہایت اہم عنصر ہے ویسے ہی بصری ا
میں بھی اس کا کردار بڑا نمایاں ہے ۔

گونج سے اشیا کا ادراک :

اکثر تو ہم آنکھوں سے دیکھ کر یا کانوں سے سن کر آواز ک
بتاتے ہیں ۔ لیکن بعض دفعہ کام گونج سے بھی سر انجام پاتا ہے ۔
گونج سنائی دے تو فوراً خیال آتا ہے کہیں کوئی چیز ہوگی جو
پیدا کر رہی ہے ۔ مثلاً کشتی اگر دھند میں پھنس جائے تو قرن (n
بجائی جاتی ہے تا کہ گونج سے پتہ چلے کہ آیا ساحل قریب ہے یا :
اندھوں کو اسی طرح اشیا اور ان کے فاصلے کا علم ہوتا ہے ۔
لوگوں کا خیال تھا کہ راستے کی رکاوٹوں سے ہوا کی لہریں اٹھتی
اور یہ لہریں اندھوں کے چہرے کے ٹمپریچر اور دباؤ کے حواس
متأثر کرتی ہیں ۔ اس تأثر سے اندھے جان جاتے ہیں کہ راستے میں
رکاوٹ ہے ۔ ووڈورتھ اس قیاس کو صحیح نہیں مانتا ۔ وہ سمعی ن
پیش کرتا ہے اور اس کی تائید میں ایک تجربہ بیان کرتا ہے ۔
کمرے میں ایک پردہ لٹکایا گیا اور اندھے کو کہا گیا کہ اس پر

کی طرف جائے اور جونہی اسے پردے کا علم ہو بتا دے ۔ اس کے بعد پردے تک بغیر پردہ چھوئے چلے ۔ اندھوں کو پردے کا پتہ دس پندرہ فٹ سے ہو جاتا تھا لیکن جن لوگوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر تجربہ کرایا گیا وہ اتنی دور سے پردے کو نہ بتا سکے ۔ جب اندھوں کے پاؤں کی آہٹ ختم کر دی گئی (ان کے پاؤں پر جرابیں پہنا کر موٹی دریوں کے اوپر چلایا گیا) تو ان کی دور سے پردہ جان لینے کی قابلیت کمزور پڑ گئی اور جب ان کے کانوں میں روئی ٹھونس دی گئی تا کہ وہ کچھ نہ سن سکیں تو یہ قابلیت بالکل جاتی رہی ۔ لیکن اگر صرف ان کے چہرے کو موٹے کپڑوں سے ڈھانپا گیا تو اس قابلیت میں بہت تھوڑا فرق پڑا ۔ اس تجربہ سے پتہ چلا کہ اندھے جلد کی نسبت کان زیادہ استعمال کرتے ہیں ۔ اندھیرے میں چمگادڑ چیختا ہے اور اپنی چیخوں سے پچاس ہزار فی سیکنڈ سے زیادہ ارتعاش پیدا کرتا ہے ۔ جو گونج ان چیخوں کی بدولت معرض ظہور میں آتی ہے وہ چمگادڑ کو رکاوٹوں سے آگاہ کر دیتی ہے ۔ اگر چمگادڑ کے کان بند کر دیے جائیں یا ان کے منہ میں کوئی چیز ٹھونس دی جائے تو چمگادڑ رکاوٹوں سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکیں گے ۔ یہ اصول راڈر (Radar) میں بھی استعمال ہوتا ہے یہاں پر صوتی لہروں کی بجائے ریڈیو کی لہریں منتشر کی جاتی ہیں جو رکاوٹوں سے ٹکرا کر واپس آتی ہیں ۔

وقت کا ادراک (Temporal Perception) :

روزمرہ کی زندگی میں وقت کا احساس اور اس کا صحیح تعین نہایت ضروری ہے ۔ صبح سے لے کر شام تک اور شام سے سوتے تک ہر کام اپنے مقررہ وقت پر کرنا ہوتا ہے ۔ کالج کا ٹائم ٹیبل ، دفتروں کے اوقات ، روزہ رکھنا ، کھولنا ، نماز وقت پر ادا کرنا ۔ یہ سب چیزیں اس کی مقتضی ہیں کہ وقت کا تعین ہو اور ہر چیز اپنے وقت پر ادا کی جائے ۔

وقت کا اندازہ گھڑیوں سے ہوتا ہے یا سورج چڑھنے اور غروب ہو
سے یا فیکٹریوں میں سائرن بجنے سے یا سکول میں گھنٹیاں بجنے سے وغ
وغیرہ - ان چیزوں کے بغیر وقت کا بتانا نہایت مشکل ہو جاتا ہے لیکن
ناممکن نہیں ہوتا۔ کیونکہ موسیقی میں وقت کا ادراک گھڑیوں پر نہیں بل
انسان کی ذاتی قابلیت پر منحصر ہے - اور اس مطلب کے لیے خا
تربیت دی جاتی ہے -

اگر وقت کا ادراک گھڑیوں پر موقوف نہ ہو تو ہمیں عضویہ
اندر ایسے عوامل معلوم کرنے ہوں گے جو مقررہ وقفہ کے بعد اپنے آ
کو دہراتے ہوں - آپ نے سنا ہوگا کہ بعض لوگ گھڑی کے بغیر ٹھیک
ٹھیک وقت بتا دیتے ہیں اور سوتے وقت اگر وہ اپنے آپ سے کہہ دیں
انہیں فلاں وقت جاگنا ہو گا تو وہ اس وقت جاگ بھی اٹھتے ہیں گو
کی نیند خراب ہو جاتی ہے - ہمارے کئی فعلیاتی عوامل ایک خاص تناس
اور وقفے سے بار بار آتے ہیں مثلاً سانس کی آمد و رفت ، دل کی دھڑ
اور ہاضمے کا فعل - فعلیاتی ماہروں کا خیال ہے کہ جسم کے اندر ک
ایک اور بھی کیمیائی عوامل ہیں جو ترتیب سے عود کرتے ہیں - اور
کے لیے بیرونی تأثرات کی حاجت نہیں - بعض لوگوں کا قیاس ہے
جب اندر ہی اندر کیمیائی عوامل کی ترتیب ، تناسب اور وقفے
جمع کر لیا جاتا ہے تو اس سے وقت کا احساس ہوتا ہے - جب آدم
تھکا ہوا ہو تو اس کے وقت کا احساس بھی غلط ہو جاتا ہے - ایسے
انتظار میں جب ہیجان کے ساتھ احشا بھی متأثر ہوتے ہیں ، وقت کا اند
عجیب و غریب ہو جاتا ہے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے اح
کو وقت کے احساس میں دخل ہے - کچھ لوگوں کا خیال ہے
عضویہ میں تبدیلیاں صرف کمیت (Quantity) کے لحاظ سے نہیں ہوت
بلکہ کیفیت (Quality) کے لحاظ سے بھی ہوتی ہیں - ان کی
(Qualitative) تبدیلیوں سے بھی وقت کا احساس ہوتا ہے -

پلاٹس (Plautus) (ایک شاعر) لکھتا ہے -

When I was young, no timepiece Rome supplied,
But every fellow had his own—inside.
A trusty horologe, that—rain or shine—
Never failed to warn him of the hour—to dine.

شاعر کہتا ہے جب میں جوان تھا روم میں کوئی گھڑی نہیں تھی لیکن ہر آدمی کے اندر گھڑی موجود تھی - یہ گھڑی اتنی قابل اعتماد تھی کہ چاہے بارش ہو یا دھوپ، یہ کبھی عشائیہ بتانے میں غلطی نہیں کرتی تھی -

پڑھنے میں الفاظ کا ادراک :

پڑھنا اصل میں الفاظ اور فقرات کا ادراک ہے - یہ ادراک اشاراتی ہونے کی وجہ سے باقی اور ادراکات سے خاصہ مشکل اور پیچیدہ ہے - جب کوئی کتاب پڑھ رہا ہو تو اس کے سامنے شیشہ رکھ دیجیے اور خود اس کی پیٹھ پیچھے کھڑے ہو کر شیشے میں اس کی آنکھوں کی حرکات ملاحظہ کیجیے - اگر کتاب انگریزی میں ہو تو اس کی آنکھیں بائیں سے دائیں جانب جائیں گی لیکن ان کی حرکت لگاتار اور مسلسل نہیں ہوگی راستے میں چھلانگیں لگاتی گزریں گی - کہیں کہیں تھوڑے وقفے کے لیے ٹھہر جائیں گی - آنکھوں کی حرکت کے وقت شبکیہ پر کوئی عکس نہیں آتا - لہٰذا اس وقت پڑھا نہیں جاتا - وقفے کے وقت پڑھا جاتا ہے - آنکھوں کا یہ خاصہ ۱۸۷۹ء میں دریافت ہوا اور اس وقت سے کئی تجربات نے اس امر کی تائید کی ہے -

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پڑھتے وقت آنکھ کی حرکت لگاتار نہیں بلکہ آنکھ چھلانگیں لگاتی ہوئی ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی ہے اور بیچ میں کہیں کہیں تھوڑے عرصہ کے لیے ٹھہر جاتی ہے تو ہمیں پورا لفظ یا ساری سطر کیسے دکھائی دیتی ہے ؟

۱- اس سلسلے میں پہلی بات یہ یاد رکھنی چاہیے کہ ماحول کا

ادراک جزئی طریقے سے (یعنی ماحول کے ٹکڑے کرکے تحلیلی طریقے سے
نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی گسٹالٹ بنا کر ہوتا ہے ۔ مثلاً توجہ
وسعت (Span of Attention) پر تجربہ کرتے ہوئے پتہ چلتا ہے کہ ا
زیادہ سے زیادہ ایک نگاہ میں پانچ چھ حروف دیکھے جا سکتے ہیں تو جب
ان حروف سے الفاظ بنائیں تو پانچ چھ الفاظ دیکھے جاسکیں گے اور اگر
الفاظ سے فقرے بنا لیے جائیں تو وسعت توجہ اور بھی بڑھ جاتی ہے، ا
ایک سطر میں نظر پانچ چھ دفعہ ٹھہرے تو ہر وقفے میں صرف پانچ
حروف نہیں پڑھے جائیں گے بلکہ پانچ چھ الفاظ یا چند ایک سطریں ۔ یعنی
سطر کے پانچ چھ ٹکڑے ایک ہی وقت حیطۂ ادراک میں آ جائیں گے

۲۔ دوسری ضروری چیز اس ضمن میں یہ ہے کہ الفاظ سے قو
گویائی کی عادتیں اور سلسلے متأثر ہوتے ہیں ۔ فقرے کے چند الف
پڑھنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ بعد کے الفاظ کیا ہوں گے اور انھ
پڑھنے کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ مثلاً اگر فقرہ شروع ہو "ہونہار برو
سے تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سارا فقرہ یوں ہوگا ہونہار بر
کے چکنے چکنے پات ۔ اس لیے ہونہار بروا کے بعد الفاظ پڑھنے
ضرورت محسوس نہیں کریں گے ۔ اخبار پڑھتے وقت ہم ایک سطر
دوسری سطر تک ، ایک پیراگراف سے دوسرے پیراگراف تک
بعض دفعہ ایک صفحہ سے دوسرے صفحہ تک جلد جلد پہنچ جاتے ہیں
اس کی وجہ یہ ہے کہ چند الفاظ پڑھنے سے تواتر بھانپ لیا جاتا ہے ا
مضمون بھی سمجھ میں آ جاتا ہے لہٰذا لفظ بہ لفظ پڑھنے کی زحمت
گوارا نہیں کی جاتی ۔

۳۔ تیسرا قابل غور امر یہ ہے کہ انسان محض عادات کا مجمو
ہی نہیں بلکہ دلچسپیوں کا مرکز بھی ہے ۔ افسانہ پڑھتے ہوئے انسان
شوق ابھرتا ہے اور پڑھائی تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے ۔ الفاظ
فقرات اشاروں کا کام دیتے ہیں ۔ ایک اشارے سے دوڑ کر دوسرے

پہنچ جاتے ہیں ۔ ایک واقعہ دوسرے واقعہ کا پیش خیمہ ہے ۔ للہذا اپنی دلچسپی کی وجہ سے افسانہ پڑھنے والا جلد جلد پڑھتا جاتا ہے ۔ وہ چاہتا ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو انجام کا پتہ چل جائے ۔ ناول پڑھتے وقت بھی یہی حال ہوتا ہے ۔ پڑھنے والے کی دلچسپیاں اس کی ذات کی گہرائیوں سے اٹھتی ہیں اور جب تک انجام کا پتہ نہیں چلتا ناول چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا ۔

التباس (Illusion) :

جیسے بیماریوں سے اعضا کے وظائف کا پتہ چلتا ہے ویسے ہی التباس سے ادراک کے متعلق کئی مفید معلومات ملتی ہیں ۔ التباس سے مراد ہے غلط ادراک ۔ کئی دفعہ تحسسات غیر واضح اور مبہم طریقے پر پیش ہوتے ہیں انہیں وصول کرتے وقت جب ان کی توجیہ کی جاتی ہے تو انسانی ذہن دھوکا کھا جاتا ہے ۔

ووڈورتھ نے التباس کی چار وجوہات بیان کی ہیں :

۱ ۔ طبعی اسباب : اگر چیزوں کو شیشے میں دیکھیں تو وہ شیشے کے پیچھے نظر آئیں گی ۔ اسی طرح گونج کہیں پہاڑوں یا دریاؤں کے پیچھے سے آتی سنائی دیتی ہے ۔ اس التباس کے طبعی اسباب ہیں ۔ شیشے سے منعکس ہو کر شعاعیں آپ تک پہنچتی ہیں ۔ للہذا چیزیں شیشے کے سامنے نہیں بلکہ پیچھے دکھائی دیں گی ۔ گونج میں پہاڑوں یا دریاؤں سے ٹکرا کر آواز آپ تک پہنچتی ہے ۔ للہذا آواز کا منبع پہاڑ یا دریا سمجھے جائیں گے ۔ عمر کے ساتھ ان التباس کو سمجھ لیا جاتا ہے اور دھوکا کھانے کی بجائے ان سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے مثلاً شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر کپڑے پہنے جاتے ہیں یا کنگی پٹی کی جاتی ہے اور ہمیں کبھی یہ دھوکا نہیں ہوتا کہ ہم شیشے کے پیچھے کھڑے ہیں ۔ گاڑیوں ، میں بھی شیشے لگے ہوتے ہیں جن سے پیچھے سے آنے والی

گاڑیوں کا عکس شیشے پر پڑتا ہے اور ڈرائیور کو پتہ لگ جاتا ہے کہ کوئی گاڑی آ رہی ہے اور کس فاصلے پر ہے ۔ شیشے میں تو گاڑی آگے دکھائی دے گی لیکن در اصل وہ پیچھے ہوتی ہے ڈرائیور التباس سے واقف ہوتا ہے اور اس کو نظر انداز کرکے عکس کا صحیح فائدہ اٹھا لیتا ہے ۔

۲۔ **عادت اور السیت (Familiarity) :** ہمیں مہیجات کو ایک نہج پر سمجھنے کی عادت پڑی ہوئی ہوتی ہے ۔ لہٰذا جب اس نوع کے مہیجانات آتے ہیں تو اس کی تشریح حسب معمول کر لی جاتی ہے ۔ لیکن غلطی اس وقت ہوتی ہے جب مہیج سے ملتا جلتا ایک اور مہیج ہمارے سامنے آتا ہے اور اس کو بھی اصلی مہیج کی طرح سمجھ لیا جاتا ہے ۔ مثلاً ہمیں اپنے دوست کے خد و خال ، چال ڈھال ، رنگ ، قد وغیرہ سے شناسائی ہوتی ہے ۔ دور سے اسے پہچان لیتے ہیں ۔ بعض دفعہ کوئی اور شخص جو کسی حد تک دوست سے ملتا جلتا ہو ، آنکھوں کو دھوکا دے دیتا ہے اور اسے بھی دوست سمجھ لیا جاتا ہے جب وہ نزدیک آتا ہے تو غلطی کا علم ہوتا ہے ۔

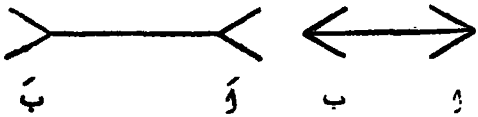
ارسطو نے ایک التباس کا ذکر کیا ہے ۔ اگر دو انگلیوں کو ایک دوسرے پر ترچھا رکھیں اور ان کے درمیان سنگ مرمر کا ٹکڑا یا پنسل رکھ دیں تو ٹکڑا یا پنسل ایک کی بجائے دو محسوس ہوں گے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر جہاں ٹکڑا یا پنسل رکھی گئی ہے ، وہاں سے دو چیزوں کے لیے مہیجات آنے چاہییں نہ کہ ایک کے ۔ ایک اور التباس جو یہاں بیان کیا جا سکتا ہے وہ پروف پڑھنے والوں کا التباس (Proof-readers Illusion) ہے ۔ باوجود ہزار کوشش کے ہر کتاب میں ہجوں کی چند ایک غلطیاں رہ جاتی ہیں ۔ ہمارے ملک کی مطبوعہ کتابوں میں تو بے شمار غلطیاں ہوتی ہیں ۔ لیکن باہر کی چھپی ہوئی کتابیں بھی طباعت کی غلطیوں سے پاک نہیں ہوتیں ۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے

کہ غلط لفظ صحیح لفظ کے مشابہہ ہوتا ہے ۔ اسی مشابہت کی بنا پر غلط ہجوں والا لفظ آنکھوں کو دھوکا دے کر نکل جاتا ہے اور درست نہیں ہونے پاتا ۔

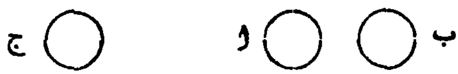
۳- ذہنی سٹ اور توقع (Expectancy) : جس چیز کا انتظار یا توقع ہو اس کا دھوکا عموماً لگ جاتا ہے ۔ اگر دوست کا انتظار ہو تو کوئی اور شخص جو دوست سے اوپری سی مشابہت رکھتا ہو دور سے دوست ہی دکھائی دیتا ہے ۔ یہ دھوکا توقع اور انتظار سے ہوا ۔ اب ذہنی حالت کر لیجیے ۔ کئی پاگل آدمی کرسیوں کی گھسیٹ میں گالیوں کی آوازیں سنتے ہیں ۔ جنون کی وجہ سے وہ سمجھتے ہیں کہ ہر چیز انہیں برا بھلا کہہ رہی ہوگی لہٰذا اگر کرسی بھی گھسٹنے سے آواز نکالے تو انہیں گالی دے رہی ہوگی ۔ عیدالفطر کا چاند دیکھنے میں بڑا دھوکا ہوتا ہے - ۲۹ روزے ختم ہونے پر لوگ کوٹھوں پر چڑھ کر چاند دیکھنا شروع کر دیتے ہیں ۔ بعض دفعہ چاند ۲۹ تاریخ کو نہیں نکلنا ہوتا لیکن پھر بھی کئی لوگوں کو چاند کا دھوکا ہوتا ہے ۔ کئی دفعہ آنکھیں ملتے ہیں اور چاند دوبارہ سہ بارہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور کہہ بھی دیتے ہیں لو دیکھو وہ چاند ! حالانکہ چاند کہیں نہیں ہوتا ۔ قبرستان میں بھوت پریت دیکھنے یا گھر میں چور گھس آنے کا التباس بھی انہی اسباب پر مبنی ہے -

۴- مجموعی تأثرات کی تشریح نہ کرنا (Unanalysed total impressions) : جو مہیجات اکثر آتے ہیں وہ سادہ اور بسیط نہیں ہوتے بلکہ بڑے دقیق اور پیچیدہ ہوتے ہیں ۔ اگر ان کی صحیح تشریح نہ کی جائے تو بڑا دھوکا لگتا ہے لیکن تشریح اور تحلیل بڑا مشکل کام ہے ۔ اس لیے کئی ایک التباس جن سے فوج میں فائدہ اٹھایا جاتا ہے ، اس ضمن کے ہیں ۔ عام چیزوں کو ایسے چھپایا جاتا ہے کہ یہ چیزیں نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں - اس سلسلہ میں ملر لیر (Muller-Lyer)

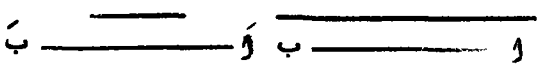
التباس مشہور ہیں ۔ دو برابر لکیروں یا فاصلوں کو ساری شکل میں ایسے چھپایا جاتا ہے کہ اگر اشکال کی تشریح نہ کی جائے تو مساوی لکیریں مساوی دکھائی نہ دیں گی اور نہ مساوی فاصلے مساوی نظر آئیں گے ۔



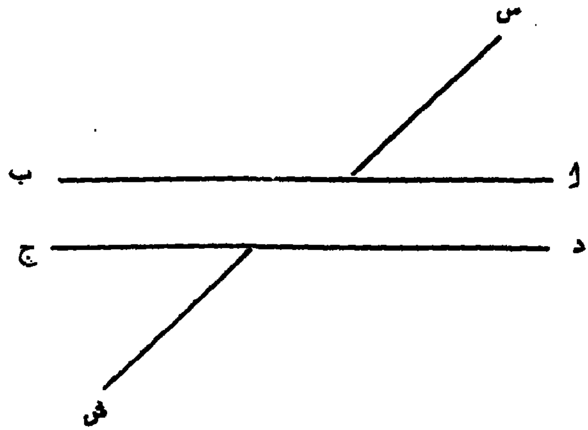
ان اشکال میں ا ب کا فاصلہ اَ بَ کے فاصلے کے برابر ہے ۔ لیکن ایسا دکھائی نہیں دیتا کیونکہ سروں کی لکیریں مختلف سمتوں میں جا رہی ہیں ایک اندر کو دوسری باہر کو ۔ اب ایک اور شکل لیں ۔



ا ب کا فاصلہ ا ج کے فاصلے کے برابر ہے لیکن دیکھنے میں برابر نہیں لگتا ۔ ایک اور شکل ملاحظہ کیجیے ۔



ا ب اور اَ بَ ہیں تو برابر لیکن ایسے دکھائی نہیں دیتیں۔ اب ایک اور التباس لیجیے جسے پوجن ڈارف التباس (Poggindorf illusion) کہتے ہیں ۔



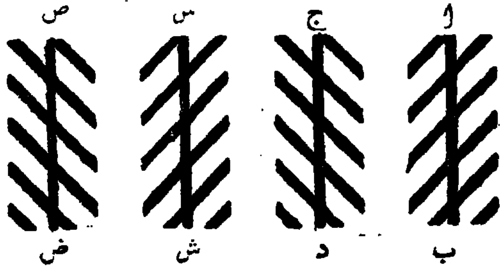
دو متوازی ا ب اور د ج لکیروں کو س ش کاٹتی ہے ۔ س ش بھی سیدھی لکیر ہے لیکن دیکھنے میں ایسے نہیں لگتی۔ چند ایک اور التباس دیکھیے ۔

ونٹ (Wundt) کا التباس :



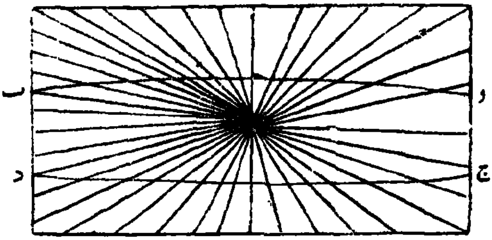
یہ دونوں شکلیں برابر ہیں لیکن دیکھنے میں ایک بڑی دوسری چھوٹی لگتی ہے ۔

ذولنر (Zollner) کا التباس :



یہ چاروں لکیریں ا ب، ج د، س ش اور ص ض ایک دوسرے کے متوازی ہیں لیکن کاٹتی ہوئی لکیروں سے غیر متوازی نظر آتی ہیں -

ہیرنگ (Herring) کا التباس :



ا ب اور ج د متوازی لکیریں ہیں لیکن ایسے دکھائی نہیں دیتیں - من(Munn)[1] نے التباسات کی ایک اور وجہ ہمارے بصری آخذات یا اعصابی نظام یا دونوں کے اس غیرمتبدل رد عمل میں پائی ہے جو وہ مہیجات کے روابط وصول کرنے پر پیش کرتے ہیں - پردہ سکرین پر ساکن تصویروں کو متحرک دیکھنے کا ذکر پہلے آ چکا ہے - اس التباس کو فائی مظہر (Phi-phenomenon) کہتے ہیں۔ سکرین کے اوپر کوئی حرکت نہیں ہوتی لیکن مختلف تصویروں کے جلد جلد یکے بعد دیگرے آنے سے حرکت کا التباس پیدا ہو جاتا ہے - تجربہ گاہوں میں کئی تجربے دو یا دو سے زیادہ قسم کی روشنیوں کو ایک دوسرے کے بعد پردہ پر پھینکنے سے کیے جاتے ہیں - ان سے روشنی متحرک دکھائی دیتی ہے - عید میلاد النبی کی خوشی میں ہر چھوٹی بڑی عمارت پر روشنی کی جاتی ہے - پہلے تو چراغ جلائے جاتے تھے اب بجلی کا استعمال ہوتا ہے - کئی جگہ بجلی متحرک نظر آتی ہے۔ گول دائرہ میں چلتی ہے یا الفاظ بناتی ہے یا جلتی بجھتی ہے وغیرہ وغیرہ - اصل میں بجلی کوئی حرکت نہیں کر رہی ہوتی - مختلف روشنیوں کو مناسب وقفے، سائز، فاصلے اور تابانی سے پیش کیا جاتا ہے -

---

۱- ملاحظہ ہو اس کی Psychology ، صفحہ ۳۲۴ -

ان کے تواتر سے حرکت کا التباس پیدا ہوتا ہے۔ ایک روشنی اور دوسری کے درمیان وقفہ مناسب ہونا چاہیے ۔ کیونکہ اگر وقفہ زیادہ ہو جائے تو پہلے ایک روشنی دکھائی دے گی ، پھر دوسری اگر وقفہ کم ہوگا تو دونوں روشنیاں ایک ہی وقت میں ظاہر ہوں گی ۔ یہی حال سائز، تابانی اور فاصلے کا ہے ۔ یہاں بھی ہر چیز مناسب مقدار میں ہونی چاہیے ۔

من (Munn) کا خیال ہے کہ فائی مظہر کو ہم دو آنکھوں کے مفروضے سے بیان نہیں کر سکتے کیونکہ اگر دو روشنیوں کو اوپر نیچے پھینکا جائے تو ایک وقت میں ایک روشنی کو الف سے ب تک جاتے دیکھیں گے اور دوسری کو ب سے الف تک ۔ پس دو مختلف سمتوں کو جانے والی روشنیاں ایک ہی وقت میں دیکھی جائیں گی لیکن من کی رو سے یہ بالکل نہ ہوتا اگر آنکھ کی حرکت ایک مقام سے دوسرے مقام تک ضروری ہوتی ۔ من یہ بھی کہتا ہے کہ فائی مظہر کا سبب شبیہ (Images) میں بھی نہیں پایا جاتا کیونکہ اگر روشنی الف سے ب کی طرف جائے تو بعد شبیہ (After images) پیدا ہو سکتا ہے اور چونکہ فائی مظہر میں روشنی ایک مقام سے دوسرے مقام تک نہیں جاتی ، بعد شبیہ پیدا نہیں ہو سکتا ۔ لہٰذا اس مسئلے کا حل بصری آخذات یا اعصابی نظام کے پرانے رد عمل میں ملے گا ، جو تأثرات کے باہمی علائق سے معرض ظہور میں آتا ہے ۔

ادراک کی اصلاح (Improvement of Observation) :

مشاہدے کو تیز اور بہتر بنانے کے لیے مندرجہ ذیل تجاویز پیش کی جا سکتی ہیں ۔

۱۔ مشاہدہ ہمیشہ انتخابی ہوتا ہے ۔ نہ ہر چیز کا مشاہدہ ہو سکتا ہے نہ ہر چیز کا مشاہدہ کرنا چاہیے ۔ اچھا مشاہدہ کرنے والا وہ شخص ہے جو صرف انھی چیزوں کو دیکھتا ہے جو اس کے مطلب کی ہوں ۔ چونکہ مشاہدہ توجہ کا محتاج ہے اور توجہ کی بنا دلچسپی پر ہے ۔ لہٰذا

جس چیز کا مشاہدہ درکار ہو اس میں دلچسپی ضرور پیدا کر لینی چاہیے
مثال کے طور پر ہمسایوں کو چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کی پسند اور
ناپسند کا مطالعہ کرکے ایک دوسرے میں دلچسپی پیدا کریں وگرنہ
بے توجہی پیدا ہو جائے گی ، جو پیار اور محبت قائم نہیں ہونے دیں گی ۔

۲۔ مشاہدہ بہتر بنانے کے لیے مشق چاہیے ۔ مشق تب سود مند
ہوگی جب نتائج پیش نظر رہیں ۔ مثلاً ہر روز صبح کو جو ٹمپریچر آپ
کے قیاس میں ہو اس کا مقابلہ تھرمامیٹر سے کریں ۔ آپ کا موسمی
مشاہدہ ضرور بہتر ہوگا ۔

۳۔ التباس ایک قسم کی بیماری ہے : جیسے جسمانی بیماریوں سے پتا
چلتا ہے کہ صحت برقرار رکھنے کے لیے کن چیزوں سے بچنا چاہیے
ویسے ہی التباس سے علم ہوتا ہے کہ عمدہ مشاہدے کے لیے کن چیزو
سے پرہیز لازمی ہے ۔ التباسات سے ظاہر ہے کہ کمزور اور ناقص مشاہد
مندرجہ ذیل امور سے پیدا ہوتا ہے :

(ا) مبہم اور غیر واضح مہیجات سے ۔
(ب) عادت سے اور نئے تأثرات نہ وصول کرنے سے ۔
(پ) تعصب اور مشغولیت (Preoccupation) سے ۔
(ت) مجموعی تأثر پر بھروسہ کرنے سے ۔

ان چیزوں سے احتراز لازمی ہے ۔ کبھی کبھار یہ چیزیں فائدہ مند
بھی ہو جاتی ہیں ۔ مثلاً ڈرائیور شیشے کے عکس سے فائدہ اٹھاتا ہے
عادتوں سے دلچسپیاں پیدا ہوتی ہیں اور دلچسپیوں سے عمدہ مشاہدہ
تعصب یقیناً بری شے ہے ، لیکن تعصب سے مشاہدہ انتخابی بن جا
ہے ۔ مجموعی تأثر ، تحلیل اور تشریح کا دشمن ہے لیکن ہر ادراک ام
میں مجموعی تأثر ہے ۔ پس مندرجہ بالا نقائص سے بچتے وقت ان کے عم
پہلو کو فراموش نہیں کرنا چاہیے ۔

۴۔ مشاہدہ سائنسی طریقہ پر ہونا چاہیے : سائنسدان اپنا م

مشاہدے سے اکھٹا کرتا ہے اور جو نظریہ ان کے بل بوتے پر بناتا ہے مشاہدات سے اس کی صحت کی تصدیق کرتا ہے۔ اس کے علاوہ سائنسدان سوالات وضع کرتا ہے اور ان کا حل مشاہدات سے چاہتا ہے۔ مشاہدہ کرتے وقت مشینوں کا استعمال کرتا ہے، تعصب دور کرنے کے لیے دوسرے سائنسدانوں سے مل جل کر کام کرتا ہے اور نظریوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتا ہے۔

سولھواں باب

توجہ (Attention)

توجہ اور ادراک :

توجہ اور ادراک کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جس چیز کو توجہ کہا جاتا ہے اسے ادراک بھی کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً مد و جزر توجہ (Fluctuation of Attention) کو بعض لوگ مد و جزر ادراک کہیں گے اور انفعالی توجہ (Involuntary Attention) کو انفعالی ادراک کا نام دیں گے۔ علاوہ ازیں توجہ کا سوال ادراک کا سوال بن جاتا ہے اور ادراک کا سوال توجہ کا سوال۔ مثلاً اس سوال کو کہ کتنی چیزیں بیک وقت توجہ کا مرکز بن سکتی ہیں، یوں بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ کتنی چیزوں کا ادراک بیک وقت ہو سکتا ہے۔ لہٰذا خواہ ادراک کا معاملہ ہو خواہ توجہ کا، نتیجہ قریب قریب ایک ہی ہوتا ہے۔ جو عناصر ادراک کو کنٹرول کرتے ہیں وہی توجہ کو کنٹرول کرتے ہیں۔

اس مماثلت کے باوجود من (Munn) کا خیال ہے[1] کہ یہ دونوں نفسی کوائف ایک ہی چیز کے دو نام نہیں۔ ان میں تمیز ہو سکتی ہے۔ اور ان کا الگ الگ مطالعہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ ثبوت میں وہ تین دلائل پیش کرتا ہے۔

۱۔ انفعالی توجہ کو چھوڑ کر باقی ہر قسم کے ادراک میں توجہ پہلے آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ توجہ کو متوقعانہ (Anticipation) یا قبل ادراکی (Pre-perceptive) فعلیت کہا جاتا ہے۔

۱۔ ملاحظہ ہو اس کتاب Psychology، صفحہ ۳۱۵۔

۲۔ توجہ کے بعد ادراک کا ہونا لازمی امر نہیں : مثلاً کوئی شخص انتظار میں بیٹھا ہے لیکن جس شے کا انتظار کر رہا ہے وہ ظاہر نہیں ہوتی ۔ یا کوئی آدمی اِدھر اُدھر کچھ چیز ڈھونڈ رہا ہے ، لیکن جس شے کا متلاشی ہے وہ نظر نہیں آتی ۔

۳۔ محض توجہ سے تحسسات کو بامعنی نہیں بنایا جا سکتا : ایک ہی شے کو مختلف لوگ مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں ۔ ممکن ہے ایک شخص کے لیے یہ شے بامعنی ہو، لیکن دوسرے شخص کے لیے بالکل بیہودہ اور بکواس ہو ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہر شخص کے لیے اس شے کا کچھ نہ کچھ مطلب ہو لیکن مطلب ہر ایک کے لیے الگ ہو ۔

پس توجہ اور ادراک میں تمیز کی جا سکتی ہے ۔ توجہ ذہنی حالت (Mental Set) کا نام ہے ۔ ادراک میں توجہ کا موجود ہونا لازمی ہے ۔ لیکن ادراک میں توجہ کے علاوہ اور بھی کئی عناصر ہوتے ہیں ۔ مثلاً تاثرات ، آخذات کے وظائف جن کا ذکر پچھلے باب میں ہو چکا ہے ۔

توجہ :

توجہ کے نام سے ہر طالب علم واقف ہے ۔ استاد صاحبان طلبا کو بار بار ہدایت کرتے ہیں کہ وہ پڑھائی کی طرف دھیان دیں ، توجہ سے لیکچر سنیں اور جن چیزوں سے توجہ خراب ہوتی ہو ، ان سے احتراز کریں ۔ فوج میں توجہ (Attention) ایک عام فہم فاعلیت کا نام ہے ۔ ہر فوجی کو ہوشیار اور توجہ میں رہنے کی تلقین دی جاتی ہے ۔ دیگر شعبوں میں بھی یہی حال ہے ۔ کوئی آدمی کسی شعبہ میں اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک وہ دل و جان سے اس کی طرف متوجہ نہ ہو ۔

توجہ ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے ۔ جس کی بدولت ہمارے آخذات یا تو رد عمل کو آسان اور سہل بنا دیتے ہیں یا انہیں مشکل اور بعض

حالتوں میں ناممکن بنا دیتے ہیں ۔ اس کیفیت میں آخذات کے علاوہ ہمارے عضلات اور شعور بھی سر گرم کار ہوتے ہیں ۔ فرض کیا کوئی شخص آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کسی شے کو دیکھ رہا ہے ۔ یہ تو آخذات کا حصہ ہوگا ۔ لیکن یہاں پر عضلات بھی مصروف نظر آئیں گے ۔ کیونکہ اس کی آنکھیں شے پر جھکی ہوئی ہیں اور شے کا عکس ماسکہ پر پڑ رہا ہے ۔ اس کے علاوہ شعور یا ذہن بھی کام کر رہا ہوتا ہے ۔ کرکٹ کھیلنے والے کو دیکھیں ہاتھ میں بلا لے کر وکٹوں کے سامنے بال کا انتظار ایک مخصوص جسمانی انداز میں کر رہا ہوتا ہے ۔ اس کے آخذات کام کر رہے ہیں ۔ جسم بھی سرگرم کار ہے لیکن اس کے علاوہ وہ ایک ذہنی کیفیت میں بھی ہے ، جس کی اہمیت کسی طور بھی باقی عناصر سے کم نہیں ۔

بعض حالتیں (Sets) ادراک کو سہل اور قابل اعتماد بنا دیتی ہیں لیکن بعض روڑا بھی اٹکاتی ہیں ۔ ممکن ہے لکھنے میں آپ اس قدر مصروف ہوں کہ ریڈیو کے گانے آپ کے لیے کچھ حقیقت نہ رکھیں اور آپ انھیں نہ سنیں ۔ اسی طرح جب کوئی فصیح و بلیغ تقریر سن رہے ہوں تو باقی تمام چیزیں توجہ سے خارج ہو جاتی ہیں ۔ صرف الفاظ جو مقرر کے منہ سے نکلتے ہیں وہی جاذبیت کا باعث بنے ہوتے ہیں ۔ اس کے علاوہ جو کچھ مجمع میں یا مجمع سے باہر ہو رہا ہے وہ توجہ کے دائرے میں نہیں آتا ۔ اگر پتلیوں کا تماشا دیکھ رہے ہوں ، تو توجہ کی وجہ سے پتلیاں بولتی نظر آئیں گی (گو پتلیاں نہیں بول رہی ہوتیں) اور پتلی نچانے والے کے لبوں کی حرکات نہ دیکھ سکیں گے ۔ حالانکہ تھوڑے سے غور سے یہ حرکات صاف نظر آ جائیں گی ۔ بعض اوقات جسمانی انداز سے توجہ خراب ہو جاتی ہے ۔ اگر بیٹسمین (Batsman) غلط انداز سے وکٹوں کے سامنے کھڑا ہو تو بال وکٹوں میں جا لگے گا ۔ اسی بال کو صحیح انداز سے روکنا ناممکن نہ تھا ۔

کرکٹ کے کھلاڑیوں کو مختلف پوزیشنوں میں مناسب اور موزوں جسمانی انداز بنانے کی مشق اور تربیت دی جاتی ہے۔

کئی پہلوؤں سے توجہ کو دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن پانچ اہم پہلو یہ ہیں: (۱) آخذات کا توافق (۲) جسمانی توافق (Postural Adjustment) (۳) عضلاتی کھچاوٹ اور کوشش کا احساس (۴) مرکزی اعصابی نظام کا توافق (۵) شعور کی روشنی یعنی معاملہ کا زیادہ صاف اور واضح ہو جانا۔ فرض کیا آپ کسی چیز کو ٹٹول رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ٹرنک کی چابیاں گم ہوگئی ہیں انہیں اِدھر اُدھر تلاش کر رہے ہیں۔ اس فعل میں آنکھوں اور سر کے علاوہ تمام جسم ایسے انداز میں ہے جس میں چابیوں کو تلاش کرنے میں مدد ملے۔ عضلات میں کھچاؤ ہے اور نظام عصبی میں کئی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ جب چابیاں مل جاتی ہیں تو باقی تمام اشیا بھول جاتی ہیں اور صرف چابیاں حلقۂ شعور میں اُبھر آتی ہیں۔ مشکل سوال حل کرتے ہوئے کسی طالب علم کو دیکھیں اس کی آنکھوں اور سر کی پوزیشن ملاحظہ کریں۔ پھر عام جسمانی حالت دیکھیں۔ یہ سب چیزیں ایک خاص انداز میں ہوں گی۔ اس کے بعض عضلات کھچے ہوئے دکھائی دیں گے، خصوصاً چہرے کے۔ شعوری طور پر طالب علم بڑا ہوشیار اور مستعد نظر آئے گا۔ بعض دفعہ ہیجانی حالتیں بھی نمودار ہو جاتی ہیں۔ اگر انتہائی کوشش کے باوجود مسئلہ کا حل نظر نہ آئے تو طالب علم جھنجھلا اُٹھے گا۔ برافروختہ یا مایوس ہو جائے گا اور اگر وہ مسئلہ پر قابو پالے تو اس کے چہرہ پر خوشی اور مسرت کی لہر دوڑے گی۔

اب ان پانچوں عناصر پر مختصر سی بحث آتی ہے۔

(الف) آخذات کا توافق: متذکرہ بالا مثالوں میں سر اور آنکھوں کی حرکات کا ذکر کیا گیا ہے۔ دونوں کو اس پوزیشن میں لایا جاتا ہے کہ مطلوبہ شے کو پا لیا جائے یا غور طلب معاملہ کو سمجھ لیا

جائے۔ ٹینس کے کھلاڑی کو دیکھیے اس کا سر اور آنکھیں اپنی پوزیشن جلد جلد بدل کر مفید اور کامیاب اندازہ قبول کر لیتی ہیں - تھوڑے عرصہ کے لیے ایک حالت پر رہتی ہیں پھر بدل کر کوئی اور پوزیشن لے لیتی ہیں - کیمرے سے آنکھوں کی حرکات اور ان کے جم جانے کے وقفے ملاحظہ ہو سکتے ہیں - کتاب کی جو جگہیں آنکھوں کو اپنی جانب کھینچتی ہیں ، اور جن مقامات پر آنکھ ٹک جاتی ہے وہ دلچسپی اور جاذبیت کے مقامات ہوتے ہیں اور توجہ کے لحاظ سے ان کی بڑی قیمت ہے - ڈاکٹر ہرمن ایف برانٹ (Dr. Herman F. Brandt) نے تجربے سے معلوم کیا ہے کہ عورتیں پہلے مردوں کی چھاتی پر نگاہ ڈالتی ہیں ، پھر اس کے چہرے پر ، پھر آنکھوں پر ، پھر کالر پر اور پھر اور چیزوں پر - تجربے میں سو عورتیں لی گئیں - جتنا وقت انہوں نے ہر شے ملاحظہ کرنے میں صرف کیا وہ حسب ذیل ہے :

	عورتوں کی تعداد	شے	اپنے وقت کا فی صد حصہ
۱	۱۰۰	دایاں بازو - ہاتھ اور کندھا	۲٫۵۰
		دائیں اپر کوٹ	۶٫۶۹
		"لوئر کوٹ	۷٫۶۲
۲	۹۸	چہرہ	۳۱٫۶۵
۳	۹۸	ٹائی کالر	۲۱٫۹۰
۴	۴۱	بایاں کندھا	۲٫۳۷
۵	۶۸	جیب کا رومال	۵٫۹۲
۶	۳۹	بایاں بازو	۱٫۵۱
۷	۱۸	بایاں ہاتھ	۰٫۶۵
۸	۷۷	پتلون	۶٫۷۲
۹	۵۲	جوتے	۳٫۳۶

اس نقشے سے ظاہر ہوتا ہے کہ امریکی عورتیں سب سے زیادہ وقت

چہرہ دیکھنے پر اور اس کے بعد ٹائی اور کالر پر صرف کرتی ہیں۔ پاکستان میں اس قسم کی کوئی تحقیق نہیں ہوئی۔

آنکھوں کی حرکت کے علاوہ آنکھیں ایک مقام پر مرکوز ہو جاتی ہیں اور آنکھوں کے عدسے اور مژگانی عضلات ماحول سے ہم آہنگی پیدا کر لیتے ہیں۔ آپ نے کتے کو کان کھڑے کرتے دیکھا ہوگا۔ اس کا سارا جسم مع آنکھ اور سر کے خاص حالت میں آ جاتا ہے۔ بعض جانور صرف کان کھڑے ہی نہیں کرتے بلکہ جدھر سے آواز آ رہی ہو ادھر کان موڑ بھی لیتے ہیں۔ اونچا سننے والے بھی کان کو آواز کی رخ میں کر لیتے ہیں اور اکثر اوقات کان سے ہاتھ کی ہتھیلی لگا کر آواز کی لہروں کو کان تک پہنچا دیتے ہیں۔

(ب) **جسمانی توافق :** زمین پر چیز ٹٹولتے وقت انسان جھک جاتا ہے۔ یا دوڑ لگانے سے پہلے دوڑ کی تیاری میں کوئی کھلاڑی لائن کے اوپر سیٹی کا انتظار کر رہا ہو تو اس کا جسم آگے کو خم کھاتا ہے یا کئی دفعہ غور سے باریک اور مدھم آواز سننے کے لیے اپنی کرسی پر انسان بیٹھا بیٹھا آگے کو جھک جاتا ہے۔ ان حالات میں جسمانی توافق کی بہترین مثالیں ملیں گی۔ یا بلی کو دیکھیے جب وہ چوہے کے انتظار میں بل کے پاس بیٹھی ہو۔ یا پھر فوجی کو اٹنشن (Attention) کی حالت میں کھڑا دیکھیے یا لڑکوں کو ڈرل کے گھنٹے میں باوردی ہوشیار ملاحظہ کیجیے۔ یہاں بھی جسمانی توافق کی مثالیں ملتی ہیں۔

(پ) **عضلاتی کھچاوٹ اور کوشش کا احساس :** جسمانی توافق میں عضلاتی کھچاوٹ لازمی امر ہے لیکن عضلاتی کھچاوٹ کا علیحدہ وجود بھی ہے۔ جب انسان کسی کام میں محو ہو اور اسے پریشان کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کی کارکردگی کم نہیں ہوتی بلکہ بعض اوقات زیادہ ہو جاتی ہے۔ زیادہ کارکردگی کے لیے زیادہ توانائی کی ضرورت ہے اور اس کا سرچشمہ عضلاتی تناؤ ہے۔ مارگن (Morgan) نے ایک تجربہ

بیان کیا ہے - چھ طلبا لیے گئے ، انھوں نے حروف دیکھ کر کلیدیں (Keys) دبانی تھیں - کلیدیں دس تھیں اور الفاظ بھی دس تھے - LMNPSTVXYZ ان الفاظ کو سرخ ، پیلے یا سبز پس منظر پر پیش کیا جاتا تھا - جونہی کوئی لفظ پردے پر آتا تھا اسے دیکھ کر اور اس کا پس منظر دیکھ کر کلید دبانی ہوتی تھی - کلید دبتے ہی نیا لفظ نکل آتا تھا - ان کلیدوں کے ساتھ ایسی چیز لگی ہوئی تھی جس سے دباؤ کی شدت کا پتہ چل جاتا تھا - یہ تجربہ پہلے معمولی حالات میں ہوا پھر شور میں - دباؤ کی شدت معمولی حالات میں دیکھی گئی اور غیر معمولی میں بھی - غیر معمولی حالات میں طلبا کو کلیدیں زیادہ زور سے دبانی پڑیں - لیکن ان کی کارکردگی میں کوئی فرق نہیں آیا - توجہ زیادہ دینی پڑی اور عضلات کو زیادہ کام کرنا پڑا - کارکردگی شور اور سکون کے ماحول میں ایک جیسی تھی -

(ت) **مرکزی اعصابی نظام کا توافق :** ہم نے آخذات اور عضلات کے توافق کا ذکر کیا ہے لیکن کیا اس کے علاوہ مرکزی نظام عصبی میں بھی توافق پیدا ہوتا ہے یا نہیں ؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا تسلی بخش حل ابھی تک نصیب نہیں ہوا - بعض کہتے ہیں کہ توافق صرف آخذات ، عضلات اور جسم میں ہوتا ہے - بعض کہتے ہیں کہ مرکزی نظام اعصاب بھی توجہ میں سرگرم کار ہوتا ہے - تجربات سے یہ معاملہ قطعی طور پر طے نہیں ہو پایا -

نومیت (Hypnotism) کی حالت میں معمول کو کہا جاتا ہے کہ وہ درد محسوس نہیں کرے گا - پھر وہ بجلی کے جھٹکے یا جلنے یا سوئی چبھونے سے درد محسوس نہیں کرتا - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی چیز اندر سے کنٹرول کر رہی ہے اور درد کا احساس نہیں ہونے دیتی - ایسے ہی اگر معمول کو کہہ دیا جائے کہ وہ بہت درد محسوس کرے گا تو انگلی لگنے پر بھی چلا اٹھتا ہے - یہ چیز بھی اس امر کی توثیق

کرتی ہے کہ اخذات اور عضلات کے علاوہ توجہ کے سلسلے میں مرکزی نظام بھی اہم وظائف ادا کرتا ہے۔

ان حقائق سے جو قیاس پیدا ہوا اس کی مکمل تائید کہیں نہیں ملتی۔ مثلاً کچھ افراد کو کہا گیا کہ جب وہ روشنی دیکھیں یا آواز سنیں تو انہیں فوراً انگلی اٹھا دینی چاہیے۔ کبھی روشنی آئے گی اور کبھی آواز لیکن دونوں صورتوں میں رد عمل ایک ہی ہوگا۔ جب یہ لوگ روشنی کی توقع کرتے تو ان کا روشنی کا رد عمل آواز سے جلد تر ہوتا اور جب انہیں آواز کی توقع ہوتی تو آواز کا رد عمل روشنی سے جلد تر ہوتا۔ روشنی اور آواز کی حالت میں جسمانی انداز ایک ہی تھا اس لیے رد عمل کی تیزی توقع پر مبنی کی گئی۔ چونکہ توقع مرکزی نظام سے تعلق رکھتی ہے لہٰذا یہ کہا گیا کہ توجہ میں مرکزی نظام خود مختار عنصر کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔

اس تجربے میں خامی یہ ہے کہ آواز کی توقع میں تو سر کی وہ حالت نہ تھی جو روشنی کی توقع میں تھی اور روشنی کی توقع میں تو آنکھوں کی حالت بھی وہ نہ تھی جو آواز کی توقع میں تھی۔ لہٰذا روشنی اور آواز کی توقع میں جو توافق آخذات اور عضلات میں آ جاتا ہے وہ رد عمل کی تیزی کا ذمہ دار گردانا جا سکتا ہے۔ مرکزی عصبی نظام اس سلسلہ میں کوئی فریضہ ادا نہیں کرتا۔

پس یہ تجربہ بھی صاف طور پر مرکزی نظریے کی تائید نہیں کرتا۔ لیکن یاد رہے کہ ابھی تک اس نظریے کی تردید بھی نہیں ہوئی بلکہ غیر طبعی (Abnormal) نفسیات کے بعض حقائق اس نظریے کے حق میں دکھائی دیتے ہیں۔

(ٹ) **شعور کی روشنی :** آنکھیں پھاڑ کر دیکھیں تو اشیائے مطلوبہ نظر آ جاتی ہیں لیکن توجہ محض آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کا نام نہیں۔ کیونکہ آنکھیں کھولی جا سکتی ہیں اور توجہ غیر حاضر ہو سکتی ہے۔

اسی طرح جسمانی انداز توجہ میں ضروری ہے لیکن توجہ کا ضامن نہ
جماعت میں کئی لڑکے توجہ کے انداز میں بیٹھے ہوتے ہیں لیکن ا
دماغ غیر حاضر ہوتا ہے۔ ان سے اگر پوچھا جائے کہ کیا کہ
تو وہ کچھ جواب نہ دے سکیں گے۔ لہٰذا آخذات، عضلات اور ج
توافق کے علاوہ کسی اور عنصر کا ذکر بھی توجہ میں ضروری
اور وہ عنصر شعور کا ہوگا۔ شعور میں لاتے ہی چیزیں صاف اور
ہو جاتی ہیں۔ جن چیزوں کو شعور میں نہیں لایا جاتا وہ مدھم
دھندلی رہ جاتی ہیں۔

جن چیزوں کا شعور ہو وہ توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہوتی ہ
لیکن ان چیزوں کے علاوہ کئی اور بے شمار چیزیں ہیں جو شعور
مرکز میں تو نہیں ہوتیں لیکن شعور سے باہر بھی نہیں ہوتیں۔ ا
مقام شعور کی سرحدوں پر ہوتا ہے۔ اگر کھڑکی سے باہر نگاہ دوڑ
تو بعض چیزیں فوراً دلچسپی کا موجب بن جاتی ہیں اور شعور کا م
سنبھال لیتی ہیں بعض اور چیزیں شعور کے حاشیہ (Fringe) پر
لے لیتی ہیں اور بعض کا مقام شعور میں بالکل نہیں ہوتا وہ لاشعو
حصہ ہیں۔ لہٰذا شعور کو تین ہم مرکز دائروں میں دکھایا جا سکتا۔
مرکزی دائرہ جس میں ہر چیز صاف اور بین ہے، درمیانی دائرہ



توجہ کا مرکز نہیں لیکن توجہ کے پس منظر میں شامل ہے اور بیر

دائرہ جو لاشعور کا ہے۔

درمیانی دائرہ جو توجہ کو ظاہر کرتا ہے وسعت میں نہایت تنگ ہوتا ہے۔ اسی لیے ربو (Ribot) کے مطابق توجہ نام ہے صرف وحدت خیال کا (Mono-ideaism) یعنی توجہ کی حالت میں صرف ایک خیال شعور کے مرکز میں ہوتا ہے باقی تمام خیالات پس منظر میں ڈوب جاتے ہیں ، اور بے توجہی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اگر پڑھتے ہوئے بھڑ کاٹ جائے تو کتاب ہاتھ سے گر جائے گی۔ سب خیالات رفو چکر ہو جائیں گے اور صرف درد اور بھڑ کا احساس شعور پر قبضہ کر لے گا۔ جب درد کی شدت ذرا کم ہو جائے گی تو کتاب وغیرہ کو سنبھال لیا جائے گا۔ درمیانی دائرہ جسے بے توجہی کا رقبہ کہا گیا ہے۔ بے شمار چیزوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ کام کرتے وقت اپنے لباس کا احساس نہیں ہوتا۔ جس کرسی پر بیٹھے ہوں اس کا پتہ بھی نہیں ہوتا۔ بجلی کا پنکھا چل رہا ہے لیکن اس کی آواز نہیں سن رہے ہوتے۔ گھڑی ٹک ٹک کرتی ہے لیکن اس کی ٹک ٹک سنائی نہیں دیتی۔ یہ سب چیزیں پس منظر میں ہیں ان کا علم تب ہوتا ہے جب ان میں سے کوئی اپنا کام چھوڑ دے۔ پنکھا بند ہو جائے یا گھڑی ٹک ٹک نہ کرے تو فوراً علم ہو جاتا ہے۔ لاشعور کا مطالعہ غیر طبی نفسیات کا موضوع ہے۔ اس کی اہمیت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے کسی پہاڑ جیسے جسیم برف کے تودے کا تصور ذہن میں لائیے جو قطب شمالی یا قطب جنوبی سے خط استوا کی طرف آ رہا ہو۔ دور سے یہ پہاڑ ہی دکھائی دے گا۔ لیکن اگر کسی جہاز سے ٹکرا جائے تو جہاز چکناچور ہو جائے گا۔ اس تودے $\frac{1}{10}$ کا حصہ پانی سے باہر اور $\frac{9}{10}$ حصہ پانی کے اندر ہوتا ہے۔ شعور کو زندگی کا $\frac{1}{10}$ حصہ کہا جاتا ہے اور لاشعور کو $\frac{9}{10}$ حصہ۔ یہ مثال لاشعور کی عظمت اور وسعت ظاہر کرتی ہے۔

بعض لوگ شعور اور توجہ میں کوئی فرق نہیں کرتے لیکن یہ صحیح نہیں ۔ کیونکہ توجہ شعور کا مرکزی حصہ ہے شعور کا باقی حصہ تحت الشعور کہلاتا ہے اور جو حصہ شعور کی دسترس سے پرے ہو اسے لاشعور کہتے ہیں ۔

توجہ کا مد و جزر (Fluctuations of Attention) : گھڑی کو کان سے لگائیے اور اس کی ٹک ٹک کی طرف دھیان دیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ تھوڑے عرصہ کے بعد توجہ ٹک ٹک سے ہٹ کر کسی اور چیز پر لگ جاتی ہے ۔ پھر کوشش کیجیے کہ توجہ کا مرکز ٹک ٹک بن جائے ۔ جب آپ دوبارہ ٹک ٹک کو سننے لگیں گے تو کچھ عرصہ کے بعد اس ٹک ٹک کا بھی وہی حشر ہوگا جو پہلی کا ہوا تھا ۔ تھوڑی دیر بعد توجہ اس ٹک ٹک سے کھسک کر کسی اور چیز پر جا پڑے گی ۔ اس تجربے سے توجہ کے اتار چڑھاؤ کا پتہ چلتا ہے لیکن یہ تجربہ اور طرح سے بھی ہو سکتا ہے ۔ چھوٹے سے مدھم دھبے یا ننھے سے ستارے کو دیکھیے ۔ کچھ وقت کے لیے توجہ ان پر ٹکی رہے گی ۔ پھر کسی اور چیز کی طرف چلی جائے گی ، کوشش کرکے دوبارہ دھبے یا ستارے پر توجہ لے آئیے ۔ تھوڑی دیر کے لیے توجہ واپس آ جائے گی ۔ لیکن پھر وہاں سے کھسک کر کسی اور چیز پر جاگزیں ہوگی ۔ ایسا کیوں ہوتا ہے ؟ کیا اس کی وجہ یہ ہوگی کہ ہمارے آخذات اور دیگر جسمانی اعضا کی حالت اب ویسی نہیں رہی جو پہلے تھی یا اس کی وجہ یہ ہے کہ دماغ میں ہر وقت تبدیلیاں آتی رہتی ہیں اور توجہ کا مد و جذر ان تبدیلیوں کا عکس ہے ؟ من (Munn) کی رائے میں حسی اعصاب میں کوئی فرق نہیں آتا ۔ ان کی کارکردگی بدستور قائم رہتی ہے ۔ اگر فرق پڑتا ہے تو حواس میں یا مرکزی نظام میں ۔ لہٰذا دونوں میں سے ایک کو یا دونوں کو توجہ کی مد و جذر کا ذمے دار قرار دینا چاہیے ۔ کیونکہ تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ طبل گوش کی عدم موجودگی

سمعی مد و جذر کو روکتی نہیں اور نہ ہی عدسوں کی عدم موجودگی بصری مد و جزر کو ۔ لیکن شبکیہ کی تبدیلیاں یا دوران خون میں اور تنفس میں کمی بیشی ، توجہ پر اثر انداز ہوتی ہیں اور عضلاتی کھچاوٹ کو بھی اس سلسلہ میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ لہذا مد و جذر کے اسباب مرکزی نظام میں بھی پائے جائیں گے اور حواس میں بھی ۔

مد و جذر کے اسباب خواہ کچھ ہی ہوں لیکن کوئی شخص اس کی حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا ۔ ادراک میں زمین اور شکل کا ذکر کرتے وقت بیان کیا گیا تھا کہ بعض اوقات شکل زمین میں تبدیل ہو جاتی ہے اور بعض اوقات زمین شکل میں ۔ اور یہ دونوں بار بار اپنی جگہ بدلتی ہیں ۔ عموماً زمین کی نسبت شکل زیادہ متعین ہوتی ہے ۔ لیکن اگر شکل اور زمین دونوں متعین ہوں تو پھر کبھی شکل اور کبھی زمین توجہ کا مرکز بنیں گی ۔

توجہ کی وسعت (Span of Apprehension) : کتنی چیزیں ایک ہی وقت میں توجہ کا مرکز بن سکتی ہیں ؟ یعنی ایک ادراک میں کتنی چیزیں زیادہ سے زیادہ آ سکتی ہیں ۔ مثلاً اگر تھالی میں کئی چیزیں پڑی ہوئی ہوں تو ایک ہی نگاہ میں کتنی چیزیں دیکھی جا سکتی ہیں ؟ تجربوں سے ثابت ہے کہ زیادہ سے زیادہ پانچ چھ دیکھ سکیں گے ۔ آج کل تجربہ گاہوں میں کارڈوں پر مختلف نمبر ⅕ سیکنڈ کے لیے دکھائے جاتے ہیں ۔ چار تک تو بغیر غلطی کے بتا دیے جاتے ہیں لیکن پانچ پر غلطی کا امکان ہوتا ہے ۔ جب تعداد بارہ تک پہنچ جاتی ہے تو کچھ یاد نہیں رہتا ۔ لیکن توجہ کی وسعت طے شدہ امر نہیں ۔ مختلف افراد کے لیے توجہ کی وسعت مختلف ہے ۔ بعض لوگ آٹھ تک صحیح دیکھ لیتے ہیں اور یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص جو کسی وقت آٹھ تک صحیح دیکھ لیتا ہے کسی اور وقت پانچ سے زیادہ صحیح نہیں دیکھ سکتا ۔

گروپ بنانے سے توجہ کی وسعت بڑھ جاتی ہے۔ جب صرف چار پانچ نقطے دیکھے جاتے ہیں تو ہر نقطے کو الگ الگ دیکھا جاتا ہے۔ جب وسعت آٹھ تک بڑھ جاتی ہے تو نقطوں کے گروپ بنا لیے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک ہی نگاہ میں اگر صرف چار پانچ حروف دیکھے جا سکیں تو جب ان حروف سے الفاظ بنا لیے جاتے ہیں تو چار پانچ الفاظ دیکھے جائیں گے۔ چونکہ ہر لفظ حروف کا مجموعہ ہے۔ لہٰذا اگر ان الفاظ کے حروف گنے جائیں تو تعداد پانچ سے کہیں زیادہ ہوگی اور اگر الفاظ سے اجزائے جملہ بنا لیے جائیں تو وسعت اور بھی بڑھ جائے گی۔

توجہ کے اقسام (Varieties of Attention) :

توجہ کی موٹی موٹی قسمیں تین ہیں۔

(۱) انفعالی یا غیر ارادی (Involuntary)۔

(۲) فعالی یا ارادی (Voluntary)۔

(۳) عادتی (Habitual)۔

جب بم پھٹے، بادل گرجے، بجلی کی تیز چمک ہو یا ڈھول بجے یا جسم کو شدید درد ہو تو ہماری توجہ خواہ مخواہ ان چیزوں کی طرف منعطف ہوگی۔ یہ توجہ غیر ارادی کہلائے گی کیونکہ مہیجات یا ماحول اپنی طاقت اور شدت سے توجہ کو کھینچتے ہیں۔ اس میں انسانی ارادے کو دخل نہیں۔ بعض دفعہ انسان کسی دلچسپ کام میں منہمک ہوتا ہے اور پھوڑ کاٹ جاتی ہے تو کام وام سب بھول جاتا ہے اور درد کی طرف دھیان جا پڑتا ہے۔

لیکن جب کبھی اپنے ارادے اور مرضی سے کسی چیز کو توجہ دی جائے تو ایسی توجہ کو ارادی کہیں گے۔ ہر طالب علم امتحان کے نزدیک کتابیں پڑھتا ہے اور دہراتا ہے۔ جو چیز یاد نہیں ہوتی اسے دوبارہ یاد کرتا ہے۔ یہ سب کچھ توجہ کی بدولت ہے۔ یہ توجہ ارادی ہے کیونکہ طالب علم خود اپنی مرضی سے توجہ دے رہا

ہوتا ہے - توجہ کا سرچشمہ خود اس کی ذات ہے نہ کہ ماحول - لیکن اگر پڑھائی ڈر سے ہو تو توجہ ارادی کے بجائے غیر ارادی کہلائے گی - دراصل ارادی اور غیر ارادی توجہ میں کوئی مستقل حد فاصل موجود نہیں - فرق صرف نقطہ نگاہ کا ہے اگر توجہ کے اسباب خارجی ہوں تو توجہ غیر ارادی ہوگی اور اگر توجہ فرد کی مرضی اور ارادے کے تحت ہو تو اسے ارادی کہیں گے -

چونکہ فعالی توجہ میں کوشش اور ارادے کو دخل ہوتا ہے - لہٰذا بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ اس توجہ کا منبع قوت ارادی (Will Power) ہے - جب انسان طبیعت پر زور دے کر کسی کام کی طرف دھیان دے ، جیسے طالب علم امتحان کے نزدیک کرتا ہے ، تو کئی ایک ترغیبات کو رد کرنا ہوتا ہے اور یہ قلعہ قوت ارادی کے بغیر سر نہیں ہو سکتا - لیکن آج کل کے نفسی عالموں نے قوت ارادی کا لفظ چھوڑ دیا ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس قوت کو فرض کر لینے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا - یہ درست ہے کہ مشکل اور ناسماعد حالات میں طبیعت متصادم خیالات کی آماجگاہ بن جاتی ہے - کبھی کوئی محرک شعور پر قبضہ جما لیتا ہے اور کبھی کوئی - لیکن اس تصادم کا حل 'قوت ارادی' میں نہیں ملے گا - بلکہ محرکات کی توانائی اور ان کے نظم و نسق میں ملے گا -

اب عادتی توجہ کو لیجیے : ہر شخص عادتاً کچھ مہیجات کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے - مثلاً ڈاکٹر لوگ ٹیلیفون وصول کرنے کو اور ماں اپنے بچے کی آوازیں سننے کو ہر وقت تیار ہے - ایسے ہی نر اور مادہ کی آپس کی دلچسپیاں ہیں - عورتوں کو مرد پسند ہیں اور مردوں کو عورتیں اور دونوں ایک دوسرے پر توجہ دیتے ہیں - اس کے علاوہ ہمارا خورد و نوش اور پوشاک میں دلچسپی لینا عادت کی وجہ سے ہے - سائنسدانوں کی اپنے اپنے مسائل میں

دلچسپیاں تربیت اور عادت سے ہیں ۔ عالم نباتیات جڑی بوٹیوں کو غور سے دیکھتا ہے ۔ اس کی توجہ کا مآخذ اس کا شوق ہے ۔ اور شوق عادت سے پیدا ہوتا ہے ۔ جماعت میں اگر مسمریزم یا جنس کا ذکر ہو تو تمام طلبا کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ ہر طالب علم بڑے شوق سے جنس کی باتیں سنتا ہے اور چاہتا ہے کہ ان کا سلسلہ جاری رہے ۔ توجہ دینے کی عادات باقی عادتوں کی طرح قائم رہتی ہیں اور ادراک کو آسان یا مشکل بنا دیتی ہیں ۔ عالم نباتیات کا شوق جڑی بوٹیوں کا ادراک تو آسان کر دے گا ، لیکن کسی اور چیز کا ادراک مشکل بنا دے گا ۔

یاد رہے کہ عادتی توجہ محرکات سے پیدا ہوتی ہے ، ان میں بعض محرکات تو پیدائشی ہوتے ہیں ، بعض اکتسابی ۔ مثلاً مرد اور عورت کی ایک دوسرے میں دلچسپی اور ایک دوسرے پر توجہ دینا پیدائشی محرکات کے باعث ہے ۔ لیکن کسی خاص خوراک یا مشروب پر توجہ دینا یا کسی خاص لباس ، مصوری یا شاعری کو پسند کرنا اکتسابی امر ہے ۔ پیدائشی اور اکتسابی کی تمیز محض اضافی ہے ، کیونکہ جیسے گزشتہ ابواب میں ذکر آ چکا ہے زندگی کا ہر فعل پیدائشی بھی ہے اور اکتسابی بھی ۔ فرق صرف زور کا ہے ۔ اگر پیدائشی عنصر پر زور ہوگا تو توجہ کے اسباب پیدائشی کہلائیں گے اور اگر زور اکتسابی عنصر پر ہوگا تو توجہ کے اسباب اکتسابی بن جائیں گے ۔ لیکن خواہ اسباب پیدائشی ہوں یا اکتسابی توجہ کا مآخذ محرکات کو سمجھنا چاہیے ۔ اس خیال کو میکڈوگل (McDogall) نے بڑی شد و مد سے اپنی کتابوں میں ظاہر کیا ہے ۔

توجہ کھینچنا اور توجہ قائم رکھنا :

(Catching attention and holding attention)

ماحول سے بے شمار مہیجات اٹھتے ہیں لیکن ان میں سے چند ایک

توجہ کھینچنے اور اسے قائم رکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ کچھ مہیج اس قسم کے ہوتے ہیں کہ وہ توجہ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ ہم خود انہیں اپنی دلچسپیوں کے باعث اپنی توجہ کا مرکز بنا لیتے ہیں۔ اول الذکر کو معروضی اور مؤخرالذکر کو موضوعی اسباب کہتے ہیں۔

معروضی اسباب (Objective Conditions) :

۱۔ **شدت :** ایک زیادہ شدید چیز کم شدید چیز کی نسبت ہماری توجہ کو جلد اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ مثلاً ٹارچ کی تیز روشنی ہماری چہرے پر ڈالی جائے تو ہم فوراً گھبرا کر اس کی طرف متوجہ ہوں گے یا گرج کی مہیب آواز ہم سننا چاہیں یا نہ سننا چاہیں خواہ مخواہ ہمیں سننی پڑے گی۔

۲۔ **جسامت :** ایک چھوٹی چیز کی نسبت بڑی چیز ہماری توجہ کو جلد اپنی طرف کھینچتی ہے۔ بہت سے معمولی قد و قامت کے اشخاص میں ایک لحیم و شحیم آدمی خواہ مخواہ توجہ کا مرکز بن جاتا ہے اور ہر کس و ناکس اس کی طرف ایک نظر ضرور دیکھتا ہے۔

۳۔ **نمایاں حیثیت :** شوخ و شنگ لباس، چمکدار اور بھڑکیلے رنگ، نہایت خوبصورت یا نہایت بدصورت چہرے نسبتاً زیادہ جاذب توجہ ہوتے ہیں۔

۴۔ **حرکت :** بعض نفسی عالموں کے خیال میں توجہ کا ایک بنیادی معروضی سبب حرکت ہے۔ آپ بے توجہ بیٹھے ہیں، سامنے فرش پر کوئی چیز حرکت کرتی ہے، آپ فوراً چونک کر اٹھ بیٹھتے ہیں اور غور سے دیکھتے ہیں کہ یہ کیا چیز ہے جو ہلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

۵۔ **ماحول میں تبدیلی :** سورج یکایک غائب ہو جائے یعنی ابر کے ٹکڑے میں چھپ جائے تو مصروفیت کے باوجود ہم ایک دم متوجہ ہو جاتے ہیں کہ روشنی کیوں غائب ہو گئی۔ باہر بارش کے مدھم شور میں

اگر یکدم گرج پیدا ہو یا بارش زیادہ تیز ہو جائے تو ہم خواہ مخواہ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں - جس کمرے میں بیٹھے ہوں وہاں یکدم اندھیرا ہو جائے یا اندھیرے میں یکایک روشنی ہو جائے تو متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے -

۶- تکرار : ایک ہی عمل کو بار بار دھرایا جائے تو توجہ کا مرکز بن جاتا ہے - مثلاً کوئی شخص ایک ہی لفظ کو بار بار دھراتا چلا جائے تو سننے والا آخر سنے گا -

۷- تغیر و تضاد : جو چیز ماحول سے مختلف ہوگی توجہ کھینچے گی- مثلاً صاف اور شفاف میدان میں کالا نشان ، نیز کھیتوں میں سرخ پھول ، یا متحرک شے میں ساکن اور جامد دھبہ توجہ کو کھینچے بغیر نہیں رہ سکتے - عموماً گھڑی کی ٹک ٹک سنی نہیں جاتی لیکن اگر ٹک ٹک رک جائے تو فوراً توجہ کا رخ ادھر ہو جائے گا -

موضوعی اسباب (Subjective Conditions) :

یہ اسباب فرد کی ذات میں موجود ہوتے ہیں اور دو اقسام میں بٹے جاتے ہیں -

(۱) فرد کے مستقل خصائص -

(۲) ذہنی حالت اور مشاغل کی وجہ سے عارضی عناصر -

مستقل خصائص میں توجہ اور بے توجہی کی عادات شامل ہیں - ہر انسان نے بعض چیزوں کو دھیان دینے اور بعض چیزوں کو نظر انداز کرنے کی عادتیں بنائی ہوئی ہوتی ہیں - مثلاً موٹر ڈرائیور کو فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ انجن سے کوئی آواز نکل رہی ہے اور اس آواز کا کیا مطلب ہو سکتا ہے - موٹر چلاتے چلاتے اسے موٹر اور اس کے اجزا کی طرف توجہ دینے کی عادت پڑھ گئی ہے - جو مسافر اس گاڑی میں سوار ہوں گے وہ اس آواز کو نہیں سنیں گے کیونکہ انہیں ایسی کوئی عادت نہیں - عام لوگ بھی بعض چیزوں کو توجہ دیتے ہیں بعض کو بالکل

نظر انداز کر دیتے ہیں ۔ ان کی توجہ اور بے توجہی ان کے علم کے تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے ۔ سکولوں اور کالجوں میں کوشش کی جاتی ہے کہ طلبا کو پڑھنے لکھنے کی عادت پڑے ۔ عادت دلچسپی سے پیدا ہوتی ہے اور دلچسپی سے عادت پھلتی پھولتی ہے۔ جو طالب علم اپنے مضامین میں دلچسپی نہیں رکھتے وہ پڑھنے کی عادت نہیں ڈال سکتے اور عادت کے بغیر یا تو رٹے پر گزارا کرتے ہیں یا کورے کے کورے رہ جاتے ہیں ۔ مستقل خصائص میں پیدائشی اور اکتسابی دونوں عناصر شامل ہیں ۔

عارضی عناصر میں وقتی دلچسپیاں نہایت اہم ہیں ۔ جو چیزیں وقتی دلچسپیوں کو تشفی دیں وہ توجہ کا مرکز بن جاتی ہیں ۔ مثلاً کمرہ امتحان میں پرچہ لکھنے کی کاپی ، نگران اور اس کا عملہ بھی توجہ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ لیکن جب امتحان ختم ہو جاتا ہے تو نہ نگران کی پرواہ رہتی ہے اور نہ اس کے عملے کی ، نہ ہی پرچے اور لکھنے کی کاپی کی ، اسی طرح بازار میں کوئی چیز خریدنے جائیں تو جس دکان سے وہ چیز دستیاب ہو سکتی ہے وہ دکان اور وہ شے جس کی تلاش ہے عارضی طور پر جاذب توجہ بن جائیں گے ۔ چیز خرید لینے پر دکان میں کوئی دلچسپی نہیں رہتی ۔

توجہ کی تین اقسام بتائی گئی تھیں یعنی فعالی، انفعالی اور عادتی۔ اگر اسباب توجہ کو سامنے رکھیں تو انفعالی توجہ کے اسباب تو سراسر معروضی نکلیں گے ۔ فعالی اور عادتی توجہ کے اسباب موضوعی ہوں گے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ توجہ کھینچنے کے لیے معروضی اسباب درکار ہیں ۔ لیکن توجہ کھینچنے کے بعد اگر توجہ کو برقرار رکھنا ہو تو موضوعی اسباب سرگرم کار ہونے چاہییں ۔ شدت یا تغیر سے ایک مہیج شعور میں داخل تو ہو سکتا ہے لیکن اگر اس مہیج کو داخل ہونے کے بعد کچھ دیر قائم رہنا ہو تو فطری یا اکتسابی دلچسپی ضرور بیدار ہونی چاہیے ۔ کوئی شکل نرالی ہونے کی وجہ سے جاذب نظر

تو بن سکتی ہے لیکن بار بار تبھی دیکھی جائے گی جب وہ کسی فطری یا اکتسابی میلان کی تشفی کرے۔ اسی لیے بعض عجیب و غریب چہرے ایک نگاہ سے زیادہ نہیں دیکھے جاتے اور بعض مستقل دلچسپی کا باعث بن جاتے ہیں۔

اخبار میں اشتہار کی مثال لیجیے۔ جلی یا ٹیڑھے حروف میں لکھا ہوا شاید باقی تحریر کے مقابلے میں زیادہ روشن ہو۔ یہ سب معروضی عناصر ہیں، ان سے توجہ اشتہار کی طرف کھینچ جائے گی - لیکن اشتہارات صرف جلی یا ٹیڑھے حروف پر ہی اکتفا نہیں کرتے۔ ان میں تصویریں بھی ہوتی ہیں اور تصویریں بھی خوبصورت عورتوں کی۔ یہ تصویریں جنسی میلانات کی تشفی کرتی ہیں۔ اور تصویروں کے ساتھ یہ بھی لکھا ہوا ہوتا ہے کہ یہ صابن حسن کو دوبالا کرتا ہے۔ یہ تربیت آمدنی کو دگنا کرتی ہے اس کورس سے ہکلے سو فی صد ٹھیک ہو جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ایسی تحریر جذبات اور محرکات کو شعوری یا لاشعوری طور پر تسکین بہم پہنچاتی ہے، اور توجہ کو دیر تک اپنی جانب لگائے رکھتی ہے - بس ہمیں دو قسم کے عناصر تسلیم کرنے پڑیں گے ایک تو وہ جو توجہ کو کھینچتے ہیں اور دوسرے وہ جو اسے برقرار اور قائم رکھتے ہیں۔

توجہ برقرار رکھنا (Sustained Attention) :

مد و جذر توجہ میں توجہ کے بار بار بدلنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ کسی منظر کو دیکھیں، نگاہ ایک مقام پر جمی نہیں رہے گی، کبھی ایک مقام پر ہوگی کبھی دوسرے مقام پر۔ اگر کوشش بھی کی جائے کہ توجہ ایک مقام سے نہ ہٹے تو بھی یہ کوشش کامیاب نہ ہوگی۔ لیکن اس مد و جذر کے باوجود توجہ برقرار بھی رہتی ہے۔ کوئی دلچسپ ناول پڑھنا شروع کریں۔ جب تک ختم نہ ہو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ پڑھتے پڑھتے گھنٹوں گزر جاتے ہیں۔ دلچسپی کم نہیں ہوتی اور توجہ بدستور قائم رہتی ہے۔ سینما دیکھتے ہوئے برابر تین گھنٹے

تک توجہ تصویر پر لگی رہے گی - ایک منٹ کے لیے بھی بے توجہی کا عالم نہیں آتا - کیا یہ حقائق مد و جذر توجہ کے مخالف نہیں ؟ اس سوال کا جواب نفی میں دینا ہوگا کیونکہ تصویر کو تین گھنٹے تک دیکھتے ہوئے ہماری توجہ ایک مقام پر مرکوز نہیں رہتی - تصویر میں مختلف مناظر آتے ہیں - ناچ آتے ہیں ، گانے ہوتے ہیں ، مار دھاڑ خون خرابہ ہوتا ہے - عشق و محبت کی باتیں ہوتی ہیں - غرضیکہ ہر لحظہ تصویر بدلتی ہے اور ساتھ ہی توجہ بھی بدل جاتی ہے لیکن اس کا بدلنا اس قدر فوری ہوتا ہے کہ محسوس نہیں ہوتا - یہی حال ناول کا ہے - اس میں بھی ہر آن تبدیلی آتی ہے اور تبدیلی کے ساتھ اسی سرعت سے توجہ بدل جاتی ہے - لیکن تبدیلی کا پتہ نہیں چلتا - للہذا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ توجہ میں مد و جذر نہیں آیا اور وہ ایک ہی نہج پر برقرار رہی -

بعض دفعہ طلبا بے توجہی (Inattention) کی شکایت کرتے ہیں - استاد صاحبان بھی گلہ کرتے ہیں کہ طلبا دھیان نہیں دیتے - بے توجہی سے یہ مراد نہیں کہ طلبا کا ذہن بالکل خالی ہے اور وہ کسی چیز کو توجہ نہیں دے رہے - وہ توجہ ضرور دیتے ہیں لیکن استاد کے لیکچر یا کتاب پر توجہ نہیں دیتے - ان کا دھیان کسی اور چیز میں ہوتا ہے - اگر وہ پڑھائی میں توجہ دینا چاہیں تو انھیں اپنے مضامین میں دلچسپی پیدا کرنی ہوگی اور استاد صاحبان بھی اگر چاہتے ہوں کہ طلبا ان کے لیکچر میں دلچسپی لیں تو انھیں لیکچر دلچسپ بنانا ہوگا اور طلبا کی دلچسپیاں مضامین میں پیدا کرنی ہوں گی - افسانہ پڑھنے والے کو دیکھیے - وہ افسانہ شروع کرتا ہے اور جب تک ختم نہیں کر لیتا اسے چین نہیں آتا - اس قسم کا انہماک درسی مضامین میں پیدا کرنے کی ضرورت ہے - افسانہ پڑھنے والا مسئلہ یا الجھن کو سمجھ جاتا ہے اور الجھن کا حل جاننے کے لیے آگے آگے بڑھتا جاتا ہے ، اسی طرح جو طالب علم اپنے مضامین کے مرکزی مسائل کو سمجھ لے ان کا حل

ڈھونڈنے کے لیے وہ زیادہ سے زیادہ انہاک اور محویت دکھائے گا۔ اس کا شوق اسے اور پڑھنے پر مجبور کرے گا۔

جیسے استاد صاحبان کا مسئلہ طلبا میں دلچسپی پیدا کرنا ہے ویسے ہی مقرر کا مسئلہ سامعین میں دلچسپی پیدا کرنا ہے۔ بعض مقررین چیخنے سے توجہ کھینچنا چاہتے ہیں۔ وہ زور زور سے میز پر مکہ مارتے ہیں۔ اس سے سامعین کی توجہ تو کھینچ جاتی ہے لیکن قائم نہیں رہ سکتی۔ قائم رکھنے کے لیے دلچسپیاں بیدار کرنی ہوں گی۔ اس مطلب کے لیے نعروں سے کام لیا جا سکتا ہے یا حقیقی مسائل کی طرف توجہ دلائی جا سکتی ہے۔ مثلاً مذہب یا تہذیب و تمدن کے نام پر لوگوں کو بھڑکایا جا سکتا ہے۔ جو تقریر عوام کو مشتعل کر دے ممکن ہے وہ تعلیم یافتہ طبقے میں بے اثر پائی جائے۔ لہٰذا مجمع دیکھ کر اندازہ ہو سکتا ہے کہ کونسی دلچسپیاں پیدا کرنی چاہییں۔ اور کس طرح توجہ کو کھینچا اور برقرار رکھا جا سکتا ہے۔

اختلال توجہ (Distractions) :

مد و جذر توجہ میں انتقال توجہ پر زور دیا گیا ہے۔ ایک ہی چیز کو دیکھتے ہوئے ہماری توجہ ایک پہلو سے دوسرے پہلو پر منتقل ہو جاتی ہے اور تبدیلی کا پتہ تک نہیں چلتا۔ لیکن انتقال توجہ ایک ہی مضمون تک محدود رہتی ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے۔ میچ دیکھتے وقت میچ کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔ کبھی بال اِدھر جاتا ہے کبھی اُدھر جاتا ہے، کبھی کھلاڑی یہاں ہیں کبھی وہاں ہیں۔ کبھی بال اس گول میں چلا گیا کبھی اس گول میں، جونہی کھیل بدلتی ہے توجہ بھی ساتھ بدلتی ہے۔ لیکن یہ تبدیلی توجہ میں حارج ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس کی مدد کرتی ہے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ توجہ میں خلل ڈالنے والے حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ آپ ریسور اٹھا کر کان سے لگاتے ہیں اور آواز سننا

چاہتے ہیں ، لیکن یکدم بچوں نے شور مچا دیا اور اپ اچھی طرح آواز نہیں سن سکتے ۔ ایسے اختلال توجہ کہیں گے ۔ ایک اور مثال لیجیے آپ کتاب کھول کر پڑھنا چاہتے ہیں اور یکدم کوئی ریڈیو لگا دیتا ہے ۔ ریڈیو سے آپ کی پسند کا گانا بجتا ہے اور توجہ کتاب سے ہٹ کر گانے پر لگ جاتی ہے ، یہ بھی اختلال توجہ ہے ۔

یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس قسم کے عناصر اختلال توجہ کا باعث بن سکتے ہیں ؟ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ جن پیشوں میں انتہا کی محویت اور توجہ چاہیے وہاں اگر ریڈیو بجنا شروع ہو جائے تو کام میں حرج ہوتا ہے لیکن کئی لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ریڈیو سے توجہ خراب نہیں ہوتی بلکہ کارکردگی میں اضافہ ہوتا ہے ۔ تخلیقی کام کرنے والے اصحاب شہروں کے شور و غل سے بھاگ کر پہاڑوں کی وادیوں میں چلے جاتے ہیں تاکہ خاموشی میں اپنا کام سر انجام دے سکیں ۔ لیکن اس کے برخلاف ایسے حضرات بھی ہیں جو کافی ہاؤسوں یا چوراہوں میں کہانیاں اور اداریے تک لکھ مارتے ہیں اور شور و غل انہیں کچھ نہیں کہتا ۔

پس اختلال توجہ کی نفسیات کئی ایک دقتیں پیش کرتی ہے ۔ دقت کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے کہ آیا فلاں آوازیں ، نظارے یا تأثرات توجہ میں خلل انداز ہوں گے یا نہیں ، ہمیں یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ یہ سوال کس شخص کے لیے اٹھایا گیا ہے ، کس وقت اٹھایا گیا ہے اور کہاں اٹھایا گیا ہے ۔ لہٰذا اختلال توجہ کے بارے میں تعمیات بنانا خطرے سے خالی نہیں ۔

اختلال کے اسباب یا تو خارجی ہو سکتے ہیں یا اندرونی ۔ خارجی اسباب سے مراد وہ عناصر ہیں جو ماحول سے اٹھیں اور توجہ کو ہٹا دیں ۔ مثلاً ٹیلیفون سنتے ہوئے بچوں کا شور و غل ۔ اندرونی اسباب سے وہ عناصر مراد ہیں جو فرد کی ذات سے اٹھیں اور توجہ کو خراب کر

ہیں ۔ مثلاً بوریت یا اکتاہٹ ، غم و غصہ، ڈر اور خوف وغیرہ مثلاً اگر طالب علم کی طبعیت اچاٹ ہو تو کتابوں پر طبعیت نہیں جمے گی ۔ تجربوں سے ثابت ہے کہ خارجی اسباب توجہ کو اتنا خراب نہیں کرتے جتنا اندورنی اسباب ۔ لیکن یہاں بھی احتیاط لازمی ہے کیونکہ ایماذ (Suggestion) سے بڑا فرق پڑتا ہے ۔ مندرجہ ذیل تجربات ملاحظہ ہوں ۔

کچھ طلبا لیے گئے جنھیں بتایا گیا کہ انھیں اختلال توجہ پر تجربے کے لیے استعمال کیا جائے گا ۔ لہٰذا ان طلبا نے اس تجربے کے لیے تیاری کی ۔ جیسے کسی امتحان کی تیاری کی جاتی ہے ۔ تجربے کی نوعیت یہ تھی کہ ایک عدد بولا جاتا تھا ۔ اس میں طلبا نے ۶ ، پھر ۷ ، پھر ۸ ، پھر ۹ ، پھر ۶ ، پھر ۷ ، اسی طرح سے باقی اعداد جمع کرتے تھے ۔ اعداد کا یہ سلسلہ تین دفعہ دھرایا جاتا تھا ۔ ہر تیس سیکنڈ کے بعد کوئی رکاوٹ آتی تھی ، تا کہ توجہ میں خلل پیدا ہو ۔ یہاں پر خلل ڈالنے کے لیے گانا گایا جاتا تھا ۔ ان طلبا کے گروپ بنائے گئے ۔

(۱) منضبط گروپ : جنھیں اختلال توجہ پر پہلے تجربوں کے نتائج بتائے گئے ۔ لیکن یہ نہیں کہا گیا کہ اس کا اثر اس تجربے پر کیا ہوگا ۔

(۲) دوسرے گروپ کو بتایا گیا کہ اختلال توجہ سے کارکردگی میں اضافہ ہوتا ہے اور اس امر کی تائید میں جعلی گراف پیش کیے گئے ۔

(۳) تیسرے گروپ کو کہا گیا کہ اختلال توجہ سے کارکردگی میں فرق آتا ہے اور انھیں بھی جعلی گراف دکھائے گئے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اختلال سے رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں اور کام میں حرج ہوتا ہے ۔

(۴) چوتھے گروپ کو کہا گیا کہ شروع شروع میں تو اختلال سے کارکردگی میں فرق آتا ہے ، لیکن بعد میں اضافہ ہوتا ہے ۔

ان چار گروہوں کا شمار (Score) ایسا کیا ہر ایک کا شمار ایماء (Suggestion) کے مطابق تھا۔ جن طلبا کو کہا گیا تھا کہ اختلال سے کارکردگی بڑھے گی ان کی کارکردگی فی الواقعہ بڑھ گئی۔ جنھیں کہا گیا تھا کہ اختلال سے کارکردگی گھٹے گی۔ ان کی کارکردگی گھٹ گئی اور جنھیں کہا گیا تھا کہ اختلال سے شروع میں کارکردگی گھٹے گی بعد میں بڑھے گی ان کی کارکردگی شروع میں گھٹ گئی اور بعد میں بڑھ گئی۔

یہ تجربہ ظاہر کرتا ہے کہ اختلال توجہ کے بارے میں تعمیمات وضع کرتے ہوئے بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیے کیونکہ نہ صرف ذاتی عناصر بلکہ ایماء بھی اختلال کا موجب بن سکتا ہے۔

۱۔ ملاحظہ ہو ڈیشئل Dashiel کی کتاب Fundamentals of General Psychology، صفحہ ۳۵۹۔

سترھواں باب

آموزش (Learning)

آزموش کی تعریف اور اہمیت :

مسئلہ ارتقا (Evolution) کا مطالعہ کرتے وقت ڈارون نے بتایا کہ تنازع للبقا (Struggle for Existence) میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ہر جان دارشے کئی حربے استعمال کرتی ہے ۔ ایک آسان سا حربہ جو قدرت نے اسے عطا کیا ہوا ہے ، وہ افزائش نسل کا ہے ۔ ازمنہ گذشتہ میں بیماریاں اس قدر عام تھیں ، آب و ہوا اس قدر نامساعد تھی اور جنگلی جانور اس کثرت سے کمزور اور ناتواں جانوروں کو ہڑپ کرتے تھے کہ جب تک کوئی نوع کثرت سے بچے پیدا نہ کرے اس کا باقی رہنا ناممکنات میں سے تھا ۔ مثال کے طور پر بام مچھلی پندرہ ملین انڈے دیتی ہے ۔ اگرچہ سب کے سب انڈے بچتے نہیں تھے ، لیکن ان میں سے بعض انڈوں کا بچ رہنا اور ان سے بچوں کا نکل آنا ناممکن نہ تھا ۔

کامیابی کا ایک اور طریقہ ماحول سے تطبیق ہے ۔ جو جانور اپنے گرد و نواح سے جسمانی اور دماغی لحاظ سے توافق پیدا کر لےوہ دوسروں کی نسبت ، جنہیں یہ سہولتیں میسر نہ ہوں ، پھلے اور پھولے گا ۔ مثلاً قطب شمالی کی لومڑی سردیوں میں سفید ہو جاتی ہے اور گرمیوں میں مٹیالی ، لومڑی کی بقائے حیات کے لیے یہ رنگ بہت مفید ثابت ہوتے ہیں ۔ چڑیا کا ہلکا رنگ چڑیا کو باز کی نگاہوں سے اوجھل رکھتا ہے اور چڑیا کو اپنے شکار تک پہنچنے میں مدد دیتا ہے ۔ سائبیریا کا ریچھ سفید رنگ کا ہوتا ہے اور ریگستان کا مٹیالے رنگ کا ، یہ رنگ ریچھ کے لیے فائدہ مند رہتے ہیں اور تنازع للبقا میں مدد دیتے ہیں پس جو

جانور ماحول سے توافق حاصل کر لیں وہ زندہ رہتے ہیں ، دوسرے ختم ہو جاتے ہیں ۔

ادنیٰ جانوروں سے جب اعلیٰ جانوروں کی طرف آتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بقا اس امر پر موقوف نہیں کہ ان کا رنگ ماحول سے سازگار ہے ۔ بلکہ اس امر پر موقوف ہے کہ ان میں مطابقت پزیری (Adaptability) کی صلاحیت موجود ہے ۔ یعنی جس قسم کے حالات ہوتے ہیں ، انھی کے مطابق جانور اپنے آپ کو ڈھال لیتے ہیں ۔ ایسے جانور ان جانوروں پر تسلط حاصل کر لیں گے جو حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال نہیں سکتے ۔ اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھال لینے والے جانوروں کو زیادہ بچے پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ۔ وہ مطابقت پزیری کی بدولت زندگی کی تگ و دو میں یقیناً کامیاب رہیں گے ۔ وہ اپنی پیدائش اور موت کی شرح کو کم کر سکتے ہیں ۔ زندگی کا معیار بڑھا سکتے ہیں اور ہر ممکن طریقے سے زندگی کو بہتر سے بہتر بنا سکتے ہیں ۔

توافق اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کوئی شخص :

(۱) مشکلات اور رکاوٹوں میں ہو ۔

(۲) انھیں رفع کرنے کے لیے وافر اور مختلف النواع سرگرمیاں دکھائے

(۳) حتیٰ کہ ان سرگرمیوں میں سے ایک یا تو مشکل کو دور کرے ۔ یا مقصد کی طرف لے جائے یا کم از کم حالات کو بہتر بنا دے ۔

(۴) اور جب یہی مشکل دوبارہ آئے تو پہلے والا حل سوجھ جائے ۔ یاد رہے کہ اگر بار بار یہی مشکل آئے تو رد عمل زیادہ صاف سیدھا اور کامیاب ہوگا ۔ وقت تھوڑا لگے گا اور محنت کم صرف ہوگی ۔ ایک عادت پیدا ہو جائے گی ۔ مہیج اور رد عمل کا رشتہ استوار ہو جائے گا ۔ جب ایسا ہو تو اسے آموزش کہا جاتا ہے ۔

فرض کیا کسی نے سائیکل چلانی سیکھنی ہے - شروع شروع میں اسے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے - وہ گدی پر نہیں بیٹھ سکتا اور پیڈل نہیں ہلا سکتا - بدن کا توازن قائم رکھنا اسے نہیں آتا - اس لیے چڑھتا ہے اور گرتا ہے - کئی طریقے استعمال کرتا ہے - ان میں سے ایک طریقہ کامیابی کا ضامن بنتا ہے ، اسے دھرایا جاتا ہے - سائیکل چلانی سیکھ لی جاتی ہے - وقت اور محنت کی بچت ہو جاتی ہے - کام آسان اور دلچسپ بن جاتا ہے - یہی آموزش ہے اسی کی بدولت فطری افعال کے علاوہ بیشمار اکستابی افعال حاصل کر لیے جاتے ہیں - فطری افعال زندہ رہنے کے لیے ضروری ہیں لیکن زندگی کے بڑھتے ہوئے تقاضے ان سے پورے نہیں ہو سکتے - انسان حیوانوں سے بہتر ہیں - اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انسانوں میں اکتسابی افعال کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے - ان افعال کی بدولت نہ صرف انسان ماحول سے توافق حاصل کرتے ہیں بلکہ ماحول پر قبضہ کر کے زندگی کے لیے نئی شاہراہیں بھی نکال لیتے ہیں -

آموزش کا مطالعہ کرنے کے لیے جانوروں پر تجربے کیے جاتے ہیں - یہ تجربے آسان اور سادہ طریقے سے آموزش کے اصولوں کو اجاگر کرتے ہیں - یہ اصول انسانوں کے لیے بھی صحیح ہیں - کچھ اصول ایسے ہیں جو انسانی آموزش کے لیے مخصوص ہیں - ان کا ذکر بھی اس باب میں آئے گا -

آموزش باسعی و خطا (Learning by Trail and Error) :

لائڈ مارگن (Lloyd Morgan) ، ایک انگریزی حیاتیاتی ماہر نے کہا تھا کہ نفسیات کو سائنس بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اسے قصے کہانیوں سے آزاد کر کے تجربہ گاہ میں لایا جائے - اس کا اپنا کتا بڑا ہونہار اور ذہین تھا - مثلاً دروازہ اپنی مرضی سے کھول لیتا تھا - گیند اچھلنے کا انتظار کر لیتا تھا - لیکن لائیڈ مارگن کہتا تھا کہ کتے کی عادتی افعال کی ابتدا ایسی حرکات سے ہوئی جن میں سعی و خطا کا عنصر

غالب تھا اور جہاں اتفاقیہ طور پر ایک حرکت کامیابی کی ضامن بنی۔ لہٰذا اس کی خواہش تھی کہ محض قصے کہانیوں پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ جانوروں پر تجربہ کرکے ان کے عادتی افعال کا تجزیہ کیا جائے۔

امریکی نفسی ماہروں نے لائڈ مارگن کے نقش پر چلنا شروع کیا اور دست ورزی عادات (Manipulative Habits) ، امتیاز کرنے والی عادات (Discriminative Habits) اور چلنے پھرنے کی عادات (Locomoter Habits) پر تجربے کیے۔

تھارنڈائک (Thorndike) نے ایک ڈبہ بنوایا جس سے پتہ چل جاتا تھا کہ کسی جانور نے تالا کھولنے، چٹخنی اتارنے یا دروازے کی گھنٹی بجانے کا ہنر کیسے سیکھا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ وہ بھوکی بلی یا کتے کو ڈبے میں بند کر دیتا تھا۔ یہ جانور اسی صورت میں باہر نکل سکتا تھا، جب کوئی سرگرمی دکھائے۔ یعنی لیور (Lever) دبا دے، رسی کھینچ لے یا پلیٹ فارم پر چڑھ جائے۔ ڈبے کے دوسری طرف خوراک پڑی ہوتی تھی تا کہ سرگرمی کے بعد جانور کو فوراً اجر مل جائے۔ سرگرمی سے پہلے جتنا عرصہ گزرتا تھا اس کا ریکارڈ رکھا جاتا اور ساتھ ہی آموزش کی منحنی تیار کی جاتی۔ منحنی کی نوعیت سے تھارنڈائک اس نتیجہ پر پہنچا کہ جانور گر پڑ کر سیکھتے ہیں۔

سعی و خطا کے طریقے میں مندرجہ ذیل عناصر ہیں :

۱۔ جب جانور کا کوئی محرک بیدار ہو تو وہ کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے یا کچھ چھوڑنا چاہتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ نادانستہ طور پر مقصد کا متلاشی ہوتا ہے۔ مثلاً اوپر والے تجربے میں بلی بھوکی ہے اور خوراک چاہتی ہے۔

۲۔ مقصد کے حصول کی خاطر (نادانستہ اور لاشعوری طور پر) وہ کئی قسم کی بے تکی حرکات کرتا ہے۔

۳۔ بار بار کوشش سے اتفاقاً ایسی حرکت ہو جاتی ہے جو مقصد

تک لے جاتی ہے - یہاں پر جانور کی حرکات انتخابی (Selective) ہوجاتی ہیں - کامیاب حرکات کو دھرایا جاتا ہے باقی کو چھوڑ دیا جاتا ہے -

۴- بالاخر ایک عادت بن جاتی ہے یعنی مہیج اور رد عمل کے درمیان ایک رشتہ قائم ہو جاتا ہے جو بار بار دھرانے سے پختہ ہو جاتا ہے -

۵- اس عادت کا تعلق خاص مہیج یا مہیجات کے نظام سے ہوتا ہے -

اگر یہاں پر یہ سوال اٹھایا جائے کہ کتے نے کیا سیکھا تو جواب یہ ہوگا کہ پہلے پہل اس نے مقامات سے واقفیت حاصل کی یعنی لیور (Lever) یا رسی یا ڈبے کا علم حاصل کیا - بعد میں ان کا استعمال سیکھا - کتا جان گیا کہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے کیا کرنا چاہیے - (یہ علم شعوری نہیں) اس علم کو مقاماتی آموزش (Place Learning) کہہ سکتے ہیں - جب اس نے یہ سیکھ لیا کہ لیور کو کیسے دبایا جاتا ہے - رسی کیسے کھینچی جاتی ہے تو اسے آلاتی آموزش (Tool Learning) حاصل ہوئی -

جانوروں کی آموزش کے سلسلے میں ہمیں لائڈ مارگن کا اصول ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے - وہ کہتا ہے کہ دو یا دو سے زیادہ توجیہات جانوروں کے کردار کے لیے ملیں تو ان میں سے آسان ترین توجیہہ قبول کرنی چاہیے -

مقاماتی آموزش (Place Learning) :

فرض کیا کہ چوہے کو پنجرے میں ڈالا جاتا ہے اور اسے صحیح راستے پر چلنے کی تربیت دی جاتی ہے - جب وہ بغیر غلطی کے ٹھیک راستہ اختیار کرکے خوراک تک پہنچ جاتا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چوہے نے کیا سیکھا ، ایک چیز جو ان تجربوں سے بالکل صاف نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ چوہے کا سیکھنا دو قسم کا ہوتا ہے - ایک تو

مثبت آموزش ہے ۔ مثلاً چوہے نے صحیح راستہ جو خوراک تک لے جاتا ہے سیکھ لیا ۔ دوسرے منفی آموزش ہے یعنی وہ کئی چیزوں کو نظر انداز کرنا سیکھ لیتا ہے ۔ پہلی قسم کو مثبت تطبیق (Positive Adaptation) اوردوسری قسم کو منفی تطبیق(Negative Adaptation) کہا جاتا ہے ۔

منفی تطبیق : شروع شروع میں چوہا پنجرے سے گھبراتا اور ڈرتا ہے ۔ یا تو وہ دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر بھاگتا ہے یا ایک کونے میں دبک کر بیٹھ جاتا ہے ۔ تھوڑے عرصہ کے بعد کچھ سنبھل جاتا ہے اور پنجرے کا جائزہ لینا شروع کرتا ہے ۔ اگر دوسرے دن چوہے کو اسی پنجرے میں رکھیں تو اس کے ڈر اور گھبراہٹ میں کمی ہوگی وہ زیادہ اطمینان سے پنجرے میں دوڑتا بھاگتا ہے ۔ تیسرے دن اس کی گھبراہٹ اور بھی کم ہو جائے گی اور اسی طرح ہر روز گھٹتی جائے گی ۔ اس آموزش کو منفی اس لیے کہا جاتا ہے کہ چوہا بعض حرکات کو بالکل ترک کر دیتا ہے (یعنی پریشانی اور خوف والی حرکات کو) اور صرف سود مند حرکات کو اپناتا ہے ۔

منفی تطبیق بڑے کام کی شے ہے ، مثلاً گھوڑا زین سے عادی ہو جاتا ہے اور گھر میں کتا بلی سے مانوس ہو جاتا ہے ۔ پہلے پہل تو گھوڑا ساز سے گھبراتا ہے ، ٹانگیں اُٹھاتا ہے اور زمین پر مارتا ہے ۔ تانگے کے آگے پریشان ہوتا ہے ۔ لیکن تربیت اور مشق سے اس کی گھبراہٹ ختم ہو جاتی ہے اور وہ بڑے آرام سے ساز بھی پہن لیتا ہے اور تانگہ بھی کھینچتا ہے ۔ ایسے ہی شروع شروع میں کتے سے بلی گھبراتی ہے ۔ کتا بلی کو دبوچنا چاہتا ہے بلی غر غر کرتی ہے ۔ لیکن کچھ عرصے بعد دونوں ایک جگہ رہنا سیکھ جاتے ہیں ۔ سرکس والے شیر اور بکری کو ایک ساتھ پانی پینا سکھا دیتے ہیں پس منفی آموزش سے وہ تمام حرکات چھوڑ دی جاتی ہیں جو بے قاعدہ ،

فضول یا ضرر رساں ہوں اور صرف انھیں حرکات کو دھرایا جاتا ہے جو حصول مقصد میں مد اور معاون ثابت ہوں ۔

اس اصول کے تحت چوہا بھی فضول حرکات کو بتدریج چھوڑ دیتا ہے ۔ روز بروز اس کی غلطیوں کا شمار کم ہو جاتا ہے اور ایک دن آتا ہے کہ بغیر وقت ضائع کیے وہ بھاگ کر ٹھیک راستے پر بڑھ کر منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے ۔ لیکن ابھی تک ہمارا سوال کہ چوہے نے فی‌الحقیقت کیا سیکھا ؟ حل نہیں ہوا اس سوال کے جواب میں تین نظریات پیش کیے جاتے ہیں ۔

۱۔ **اضطراری سلسلے کا نظریہ (Chain Reflex Theory)** : اس نظریے کے رو سے چوہے نے چند ایک اضطراری حرکات کا سلسلہ سیکھ لیا ۔ فضول اضطراری حرکات تو ختم ہوگئیں لیکن مفید اضطراری حرکات دھرائی گئیں ۔ للہذا منفی آموزش کے بعد مفید اور کارآمد حرکات کا سلسلہ رہ گیا جس کا اعادہ ہوتا رہتا ہے ۔ یہ نظریہ بڑا سادہ ہے ۔ واٹسن (Watson) اور اس کے پیروکاروں نے اسے ہر قسم کے افعال و کردار کی اساس جانا ۔ لیکن تجربوں نے اس نظریے کی تائید نہیں کی ۔ ملاحظہ ہو ذیل کا تجربہ جو نمبر ۲ کے تحت آتا ہے ۔

۲۔ **مقررہ راستے کا نظریہ (Fixed Path Theory)** : فرض کیا کہ سیکھے ہوئے پنجرے کو پانی سے بھر دیتے ہیں ۔ پانی کی مقدار کم و بیش ہو سکتی ہے ۔ پانی تھوڑا ہو تو چوہا ایسے ہی گزر جائے گا اگر زیادہ ہو تو اسے تیرنا پڑے گا ۔ جن چوہوں نے پنجرہ اچھی طرح سے سیکھ لیا ہو وہ تھوڑے پانی میں یونہی گزر جاتے ہیں اور اگر پانی زیادہ ہو تو تیر کر پار کر لیتے ہیں ۔ اب یہ دونوں حرکات مختلف ہیں ایک تو پایابی کی ہے اور دوسرے تیرنے کی ۔ نہ تو گہرے پانی میں پایابی ہو سکتی ہے اور نہ ہی تھوڑے پانی میں تیرنا ۔ للہذا چوہا حرکات کا سلسلہ نہیں سیکھتا بلکہ خوراک تک پہنچنے کا مقررہ راستہ سیکھتا ہے ۔

لیکن یہ نظریہ بھی خامیوں سے خالی نہیں۔ جیسا کہ تیسرے نظریے کے ذیل میں ظاہر ہوگا۔

۳۔ پنجرہ سیکھنے کا نظریہ: چوہے کو سدھانے کے بعد اس کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کیجیے۔ چوہا رکاوٹوں کے ارد گرد گھوم کر ان سے بچ نکلے گا اور خوراک تک پہنچ جائے گا۔ ووڈورتھ کہتا ہے[1] کہ چوہوں کے تین گروپ بنائے گئے۔ ایک گروپ کو ہر کامیابی پر خوراک دی گئی ان کی آموزش کا خط حسب معمول بڑھتا گیا۔ دوسرے گروپ کو پہلی دس آزمائشوں پر کچھ نہیں ملا۔ گیارہویں سے خوراک شروع ہو گئی۔ گیارہویں کے بعد چوہوں نے بہت جلد سیکھنا شروع کیا۔ تیسرے گروپ کو پہلی دس آزمائشوں میں خوراک ملتی گئی پھر بند کر دی گئی۔ لیکن اس کے باوجود یہ چوہے پنجرے میں بھاگتے رہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ چوہے نہ صرف اضطراری حرکات کا سلسلہ سیکھتے ہیں اور نہ ہی مقررہ راستہ کو بلکہ تمام پنجرے کو سیکھ لیتے ہیں۔

اب اگر چوہوں کی بجائے انسانوں کو بھول بھلیوں میں ڈالا جائے تو انسانوں کی برتری کئی لحاظ سے ثابت ہوتی ہے۔

۱۔ انسان زیادہ سوچ بچار اور احتیاط سے کام لیتا ہے۔ اگر ایک دفعہ بند راستے میں ہو آتا ہے تو اس غلطی کو دوبارہ نہیں دہراتا۔ غلطی دہرانے پر اسے شرم محسوس ہوتی ہے۔ چوہے شرم وغیرہ محسوس نہیں کر سکتے۔

۲۔ انسان زبان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ دائیں، بائیں، اوپر، نیچے جیسے الفاظ استعمال کرتا ہے یعنی دائیں چلنا ہے یا بائیں۔ اوپر جانا ہے یا نیچے۔ اور ان الفاظ کو یاد بھی رکھتا ہے۔ زبان سے غلطی کے امکانات گھٹ جاتے ہیں اور فعل جلد سے جلد تر ہو جاتا ہے۔

۱۔ ملاحظہ ہو اس کی Psychology، صفحہ ۲۹۸۔

۳۔ ایک دفعہ سیکھنے کے بعد انسان تخیلات کے زور پر بھول بھلیوں کا نقشہ تیار کر لیتا ہے ۔ چوہے میں یہ صلاحیت نہیں ۔ وہ پنجرے کو پہچان تو لیتا ہے لیکن یاد رکھ کر ذہنی نقشہ تیار نہیں کر سکتا ۔

۴۔ بھول بھلیاں سیکھنے کے بعد انسانوں سے پوچھا گیا کہ انھوں نے کیا سیکھا ۔ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ انھوں نے سنگ میل (Land Marks) یا موٹے موٹے نشانات سیکھے جو منزل مقصود تک لے جانے میں بڑے کارآمد ثابت ہوئے ۔ اور جب وہ ان نشانات پر دوبارہ پہنچتے ہیں تو ان کا کام نہایت آسان ہو جاتا ہے ۔ فرض کیا کوئی شخص جنگل میں راستہ بھول جاتا ہے ۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ ایسے مقام پر پہنچتا ہے ۔ جہاں اسے یاد آتا ہے کہ آتے وقت وہ وہاں سے گزرا تھا ۔ اس سنگ میل کو لے کر اب وہ اپنا راستہ اور سمت تعین کر لیتا ہے ۔ ایسے ہی بھول بھلیوں میں موٹے موٹے نشانات یاد رہ جاتے ہیں اور ان سے کام آسان ہو جاتا ہے ۔ چوہوں کو یہ سہولت میسر نہیں ۔

بعض پرندے مثلاً کبوتر بڑے بڑے فاصلے طے کر لیتے ہیں ۔ اس لیے بعض لوگوں نے خیال کیا ہے کہ شاید سمت کے لیے کوئی علیحدہ حس ہے لیکن یہ قیاس غلط ہے ۔ کبوتر اپنی تیز آنکھوں سے موٹی موٹی نشانیاں دیکھ لیتا ہے اور انھیں پر بھروسہ کرتا ہے ۔ ایسے ہی کار ڈرائیور بھی ایک دفعہ راستہ دیکھ لینے کے بعد بھولتے نہیں اور لمبے لمبے فاصلے طے کرتے جاتے ہیں ۔ یہ لوگ بھی سمت کی حس (Sense of direction) نہیں رکھتے بلکہ موٹی موٹی نشانیوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں ۔ انسانوں نے کئی ایک چیزیں اپنی سہولت کے لیے بنا لی ہیں ۔ مثلاً سڑکوں کے پھریرے ، روشنی کے مینار ، مرغ باد نما ، قطب نما اور ریڈیو کی شعاعیں ، ان سے اطراف کا پتہ چل جاتا ہے یہ موٹی موٹی نشانیاں ہیں چو - ہے ایسی ایجادات نہ کر سکے ، لہذا انسانوں سے ادنیٰ مقام پر رہے ۔

آلاتی آموزش (Tool Learning) :

مقاماتی آموزش میں جانور ڈبے یا پنجرے میں ادھر آدھر بھاگتے ہیں، تا کہ جگہ سے مکمل واقفیت ہو جائے۔ لیکن واقفیت اس وقت تک ادھوری رہے گی جب تک مثال کے طور پر لیور دبانا ، رسی کھینچنا یا چٹخنی کھولنا نہ آ جائے۔ یعنی تلاش (Exploration) کے ساتھ دست ورزی (Manipulation) کی بھی ضرورت ہے۔ انسانوں میں دست ورزی کا عام مظاہرہ ہوتا ہے ہاتھوں سے چیزوں کو سنبھالا جاتا ہے۔ ادھر آدھر رکھا جاتا ہے ، اٹھایا گرایا جاتا ہے ، توڑا یا جوڑا جاتا ہے۔ غرضیکہ سینکڑوں کام ہیں جو ہاتھوں سے ہوتے ہیں۔ جانور ہاتھ تو نہیں رکھتے لیکن پنجوں ، دانتوں ، چونچ اور تھوتھنی سے بے شمار کام کر لیتے ہیں۔ مثلاً اگر رسی کھینچنا ہو تو ہاتھ سے نہیں کھینچیں گے۔ پاؤں استعمال کریں گے یا دانت اور چونچ کا استعمال کریں گے۔ پس جانوروں کے متعلق جب دست ورزی کا لفظ مستعمل ہوتا ہے تو اس سے مراد صرف ہاتھ کا استعمال نہیں بلکہ جسم کے ہر عضو کا ہوتا ہے جس سے آلات کا استعمال سیکھا جاتا ہے۔ یہاں پر بھی پہلے کی طرح یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جانور کیا سیکھتے ہیں۔

تھارنڈائک (Throndike) نے بھوکی بلی پنجرے میں ڈال دی۔ مچھلی کا ٹکڑا اس پنجرے کے باہر لٹک رہا تھا۔ بلی نے سلاخوں پر پنجے مارے لیکن گوشت کا ٹکڑا ہاتھ نہ آیا۔ پھر تھوتھنی سلاخوں سے باہر نکالنی چاہی ، یہاں بھی کامیابی نہ ہوئی۔ بعد ازاں اس نے سلاخوں کو کاٹنا شروع کیا۔ ہر چھوٹی بڑی چیز پر پنجہ مارا۔ ہر چیز کو ہلایا ، لیکن کام نہ بنا۔ بالآخر کہیں بٹن دب جاتا ہے جس سے دروازہ کھلتا ہے اور بلی مچھلی کا ٹکڑا حاصل کر لیتی ہے۔ دوسری آزمائش میں پہلی سے کم وقت لگا۔ تیسری میں دوسری سے کم۔ حتیٰ کہ بلی یک لخت بٹن کو دبا لیتی تھی اور دو سیکنڈ میں باہر نکل آتی تھی۔

اس تجربے سے کئی باتیں واضح ہوتی ہیں :

۱۔ بوڑھی اور پر اطمینان بلیاں بھاگتی دوڑتی کم ہیں اور بدحواس بلیوں کی نسبت تھوڑی آزمائشوں میں بھید پا لیتی ہیں ۔ جس سے ثابت ہوا کہ آموزش میں حرکی فعلیت سے زیادہ حواس کا استعمال مفید ہے ۔

۲۔ بھید پا لینے کے بعد بلیوں کی سرگرمیوں کا اصل مرکز وہ جگہ بن گئی جہاں بٹن نصب تھا ۔ ایک تجربے میں رسی کھینچنی تھی ۔ جب بلیوں نے یہ راز معلوم کر لیا تو رسی ان کی دلچسپیوں کا مرکز بن گئی ۔ اگر رسی کو دوسرے مقام پر باندھ دیا جائے تو پہلے تو بلی پرانی جگہ پر جائے گی جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی آموزش مقاماتی تھی پھر وہ نئے مقام پر جہاں رسی اب لٹک رہی ہے چلی جائے گی اور فوراً ہی رسی کھینچنے لگے گی ۔ جس کا مطلب ہوا کہ مقاماتی آموزش کے علاوہ بلی نے آلات کی آموزش بھی حاصل کر لی ۔

اگر کرداریوں (Behaviorists) کی طرح کہہ دیا جائے کہ بلی نے چند اضطراری حرکات کا سلسلہ سیکھ لیا تو یہ صحیح نہ ہوگا کیونکہ بٹن کھولتے وقت کبھی پنجے استعمال ہوتے ہیں کبھی دانت ۔ جس کا مطلب ہوا کہ حرکات نہیں سیکھی جاتیں بلکہ اشیا کے مفید اور غیر مفید خصائص سیکھے جاتے ہیں ، مثلاً بلی نے سیکھ لیا کہ سلاخوں کو کاٹنا فضول ہے ، سلاخوں میں سے سر باہر نکالنا بھی بے سود ہے ۔ فائدہ مند چیز صرف بٹن دبانا یا رسی کھینچنا ہے ۔ اس کام کے لیے غیر معمولی حرکات نہیں چاہییں بلکہ وہی معمولی روزمرہ کی حرکات ، بٹن دبانے کے لیے پنجہ اٹھانا اور اسے خاص جگہ پر مارنا ، ہوتا ہے ۔ ان دونوں حرکات سے بلی پہلے ہی واقف ہوتی ہے ۔ صرف ان حرکات کو نئے ماحول اور نئے گسٹالٹ میں استعمال ہونا ہے ۔ گسٹالٹ کا مفہوم سمجھنے کے لیے ہم چند ایک کوہلر (Kholer) کے تجربات پیش کرتے ہیں ۔

آموزش بہ بصیرت (Learning by Insight) :

بندروں اور چمپانزی پر تجربے : پہلی عالمی جنگ میں کوہلر (Kholer) جانوروں کی رہائش گاہ میں نظربند ہو گیا ، وہاں اسے بندروں اور چمپانزی کے کردار کو ملاحظہ کرنے کے بے شمار مواقع نصیب ہوئے ۔ وہ لکھتا ہے نیوا (ایک بندر کا نام) کو ایک چھوٹی چھڑی دی گئی جس سے اس نے پنجرے کے اردگرد زمین کھرچ ڈالی ۔ پنجرے کے باہر ، لیکن اس کی دسترس سے پرے ، پھل رکھ دیے گئے ۔ کئی دفعہ بندر نے پھل تک پہنچنے کی کوشش کی جب اس کی کوششیں کامیاب نہ ہوئیں تو اس نے رونا بلبلانا شروع کیا ۔ لیکن سات منٹ کے بعد (کوہلر وقت نوٹ کر رہا تھا) اچانک اس کی نگاہ چھڑی پر پڑی ۔ اس نے رونا دھونا بند کر دیا ، چھڑی کو ہاتھ میں لے کر (گو بھدے طریقے سے) بندر نے پھل کو اپنی طرف کھینچ لیا ۔ دو دن بعد جب چھڑی نہ رکھی گئی تو اس نے چیتھڑوں ، تنکوں اور پانی پینے کے پیالے سے پھل اپنی طرف گھسیٹنا چاہا ۔ ایک اور تجربہ دیکھیے :

"سلطان کو (ایک اور بندر کا نام) پنجرے کے باہر رکھی ہوئی خوراک دکھائی گئی لیکن وہ ہاتھ لمبا کرکے اسے پکڑ نہیں سکتا تھا ۔ اس لیے سلاخوں کے پاس آیا ۔ بیچ میں سے جھانکنے لگا ۔ دفعتاً پیچھے مڑا درخت پر چڑھ کر ایک پتلی سی ٹہنی توڑی اور بھاگ کر سلاخوں کے پاس آن کر جھٹ خوراک اپنی طرف کھینچ لی ۔ ایک اور تجربے میں اسی بندر کو دو چھڑیاں دی گئیں ایک چھڑی دوسرے میں گڑ جاتی تھی ۔ شروع میں تو بندر بیٹھ گیا ۔ پھر اٹھا اور دونوں چھڑیوں کو ہاتھ میں لیا اور ان دونوں سے کھیلنے لگا پھر پتلی چھڑی کا سرا موٹی چھڑی میں گاڑ دیا ۔ اچھلا اور سلاخوں کی طرف گیا اور دونوں جڑی ہوئی چھڑیوں سے پھل اپنی طرف کھینچ لیا ۔"

کوہلر کا ایک اور تجربہ لیجیے ۔ حسب سابق پھل کو بندر کی

دسترس سے پرے رکھا گیا ۔ ایک تجربہ میں اسے چھت پر گاڑ دیا گیا اور پنجرے میں صندوق رکھ دیا گیا ۔ تجربے کے لیے چھ بندر لیے گئے ۔ کوہلر لکھتا ہے ''چھ کے چھ بندروں نے چھلانگیں لگا کر پھل تک پہنچنے کی بے سود کوشش کی ۔ سلطان نے یہ کوشش چھوڑ دی ۔ ادھر آدھر بے چینی سے چلنے لگا پھر دفعتاً صندوق کے سامنے کھڑا ہوگیا ۔ اسے پکڑا اور پھل کی طرف گھسیٹا ۔ اس کے اوپر چڑھ گیا اور پھر اس زور سے چھلانگ لگائی کہ پھل اس کی گرفت میں آ گیا اور اس نے جھٹ پٹ اسے منہ میں ڈال لیا ۔''

ایک اور تجربے میں کوہلر نے دو صندوق رکھے ۔ پھل بہت اونچا لٹکایا گیا ۔ دونوں صندوق ایک دوسرے کے قریب تھے اور پھل سے بھی زیادہ دور نہ تھے سلطان نے بڑے صندوق کو پھل کی طرف گھسیٹا پھر اس کے اوپر چڑھ گیا ۔ چھت کی طرف دیکھا لیکن اچھلا نہیں ۔ پھر نیچے اتر آیا ۔ دوسرے صندوق کو پکڑا ۔ کمرے میں بھاگا شور مچایا دیواروں کو دولتیاں لگائیں اور ہر قسم کی بے چینی ظاہر کی ۔ اس نے دوسرا صندوق اس غرض سے نہیں پکڑا کہ پہلے پر رکھ دے وہ تو صرف اپنا غصہ نکالنا چاہتا تھا ۔ لیکن اچانک ہی اس کا کردار بدل گیا شور بند ہوگیا چھوٹے صندوق کو گھسیٹ کر بڑے کے اوپر رکھ دیا اور اس کے اوپر سیدھا کھڑا ہوگیا ۔''

کوہلر کے تجربات ظاہر کرتے ہیں کہ بندر نے علت اور معلول کا تعلق جان لیا ۔ یعنی چھڑی اور کیلے کا یا صندوق اور کیلے کا رشتہ پا لیا یعنی دونوں کو ایک گسٹالٹ کے مختلف لیکن لازمی اجزا دیکھے ۔ جب ان تجربات کی تشریح کی جائے تو مندرجہ ذیل امور عیاں ہوں گے :

(۱) بندر ماحول سے بہ ہیئت مجموعی نپٹ رہا ہے نہ کہ اس کے کسی جزو سے ۔

(۲) مجموعی ماحول کے چند ایک علائق سے سرگرم کار ہے ۔
(۳) جو علائق اس کے کردار کو متعین کرتے ہیں وہ علت اور معلول سے متعلق ہیں ۔
(۴) ایک لحاظ سے بندر ماحول کی تشکیل کر رہا ہے وہ اس کا جائزہ لیتا ہے ۔ ادراک کرتا ہے اور تعمیر کرتا ہے ۔
(۵) اس کے کردار کا اچانک بدل جانا نمبر ۴ کی دلیل ہے ۔
(۶) بندر کی اس آموزش میں اجزا کی تنظیم نئے پیرائے میں ہوتی ہے ۔ اجزا تو گزشتہ تجربے سے آتے ہیں لیکن تنظیم یا گسٹالٹ بالکل نیا ہوتا ہے ۔

گسٹالٹ کے حامی گزشتہ تجربے کی اہمیت کو تسلیم نہیں کرتے لیکن مندرجہ ذیل تجربہ ثابت کرے گا کہ ماضی کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ۔ چھ چمپانزیوں کو پیدائش سے زیر مطالعہ رکھا گیا ۔ اس عرصہ میں انھیں چھڑی دیکھنے یا چھونے کا کوئی موقعہ نہ دیا گیا ۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ وہ چھڑی کا استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں ۔ یہ چھڑی جس کی شکل کھرپی جیسی تھی پنجرے سے باہر رکھی گئی پھل کو کھرپی سے کھینچا جا سکتا تھا ۔ اس کام کے لیے تیس منٹ تھے ۔

۱۔ ان تیس منٹوں میں چار چمپانزی تو بالکل فیل ہو گئے ۔ انھوں نے کھرپی پکڑنے کی تکلیف ہی گوارا نہ کی وہ تو شاید کھرپی کو بیکار تکلیف دہ آلہ خیال کرتے رہے ۔

۲۔ پھر ان بندروں کو کھلی ہوا میں چھوڑ دیا گیا ۔ کوئی بارہ کے قریب چھوٹی بڑی چھڑیاں وہاں رکھ دی گئیں ۔ تین دن تک بندر ان سے خوب کھیلے ۔ پہلے پہل جب انھوں نے کوئی چیز پکڑنی ہوتی تھی تو چھڑیاں لے لیتے تھے، کو پکڑتے ہاتھ ہی سے تھے ۔ لیکن تھوڑے عرصہ میں چھڑی کو چیزیں گھسیٹنے کے لیے استعمال کرنے لگ پڑے ۔

۳۔ تین دن کے بعد ان بندروں کو پنجرے میں واپس لایا گیا ۔

اب ان کا کردار بالکل مختلف تھا ۔ پہلے تجربے میں تو صرف دو نے چھڑی کو چھؤا تھا اب سب نے چھڑی کو پکڑ کر پھل کھینچ لیا ۔ جو چیز پہلے تجربہ میں بے کار اور فضول تھی اب گزشتہ تجربے کی بنا پر کارآمد اور سود مند بن گئی ۔

اس آموزش کو آموزش بہ بصیرت (Learning by Insight) کہتے ہیں ۔ جس وقت بندر دفعتاً صندوق یا صندوقوں پر چڑھ جاتا ہے یا اچانک چھڑی پکڑ کر پھل اپنی طرف کھینچ لیتا ہے تو اس مقام کو مقام بصیرت کہا جاتا ہے ۔ یوں جانوروں کے لیے بصیرت کا لفظ استعمال کرنا ٹھیک نہیں ۔ کیونکہ بصیرت سے مراد اشیا کی تہہ تک پہنچنا ہے ۔ بندر اشیا کی تہہ تک نہیں پہنچتا بلکہ فضول آزمائشوں کے بغیر ماحول کا جائزہ لے لیتا ہے اور پیش از وقت نتائج سمجھ لیتا ہے ۔ ووڈورتھ کا کہنا ہے کہ مشاہدہ (Observation) کا لفظ بھی یہاں پر غیر موزوں ہوگا ، کیونکہ بندر شعوری طور پر مشاہدہ نہیں کرتا ۔ وہ محض اپنے حواس استعمال کرتا ہے ان سے موجودہ سامان کے خصائص کا علم ہوتا ہے اور اس کی بدولت منزل مقصود تک پہنچا جاتا ہے ۔

بصیرت دو قسم کی ہوتی ہے ، ایک پیش بینی (Fore Sight) اور دوسری پس بینی (Hind Sight) ۔ اول الذکر سے مراد نتائج کا پیش از وقت سمجھ لینا ہے ۔ مثلاً بندر دونوں چھڑیوں کو ایک دوسرے میں گاڑ کر سمجھ لیتا ہے کہ ان کی مدد سے وہ پھل گھسیٹ لے گا ۔ چوہوں میں پیش بینی نہیں ہوتی وہ کئی راہیں چلتے ہیں اور چلنے سے پہلے انہیں کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ اس کا کیا انجام ہوگا ۔ پس بینی سے مراد ہے کام ختم ہونے پر اس کا انجام دیکھنا اور اس سے فائدہ اٹھانا ہے ۔ دست ورزی (Manipulation) اور تجسس (Exploration) میں پس بینی استعمال ہوتی ہے ۔

انسانوں کی آلاتی آموزش : انسانوں کو بھول بھلیوں میں رکھ کر

دو چیزوں کو دیکھا جاتا ہے ، ایک تو یہ کہ انھیں کتنے عرصے میں حل کر لیتے ہیں اور دوم یہ کہ حل کرنے کے لیے کون سا طریقہ استعمال کرتے ہیں ۔ تجربے کے خاتمے پر زیر تجربہ فرد اپنی مشکلات اور کوششیں بتاتا ہے ۔

شروع شروع میں انسان بھی سعی و خطا کا طریقہ استعمال کرتے ہیں ۔ کبھی ایک راہ اختیار کرتے ہیں کبھی دوسری ۔ حتیٰ کہ ان میں سے ایک راہ کامیابی کی طرف لے جاتی ہے ۔ بعض آدمی سوچ بچار سے شروع کرتے ہیں ۔ لیکن یہ طریقہ کامیاب نہیں ہوتا کیونکہ جب تک بھول بھلیوں کی مختلف راہوں پر چلا نہ جائے راستہ نہیں ملتا ۔ کئی لوگ دوسری آزمائش میں بھی اٹکل پچو سے چلتے ہیں ۔ لیکن عموماً انھیں ایک یا دو موٹے موٹے مقامات یاد رہ جاتے ہیں ۔ ان کی مدد سے وہ جلد منزل پر پہنچ جاتے ہیں ۔ چند ہی آزمائشوں میں فضول اور بے کار راہوں کو چھوڑ کر صحیح راستے کو اپنا لیا جاتا ہے ۔

انسان بھی بصیرت استعمال کرتے ہیں لیکن ان کی بصیرت پس بینی (Hind Sight) کی صورت اختیار کیے ہوئے ہوتی ہے ۔ انھیں یاد ہوتا ہے کہ پچھلی آزمائشوں کے کیا نتائج رہے ، ان میں سے کارآمد کون سے تھے اور بے کار کون سے ۔ اس علم کی بنا پر بے کار حرکت کو چھوڑ کر صرف کارآمد حرکات کو دھرایا جاتا ہے ۔ بھول بھلیوں کا حل ڈھونڈتے وقت مشاہدے کا استعمال بھی ہوتا ہے ۔ آلات آموزی میں بھی یہی کیفیت ہے ۔ بٹن یا چھڑیوں کو بغور دیکھ کر مناسب رد عمل پیش کیا جاتا ہے ۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مشاہدہ دست ورزی (Manipulation) کی جگہ لے سکتا ہے ۔ کیونکہ جب تک کسی آلے کو استعمال نہ کیا جائے اس کے خصائص کا پتہ نہیں چلتا ۔ لیکن مشاہدے کا فائدہ یہ ہے کہ انسان کئی غلط راہوں سے بچ جاتا ہے اور منزل تک جلد پہنچ جاتا ہے ۔

ان تمام حقائق کی روشنی میں حیوانوں اور انسانوں کی آموزش میں مندرجہ ذیل فرق پائے جائیں گے ۔

(۱) انسان کا مشاہدہ بہتر ہوتا ہے ۔ اشیا اور لوگوں کے متعلق اپنے مشاہدے سے وہ کئی ایسے خصائص سے آگاہ ہو جاتا ہے جن کا علم حیوان کو نہیں ہوتا اور نہ ہی ہو سکتا ہے ۔

(۲) اپنے مسائل کے حل میں انسان تنظیم ، غور و خوض اور جانچ پڑتال سے کام لیتا ہے ۔ حیوان ایسا نہیں کر سکتے، کم از کم اتنا عمدہ نہیں کر سکتے ۔

(۳) انسان اعداد اور الفاظ سے مدد لیتا ہے ۔ یہ قابلیت حیوانوں میں موجود نہیں ۔ انسان کو زبان کی وجہ سے حیوانوں پر بہت بھاری فوقیت حاصل ہے اور اسی لیے اس کی آموزش بہتر بھی ہے اور تیز بھی ۔

(۴) زبان اور تخیلات کی وجہ سے ہر انسان اشیا کی غیر حاضری میں بھی ان کے متعلق غور و خوض کر سکتا ہے ۔

یہ نقاط انسان کی حیوانوں پر برتری ثابت کرتے ہیں ۔ دونوں کو ایک ہی جیسے مسائل دیے جائیں ، تو انسان بعض خوبیوں کی بنا پر ، جن سے حیوان محروم ہیں ، انھیں احسن طریقے سے حل کرتا ہے ۔ اور کچھ ایسے ہنر بھی ہیں جو صرف انسانوں کے لیے مخصوص ہیں ۔ مثلاً ٹائپ کرنا ، وائلن بجانا ، منہ سے گانا وغیرہ جو جانور نہیں سیکھتے ۔ پس سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ہنر اور مہارتیں کیسے حاصل ہوتی ہیں ۔

ٹائپنگ کو لیجیے ۔ جب کسی انسان نے ٹائپ سیکھنی ہو تو پہلے اسے مشین کا علم ہونا چاہیے ۔ اس کی کلیدوں سے آگاہ ہونا چاہیے اور حروف کے مقامات سے شناسائی ہونی چاہیے ۔ یہ حصہ مقاماتی آموزش سے تعلق رکھے گا ۔ اس کے بعد وہ اپنی دس انگلیوں سے مختلف کلیدوں

کو دبانا سیکھتا ہے۔ تھوڑی مشق کے بعد اس کی انگلیاں صحیح حروف پر جا پڑتی ہیں لیکن مہارت حاصل کرنے کے لیے طالب علم کو حروف سے الفاظ تک آنا چاہیے۔ اگر ایک لفظ کے تین حروف ہیں تو وہ تینوں کی ایک اکائی (Unit) بنا لے گا اور اگر پہلے دو لفظ بائیں انگلیوں سے دباتے ہیں اور بیچ والے دائیں سے تو پہلے وہ بائیں انگلی استعمال کرے گا، دائیں انگلی تیار رہے گی اور دائیں انگلی استعمال کرتے وقت بائیں انگلی تیار رہے گی۔ اس تیاری (Preparation) سے وقت بچ جاتا ہے اور مہارت حاصل ہوتی ہے۔

انسان کے ہر اعلیٰ ہنر میں تیاری کا عنصر ہوتا ہے مثلاً تقریر کرتے وقت ہر لفظ فقرے کا جزو ہوتا ہے جونہی، وہ بول دیا جاتا ہے دوسرا لفظ منہ سے نکل آتا ہے۔ یعنی پہلا لفظ ادا کرتے وقت دوسرے کی تیاری ہو رہی ہوتی ہے۔ گانے میں بھی یہی حال ہے۔ گویوں کو سارا گانا یاد ہوتا ہے، اس کی سروں اور آواز سے شناسائی ہوتی ہے، لہٰذا گاتے ہوئے بعد والے مصرعوں، شعروں یا آوازوں کی تیاری ذہن میں ہو جاتی ہے۔ ٹینس کھیلنے والے کو دیکھیے، بال قبول کرنے میں یا ٹھوکر لگانے میں کیسے مستعد کھڑا ہوتا ہے۔ ٹھوکر لگا کر اور لگاتے ہوئے اس کی ایک حرکت دوسری کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

آموزش کا گراف :

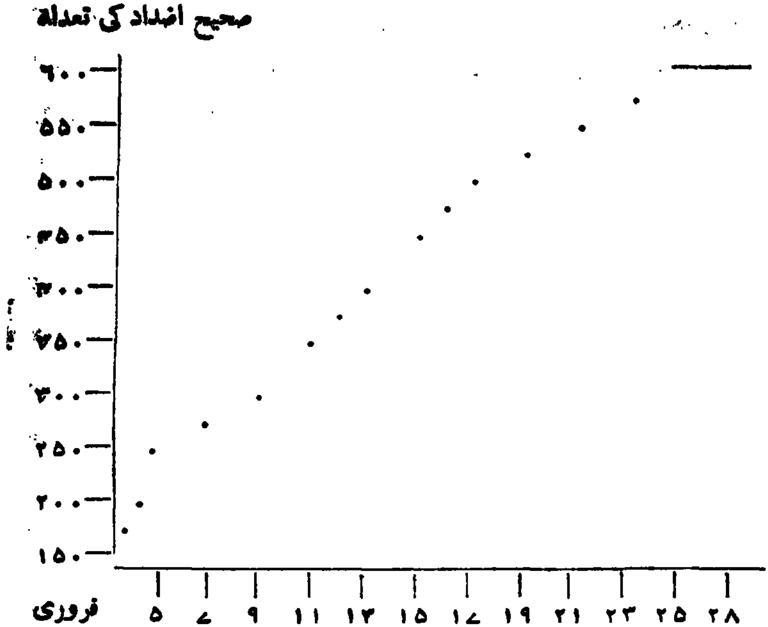
تربیت اور مشق سے ہر آموزش میں ترقی ہوتی ہے۔ ٹائپسٹ کی رفتار دن بدن بڑھتی ہے اور اس کی غلطیوں کا شمار گھٹتا جاتا ہے۔ لیکن ترقی کی رفتار ایک مقام پر آ کر رک جاتی ہے۔ کوئی لاکھ کوشش کرے مزید ترقی نہیں ہوتی۔ اس مقام کو فعلیاتی حد (Physiological Limit) کہتے ہیں۔ ایک پہلوان رات دن کسرت کرے۔ اچھے سے اچھا کھانا کھائے لیکن طاقت میں رستم کی برابری

نہیں کر سکے گا۔ اسی طرح طالب علم رات دن فلسفہ پڑھے اور فلسفہ سوچے لیکن ان تھک کوشش اور سوچ بچار کے باوجود وہ ارسطو نہیں بن جائے گا۔ ہر شخص کی صلاحیتوں اور استعداد کی فعلیاتی حد ہے۔ جب یہ حد آ جائے تو کوشش بےکار ہو جائے گی۔ لیکن یاد رہے کہ بعض لوگ یونہی سمجھ بیٹھتے ہیں کہ حد آ گئی اور کوشش چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

آموزش کا گراف بتاتا ہے کہ شروع شروع میں ترقی کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے پھر گھٹتی جاتی ہے۔ اس میں بعض ایسے مقام بھی آتے ہیں جہاں ترقی رکی ہوئی نظر آتی ہے انھیں حدب (Plateau) کہا جاتا ہے۔ لیکن اگر سیکھنے والا اپنا کام جاری رکھے اور گھبرائے نہیں تو یہ مقام گزر جاتا ہے اور ترقی دوبارہ شروع ہو جاتی ہے اس کے بعد پھر حدب آئے گا۔ اس سے بھی گھبرانا نہیں چاہیے۔ یہ بھی عبور ہو جائے گا۔ اس طرح کئی ترقی کے مقام آئیں گے کئی حدب کے۔ جس حدب کے بعد ترقی کے امکانات ختم ہو جائیں وہ فعلیاتی حد ہوگی۔

مندرجہ ذیل گراف لیجیے۔ اس کا مواد تھارنڈائک (Thorndike) سے لیا گیا ہے۔ کچھ الفاظ کے اضداد بتانے تھے اور دیکھنا یہ تھا کہ مشق سے ان کی تعداد کتنی بڑھے گی۔ ایک شخص کا شمار حسب ذیل ہے:

۱۶۵، ۲۳۸، ۲۶۰، ۳۳۵، ۳۳۴، ۳۴۱، ۳۷۳، ۳۹۰، ۳۹۶، ۴۱۲، ۴۱۵، ۴۴۸، ۴۳۶، ۴۴۸، ۴۷۶، ۴۹۸، ۴۷۷، ۶۰۲، ۵۰۷، ۵۲۶، ۵۴۵، ۵۲۲، ۵۴۶، ۵۵۷، ۵۵۴، ان اعداد کو پڑھنے سے ترقی کی رفتار کا صحیح صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ اس کا گراف بنائیں تو یہ چیزیں واضح ہو جائیں گی۔



جہاں گراف کا خط اوپر کو نہیں اٹھتا بلکہ چوڑا ہو جاتا ہے وہ حدب کا مقام ہے - ۵۵۴ کے بعد اگر لگاتار کوشش کے باوجود ترقی نہ ہو تو فعلیاتی حد کا مقام تصور کیا جائے گا - حدب کی دو وجوہات بتائی جاتی ہیں - یا تو شوق کم ہو جاتا ہے یا طریق کار نا کارہ ہو جاتا ہے - پہلے پہل کام سیکھنے کا شوق انتہا کو پہنچا ہوا ہوتا ہے اس لیے ترقی تیز ہو جاتی ہے- کچھ عرصہ کے بعد شوق ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور ترقی کی رفتار بھی سست ہو جاتی ہے - بعض دفعہ طریق کار کو بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے - اسے نہیں بدلا جاتا اور رفتار نہیں بڑھتی - عموماً دونوں اسباب مل جاتے ہیں اور ترقی کی بجائے تنزل کی طرف لے جاتے ہیں - کئی لڑکے میٹرک میں اچھی ڈویژن لے کر کالج میں

لکمے ثابت ہوتے ہیں ۔ یا تو ان کا شوق جاتا رہتا ہے یا وہ سکول کا طریقہ بدل کر کالج کا طریقہ اختیار نہیں کرتے۔ ترقی کے لیے شوق کو برقرار رہنا چاہیے اور طریق کار بہتر ہونا چاہیے ۔

مشروط آموزش (Conditioned Learning) :

اوپر اس امر کا ذکر آ چکا ہے کہ اعلیٰ آموزش میں ایک عنصر تیاری کا عنصر ہے ۔ مقرر کو تقریر کرتے ہوئے یہ خیال ہوتا ہے کہ اس لفظ کے بعد کون سا لفظ آئے گا یا اس فقرے کے بعد اب کون سا فقرہ بولنا چاہیے یا اس خیال کے بعد کس خیال کو زیر بحث لانے کی ضرورت ہے ۔ لہٰذا جب وہ ایک لفظ یا فقرہ ادا کر رہا ہوتا ہے تو دوسرے لفظ یا فقرے کی تیاری میں ہوتا ہے ۔ مقرر کے ذہن میں تواتر یا تسلسل ہے ۔ اس تواتر سے ہر لفظ اور ہر فقرہ ایک دوسرے سے وابستہ ہے ۔

تواتر کا مظاہرہ زندگی کے ہر شعبے میں موجود ہے ۔ جب تک حوادث کو کسی تواتر میں نہ باندھ دیں نہ تو انہیں قابو میں لایا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان کے متعلق کوئی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے ۔ مثال کے طور پر مچھروں اور ملیریا میں تواتر ہے ۔ لہٰذا ملیریا کو ختم کرنے کے لیے مچھروں کا خاتمہ لازمی ہے ۔ اسی طرح بادلوں اور بارش یا چمک اور گرج میں تواتر ہے ۔ زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے از بس ضروری ہے کہ تواتر کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے ۔ تواتر سے جو حوادث وابستہ ہوں گے ان میں سے مقدم مؤخر کے لیے علامت کا کام دے گا ۔ مثلاً بادل علامت بن جائیں گے بارش کی ۔ بچے کا رونا ماں کے لیے بچے کی بھوک ، پیاس یا پیٹ کے درد کی علامت بن جائے گا ۔

یہ مت خیال کیجیے کہ تواتر کا سلسلہ صرف مظاہر فطرت میں ہی ہے ۔ انسانی ذہن میں ہر چھوٹی بڑی چیز ایک دوسرے سے

مربوط ہے ۔ ہماری چھوٹی چھوٹی حرکات ایک تواتر کے تحت ظہور پذیر ہوتی ہیں ۔ چلنے میں ٹانگوں کی حرکات دیکھیں یا بولنے میں زبان کی حرکات ملاحظہ کریں ، ایک تواتر میں آئیں گی ۔ ایک حرکت کے بعد دوسری حرکت ، دوسری کے بعد تیسری و علیٰ ہذا القیاس - بعض دفعہ ایک حرکت دوسری حرکت کے لیے مہیج کا کام دیتی ہے ۔ اس مہیج کے بعد کوئی اور حرکت آتی ہے ۔ یہ حرکت بھی کسی اور حرکت کے لیے مہیج بن جاتی ہے ۔ اس طرح حرکات کا ایک سلسلہ بن جاتا ہے اگر پرانا فارمولا استعمال کریں تو اس فارمولے کی شکل ہوگی ۔

$$S_1 - R_1 - S_2 - R_2$$

S_1 سے مراد پہلا مہیج اور S_2 سے مراد دوسرا مہیج ہے ۔ اسی طرح R_1 سے مراد پہلا رد عمل اور R_2 سے مراد دوسرا رد عمل ہے ۔ مثلاً دوڑ لگانے والے لکیر پر کھڑے خاص انداز میں بگل کا انتظار کرتے ہیں ۔ بگل سے پہلے ریڈی (Ready) کا لفظ بولا جاتا ہے ۔ یہ لفظ مہیج کا کام دیتا ہے اور سننے والے آگے کو جھک کر بگل پر کان لگا دیتے ہیں ۔ پھر بگل بجتا ہے تو دوڑ شروع کر دیتے ہیں ۔ دوڑ میں بھی کئی چیزیں مہیج کے طور پر آتی ہیں ۔ ان سے جو حرکات معرض ظہور میں آتی ہیں وہ بعد والی حرکات کے لیے مہیج بن جاتی ہیں ۔ انسانوں کے مشاغل مہیجات اور حرکات کے سلسلے ہوتے ہیں ۔ یاد رہے کہ سبھی حرکات ارادی نہیں ہوتیں ۔ بات کرتے وقت زبان اور تالو کی حرکات غیر ارادی ہیں اور لاشعوری طور پر مہیجات کا کام کرتی ہیں ۔ بازو اٹھاتے وقت کئی غیر ارادی حرکات ادا کرنی پڑتی ہیں ۔

مشروط رد عمل (Conditioned Response) حقیقتاً غیر ارادی رد عمل ہے ۔ اصل مہیج کے ساتھ یا اس کے فوراً پہلے کوئی اور مہیج آتا ہے جو رد عمل کے لیے مہیج کا کام دیتا ہے ۔ ووڈورتھ کے خیال میں مشروطیت ایک قسم کی آموزش ہے جس میں پرانے تواتر کی بجائے

لیا تواتر سیکھا جاتا ہے ۔ لیکن فارمولا وہی ہے یعنی $S_1 - R_1 - S_2 - R_2$
اس سلسلے میں پیولو (Pavlov) کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے ۔

پیولو کے تجربے: پیولو ایک روسی تھا جس نے ماسکو میں کتوں پر تجربے کرکے مشروط رد عمل کے اصولوں کو اجاگر کیا ۔ پیولو نے کتے کے منہ میں ایک طرف چیرا دے دیا اور ربڑ کی نالی وہاں سے گزار کر لعاب نکالنے کا بندوبست کر لیا ۔ اس نال سے جو لعاب باہر آتا رہتا تھا اسے ناپ لیا جاتا تھا ۔ یوں تو ہر کھانے پر کتے کے منہ سے لعاب نکلتا ہے لیکن تجربے کے طور پر کتا تیس سیکنڈ میں جتنا لعاب نکال سکا اسے جمع کرکے تجربے سے پہلے ناپ لیا گیا ۔ تجربے کی نوعیت یہ تھی کہ کتے کو کھانا دینے سے پہلے گھنٹی بجائی گئی یا بجلی کی چمک پیدا کی گئی یا کوئی اور مہیج پیش کیا گیا جو عام طور پر منہ میں لعاب پیدا نہیں کرتا ۔ اس مصنوعی مہیج یعنی گھنٹی بجنے یا بجلی کی چمک کے فوراً بعد کتے کو اصلی مہیج یعنی کھانا دیا گیا ۔ خوراک کی وجہ سے کتے کے منہ میں لعاب پیدا ہوا ۔ لیکن مصنوعی مہیج (C S) کو اصلی مہیج (U S) کے ساتھ بار بار پیش کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصنوعی مہیج ، اصلی مہیج کی عدم موجودگی میں بھی لعاب پیدا کرنے کے قابل ہو گیا ۔ یوں تو لعاب صرف کھانا دیکھنے یا کھانا کھانے پر پیدا ہونا چاہیے لیکن گھنٹی کی آواز یا بجلی کی چمک ، تکرار کی وجہ سے لعاب سے وہی رشتہ قائم کر لیتی ہے جو اسے پہلے خوراک سے تھا ۔ لہٰذا نیا تواتر قائم ہونے کے بعد جو کام خوراک کر سکتی تھی ، یعنی لعاب کا پیدا ہونا ، وہی گھنٹی یا بجلی کی چمک نے کیا ۔ پس مشروط رد عمل کا اصول یوں بیان کر سکتے ہیں کہ اگر اصلی مہیج کے ساتھ کوئی اور مہیج چسپاں کر دیا جائے جو اصلی مہیج کے ساتھ یا فوراً پہلے آئے اور اس عمل کو بار بار دہرایا جائے تو دوسرا مہیج اصلی مہیج کی جگہ لے لیتا ہے اور وہی فرائض ادا

کرتا ہے جو اصلی مہیج کیا کرتا تھا ۔اس اصول کا مطلب یہ ہوا کہ پرانے رد عمل کے ساتھ نیا مہیج یا پرانے مہیج کے ساتھ نیا رد عمل وابستہ ہو جاتا ہے ۔

پیولو کے اس اصول کو آموزش کی بنیاد سمجھا جاتا ہے ۔ بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ ہر آموزش ایک قسم کی مشروطیت ہے ۔ ووڈورتھ اس دعوے کی صداقت کا قائل نہیں گو اس کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا ۔

اصل میں پیولو نے یہ اصول حیاتیاتی اغراض کے لیے وضع کیا ۔ وہ کہتا ہے کہ جانوروں میں بقا کا مسئلہ بڑا اہم ہے ۔ ہر بڑا جانور چھوٹے جانور کو ہڑپ کرنا چاہتا ہے ۔ شیر ہو یا بھیڑیا ، چیل ہو یا عقاب ، سانپ ہو یا ہزار پائے ، وہیل ہو یا بام مچھلی ، ہر زبردست جانور کمزور جانور کا دائرۂ زیست تنگ کر رہا ہے ۔ لیکن کمزور جانور بھی اپنے بچاؤ کے لیے کئی طریقے استعمال کرتا ہے ۔ اپنے دشمن کو دیکھ کر بھاگ جاتا ہے یا چھپ جاتا ہے ۔ پیولو کہتا ہے کہ اگر بکری اس وقت بھاگے جب اسے شیر کے دانت نظر آ جائیں تو وہ کبھی اپنی حفاظت نہیں کر سکے گی ۔ جب شیر دانت نکالے گا بکری اس کی گرفت میں ہوگی اور جان کھو بیٹھے گی ۔ لہٰذا بکری دور سے شیر کو آتا دیکھ کر فرار ہو جاتی ہے یا چھپ جاتی ہے ۔ یعنی جو کردار شیر کے دانت نکالنے پر ظاہر ہوتا تھا وہ دور سے شیر کا رنگ دیکھنے یا آواز سننے سے پیدا ہو جاتا ہے ۔ پیولو کا کہنا ہے کہ مشروط رد عمل سے کمزور جانور اپنے آپ کو طاقتور جانوروں سے محفوظ رکھ سکتا ہے ۔

کتے کے تجربے میں بھی یہی صورت حال پیدا ہوئی ۔ وہاں بچاؤ کا مسئلہ نہ تھا لیکن مشروطیت کی وجہ سے جو فریضہ فطری مہیج کے سپرد تھا وہ مصنوعی مہیج سے ادا ہوا ۔ لعاب کو کھانے پر نکلنا

چاہیے لیکن گھنٹی کی آواز پر بھی ٹپکنے لگا۔ بعض بورڈنگ ہاؤسوں میں کھانے کے وقت گھنٹی بجتی ہے۔ گھنٹی کی آواز سنتے ہی بورڈنگ ہاؤس میں رہنے والے طلبہ کے منہ میں پانی آ جاتا ہے۔ پلاؤ اور زردے کا نام سنتے ہی منہ میں پانی آ جاتا ہے۔ یہ مشروط افعال ہیں۔ مصنوعی مہیجوں نے اصل مہیجوں کی جگہ لے لی ہے اور وہی کام سر انجام دے رہے ہیں جو اصلی مہیج سر انجام دیتے تھے۔

بھکھترویو (Bekhterev) ایک اور روسی نے اضطراری تلازم (Association Reflex) پر کام کیا۔ اگر پاؤں کو بجلی کا شاک دیا جائے تو پاؤں کھینچ لیا جاتا ہے۔ بھکھتریو نے بجلی کا شاک دینے سے پہلے گھنٹی بجائی اور اس عمل کو کئی بار دھرایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گھنٹی کی آواز پر ہی پاؤں کھنچ گیا۔ امریکہ میں بھی اسی قسم کا تجربہ بکریوں، بھیڑوں، سور، کتے اور خرگوش پر ہوا۔ بجلی کے شاک سے پہلے ہی یہ جانور محض گھنٹی کی آواز پر اپنی ٹانگ جھکانے لگ پڑے۔ تجربے کی نوعیت بالکل بھکھتریو جیسی تھی۔ بجلی کے شاک اور گھنٹی کی آواز کو ساتھ ساتھ دس بار دھرایا گیا۔ تب جا کر، جو چیز بجلی کر سکتی تھی، وہ گھنٹی کی آواز کرنے لگی۔ جیسے بجلی کا شاک کسی صدمے کا پیش خیمہ تھا، ایسے ہی گھنٹی کی آواز صدمے کی علامت بن گئی۔ گو بھکھتریو نے اسے اضطراری تلازم کا نام دیا لیکن در اصل یہ مشروط رد عمل ہے اور پیولو کے اصول سے بالکل انحراف نہیں کرتا۔

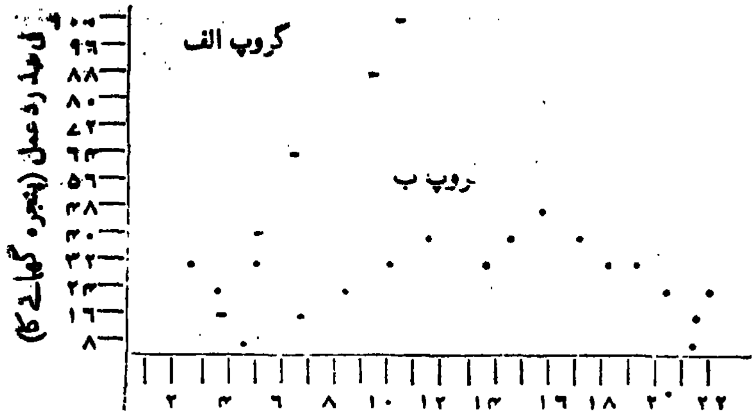
مشروط اور غیر مشروط رد عمل میں تھوڑا سا فرق ضرور ہے۔ مثلاً بکری، بلی یا کسی دوسرے جانور کی ٹانگوں کا مشروط رد عمل زیادہ صاف اور آسان ہوتا ہے۔ قدرتی رد عمل میں جو بجلی کے شاک پر رونما ہوتا ہے اس میں جھٹکا ہوتا ہے اور شدت بھی قدرے زیادہ ہوتی ہے۔ باڑ پر چڑھتے ہوئے چوہے کو بجلی کا شاک دیا گیا۔ وہ

بہت جلد پاگلوں کی طرح باڑ پر چڑھ گیا ۔ لیکن جب یہی حرکات مشروط رشتے میں منضبط ہو گئیں تو صاف اور آسان ہو گئیں ۔ اب ان میں کوئی جھٹکا یا تیزی نہ تھی ۔ توانائی کا بھی فضول خرچ نہ ہوا۔ یہی صورت انسانی مشروط افعال میں ہے ۔ مشروطیت سے تناسب اور توازن آ جاتا ہے اور افعال زیادہ آسان اور صحیح ہو جاتے ہیں ۔

معاونی مشروطی طریقے (Instrumental Conditioning Methods):

مشروط تجربوں میں اگر جانور کو سزا سے بچ نکلنے یا جزا حاصل کرنے کا موقعہ مل جائے تو مشروطیت کی اہمیت بڑھ جاتی ہے ۔ معاونی مشروط طریقوں میں اسی اصول پر کام کیا جاتا ہے ۔ کوہلر کی تجربہ گاہوں میں تجربے کے لیے ہر چیز پیولو جیسی تھی ۔ کتے کو ویسے ہی باندھا گیا ۔ فرق صرف یہ تھا کہ جب مصنوعی مہیج پر کتا پاؤں اٹھاتا تو پاؤں سلاخوں سے نکل جاتا اور کتا بجلی کے شاک سے بچ جاتا ۔ اس تجربے کی حیاتیاتی قیمت پیولو کے تجربے سے کہیں زیادہ ہے، اس لیے کتے کی آموزش کی رفتار بہت تیز تھی ۔

جھولنے والے پنجرے میں خنزیروں پر تجربے ہوئے ۔ ان کے دو گروپ بنائے گئے ۔ دونوں کو دو سیکنڈ تک آواز سنائی جاتی تھی اور بعد میں بجلی کا شاک دیا جاتا تھا ۔ الف گروپ کے خنزیر پنجرے کو گھما کر بجلی کے شاک سے بچ جاتے تھے لیکن ب گروپ کو یہ سہولت حاصل نہ تھی ۔ لہذا ب گروپ کے خنزیروں نے پنجرے کو گھمانا ترک کر دیا اور بجلی کا مقابلہ سانس بند کرکے اور پٹھے اکڑا کر کرنے لگے ۔ الف گروپ کی آموزش حیرت انگیز رفتار سے بڑھی ۔ ب گروپ کی آموزش مقابلتاً بہت کم تھی ۔ ملاحظہ ہو گراف :



ایک اور معاونی مشروط طریقے میں سکنر (Skinner) کا ڈبہ استعمال ہوتا ہے - چوہے کو خالی ڈبے میں بند کر دیا جاتا ہے اس کے ایک طرف ایک پیالہ پڑا ہے - ڈبے کے باہر ایک مشین لگی ہے جو تھوڑے سے شور کے ساتھ خوراک کا ٹکڑا پیالے میں پھینک دیتی ہے - پہلے چوہے کو ڈبے سے شناسائی حاصل کرنے کا موقعہ دیا جاتا ہے جب شناسائی ہو جاتی ہے تو بعد میں مشین کے ذریعے خوراک پیالے میں پھینکی جاتی ہے - چوہا ادھر ادھر تلاش میں پھرتا ہے - خوراک پا لیتا ہے اور کھا جاتا ہے - چند منٹ بعد اسی تجربے کو دھرایا جاتا ہے اب چوہا پھرتی سے خوراک کی طرف جاتا ہے اس تجربے کو چند بار دھرانے سے مشروط رد عمل پیدا ہو جاتا ہے چوہا $S_1-R_1-S_2-R_2$ سیکھ جاتا ہے S_1 تو ہلکا سا شور ہے R_1 پیالے کی طرف جانا ہے S_2 خوراک ہے اور R_2 خوراک کا کھانا ہے - R_1 ایک قسم کی تیاری کا رد عمل ہے اس کی بدولت خوراک حاصل کی جاتی ہے لہٰذا اسے معاونی مشروط رد عمل کہیں گے -

اس ڈبے میں غلط راستے نہیں ہوتے اس لیے آموزش کی رفتار بڑی تیز ہوتی ہے - لیکن اصول ایک ہی ہے خواہ تھارنڈائک کی بھول بھلیاں ہوں

' پیولو کا کتا یا سکنر کا ڈبہ ۔ یہ اصول $S_1 - R_1 - S_2 - R_2$ کا ہے ۔ مثلاً تھارنڈائک کی بھول بھلیوں میں، S_1 تو دروازے کا بٹن ہے R_1 اس کا دبانا ہے ۔ S_2 خوراک ہے اور R_2 خوراک کا کھانا ہے ۔ سکنر نے تھارنڈائک کے سعی وخطا اور پیولو کے مشروط طریقوں کے درمیان جو خلا تھا اسے پر کر دیا ۔ ان دونوں طریقوں کو الگ الگ طریقے خیال کیا جاتا تھا ۔ سکنر نے ثابت کر دیا کہ یہ الگ الگ نہیں ۔ ایک ہی اصول کو مختلف طریقوں سے تسلیم کرتے ہیں ۔

پیولو کے چند ایک اہم مشروط اصول :

۱۔ مشروط رد عمل تکرار اور تقویت (Reinforcement) سے قائم ہوتا ہے ۔ کتے پر تجربہ کرتے وقت دیکھا گیا کہ گھنٹی اور خوراک کو متعدد بار اکٹھا پیش کیا گیا ۔ تکرار کی وجہ سے جو لعاب خوراک پر نکلتا تھا گھنٹی کی آواز پر نکلنے لگا ۔ لعاب کے ساتھ کتے کا سر بھی خوراک کی جانب جھک جاتا تھا ۔ گھنٹی کی آواز پر یہ رد عمل بدستور قائم رہا ۔ لعاب کا نکلنا اور سر کا جھکنا تیاری کے عناصر ہیں اور یہ تیاری خوراک حاصل کرنے کے لیے ہو رہی ہے ۔

پیولو کے کتے کو تجربے کے خاتمہ پر خوراک ملتی ہے ۔ یہ تقویت کا عنصر ہے ۔ اس سے مہیج اور رد عمل کا رشتہ مضبوط ہو جاتا ہے ۔

۲۔ تقویت کے بغیر مشروط رد عمل کا خاتمہ : پیولو نے تجربوں سے معلوم کیا کہ اگر مصنوعی مہیج کے بعد تقویت کا عنصر نہ ہو یعنی گھنٹی بجائی جائے لیکن خوراک نہ رکھی جائے تو مشروط رد عمل ختم ہو جاتا ہے ۔ ایک تجربے میں لعاب اور گھنٹی کی آواز میں اچھی طرح کتے کا مشروط رد عمل قائم کر دیا گیا ۔ اس کے بعد ایک روز گھنٹی بجائی گئی لیکن خوراک نہ رکھی گئی ، دوبارہ یہی کیا گیا ۔ لعاب کی مقدار کم ہو گئی ۔ اسی طرح جب چند بار ایسا ہی کیا گیا تو لعاب کا نکلنا بالکل بند ہو گیا ۔ پیولو کے نتائج حسب ذیل تھے :

گھنٹی بجنے کے اوقات		لعاب کی مقدار قطروں میں
١٢•٠٧	بعد دوپہر	١٣
١٢•١٠	”	٧
١٢•١٣	”	٥
١٢•١٦	”	٦
١٢•١٩	”	٣
١٢•٢٢	”	٢•٥
١٢•٢٥	”	٠
١٢•٢٨	”	٠

یاد رہے کہ خوراک نہ ملنے پر مشروط رد عمل بالکل ختم نہیں ہو جاتا ۔ کیونکہ دو طریقوں سے اس کا احیا ممکن ہے ۔

(ا) ختم ہونے کے بعد ایک دو دفعہ خوراک پیش کرنے سے مشروط رد عمل دوبارہ پیدا ہو جاتا ہے ۔

(ب) خاتمے کے بعد خوراک نہ رکھیں لیکن کتے کو آرام کرنے دیں ۔ دوسرے روز دیکھیں گے کہ گھنٹی کی آواز سنتے ہی لعاب نکل آئے گا ۔ اب بھی اگر خوراک نہ دی جائے تو خاتمہ بہت جلد ہوگا ۔

ایک لحاظ سے مشروط رد عمل کی تلفی منفی تطبیق ہے ۔ دونوں میں فضول اور بے کار رد عمل سے احتراز کیا جاتا ہے ۔

٣۔ تقویت میں تاخیر ، رد عمل کی تاخیر تلفی کا باعث بن سکتی ہے ، گھنٹی بجنے کے فوراً بعد خوراک نہ دیں بلکہ تھوڑا سا توقف کریں تو لعاب بھی اتنی ہی دیر سے نکلے گا ۔ مثلاً آہستہ آہستہ اس توقف کو ایک منٹ تک بڑھا دیں تو پہلے آدھ منٹ تو کتے کے منہ سے کوئی لعاب نہ نکلے گا کتا بھی بے توجہی میں کھڑا ہوگا ۔ لیکن آدھ منٹ کے بعد یکدم ہوشیار ہو جائے گا اور لعاب اس کے منہ سے نکل پڑے گا ۔ کتے نے بدلے

ہوئے ماحول سے تطبیق حاصل کر لی ہے۔

اس فعلیت میں دو مدارج ہیں۔ پہلے انتظار سے بے توجہی پھر یک دم ہوشیار ہو پڑنا اور منہ سے خوراک کی تیاری میں لعاب کا نکل آنا۔

۴۔ انتخابی تقویت سے انتخابی مشروطیت : عموماً مشروطی فعل غیر انتخابی ہوتا ہے۔ مشروطی مہیج سے ملتا جلتا لیکن قدرے شدید مہیج لیں تو اس سے بھی مشروط رد عمل پیدا ہو جائے گا۔ مثلاً گھنٹی کی بجائے جھنجھنا بجائیں تو مشروط رد عمل پیدا ہو جائے گا۔ اگرچہ رد عمل قدرے ضعیف ہوگا۔ ایسے ہی کانٹے کی بجائے اونچی یا مدھم سریں نکالیں تو مشروط رد عمل ظاہر ہوگا۔

مشروط رد عمل کو انتخابی بنانے کے لیے دو مہیجات لیجیے۔ ایک مہیج کے بعد تو کتے کو خوراک دیں لیکن دوسرے کے بعد نہ دیں۔ ان دونوں کو کسی تواتر میں آنے کی ضرورت نہیں۔ کافی بار اس نتیجے کو دوہرایا جائے تو کتا ان دونوں مہیجات میں تمیز کرنا شروع کر دیتا ہے اور تمیز کرنے کی وجہ نہایت واضح ہے، کیونکہ ایک مہیج خوراک لاتا ہے دوسرا نہیں لاتا۔ تمیز اس طرح ہوتی ہے کہ خوراک والے مہیج پر کتا ہوشیار ہو جاتا ہے اور اس کے منہ سے لعاب بہتا ہے لیکن غیر خوراک مہیج پر کتا ٹس سے مس نہیں ہوتا اور اس کے منہ میں لعاب نہیں پیدا ہوتا۔

مشروطیت کے اہم اساسی اصول :

پیولو نے مشروطیت کی کامیابی چند ایک عناصر پر موقوف کی ہے۔

۱۔ مشروط کے لیے سب جانور ایک جیسے نہیں ہوتے۔ بعض کتے تجربے کے لیے دوسروں سے زیادہ موزوں رہتے ہیں۔ وہ لیبارٹری ماحول اور تربیت کے طریقوں کو نسبتاً جلد قبول کر لیتے ہیں۔ لہٰذا کچھ نفسی ماہروں نے جانوروں کا مقابلہ اس نقطہ نگاہ سے کیا اور بعض

جانوروں کو نفسی تجربوں کے لیے زیادہ موزوں پایا ۔ انسانوں میں بھ
اس قسم کا فرق موجود ہے ۔ بعض انسانوں کو زیادہ آسانی سے معمو
بنایا جا سکتا ہے دوسروں کو نہیں ۔

۲۔ مشروط تجربے اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتے جب تک کتا
اور کوئی جانور تجربہ کنندہ سے مانوس نہ ہو جائے اور لیبارٹری ماحو
سے مطابقت پیدا نہ کرلے ۔ تجربہ گاہ ہر قسم کے اختلال سے پاک ہو
چاہیے ۔ ذرا سا خلل مشروطیت یا اس کی تلفی کو نقصان پہنچا سکتا ۔
اور تجربے کو خراب کر سکتا ہے ۔ یہی وجہ تھی کہ پیولو ۔
مشروطی رد عمل کے تجربوں کے لیے خاص لیبارٹری بنوائی جہاں با
سے روشنی یا آواز داخل نہیں ہو سکتی تھی حتیٰ کہ تجربہ کنندہ بھ
کتے کو نظر نہیں آتا تھا ۔

۳۔ معمول کو نہایت ہوشیاری کی حالت میں رہنا چاہیے ۔ شرو
شروع میں جو تجربے مشروطیت پر کیے گئے ان کے نتائج خاطر خو
نہ تھے ۔ لہٰذا جن جانوروں یا انسانوں کو تجربے کے لیے چنا گیا ان
مطالعہ کیا گیا ۔ رازران (Razran) اور دوسرے نفسی ماہر اس مطال
کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ مشروطی تجربوں کی کامیابی کا دار و مد
معمول کے رویے پر ہے ۔

۴۔ ایک نہایت ضروری امر یہ ہے کہ تجربہ کنندہ اور معمول می
پورا تعاون ہونا چاہیے ۔ نہ تو معمول تجربہ کنندہ سے بڑھنے کی کوشش
کرے اور نہ ہی جن نتائج کی وہ توقع کر رہا ہے انھیں پیدا کرنے
لیے تیزی دکھائے ۔ بعض تجربہ کنندہ تو پہلے ہی معمول طلبہ ک
نالیوں ، سلاخوں اور دیگر سامان تجربہ کا مطلب سمجھا دیتے ہیں او
بعض تجربہ کنندہ معمول طلبہ کی توجہ تجربے سے دور لے جانے ک
کوشش کرتے ہیں ۔ مشروطی تجربوں کے دنوں میں معمول کو پڑھن
کی ہدایت کی جاتی ہے تاکہ ان کے اپنے خیالات تجربے کو خراب ن

کر دیں ۔

انسانوں پر مشروطی تجربے : کتوں کی طرح چھوٹے بچوں پر مشروطی تجربے کیے گئے ہیں - دودھ کی بوتل دینے سے ذرا پہلے گھنٹی بجائی جاتی ہے - کئی بار ایسا کرنے سے جو رد عمل دودھ کی بوتل دیکھنے پر پیدا ہوتا تھا وہی گھنٹی کی آواز پر ہوا - بچے بوتل دیکھ کر منہ کھول دیتے ہیں، چوسنے کی حرکات کرتے ہیں یا ہاتھ اور پاؤں اوپر اٹھا دیتے ہیں، یہ ساری چیزیں گھنٹی کی آواز پر نمودار ہوتی ہیں - ووڈورتھ کا کہنا ہے کہ انسانوں میں چار سال کی عمر تک مشروطیت آسانی سے پیدا ہو جاتی ہے اور وقت بھی تھوڑا لیتی ہے - لیکن اس کے بعد مشروطی تجربے اعتماد کے قابل نہیں رہتے - ویسے تو اچھی خوراک دیکھ کر یا نام سن کر ہر بالغ کے منہ میں پانی آ جاتا ہے لیکن جب اس امر پر تجربہ کیا جائے تو انسان خیال کرتا ہے کہ مجھے آلو بنایا جا رہا ہے - گھنٹی بجا کر میرا تماشہ دیکھا جا رہا ہے - لہٰذا وہ لعاب کو صحیح مقدار میں نہیں نکلنے دیتا - یہی وجہ ہے کہ بالغوں پر جو مشروطی تجربے کیے گئے ہیں وہ قابل اعتماد نہیں - لیکن پھر بھی چند ایک کیے گئے ہیں -

(ا) آنکھ جھپکنے کا اضطراری فعل - اگر ہوا کا جھونکا آئے تو آنکھیں جھپک جاتی ہیں - لیکن جھونکے سے پہلے روشنی کی چمک $\frac{2}{5}$ سیکنڈ کے لیے دکھائیں - صرف ایک گھنٹے میں آپ دیکھ لیں گے کہ روشنی کی چمک پر آنکھ بند ہو جاتی ہے -

(ب) شاک سے ہاتھ کھینچ لینا : بجلی کے شاک سے ہاتھ کا کھینچ لینا ایک قدرتی امر ہے لیکن شاک سے پہلے آدھ سیکنڈ کے لیے بجلی کی چمک پیدا کیجیے - اگر اس تجربے کو بار بار ایک گھنٹے تک کرتے رہیں تو بجلی کی چمک پر ہاتھ کھینچ لیا جائے گا -

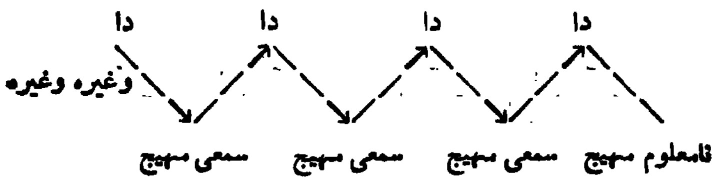
اسی قسم کے بعض اور تجربے کیے گئے ہیں جن سے مشروطیت کی صداقت حیوانوں اور انسانوں دونوں کے لیے ثابت ہو جاتی ہے -

انسانی زندگی میں مشروطیت کی اہمیت : بچہ زبان کیسے سیکھتا ہے ؟ فرض کیا بچہ دا کی آواز نکالتا ہے اور جو چیز اس کے سامنے آتی ہے اسے دا کہہ کر پکارتا ہے ، یعنی جو مہیج آئے اس کے لیے دا ہے - یہ مشروطیت کی وجہ سے ہے - مندرجہ ذیل شکلیں دیکھیں :

نامعلوم مہیجات ←——— دا

سمعی مہیج ←——— ؟

مشروطیت کے بعد



بچہ دا کہتا ہے اور دا سنتا ہے - بعد میں اگر بچہ کسی کو دا کہتے سنے گا تو خود بھی دا کہے گا - پھر وہ کسی کو ڈیڈی کہتے سن لیتا ہے تو آواز کی مشابہت سے خود بھی ڈیڈی کہنا شروع کر دیتا ہے -

الفاظ کے مطالب سمجھنا اور انہیں اشیا اور ماحول کے اظہار کے لیے استعمال کرنا بھی ایک قسم کی مشروطیت ہے - بچہ ڈیڈی کہتا ہے تو باپ آن موجود ہوتا ہے - چند ایک دفعہ ایسا ہوتا ہے یعنی ڈیڈی کا لفظ بولا گیا اور جھٹ ایک قسم کا آدمی آ گیا - اس فعل کو بھی مندرجہ ذیل شکل میں ظاہر کر سکتے ہیں -

مشروطیت سے پہلے

غیر معلوم مہیجات ←——— ڈیڈی

بصری مہیج ←——— ؟

مشروطیت کے بعد

ڈیڈی

↗

باپ بصری مہیج

جیسے بچے اپنی آوازوں سے لفظ کے مطالب سیکھتے ہیں ویسے دوسرے لوگوں کے بولنے سے بھی بہت کچھ سیکھ جاتے ہیں مثلاً کوئی شخص گڑیا کا لفظ بولتا ہے اور ساتھ ہی گڑیا بھی دکھاتا ہے۔ پس لفظ اور شے کا رابطہ قائم ہو جاتا ہے اور شے ہی اس لفظ کا مطلب بن جاتی ہے۔

اب رویوں کو لیجیے، بعض اشیا اشخاص اور خیالات کے لیے ہمارے رویے مثبت ہوتے ہیں، بعض کے لیے منفی۔ یہ کیوں؟ ہمارا ہاتھ گرم چمٹے کو لگ جاتا ہے، ہمارا رویہ گرم اشیا کے لیے منفی بن جاتا ہے۔ ہمارے والدین ہمارے لیے کھلونے اور مٹھائیاں لاتے ہیں ہمیں ہر طرح سے آرام پہنچاتے ہیں لہٰذا ان کے بارے میں ہمارا رویہ مثبت ہوتا ہے۔

بعض غیر طبعی قسم کے کردار (Abnormal Behaviour) کی تصحیح مشروطیت سے کی جاتی ہے۔ فرض کیا کوئی بڑا بچہ رات کو بستر پر پیشاب کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے مثانے کے مہیجات اس قدر کمزور ہیں کہ پیشاب نکلنے سے پہلے مثانہ کو احساس نہیں ہوتا۔ اگر اس احساس کو تیز کر دیا جائے تو بچہ پیشاب نکلنے سے پہلے جاگ اٹھے گا۔ ایسے بچے کو بہت باریک تاروں والی چٹائی پر سلایا

جاتا ہے ۔ پیشاب نکلنے پر تاروں کا دور ناقص (Short Circuit) پڑ جاتا ہے اور گھنٹی بجنے لگتی ہے ۔ بچے کو کہا جاتا ہے کہ گھنٹی بجنے پر پیشاب خانے جائے اور خواہ اسے پیشاب آیا ہو یا نہ ، پیشاب ضرور کرے ۔ چند راتوں کے بعد مثانے کا کھچاؤ بچے کو گھنٹی کی آواز سے پہلے جگا دیتا ہے ۔ اس طرح اس کا عارضہ جاتا رہتا ہے ۔

بعض لوگ بند جگہوں ، پنگوڑوں ، بلیوں ، بندروں سے خوف کھاتے ہیں ۔ ان کا خوف دور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ ان لوگوں کا خوف تب دور ہو سکتا ہے اگر یہ بار بار خوف پیدا کرنے والی چیز کے پاس جائیں ۔ ایک آدمی ساری عمر پنگوڑوں سے ڈرتا رہا اسے زبردستی پنگوڑے پر بٹھایا گیا ۔ جب وہ نیچے اترا تو اس کا خوف جاتا رہا ۔ ناخن کاٹنے (Nail Biting) کا علاج بھی اسی طرح کیا گیا ۔ مریض کو کہا گیا کہ وہ مقررہ وقت پر ناخن کاٹے ۔ اب چونکہ اسے وقت پر ہی ناخن کاٹنے ہوتے تھے اور کئی دفعہ بغیر ذہنی الجھن کے بھی ناخن کاٹنے ہوتے ہیں ۔ ناخن کاٹنے کا اور ذہنی الجھن کا رشتہ منقطع ہوگیا اور عارضہ جاتا رہا ۔

بچوں کی حسی کمزوریوں کا پتہ بھی مشروطیت سے چل جاتا ہے ۔ فرض کیا ایک بچہ شروع سے ہی کچھ نہیں سنتا ۔ لیکن اگر اس کے پاؤں پر سوئی چبھوئی جائے تو پاؤں کھینچ لیتا ہے ۔ اب سوئی چبھونے سے پہلے کچھ آواز پیدا کریں اور دونوں میں مشروطیت کا رشتہ قائم کر دیں ۔ اگر کچھ عرصہ کے بعد آواز پر ہی بچہ اپنی ٹانگ کھینچ لے تو سمجھیں کہ بچہ بالکل بہرہ نہیں ۔

اموزش کے چند اہم عناصر :

۱۔ مشاہدہ : مقاماتی اور آلاتی آموزش میں مشاہدے کی ازحد ضرورت ہے ۔ ماحول سے کامیابی سے نپٹنے کے لیے اشیا کے مفید اور غیر مفید خصائص سے شناسائی ضروری ہے اور یہ مشاہدے کے بغیر ناممکن ہے ۔

نتائج کا علم اور مشاہدہ بھی ضروری ہے - گولی نشانے پر ماریں اگر گولی اوپر چلی جائے تو شست نیچے باندھیں گے اور اگر نیچے چلی جائے تو شست اوپر باندھیں گے - نتائج کے مشاہدے سے مشق، دلچسپ اور بامعنی بنتی ہے - اگر کوششوں کا نتیجہ نہ دیکھ سکیں تو کوشش چھوڑ دی جائے گی - لہٰذا جتنی عمدگی سے ماحول یا مسئلے کو سمجھا جائے اتنی ہی عمدگی سے اس کا تجزیہ یا حل کیا جا سکتا ہے -

۲- مہیجات کا نظام: مشروطی رد عمل میں اصل مہیج اور دوسرے مہیج کے درمیان زمانی قرب (Temporal Contiguity) ہوتا ہے - یعنی اصلی مہیج کے فوراً بعد دوسرا مہیج نمودار ہوتا ہے - اس زمانی قرب سے مہیجات اور حرکات میں نظام پیدا ہو جاتا ہے - مشروط رد عمل کے قائم ہو جانے کے بعد چوہا بڑے آرام سے پنجرے میں ادھر اُدھر چلتا پھرتا ہے - اسے علم ہوتا ہے کہ فلاں علامت کے بعد اب کیا ہوگا - علامت دیکھنے کے لیے اور خوراک پانے کے لیے اسے کئی فعلیاتی حرکات کرنی ہوتی ہیں - یہ سب کی سب ایک سلسلہ اور نظام میں پروئی جاتی ہیں - اس نظام کے بغیر مشروط رد عمل بے کار ہو جائے گا -

۳- تکرار: مشروط رد عمل میں تجربے کو دھرانے کی ضرورت ہوتی ہے - دھرانے سے مشروطی رشتہ پختہ ہو جاتا ہے - مشروطیت ایک قسم کی عادت ہے اور عادت تب پختہ ہوتی ہے جب فعل کا اعادہ ہو -

۴- اعادہ کا وقفہ: اگر دھرائی میں وقفہ زیادہ گزر جائے تو آموزش کو نقصان پہنچے گا - وقفہ کم ہونے سے بھی نقصان پہنچتا ہے - لہٰذا وقفہ مناسب ہونا چاہیے -

۵- تقویت: اگر تقویت کا ذکر نہ کیا جائے تو آموزش کے عناصر ادھورے رہ جائیں گے - مشروط رد عمل میں دیکھا گیا ہے کہ اگر اس میں تقویت موجود نہ ہو تو آہستہ آہستہ تلف ہو جاتا ہے - اسے دوبارہ

زندہ کرنے کے لیے تکرار کے ساتھ تقویت کی ضرورت پڑتی ہے۔ بعض لوگ تقویت کی بجائے سزا اور جزا کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ جب کتے کو آزمائش کے بعد کھانا نہیں ملتا تو اس کا رد عمل ختم ہو جاتا ہے اور جب دوبارہ ملنے لگتا ہے تو رد عمل عود کر آتا ہے بلی کو جب بجلی کا شاک پہنچتا ہے تو وہ اس راستے سے، جس پر اسے بجلی کا شاک لگا ہو احتراز کرتی ہے۔ ووڈورتھ کا کہنا ہے کہ آموزش میں سزا اور جزا کے عناصر بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں لیکن وہ ان الفاظ کو پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ سزا اور جزا ان تمام پہلوؤں کو ظاہر نہیں کرتا جو تقویت سے مراد لیے جاتے ہیں۔

٦۔ محرک کی موجودگی : ہر قسم کی آموزش میں محرکیت کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ کوئی ہوگا جو علم کو بحیثیت علم حاصل کرتا ہو۔ علم کی ضرورت تب پڑتی ہے جب کوئی مسئلہ درپیش ہو۔ اسی طرح جب بھوک لگی ہو تو کھانا کھاتے ہیں، جب جان کا خطرہ لاحق ہو تو بھاگنے یا حالات پر قابو پانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ناموری چاہیے تو الیکشن لڑنا ہوگا یا کسی کھیل میں چوٹی کی پوزیشن حاصل کرنی ہوگی۔ یہ محرکات ہیں۔ ان کی تشفی کے لیے ماحول کو سمجھنے اور اس پر قابو پانے کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ آموزش کو محرکات کے تابع سمجھتے ہیں۔

یہ ذکر آ چکا ہے کہ آموزش میں تجسس اور دست ورزی کے محرکات ضروری ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر محرکات کی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ تقویت کا انحصار سراسر محرکات پر ہے۔ بھوکی بلی کو خوراک پر تقویت حاصل ہوتی ہے اور وہ جلد سے جلد تر سیکھتی جاتی ہے یہی بلی اگر بھوکی نہ ہو تو خوراک کی موجودگی سے تقویت حاصل نہیں کرے گی اور آموزش میں نہایت سست ثابت ہوگی۔

منفی تطبیق اور مشروطی عمل کی تلفی میں بھی محرک موجود ہوتا ہے۔

یہ محرک سلبی قسم کا ہے۔ یعنی جو چیز فضول اور بے کار ہو اسے ترک کر دیا جائے۔ بعض حالتوں میں فضول حرکت کو کچھ عرصہ کے لیے دہرایا جاتا ہے۔ شاید یہاں پر کوئی جعلی تقویت (Assumed Reinforcement) موجود ہو۔ انسان یونہی سمجھتا رہے کہ اس حرکت سے کچھ حاصل ہو رہا ہے حالانکہ دراصل کچھ حاصل نہ ہوتا ہو۔ مثلاً جو بچہ کتوں سے ڈرتا ہو وہ بے ضرر کتے کو دیکھ کر بھی بھاگ پڑتا ہے اور بھاگنے کے بعد اپنے آپ کو مبارک باد دیتا ہے کہ کتے سے بچ گیا۔ اس بے بنیاد خوشی سے ڈر کو تقویت ملتی ہے اور ڈر بے جا طور پر قائم رہتا ہے۔ کئی مخالفتیں اور دشمنیاں اسی طرح قائم رہتی ہیں۔ ان سے کچھ حاصل نہیں ہوتا لیکن انسان اس فریب میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ حاصل کر رہا ہے۔

حدب پر پہنچ کر بھی یہ دھوکا لگتا ہے۔ حدب پر ترقی رک جاتی ہے لیکن کھلاڑی سمجھتا ہے کہ کچھ نہ کچھ حاصل ہو رہا ہے، اس کی صحت بن رہی ہے، اعضا میں لچک آ رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس کے دل میں یہ خیال بھی نہیں گزرتا کہ تکنیک بدلنے یا شوق کو دوبارہ زندہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ حدب دور ہو۔

اٹھارواں باب

حافظہ (Memory)

حافظے کی اہمیت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ اگر ذہن میں گزشتہ یا موجودہ تجربات محفوظ نہ رکھ سکیں تو مستقبل میں ان سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا جا سکے گا اور ہر بار انسان نئے سرے سے کام شروع کرے گا۔ کوئی عادت نہ پڑ سکے گی۔ علم میں ترقی نہ ہوگی۔ تہذیب و تمدن کا نام و نشان نہ ہوگا اور انسانی زندگی حیوانی سطح سے اُوپر نہ جا سکے گی۔

حافظے کو آموزش (Learning)، خازنیت (Retention) اور بازیافت (Recall) یا شناخت (Recognition) میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ فرض کیا آپ کسی عظیم ہستی سے متعارف ہوتے ہیں۔ اس کے نام، اوصاف، رتبہ اور حسب نسب سے واقفیت حاصل کرتے ہیں، یہ آموزش ہے۔ یہ علم دماغ میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ یہ خازنیت ہوگی۔ جب ان بزرگ سے دوبارہ ملاقات ہوتی ہے تو ان کے متعلق جو علم دماغ کے کسی کونے میں حفاظت سے پڑا ہے یاد آ جاتا ہے یہ بازیافت ہوئی۔ بعض دفعہ دیکھی ہوئی چیز دوبارہ سامنے آتی ہے تو اسے پہچان لیا جاتا ہے تب بازیافت کی بجائے شناخت کہیں گے۔

حافظے کا مطالعہ کرنے کے لیے ووڈورتھ L - I - R کا فارمولا پیش کرتا ہے۔ L سے مراد آموزش (Learning)، I سے مراد وقفہ (Interval) اور R سے مراد بازیافت (Recall) یا شناخت (Recognition) ہے۔ ان تینوں عناصر کا یکے بعد دیگرے تجربی طور پر مطالعہ کر

سکتے ہیں ۔ کسی دو عناصر کو ساکن (Constant) کرکے تیسرے کو متغیرہ (Variable) بنا کر اس کی حیثیت متعین کی جا سکتی ہے ۔

حفظ کرنا (Memorising) :

معمول کو کوئی سبق یاد کرنے کے لیے دیا جاتا ہے ۔ یہ سبق نیا ہونا چاہیے ۔ نیا اس صورت میں کہ معمول کو پہلے سے اس کی واقفیت نہیں ہونی چاہیے ۔ کیونکہ اگر مواد کبھی پہلے نظر سے گزرا ہو یا اس کے اجزا سے تھوڑی بہت شناسائی ہو تو تجربہ ناکام رہے گا ۔ یہی وجہ ہے کہ حافظے کے تجربات عموماً بے معنی مواد پر ہوتے ہیں ۔ یونہی حرف لے لیے جاتے ہیں ۔ یا بیہودہ لاطینی تصاویر ، اعداد اور الفاظ کو حفظ کرنے کے لیے کہا جاتا ہے ۔ مواد مشکل ہونا چاہیے تاکہ یادداشت اور بازیافت میں غلطیوں کا امکان پیدا ہو سکے ۔ آسان مواد خواہ بے معنی ہو، جلد یاد ہو جائے گا اور اس کی بازیافت بھی صحیح ہوگی ۔ لیکن مشکل مواد یاد بھی دقت سے ہوتا ہے اور اس کی بازیافت بھی یقینی نہیں ہوتی ۔ خواہ فوری حد حافظہ (Immediate Memory Span) ہو یا لمبے مواد کی یادداشت کا سوال ہو مندرجہ بالا اصولوں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے ۔

فوری حد حافظہ : حد حافظہ سے مراد ہے کہ کوئی شخص ایک ہی آزمائش یا نظر میں کس قدر مواد یاد کر سکتا ہے ۔ تجربہ کرتے ہوئے وقفے کی مدت کم سے کم کر سکتے ہیں ۔ الفاظ یا اعداد دکھانے کے فوراً بعد ہی یا کچھ عرصہ بعد اس شخص کو کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ اسے یاد ہے اس کی بازیافت پیش کرے ۔ مندرجہ ذیل اعداد لیجیے اور معمول کو کہیے کہ ایک نظر دیکھ کر بتائے کہ کتنے اعداد یاد رکھ سکا ہے ۔

۷۰۳۶۱
۹۲۷۳۵۸
۳۰۱۶۳۷۲
۲۳۹۷۱۳۰۶

عموماً ۴،۵ اعداد تک صحیح یاد رہتا ہے بعض دفعہ حافظہ کی وسعت بڑھ کر آٹھ تک پہنچ جاتی ہے۔ بچوں کی وسعت چار سے زیادہ نہیں بڑھتی۔ ۲۸ سال کی عمر تک وسعت بڑھنے کے امکان ہیں۔ یاد رہے کہ وسعت مشق سے بھی بڑھ جاتی ہے اور وسعت کا تعلق ذہانت سے بھی ہے۔ اسی لیے ذہانت کی آزمائشوں میں بازیافت پر سوال ہوتے ہیں۔

اب لمبے مواد کو لیجیے۔ فرض کیا آٹھ اعداد حفظ ہوگئے ہیں، کیا یہ ممکن ہے کہ ان آٹھ اعداد کو ایک طرف رکھ کر اور آٹھ اعداد حفظ کر لیں اور پھر پورے سولہ دھرا دیں۔ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ کیونکہ بعد کے آٹھ اعداد یاد کرتے وقت پہلے آٹھ اعداد پر گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور وہ قدرے بھول جاتے ہیں۔ لہٰذا اگر لمبی فہرست یاد کرنی ہو تو خواندگیوں (Readings) کا نمبر بڑھانا پڑے گا۔ بار بار دہرانے سے اعداد یاد ہو جائیں گے اور ان کی بازیافت بھی صحیح ہوگی۔ حافظ قرآن بار بار قرآن شریف دھراتے ہیں اور دھرانے سے ان کی بازیافت قابل اعتماد ہو جاتی ہے۔ ایک آدھ غلطی پھر بھی ہو جاتی ہے جسے دوسرے حافظ درست کر دیتے ہیں۔ اعداد یاد کرتے وقت صرف خواندگیوں پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ اعداد کے گروپ بنا لیے جاتے ہیں، ان گروہوں میں رشتے اور علائق قائم کر لیے جاتے ہیں۔ اس طرح ان کا یاد کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اگر الفاظ یاد کرنے ہوں تو ان میں قافیہ پیدا کر لیا جاتا ہے یا انھیں بامعنی بنانے کے ڈھنگ سوچے جاتے ہیں۔ ان سب کا مطلب یہ ہوا کہ حفظ کرنے والا بے معنی مواد کو بامعنی بنانا چاہتا ہے۔

حافظہ میں کفایت (Economy of Learning) :

اس سلسلہ میں ابینگھاس (Ebinghaus) نے نہایت ہی قابل قدر کام کیا ہے۔ اپنے آپ کو معمول بنا کر اس نے بے معنی مواد کو بار بار پڑھا۔ اس کے پاس کوئی سائنسی سامان نہ تھا لیکن اس کے باوجود جن نتائج پر وہ پہنچا وہ اس قدر درست ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ تجربے کرتے وقت مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھا گیا۔

(۱) ہر سلسلہ کو شروع سے آخر تک مکمل پڑھا گیا۔

(۲) خواندگیوں کا وقت ایک جیسا تھا اسے تال ترازو (Metronome) سے کنٹرول کیا گیا۔ یہ ترازو ایک منٹ میں ۱۵۰ دفعہ بجتا تھا۔

(۳) ہر خواندگی کے بعد ۱۵ سیکنڈ کا وقفہ تھا۔

(۴) حروف کا تلازم (Association) منع تھا۔

(۵) جہاں تک ممکن تھا توجہ کو مواد پر لگائے رکھا جاتا تھا۔

(۶) خارجی ماحول کو ضبط میں رکھا گیا تاکہ تجربہ خراب نہ ہو۔

ابینگھاس نے حافظے کے امتحان کے لیے بچت کا طریقہ (Savings Method) استعمال کیا۔ جتنی خواندگیاں مواد کو یاد کرنے کے لیے درکار تھیں انہیں نوٹ کر لیا گیا۔ کچھ وقفہ کے بعد اسی مواد کو دوبارہ یاد کیا گیا۔ جتنی خواندگیوں کی اب ضرورت پڑی انہیں پہلی خواندگیوں سے تفریق کر دیا گیا۔ جس قدر خواندگیاں کم نکلیں اتنی بچت ہوگئی۔ مندرجہ ذیل نتائج کچھ ابینگھاس سے لیے گئے ہیں کچھ دوسرے محققوں سے۔

۱۔ بارہ حروف کے ایک سلسلہ کو دوبارہ یاد کرنے کے لیے تین دنوں میں ۳۸ خواندگیوں کی ضرورت پڑی لیکن ایک ہی دن میں یاد کرنے کے لیے ۶۸ خواندگیاں چاہیے تھیں۔ لہٰذا ابینگھاس اس نتیجہ پر پہنچا کہ غیر مسلسل اعادہ (Spaced Repetition) مسلسل اعادے (Unspaced Repetition) سے بہتر ہے۔ کالج کے چند ایک طلبا کو

حروف کے تین سلسلے یاد کرنے کے لیے دیے گئے ، یاد دو طریقوں سے کرنے تھے ۔ ایک میں خواندگیوں کے درمیان چھ سیکنڈ کا وقفہ تھا دوسرے میں دو منٹ کا ۔ پہلا اعادہ مسلسل اور دوسرا اعادہ غیرمسلسل کہلانے گا ۔ نتائج حسب ذیل تھے :

حفظ کرنے کا طریقہ	حروف کی تعداد		
	۱۴	۱۱	۸
مسلسل	۷.۱	۱۱.۶	۷.۰
غیر مسلسل	۲۱.۱	۹.۴	۵.۹

یہ نتائج صاف طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ غیر مسلسل اعادہ تھوڑی خواندگیاں چاہتا ہے اس لیے مسلسل سے بہتر ہے[1]۔ ووڈورتھ ایک اور تجربہ ۳۲ طلبا پر بیان کرتا ہے ۔ انھیں بھی الفاظ کی فہرست یاد کرنی تھی ۔ ایک دفعہ تو ہر خواندگی میں ۶ سیکنڈ کا وقفہ تھا دوسرے میں دو منٹ کا۔ مسلسل طریقے سے ۱۵ خواندگیوں کی ضرورت پڑی غیرمسلسل میں ۱۱ کی۔

اس مطالعہ سے دو چیزیں اخذ کی جا سکتی ہیں :

(الف) خواہ بے معنی مواد ہو یا با معنی ۔ خواہ دماغی عادت ہو یا جسمانی ، غیرمسلسل اعادہ ہرحالت میں بہتر رہتا ہے ۔ اگر سائیکل چلانا سیکھنا ہو تو ایک ہی دن میں بار بار چلانے سے وہ بہت نہ ہوگی جو کئی روز تھوڑا تھوڑا وقت دینے سے ہوسکتی ہے۔

(ب) جتنا دقت آمیز کام ہوگا اتنے ہی اس کی آموزش کے لیے وقفے چاہییں ۔

ان اصولوں کے پیش نظر رٹے (Cramming) کو بھی سراہا نہیں جا سکتا ۔ چند ایک فوجیوں کو ریڈیو آپریٹر (Radio Operator) بننے کی تربیت دیتے وقت روزانہ سات گھنٹے کام کرایا گیا ۔ جب کام کی مدت

۱۔ یہ تجربہ سی ۔ آئی ہولینڈ (C. I. Hovland) نے کیا ہے ۔

چار گھنٹے فی یوم کر دی گئی تو انھوں نے بہت جلد سیکھ لیا ۔

اگر پوچھا جائے کہ وقفہ دینے سے کیا فائدہ ہوتا ہے تو اس سوال کا جواب آسان نہ ہوگا ۔ لیکن ایک چیز وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ وقفے کے بعد ہر شخص تازہ دم ہو کر کام کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس سے بڑا فرق پڑ جاتا ہے ۔ لہٰذا ہر چھوٹے بڑے کام کے درمیان وقفہ دینا چاہیے تاکہ کام دلچسپ رہے ۔ اگر کسی کام میں دلچسپی گھٹنے لگے تو وقفے کی ضرورت ہوتی ہے، اس سے تھکاوٹ دور ہوتی ہے اور دماغ از سر نو تازہ ہو جاتا ہے ۔

غیرمسلسل اعادہ کا اصول برتتے وقت احتیاط کی ضرورت ہے۔ تھوڑے وقت میں اگر کوئی چیز یاد کرنی ہو تو وہاں لمبے وقفوں کی حاجت نہیں ہوتی ۔ طلبا دیر سے موڈ میں آتے ہیں اور جب پڑھنے کا موڈ بنا ہو اس وقت وقفے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی ۔ جب تک شوق قائم ہے تب تک سرگرمی جاری رکھنی چاہیے ۔ لیکن اگر ایک ہی مواد کا بار بار اعادہ کرنا ہو تو خواندگیوں کے درمیان وقفہ کی مدت کا انحصار منجملہ اور چیزوں کے فرد کے فطری اور اکتسابی میلانات پر بھی ہے ۔

۲- ایبنگھاس نے با معنی اور بے معنی مواد پر تجربہ کیا ۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ رٹنے (Rote) کے مقابلے میں معانی اور مطالب سمجھ کر یاد کرنا ہر حالت میں بہتر رہتا ہے ۔ یاد کرنے کے لیے اس نے ایک ٹکڑا بائرن (Byron) سے لیا ۔ اس میں ۸۰ حروف تھے ۔ یہ ٹکڑا ۹ خواندگیوں میں یاد ہوگیا ۔ لیکن جب اتنا بڑا ٹکڑا بے معنی مواد کا لیا گیا تو اسے یاد کرنے کے لیے ۷۰ سے لے کر ۸۰ خواندگیوں کی ضرورت پڑی ۔ لہٰذا بےمعنی اور با معنی مواد یاد کرنےمیں ۹ اور ۷۵ کی نسبت ہے ۔ یاد کرتے وقت ہمیشہ یہ گر یاد رکھنا چاہیے کہ کسی نہ کسی طرح مواد کو با معنی بنانا ہے ۔ کیونکہ جو چیز سمجھ کر یاد کی جائے وہ جلد یاد ہو جائے گی اور دیر تک یاد رہے گی ۔ بعض لوگ تقریروں

کو رٹا لگا لیتے ہیں - سٹیج پر آ کر یہ تقریریں بھول جاتی ہیں اور اگر وہاں بھی یاد رہ جائیں اور انھیں صحیح طور پر اگل بھی دیا جائے تو بھی تقریر کرنے کے فوراً بعد ذہن سے بالکل نکل جاتی ہیں اور ان کا یاد کرنا نہ کرنا ایک برابر ہو جاتا ہے -

۳- اینگھاس نے تلازم اور قافیہ بندی کو بھی بڑا مفید پایا - اگر ترنم کو ساکن یا حذف کر دیا جائے یعنی اگر یہ ایک ہی تال پر رہے تو اس کے خلل انگیز پہلو دور ہو جاتے ہیں - تجربوں سے ثابت ہے کہ اگر حفظ کرتے وقت ہر قسم کے ترنم کو حذف کر دیا جائے تو حفظ کرنے میں دقت پیدا ہو جاتی ہے - یہی وجہ ہے کہ چھوٹے بچے کھیلتے یا یاد کرتے وقت قافیہ بندی سے کام لیتے ہیں اور بڑے مزے سے مواد یاد کرتے جاتے ہیں - الہامی کتابوں میں بھی قافیہ ہوتا ہے - اسی وجہ سے انھیں حفظ کرنا آسان ہو جاتا ہے -

۴- زبانی قرأت (Recitation) : سبق یاد کر لینے کے بعد ہر طالب علم کو چاہیے کہ وہ کتاب بند کر کے سبق کو زبانی دھرائے - اس سے نہ صرف وقت کی بچت ہوتی ہے بلکہ یاد کیا ہوا سبق دیر تک یاد رہتا ہے - ووڈورتھ نے گیٹس (Gates) سے ایک تجربہ لیا ہے جو اس امر کی تائید کرتا ہے - اس کے نتائج حسب ذیل ہیں :

مواد جو یاد کیا گیا	۱۶ بے معنی حروف		۵ چھوٹی سوانح عمریاں	
وقت کی تقسیم	فی صد جو فوراً یاد ہو گیا	جو ۴ گھنٹہ بعد یاد رہا	فی صد جو فوراً یاد ہو گیا	جو ۴ گھنٹہ بعد یاد رہا
تمام وقت یاد میں صرف ہوا	۳۵	۱۵	۳۵	۱۶
$\frac{۱}{۵}$ وقت قرأت کو دیا گیا	۵۰	۲۶	۳۷	۱۹
$\frac{۴}{۵}$ "	۵۴	۲۸	۴۱	۲۵

۳/۵ وقت قرأت کو دیا گیا ۵۷ ۳۷ ۴۲ ·۲۶

۴/۵ " ۷۴ ۴۸ ۳۲ ·۲۶

اس نقشہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ

(ا) قرأت ہر حالت میں مفید ہے -

(ب) یہ فائدہ پہلی خواندگی اور ۴ گھنٹے بعد والی میں بھی موجود ہے جس سے ثابت ہوا کہ قرأت سے حافظہ دیرپا رہتا ہے - اسی قسم کا تجربہ ای میومن (E. Meumunn) نے بھی کیا ہے - اس نے بھی بے معنی مواد لے کر بارہ مختلف طریقوں سے خواندگیوں اور قرأت کو ملایا - نتائج حسب ذیل ہیں -

خواندگیاں	قرأت	خواندگیاں	قرأت	خواندگیاں	قرأت	خواندگیاں	قرأت
۶	×	۶	۵	۶	۱۰	۶	۱۵
۱۱	×	۱۱	۵	۱۱	۱۰	۱۵	۱۰
۱۶	×	۱۶	۵	۱۶	۱۰		
۲۱	×						

اس نے معلوم کیا کہ ۶ خواندگیاں اور ۱۵ قرأت بہترین نتائج دیتا ہے -

قرأت سے دو فوائد متصور ہیں :

۱- بار بار پڑھنا بوریت لاتا ہے - قرأت سے دلچسپی بڑھتی ہے -

۲- قرأت سے معلوم ہوجاتا ہے کہ کتنا مواد یاد ہوگیا ہے اور کتنا اور یاد کرنا چاہیے - لہٰذا قرأت سے اپنی کامیابی اور ناکامی کا علم ہوتا ہے- اس سے حوصلہ بڑھتا ہے اور مزید کام کرنے کی جرأت پیدا ہوتی ہے- سزا اور جزا کا عنصر ایک قسم کی تقویت (Reinforcement) ہے -

(۵) کلی اور جزئی طریقہ (Whole and Part Method) :

یاد کرتے وقت کیا یہ بہتر رہتا ہے کہ سارا مواد ایک دم پڑھا جائے یا بہتر رہے گا کہ اس کے حصے بنا لیے جائیں اور ایک حصے

کو یاد کرکے پھر دوسرے کو لیا جائے ۔ فرض کیا کہ ایک لمبی سی ۴۲ مصرعوں والی نظم یاد کرنی ہے ۔ اکثر لوگ پہلے ایک شعر یاد کریں گے پھر دوسرا ، پھر تیسرا ، یعنی ایک ایک شعر یاد کرکے آگے بڑھتے جائیں گے ۔ یہ جزئی طریقہ ہے ۔ اگر کوئی شخص ساری نظم کو پڑھے پھر دوبارہ ساری پڑھے اور اسی طرح ساری نظم کو بار بار پڑھ کر یاد کرنے کی کوشش کرے تو یہ کلی طریقہ ہوگا ۔ پائل (Pyle) اور سنڈر (Synder) نے کچھ نوجوانوں کو ایک ہی نظم کے دو ٹکڑے یاد کرنے کو دیے ۔ ایک ٹکڑا تو کلی طریقے سے اور دوسرا جزئی طریقے سے یاد کیا گیا ۔ نتائج دیکھیں ۔

۲۴۰ مصرعوں کو کلی اور جزی طریقوں سے یاد کرنا ۔

یاد کرنے کا طریقہ	دنوں کی تعداد	کل جتنے منٹ دیے گئے
ہر روز ۳۰ مصرعے یاد کیے گئے	۱۲	۴۳۱
ہر روز تین دفعہ ساری نظم کو پڑھا گیا	۱۰	۳۴۸

کلی طریقے سے ۸۳ منٹوں کی بچت ہوئی ۔ کئی تجربوں نے کلی طریقے کی تائید کی ہے ۔ کچھ تجربے جزئی طریقے کو سراہتے ہیں ۔ اس تضاد سے پتہ چلتا ہے کہ نہ تو کلی طریقہ ہر حالت میں مفید ہے اور نہ ہی جزی طریقہ ہر حالت میں نقصان دہ ۔ مواد کو دیکھنا چاہیے ۔ اگر مواد لمبا ہو تو اس کے حصے بنا لینے چاہییں اور اگر مواد چھوٹا ہو تو اس کے اجزا بنانے کی ضرورت نہیں ۔ مثلاً اگر قرآن شریف حفظ کرنا ہو تو اس کے اجزا بنانے پڑیں گے اور ہر چیز کو اکائی سمجھ کر اسے سارا پڑھنا ہوگا ۔ یہاں ہر کلی اور جزئی طریقے مل جائیں گے اور دونوں کارآمد ثابت ہوں گے ۔ لیکن اگر چھوٹی سی سورت یاد کرنی ہو جیسے قل شریف تو کلی طریقہ بہتر رہے گا ۔ مواد کے علاوہ فرد کا اپنا رویہ بھی دیکھنا چاہیے ، بعض لوگ جزئی طریقے سے یاد کرنے کے عادی ہیں بعض کلی سے ۔ پس دیکھنا یہ چاہیے کہ بہتر نتائج کس طریقے سے ملتے ہیں ۔

۳۔ حفظ کرنے میں محرکات اور رویوں کی اہمیت : زندگی کے فرائض ادا کرتے وقت ماحول اور طریق کار کے علاوہ فرد کے محرکات اور رویے بھی نہایت اہم ہیں ۔ طالب علم کو لیجیے ۔ اس کا مقصد امتحان پاس کرنا ہے ، اس غرض کے لیے وہ کسی سکول میں تعلیم پاتا ہے اور تحصیل علم کے لیے کوئی طریق کار استعمال کرتا ہے ۔ لیکن ان دو عناصر کے علاوہ شوق اور دلچسپی کی بھی ضرورت ہے ۔ اگر پڑھنے کو جی نہ چاہے تو بہتر سے بہتر کالج اور لائق سے لائق اساتذہ بے کار ثابت ہوں گے ۔ اسی طرح حافظے میں بھی یاد کرنے والے کے محرکات کو دیکھا جاتا ہے ۔

(ا) محض توجہ دینے سے مواد کو حفظ نہیں کیا جا سکتا ۔ حفظ کرنے کی خواہش بھی موجود ہونی چاہیے ۔ کسی نظم کو آپ ہزار دفعہ پڑھ جائیں اگر یاد کرنے کا خیال یا نیت نہ ہو تو یاد نہ ہوگی ۔ بعض تجربوں میں لوگوں کو ایک مواد بار بار دکھایا جاتا ہے لیکن انہیں یاد کرنے کے لیے نہیں کہا جاتا ۔ کچھ عرصے کے بعد انہیں دہرانے کے لیے کہا جاتا ہے وہ دہرا نہیں سکتے ۔ وہ کہتے ہیں کہ انہیں یاد کرنے کے لیے تو کہا ہی نہیں گیا تھا ۔

یہاں پر بعض استثنا کا بھی ذکر کرنا چاہیے ۔ بعض آدمی ایسی واردات بھی یاد کر لیتے ہیں اور بعد میں ٹھیک طرح سے دہرا بھی دیتے ہیں جو انھوں نے یاد کرنے کی نیت سے کبھی نہ دیکھے ہوں ۔ مثلاً شیلو (Shellow) بیان کرتا ہے کہ کالج کے طلبا کو کچھ رسالے دکھانے گئے اور انہیں کہا گیا کہ بعد میں انہیں رسالوں کے نام بتانے ہوں گے اور جس ترتیب میں رسالے دکھائے گئے ہیں وہ ترتیب بھی بتانی ہوگی ۔ جب ان طلبہ سے مندرجہ بالا سوال پوچھنے کا وقت آیا تو ان سوالوں کے علاوہ کچھ اور سوال بھی پوچھے گئے ۔ مثلاً

فلاں رسالے کے سرورق پر کون سی تصویر تھی -
کس رسالے کا سرورق بائیں کونے سے پھٹا ہوا تھا -
فلاں رسالے پر جو تصویر تھی کیا وہ انگریزی ایکٹر کی تھی یا امریکی ایکٹر کی -
رسالے کا نام دکھاتے وقت تمھیں اور کیا بتایا گیا -
ایسے ضمنی سوالوں کا جواب بھی کئی طلبہ نے ٹھیک دے دیا -
اس تجربے سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ جن طلبہ کا حافظہ بہتر تھا انہوں نے ضمنی سوالوں کے جواب بھی بہتر دیے -

ڈیشیئل (Dashiell) کہتا ہے[1] کہ اس تجربے سے "حفظ کرنے کی نیت" کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کیونکہ جو حصہ یاد کرنے کی نیت سے یاد کیا گیا تھا وہ بہتر یاد تھا بہ نسبت اس حصے کے جہاں یہ نیت موجود نہ تھی - لہٰذا طلبہ کو چاہیے کہ وہ کتابیں یاد کرنے کی نیت سے پڑھیں - اس سے بہت فرق پڑے گا -

(ب) سکولوں ، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جو تجربے ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر طلبہ کو ان کی پڑھائی کے نتائج سے آگاہ کر دیا جائے تو اس سے نہایت خوشگوار اثر پڑتا ہے - طلبہ کے امتحان ہونے چاہییں اور انھیں اپنی ترقی کا علم ہونا چاہیے - اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ طلبہ کو صحیح یا غلط طریق کار کا پتہ لگ جائے گا اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ نمبروں کی کمی یا زیادتی تقویت (Reinforcement) کا کام دے گی -

جنگ کے دنوں میں کچھ فوجیوں کو توپچی بننے کی تربیت دی گئی - ان کے تین گروپ بنائے گئے - پہلے گروپ کو زبانی تعلیم دی گئی -

---

۱ - ملاحظہ ہو اس کی Fundamentals of General Psychology صفحہ ۳۷۳ -

دوسرے گروپ میں فوجیوں نے ایک دوسرے کو سکھایا ۔ تیسرے گروپ کو استاد نے دوربین سے دیکھ کر بتاتا تھا کہ گولی نشانے پر لگی یا نہیں لگی ۔ تیسرے گروپ کو شمار (Score) سے بھی آگاہ کیا گیا ۔ تیسرے کی کارکردگی بہترین رہی ۔ شروع شروع میں تو تینوں گروپ ایک جیسے تھے لیکن جونہی مشق بڑھی فرق ظاہر ہو گیا اور اخیر پر تیسرا گروپ سب سے بڑھ گیا[۱] ۔

(ج) اکثر چیزیں سوشل حالات میں سیکھی جاتی ہیں مثلاً طلبہ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں علم حاصل کرتے ہیں، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا تعریف یا لعن طعن سے حافظہ پر کچھ اثر پڑتا ہے یا نہیں ۔ اکثر لوگ اس سوال کا جواب مثبت میں دیں گے ۔ لیکن یہاں پر احتیاط کی ضرورت ہے ۔ ایچ ۔ او ۔ شمٹ (H. O. Schmit) نے کچھ سکول اور کچھ کالج کے طلبہ لیے اور انہیں یاد کرنے کے لیے مواد دیا ۔ یہ طلبہ آپس میں چار طرح سے مختلف تھے ۔ ان کی جنس عمریں ، اور کلاسیں مختلف تھیں اور ان کے ممتحنوں کی جنس بھی ایک نہ تھی ۔ ان طلبہ میں بعض کو شاباش کہی جاتی تھی ۔ بعض کو ملامت کی جاتی تھی اور بعض کو نہ شاباش ملی نہ ملامت ۔ نتائج متناقض تھے ۔ کہیں شاباش پانے والا طالب علم اونچا نظر آتا ہے ، کہیں ملامت پانے والا اور کہیں جسے کچھ نہ کہا گیا ۔ اسی طرح کہیں شاباش پانے والا نیچا نظر آتا ہے ۔ کہیں ملامت پانے والا اور کہیں جسے کچھ نہ کہا گیا ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض لوگ شاباش سے بگڑ جاتے ہیں اور بعض ملامت سے ۔ ایسے ہی

۱۔ ملاحظہ ہو سی ۔ ڈبلیو برے C. W. Bray کی کتاب موسومہ
- Psychology and Military Proficiency

ہے تو لاشعور کا نظریہ فضول ہوگا۔ کیونکہ اس سے مراد یہ ہوگی کہ آموزش سے عضویہ کی حالت بدل جاتی ہے اور یہ تبدیلی قائم رہتی ہے اور ضائع نہیں ہوتی۔

پس فعلیاتی لحاظ سے ہر تأثر عضویہ پر اپنا نقش چھوڑ جاتا ہے اس نقش کو حافظہ کا نقش (Memory Trace) کہتے ہیں۔ یہ نقوش کچھ عرصے تک قائم رہتے ہیں انہی کی بدولت اعادہ آسان ہو جاتا ہے۔ اگر تأثرات کو دھرایا جائے تو نقش گہرا ہو جاتا ہے اور زیادہ دیر تک قائم رہتا ہے۔ کم ہی ایسے نقوش ہوتے ہیں جو تادم مرگ قائم رہتے ہوں۔ بے شمار نقوش اس قسم کے ہوتے ہیں جو پیدا ہوتے ہیں اور مٹ جاتے ہیں، اس لیے کئی باتیں یاد ہو جاتی ہیں پھر ذہن سے مٹ جاتی ہیں اور بھول جاتی ہیں۔

تجزیۂ نفس کے بعض ماہرین دعویٰ کرتے ہیں کہ جو چیز ایک دفعہ تجربہ کرلی جائے وہ کبھی نہیں بھولتی۔ شعور سے نکل کر وہ چیز لاشعور میں ڈیرا لگا لیتی ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ تحلیل نفسی سے بچپن کی بھولی بسری باتیں یاد آ جاتی ہیں۔ لہٰذا اور باتیں بھی جنھیں ہم بھولی ہوئی سمجھتے ہیں ان کو بھی نومیت (Hypnotism) اور تحلیل نفسی کے ذریعے شعور میں لایا جا سکتا ہے۔ ووڈورتھ اس نظریے کو مبالغہ پر مبنی تعبیر کرتا ہے۔ اس کا یہ خیال نہیں کہ ہر چھوٹا بڑا تجربہ اور ہر فضول اور لایعنی تأثر کہیں نہ کہیں ذہن میں محفوظ ہو جاتا ہے۔

خازنیت کو ناپنے کا طریقہ: تین طریقوں سے خازنیت کا پتہ لگ سکتا ہے۔

۱۔ یاد کیے ہوئے سبق کی بازیافت ہو سکتی ہے۔ مثلاً کمرہ امتحان میں بیٹھا ہوا طالب علم آموختہ کو دوبارہ یاد کرتا ہے اور صیغۂ تحریر میں لے آتا ہے۔

۲- ایک سبق پڑھائیے ، کچھ فقرے اس سبق میں سے اور کچھ فقرے کسی دوسرے سبق سے لیجیے - پھر طالب علم کو کہیے کہ جو فقرے پڑھے ہوئے سبق میں سے ہیں انھیں شناخت کرے -

۳- مکرر آموزش (Relearning) سے بھی خازنیت کا پتہ چلتا ہے - اگر پہلی دفعہ نظم کو یاد کرنے میں دس منٹ لگے اور چند دن بعد اسی نظم کو یاد کرنے میں چھ منٹ لگے تو چار منٹ کی بچت خازنیت کی بدولت ہوگی -

مکرر آموزش : فرض کیا کہ چوہے کو بھول بھلیاں سیکھنے میں بیس آزمائشیں چاہییں - لیکن بعد میں یہ وہی بھول بھلیاں پانچ آزمائشوں میں یاد کر لیتا ہے تو پندرہ آزمائشوں کی بچت ہوئی - چوہا صرف ۲۵ فی صد بھولا - ایک اور تجربے میں دو ہفتے کے بعد جب چوہے نے دوبارہ بھول بھلیاں سیکھی تو بچت نوے فی صد تھی - چار ہفتوں کے بعد ۸۸ فی صد ، چھ ہفتوں کے بعد ۸۵ فی صد اور چار ہفتوں کے بعد ۷۳ فی صد تھی -

اچھی طرح سے یاد نہ کیے ہوئے مواد کو دوبارہ یاد کرنے میں بھی بچت کی پیمائش ہو سکتی ہے - ایچ - ای - برٹ (H. E. Burt) نے بیان کیا ہے کہ ایک بچے کو پندرہ سے چھتیس ماہ کی عمر میں کچھ یونانی زبان سے تحریریں سنائی گئیں - کچھ سال بعد بچے کو کہا گیا کہ انھیں تحریروں کو پھر زبانی یاد کرے - کچھ ٹکڑے تو اس نے ساڑھے آٹھ سال کی عمر میں یاد کر لیے اور کچھ چودہ سال کی عمر میں - دونوں دفعہ بچے کو نسبتاً کم خواندگیاں کرنی پڑیں - بچت سے خازنیت کا اندازہ ہوا - ایسے ہی مشکل ٹکڑے اگر نئے سرے سے حفظ کیے جائیں تو ان کے لیے ۴۳۵ دھرائیوں کی ضرورت ہے - لیکن جو ٹکڑے بچہ بچپن میں سن چکا تھا ان کے لیے ۳۱۷ دھرائیاں چاہییں تھیں -

پس ۶۷ فی صد بچت ہوئی -

فراموشی (Forgetting) : فراموشی کو منفی خازنیت کہہ سکتے ہیں - وقت گزرنے پر خازنیت کا خط نیچے اترنے لگتا ہے اور فراموشی کا اوپر چڑھنے لگتا ہے - ایبنگھاس (Ebinghaus) نے بے معنی مواد کی کئی فہرستیں زبانی یاد کیں - بیس منٹ کے بعد ان میں سے چند ایک فہرستوں کو دوبارہ یاد کیا - کچھ فہرستوں کو ایک دن بعد اور کچھ کو دو دن بعد یاد کیا - اس نے دیکھا کہ ۲۰ منٹ کے بعد ۴۷ فی صد مواد بھولا - ایک دن کے بعد ۶۶ فی صد - دو دن کے بعد ۷۲ فی صد - چھ دن کے بعد ۷۵ فی صد اور ۳۱ دنوں کے بعد ۷۹ فی صد - ان نتائج سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے چند روز میں فراموشی کی رفتار بڑی تیز ہوتی ہے بعد میں سست پڑ جاتی ہے -

یاد رہے کہ ہر مواد میں فراموشی کی رفتار ایک جیسی نہیں ہوتی - بے معنی مواد جلد بھول جاتا ہے - اس کے بعد نثر کا نمبر آتا ہے اور پھر شعر و شاعری کا - اگر سمجھ سے یاد کیا جائے تو مواد جلد نہیں بھولتا - آئی - اے - گیٹس (I. A. Gates) نے بیان کیا ہے کہ کالج کے طلبہ کو کہا گیا کہ وہ بھول بھلیوں کو یا جواب دیکھ کر سمجھ لیں یا اصول سمجھ کر حل کر لیں - جن لوگوں نے محض رٹا لگایا اور اصول نہ سمجھے ان کی فراموشی کی رفتار بہت تیز تھی - لیکن جن طلبہ نے پہلے اصول سمجھے اور بعد میں بھول بھلیوں کا حل نکالا ان کی یادداشت دیرپا تھی -

زائد آموزش (Overlearning) کے فوائد : فرض کیا کسی مواد کو بیس خواندگیوں میں حفظ کیا جا سکتا ہے - اگر اسے دس دفعہ اور دھرایا لیا جائے تو کیا اس کا کچھ فائدہ ہوگا ؟ ایبنگھاس اور

۱- ملاحظہ ہو من (Munn) کی Psychology، صفحہ ۱۵۰ -

کئی دوسرے محققوں نے اس سوال کا جواب مثبت میں دیا ہے ۔ تجربہ یوں ہوتا ہے، اگر کسی مواد کو یاد کرنے کے لیے بیس خواندگیاں چاہییں اور اسے دس اور خواندگیاں دے دی جائیں تو زائد آموزش ۵۰ فی صد ہوگی ۔ اگر بیس اور دے دی جائیں تو زائد آموزش ۱۰۰ فی صد ہوگی ۔ من (Munn) کہتا ہے[۱] کچھ طلبہ کو زائد آموزش کے لیے اسما کی فہرست دی گئی ۔ زائد آموزش صفر، پچاس اور سو فی صد تھی ۔ یہ فہرست مکرر آموزش کے لیے ایک ، دو ، چار ، سات ، چودہ اور اٹھائیس روز بعد دی گئی ۔ نتائج سے پتہ چلا کہ زائد آموزش سے خازنیت بڑھتی ہے ۔ یعنی جتنی زیادہ آموزش ہوگی اتنی زیادہ خازنیت ہوگی ۔ ایک دن کے بعد جب وہ فہرست دوبارہ یاد کی گئی تو صفر زائد آموزش کے لیے خازنیت ۲۶ فی صد تھی ۔ ۵۰ فی صد زائد آموزش کے لیے ۳۸ فی صد اور ۱۰۰ فی صد زائد آموزش کے لیے ۴۹ فی صد تھی ۔ جب مختلف دنوں کے نتائج کو اکٹھا کیا گیا تو پچاس سے سو فی صد زائد آموزش کے لیے مجموعی طور پر ۳۳ فی صد خازنیت کا فائدہ ہوا ۔

ڈبلیو ۔ سی ۔ ایف ۔ کیروگر (W.C.F. Krueger) نے یہی تجربہ الفاظ کی بجائے بھول بھلیوں پر کیا ۔ اس کے نتائج بھی پہلے تجربہ جیسے تھے ۔ اس نے زائد آموزش دو سو فی صد تک بڑھا دی ۔ لیکن کیروگر کے تجربے نے ثابت کر دیا کہ زائد آموزش اگر بہت زیادہ بڑھا دی جائے تو اس سے منافع نسبتاً کم رہتا ہے ۔ مثلاً زائد آموزش کو ۱۰۰ سے ۲۰۰ تک بڑھانے کے بعد خازنیت کا منافع ۵۰ فی صد کے لگ بھگ رہا ۔

فراموشی کے اسباب : کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وقت گزرنے سے چیزیں بھول جاتی ہیں ۔ لیکن یہ خیال چنداں درست نہیں ۔ فراموشی

۱۔ ملاحظہ ہو اس کی Psychology، صفحہ ۱۶۲ ۔

کے اصل اسباب تو اس وقفے میں پائے جاتے ہیں جو یاد کرنے اور بازیافت کے درمیان گزرا ہو - یہ وقفہ کیسے استعمال ہوا ، یادداشت کے سلسلے میں بڑا اہم ہے - دو نظریے فراموشی کی تشریح کرتے ہیں -

۱- مداخلت : فرض کیا بچپن میں کوئی بچہ زید آپ سے ملتا ہے اور عرصہ تک آپ کے ساتھ کھیلتا رہتا ہے - اس کے بعد وہ کہیں چلا جاتا ہے، آپ کہیں چلے جاتے ہیں اور ملنے کا اتفاق نہیں ہوتا - لیکن اس اثنا میں کئی اور شخص ملتے ہیں جن کے نام زید ہیں - ان سے واقفیت بڑھتی ہے اور شناسائی پیدا ہوتی ہے - اس شناسائی کی وجہ سے آپ کو بچپن کا زید یاد نہیں پڑتا - بعد میں جو اور زید آئے انہوں نے پہلے زید کو بھلا دیا - دوسرے الفاظ میں بعد کی معلومات پہلی معلومات میں دخل اندازی کرتی ہیں اور انہیں یاد نہیں آنے دیتیں - بچپن کے زید والے رابطہ کو اگر $S-R$ کہیں اور بعد والے کو $S-R_2$ تو $S-R_2$ ، $S-R_1$ کی یاد آوری میں روڑا اٹکاتا ہے - یہی وجہ ہے کہ بچپن کے واقعات بھول جاتے ہیں - جوں جوں بچہ بڑا ہوتا ہے ویسے ویسے زیادہ سے زیادہ تأثرات آتے جاتے ہیں - یہ تأثرات پہلے تأثرات کے یاد آنے میں مانع ہوتے ہیں -

۲- ذبول تعطل (Atrophy through Dis-use) : محض مداخلت سے ہر قسم کی فراموشی نہیں سمجھائی جا سکتی - دماغ میں ہر وقت تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں - جو خلیے سرگرم کار ہوتے ہیں انہیں زیادہ خوراک کی ضرورت ہوتی ہے اور اس لیے انہیں زیادہ خوراک مل جاتی ہے - لیکن جو خلیے بے کار ہوتے ہیں انہیں خوراک نہیں ملتی اور وہ آہستہ آہستہ اپنی توانائی کھو بیٹھتے ہیں - پس دماغ کے وہ نقوش جو بے کار ہو جاتے ہیں وہ مر جاتے ہیں اور جن تأثرات کے وہ حامل تھے وہ بھی ذہن سے اتر جاتے ہیں - آپ نے دیکھا ہوگا کہ جس عضو کو عرصہ تک استعمال نہ کیا جائے وہ کمزور پڑ جاتا ہے اور اپنی طاقت

اور توانائی کھو بیٹھتا ہے ۔ بعینہ یہی حال ذہنی نقوش کا ہے ۔ اگر انہیں استعمال نہ کیا جائے تو بے کاری کی وجہ سے ضائع ہو جائیں گے ۔

یہ دونوں نظریے اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں اور دونوں کو ملا کر فراموشی کی اکثر اقسام سمجھی جا سکتی ہیں ۔ فراموشی ہر حالت میں نقصان دہ چیز نہیں ۔ فضول اور بے کار تأثرات کو بھولنا ہی بہتر ہے کیونکہ اگر کارآمد تأثرات کے ساتھ بے کار بھی یاد رہیں تو دماغ کباڑ خانہ بن جائے گا اور اپنے ہی وزن سے دب جائے گا ۔ علاوہ ازیں جوں جوں عمر بڑھتی ہے زندگی کے فرائض بدلتے جاتے ہیں لہٰذا نئی معلومات کی ضرورت پڑتی ہے ۔ وہ علم جو گزشتہ منازل پر کارآمد تھا بدلے ہوئے حالات میں ناکارہ ثابت ہوتا ہے ۔ اس علم کو بھولنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ذہن اپنی پوری طاقت سے نئے تقاضوں کا جواب دے سکے ۔ مداخلت دونوں طریقوں پر اپنا جوہر دکھاتی ہے ۔ اگر پرانا علم یاد پڑے گا تو نیا یاد نہیں آئے گا اور اگر نیا یاد آئے گا تو پرانا یاد نہیں آئے گا ۔ لہٰذا زندگی کی دوڑ میں ایسا علم جو افادیت کھو چکا ہو ، بھولنا ہی پڑتا ہے ۔

نیند کا اثر : دو اشخاص کو بے معنی حروف کی فہرست یاد کرنے کے لیے دی گئی، ایک دفعہ نیند سے پہلے دوسری دفعہ دن کے مشاغل میں ۔ ان کی خازنیت کا امتحان نیند اور مشاغل کے ایک ، دو ، چار اور آٹھ گھنٹے بعد لیا گیا ۔ ان اوقات میں جو فہرستیں یاد کی گئیں وہ گو مختلف تھیں لیکن مشکل کے لحاظ سے ایک جیسی تھیں ۔

آزمائشوں نے ثابت کیا کہ نیند میں خازنیت بہتر ہوتی ہے ۔ بے معنی حروف کی فی صد بازیافت ایک ، دو ، چار اور آٹھ گھنٹے نیند کے بعد ۷۰ ، ۵۴ ، ۵۵ اور ۵۶ تھی ۔ اور دن کے مشاغل کے بعد ۴۶ ، ۳۱ ، ۲۲ اور ۹ تھی ۔ فراموشی کی رفتار نیند کی ابتدا میں تیز ہوتی ہے

بعد میں سست پڑ جاتی ہے اور گھٹتی بڑھتی نہیں ۔ نیند کے پہلے گھنٹہ کے بعد بازیافت ۵۴ ، ۵۵ ، ۵۶ رہ جاتی ہے یعنی اس میں کمی بیشی نہیں آتی ۔ دن کے وقت یہ کیفیت نہیں وہاں پہلے ۴۶ پھر ۳۱ پھر ۲۲ اور پھر ۹ بازیافت ہے ۔ یعنی بتدریج گھٹتی جاتی ہے ۔

یہ نتائج ہمارے پہلے مفروضے کو تقویت دیتے ہیں یعنی فراموشی کے اسباب محض وقت گزرنے میں نہیں ڈھونڈنے چاہییں بلکہ اس وقفہ میں دیکھنے چاہییں جو یاد اور بازیافت کے درمیان گزرتا ہے ۔ نیند میں یہ وقفہ تأثرات سے خالی ہوتا ہے لہٰذا کوئی مداخلت یا مزاحمت نہیں ہوتی ۔ دن کے وقت صدہا قسم کے تأثرات اٹھتے ہیں ۔ یہ ایک دوسرے کی یاد آوری میں روڑا اٹکاتے ہیں ۔ جو طالب علم پڑھ کر سو جاتا ہے وہ رات کا پڑھا ہوا تقریباً سارا علم صبح کو دھرا سکتا ہے ۔ اس کے برخلاف جو طالب علم امتحان شروع ہونے تک کتابیں پڑھتا رہتا ہے اسے اکثر پریشانی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے ۔ لیکن یاد رہے کہ :

۱۔ دن کے مشاغل کا اثر اس مواد پر پڑتا ہے جو اچھی طرح یاد نہ کیا گیا ہو ۔ لیکن جو مواد اچھی طرح ذہن نشین ہوگیا ہو اس پر خواہ رات ہو یا دن چنداں اثر نہیں پڑتا ۔

۲۔ مداخلت سے صرف تازہ نقوش نقصان اٹھاتے ہیں ۔ اس لیے نیند انہیں فائدہ پہنچاتی ہے ۔ پرانے نقوش جو تکرار سے پختہ ہو چکے ہوں ، دن کے مشاغل سے خراب نہیں ہوتے ۔

معکوس فعالی مزاحمت (Retroactive Inhibition) : فرض کیا کہ یادداشت پر تجربہ ہو رہا ہے اور مندرجہ ذیل الفاظ یاد کرتے ہیں ۔

پہلی فہرست :

مہیج الفاظ	رد عمل کے الفاظ
سبز	بہشت
بوٹ	باٹا

مہیج الفاظ	رد عمل کے الفاظ
صفر	انڈا
دور	امریکہ ، وغیرہ وغیرہ

سکرین پر یہ الفاظ ایک بار دکھائے جاتے ہیں، پھر دوسری بار، پھر تیسری بار ، حتیٰ کہ پانچویں بار بیس میں سے سولہ جوڑے یاد ہو جاتے ہیں ۔ پھر پندرہ منٹ کے لیے تصویریں دکھائی جاتی ہیں ۔ اس کے بعد الفاظ کی فہرست سنی جاتی ہے ۔ اب معمول کو کہیں کہ وہ پہلی فہرست کو زبانی دھرائے تو وہ سولہ جوڑے نہیں سنا سکے گا بلکہ اس سے کچھ کم ۔ فرض کیا کہ صرف بارہ جوڑے یاد رہ جاتے ہیں اور چار بھول جاتے ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ مداخلت کے بعد خازنیت کم ہوگئی اور پہلے کے مقابلہ میں ۷۵ فی صد رہ گئی ۔ یہ مداخلت بلا واسطہ (Direct Interference) ہے ۔

اب فرض کریں کہ پہلی فہرست یاد کرانے کے بعد تصویریں نہیں دکھائی جاتیں بلکہ ایک اور فہرست حفظ کرنے کے لیے دے دی جاتی ہے ۔ اس فہرست کے مہیج الفاظ وہی ہیں جو پہلی فہرست کے تھے ۔

دوسری فہرست :

مہیج الفاظ	رد عمل کے الفاظ
سبز	ایجاد
بوٹ	سیاست
صفر	زناری
دور	سخاوت ، وغیرہ وغیرہ

اس کے بعد کچھ آرام کا وقفہ آتا ہے جس میں تصویریں دکھائی جاتی ہیں ۔ بعد میں پہلی فہرست دہرانے کو کہا جاتا ہے ۔ آپ دیکھیں گے کہ دوسری فہرست پہلی میں مزاحمت کر رہی ہے ۔ اگرچہ پہلی دفعہ ۱۲ جوڑے

یاد آئے تھے تو اب صرف آٹھ یاد آئیں گے ۔ خازنیت ۵۔ سے گر کر ۵۰ فی صد تک پہنچ جاتی ہے ۔ لیکن اگر پہلی فہرست بہت اچھی طرح یاد ہو تو دوسری فہرست اسے زیادہ خراب نہیں کرے گی ۔ اور اگر دوسری فہرست زیادہ یاد ہو تو پہلی زیادہ بھولے گی اور اگر دونوں ایک جیسی یاد ہوں تو ایک فہرست سے دوسری فہرست کی طرف چلے جائیں گے اور جس فہرست کو یاد کرنا ہوگا وہی یاد آئے گی ۔ مثلاً اگر کوئی طالب علم تمام مضامین اچھی طرح یاد کر لے تو جس مضمون کا پرچہ ہوگا وہی یاد آئے گا ۔ یہ نہیں ہوگا کہ تاریخ والے روز نفسیات یاد آ جائے اور نفسیات والے روز دینیات ۔ کون سی چیز یاد آئے گی اس کا انحصار ہماری دماغی کیفیت (Set) پر ہے ۔

اوپر کی دونوں فہرستوں میں مہیج الفاظ ایک ہی تھے لیکن رد عمل کے الفاظ مختلف تھے ۔ لیکن اب الفاظ کی ایسی فہرستیں لیں جن میں مہیج الفاظ بھی مختلف ہیں اور رد عمل کے الفاظ بھی مختلف ۔ اب اگر پہلی فہرست کو یاد کرنا چاہیں تو بڑی دقت ہوگی ۔ اس مداخلت کو بالواسطہ مداخلت (Indirect Interference) کہتے ہیں ۔

تجربوں سے ثابت ہے کہ اگر آموزش کے فوراً بعد آرام کا وقفہ آ جائے تو خازنیت بہتر رہتی ہے ۔ اگر یاد کے فوراً بعد ہی دھرانے کے لیے کہا جائے ، یعنی یاد کے بعد آرام کا موقعہ بالکل نہ دیا جائے تو خازنیت بہت کم ہوتی ہے ۔ ایک تجربہ میں جن لوگوں کو یاد کے بعد آرام ملا ان کی خازنیت بہ نسبت ان لوگوں کے جنھیں آرام بالکل نہ ملا تقریباً دوگنی تھی[۱] ۔ ایک اور چیز جو تجربوں سے واضح ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر مشاغل ایک دوسرے کے مثل ہوں تو مداخلت بہت زیادہ ہوگی ۔ لیکن اگر ایک دوسرے کے مخالف ہوں تو بہت کم ہوگی ۔ مثلاً اگر پہلے الفاظ کی

---

۱ ۔ ملاحظہ ہو من Munn کی Psychology ، صفحہ ۱۶۳ ۔

ایک فہرست یاد کرنی پڑے اور پھر دوسری بھی تو ایک فہرست کو دھراتے وقت دوسری فہرست سے مزاحمت آئے گی - لیکن اگر پہلے الفاظ کی فہرست یاد کرنی ہو اور پھر تصویریں دیکھنی ہوں تو یہ مشاغل چونکہ ایک دوسرے کے مثل نہیں ، ایک دوسرے میں مداخلت نہیں کریں گے اور دونوں کو دوبارہ یاد کرنے میں کوئی دقت نہ ہوگی -

بازیافت (Recall) :

خازنیت کا امتحان بازیافت سے ہوتا ہے - بازیافت کیسے ہوتی ہے؟ ظاہر ہے کہ مہیجات کے بغیر کوئی بازیافت نہیں ہو سکتی - جیسے معلول کا تصور علت کے بغیر محال ہے ویسے ہی بازیافت کا تصور مہیجات کے بغیر محال ہے -

۱- بازیافت کے مہیجات بیرونی یا اندرونی فعلیاتی واردے یا کوائف ہو سکتے ہیں - فرض کیا کہ کوئی آدمی غالب کا کوئی مصرعہ پڑھنے لگتا ہے - ع قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں - اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ اس نے قید کا لفظ ابھی پڑھا ہے یا سن لیا ہے یا اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس کے پروفیسر نے یاسیت (Pessimism) پر لیکچر دیتے ہوئے غالب کا یہ مصرعہ پڑھا- یا اس کی یہ وجہ ہے کہ آج اس کا موڈ خراب ہے ، ایسے حزن و یاس نے تنگ کر رکھا ہے ، اس لیے غالب کا مصرعہ پڑھا جا رہا ہے -

پس اس مصرع کا یاد آنا کئی وجوہ سے ہو سکتا ہے - اگر یہ سوال کیا جائے کہ کون سی وجہ کسی خاص وقت بازیافت کا موجب بنے گی تو اس سوال کا جواب اس وقت تک ناممکن ہے جب تک فرد کے متعلق مکمل علم نہ ہو اور اس کے مستقل اور عارضی مشاغل سے واقفیت نہ ہو-

۲- بازیافت کے کئی اسباب سوشل ماحول میں ملتے ہیں - مثلاً دسترخوان پر بیٹھے ہوئے کئی لطیفے اور چٹکلے یاد آتے ہیں - کھانا کھانے والوں کے لباس اور چہرے کئی باتیں یاد دلاتے ہیں - ان کے کپڑوں کی

خوشبوئیں جنت کی خبر لاتی ہیں۔ ایسے ہی اور سوشل مواقع بے شمار بھولی بسری باتیں دوبارہ ذہن میں لے آتے ہیں۔ ان سے نشست دلچسپ بنتی ہے اور میل ملاپ مضبوط اور کامیاب بنتے ہیں۔

۳۔ بعض ہیجانی اور فعلیاتی کیفیات بھی بازیافت کی موجب بنتی ہیں۔ بھوکے آدمی کو جاگتے اور سوتے پلاؤ، زردہ اور فرنی کے خیالات آتے ہیں۔ کچھ بچوں کو خوراک سے پہلے اور کچھ کو خوراک کے بعد الفاظ کے تلازم اور تصویروں کی تشریح کی آزمائش دی گئی۔ بھوکے بچوں کے تلازم دوسرے بچوں کی نسبت خوراک سے زیادہ متعلق تھے۔ نتائج دیکھیے:

بھوک اور بازیافت

تلازم	گروپ	خوراک والے رد عمل: خوراک سے پیشتر	خوراک والے رد عمل: خوراک کے بعد
الفاظ کا تلازم	الف	۸	۳
	ب	۳	۲
تصویر کی تشریح	الف	۷	۴
	ب	۸	۲

۴۔ کچھ بازیافت فرد کے اپنے الفاظ، حرکات و سکنات اور جسمانی انداز سے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً پڑے پڑے کسی شخص کو کوئی لفظ سوجھتا ہے اور پرانی واردات یاد آ جاتی ہیں۔ جب ذہنی مریض اپنے خیالات کا اظہار آزاد تلازم سے نفسی ماہر کے سامنے کر رہا ہو مریض کے اپنے خیالات ہی بازیافت کا موجب بنتے ہیں۔ خیالات کے ساتھ ہیجانی

کیفیات بھی عود کر آتی ہیں۔ ان کی وجہ سے ماضی کا سارا ماحول دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے۔

پس اگر کسی شخص کا ماضی جاننا ہو تو بازیافت کے لیے مناسب مہیج چاہیے۔ مہیج ایسا ہونا چاہیے جو اس شخص کے ماضی کو متاثر کر سکے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کوئی مہیج کیسے کسی خاص واقعہ کی یاد دلاتا ہے؟ انسان کے ماضی میں سینکڑوں ہزاروں واردات ہیں۔ ان میں سے صرف چند یاد آتی ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کے جواب میں بازیافت کے معروضی اور موضوعی اسباب بیان کرنے پڑیں گے۔

بازیافت کے معروضی اسباب:

۱۔ اصول تکرار (Frequency): جو S–R رابطہ کثرت اور تکرار سے بنا ہو وہ جلد یاد آئے گا۔ تصویروں میں اور عام زندگی میں کئی چہرے دیکھے جاتے ہیں لیکن یاد وہی چہرہ آئے گا جسے اکثر دیکھا گیا ہو۔ ایسے ہی تقریر کرتے وقت وہی الفاظ اور فقرے یاد آئیں گے جن سے اکثر واسطہ پڑا ہو اور جو تکرار سے عادت کا رتبہ اختیار کر چکے ہوں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ عادت، فطرت ثانیہ ہے۔ کسی شخص نے کہا ہے کہ اگر میں اپنی عادت ایک دن کے لیے چھوڑ دوں تو مجھے چھوڑنے کا علم ہوتا ہے۔ اگر دو دن کے لیے چھوڑ دوں تو میرے دوست جان جاتے ہیں اور اگر تین دن کے لیے چھوڑ دوں تو ساری دنیا جان جاتی ہے۔

۲۔ اصول تاخر (Recency): جو چیز تازہ تازہ یاد کی ہو اس کی بازیافت آسان ہوتی ہے۔ امتحان سے پہلے ہر طالب علم اپنے علم کا جائزہ لیتا ہے۔ کتابیں دھراتا ہے، نوٹس یاد کرتا ہے۔ اسی طرح وکیل کمرہ عدالت میں جانے سے پہلے مقدمے کا مطالعہ کرتا ہے، پرانے حوالے دیکھتا ہے اور بحث کے لیے تیار ہو کر جاتا ہے۔ ایسے

ہی کل کی گفتگو تو ہر شخص اچھی طرح دھرا لے گا لیکن سال بھر کی پرانی گفتگو کچھ یاد رہے گی اور کچھ بھول جائے گی۔

۳۔ اصول اولیت (Primacy) : جو تجربہ سب سے پہلے ہوا ہو وہ آسانی سے یاد آ جاتا ہے۔ مثلاً جہاز سے اترتے وقت جو تجربہ اجنبیوں کو دیسیوں کے متعلق ہوگا وہ ذہن نشین ہو جائے گا اور جلد یاد آ جائے گا۔ کالج میں داخل ہونے پر جو تجربات پہلے دن ہوتے ہیں وہ کبھی نہیں بھولتے۔ ایسے ہی شادی کی رات کے تجربات بہت ہی کم لوگوں کو بھولتے ہیں اور مرتے دم تک یاد رہتے ہیں۔

۴۔ اصول تأثر (Intensity) : جو چیزیں شدید توجہ اور محویت سے حاصل کی جائیں وہ ضرور یاد رہتی ہیں۔ سکولوں اور کالجوں میں استاد صاحبان اپنے شاگردوں کی توجہ ہر ممکن طریقے سے اپنی طرف کھینچتے ہیں، کبھی وہ آواز اونچی کرتے ہیں اور کبھی نیچی، کبھی نقشوں اور چارٹوں سے مدد لیتے ہیں، کبھی سرخ چاک کا استعمال کرتے ہیں، کبھی متحرک تصاویر دیکھاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ان سب کا مقصد شاگردوں کی توجہ کھینچنا اور سبق ذہن نشین کرانا ہے۔ شاگرد بھی زیادہ توجہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ کتاب یا تجربے کو زیادہ غور سے دیکھتے ہیں۔ ایسا تجربہ جس میں اساتذہ اور شاگرد دونوں مل کر کام کریں، شدت سے دماغ میں جگہ لے گا اور آسانی سے یاد آئے گا۔ اب ایک اور مثال لیجیے۔ کسی باپ کا اکلوتا لڑکا فوت ہو جاتا ہے۔ یہ واقعہ اسے کبھی نہیں بھولے گا اور کوئی چیز جو اس واقعہ سے بلاواسطہ متعلق ہوگی بیٹے کی یاد تازہ کر دے گی۔ عاشق کا بھی یہی حال ہے۔ جو ادائیں محبوب کی ادا سے ملتی ہوں وہ اس کے دل میں محبوب کی یاد لے آئیں گی۔ ان واقعات کا تعلق دل کی گہرائیوں سے ہے۔ اس لیے ان کی یاد کبھی نہیں بھولتی۔

متذکرہ بالا چاروں اصولوں پر تجربے ہو چکے ہیں اور ان کی

صداقت کو پایۂ یقین تک پہنچا دیا گیا ہے۔ کالج کے دس مختلف طلبہ کے گروہوں کو ایک فرضی سوانح عمری جو ۷۰ مدات پر مشتمل تھی، سنائی گئی۔ پہلی مدات کو اولیت کا اور آخری کو تاخر کا فائدہ حاصل تھا۔ بعض مدات کو بار بار دہرایا گیا اور انہیں تکرار کا فائدہ ملا۔ بعض مدات کی شدت کو ہاتھ کے اشاروں سے بڑھایا گیا۔ نتائج¹ مندرجہ ذیل چارٹ میں دکھائے گئے ہیں یہ چارٹ اولیت، تأخر، تکرار اور تأثر کا فائدہ ظاہر کرتا ہے۔

اولیت، تأخر، تکرار اور تأثر سے بازیافت میں فائدہ۔

نارمل	۱۰۰%
اولیت:	
پہلی مد	۱۷۵
دوسری مد	۱۲۳
تیسری مد	۱۳۵
تأثر:	
۶۸ ویں مد	۱۲۳
۶۹ ویں مد	۱۰۹
۷۰ ویں مد	۱۲۸
تکرار:	
۳ خواندگیاں	۲۹۷
۴ "	۲۳۶
۵ "	۳۱۵
تأثر:	
۱۔ 'کیا تم نے دیکھا' کہا گیا	۱۵۳

۱۔ ملاحظہ ہو اے۔ آئی جرسلڈ (A. I. Jerseld) کا مضمون Journal of Experimental Psychology، ۱۹۲۹ء۔

آہستہ آواز میں	۹۷
میز پر مکہ مار کر	۱۱۵
ہاتھ کے اشارہ کے ساتھ	۱۱۸
اونچی آواز میں	۱۲۶
وقفہ دے کر	۱۴۳
'اسے دیکھیں' کہہ کر	۱۹۱

۵۔ ان پرانے چار اصولوں کے علاوہ ایک اور اصول بھی ہے جسے سیاق و سباق اور گرد و پیش کے استمرار کا اصول (Identity of Setting Context) کہا جاتا ہے ۔ اگر ایک جانور نے بھول بھلیاں سیکھ لی ہوں اور اس بھول بھلیوں کے اندر کوئی تبدیلی پیدا کر دی جائے تو جانور اندر جانے سے ہچکچائے گا اور اس کی آموزش کو وقتی طور پر دھکا لگے گا ۔ بھول بھلیوں کی روشنی کم یا زیادہ کر دی جائے یا بجلی کی روشنی کو سورج میں بدلا جائے یا تجربہ کنندہ اپنی جگہ سے ہٹ کر کسی اور جگہ کھڑا ہو جائے یا بھول بھلیوں کو اٹھا کر کسی اور جگہ رکھا جائے تو ان تبدیلیوں سے جانور شش و پنج میں پڑ جاتا ہے ۔

تبدیلیٔ ماحول کا اثر انسانوں کی آموزش پر بھی پڑتا ہے ۔ اگر کمرہ وہی نہ ہو یا وقت بدل دیا جائے یا تجربہ کنندہ بدل جائے یا کمرے کی بو میں فرق آ جائے تو یاد کیا ہوا سبق دوبارہ یاد نہیں آتا ۔ سیاق و سباق (Contex) کا اثر بھی بہت پڑتا ہے ۔ ایک دفعہ چند طلبہ کو الفاظ کے جوڑے دکھائے گئے ۔ یہ الفاظ ایسے کارڈوں پر لکھے گئے جن پر الفاظ کے جوڑوں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے حرف بھی کندہ تھے لیکن طلبہ کو کہا گیا کہ وہ چھوٹے حروف کی پرواہ نہ کریں اور انھیں نظر انداز کر دیں ۔ بعد میں کارڈوں سے ان چھوٹے حروف کو بدل دیا گیا ، اب الفاظ کی بازیافت مشکل ہو گئی ۔ ایک اور تجربے میں انہیں طلبہ کو بدلے ہوئے سیاق و سباق میں چہرے اور نام حفظ کرائے

گئے - فلمی رسالوں سے ۳۲ تصویریں کاٹ کر نئے ناموں کے ساتھ پوسٹ کارڈوں پر چسپاں کی گئیں - بعض پوسٹ کارڈ تصویروں والے تھے - ان کی اپنی تصویریں چسپاں شدہ تصویروں کے لیے پس منظر کا کام دیتی تھیں - نتائج دیکھیے -

سیاق و سباق بدلنے سے ۴۸ گھنٹے بعد - تصاویر کے ناموں کی بازیافت پر اثر -

سیاق وسباق (Context)	زیر تجربہ افراد											
	ا	ب	پ	ت	ٹ	ث	ج	چ	ح	خ	د	ذ
بغیر تبدیلی کے	۶	۲	۸	۵	۹	۷	۸	۶	۶	۵	۷	۱۰
تبدیل شدہ	۳	۰	۳	۴	۵	۹	۳	۸	۷	۳	۴	۷

جو تصاویر ا سے ث تک کے لیے سیاق و سباق کو بدلے بغیر استعمال ہوئیں وہ ج سے ذ تک کے لیے تبدیل شدہ سیاق و سباق میں استعمال کی گئیں - اور پھر اس کو الٹ دیا گیا - نتائج سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ماحول کے بدلنے سے کارکردگی پر اثر پڑتا ہے اور بازیافت کم ہو جاتی ہے -

دیکھا گیا ہے کہ کھلاڑی اپنی گراؤنڈ پر بہترین کھیلتے ہیں دوسرے کی گراؤنڈ پر کھیلنے میں انھیں نقصان رہتا ہے - تاریخ میں مذکور ہے کہ لکھنے سے پہلے بالزک (Balzac) کو راہب کا چغہ ، بفن (Buffan) کو کف اور ڈنر کوٹ اور جائس (Joyce) کو سرجن کا سفید چغہ پہننا ضروری تھا - وگرنہ ان کی قلم نہیں چلتی تھی - پی بی بیلرڈ (P. B. Ballard) نے بیان کیا ہے کہ ایک شخص کئی سال چین میں رہا اور چینی زبان بڑی مشکل سے سیکھی، جب وہ دو سال کے لیے

اپنے ملک گیا تو چینی زبان بالکل بھول گیا ۔ جس کا اسے بہت افسوس تھا ۔ جب وہ واپس چین جانے لگا تو اسے خیال تھا کہ دوبارہ چینی زبان سیکھنے میں وقت لگے گا اور خاصی مشکل ہوگی ۔ لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ چین پہنچتے ہی چینی زبان فر فر بولنے لگا ۔ اس کے علاوہ ایک بیرے کے متعلق کہانی ہے کہ نشہ کی حالت میں ڈبہ کہیں رکھ کر بھول گیا ۔ جب دوبارہ اس نے شراب پی اور نشہ کی حالت میں آیا تو یاد آگیا کہ ڈبہ کہاں رکھا تھا ۔

بازیافت کے موضوعی اسباب :

بازیافت کے سلسلے میں فرد کی ذہنی کیفیت (Mental Set) کی بڑی اہمیت ہے ۔ کونسی چیز یاد آئے گی اور کیسے یاد آئے گی اس کا انحصار فرد کی ذہنی کیفیت ، اس کی دلچسپیوں اور مشاغل پر ہے ۔ بچوں کو مندرجہ ذیل سوال دیں :

$$\frac{36}{17}$$

اور کہیں کہ اسے حل کریں ۔ بچوں کے جواب ۵۳، ۱۹ اور ۶۱۲ ہوں گے ۔ کوئی جمع کرے گا ، کوئی تفریق اور کوئی ضرب دے گا ۔ جو خیال ان کے ذہن میں آئے گا اسی کے مطابق جواب ہوگا ۔ ذہنی کیفیت کے علاوہ ہیجانی کیفیت بھی بڑی اہم ہے ۔ جو شخص عشق میں مبتلا ہوگا وہ سوز سے بھرے ہوئے شعر ورد زبان کرے گا ۔ فلمی گیت اور گانے حفظ کرے گا اور رومان سے بھرے ہوئے افسانے ، پلاٹ اور ناول یاد کرے گا ۔

ان نتائج کو تجربوں سے ثابت کیا جا سکتا ہے ۔ کچھ طلبہ کو نامکمل الفاظ کی فہرستیں دی گئیں ۔ چھوڑے ہوئے حروف انھوں نے

خود پر کرنے تھے (یہ تجربہ شمع رسالہ کے معمہ حل کرنے جیسا ہے)۔ بعض فہرستوں کے اوپر لکھا تھا کہ یہ الفاظ پھلوں کے نام ہیں یا یہ الفاظ امریکی مصنفوں کے نام ہیں یا یہ الفاظ پالتو جانور کے نام ہیں۔ بعض فہرستوں کے اوپر صرف یہ لکھا تھا کہ یہ الفاظ نام کو ظاہر کرتے ہیں۔ جتنا وقت ان فہرستوں کو پر کرنے میں لگا تجربہ کنندہ اسے نوٹ کرتا رہا۔ اس تجربے نے ثابت کیا کہ جن فہرستوں پر ہدایات درج تھیں انھیں پر کرنے میں نسبتاً تھوڑا وقت لگا۔ ان پر ۳۶ سیکنڈ لگے اور جو بغیر ہدایات کے تھیں ان پر ۱ منٹ اور ۱۵ سیکنڈ صرف ہوئے۔

ہدایات سے ایک ذہنی کیفیت (Set) بن جاتی ہے اس سے آموزش اور بازیافت میں فائدہ رہتا ہے، جہاں ہدایات نہیں دی جاتیں وہاں بازیافت مشکل ہو جاتی ہے۔

گواہوں کی شہادتوں میں موضوعی عناصر کا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ گواہی دیتے وقت نہ صرف ان پڑھ اور اجڈ طبقہ غلطیاں کرتا ہے بلکہ خاصا پڑھا لکھا اور سوجھ بوجھ رکھنے والا طبقہ بھی یا تو واقعہ ٹھیک طرح پر بیان نہیں کر سکتا یا ان کی بازیافت ادھوری اور ناقص ہوتی ہے۔ عدالتوں کی شہادتوں کا بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ حافظہ کس قدر غیر یقینی فعل ہے۔ ڈیشیئل (Dasheill) بیان کرتا ہے[۱] کہ ایک شخص دن دھاڑے کئی لوگوں کی موجودگی میں قتل ہو گیا۔ لوگوں نے قاتل اور مقتول دونوں کو اچھی طرح دیکھا لیکن اس کے باوجود شہادت دیتے وقت ان لوگوں کے بیانات میں شدید اختلاف تھا۔ کوئی سے دو گواہوں نے بھی ایک جیسی گولی چلتی

۱۔ ملاحظہ ہو اس کی Fundamentals of General Psychology

۳۹۔ ۱

نہیں دیکھی - کسی نے کہا چار گولیاں چلیں - کسی نے کہا گولی چلنے سے پہلے مقتول قاتل کی طرف دوڑا - بعض نے کہا کہ مقتول اپنی جگہ سے نہ ہلا - قتل کے بعد سب کے سامنے قاتل ایک خاتون کی کار میں بیٹھ کر ہوا ہو گیا - لیکن جب تک یہ واقعہ خود اس خاتون نے نہ بتایا، کسی کو یاد نہ تھا - پھر بعض کے خیال میں قاتل کے ہاتھ خالی تھے، بعض کے خیال میں ان میں کوئی شے پکڑی ہوئی تھی -

اس شہادت میں اچھا خاصا تضاد تھا اور تضاد بھی ان گواہوں کی گواہی میں تھا جو موقعہ پر موجود تھے اور ہر چیز اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے -

اس سلسلے میں اور بھی دلچسپ تجربے ہوئے ہیں - ایک تجربے میں ایک پروفیسر لیکچر دے رہا ہے ، کوئی شخص جماعت میں داخل ہوتا ہے اس کی الماری سے کتاب نکال کر چلا جاتا ہے - لڑکے اپنے کام میں لگے رہتے ہیں کسی نے توجہ دی کسی نے نہ دی - ہفتہ کے بعد لڑکوں سے کہا گیا کہ واقعہ بیان کریں - ان کے بیانات میں عجیب مضحکہ خیز تضاد تھا - ان تجربوں سے منجملہ اور چیزوں کے یہ بھی واضح ہوا کہ جتنا کم سن اور کند ذہن گواہ ہوگا اتنی ہی اس کی شہادت غیر یقینی ہوگی - یہی وجہ ہے کہ بچے کی شہادت کو قابل اعتماد نہیں سمجھا جاتا - یاد رہے کہ ذہانت کا کم درجہ ، گواہ کے ہیجانی رویے، واقعہ کے ہیجانی تلازم اور جرح کے سوالات شہادت پر اثر ڈالتے ہیں - بے وقوف گواہ کی گواہی خطرے سے خالی نہیں ہو سکتی - گواہ کی اپنی ہیجانی زندگی، آیا وہ خبطی ہے یا باخبر، غصیلا ہے یا جوشیلا، گواہی کو اپنے رنگ میں رنگ دے گی - اس کے علاوہ واقعہ کی نوعیت اور اس کے ہیجانی تلازم بڑے زبردست عناصر ہیں - اگر کسی واقعہ میں ہندو اور مسلمان دونوں دلچسپی رکھتے ہوں جیسے کشمیر کے معاملہ میں ہے، تو دونوں فریق کی شہادت تعصب سے پاک نہیں ہوسکتی -

علاوہ ازیں وکیلوں کی جرح ، ان کے جواب سوال اور چھان بین شہادت کو کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں ۔

شبیہ حافظہ (Memory Images) :

اگر بازیافت کے وقت نفسی عمل کے حسی خصائص بھی ساتھ آ جائیں تو اسے شبیہ حافظہ کہا جاتا ہے ۔ مثلاً نیلگوں آسمان کو یاد کریں یا وائلن کی سروں کو ، یا کافور کی بو کو ، یا ہاتھوں پر رکھی ہوئی برف کو ، تو ایسا نظر آئے گا جیسے اصل دوبارہ زندہ ہو گیا ۔ یعنی نیلگون آسمان یاد کرتے ہوئے نیلا آسمان پھر سامنے آ جاتا ہے ۔ وائلن کی سریں یاد کرتے ہوئے از سر نو سریں سنی جاتی ہیں ۔ کافور کی بو یاد کرتے ہوئے دوبارہ بو سونگھنے لگتے ہیں ، علیٰ ہٰذالقیاس ۔ یاد کرتے وقت حسی خصائص بھی زندہ ہو جاتے ہیں لیکن ہر آدمی کا شبیہ ایک جیسا شوخ اور واضح نہیں ہوتا ۔ ووڈورتھ کہتا ہے[1] کہ ایک یونیورسٹی میں لائبریری بڑی خوبصورت ہے ۔ ہر صبح شام لڑکے وہاں سے گزرتے ہیں اور اس کی خوبصورتی سے حظ اٹھاتے ہیں ۔ تجربے کے لیے چند لڑکوں کو کہا جاتا ہے کہ لائبریری کا سامنے کا حصہ یاد کریں اور بتائیں کہ اس میں کتنے ستون ہیں ۔ لڑکے جواب نہیں دے سکتے اور کہتے ہیں کہ انھیں ستون گننے کو تو کہا ہی نہیں گیا تھا ۔ جن لڑکوں کی شبیہ حافظہ دوسروں سے بہتر تھی انھوں نے اس سوال کا جواب تھوڑا بہت دے لیا ۔ ہر شخص جانتا ہے کہ عمارتیں دیکھ کر ایک عام تأثر حاصل کر لیا جاتا ہے، تفصیلات نوٹ نہیں کی جاتیں، ہاں اگر کوئی تفصیل یاد رکھنی مقصود ہو تو اسے غور سے دیکھ لیا جاتا ہے ورنہ عام تأثر لے کر لوگ آگے گزر جاتے ہیں ۔

---

۱ ۔ ملاحظہ ہو اس کی Psychology ، صفحہ ۵۹۳ ۔

ابتدائی شبیہ حافظہ (Primary Memory Image) :

عام طور پر مہیج کے بعد شبیہ آتی ہے مثلاً مری دیکھ لی پھر جب کبھی مری کا خیال آیا اس کا نقشہ ذہن کے سامنے آ گیا ۔ لیکن ابتدائی شبیہ حافظہ میں معاملہ ذرا مختلف ہے ۔ مہیج کے بعد کچھ عرصہ تک شبیہ نہیں آتی بلکہ وہی نفسی تجربہ کچھ دیر تک قائم رہتا ہے ۔ مثلاً گفتگو ختم ہو جاتی ہے لیکن پھر بھی چند منٹ تک آواز سنائی دیتی رہتی ہے، جیسے کوئی گونج ہو ۔ ممکن ہے یہ تاخر (Recency) کا اثر ہو ۔ اگر کوئی چاہے کہ اس گفتگو کو دھرایا جائے تو دھرائی بھی کی جا سکتی ہے حالانکہ جب یہ گفتگو ہو رہی تھی ، اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی ۔ جماعت میں کئی لڑکے غیر حاضر دماغ ہوتے ہیں ، پروفیسر لیکچر دے رہا ہوتا ہے ، ان کی توجہ کسی اور طرف مرکوز ہوتی ہے ۔ لیکن اگر استاد ان سے پوچھ بیٹھے کہ میں نے ابھی کیا کہا تھا تو وہ ٹھیک ٹھیک بتا دیتے ہیں یہ ابتدائی شبیہ حافظہ کا کرشمہ ہے ۔

ابتدائی شبیہ حافظہ کی صلاحیت چودہ سال کے بچوں تک بہت زیادہ ہوتی ہے بعد میں کم ہو جاتی ہے ۔ اگر بچے کسی منظر کو آدھ منٹ کے لیے دیکھیں اور پھر آنکھیں بند کر لیں تو نظارہ ویسا ہی دیکھیں گے ۔ وہی پھول ، وہی سبزہ ، وہی اشجار اور وہی روشیں دیکھی جائیں گی ۔ اگر اس منظر کی تفصیلات دریافت کی جائیں تو بچے اس طرح جواب دیں گے جیسے وہ نظارہ دوبارہ دیکھ رہے ہیں اور دیکھ دیکھ کر جواب دے رہے ہیں۔ بچوں کا تخیل بڑی حد تک فوٹوگرافک ہوتا ہے مکمل طور پر تو اسے فوٹوگرافک نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس تخیل میں رد و بدل ممکن ہے اور بچے کی دلچسپیاں اس پر اثر انداز ہوتی ہیں ۔ مثلاً ابتدائی شبیہ حافظہ میں دیکھی ہوئی چیز شاید اصل کے مقابلہ میں بڑی ہو جائے ، اس کا رنگ اصل کے مقابلہ میں زیادہ شوخ ہو جائے یا وہ حرکت کرنے لگے، جب کہ اصل چیز حرکت نہیں کر رہی تھی ۔ اس

طرح چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں آ جاتی ہیں لیکن پھر بھی ایسی کوئی تبدیلی نہیں آئے گی جس سے اشیائے مدرکہ پہچانی نہ جا سکیں ۔

ہیں اور مفصل شبیہ حافظہ کو (Eidetic) شبیہ صحیحہ کہتے ہیں اور جن لوگوں میں یہ صلاحیت ہو انہیں ایڈیٹک (Eidetic) اشخاص کہا جاتا ہے ۔ چودہ سال کی عمر کے بعد یہ صلاحیت گھٹ جاتی ہے ۔ شباب میں کچھ آثار باقی رہتے ہیں ، بعد میں بالکل ختم ہو جاتے ہیں ۔

واہیت (Hallucination) : کئی لحاظ سے واہیت کو ابتدائی شبیہ حافظہ کی مثل قرار دیا جا سکتا ہے ۔ کیونکہ اس میں بھی شبیہ بڑی واضح اور مفصل ہوتی ہیں ۔ مثلاً رات کو قبرستان سے گزریں تو قبر کے پتھروں پر بھوت بیٹھا دکھائی دے گا ۔ جب اس پتھر کے قریب پہنچیں تو کچھ بھی نہیں ہوتا ۔ واہیت کو فضول اس لیے کہا جاتا ہے کہ خارج میں اس کا وجود نہیں ہوتا ۔ لیکن اگر اس کی حقیقت زیر بحث نہ لائیں تو اس میں جو شبیہ پیدا ہوتی ہیں وہ ادراک کے بالکل مثل ہوتی ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ جتنی دیر واہیت قائم ہو اس میں مطلق احساس نہیں ہوتا کہ جو کچھ دیکھا جا رہا ہے یہ خواب و خیال ہے ۔

خوابوں میں بھی ابتدائی شبیہ حافظہ آتی ہیں ان میں بھی واہیت کی بھرمار ہوتی ہے ۔ لیکن واہیت کا پتہ تب لگتا ہے جب آنکھ کھول کر اپنے گرد و پیش کا معائنہ کیا جاتا ہے اور خواب کی کوئی چیز نظر نہیں آتی ۔ بعض ذہنی مریضوں کو بڑی کثرت سے وہم ہوتا ہے ۔ آندھی کے شور میں انہیں گالیاں سنائی دیتی ہیں ۔ فضا میں بھوت پریت یا فرشتے دکھائی دیتے ہیں حالانکہ وہیں کھڑے دوسرے آدمی نہ گالیاں سنتے ہیں نہ بھوت پریت یا فرشتے دیکھتے ہیں ۔

اس قسم کے غلط ادراک کو واہیت (Hallucination) کہا جاتا ہے ۔ اس میں شبیہ حافظہ ہوتی ہیں ۔ غلطی سے ان کو ادراکات تصور کر لیا جاتا ہے ۔ واہیت کی ساخت تو گزشتہ تجربات سے ہوتی ہے لیکن

جو کچھ دیکھا یا سنا جاتا ہے اس کا وجود خارج میں نہیں ہوتا۔

بازیافت میں مشکلات:

تقریباً ہر انسان کو کبھی نہ کبھی بازیافت کی مشکل ہوتی ہے۔ ایکٹر اپنے مکالمے خوب رٹ کر سٹیج پر آتے ہیں۔ لیکن تماشائیوں کا ہجوم دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں اور لقمے کے باوجود منہ سے الفاظ نہیں نکال سکتے۔ افسر سے تعارف کراتے وقت کئی پرنسپل صاحبان اپنے سٹاف کا نام بھول جاتے ہیں۔ پھر پروفیسر صاحبان کو خود اپنا نام بتانا پڑتا ہے۔ ایک لڑکے کا بیان ہے کہ شادی کے وقت وہ اپنی دلہن کا نام بھول گیا۔ اس فراموشی کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔

۱۔ ہیجانات کی فراوانی بھی بازیافت میں مزاحمت کرتی ہے۔ ایکٹر کی فراموشی لوگوں کے خوف سے ہے۔ ایسے ہی کمرہ امتحان میں بعض طلبہ کو سوالوں کے جواب یاد نہیں آتے۔ جب وقت ختم ہو جاتا ہے اور باہر نکل آتے ہیں تو جواب فوراً ذہن میں آجاتے ہیں۔ ان کی فراموشی کی وجہ بھی گھبراہٹ، بے چینی اور خوف و ہراس ہے۔

۲۔ بعض دفعہ متضاد عادات مزاحمت کا باعث بنتی ہیں۔ کوئی مقرر تقریر کر رہا ہے، بولتے بولتے ایک لفظ دو متضاد لسانی عادات کو بیدار کر دیتا ہے۔ ان کا تضاد فراموشی کا باعث بنتا ہے کیونکہ فوری طور پر مقرر فیصلہ نہیں کر سکتا کہ کس لفظ یا جز فقرہ کو بولا جائے، لہٰذا وہ سلسلۂ تقریر کھو بیٹھا ہے۔

۳۔ لاشعوری الجنھوں سے بھی بازیافت میں دقت ہو سکتی ہے۔ لوگوں کے نام یا واقعات اس وجہ سے بھی یاد نہیں آتے کہ ان کے پیچھے لاشعوری عوامل کارفرما ہیں۔ فرض کیا کوئی کہانی یا واقعہ معاشرتی طور پر ممنوع ہے، اس کے خلاف مشروط رد عمل پیدا ہو جائے گا اور جب کبھی اس کی بازیافت کی کوشش کی جائے گی، مخالف مشروط رد عمل اسے یاد نہیں آنے دے گا۔ مثلاً ہمارا کوئی دشمن بامِ عروج

کو پہنچ جاتا ہے ۔ تہذیب کا تقاضا ہے کہ جو دشمنی اور نفرت کا جذبہ اس شخص کے خلاف ہمارے دل میں موجود ہے اسے بھول جائیں اور اسے جا کر مبارکباد پیش کریں ۔ لیکن تجزیہ نفس کے ماہروں کا خیال ہے کہ دشمنی اور نفرت کو مٹایا نہیں جا سکتا صرف دبایا جا سکتا ہے ۔ لہٰذا شعور سے نہیں بلکہ لاشعور سے یہ جذبات اپنا انتقام لیں گے ۔انتقام لینے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ دشمن کا نام یاد نہ آئے ۔ لہٰذا مبارکباد کہنے کے لیے جب دشمن کے گھر کی طرف روانہ ہوتے ہیں اور راستے میں کسی سے اس کے گھر کا راستہ پوچھنا چاہتے ہیں تو اس شخص کا نام یاد نہیں آتا اور جو گلی محلے کا پتہ لکھ کر رکھا تھا اسے ساتھ لانا بھول گئے ہوتے ہیں ۔ اس مثال میں بازیافت کی دقت لاشعوری معاندانہ جذبات سے پیدا ہوئی ۔

شناخت (Recognition) :

شناخت میں سامنے پڑی ہوئی شے کو یاد کیا جاتا ہے اور اس لحاظ سے شناخت بازیافت سے مختلف ہے ۔ بازیافت میں گزشتہ واقعات کو یاد کیا جاتا ہے ان واقعات کا سامنے موجود ہونا ضروری نہیں ۔ شناخت میں کوئی شے سامنے موجود ہوتی ہے اور اسے پہچاننا پڑتا ہے یعنی اس کے متعلق جو معلومات یاد ہوں انہیں دوبارہ یاد کرنا پڑتا ہے ۔ انہی معلومات کی بنا پر کہنا پڑتا ہے کہ آیا یہ چیز وہی ہے جسے ماضی میں دیکھا یا سنا گیا تھا یا کچھ اور ۔ تجربوں میں معمول کو ایسی چیزیں دکھائی جاتی ہیں جو اس نے پہلے دیکھ رکھی ہوں ۔ لیکن دیکھی ہوئی چیزوں کے ساتھ کچھ اور چیزیں بھی ملا دی جاتی ہیں اور معمول سے کہا جاتا ہے کہ وہ دیکھی ہوئی چیزوں کی شناخت کرے ۔ ایک آزمائش میں بارہ مردوں اور عورتوں کے چہروں کی تصاویر دکھائی جاتی ہیں ۔ پھر ان تصویروں کو اور تصویروں میں ملا کر پیش کیا جاتا ہے اور جو بارہ تصویریں دیکھی جا چکی ہیں انہیں پہچاننا پڑتا ہے ۔

اس تجربہ میں ضروری ہے کہ اور تصویریں جو ملائی جائیں وہ پہلی تصویروں سے ملتی جلتی ہوں۔ یعنی ان کے چہرے پہلی تصویروں کے چہروں سے زیادہ مختلف نہیں ہونے چاہییں۔

شناخت کے تجربے عدالتوں میں بھی ہوتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ اس نے قاتل یا ڈاکو کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے یا جو بھینس چرائی گئی ہے وہ اس نے دیکھ رکھی ہے اور اسے پہچان سکتا ہے۔ سچائی معلوم کرنے کے لیے قاتل یا ڈاکو کو دوسرے آدمیوں میں ملا دیا جاتا ہے اور جس آدمی نے دعویٰ کیا ہو کہ اس نے اسے دیکھ رکھا ہے، اسے شناخت کرنے کو کہا جاتا ہے۔ اسی طرح بھینس کو دوسری بھینسوں میں ملا دیا جاتا ہے اور اس شخص کو کہا جاتا ہے کہ شناخت کرے۔

شناخت غلط بھی ہو سکتی ہے۔ دور سے کوئی آدمی آتا دیکھتے ہیں تو مشابہت کی بنا پر اسے دوست سمجھ لیتے ہیں۔ جب وہ شخص قریب آتا ہے تو غلطی کا احساس ہو جاتا ہے۔ یہاں پر غلطی کی بنا اشاروں کی غلط تشریح سے ہوئی۔ ایسے ہی بعض دفعہ احساس ہوتا ہے کہ یہ جگہ پہلے دیکھی ہوئی ہے یا یہ چیز پہلے کبھی چکے ہیں یا کرچکے ہیں حالانکہ نہ تو وہ جگہ پہلے دیکھی ہے اور نہ ہی وہ چیز پہلے کبھی کی یا دیکھی ہے۔ مغالطے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ موجودہ ماحول میں کچھ ایسے خصائص ہیں جو ماضی میں مشاہدہ کی ہوئی چیزوں کے خصائص سے ملتے جلتے ہیں۔ یہ مماثلت ماضی کی بازیافت کا موجب بنتی ہے۔ اس سے دھوکا ہوتا ہے کہ جو چیزیں ہم دیکھ رہے ہیں وہ پہلے بھی دیکھ چکے ہیں۔

دیانت داری معلوم کرنے کے لیے شناخت کے تجربے ہوتے ہیں۔ مثلاً کتابوں کی ایسی فہرست تیار کریں جس میں اصلی کتابوں کے نام بھی ہوں اور بچے کو کہیں کہ ان کتابوں پر نشان لگا دے جو اس

نے پڑھ رکھی ہیں۔ بعض بچے اصلی کتابوں کے علاوہ جعلی کتابوں پر بھی نشان لگا دیتے ہیں ان سے ان کی دیانت داری کا پتہ چلتا ہے۔ اسی قسم کی آزمائش بڑی عمر کے طلبہ کو بھی دی جا سکتی ہے۔ کچھ فقرے ان طلبہ کی کتابوں سے لیجیے اور کچھ فقرے دوسری کتابوں سے اور طلبہ کو کہیے کہ جو فقرے انہوں نے پڑھ رکھے ہیں ان پر نشان لگا دیں۔ طلبہ کتابوں کا شوق دکھانے کی خاطر ایسے فقروں پر بھی نشان لگا دیں گے جو انہوں نے کبھی نہیں پڑھے۔ یہاں وہ پکڑے جاتے ہیں۔

یاد کی تربیت (Training of Memory) :

ہر آدمی کی خواہش ہے کہ اس کا حافظہ بہتر سے بہتر طریقے پر کام کرے۔ کوئی شخص نام بھول جاتا ہے لیکن چہرے یاد رکھتا ہے یا چہرے بھول جاتا ہے لیکن نام یاد رہ جاتے ہیں۔ بعض آدمی تفصیلات بھول جاتے ہیں لیکن عام اصول یا تأثرات یاد رہ جاتے ہیں۔ بعض آدمیوں کو عام اصول یاد نہیں رہتے لیکن چھوٹی چھوٹی چیزیں یاد رہ جاتی ہیں۔ طلبہ کو حافظے کی عام شکایات رہتی ہیں۔ انہیں کتابیں یاد نہیں رہتیں۔ پروفیسر صاحبان کے لیکچر یاد نہیں رہتے، توجہ منتشر رہتی ہے کتاب سامنے کھلی پڑی ہے اور دماغ غیر حاضر ہے، باہر کی یونیورسٹیوں میں طلبہ کو صلاح مشورہ دینے کے باقاعدہ شعبے ہوتے ہیں۔ ان شعبوں میں ماہرین نفسیات کے علاوہ اور ماہر بھی ہوتے ہیں۔ طلبہ کی شکایات کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور انہیں رفع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے حافظہ ازبس ضروری ہے لہٰذا حافظے کی اصلاح کے لیے دوائیاں تجویز کی جاتی ہیں اور کچھ کورس وضع کیے جاتے ہیں۔ دوائیوں کا فائدہ یہ ہے کہ اگر کسی فعلیاتی نقص سے حافظہ میں رکاوٹ پیدا ہوگئی ہو تو وہ نقص دور ہو جانے کا

اور حافظہ اپنی اصلی طاقت پر کام کرے گا ۔ لیکن اگر کوئی طبیب یہ دعویٰ کرے کہ اس کی دوائیاں حافظہ کی قوت بڑھا سکتی ہیں تو یہ دعویٰ باطل ہے ۔ کیونکہ حافظے کی قوت فطری ہے اسے بڑھانا ممکن نہیں - ولیم جیمز (William James) کا کہنا ہے کہ خواہ کتنی ہی مشق کیوں نہ کی جائے حافظہ بہتر نہیں ہو سکتا ۔ حافظہ ایک فعلیاتی صفت ہے اس میں کوئی تبدیلی واقعہ نہیں ہو سکتی ۔ مس سمتھ (Miss Smith) اور میکڈوگل (Mc Dougall) کے تجربات اس کے برعکس ہیں ، ان کا خیال ہے کہ مشق سے حافظہ بڑھ سکتا ہے ۔ لیکن دور حاضرہ کے ماہرین کا خیال ہے کہ حافظہ کی اصلاح نفسیاتی اصولوں کے اتباع سے ہو سکتی ہے نہ کہ حافظہ کی قوت بڑھانے سے[1] ۔ لہٰذا دوائیوں کی نسبت نفسیات کی طرف زیادہ رجوع کرنی چاہیے ۔ جو لوگ حافظے کو بہتر بنانے کے مدعی ہیں ان کے سسٹم اور کورس سراسر جدید نفسیات پر مبنی ہیں ۔ جن اصولوں کو نفسیات نے تجربے اور مشاہدے سے پایۂ ثبوت کو پہنچا دیا ہے ان کا اطلاق مختلف طریقوں سے بتایا جاتا ہے ۔ لہٰذا جو اصول یاد کی کفایت کے سلسلے میں بیان کیے گئے ہیں یا جو طریقے بازیافت اور شناخت کو بہتر بنانے کے لیے تجویز کیے گئے ہیں وہی اصول اور طریقے یاد کی تربیت کریں گے اور اسے بہتر بنائیں گے ۔ ان اصولوں کو اگر ایک جگہ جمع کریں تو حسب ذیل ہوں گے ۔

۱۔ یاد رکھنے کا ارادہ یا نیت ہونی چاہیے ۔ فرض کیا آپ امتیاز سے ملتے ہیں ، علیک سلیک ہوتی ہے ، خیریت پوچھی جاتی ہے ، اس کے بعد امتیاز آپ کے ذہن سے نکل جاتا ہے ۔ دوبارہ جب امتیاز ملے گا تو اس کا چہرہ تو یاد آ جائے گا لیکن نام یاد نہیں آئے گا ۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ آپ کا حافظہ کمزور ہے بلکہ اصلی وجہ یہ ہے کہ امتیاز کو یاد رکھنے کی نیت آپ میں نہ تھی ۔ جب بھی کسی چیز کو سرسری یا

۱۔ ملاحظہ ہو (Munn) کی Psychology ، صفحہ ۱۶۳ ۔

اوپری نگاہ سے دیکھیں گے تو وہ چیز ذہن سے اتر جائے گی ۔ ایک پرنسپل کے متعلق سنا ہے کہ خواہ اس کے اپنے طالب علم دس سال بعد ملیں ، ان کے نام ، مضامین اور دلچسپیاں اسے یاد ہوتی تھیں ۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ جب لڑکا اس کے کالج میں داخل ہوتا تھا وہ اس کا نام پوچھتا تھا ، باپ کا نام ، پیشہ ، آمدنی وغیرہ پوچھ لیتا ۔ اس کے علاوہ اور معلومات جو لڑکے سے بالواسطہ یا بلاواسطہ متعلق ہوں پتہ لگا لیتا تھا ۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ جو طالب علم اس کے کالج میں ایک دفعہ داخل ہو گیا وہ اسے بھولتا نہیں تھا۔ طالب علم کو یاد رکھنے کا ارادہ اور نیت پرنسپل کے ذہن میں موجود تھی ۔

۲۔ نیت کے ساتھ توجہ کی بھی ضرورت ہے ۔ امتیاز کو اگر یاد رکھنے کی نیت ہو تو اسے غور سے دیکھیں، اس کے خد و خال، چال ڈھال اور طرز گفتگو کا غور سے مطالعہ کریں، امتیاز یاد رہے گا ۔ کلاس میں بعض لڑکے سارا وقت لیکچر کے نوٹس لیتے رہتے ہیں ۔ سمجھتے کم ہیں، لکھتے زیادہ ہیں ۔ یہ طریقہ اچھا نہیں سوچنے اور سمجھنے کی زیادہ کوشش کرنی چاہیے ۔ جو نکتہ اچھا لگے اسے درج کرنا چاہیے ۔ سوچا سمجھا ہوا مواد بہ نسبت بے معنی مواد کے زیادہ دیر یاد رہتا ہے ۔ کئی نکمے طالب علموں کی کاپیاں استاد کے نوٹوں سے بھری ہوتی ہیں ۔ انہیں فائدہ کم ہوتا ہے کیونکہ مواد کو سمجھا نہیں گیا ۔

۳۔ اشباح (Imagery) سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے ۔ امتیاز کا فوٹو اپنے ذہن میں آتار لیجیے ، اس کی آنکھیں، اس کا چہرہ، اس کے بال وغیرہ ایسے ذہن میں نقش ہونے چاہئیں، جیسے ذہن ایک کیمرہ ہے اور تصویر آتار رہا ہے ۔ بعض حافظہ کی سکیمیں اس بات کی ہدایت کرتی ہیں کہ جس شے کو یاد رکھنا ہو اسے مضحکہ خیز حالات میں دیکھیں ۔ جس قدر اشباح ہوگا اتنا ہی وہ زیادہ دیر یاد رہے گی ۔ سنیما میں دیکھی ہوئی چیزیں دیر تک یاد رہتی ہیں، اس کی وجہ بھی یہی ہے ۔ آج کل تعلیم

میں بصری سمعی امداد (Audo-visual Aids) پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ نقشوں چارٹوں اور ماڈلوں سے جو سبق پڑھایا جاتا ہے وہ طلبہ کو جلد یاد ہو جاتا ہے اور دیر سے بھولتا ہے ۔

۴۔ جو چیز یاد رکھنی ہو اس کا رشتہ ناطہ دوسری اشیا سے جوڑئیے، جس قدر ممکن تلازم ہوں پیدا کیجیے ۔ ولیم جیمز (William James) کا کہنا ہے کہ جس قدر تعلق ایک چیز کا دوسروں سے ہوگا اتنا ہی وہ زیادہ یاد رہے گی ۔ بہتر حافظہ وہ ہوگا جس کے تلازم کثیر اور مضبوط ہوں ۔ مثلاً امتیاز کو مختلف مقامات میں دیکھیں اس کی مختلف دلچسپیاں ملاحظہ کریں ۔ اس کے استادوں ، دوستوں ، عزیز و اقارب کو ذہن میں جگہ دیں ۔ امتیاز آپ کے ذہن میں مستقل جگہ حاصل کر لے گا ۔

بعض لوگوں کو حیرانی ہوتی ہے کہ کیسے کسی نے دو گھنٹوں میں کتاب پڑھ لی اور اس کے مطالب پا لیے ۔ کتاب اس قدر جلد ختم کرنے والے عموماً اس شعبہ کے ماہر ہوتے ہیں جس سے کتاب تعلق رکھتی ہے ۔ ماہر ہونے کی حیثیت سے پہلے ہی اپنے شعبہ کا بے شمار علم ان کے ذہن میں موجود ہوتا ہے ۔ لہٰذا کتاب پڑھتے وقت گزشتہ علم ان کے کام آتا ہے اور وہ کتاب جلد ختم کر لیتے ہیں ۔

حافظہ کی سکیموں میں بھی تلازم پر بڑا زور دیا جاتا ہے ۔ پہلے ایسی فہرست یاد کرائی جاتی ہے جس کے الفاظ منطقی طور پر ایک دوسرے سے مربوط ہوں ۔ یہ فہرست ایسے یاد ہونی چاہیے کہ آگے سے پیچھے اور پیچھے سے آگے بغیر رکاوٹ کے جایا جا سکے اور لفظ خواہ کسی جگہ پر ہو اسے فوراً یاد کیا جا سکے ۔ جب اس قدر قابو حاصل ہو جائے تو جو چیزیں آپ نے یاد رکھنی ہیں انہیں ایک ایک کرکے علیحدہ علیحدہ لفظ کے ساتھ ٹانک دیں ۔ جب یہ لفظ یاد آئیں گے تو ان کے ساتھ بندھی ہوئی چیزیں بھی یاد آ جائیں گی ۔

۵۔ قافیہ بندی اور ترنم بھی حافظہ کو مدد دیتے ہیں ۔ گرائمر کے اصول یوں تو خشک ہوتے ہیں لیکن جب انہیں نظم میں پرو دیا جائے تو جلد یاد ہو جاتے ہیں ۔ مثلاً منطق کے درست ضروب (Valid Moods) یاد کرنے کے لیے ایک چھوٹی سی نظم ہے ۔ یہ ایف ۔ اے کی منطق کی سب کتابوں میں پائی جاتی ہے۔ اس سے ضروب آسانی سے یاد ہوجاتے ہیں ۔ فارسی گرائمر یاد کرنے کے لیے لمبی سی نظم ہے اس کا پہلا شعر ہے :

فارسی مصدر کا جانو یہ نشاں آخر اس کے تن ہے یا دن میری جاں

اس نظم سے فارسی گرائمر کے موٹے موٹے اصول خوب یاد ہو جاتے ہیں ۔

۶۔ غیر مسلسل اعادے مسلسل اعادوں سے بہتر رہتے ہیں ۔ لہٰذا طالب علموں کو اپنا کام تمام سال پر پھیلانا چاہیے ۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ امتحان کے قریب کتابیں کھول لیں اور رٹا لگا لیا ۔ رٹا جلد بھول جاتا ہے اس کے پاؤں نہیں ہوتے ۔

۷۔ جہاں تک ممکن ہو مواد کو دھرانا چاہیے اور قرأت کرنی چاہیے صرف یہی نہ کہیں کہ ”آپ سے مل کر طبیعت خوش ہوئی ۔“ بلکہ ”امتیاز صاحب آپ سے مل کر طبیعت خوش ہوئی ۔“ ایسے ہی یہ نہ کہیں ”اب کب ملاقات ہوگی“ بلکہ ”امتیاز صاحب اب کب ملاقات ہوگی ۔“ رخصت کے وقت صرف یہ نہ کہیں ”خدا حافظ“ بلکہ ”امتیاز صاحب خدا حافظ“ جتنی بار امتیاز کا نام دھرائیں گے اتنا ہی زیادہ یاد رہے گا ۔ پس نیت اور توجہ کے ساتھ دھرانا اور قرأت بھی نہات ضروری ہے ۔

۸۔ مطالعہ کے بعد آرام کرنا چاہیے یا سو جانا چاہیے ۔ اس سے مزاحمت نہیں ہوتی اور مواد ذہن نشین ہو جاتا ہے ۔ ٹائم ٹیبل میں لگاتار گھنٹے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں ۔ اگر مضامین مختلف ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن اگر مضامین ایک جیسے ہوں تو مسلسل پیریڈ علم کو ذہن نشین نہیں ہونے دیتے ۔ تھوڑا سا آرام کا وقفہ ہر پیریڈ کے بعد ہونا چاہیے ۔

۹۔ اگر کوئی لمبا باب مطالعہ کرنا ہو تو تفصیلی مطالعہ سے پہلے باب کا مجموعی جائزہ لینا چاہیے۔ اگر باب کے آخر میں خلاصہ دیا ہو تو اسے پہلے پڑھ لینا چاہیے یا اگر مندرجات میں سرخیاں دی ہوئی ہوں تو سرخیاں دیکھ لینی چاہییں اس سے سمجھنے میں مدد ملے گی اور یاد داشت بہتر ہوگی۔

انتقال تربیت (Transfer of Training) :

کیا ایک قسم کا مواد یاد کرنے میں مہارت دوسری قسم کا مواد یاد کرنے میں مدد دیتی ہے؟ کیا ایک سلسلہ کی تربیت دوسرے سلسلہ میں منتقل ہو سکتی ہے؟ ووڈورتھ کا خیال ہے کہ انتقال اگر ہوتا بھی ہو تو بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ درحقیقت جو چیز انتقال ہوتی ہے وہ خود اعتمادی کے علاوہ روابط اور گروپ بنانے کی عادت ہے۔ کچھ طلبہ کو بے معنی مواد اور نظمیں یاد کرنے کے لیے دی گئیں۔ یاد کرنے کے بعد وہ دوسرے مواد بھی آسانی سے یاد کر لیتے ہیں۔ لیکن یاد کرواتے وقت انھیں با خبر اور ہوشیار رہنے کی تلقین کی گئی۔ انھیں یہ بھی کہا کہ وہ مطالب سمجھیں، گروپ بنائیں، مواد کو زبانی دہرائیں اور جزئی طریقے کی بجائے کلی طریقہ استعمال کریں۔ جن چیزوں کی ہدایت کی گئی وہ نفسیات آموزش اور حافظہ کے عام اصول ہیں۔ یہ اصول جہاں کہیں بھی استعمال ہوں گے فائدہ دیں گے۔

پس ایک مواد یاد کرنے کی مہارت دوسرے مواد یاد کرنے میں پوری طرح منتقل نہیں ہوتی۔ انتقال کی بنیاد مشابہت پر ہے۔ جس قدر مواد ملتا جلتا ہو اسی قدر ایک مواد کی مہارت دوسرے میں فائدہ دے گی۔ لہٰذا اگر کام کے ان خصائص پر توجہ دی جائے جو مشترک ہوں تو فائدہ رہتا ہے۔ اس صورت میں اصولوں، تکنیک اور رویوں پر زور دینا ہوگا۔

انیسواں باب

فکر (Thought)

فکر اور ادراکی آموزش :

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ تخیلات ہر انسان کے خواب ہائے بیداری، نیند کے خوابوں اور یاد میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ لیکن فکر میں بھی تخیلات کی کچھ کم اہمیت نہیں۔ ہر قسم کا فکر خصوصاً ابتدائی صورتوں میں کسی نہ کسی شکل میں عملی مسائل سے وابستہ ہے۔ اگر ہمارا واسطہ دیکھے بھالے یا حل شدہ مسئلہ سے دوبارہ پڑے تو سوچ بچار کی ضرورت نہیں ہوتی، جبلی یا عادتی طریقے سے نپٹا جا سکتا ہے، بعض دفعہ اضطراری فعل ہی کافی ہوتا ہے۔ مثلاً کھانا کھانے یا لکھنے یا آنکھ جھپکنے کے لیے غور و فکر کی ضرورت نہیں۔ کھانا کھانا جبلت ہے، لکھنا ایک عادت ہے اور آنکھ جھپکنا محض اضطراری فعل ہے۔ لیکن اگر حالات نئے ہوں اور ان سے پہلے شناسائی نہ ہو چکی ہو تو جبلت، عادت اور اضطراری فعل کام نہیں دیں گے۔ کیونکہ غیر مانوس حالات میں ہمیں تامل سے کام لینا پڑتا ہے، ہماری سرگرمیاں معمول کے مطابق نہیں چل سکتیں۔ راستے میں رکاوٹیں ہیں۔ مشکلات ہیں لہٰذا رد عمل میں تاخیر ہوگی۔ مہیج اور رد عمل کے درمیانی وقفہ میں سوچ بچار ہوتا ہے۔ پلان بنائے جاتے ہیں تجاویز وضع ہوتی ہیں تا کہ رکاوٹیں دور ہوں اور راستہ ہموار ہو جائے۔

غور و فکر کا طریقہ انسانی کردار کو جانوروں سے الگ کر دیتا ہے۔ چوہوں اور بلیوں پر آموزش کے تجربے ہوئے ہیں، ان سے صاف

پتہ چلتا ہے کہ جانور مقصد حاصل کرنے کے لیے پے در پے حرکات کرتے جاتے ہیں۔ ان کی سرگرمی تب ختم ہوتی ہے جب انہیں کامیابی کی راہ مل جاتی ہے۔ لیکن فکری سطح پر معاملہ برعکس ہے، غور و فکر کے وقت حرکت نہیں کی جاتی بلکہ حرکت کو ختم کر دیا جایا ہے۔ اور انسان خاموشی سے مسئلہ پر غور کرتا ہے۔ جو دلائل اس کے حق میں یا مخالفت میں دیے جا سکتے ہوں انہیں پرکھتا ہے اور کسی نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ اسی طرح اگر تجاویز کئی ہوں تو ہر تجویز کا الگ الگ تجزیہ کر کے ان کا موازنہ کیا جاتا ہے اور جو تجویز بہترین نظر آئے اس پر عمل کیا جاتا ہے۔ تجاویز پر غور کرنا اور کسی نتیجہ پر پہنچنا آسان کام نہیں۔ بعض دفعہ کئی کئی ہفتے بلکہ مہینے اسی کام میں لگ جاتے ہیں تب جا کر کچھ فیصلہ ہوتا ہے۔ پس مہیج سے لے کر رد عمل تک کا وقفہ غور و فکر کی منزل ہے۔ یہ منزل جانوروں میں نہیں آتی۔ لہٰذا ان کا کردار انسانی سطح سے بہت نیچے رہ جاتا ہے۔

مندرجہ بالا بیان سے واضح ہو گیا ہوگا کہ فکر کی ضرورت تب محسوس ہوتی ہے جب حالات نئے اور غیر معمولی ہوں۔ جبلی اور عادتی سطح پر چونکہ حالات معمول کے مطابق ہوتے ہیں سوچ بچار کی ضرورت نہیں پڑتی۔ فرض کیا کہ کالج کا وقت یکدم بدل جاتا ہے، پہلے تو کالج نو بجے لگتا تھا اب ساڑھے سات بجے لگنے لگتا ہے۔ جب ٹائم نو بجے تھا تو آرام سے ہاتھ منہ دھو کر ناشتہ کرکے کالج پہنچ سکتے تھے۔ اب چونکہ ڈیڑھ گھنٹے کا فرق پڑ گیا ہے، معمول کو قائم نہیں رکھا جا سکتا، یا تو سویرے اٹھنا پڑے گا یا منہ ہاتھ دھونے اور ناشتہ کیے بغیر کالج جانا ہوگا۔ اس کے علاوہ اور تجاویز بھی ذہن میں آ سکتی ہیں انہیں بھی زیر بحث لایا جا سکتا ہے۔ اس بحث کے بعد کوئی لائحہ عمل مرتب ہوگا اور اس پر عمل کیا جائے گا۔ ممکن ہے آپ جلد اٹھنا شروع کر دیں یا اگر جلد نہیں اٹھ سکتے تو ناشتہ کیے بغیر کالج پہنچ جائیں اور کسی خالی پیریڈ میں ناشتہ

کر لیں ۔ لیکن خواہ کوئی فیصلہ کریں ، فیصلے سے پہلے سوچا جاتا ہے اور حالات کا کماحقہ جائزہ لیا جاتا ہے ۔

ایک مثال اور لیجیے، ایک شام آپ جب گھر واپس آتے ہیں تو دروازہ باہر سے بند پاتے ہیں ۔ یہ غیر معمولی چیز ہے کیونکہ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا ۔ اب کیا کرنا چاہیے ؟ کئی تجویزیں سوجھتی ہیں ۔ ایک تو یہ ہے کہ باہر بیٹھ جائیں اور چپکے سے انتظار کرتے رہیں ۔ آخر کوئی دروازہ کھولے ہی گا نہ ۔ دوسری یہ ہے کہ نوکر کی تلاش میں ادھر ادھر جائیں، سودا سلف لانے کے لیے وہ بازار گیا ہوگا ، ممکن ہے وہ کہیں پاس کی دکان پر بیٹھا ہو ۔ تیسری یہ ہے کہ اپنے ہمسائے سے پوچھیں کہ معاملہ کیا ہے ۔ شاید نوکر چابی انہیں دے گیا ہو یا کچھ کہہ گیا ہو ۔ یہ تمام تجاویز ذہن میں آتی ہیں ۔ ان سب پر عمل نہیں کیا جاتا ۔ صرف سوچا جاتا ہے اور سوچ کے بعد جو تجویز اچھی لگتی ہے اس پر عمل کیا جاتا ہے ۔

پہلی مثال کی طرح یہ مثال بھی واضح کرتی ہے کہ غیرمعمولی حالات میں سوچ بچار کی ضرورت پڑتی ہے ۔ اس وقت تمام جسمانی حرکات بند کر دی جاتی ہیں ۔ صرف ذہن فعال ہوتا ہے ۔ وہی سوچ بچار کرتا ہے اور کسی نتیجہ پر پہنچتا ہے ۔ یاد رہے کہ دن کا اکثر وقت سوچ بچار میں گزرتا ہے ۔ لیکن ہمیں اس کا احساس نہیں ہوتا ۔ ہم صرف نتائج کو چاہتے ہیں اور جن ذرائع سے نتائج تک پہنچتے ہیں انھیں بھلا دیا جاتا ہے ۔ لیکن ماہر نفسیات کا کام ہے کہ وہ نتائج سے ہٹ کر ان عوامل کو دیکھے جو ان نتائج کا باعث ہیں ۔

ادراک کا تعلق حال سے ہے ۔ یاد کا تعلق ماضی سے ہے ۔ لیکن فکر کا تعلق اگرچہ حال اور ماضی سے بھی ہے لیکن اس کا تعلق خاص طورپر مستقبل سے ہے ۔ سوچ بچار کی باگ ڈور مقصد کے ہاتھوں میں ہے ۔ جیسا مقصد ہوگا ویسا ہی سوچ بچار ہوگا ۔ چونکہ عام طور پر مقصد کا تعلق

مستقبل سے ہوتا ہے۔ لہٰذا سوچ بچار کا رخ بھی آنے والے زمانے سے متعلق ہوگا۔ مقصد کا تو ہر انسان کو پتہ ہوتا ہے لیکن مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ کیسے اس مقصد تک پہنچا جائے۔ مثلاً ہر طالب علم کو پتہ ہے کہ میرا مقصد اپنی جماعت میں کامیاب رہنا ہے۔ لیکن یہ کامیابی کیسے ممکن ہو سکتی ہے، اس کے لیے فکر کی ضرورت ہے۔ فکر میں تخیلات سے واسطہ پڑتا ہے۔ ان تخیلات کا تعلق کسی مادی شے سے نہیں بلکہ ان خصائص سے ہوتا ہے جو ایک قسم کی مادی اشیا میں بطور قدر مشترک پائے جائیں۔ مثلاً اوپر کی مثالوں میں جب تخیلات کے بل بوتے پر مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو تخیلات کا تعلق زید بکر سے نہیں بلکہ زید بکر کے ان خصائص سے ہے جو دونوں میں پائے جاتے ہوں۔ ایسے خصائص کو مادی اشیا سے الگ کر کے عمومی حیثیت دے دینا ذہن کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ جب ہمارے تخیلات عمومی جامہ پہن لیتے ہیں تو انھیں تعقلات (Concepts) کہا جاتا ہے۔ مثلاً لڑکا ایک تعقل ہے کیونکہ لڑکے کا لفظ صرف سجاد، اعجاز اور امتیاز کے لیے ہی استعمال نہیں ہوتا بلکہ تمام لڑکوں کے لیے خواہ وہ کسی ملک، قوم یا زمانے سے تعلق رکھتے ہوں۔ لیکن ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ پہلے تو تعقلات آتے ہیں بعد میں استدلال (Reasoning) کیونکہ خود تعقلات استدلال کا ماحصل ہیں۔ بعض اشیا ایک دوسرے کی مانند پائی جاتی ہیں، بعض ایک دوسرے سے مختلف۔ مشابہت اور اختلاف کی بنا پر مقابلہ کیا جاتا ہے۔ مقابلہ تجرید (Abstraction) کی طرف لے جاتا ہے اور تجرید سے تعقلات بنتے ہیں۔

فکر میں تحلیل (Analysis) اور ترکیب (Synthesis) کا مقام: جیسا کہ ظاہر ہے ہمیں فکر میں ان حالات سے واسطہ پڑتا ہے جو ماضی کے عین مطابق نہیں ہوتے بلکہ کچھ ایسے عناصر کے حامل ہوتے ہیں جو کئی لحاظ سے نادر، غیر متوقع اور غیر معمولی ہوتے ہیں۔ فکر بھی اپنے اندر

ندرت لیے ہوئے ہوتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب فکر کا سرچشمہ ماضی اور گزرے ہوئے واقعات ہیں تو فکر میں ندرت کہاں سے آتی ہے ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یوں تو فکر کا سر چشمہ ماضی اور اس کے واقعات ہیں لیکن ماضی کو یاد کرتے وقت اس کے واقعات اور معلومات کی تشریح اس طرح کی جاتی ہے اور پھر ان کو ایسے انداز سے جوڑا جاتا ہے کہ ایک نئی شے معرض وجود میں آ جاتی ہے۔ تحلیل اور ترکیب سے فکر ماضی اور حال سے آزاد ہو کر نئی راہیں تجویز کرتا ہے اور اچھوتی باتیں پیدا کرتا ہے۔

واٹسن کو لیجیے، اس نے اُبلتی ہوئی دیگچی کے ڈھکنے کو اوپر نیچے ہوتا دیکھا۔ بھاپ سے ڈھکنا اُٹھتا تھا اور بھاپ نکل جانے پر نیچے گرتا تھا۔ یہ اس کا ادراک تھا - اس ادراک کی تحلیل کی گئی تو معلوم ہوا (۱) پانی گرم ہونے پر بھاپ بن جاتا ہے - (۲) جس چیز کو بھاپ لگے وہ دھکیلی جاتی ہے یا حرکت میں آتی ہے۔ واٹسن نے ان دو عناصر کی ترکیب نئے طریقے سے کی۔ اس نے ایسی کلیں بنائیں جن میں عناصر تو یہی دو تھے لیکن کام مختلف طریقے سے کر رہے تھے۔ اس نے وسیع پیمانے پر بھاپ بنائی اور ڈھکنے سے ہزاروں گنا زیادہ بوجھل چیزوں کو حرکت میں لے آیا۔ اس طرح اسٹیم انجنوں کی ایجاد ہوئی۔

ایجادیں معمولی شے نہیں ہوتیں، واٹسن نے کئی مہینے سوچ بچار میں گزارے تب کہیں جا کر سٹیم انجن بن سکا۔ نفسیاتی طور پر اس کا فکر تحلیل اور ترکیب کا مجموعہ ہے۔ اس نے اپنے ادراک کا تجزیہ کیا اور تحلیل شدہ عناصر کی ترکیب نئے طریقے سے کی۔ پس فکر میں دو موٹے موٹے مدارج ہیں۔ پہلا درجہ تو تحلیل کا ہے دوسرا ترکیب کا۔ فکر کے ذریعے ہمارے ماضی کے ٹکڑے ہوتے ہیں۔ پھر ان ٹکڑوں سے ایسا کل بنایا جاتا ہے جس کی مثال ماضی اور حال میں نہیں ملتی۔ فرض کیا آپ نے مکان بنانا ہے، پتھر پہاڑوں سے ملتا ہے لکڑی جنگلات سے۔ لیکن جب

تک پتھر اور لکڑی نہ کاٹیں گھر نہیں بنے گا۔ کاٹنے کے بعد پتھروں اور لکڑی کا ڈھیر لگانے سے مکان نہیں بن جاتا۔ جب تک پتھروں کو تراش کر ایک دوسرے کے مطابق نہ بنا لیں دیوار نہیں بنے گی، اسی طرح لکڑی کو کاٹ کر شہتیر بنانے ہوں گے، انھیں کیلوں سے جوڑنا ہوگا تب کہیں جا کر چھت پڑے گی۔ تمام گھر لکڑی اور پتھر سے بنتے ہیں۔ لیکن ہر گھر کا ڈیزائن اپنا ہوتا ہے۔ ڈیزائن علیحدہ بنانے کے لیے سوچ کی ضرورت ہے۔ فکر کا بھی یہی حال ہے۔ پہلے ادراک کے ٹکڑے کیے جاتے ہیں۔ پھر ان ٹکڑوں کو نئی شکل دے کر جوڑا جاتا ہے اس سے جو عمارت بنتی ہے وہ اپنی مثل آپ ہوتی ہے۔

پس فکر کے خصائص مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) اس کا تعلق مقصد سے ہوتا ہے۔

(۲) مقصد کے حصول کے لیے مختلف راہیں سوچی جاتی ہیں۔

(۳) ماضی کے واقعات یاد کیے جاتے ہیں تا کہ ان سے استفادہ کیا جائے۔

(۴) ان واقعات کی تنظیم اور ترکیب نئے طریقے سے کی جاتی ہے۔

(۵) اس سلسلے میں زبان سے مدد لی جاتی ہے۔

تلازم خیالات (Association of Ideas): فکر کا بغور مطالعہ کیجیے۔ اس میں خیالات کا سلسلہ نکلے گا۔ یہ سلسلہ کیسے بنتا ہے؟ کیسے ایک خیال دوسرے کی یاد دلاتا ہے، دوسرا تیسرے کی، تیسرا چوتھے کی حتیٰ کہ ایک سلسلہ یا تواتر بن جاتا ہے؟ خیالات کے اس تعلق کو تلازم کہا جاتا ہے۔ اگر ایک خیال دوسرے کی یاد ذہن میں لے آتا ہے تو دونوں میں تلازم ہے۔ اگر ایک ہی وقت میں یا فوراً ایک دوسرے کے بعد کوئی دو تأثرات محسوس کیے جائیں تو جب ان میں سے ایک تأثر پیدا ہوگا تو دوسرے کو بھی کھینچ لائے گا۔ لیکن اگر ایک خیال کا تعلق کئی خیالات سے پیدا ہوگیا ہو تو جب یہ

خیال آئے گا تو باقی سب خیالات میں سے جن کے ساتھ اس کا رشتہ قائم ہے صرف چند خیالات یاد آئیں گے ۔ یہ کیوں ؟ سارے خیالات یاد کیوں نہیں آتے ؟ اس سوال کا جواب پہلے کسی اور سلسلے میں دیا جا چکا ہے ۔ خیالات کا انتخاب تواتر، تاخر، وضاحت، دلچسپی وغیرہ پر منحصر ہے ۔ لڑکے کا خیال ذہن میں لڑکی کا خیال لے آئے گا کیونکہ یہ دونوں خیال ہمارے دماغوں میں اکثر اکٹھے رہتے ہیں ۔ لیکن اگر ہم نے ابھی ابھی پڑھا ہو کہ لڑکے قوم کا سرمایہ ہیں تو لڑکے کا خیال ، اصول تاخر کی وجہ سے قوم کا خیال ذہن میں لے آئے گا اور ہم اپنے گزرے ہوئے وقت کو یاد کریں تو شاید لڑکے کا خیال ہمیں اپنا لڑکپن یاد کرا دے ۔ ان عناصر کے علاوہ فکر کے سلسلہ میں ایک اور نہایت اہم عنصر مناسبت (Relevance) کا ہے ۔ غور و فکر میں لڑکے کا خیال صرف انہیں خیالات کو ذہن میں لائے گا جن کا تعلق نفس مضمون سے ہوگا ۔ اگر ہم نے لڑکے کی نفسیات بیان کرنی ہو تو صرف وہی خیالات یاد آئیں گے جو نفسیات سے تعلق رکھتے ہوں ۔ پس تلازم خیالات میں جو چیز سب سے زیادہ اہم ہے وہ مقصد یا غایت کا تصور ہے اور ایسا تلازم جو مقصد کے زیر تحت کام کرے منضبط تلازم (Controlled Association) کہلاتا ہے ۔ اس کے برخلاف آزاد تلازم (Free Association) ہے جو کسی مقصد کے تحت نہیں ہوتا (کم از کم اس کا مقصد شعور میں نہیں ہوتا) ایک خیال کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا ، علیٰ ہذالقیاس خیالات کا تانتا بندھ جاتا ہے ۔ لیکن اس خیالات کے سلسلہ میں کوئی شعوری مقصد نظر نہیں آتا ۔ تجزیہ نفس کے ماہر آزاد تلازم سے بڑے کام کی چیزیں دریافت کر لیتے ہیں ۔ مثلاً اس کے استعمال سے پتہ چلتا ہے :

(۱) انکار کی عادت کا ۔ آیا کوئی شخص خود بیں ہے یا ایثار پسند ۔
(۲) آیا زیر تجربہ فرد کو وقوعہ کا علم ہے یا نہیں ۔

(۳) خلطوں (Complexes) کا -

خواب ہائے بیداری اور نیند کے خواب آزاد تلازم کی مثالیں ہیں - خواب ہائے بیداری میں ہوائی قلعے تعمیر ہوتے ہیں - ایک ڈرامہ کھیلا جاتا ہے جس کا ہیرو خود خواب کا مالک ہوتا ہے - ڈرامہ کی تعمیر کچھ اس ڈھب کی ہوتی ہے اور ڈرامے کے اداکار ایسے کام کرتے ہیں کہ خواب کا مالک ہر حالت میں کامران و شادمان نظر آتا ہے - اپنے دشمنوں سے خوب بدلہ لیتا ہے - محبوبہ کو اپنے بس میں کر لیتا ہے اور آن کی آن میں مشکل سے مشکل مہم سر کر لیتا ہے - جو چیز بیداری کی حالت میں اسے نصیب نہیں وہ خواب میں دستیاب ہو جاتی ہے - بعض دفعہ ان خوابوں میں آدمی اپنے آپ کو کامیاب نہیں خیال کرتا بلکہ مظلوم اور مجبور - اس کی کیا وجہ ہے ؟ کامیاب بننے کا محرک تو صاف نظر آتا ہے - مظلومیت کا محرک کیا ہوگا ؟ اگر کسی شخص کی تھوڑی سی نکتہ چینی ہوئی ہے تو خوابوں میں وہ کیوں چیونٹی کا پہاڑ بنا دیتا ہے ؟ ووڈورتھ کہتا ہے کہ جس شخص کی ذرا سی ٹانگ کھینچی گئی ہے وہ ایک مضحکہ خیز پوزیشن میں ہے - اب اگر اس واقعہ کو وہ بڑھا چڑھا کر پیش کرے تو اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے - پس ووڈورتھ کے خیال میں خواہ کوئی شخص اپنے آپ کو ہیرو سمجھے یا ناکام ہیرو - دونوں حالتوں میں ہیرو ہے اور اس لحاظ سے اس کے جزبۂ اثبات خود کی تسکین ہوتی ہے -

خواب ہائے بیداری میں کئی قسم کے محرک تشفی پاتے ہیں - اس لیے ہم انہیں بالکل آزاد نہیں کہہ سکتے - یوں خراب ہائے بیداری ایک قسم کے تخیلات کے کھیل ہیں - زندگی کی تلخیوں سے گھبرا کر ان کے دامن میں انسان پناہ لیتے ہیں - لیکن بعض لوگ تخیل اور حقیقت میں تمیز نہیں کر سکتے ، خیالات کی دنیا کو حقیقی سمجھ بیٹھتے ہیں اور طرح طرح کے واہموں میں مبتلا ہو جاتے ہیں - جیسے خواب کی دنیا میں وہ

پائے خاں بنے ہوئے ہیں ویسے ہی حقیقی دنیا میں بھی رہتے ہیں ۔ یعنی ان لوگوں کے لیے تخیل ہی حقیقت بن گیا ۔

نیند کے خوابوں میں دماغی تفاعل بہت نچلی سطح پر ہوتا ہے ۔ لہٰذا کھوٹے کھرے کی تمیز باقی نہیں رہتی اور نہ ہی تخیل اور حقیقت میں فرق کیا جا سکتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ خوابوں کو حقیقی سمجھ لیا جاتا ہے ۔ خوابوں میں کہانی اور پلاٹ ہوتا ہے جسے تجزیہ نفس کے ماہرین اشاروں کے طور پر لیتے ہیں ۔ ان اشاروں کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور ان کی تہہ میں جو مطلب ہوتا ہے اسے واضح کیا جاتا ہے ۔ فرائڈ ہر چیز کو جنسی نقطہ نگاہ سے دیکھتا ہے ۔ لہٰذا ان اشاروں کا مطلب بھی جنس اور اس کے اظہار میں پاتا ہے ۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ خوابوں سے ہمارے محرکات کی تسکین ہوتی ہے ۔ لیکن یہ خیال کر لینا کہ خواب صرف جنسی محرک کی تسکین کر رہے ہیں اور کسی کی نہیں ، مبالغہ آمیز بیان ہے ۔ کچھ خواب بیرونی مہیجات سے پیدا ہو جاتے ہیں ۔ مثلاً گھڑی کی ٹک ٹک سے آرکسٹرا کا خواب آ سکتا ہے ۔ لیکن اگر اس خواب کو کریدا جائے تو فرائڈ کے پیرو کار یہاں بھی جنسی محرکات نکال لیں گے ۔

دونوں قسموں کے خوابوں میں خیالات کا سلسلہ گزشتہ واقعات پر مبنی ہے لیکن ان واقعات کو ترکیب دیتے وقت ندرت پیدا ہو جاتی ہے ۔

خوابوں کو مقصدی فکر سے الگ رکھنا چاہیے کیونکہ فکر میں کسی مسئلہ کو حل کرنے کی خواہش شعوری طور پر موجود ہوتی ہے ۔ خوابوں کی دنیا لاشعور کی دنیا ہے ۔ اس میں شعور کو دخل نہیں اور نہ ہی کسی مسئلہ کو حل کرنے کا ارادہ ۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ فکر کی دنیا میں تخیلات کی ضرورت نہیں ۔ حقیقت میں معاملہ اس کے برعکس ہے کیونکہ تخیلات کے بغیر فکر کا وجود ممکن نہیں ۔ سائنس ہو یا فلسفہ تخیلات کے بغیر چارہ کار نہیں ۔ سائنس

کو لیجیے اس کی ابتدا حقائق سے ہے اور انتہا انکشافات اور ایجادات پر ۔ جہاں تک حقائق کو اکٹھا کرنے کا تعلق ہے مشاہدہ اور تجربہ درکار ہے ۔ لیکن جہاں تک انکشافات کا تعلق ہے تخیلات کی ضرورت ہے ۔ یہ ضرورت تین طریقوں سے محسوس ہوتی ہے :

۱۔ زیر غور مسائل سے جن گزشتہ واقعات کا تعلق ہے انھیں یاد کیا جاتا ہے ۔

۲۔ اصولوں اور قوانین کو یاد کیا جاتا ہے ۔ مثلاً حساب کا سوال نکالتے وقت مناسب فارمولوں کو یاد کیا جاتا ہے ۔

۳۔ جب مسئلہ پر غور کرنے کے بعد کوئی پروگرام مرتب کر لیا جاتا ہے تو دل ہی دل میں تخیلات کا سہارا لے کر اس پروگرام کا جائزہ لیا جاتا ہے ۔

استدلال (Reasoning) :

استدلال سے مراد نتائج اخذ کرنا ہے یعنی دو یا دو سے زیادہ حقائق یا اصولوں کو لے کر یا کچھ حقائق اور کچھ اصولوں کو لے کر ان کا مفہوم سمجھنا اور ان سے نتیجہ برآمد کرنا ہوتا ہے ۔ خواہ استدلال استخراجی قسم کا ہو یا استقرائی قسم کا ، نتیجہ مواد سے نکالا جاتا ہے اور یہ مواد یا تو حقائق پر مشتمل ہوتا ہے یا اصولوں پر یا دونوں پر ۔ استدلال کے ذریعہ سے جو کچھ مقدمات (Premises) میں مخفی طور پر موجود ہوتا ہے اسے عیاں اور واضح کیا جاتا ہے ۔

جب استدلال کی تشریح کی جاتی ہے تو اس میں مندرجہ ذیل عناصر ملتے ہیں :

۱۔ مواد اکٹھا کرنا ۔
۲۔ مواد کو ترتیب دینا ۔
۳۔ ترتیب یافتہ مواد کا مفہوم دریافت کرنا ۔
۴۔ نتیجے کی پڑتال کرنا ۔

۱- استدلال میں پہلا قدم موزوں اور مناسب مواد اکٹھا کرنا ہے۔ اس مطلب کے لیے مشاہدے، تجربے یا شہادت (Testimony) کی ضرورت پڑتی ہے۔ سائنس داں ہر ممکن طریقہ استعمال کرتا ہے اور جہاں کہیں سے مواد ملے اسے حاصل کر لیتا ہے۔ جیسا کہ اس باب کے شروع میں ذکر آ چکا ہے۔ فکر کی ضرورت تب محسوس ہوتی ہے جب مسئلہ نیا ہو یا موقعہ محل غیرمانوس ہو یا راستے میں رکاوٹیں آ پڑیں۔ ایسے موقعوں پر ہر انسان سوچتا ہے، دماغ کو ادھر ادھر دوڑاتا ہے تا کہ کوئی حل یا راستہ سوجھ جائے۔ پرانے واقعات یاد کیے جاتے ہیں۔ بعض اشیا یا ان کے خصائص کو دوبارہ دیکھا جاتا ہے، موقعہ کا تجزیہ ہوتا ہے۔ غرض کہ جو تدبیر بھی سوجھے اسے اختیار کر لیا جاتا ہے۔

بعض نفسی ماہر اس ابتدائی منزل پر استدلال اور آموزش بہ سعی و خطا میں کوئی فرق نہیں دیکھتے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو بڑا فرق نکلے گا۔ سعی و خطا میں تمام ممکن طریقوں پر عمل ہوتا ہے۔ فکر میں ہر ایک پر غور ہوتا ہے، عمل نہیں ہوتا۔ مثلاً جب چوہے کو پنجرے میں رکھتے ہیں تو وہ خوراک کی خاطر ہر ممکن راستہ اختیار کرتا ہے اور آخرکار ایسا راستہ معلوم کر لیتا ہے جو خوراک تک پہنچا دیتا ہے لیکن یہ طریقہ انجینئر یا سماجی مفکر کا نہیں۔ فرض کیا ملک سے جہالت دور کرنے کے لیے منصوبہ چاہیے۔ سماجی مفکر کو کئی تدبیریں سوجھیں گی، وہ ہر ایک پر غور کرے گا، موافق اور مخالف پہلوؤں کا جائزہ لے گا اور ذہن میں ہی فیصلہ کر لے گا کہ ان تمام تدبیروں میں سے کون سی تدبیر بہترین ثابت ہوگی۔ لیکن اس فرق کے باوجود استدلال اور سعی و خطا میں مماثلت بھی ہے۔ دونوں کا مقصود ایک ہی ہے۔ دونوں مقصد کو حاصل کرنا چاہتے ہیں، گو ایک میں مقصد شعوری سطح پر ہے دوسرے میں نہیں۔

غور و فکر کے راستہ میں رکاوٹیں اکثر آتی ہیں۔ اس کی کئی

وجوہات ہیں (۱) بعض دفعہ حالات کا ٹھیک پتہ نہیں ہوتا۔ مشاہدے کے باوجود کوئی راستہ نہیں سوجھتا۔ لہذا مختلف راہیں اختیار کرنی پڑتی ہیں اور ان پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص جنگل میں راستہ گم کر لیتا ہے۔ اِدھر اُدھر دیکھنے کے باوجود اسے صحیح راستہ نہیں ملتا وہ کبھی یہ راستہ لے گا کبھی وہ۔ (۲) فکر کرتے وقت ہمیں اصولوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یہ اصول عام طور پر مفروضے ہوتے ہیں ان کی وجہ سے مسئلہ کو غلط لے لیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر طلبہ ہڑتال کر دیں تو لڑکوں کے متعلق ہر پرنسپل کے ذہن میں کچھ مفروضے ہوتے ہیں۔ انھی مفروضوں سے وہ ہڑتال کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش کرے گا۔ ممکن ہے یہ مفروضے بے سروپا ہوں اور مسئلہ کو زیادہ الجھا دیں۔ (۳) مختلف تجاویز کو پوری طرح آزمایا نہیں جاتا۔ ایک تجویز کو لے کر اسے راستے میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس طرح پتہ نہیں چلتا کہ آیا یہ تجویز صحیح تھی یا غلط، مثلاً کئی مریض کبھی ایک ڈاکٹر کا علاج کرتے ہیں کبھی دوسرے کا۔ تھوڑی دیر اس کی دوا کی، تھوڑی دیر اس کی۔ کسی ڈاکٹر کی دوا بھی پوری استعمال نہیں کرتے۔ اس طرح وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ کون سی دوا نے فائدہ کیا یا کون سی دوا بیکار ثابت ہوئی۔ دوا کا پورا کورس کیا جائے تب پتہ چلے گا آیا دوا نے اثر کیا یا نہیں۔

۲- جب مواد اکٹھا ہو جائے تب اس کی صف بندی اور تنظیم کرنی چاہیے۔ اگر مواد بکھرا پڑا ہو، اس میں کوئی ترتیب یا نظام نہ ہو تو اس سے کچھ فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ ہر سائنسدان اپنے مواد کو مختلف جماعتوں میں رکھ کر اسے استعمال میں لاتا ہے۔ مثلاً نفسیات کا ماہر ہر قسم کے مشاہدات اور تجربات سے نفس اور کردار کے متعلق حقائق فراہم کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ حقائق کی صف بندی کرتا ہے۔ کچھ حقائق محرکات سے تعلق رکھتے ہیں، کچھ ہیجانات سے، کچھ حسیات

ہے، کچھ ادراک سے وغیرہ وغیرہ۔ اگر یہ جماعت بندی عمل میں نہ لائی جائے تو نفسیات علم کی بجائے ایک کباڑ خانہ بن جائے۔

۳۔ مواد کی فراہمی اور جماعت بندی سے ہمارا کام ختم نہیں ہو جاتا۔ ضروری نہیں کہ جب مواد اکٹھا ہو جائے اور اس کی ترتیب عمل میں آ جائے تو اس کا مفہوم اور مطلب بھی واضح طور پر سمجھ میں آ جائے۔ مفہوم سمجھنے کے لیے بلندیٔ فکر کے ساتھ بلندیٔ تخیل کی بھی ضرورت ہے۔ جب تک سائنس دان کو ایسا خیال نہیں سوجھے گا جو منتشر حقائق کو ایک لڑی میں پرو دے، وہ اپنے مواد سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکے گا۔ نیوٹن سے پہلے لاکھوں انسانوں نے زمین کی طرف چیزوں کو گرتے دیکھا تھا، لیکن کسی کو نہ سوجھا کہ ان مظاہرات کی تہہ میں کشش ثقل کا اصول کار فرما ہے۔ جو چیزیں سائنس دان کے مشاہدہ میں آتی ہیں وہی عام آدمی کے مشاہدے میں بھی آتی ہیں۔ لیکن سائنس دان اپنی وسیع اور بالغ نظری سے ان مشاہدات کا مطلب سمجھ لیتا ہے۔ عامی انسان اس ملکہ سے محروم ہے۔

۴۔ مفہوم پا لینے کے بعد اس کی پڑتال ضروری ہے۔ اس کے دو طریقے ہیں۔ (الف) جو نتیجہ ایک ذریعے سے اخذ کیا گیا ہے اب اس کو کسی دوسرے ذریعہ سے اخذ کیا جائے۔ مثلاً سوال حساب کے طریقے سے نکالا گیا ہے اب اس کو الجبرے کے طریقے سے نکالا جائے۔ اگر دونوں طریقوں سے ایک ہی جواب نکلے تو جواب کی پڑتال ہو جائے گی۔ (ب) جو نتیجہ نکالا گیا ہے اس کی پڑتال تجربی شواہد سے ہو سکتی ہے۔ مثلاً آئن سٹائن (Einstien) نے ریاضیاتی فارمولوں سے ثابت کیا کہ جب سورج کی شعاعیں ایک خاص مدار سے گزریں گی تو ان میں جھکاؤ ہوگا۔ اس نتیجہ کی پڑتال اس طرح ہوئی کہ ایک دفعہ سورج گرہن ہوا تو مختلف سائنس دان مختلف مقامات پر بڑی طاقتور دوربین لے کر بیٹھ گئے۔ جو مشاہدات اس وقت حاصل ہوئے ان سے آئن سٹائن کے مفروضے کی

تصدیق ہو گئی ۔

آلات فکر (Tools of Thought) : اگر فکر سے مراد تخیلات کی روانی ہو تو فکر کوئی تکلیف دہ امر نہیں کیونکہ تخیلات تو خود بخود ایک تواتر سے ذہن میں آ جاتے ہیں ۔ لیکن اگر فکر سے مراد مسائل اور مشکلات کا حل ہو تو اس جیسا دقت آمیز شاید ہی کوئی نفسی فعل ہوگا ۔ لیکن انسانی ذہن نے کئی چیزیں فکر کو آسان بنانے کے لیے تراش لی ہیں ۔ ان میں سے پہلی چیز تو زبان ہے ۔ الفاظ ایک قسم کے اشارے ہیں جو اشیا ، مواقع یا خواص کے متعلق استعمال کیے جاتے ہیں ۔ ان کی مدد سے دیکھی اور ان دیکھی چیزوں کے متعلق سوچ سکتے ہیں ۔ انسانوں کو جو آموزش کے سلسلے میں حیوانوں پر برتری ہے اس کا سبب الفاظ کا استعمال ہے ۔ بھول بھلیوں میں انسان تو کہہ سکتا ہے کہ یہ راست یا چپ ہے ۔ آگے یا پیچھے جانا چاہیے ۔ یہاں مڑنا ٹھیک رہےگا وغیرہ وغیرہ ۔ جانور الفاظ استعمال نہیں کر سکتے ۔ اسی لیے ان کی ترقی محدود دائرے سے آگے نہیں بڑھتی ۔ لہذا الفاظ کی بدولت ہمارے فکر میں بڑی سہولت پیدا ہو جاتی ہے ۔ لیکن کبھی کبھی الفاظ دھوکا بھی دے دیتے ہیں ۔ کوئی خوبصورت لفظ یا محاورہ ہاتھ آ جاتا ہے اور ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ معاملہ سمجھ میں آ گیا ۔ اس کے علاوہ مبہم الفاظ ہیں جن کا اصلی مطلب وہ نہیں ہوتا جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے ۔ کچھ شیخی خوری ، سوگ ، نعرہ بازی اور گند اچھالنے کے الفاظ ہیں جو تعصبات ابھارتے ہیں اور صحیح طور پر سوچنے نہیں دیتے ۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ محض الفاظ کا استعمال فکر کی دلیل نہیں ۔ کئی لوگ، تقریریں رٹ کر پلیٹ فارم پر آ جاتے ہیں اور فر فر بولتے جاتے ہیں ۔ ان کی تقریر الفاظ کا مجموعہ ہوتا ہے اور بس ۔ اس میں فکر نہیں پایا جاتا ۔ فکر کا تعلق الفاظ سے نہیں بلکہ مطالب سے ہے جو الفاظ کی تہہ میں ہوتے ہیں ۔ الفاظ چونکہ مطالب کے حامل ہیں انھیں استعمال میں

لایا جاتا ہے ۔ الفاظ کو صرف الفاظ سمجھ کر رٹ لینا اور دھرا دینا فکر کی علامت نہیں ۔

دوسری چیز جو فکر کو آسان بناتی ہے وہ شکلوں ، چارٹوں اور نقشوں کا استعمال ہے ۔ کسی پیچیدہ معاملہ کو الفاظ میں ادا کرنا یا سمجھنا نہایت مشکل ہوتا ہے ۔ مثال کے طور پر ٹاؤن پلینر (Town Planner) کو لیجیے جو نیا شہر بسانا چاہتا ہے اور اپنا پلان افسران بالا کو نقشہ کے بغیر سمجھا رہا ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس کا بیان خواہ کیسا ہی واضح اور پرلطف کیوں نہ ہو نقشے کے بغیر ادھورا اور نامکمل رہ جائے گا ۔ اسی طرح جغرافیہ کا سبق نقشوں اور چارٹوں کے بغیر طلبہ کے ذہن نشین نہیں ہوتا ۔ اگر کوئی استاد بغیر نقشے کے منطقے پڑھائے تو ایسا نظر آئے گا جیسے وہ کوئی ڈراما دکھانا چاہتا ہے لیکن اداکار سامنے نہیں لاتا ۔ موسیقی میں بھی یہی حال ہے ۔ اس میں چارٹ بنے ہوتے ہیں اور جب تک ہر موسیقار اپنا چارٹ سامنے نہ رکھے پارٹ ادا نہیں کر سکے گا ۔ لفظی بیان کے مقابلے میں نقشوں کو برتری حاصل ہے ۔ نقشوں سے سارے ماحول کا معائنہ ایک ہی نظر میں ہو جاتا ہے ۔ اس کے علاوہ نقشوں سے خاص خاص نقاط اور خصائص کو اجاگر کیا جا سکتا ہے ۔ مثلاً جغرافیہ میں کوئی نقشہ طبعی اور کوئی پولیٹکل حالات کو ظاہر کر سکتا ہے ۔ اس طرح کوئی نقشہ معدنیات ، کوئی جنگلات وغیرہ دکھا سکتا ہے ۔ غرض کہ جس چیز کا مطالعہ منظور ہو اس پر نقشے میں زور دیا جا سکتا ہے ۔ ٹاؤن پلینر بھی شہر کا نقشہ مختلف لحاظ سے بنائے گا کسی میں پانی کا نکاس دکھانا ہوگا ۔ کسی میں سڑکیں، کسی میں سکول، بنک اور ڈاک خانہ، کسی میں عمارتوں کا پلان وغیرہ ۔ نقشے سے پلان کی خوبیاں معلوم ہو سکتی ہیں اور خرابیاں بھی ۔ پلان کی اصطلاح فوری طور پر ہوسکتی ہے ۔ اگر یہی پلان کتابی صورت میں ہو تو کئی دن اس کی خوبیاں اور

برائیاں معلوم کرنے میں لگیں ۔

فکر کو آسان بنانے کا تیسرا ذریعہ تعقلات (Concepts) کا ہے ۔ ہر لفظ کا کچھ مطلب ہوتا ہے خواہ اس مطلب کو ادا کیا جا سکے یا نہ ۔ اس مطلب کو تعقل کہا جاتا ہے ۔ مثلاً ہر شخص لڑکے یا لڑکی کا لفظ استعمال کرتا ہے ، اگر اسے کہا جائے کہ وہ لڑکی یا لڑکے کی منطقی تعریف پیش کرے تو وہ شاید پیش نہ کر سکے گا ، لیکن اس کے باوجود وہ سمجھتا ضرور ہے کہ لڑکا یا لڑکی کسے کہتے ہیں ۔ فرض کیا زہرہ ستارے کا کوئی باشندہ زمین پر آ جاتا ہے اسے یہاں کی ہر شے عجیب و غریب دکھائی دیتی ہے ۔ وہ دیکھتا ہے کہ ایک شے ٹانگوں پر چلتی ہے ۔ منہ سے آوازیں نکالتی ہے ۔ بدن کو ڈھانپے رکھتی ہے اور صبح سے شام تک طرح طرح کے مشاغل میں مصروف رہتی ہے ۔ اس شے کا نام وہ اپنی زبان میں کچھ رکھ لیتا ہے ۔ جو نام رکھا گیا ہے وہ تو محض لفظ ہے لیکن اس لفظ کے پیچھے ایک مفہوم ہے ۔ اس مفہوم کو تعقل کہیں گے ۔ ایک اور مثال لیجیے ۔ کچھ لوگ مہنگائی کا ذکر کر رہے ہیں ۔ اس کے اسباب بیان کرتے ہیں ایک کہتا ہے آج کل روپیہ عام ہوگیا ہے ۔ روپیہ کی قیمت گھٹ گئی ہے ۔ پہلے وقتوں میں روپیہ پیسہ کم تھا تھوڑی سی قیمت پر چیزیں دستیاب ہو جاتی تھیں ۔ اگر غور سے دیکھیں تو اس بات چیت میں مہنگائی کا تعلق روپے پیسے کی فراوانی سے دکھایا گیا ہے ۔ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے ایک لفظ بنا لیا جاتا ہے جسے افراط زر (Inflation) کہا جاتا ہے ۔

تعقلات کی تعمیر میں مندرجہ ذیل مدراج ہیں :

۱۔ مماثلت : کچھ چیزیں ایک دوسرے کے مثل دیکھی جاتی ہیں۔ مثلاً اگر کسی ستارے کا باشندہ زمین پر آ جائے تو وہ بعض اشیا کو ایک دوسرے کے مثل پائے گا ۔ ان کا قد بت ایک جیسا ہوگا ۔ ان کی

حرکات و سکنات ملتی جلتی ہونگی - اسی بنا پر ان اشیا کا الگ مطالعہ کرے گا -

۲- امتیازات : جو چیزیں آپس میں ملتی جلتی ہیں وہ اور قسم کی چیزوں سے مختلف ہوتی ہیں - مثلاً اگر زہرہ کے باشندے نے چند چیزوں میں مماثلت دیکھی تو اس نے یقیناً ان چیزوں کا فرق اور چیزوں سے دیکھا ہوگا -

۳- تجرید : جب اشیا کی باہمی مماثلت دیکھی جاتی ہے اور ان کا دیگر اشیا سے فرق بھی نوٹ کر لیا جاتا ہے تب ان اشیا کو دیگر اشیا سے علیحدہ کر کے کوئی نام دے دیا جاتا ہے - الگ کرنے کو تجرید کہتے ہیں - اس کا استعمال کئی جگہوں پر ہوتا ہے - مثلاً کسی آدمی کو لمبا کہا جاتا ہے - اس وقت اس کے قد کی لمبائی کو باقی تمام خصائص سے الگ کر کے توجہ کا مرکز بنا لیا جاتا ہے یا کسی بچے کا والد سکول میں آ کر بچے کی تعلیمی حالت پوچھتا ہے - اسے بتایا جاتا ہے کہ بچہ کمزور ہے محنت کی ضرورت ہے - یہاں پر کمزور اور محنت دونوں تجریدات ہیں - بچے کی کمزوری کو دیگر خصائص سے الگ کر دیا گیا ہے اسی طرح محنت کو اور چیزوں سے علیحدہ کیا گیا ہے تا کہ جس چیز پر زور دینا ہے دیا جا سکے - یاد رہے کہ تعقلات صرف اشیا کے نہیں ہوتے بلکہ علائق ، خصائص اور کردار کے بھی ہوتے ہیں - علاوہ ازیں دیکھی ہوئی چیزوں کے بھی تعقلات ہیں اور ان دیکھی چیزوں کے بھی -

کئی تجربات بالغوں کے تعقلات پر ہوتے ہیں - ہائیڈ بریڈر (Heidbreder) نے ایک تجربہ بیان کیا ہے - وہ کہتا ہے تصویروں کے نو سٹ لیے گئے اور ہر سٹ کا نام رکھا - ان سٹوں کو باری باری مشین پر دکھایا گیا جب ایک سٹ دکھایا جاتا تھا تو اس کا نام پکارا جاتا تھا - یہ نام اصل میں تعقلات تھے معمول کو اس کا

علم نہ تھا ۔ تین تعقلات تو ٹھوس اشیا کے تھے تین مکانی اشـ
(Spatial Forms) کے اور تین اعداد کے ۔ مندرجہ ذیل چارٹ دیکھیے

ٹھوس اشیا		مکانی اشکال		اعداد	
تعقل	نام	تعقل	نام	تعقل	نام
چہرہ	ریلک	○	فارڈ	۲	لنک
عمارت	لیتھ	∝	سٹاڈ	۵	ڈلٹ
درخت	سلپ	⧧	پران	۶	سائ

اس تجربے سے ثابت ہوا کہ :

۱۔ تعقلات کو آہستہ آہستہ حاصل نہیں کیا جاتا بلکہ یکدم ؛
فوراً ہی حاصل کیا جاتا ہے ۔ ان تصاویر میں جونہی معمول کو تعـ
کا پتہ چلا اس نے استعمال کرنا شروع کر دیا ۔

۲۔ ٹھوس اشیا کے تعقلات جلد یاد ہو جاتے ہیں ۔ اس کے بـ
مکانی اشکال کا نمبر آتا ہے پھر اعداد کا ۔

۳۔ اس تجربے نے دو بہت پرانے تعلیمی اصولوں کو جھٹلا دِ
ایک تو تھا مانوس سے غیر مانوس کی طرف جاؤ، دوسرا تھا ہمیشہ سا
سے مرکب کی طرف جاؤ ۔ جو اصول تجربے نے ثابت کیا وہ تھا ہمیـ
ٹھوس اشیا سے مجردات کی طرف جاؤ ۔

۴۔ اس تجربے سے ولیم جیمز کے اساسی اصول کی تصـد
ہوتی ہے اس اصول کو لوازم بدلنے سے تلازم کا (sociation by
(Varying Concomitants اصول کہا جاتا ہے ۔ اگر ہم یہ چا
کہ کوئی شخص کسی خاص رنگ یا آواز کو پہچانے تو اس رنگـ

آواز کو مختلف حالات میں پیش کرنا چاہیے ۔ مثال کے طور پر استاد ' گول ہونے کا' تصور بچے کو دینا چاہتا ہے تو اس بچے کو گلوب ، گیند ، نارنگی جیسی گول چیزیں دکھائی چاہییں ۔ اسی طرح اگر وہ چار کا تصور دینا چاہتا ہے تو اسے چار سیب ، چار پنسلیں ، چار صفحے یا چار بچے دکھانے چاہییں ۔ ان مثالوں میں لوازم بدلتے ہیں اور جس چیز کا تصور دلانا مقصود ہوتا ہے وہ علیحدہ ہو جاتی ہے ۔ اگر علیحدہ نہ کیا جائے تو تعقل نہیں بنے گا ۔ مثلاً کسی باپ نے اپنے لڑکے سے پوچھا کہ میری انگلیاں کتنی ہیں تو بچے نے جواب دیا مجھے اس کا علم نہیں ، صرف اپنی انگلیاں گن سکتا ہوں ۔ یہ جواب ظاہر کرتا ہے کہ بچے نے انگلیوں کا تصور الگ نہیں بنایا ۔ یعنی اس کا علم تجرید (Abstraction) کی منزل پر نہیں پہنچا ۔ اسی طرح کی کہانی ولیم جیمز نے ایک شخص کے متعلق بیان کی ہے ۔ اس نے میز سے چاقو اٹھا کر عموداً پکڑا اور بچے سے پوچھا یہ کیا ہے ۔ جواب میں بچے نے کہا میں اسے چاقو کہتا ہوں ۔ باپ نے دوبارہ سہ بارہ پوچھا، یہی جواب ملا ۔ پھر اس شخص کو یاد آیا کہ جب وہ جیومیٹری پڑھاتا ہے تو ہمیشہ پنسل سے چیزیں سمجھاتا ہے ۔ تب اس نے پنسل ویسے عموداً پکڑی اور بچے سے پوچھا بیٹا یہ کیا ہے ۔ اس نے فوراً کہا یہ تو عمود ہے ۔ اس بچے کا علم بھی تجرید کی حد تک نہیں پہنچا تھا ۔

تعقلات الگ الگ نہیں رہتے بلکہ اکٹھے ہو کر قوانین اور نظام بناتے ہیں ۔ جب یہ کہا جائے کہ ہر انسان فانی ہے تو اس جملے کے چاروں لفظ تعقلات ہیں۔ ان کو یکجا جمع کرنے سے ایک قانون بن گیا ۔ ایسے ہی جب یہ کہا جائے کہ مثلث کے تین زاویے دو قائموں کے برابر ہیں تو اس جملے میں بھی کئی تعقلات ہیں ۔ جب تک تعقلات اکٹھے نہ کیے جائیں کوئی اصول یا قانون نہیں بنتا ۔ جب قوانین کا نظام

بن جائے تو سائنس بن جاتی ہے ۔ مثلاً ریاضیات میں کئی اصول ہیں لیکن ہر اصول کا رابطہ کسی دوسرے سے ہے ۔ اس لیے کوئی اصول اوپر آ جاتا ہے کوئی نیچے ۔ اس طرح ایک تعقلی نظام معرض ظہور میں آ جاتا ہے ۔ ہر علم میں کوئی نہ کوئی نظام ہوتا ہے ۔ کوئی بڑے اصول ہوتے ہیں کوئی چھوٹے ۔ کوئی اصلی مضمون ہوتا ہے کوئی اس کی شقیں ، وغیرہ وغیرہ ۔ اس کے بغیر علم ، علم نہیں کہلا سکتا ۔

فکر اور زبان (Thought and Language) :

فکر اور زبان کا تعلق اس قدر گہرا ہے کہ بعض ماہرین کے خیال میں فکر کے لیے قطعی ممکن نہیں کہ زبان کے بغیر کوئی قدم اٹھا سکے عام طور پر زبان کو فکر کا ذریعۂ اظہار (Communication) سمجھا جاتا ہے لیکن خیالات کا ایک شخص سے دوسروں تک پہنچانا زبان کے فرائض میں سے ایک فریضہ ہے ۔ اس کے علاوہ زبان کے اور بھی اہم فرائض ہیں جنھیں فراموش نہیں کرنا چاہیے ۔ نفسیاتی لحاظ سے ہر مفکر کے لیے زبان بڑی اہم شے ہے ۔ کیونکہ الفاظ محض اظہار خیالات کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ ہمارے افکار کی جان ہیں ۔ الفاظ کے بغیر سوچنا محال ہے ۔ جن تعقلات کی مدد سے ہمارا غور و فکر پروان چڑھتا ہے ان کا سرچشمہ حسی علم ہے ۔ جنم لیتے ہی تعقلات معین واضح اور بین شکل اختیار نہیں کر لیتے بلکہ شروع میں تو ان کا وجود نہایت ہی مبہم اور دھندلا سا ہوتا ہے ۔ جب ان تعقلات کو زبان سہارا ملتا ہے تو ان کا ابہام دور ہو جاتا ہے اور ان کی مخصوص شکل ہمارے سامنے آ جاتی ہے ۔ مثال کے طور پر صحت کا تعقل لیجیے صحت کے لفظ کا اطلاق مختلف مواقع پر ہوتا ہے اور اس کے مطالب بھی کئی ہیں ۔ صحت کا لفظ جسم کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور روح کے لیے بھی ۔ اس کے علاوہ جیسے انسانوں کی صحت ہوتی ہے ویسے جانوروں اور پودوں کی بھی صحت ہے ۔ جاندار چیزوں کے علا

بے جان چیزوں کی بھی صحت ہے ۔ کالج ، شہر ، ملت یا مذہب کی صحت یا عدم صحت ہوتی ہے ۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ گوناگوں مطالب کوئی آدمی اپنے ذہن میں رکھ سکے گا اگر ان کے لیے کوئی نام تجویز نہ کیا جائے؟ ذرا کوشش کریں کہ ان مطالب میں سے کوئی مطلب بغیر زبان کے ذہن میں ٹکا رہے ۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ کی کوشش رائیگاں جائے گی ۔ اصل میں ہر فکر، خیالات کا ایک سلسلہ ہے ۔ اپنی ذات میں یہ خیالات مبہم اور غیر واضح ہوتے ہیں ۔ زبان کی مدد سے خیالات کو گرفت میں لایا جاتا ہے اور جب تک جی چاہے انھیں توجہ کا مرکز بنایا جا سکتا ہے ۔ جب تک خیالات کو الفاظ کا جامہ نہ پہنایا جائے ۔ ان کا نام نہ رکھا جائے یا کوئی لیبل نہ دیا جائے، وہ ہاتھ سے کھسک جاتے ہیں اور ان کا نشان تک باقی نہیں رہتا ۔ پس زبان کے وسیلہ سے ہم اپنے خیالات پر قابو پاتے ہیں اور جس وقت جی چاہے انھیں استعمال کرتے ہیں ۔

زبان کی مدد سے تعقلی تحلیل اور ترکیب کا کام ترقی پاتا ہے ۔ فکر کے ہاتھوں زبان ایک آلہ ہے ۔ جس قدر تیز اور عمدہ یہ آلہ ہوگا اسی قدر عمدہ اور معین ہمارا فکر ہوگا ۔ جس قدر مالا مال زبان ہوگی اسی قدر گہرے مطالب ہوں گے ۔ اسی وجہ سے ترقی یافتہ زبان استعمال کرنے والوں کے افکار میں بھی گہرائی اور بلندی ہوگی ۔ پس جتنا عبور کسی کو زبان پر ہوگا اتنا ہی وسیع اس کا فکر ہوگا ۔

جب زبان کو اظہار خیالات کا ذریعہ کہا جاتا ہے تو اس سے بھی زبان کی اہمیت بیان کرنا مقصود ہوتا ہے کیونکہ دوسروں سے ملنے جلنے، بات چیت اور بحث و تمحیص کرنے سے فکر کی صلاحیتیں نشو و نما پاتی ہیں ۔ فکر کا مدعا کسی مسئلہ کا حل ہوتا ہے اور حل کرتے وقت ہمیں دوسروں تک اپنے خیالات پہنچانے ہوتے ہیں اور دوسروں کے خیالات سننے اور سمجھنے ہوتے ہیں ۔ پس فکر ایک قسم کی سوشل فعلیت ہے ۔

دوسروں کے تعاون کے بغیر نہ تو ہم جبلی میلانات کی تشفی کر سکتے ہیں اور نہ ہی اکتسابی میلانات کی ۔ لہٰذا زبان کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ ہم معاشری اور طبعی ماحول سے نہایت کامیابی اور عمدگی سے نبٹ سکیں۔

کرداری نقطۂ نگاہ سے فکر کی ماہیت :

فکر اور زبان کا گہرا تعلق دیکھ کر کرداریوں نے کہہ دیا ہے کہ فکر تو بولنے کا نام ہے ۔ جب ہم دوسروں کو اپنے خیالات بتانا چاہتے ہیں تو اونچا بولتے ہیں تاکہ دوسرے سن لیں ۔ لیکن جب ہم غور و فکر کرتے ہیں تو مدھم آواز میں بولتے ہیں، کیونکہ ہمارا مقصود دوسروں کو سنانا نہیں ہوتا ۔ غور کرتے وقت زبان اور حنجرے کی حرکات ہوتی ہیں لیکن ان سے آواز نہیں آتی ۔ فکر کا یہ نظریہ عام کرداری نقطۂ نگاہ کے موافق ہے کیونکہ کرداری ہر شعوری عمل کو جسمانی حرکات میں تبدیلی کر دینے کے حامی ہیں ۔ لیکن ان کے اکثر نظریوں کی طرح یہ نظریہ بھی مبالغے سے خالی نہیں۔ فکر کے ساتھ زبان اورحنجرےکی حرکات ضرور ہوتی ہیں لیکن ان حرکات کو فکر کہہ دینا سراسر حماقت ہے ۔ یہ حرکات فکر کا روپ تب لے لیں جب ان میں تحلیل اور ترکیب کے عناصر آ جائیں ۔ ظاہر ہے کہ جب تک حرکت محض حرکت ہے اس میں تحلیل اور ترکیب کا پہلو نہیں آ سکتا ، لہٰذا کرداری نظریہ میں کوئی صداقت نہیں ۔ لیکن زبان اور فکر کے باہمی تعلق کے بارے میں جو تجربی شہادت ملی ہے وہ بڑی قیمتی ہے ۔ اس شہادت سے پتہ چلتا ہے کہ ہر قسم کے فکر کے ساتھ الفاظ موجود ہوتے ہیں ۔ جب اونچا بولتے ہیں اور اپنا فکر دوسروں تک پہنچاتے ہیں تب تو الفاظ ہوتے ہی ہیں لیکن جب ہم خاموشی سے سوچ رہے ہوتے ہیں تب بھی الفاظ کا استعمال ہوتا ہے ۔ جتنی دیر فکر جاری رہتا ہے اتنی دیر صوتی آلہ حرکت کرتا رہتا ہے ۔

فکر میں تمثال کی ضرورت پڑتی ہے ۔ زبان سیکھنے کے بعد لسانی اشباح کا مقام آتا ہے ۔ خواہ یہ اشباح تحریر سے ہو یا تقریر سے ۔

جب میں باغ کا خیال کرتا ہوں تو میرے ذہن میں پھولوں ، آبشاروں اور روشوں کے تمثال آتے ہیں ۔ لیکن عام طور پر ہوتا ایسا ہے کہ پھولوں ، آبشاروں اور روشوں کی بجائے ان چیزوں کے ناموں کے تمثال میرے ذہن میں آ جاتے ہیں ۔ یہ تمثال بصری ، سمعی اور حرکی ہوں گے ۔ یعنی انہیں دیکھا جائے گا یا سنا جائے گا یا پکارا جائے گا یا لکھا بھی جائے گا سنا بھی جائے گا اور پکارا بھی جائے گا ۔ پکارتے وقت زبان ، تالو ، حنجرے وغیرہ کی حرکات لازمی ہیں ۔ لہٰذا سوچتے ہوئے ہم اپنے آپ سے باتیں کرتے ہیں لیکن خاموشی کے ساتھ ۔ تاکہ کوئی دوسرا نہ سن لے اور اپنے آپ کو بھی کچھ سنائی نہ دے ۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب غور و فکر کے سمندر میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں تو اچانک بولنا شروع کر دیتے ہیں گو اس بولنے کا کچھ مقصد نہیں ہوتا ۔ اس لیے کئی لوگ اپنے راز خود افشا کر دیتے ہیں ۔

فکر اور زبان کے عضویاتی تعلق کے بارے میں جدید تحقیقات :

۱۔ بر آور اعصاب کے وظائف ۔

(ا) الفاظ : فکر کی ابتدا موقعہ ادراک سے ہوتی ہے ۔ اس ادراک سے مخفی اشارتی رد عمل پیدا ہوتے ہیں جو یا تو ظاہری رد عمل بنتے ہیں یا اور مخفی رد عمل پیدا کرتے ہیں جو بالآخر ظاہری رد عمل کا باعث بنتے ہیں ۔ پس ہمارا کام ان برآور اعصاب کا دریافت کرنا ہے جو اشارتی رد عمل کے لیے ایک قسم کی فعلیاتی بنیاد کا کام دیتے ہیں ۔

ازمنہ گزشتہ سے بولنے کی مشین کو سوچنے کی مشین بھی کہا گیا ہے۔ چنانچہ بین (Bain) نے کہا تھا کہ سوچنا تو رکا ہوا بولنا اور رکی ہوئی فعلیت ہے ۔ ربو (Ribot) نے کہا ہے کہ فکر اصل میں لفظ یا فعل کی پیدائش کا مقام ہے ۔ یعنی یہ آغاز ہے حرکی فعلیت کا ۔ اسی طرح ہیگل کہتا ہے کہ ہم ناموں سے سوچتے ہیں ۔ جے ۔ ایس ۔ مل

(J. S. Mill) نے بھی کہا ہے کہ استدلال جیسے منطق کا خصوصی موضوع کہا جاتا ہے الفاظ کے ذریعہ ادا ہوتا ہے اور پیچیدہ صورتوں میں الفاظ کے بغیر سر انجام نہیں پا سکتا ۔

(ب) دیگر نظام عضلات (Musculature) ۔ تجربوں سے معلوم ہوا ہے کہ صوتی آلات کے علاوہ اور عضلات بھی سوچتے وقت مصروف کار ہوتے ہیں ۔ اس ضمن میں تجربے کے لیے معمول کو خاص تربیت دینی پڑتی ہے ۔ اسے سکھایا جاتا ہے کہ وہ کیسے اندھیرے کمرے میں صوفے پر لیٹ کر اپنے جسم کو مکمل طور پر سستا سکے ۔ ان تجربوں میں گھڑی (Stopwatch) کی آواز (Click) پر یا تو حرکت شروع کرنی ہوتی ہے یا حرکت بند کرکے جسم کو سستانا ہوتا ہے ۔ اس کے بعد مخفی حرکی نظام کا جو اس حالت میں پیدا ہوتا ہے ، اس کا مقابلہ اس نظام سے کیا جاتا ہے جو محض تخیل کی حالت میں رونما ہوتا ہے ۔ مثالیں دیکھیے ۔

(i) معمول کو کہا گیا کہ وہ خیال کرے کہ اس کا دایاں بازو جھک رہا ہے ۔ معمول کے پٹھوں اور دائیں ہاتھ کی کہنی میں برقی مورچہ (Electrode) لگا ہوا تھا ۔ اس سے شعاعیں نکلیں ، یہ شعاعیں بالکل ویسی تھیں جو بازو فی الحقیقت جھکاتے وقت نکلیں ۔ جب معمول کو کہا گیا کہ وہ پاؤں یا بائیں بازو کا جھکنا خیال کرے تو یہ شعاعیں بالکل نہ نکلیں ۔

(ii) معمول کو کہا گیا کہ وہ اوپر دیکھے ۔ جو شعاعیں نکلیں ان کا گراف خود بخود بن گیا ۔ پھر اسے کہا گیا کہ پیرس کے ایفل قلعہ (Eiffel Tower) کا خیال کرے ۔ جو اس وقت شعاعیں نکلیں ان کا بھی گراف بن گیا ۔ دونوں گرافوں کا

مقابلہ کیا گیا یہ ایک جیسے تھے ۔

(*iii*) معمول کو کہا گیا کہ وہ بائیں سے دائیں دیکھے ۔ پھر اسے کہا گیا کہ انگریزی اخبار کا مطالعہ خیال کرے ۔ دونوں دفعہ جو شعاعیں نکلیں وہ ایک دوسرے کے مثل تھیں ۔

پس ان تجربوں سے ظاہر ہوا کہ جب کوئی شخص اپنی حرکات کا خیال کرتا ہے تو وہ ان حرکات کو مختصر پیمانے پر ادا کرتا ہے اور اگر وہ کسی چیز کا خیال کرتا ہے تو نہایت ہی مختصر طور پر وہ حرکات بھی کرتا ہے جو اس چیز کو توجہ دینے کے لیے درکار ہوں ۔

اس کے علاوہ قرنیہ (Cornea) سے جو شعاعیں دیکھنے میں نکلتی ہیں وہی شعاعیں اس وقت بھی نکلتی ہیں جب معمول کو کہا جائے کہ وہ صرف خیال کرے کہ کچھ دیکھ رہا ہے ۔ ایسے ہی جیسے بازوؤں سے وزن اٹھانے اور اس وزن کو بتدریج بڑھانے سے شعاعیں نکلتی ہیں ، وہ ہی شعاعیں بازوؤں سے ، اس خیال سے کہ وزن اٹھایا اور بڑھایا جا رہا ہے ، نکلتی ہیں ۔ بہرے اور گونگوں کی انگلیوں سے سوتے وقت بعض دفعہ شعاعیں نکلتی ہیں ۔ اگر اس وقت انہیں جگا دیا جائے تو وہ کہتے ہیں کہ انہیں خواب آ رہا تھا ۔ جس وقت ان کے ہاتھوں سے شعاعیں نہیں نکل رہی ہوتیں اگر اس وقت انہیں جگایا جائے تو وہ کسی خواب کا ذکر نہیں کرتے ۔ بہرے اور گونگے ہاتھوں کی انگلیوں سے خواب دیکھتے ہیں ۔

۲۔ مخ کبیر : عضلی نظام کے تحت جن تجربات کا ذکر آیا ان سے گمان پیدا ہوتا ہے کہ فکر میں درآمد اور برآمد اعصاب سرگرم کار ہوتے ہیں ۔ دماغ کا اس میں کوئی تعلق نہیں ۔ یہ گمان بالکل بے بنیاد ہے ۔ سوچنے میں مہیجات ضرور ہوتے ہیں جو درآمدی اعصاب کو متأثر کرتے ہیں ، رد عمل بھی ہوتا ہے جن میں عضلاتی نظام کی ضرورت پڑتی ہے ، لیکن فکر کو محض مہیجات اور رد عمل کا ایک سلسلہ سمجھ

لینا فکر کی توہین ہے ۔ اس طرح یہ نظریہ کہ مہیج دماغ میں داخل ہو کر خلیوں کے کئی گچھوں کو متاثر کر دیتا ہے، تا کہ ایک خیال سے دوسرے خیال تک تلازم کی وساطت سے پہنچا جا سکے، یہ بھی ایک ناقص نظریہ ہے ۔

حقیقت میں فطری کردار بڑا پیچیدہ ہوتا ہے ۔ بعض دفعہ خیالات اس تیزی سے آتے ہیں کہ مہیج اور رد عمل کا سلسلہ خواہ کتنا ہی تیز کیوں نہ ہو اس کا ساتھ نہیں دے سکتا ۔ یہ حقیقت ٹائپسٹ اور پیانسٹ (Pianist) کو دیکھ کر عیاں ہوتی ہے ۔ ان کی حرکات اس قدر تیز ہوتی ہیں اور خیالات اس تیزی سے آتے جاتے ہیں کہ مہیج اور رد عمل کی قوتیں ساتھ نہیں دے سکتیں ۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ مہیج کی عدم موجودگی میں بھی فکر جاری رہتا ہے اور گو مہیجات ختم ہو جاتے ہیں انسان اپنا خیال اور مقصد نہیں چھوڑتے اور الفاظ اور اشاروں کے ذریعہ ان کے متعلق سوچتے رہتے ہیں ۔ پھر جسہ (Aphasia) اور اس کی اقسام دیکھیں ، ان بیماریوں میں مخ کبیر کے بعض حصے تباہ ہو جاتے ہیں ۔ اس خرابی کی وجہ سے سوچ بچار اور الفاظ سے متعلق کئی نقائص پیدا ہو جاتے ہیں ۔ مخ کبیر کے ایک حصے کی تباہی سے الفاظ اور فقرات میں خرابی آ جاتی ہے ۔ دوسرے حصے میں خرابی سے الفاظ سنے جاتے ہیں لیکن ان کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا ۔ ایک اور حصہ کی تباہی سے لفظ لکھے نہیں جا سکتے گو اس نقص سے پہلے لکھے جاتے تھے اور ایک حصہ کی تباہی سے الفاظ پڑھے نہیں جا سکتے گو پہلے مریض پڑھ لیا کرتا تھا ۔ تجربوں سے یہ بھی ثابت ہے کہ جب دماغ کو نقصان پہنچتا ہے یا انسان انشقاق ذہنی (Schizophrenia) کا مریض ہو جاتا ہے تو تجریدی فکر سے عاری ہو جاتا ہے ۔

انشقاق ذہنی کے مریضوں کو بلاک علیحدہ کرنے کی آزمائش دی گئی ۔ یہ بلاک رنگ ، شکل ، اونچائی اور سائز کے اعتبار سے ایک

دوسرے سے مختلف تھے ۔ ان بلاکوں کے نام رکھے گئے ۔ نام رکھتے ہوئے ان کے رنگ اور شکل کو نظر انداز کر دیا گیا ۔ اونچے بڑے بلاکوں کو LAG ، چوڑے بڑے بلاکوں کو BIK ، اونچے چھوٹے بلاکوں کو MUR اور چوڑے چھوٹے بلاکوں کو CEV کا نام دیا گیا ۔ ان بلاکوں کا ڈھیر مریض کے سامنے میز پر لگا دیا اور اسے کہا گیا کہ یہ بلاک چار قسموں کے ہیں انہیں چار ڈھیروں میں الگ الگ لگا دو ۔ تجربہ کنندہ نے ایک بلاک اٹھایا ، اس کا نام پڑھا اور مریض سے کہا کہ اس قسم کے باقی بلاک ڈھیر سے الگ کر لو ۔ مریض نے بلاک کا رنگ یا شکل دیکھ کر ویسے رنگ اور شکل کے بلاک الگ کرنے شروع کر دے ۔ تجربہ کنندہ نے بتایا کہ جو بلاک اس نے چنے ہیں وہ اس بلاک جیسے نہیں ۔ لہٰذا اس نے دوبارہ نام پڑھا ۔ مریض نے پھر کوشش کی اور کئی بار کوشش کی ۔ اگر کئی کوششوں کے بعد اس کی سمجھ میں آ جائے کہ صف بندی کیسے کرنی ہے تو پھر وہ ڈھیر کو چار گروہوں میں تقسیم کر لیتا ہے ۔

اس تجربہ سے ظاہر ہوا کہ (١) انشقاق ذہنی کے مریض ابتدائی مدارج پر ہوتے ہیں اور بلاکوں کا انتخاب کرتے وقت بلاکوں کے خصائص اور ان کے ناموں کے درمیان رشتہ قائم نہیں کر سکتے ، دوسرے لفظوں میں یہ مریض تجربات کے قابل نہیں رہتے ، ٹھوس اشیا (Concrete) کی سطح تک رہ جاتے ہیں ۔ (٢) جب نارمل آدمیوں کو یہی آزمائش دی گئی تو انھوں نے رنگوں اور شکلوں کو شروع سے نظر انداز کر دیا ۔

گولڈ سٹائن (Goldstein) نے معلوم کیا کہ بعض دماغی چوٹوں میں مریض تعقلات استعمال نہیں کر سکتا اور جماعت بندی سے عاجز آ جاتا ہے ۔ لہٰذا وہ کہتا ہے کہ تجریدی فکر کے لیے مخ کبیر اور خصوصاً جبہی لختے کا صحیح سالم ہونا ضروری ہے ۔

اوپر والے تجربات سے ظاہر ہوتا ہے کہ فکر کا انحصار مخ کبیر

اور اس کے روابط پر ہے عضلاتی نظام کا حصہ بہت کم ہے ۔ اس لیے فکر کی فعلیات بیان کرتے وقت دماغی وظائف پر زیادہ زور دینا چاہیے ۔ صوتی آلات اور عضلاتی نظام کی اہمیت نسبتاً بہت تھوڑی ہے ۔

اس بحث سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ فکر کی کوئی الگ حیثیت نہیں اور یہ تو صرف دماغی، صوتی اور عضلاتی نظام کا وظیفہ ہے ۔ جیسے ہارمونیم سے نکلے ہوئے گانے کا الگ وجود ہے ویسے ہی فعلیاتی نظام سے نکلے ہوئے فکر کی خود مختارانہ حیثیت ہے ۔

تخلیقی فکر (Creative Thinking) :

جب جانوروں یا انسانوں کو آزمائشوں میں ڈالا جاتا ہے تو نہ جانوروں کو اور نہ انسانوں کو علم ہوتا ہے کہ آزمائش کا حل کیا ہوگا ۔ البتہ تجربہ کنندہ کو اس کا علم ہوتا ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ بھول بھلیوں کا کون سا راستہ منزل مقصود تک پہنچائے گا ۔ یا کون سا بٹن دبانے سے دروازہ کھل جائے گا ۔ لیکن عام زندگی میں جن مسائل سے انسانوں کو دو چار ہونا پڑتا ہے وہ اس قسم کے نہیں ہوتے ۔ ان کا حل کسی کو معلوم نہیں ہوتا ۔ نہ تو اس شخص کو حل آتا ہے جس کا مسئلہ ہے اور نہ اس کے یار اغیار کو ۔ ہر انسان کو اپنی مشکل کا حل ڈھونڈنا پڑتا ہے اور یہ کوئی آسان کام نہیں ۔ یہاں پر تخلیقی فکر کی ضرورت ہے تاکہ مسائل کو سمجھ کر ان کا مناسب حل پیش کیا جائے ۔ لیکن تخلیقی فکر سے واسطہ صرف پریشانی اور مشکلوں میں ہی نہیں بلکہ زندگی کے تعمیری کاموں میں بھی پڑتا ہے ۔ مثلاً موسیقی اور لٹریچر میں ، سائنسی ایجادات اور قانونی جرح میں اور اسی طرح اشتہار بازی میں تنوع ، ندرت اور تخلیقی فکر کی ضرورت ہوتی ہے ۔ موسیقی میں نئے راگوں کو ترتیب دیا جاتا ہے ۔ لٹریچر میں نئے کردار نئے پلاٹ اور نئے خیالات پیش کیے جاتے ہیں ۔ سائنسی ایجادات بھی نئی ہوتی ہیں ۔ اشتہاروں کے ڈیزائن بھی نئے اور اچھوتے ہوتے ہیں ۔ ان سب میں جدت

پسندی سے کام لیا جاتا ہے - ماضی سے ہٹ کر نیا راستہ تجویز کیا جاتا ہے اور کوئی ایسی چیز معرض وجود میں لائی جاتی ہے جو پہلے کبھی نہ تھی - رابرٹ لوئس سٹیونسن (Robert Lious Stevenson) ایک انگریزی ناول نویس نے اپنی تصنیف (Across the Plains) میں نہایت عمدگی سے تخلیقی فکر کی تشریح کی ہے اور اس کے چند اہم عناصر بیان کیے ہیں - یہ عناصر حسب ذیل ہیں :

۱- اکثر نئے خیالات ، نئے نظریے یا نئی ایجادات دفعتاً سوجھ جاتی ہیں - ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی چیز اچانک آسمانوں سے نازل ہوئی اور مفکر کے دل میں جا گھسی - ارشمیدس (Archimedes) ایک سائنس دان کو بادشاہ وقت نے اپنا تاج اس غرض سے دیا کہ سونا پہچانے کھوٹا ہے یا کھرا- تاج بڑا خوب صورت تھا بادشاہ اسے توڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن کسی نے بادشاہ کے دل میں شک ڈال دیا تھا کہ سونا خالص نہیں - لہٰذا اس نے اپنے زمانے کے مشہور سائنس دان کو بلایا اور مسئلہ اس کے سامنے رکھا - ارشمیدس کئی دن سوچتا رہا - ایک دن وہ تالاب میں نہا رہا تھا دفعتاً اسے مسئلے کا حل سوجھ گیا - وہ پانی سے چھلانگیں لگاتا باہر نکلا اور منہ سے کہہ رہا تھا ”میں نے پا لیا میں نے پا لیا“ -

۲- یہ حل عموماً اس وقت ملتے ہیں جب انسان آرام کر رہا ہو اور اس کی توجہ حل طلب مسئلہ کی بجائے کسی اور چیز پر ہو - یعنی اس وقت اچانک اس کے دل میں خیال آ جاتا ہے -

۳- یہ حل خود بخود دماغ کے کسی کونے سے نکل آتا ہے ، اس لیے خیال ہوتا ہے کہ اس حل کو پیش کرنے والا انسان خود نہیں بلکہ کوئی بیرونی طاقت ہے - بعض دفعہ اس طاقت کو لاشعور کہا جاتا ہے -

انہیں نقاط کو ووڈورتھ وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے اور تخلیقی فکر کی چار مختلف منازل بتاتا ہے۔ یہ منازل حسب ذیل ہیں :

(۱) تیاری (Prepration) ۔

(۲) حضانت (Incubation) ۔

(۳) آمد (Inspiration) ۔

(۴) تصدیق (Verification) ۔

تیاری : یہ پہلی منزل ہے اس میں مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کا تحلیل اور تجزیہ کیا جاتا ہے۔ جو عناصر اس کی ترکیب میں شامل ہوں انہیں علیحدہ علیحدہ کیا جاتا ہے۔ اس مسئلے کے متعلق جہاں سے علم دستیاب ہو سکے فراہم کیا جاتا ہے اپنی یاد پر زور دیا جاتا ہے اور گزشتہ تجربات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بعض دفعہ پرانے ریکارڈ دیکھے جاتے ہیں۔ پرانی تحریروں کا مطالعہ ہوتا ہے، پرانے فیصلوں کو دوہرایا جاتا ہے۔ یار دوستوں سے بھی مشورے لیے جاتے ہیں۔ بڑے بوڑھوں سے بھی پوچھا جاتا ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ مسئلے کو ہر لحاظ سے سمجھا جائے تاکہ اس کا حل نکل آئے۔ اگر اس کوشش کے باوجود حل نہ سوجھے تو مسئلے کو تھوڑے وقت کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

حضانت : یہ دوسری منزل ہے۔ اس میں کچھ عرصے کے لیے مسئلہ پر غور و فکر نہیں ہوتا اور انسان دوسرے کام کاج میں لگ جاتا ہے۔ لاشعوریوں کا کہنا ہے کہ جب حل ڈھونڈنے میں شعور ناکام ہو جاتا ہے تو مسئلہ کو لاشعور کے حوالے کر دینا چاہیے۔ لاشعور کے وسائل غیر محدود ہیں۔ وہ ضرور حل پیش کردے گا۔ لہٰذا حضانت کے زمانے میں شعور تو اس مسئلہ پر سوچ بچار نہیں کر رہا لیکن لاشعور غافل نہیں ہوتا اور کبھی نہ کبھی حل پیش کر دیتا ہے۔ ووڈورتھ لاشعور کے نظریے کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ صحیح حل

نہ ملنے کے کئی وجوہات ہو سکتے ہیں ۔ مواد غیر متعلق ہو سکتا ہے ۔ مفروضے غلط اور کمزور ہوسکتے ہیں یا تفصیلات اس قدر بے ہنگم ہو سکتی ہیں کہ انسان ان میں الجھ کر رہ جائے اور صحیح پوزیشن نہ سمجھ سکے ۔ ان سب عناصر کا اثر اصول تاخر (Recency) کی بدولت ہوگا ۔ جب یہ اثر زائل ہوجاتا ہے تو صحیح حل مل جاتا ہے ۔

آمد : اس تیسری منزل میں صحیح حل یک لخت مل جاتا ہے ۔ انسان کسی اور کام میں مشغول ہوتا ہے اور دفعتاً بجلی کے موافق صحیح جواب اس کے ذہن میں آجاتا ہے ۔ ارشمیدس کا قصہ تو بیان ہو چکا ہے ۔ نہاتے نہاتے اسے مسئلہ کا حل مل گیا ۔ ایسی اور کہانیاں شاعروں ، فن کاروں اور سائنس دانوں کی زندگیوں سے مل سکتی ہیں ۔ مثلاً کولرج (Coleridge) ایک انگریزی شاعر نے اپنی نظم قبلہ خاں (Kubla Khan) خواب میں مکمل کی ۔ میسفیلڈ (Masfield) کہتا ہے کہ اس نے اپنی نظم (The Woman Speaks) ایک تختی پر حالت خواب میں لکھی ہوئی دیکھی اور بیدار ہونے پر اسے لکھ لیا ۔ پان کیر (Poincare) ایک فرانسیسی حساب دان لکھتا ہے کہ جب وہ گاڑی پر بیٹھا ہو، یا کام کر چکا ہو، یا کافی پی کر لیٹا ہو تو اس وقت کئی حساب کے نئے نقاط اسے سوجھتے ۔ جے روسمین (J. Rossman)[1] لکھتا ہے ''میں گہری نیند سے نئے خیال کے ساتھ اٹھتا ہوں ۔ بعض دفعہ جب میں کپڑے پہن رہا ہوتا ہوں ، یا حجامت بناتا ہوں یا بوٹوں کے تسمے باندھتا ہوں تو مجھے نیا خیال سوجھتا ہے ۔ بعض دفعہ میز پر محنت کرنے کے کئی گھنٹے یا کئی دن بعد نیا خیال آتا ہے ۔ لیکن اکثر نیا خیال تب آتا ہے جب میرا دماغ تازہ ہو، پر سکون ہو، ہر قسم کے فکر اور اندیشے سے پاک ہو اور جب میں کسی نئے مضمون کی طرف آؤں اور

---

١ - اپنی کتاب The Psychology of Invention میں ۔

اس کے خواص پر غور کروں ۔ میں مسئلہ کا مطالعہ کرتا ہوں اس کے متعلق تمام معلومات پڑھتا ہوں ۔ جو خیال آتے ہیں ان کا تجربی جائزہ لیتا ہوں ۔ اس کے بعد جلدی یا دیر سے صبح کے وقت گہری نیند کے بعد صحیح حل ذہن میں آتا ہے جیسے بجلی کوند گئی ۔

تصدیق : حل مل جانے کے بعد اس کی تصدیق ہوتی ہے ۔ حالات کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا جاتا ہے اگر حل واقعی ٹھیک ہو تو اسے قبول کیا جاتا ہے وگرنہ اسے رد کر کے کوئی اور طریقہ اختیار کیا جاتا ہے ۔ مثلاً کسی آدمی کا نام بھول گیا ہو ۔ لاکھ سر مارتے ہیں نام یاد نہیں آتا ۔ کوشش چھوڑ دیتے ہیں ۔ ایک دن جب کھانا کھا رہے ہوتے ہیں نام یاد آ جاتا ہے ۔ اس نام کی پڑتال کی جاتی ہے اگر واقعی ٹھیک ہو تو قبول کر لیتے ہیں وگرنہ دوبارہ کوشش کی جاتی ہے اور تخلیقی فکر کی سب منازل دوبارہ طے کرتے ہیں ۔

اس تشریح سے پتہ چلتا ہے کہ تخلیقی فکر محض آمد کا نام نہیں ۔ تخلیقی مفکر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر آمد کا انتظار نہیں کرتے بلکہ آمد کے لیے اپنے آپ کو تیار کرتے ہیں ۔ مسئلہ کے متعلق ہر قسم کی معلومات فراہم کرتے ہیں ۔ جو مشاہدات اور تجربات ممکن یا ضروری ہوں سب کیے جاتے ہیں اور جب اس کوشش میں عاجز آ جاتے ہیں تب تھوڑے عرصہ کے لیے مسئلہ کو ایک طرف رکھ دیتے ہیں ۔ اس لیے ایک موجد کہتا ہے کہ چند ”ایجادات کو چھوڑ کر میری اکثر و بیشتر ایجادات محنت شاقہ کا نتیجہ ہیں ۔ میں ہر مسئلہ اور اس کے طریق کار کو نہایت غور و فکر سے لیتا ہوں “ ۔ لہٰذا تخلیقی مفکر اس واعظ سے مختلف ہے جس نے وعظ کا پیشہ اختیار کرنے کے بعد کہہ دیا کہ اس کا کام تو منہ کھولنا ہے الفاظ سے منہ بھرنا خدا کا کام ہے ۔

تخلیقی فکر کے منازل کو سائنسی طور پر سمجھا جا سکتا ہے ۔

مثلاً آمد کو لیجیے یہ کوئی نئی چیز نہیں ۔ آموزش بہ بصیرت میں بھی تو حل دفعتاً مل جاتا ہے ۔ چھڑیوں اور صندوقوں کو دیکھ کر بندر ایک طرف بیٹھ جاتا ہے پھر یکلخت اٹھ کر چھڑیاں ایک دوسری میں گاڑ کر پھل کو چھت سے اُتار لیتا ہے ۔ یہ بھی ایک قسم کی آمد ہے ۔ بصیرت خواہ پیش بینی کی صورت میں ہو یا پس بینی کی صورت میں ایک قسم کی آمد ہے ۔ پھر یہ کہا گیا ہے کہ حل اچانک نظر آ جاتا ہے، یہ بھی کوئی عجیب چیز نہیں ۔ یاد کے سلسلے میں ہم نے دیکھا کہ فراموشی کا ایک سبب یاد داشت کے راستے میں رکاوٹیں ہیں جب یہ رکاوٹیں دور ہو جائیں تب بھولی ہوئی چیز یاد آ جاتی ہے ۔ سونے میں ، آرام کی حالت اور خوابوں میں رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں ۔ لہٰذا صحیح حل مل جاتا ہے ۔ ایک اور چیز جو اس سلسلہ میں کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے حل کا تعلق مفکر کی ذات سے نہیں بلکہ کسی خارجی طاقت سے ہے ۔ یہ قیاس ٹھیک نہیں ۔ قبلہ خاں کی نظم کسے آئی ؟ کولرج (Cleridge) کو ، یا نیوٹن کو ۔ مسئلہ کشش ثقل کس کو سوجھا ؟ نیوٹن کو یا شیکسپیئر کو ۔ اسی طرح کرداریت کا نظریہ واٹسن کو سوجھا یا پوپ (Pope) کو ؟ اگر غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ نئے خیال کا تعلق مفکر کی ذات سے ضرور ہوتا ہے ۔ شاعر کو نظمیں سوجھتی ہیں ۔ سائنس دانوں کو سائنسی نظریے ۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سائنس دانوں کو تو نظمیں سوجھیں اور شاعروں کو سائنسی نظریے ۔

اس بحث سے دو چیزیں عملی زندگی کے لیے ملتی ہیں :

۱۔ جو شخص ندرت اور جدت کا خواہاں ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مضمون پر پورا عبور حاصل کرے ۔

۲۔ مسئلہ کو پوری طرح سمجھنے اور اسے حل کرنے کے تمام

جتن کر چکنے کے بعد نئے اور اچھوتے خیالات کی آمد ہوتی ہے ۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ انگریزی میں فطانت (Genius) کے متعلق کہتے ہیں :

It is one-tenth inspiration and nine-tenth perspiration.

یعنی فطانت $\frac{۱}{۱۰}$ حصہ تو آمد ہے اور $\frac{۹}{۱۰}$ حصہ پسینہ (محنت شاقہ)

کیا ابتکار (Originality) یعنی تخلیقی قوت کو بڑھا سکتے ہیں ؟ اس سوال کا جواب مختلف طریقوں سے دیا جاتا ہے ۔ بعض استادوں کا خیال ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کی تخلیقی قویٰ کو بڑھا نہیں سکتے وہ صرف ان قویٰ کے لیے مناسب ماحول تیار کرتے ہیں ۔ کچھ اساتذہ کا خیال ہے کہ وہ ابتکار بھی پیدا کر سکتے ہیں ۔ تجربوں سے کسی دعویٰ کی تصدیق یا تکذیب نہیں ہو سکی ۔ تجربے صرف یہ بتاتے ہیں کہ لوگوں میں ابتکار ایک جیسی نہیں پائی جاتی ۔ کسی میں زیادہ ہے کسی میں کم ۔ تجربے کے لیے کچھ پیشہ ور فن کار ، کچھ آرٹ کے طلبہ اور کچھ ملے جلے طلبہ لیے گئے اور انہیں کچھ مدات تخلیقی طور پر ترتیب دینے کے لیے کہا گیا ۔ مدات حسب ذیل ہیں :

۱- زیر تجربہ افراد کو دس الفاظ سے مقررہ وقت میں زیادہ سے زیادہ فقرے بنانے تھے ۔

۲- زیر تجربہ افراد کو تھوڑے وقت میں زیادہ سے زیادہ الفاظ تین سیدھی لکیروں ، دو سیدھی لکیروں ، ایک سیدھی لکیر ، ایک ٹیڑھی لکیر سے بنانے تھے ۔

۳- ان لوگوں کو بیس الفاظ دیے گئے اور کہا گیا کہ اسی ترتیب سے الفاظ استعمال کرکے کہانی بنائیں ۔ وقت کا لحاظ رکھا گیا ۔

۴- دس لکڑی کے بلاک دیے گئے اور زیر تجربہ افراد سے کہا گیا کہ وہ ان سے زیادہ سے زیادہ گھر کا آرائشی سامان بنائیں ۔ جتنا وقت

صرف ہوا وہ نوٹ کر لیا گیا ۔ نتائج حسب ذیل ہیں :

اجزا	پیشہ ور فن کار تعداد ۳۰		آرٹس کے طلبہ تعداد ۲۵		ملے جلے طلبہ تعداد ۸۴	
	اوسط	انحراف معیاری	سط	انحراف معیاری	اوسط	انحراف معیاری
فقرات	۱۷٫۷	۷٫۲	۱۲٫۹	۷٫۶	۱۸٫۰	۴٫۲
الفاظ	۱۲٫۵	۱٫۹	۱۳٫۲	۱٫۰	۶٫۷	۱٫۸
کہانی	۱۱٫۴	۴٫۱	۷٫۳	۲٫۵	۹٫۱	۳٫۲
گھر کا سامان	۱۸٫۴	۷٫۸	۱۳٫۹	۹٫۱	۳٫۴	۲٫۷
بروں کا مجموعہ	۶۰٫۵	۱۲٫۳	۵۶٫۴	۱۵٫۱	۳۷٫۶	۷٫۵

نوٹ ۔ انگریزی میں اوسط Average اور معیاری انحراف Stanard Deviation کہلاتا ہے ۔

اس چارٹ سے پتہ چلتا ہے کہ لسانی مواد اور مکانی اشکال کے لیے پیشہ ور فن کار اور آرٹس کے طلبہ دوسروں کی نسبت زیادہ ایجادی (Original) ثابت ہوتے ہیں ۔ لیکن اس تجربے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ فنون سے ایجادات پیدا ہوتی ہیں ، ممکن ہے ایجادی یعنی تخلیقی قوی والے لوگ ہی ان فنون کی طرف آتے ہوں ۔ بہرحال اس تجربے سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ لوگوں میں تخلیقی قوت برابر نہیں ۔

بیسواں باب

انتخاب، کشمکش، ناکامی

Choice, Conflict, Frustration

اگر زندگی جبلی سطح پر رہتی تو کسی کشمکش کا امکان نہ تھا۔ بھوک لگتی تو کھانا کھا لیتے۔ نیند آتی تو سو لیتے، جنسی خواہش پیدا ہوتی تو جنس مخالف کی تلاش کر لیتے، غصہ آتا تو لڑ لیتے، غرض کہ جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتے اور ذہنی کشمکش سے بچے رہتے۔ انسان کی خوش قسمتی سمجھیے یا بد قسمتی کہ یہ جبلی سطح سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی چیز سیدھی نہیں پڑتی، ہر چیز میں الجھن ہوتی ہے۔ وہ نیکی بھی کر سکتا ہے بدی بھی، چوری بھی کر سکتا ہے اور شریفانہ زندگی بھی بسر کر سکتا ہے۔ ہر قدم پر متصادم صورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک کو انتخاب کر سکتا ہے دوسرے کو رد۔ آزادی انسان کا طغریٰ امتیاز سمجھی جاتی ہے اور اس کی ذہنی کشمکش کا سبب۔

کہا جاتا ہے کشمکش کو سلجھانے اور متصادم صورتوں میں سے انتخاب کرتے وقت ارادے کی ضرورت پڑتی ہے۔

ارادہ (The Will) :

عموماً ارادہ کے تین وظائف سمجھے جاتے ہیں :

(۱) محرکات کی کشمکش میں تصفیہ کرنا۔

(۲) کوشش سے مشکلات دور کرنا۔

(۳) مقصدی فعل میں عضویہ کو حصول مقصد کے لیے مجبور یا راغب کرنا۔

کئی نفسیاتی ماہر ارادہ کو علیحدہ خود مختار حیثیت نہیں دیتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اوپر والے تینوں وظائف نفس کا کوئی خاص حصہ نہیں بجا لاتا بلکہ یہ سارے نفس کا کام ہے۔ لیکن میخوٹی (Michotte) کا خیال ہے کہ مندرجہ ذیل دو تفاعل میں ارادے کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ لہذا اس کا وجود علیحدہ ماننا چاہیے۔

(ا) جب دو یا دو سے زیادہ متصادم محرکات یا جذبات میں سے ایک کو اپنایا جاتا ہے اور دوسرے کو رد کیا جاتا ہے۔ اور

(ب) جب فیصلہ پر کاربند رہنے کے لیے عضویہ کو مجبور یا راغب کیا جاتا ہے۔

نفسیاتی ماہر فلسفیانہ بحث میں نہیں پڑنا چاہتا وہ صرف حقائق دیکھتا ہے اور ان کی تشریح کرتا ہے۔

۱۔ محرکات کی کشمکش میں ارادہ کی حیثیت: جب محرکات میں تصادم ہوتا ہے تو ضروری نہیں کہ زیادہ طاقت ور ہی کامیاب ہو۔ مثلاً ایک آدمی بھوک سے مر رہا ہو لیکن عزت یا مذہب کے نام پر وہ بھوک پیاس قربان کر سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گو کامیاب محرک اپنی ذات میں کمزور ہوتا ہے لیکن دوسرے محرکات کی معیت میں طاقتور بن جاتا ہے۔ میکڈوگل (Mc Dougall) کا خیال ہے کہ اثبات ذات (Self assertion) کا جذبہ جس محرک کی پشت پناہی کرتا ہے وہ کامیاب ہو جاتا ہے اور یہی ارادہ ہے۔ سٹوٹ (Stout) کے خیال میں جب ہم اپنے محرکات اور مقاصد کو ذات (Self) کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو اس کا نام ارادہ ہے۔ میکڈوگل اور سٹوٹ دونوں اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ نفس اکائی ہے اور اکائی ہونے کی حیثیت سے کشمکش کی حالت میں قائم نہیں رہ سکتا۔ ہماری خواہشات، محرکات اور جذبات کا نظام جیسے

کیریکٹر یا ذات کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے ضرور متصادم حالتوں میں ایک کا ساتھ دے گا اور دوسروں کو رد کر دے گا۔ جس محرک کو ذات کا ساتھ نصیب ہوتا ہے وہ کامیاب ہو جاتا ہے دوسرا ناکام بن جاتا ہے۔ اس بیان کی تائید میں ایش (Ach) اور اینجل (Angell) ہیں۔ ایش کہتا ہے کہ ارادہ کا تفاعل ادا کرتے وقت ہماری ذات کی رفاقت اس فعل کو حاصل ہو جاتی ہے جو ہم کرتے ہیں۔ اینجل کہتا ہے کہ ارادہ سے مراد تمام نفس کی سرگرمی ہے۔ اس کی بدولت ایک کام کیا جاتا ہے اور دوسرا نہیں کیا جاتا۔

۲- ولیم جیمز (William James) کا کہنا ہے کہ ہمارے خیالات اور افکار میں ایک عام میلان ہے کہ وہ حرکت میں تبدیل ہو جائیں یا حرکت پیدا کریں۔ مثال کے طور پر تصوری۔ حرکی حرکات (Ideomoter Action) کو لیں اس میں محض ادراک ہی حرکت کو پیدا کر دیتا ہے، حالانکہ حرکت کرنے کا کوئی ارادہ موجود نہیں ہوتا۔ اگر مجمع میں چند لوگ اوپر کی طرف دیکھنے لگیں تو باقی کی نگاہیں بھی اوپر کو اٹھ جاتی ہیں۔ جیمز کے ساتھ کئی ماہرین نفسیات کا اتفاق نہیں۔ ان کی رائے میں ہر خیال کو حرکت پیدا کرنے کی صلاحیت دے دینا مبالغہ آمیز بیان ہے۔ کم از کم ان کے نزدیک ارادے میں یہ قوت موجود نہیں ہوتی۔ تجربوں سے ثابت ہے کہ جب راستے میں رکاوٹیں آتی ہیں تو یا تو انسان بیٹھ جاتا ہے یا رکاوٹیں دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وزن اٹھاتے وقت وزن کو بڑھا دیں تو جسم زیادہ طاقت صرف کرتا ہے اور وزن اٹھانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی اگر ٹائپ کرتے وقت اختلال توجہ کے سامان پیدا کر دیے جائیں تو ٹائپسٹ زیادہ کوشش کرے گا۔ ارادی فیصلوں میں عضویہ کا راغب ہو جانا اسی نوع کی چیز ہے۔ چونکہ ماحول ہماری مرضی کے مطابق نہیں ہوتا اس لیے کوشش کی جاتی ہے کہ ہمارے ارادے حرکات و افعال میں ظاہر ہوں۔

کشمکش (Conflict) :

زندگی کے تقاضے ایسے پیچیدہ اور دقیق ہوتے ہیں کہ ذہنی کشمکش سے بچنا محال ہے ۔ ان کا تصفیہ کرتے وقت عقل کے علاوہ دل کو بھی دخل ہے ۔ اگر سارے جھگڑے عقل سے سٹ سکتے تو دنیا سے جنگیں ختم ہو جاتیں ۔ تنازعوں میں عقل کا حصہ بہت تھوڑا ہوتا ہے ۔ ہماری شعوری اور لاشعوری مرضیات تنازعہ کو الجھا دیتی ہیں اور فیصلہ نہیں ہونے دیتیں ۔

کشمکش کا سرچشمہ : کشمکش کے موٹے موٹے اسباب حسب ذیل ہیں :

(۱) محرکات کی تشفی کے راستے میں ماحول سے رکاوٹیں ۔

(۲) ذاتی نقائص جس کی وجہ سے محرکات کی تشفی نہیں ہونے پاتی ۔

(۳) محرکات کا تصادم ۔

۱۔ ماحول سے مزاحمت دو صورتیں اختیار کر سکتی ہے ، یا تو اس کی صورت معاشری ہوگی یا طبعی ۔ طبعی رکاوٹ کی مثال اس طرح دی جا سکتی ہے کہ کسی شخص کو ضروری گاڑی پکڑنی ہے یا کسی ضروری تقریب پر پہنچنا ہے لیکن راستے میں کار خراب ہو جاتی ہے ۔ ہزار کوشش کرتا ہے کہ کار کا نقص رفع ہو جائے لیکن وہ رفع ہوتا نہیں اور وقت گزرتا جا رہا ہے ۔ اس صورت میں اس کا پریشان ہونا اور غصے سے جھنجھلا اٹھنا یقینی امر ہے ۔ اسی طرح سے دفتر کا بے رنگ اور اکتا دینے والا کام بعض لوگوں کو خصوصاً انہیں جو تخلیقی کام کے شائق ہوں، بڑا پریشان رکھتا ہے لیکن انہیں کوئی چارہ نہیں سوجھتا ۔ ایسے ہی جن لوگوں کو کساد بازاری کی وجہ سے مجبوراً بے کار رہنا پڑتا ہے وہ زبوں حالی کی وجہ سے تنگ رہتے ہیں لیکن کیا کریں مجبور اور لاچار ہیں ۔

معاشری مزاحمت بڑی تکلیف دہ اور پریشان کن چیز ہے، کیونکہ

ہمارا خیال ہوتا ہے کہ طبعی ماحول تو بے جان ہے اور ہمارے مسائل کو نہیں سمجھ سکتا ، لیکن ہمارے دوستوں ، عزیز و اقارب ، افسروں اور ماتحتوں کو تو ہمارا نقطہ نگاہ سمجھ جانا چاہیے اور ہم سے ہمدردی رکھنی چاہیے۔ لیکن یہ خیال بے بنیاد ثابت ہوتا ہے ۔ لوگ بڑے ضدی ، خود عرض اور بے حس نکلتے ہیں ۔ وہ نہ ہماری پروا کرتے ہیں نہ ہمارا نقطہ نگاہ سمجھتے ہیں ۔ نیا بیاہا ہوا جوڑا ایک دوسرے کو نہ سمجھنے کی بنا پر بات بات پر جھگڑ پڑتا ہے ۔ خود غرضی انھیں اجازت نہیں دیتی کہ تھوڑی سی قربانی کر کے زندگی کی بہت بڑی خوشی حاصل کر لیں ۔ جہاں تسلط ، حکمرانی اور رعب جمانے کا خیال ہو وہاں خوشگوار تعلقات قائم نہیں رہ سکتے، پیار محبت میں ایثار کی ضرورت ہے ، کچھ خود جھکنا چاہیے کچھ دوسرے کو ، تب محبت قائم رہتی ہے ۔ ورنہ بہت جلد محبت نفرت میں بدل جائے گی ۔ جہاں دو یا دو سے زیادہ لوگوں کو کسی سکیم یا منصوبہ میں مل کر کام کرنا ہو وہاں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ تعمیر کرنا بڑا جرم ہے ۔ سب کو ٹیم کی حیثیت سے کام کرنا چاہیے ۔

۴۔ ذاتی نقائص اور خامیاں نہ صرف کشمکش کا موجب بنتی ہیں ۔ بلکہ ناکامی ، محرومیت اور یاس جیسی حسیات بھی پیدا کرتی ہیں ۔ مثلاً کم ذہانت ، ناقص حافظہ اور اپنے پیشے کے لیے صلاحیت کا فقدان بڑے تکلیف دہ امور ہیں ۔ ان خامیوں کی وجہ سے جماعت میں اچھا درجہ حاصل نہیں ہو سکتا ۔ پیشہ میں ترقی نہیں ہو سکتی اور ناموری ، شاباش اور عزت نہیں ملتی۔ جسمانی خامیاں بھی بڑا تنگ کرتی ہیں۔ جسمانی لاغری اور بیماری کھیلوں کے میدان میں بڑھنے نہیں دیتی ۔ اگر کسی عضو میں نقص ہو تو کئی کھیلوں سے انسان محروم ہو جاتا ہے ۔ شادی بھی حسب منشا نہیں کر سکتا ۔ اپنے پیشے میں خاطر خواہ کامیابی نہیں پا سکتا ۔ اگر کسی انسان میں معاشرتی ذہانت کی کمی ہو یعنی دوسروں

سے مل جل کر کام کرنے کی صلاحیت موجود نہ ہو تو دوستی نہیں بنا سکے گا اور سوسائٹی میں عزت نہیں حاصل کر سکے گا۔

۳۔ محرکات کا تصادم کئی صورتیں اختیار کرتا ہے:

(ا) دو یا دو سے زیادہ مثبت محرکات کا ایک ہی شخص کو تنگ کرنا۔ مثلاً رخسانہ کو پکچر دیکھنے کی دعوت ملتی ہے اس کا جی پکچر دیکھنے کو چاہتا ہے لیکن اپنی امی سے گھبراتی ہے۔ کیونکہ وہ ایسے مشغلے پسند نہیں کرتی۔ ماں بھی شاید کشمکش میں ہو وہ ایک طرف تو بیٹی کو خوش دیکھنا چاہتی ہے اور دوسری طرف اس کی تربیت کا خیال ہے۔

(ب) مثبت اور سلبی محرکات میں تصادم: مثبت محرک وہ ہوتا ہے جو مقصد کی طرف لے جائے۔ سلبی محرک اس کے برعکس ہے۔ وہ مقصد سے پرے لے جاتا ہے۔ ان میں تصادم کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔

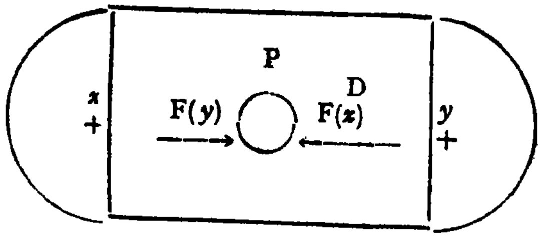
(i) سلبی محرک کی ایک صورت سستی، تھکاوٹ یا جمود ہے۔ بعض دفعہ سست آدمی اپنے حال میں مست رہتا ہے اور بعض دفعہ اپنی ناکامیوں سے پریشان ہو جاتا ہے۔ بعض آدمی سستی سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ وہ اپنے آپ کو کام کا اہل نہیں سمجھتے، محرومیت میں مبتلا رہتے ہیں۔ وہ کہہ دیتے ہیں کہ کام تو ان کے بس کا روگ نہیں۔ اور اس طرح ذمے داری سے بچ جاتے ہیں۔ کئی نوجوان معاشرتی ذہانت نہ ہونے کی وجہ سے پارٹی میں ٹھیک طرح سے شریک نہیں ہو پاتے اور الگ تھلگ کھڑے اپنی قسمت کو روتے ہیں۔

(ii) عموماً سلبی محرک کی شکل سزا کا خوف ہے۔ ایک مقروض بنک کے ملازم کو لیجیے، وہ روپے کو للچائی ہوئی نگاہوں

سے دیکھے گا ۔ لیکن پولیس کے خوف سے چرانے کی جرأت نہ کرے گا ۔ ہاں اگر اس نے پہلے بھی روپے چرائے ہوں اور پکڑا نہ گیا ہو تو دوبارہ چرانے کی جرأت کرے گا ۔ اگر چرانے اور نہ چرانے کے محرکات متوازن ہوں تو ملازم کشمکش میں مبتلا ہوجائے گا ۔ یہ کشا کش بڑی روح فرسا ہوتی ہے ، اس سے بچ نکلنے کی کوشش ہر انسان کرتا ہے ۔ یاد رہے کہ پولیس کے خوف کے علاوہ پبلک کا خوف بھی ہوتا ہے ۔ ملازم کہہ سکتا ہے کہ اگر میں نے چوری کی تو لوگ کیا کہیں گے ۔ میرے بچے کیا خیال کریں گے ، میرا خاندان بدنام ہو جائے گا وغیرہ وغیرہ ۔ یہ خوف بھی زبردست مانع ہوتا ہے اور کار بد سے باز رکھتا ہے ۔

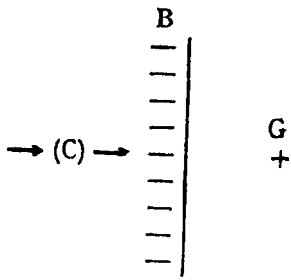
(iii) سلبی محرک انسان کا اپنا ضمیر اور اپنا اخلاقی معیار ہو سکتا ہے ۔ بنک کے ملازم کو پولیس یا پبلک کا خوف نہیں بلکہ اگر ڈر ہے تو اپنے ضمیر کا اور اخلاق گراوٹ کا ۔ اگر ضمیر طاقت ور ہو تو کشمکش کا سوال پیدا نہیں ہوتا ۔ لیکن اگر ضمیر کا ڈر اور روپے پیسے کا لالچ برابر وزنی ہوں تو کشمکش پیدا ہو جائے گی ۔

کشمکش کی حقیقت : کے ۔ لیون (K Levin) نے کشمکش کی تحلیل اور تشریح کے لیے ریاضیات سے تکنیک مانگی ہے ۔ جیومیٹری سے مقامیات (Topology) کا نظریہ لے کر انسان کو ماحول میں دکھایا جاتا ہے ۔ اس ماحول سے دو طاقتیں اٹھتی ہیں، ایک مثبت اور دوسری سلبی ۔ مثبت طاقت ترغیب دلانے والی ہے اور سلبی باز رکھنے والی ۔ ان طاقتوں کو گرفت (Valence) کہا جاتا ہے ۔ طاقتوں کی سمت اور شدت کو خط حامل (Vector) کہتے ہیں ۔ مندرجہ ذیل شکل دیکھیں اس میں ایک طاقت دوسرے سے زیادہ شدید دکھائی گئی ہے ۔



+ سے مراد ہے کہ گرفت مثبت ہے یعنی دونوں متبادل پسند ہیں ۔ بڑی اور شوخ + کا نشان ظاہر کرتا ہے کہ یہ متبادل زیادہ شدید ہے ۔ تیر ظاہر کرتے ہیں کہ کدھر کو انسان (P) کھچا جا رہا ہے ۔ لمبا تیر زیادہ کھچاوٹ ظاہر کرتا ہے ۔ اس شکل سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شخص (P) x کو y کی نسبت زیادہ پسند کر رہا ہے یعنی اس کا فیصلہ (D) x کے حق میں ہوگا نہ کہ y کے حق میں ۔

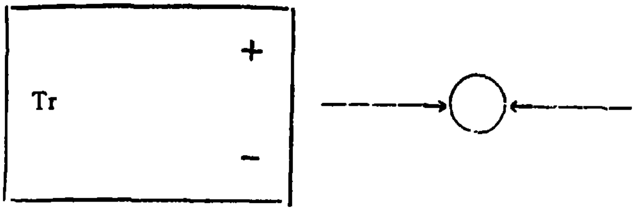
کشمکش تب پیدا ہوتی ہے جب کہ ترغیب دلانے والی اور منع کرنے والی طاقتیں مساوی یا قریباً مساوی وزن رکھیں ۔ مندرجہ ذیل شکل ملاحظہ ہو ۔



اس شکل میں محرک کی تشفی کے راستے میں طبعی رکاوٹ سد راہ کا کام دیتی ہے ۔ فرض کیا مقصد (G) کھلونا حاصل کرنا ہے ۔ یہ بچہ (C) کھلونے سے پرے ہے ۔ راستے میں رکاوٹ (B) آ جاتی ہے ۔ یہ سلبی گرفت ہے اور بچے کی محرومیت کا سبب ۔ طبعی رکاوٹ کی بجائے

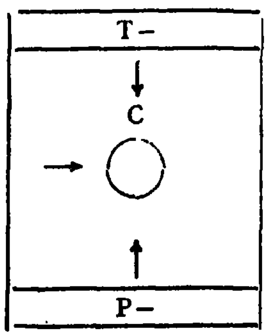
ماں باپ کی تنبیہ بھی سد راہ بن سکتی ہے۔ مثال کے طور پر کسی عورت کی شادی کے راستے میں خاندانی وقار کا خیال حائل ہو سکتا ہے۔ اس کو بھی اس شکل میں ظاہر کیا جا سکتا ہے۔

اب ایک اور شکل لیجیے۔ یہ بھی کشمکش ظاہر کرے گی۔



یہاں پر بچہ (C) درخت (Tr) پر چڑھنا چاہتا ہے لیکن گرنے کا ڈر ہے۔ درخت پر چڑھنے کا شوق اور گرنے کا ڈر + اور – گرفتیں ہیں۔ اگر ان کی طاقتیں مساوی ہوں جیسے کہ شکل میں دکھایا گیا ہے تو بچہ درخت پر نہیں چڑھیگا۔ لیکن اگر وہ اپنی حفاظت کا بندوبست کر سکے یعنی سلبی گرفت کی طاقت کو گھٹا دے تو درخت پر چڑھ جائے گا۔

اب تیسری شکل لیجیے۔



ناگوار کام (T) اور سزا (P) اس کے نہ کرنے پر دونوں سلبی گرفتیں ہیں۔ اگر دونوں ہی ایک برابر ناگوار ہوں جیسے کہ گرفت کے برابر

رقیب اور خطوط حامل یعنی تیر کی لمبائی ظاہر کرتے ہیں تو بچہ کشمکش کے میدان سے یا تو سیدھا بھاگ نکلے گا یا خیلات کی دنیا میں پناہ لے گا اور خیال کرے گا کہ کوئی کشمکش نہیں ۔

انتخاب ، مصالحت اور تذبذب Choice, Compromise and Vaccilation : کوئی انسان کشمکش میں رہنا پسند نہیں کرتا ۔ کشمکش میں ذہنی سکون جاتا رہتا ہے ، پریشانی لاحق ہوتی ہے ، نیند اڑ جاتی ہے اور توانائی یوں ہی خرچ ہوتی رہتی ہے ۔ لہٰذا ہر آدمی کوشش کرتا ہے کہ کسی نہ کسی فیصلہ پر پہنچ جائے اور کشمکش سے نجات پائے ۔

اس کا ایک طریقہ تو انتخاب ہے یعنی ایک متبادل کو چن لیا جاتا ہے اور دوسرے کو رد کر دیا جاتا ہے ۔ سوچ بچار کے بعد ایک متبادل بڑا دلآویز بن جاتا ہے دوسرا اس فائدہ سے محروم رہتا ہے ۔ دلآویز متبادل کو تو چن لیا جاتا ہے دوسرے کو رد کر دیا جاتا ہے ۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے چناؤ آسان کام نہیں ۔ بنجمن فرینکلن (Benjamin Franklin) نے انتخاب کا طریقہ اپنے ایک دوست کو لکھا ہے وہ واقعی بڑا مفید ہے ۔ وہ لکھتا ہے ، اہم کاموں میں تم میرا مشورہ چاہتے ہو لیکن مشورہ دینا آسان کام نہیں کیونکہ مشورہ تو اس وقت دیا جا سکتا ہے جب کسی معاملے کے تمام مخالف اور موافق نقاط ذہن کے سامنے ہوں اور ایسا کبھی نہیں ہوتا ۔ کبھی کوئی نقطہ سامنے آتا ہے ، کبھی کوئی ۔ لہٰذا ذہن کبھی ایک طرف جھکتا ہے کبھی دوسری طرف ۔ اور اس لیے انسان پریشان اور مضطرب رہتا ہے ۔ اس چیز کو دور کرنے کے لیے بنجمن کہتا ہے کہ میں کاغذ کے دو حصے کر لیتا ہوں، ایک حصے پر موافق اور دوسرے پر مخالف نقاط لکھ لیتا ہوں ، تین چار روز تک جو باتیں سوجھتی ہیں انھیں موافق اور مخالف حصوں میں لکھتا جاتا ہوں پھر ان کی اہمیت کا اندازہ لگاتا ہوں ۔ اگر دونوں طرف برابر کے

وزنی نقاط ہوں تو انہیں کاٹ دیتا ہوں اور اگر ایک طرف کے دو نقاط دوسری طرف کے تین نقاط کے برابر ہوں تو ان کو بھی کاٹ دیتا ہوں۔ اس طرح باقی جو بچ رہے اس سے اہمیت کا علم ہو جاتا ہے اور اگر مزید دو چار روز تک کوئی اور بات نہ سوجھے تو میں باقی نقاط کو دیکھ کر فیصلہ کر لیتا ہوں اور اس فیصلہ پر پکا رہتا ہوں۔

بعض دفعہ فیصلے خود بخود بھی ہو جاتے ہیں۔ مثلاً رشید یا تو مریم سے شادی کر سکتا ہے یا زینب سے۔ یہ کشمکش خود بخود دور ہو جائے گی اگر رشید کو علم ہو جائے کہ مریم کی شادی کہیں اور ہو گئی ہے۔

کشمکش کو دور کرنے کا دوسرا طریقہ مصالحت ہے۔ اگر ایک متبادل کی جانب بڑی رغبت ہو اور دوسرے کی جانب بڑی نفرت تو انسان پہلے مرغوب متبادل کی طرف جائے گا پھر ناپسندیدہ متبادل سے بھاگے گا۔ لیکن اگر ناپسندیدہ متبادل سے بہت ڈر لگتا ہو اور مرغوب متبادل کو بہت جی چاہتا ہو تو مصالحت کرنی پڑتی ہے۔ ناپسندیدہ شے سے ذرا ہٹ کر مرغوب شے کو حاصل کر لیا جاتا ہے۔ اگر بچے کے راستے میں والدین حائل ہوں اور بچہ باہر ہمجولیوں سے کھیلنا چاہتا ہو تو والدین سے آنکھ بچا کر بچہ ہمجولیوں سے کھیلے گا۔ یہاں پر دونوں متبادل قائم رہتے ہیں لیکن ایک سے بچنے کا ڈھنگ نکال لیا جاتا ہے۔

تیسرا طریقہ کشمکش سے بچنے کا تذبذب ہے۔ اگر دونوں ہی چیزیں اچھی ہوں یا دونوں ہی بری ہوں تو انسان کبھی ایک کی طرف جاتا ہے کبھی دوسری کی طرف یا کبھی ایک سے بھاگتا ہے کبھی دوسری سے۔ تذبذب پیدا اس لیے ہوتا ہے کہ دونوں متبادل میں اچھے پہلو ہیں اور ان کی اہمیت بھی مساوی ہے۔ للہٰذا اگر ایک متبادل کو وقتی طور پر چن بھی لیا جائے تو پشیمانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ خود انسان اپنے آپ سے کہتا ہے کہ میں نے دوسرا متبادل کیوں نہ چنا

وہ بھی تو اتنا ہی اچھا یا برا تھا ۔ مثلاً ایک لڑکا پڑھنا بھی چاہتا ہے لیکن والدین پر بوجھ بھی نہیں بننا چاہتا ۔ اس کی خواہش ہے کہ خود کمائے اور کھائے ۔ دونوں متبادل ایک جیسے وزنی ہیں ۔ یہ لڑکا بہت پریشان رہے گا کیونکہ متبادل میں سے ایک کو انتخاب کرنا اور دوسرے کو رد کرنا آسان کام نہیں ۔ ہاں اگر وہ ان متبادل میں مصالحت چاہے تو ممکن ہے لڑکا ٹیوشن کرے اور پڑھے ۔ وہ خود روپیہ کمائے گا اور اپنی تعلیم پر صرف کرے گا ۔ والدین پر بوجھ نہیں ہوگا ۔ تذبذب کی حالت بڑی پریشان کن ہے ۔ اس سے زندگی حرام ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس سے بچنے کی ممکن کوشش ہر انسان کرتا ہے ۔ لیکن ضروری نہیں کہ ہر انسان اس کوشش میں کامیاب بھی ہو ۔ ہر ایک کی قوت ارادی ایک جیسی نہیں ۔ بعض لوگ مضبوط ارادے کے ہوتے ہیں ، ایک دفعہ فیصلہ کر کے پیچھے نہیں ہٹتے۔ لیکن اکثر لوگ متلون مزاج ہوتے ہیں اور ہر قدم پر تذبذب کا مظاہرہ کرتے ہیں ۔

ناکامی (Frustration) :

اس امر کا ذکر آ چکا ہے کہ زندگی کے ہر قدم پر رکاوٹیں ہیں ۔ کوئی پلان بنائیں، کوئی لائحہ عمل وضع کریں اسے، جامہ عمل پہناتے وقت ~~پرلو~~ دقتیں آئیں گی ۔ لیکن دقتوں سے گھبرانا نہیں چاہیے بلکہ زیادہ ہمت اور کوشش سے کام لینا چاہیے ۔ رکاوٹیں دور ہو جائیں گی ۔ یا اپنے طریقے کو بدل دیں ، پلان کو زیادہ قابل عمل بنائیں ، رکاوٹیں خود بخود راستے سے ہٹ جائیں گی ۔ یا رکاوٹوں سے پرے ہٹ کر نیا راستہ تجویز کریں ۔ یہ راستہ شاید زیادہ راس آئے۔ لیکن اگر باوجود کوشش اور طریقے بدلنے کے کامیابی نصیب نہ ہو اور ناکامی منہ دکھائے تو پھر رد عمل کیا ہوگا ۔

ناکامی کا لفظ دو معانی میں استعمال کیا جاتا ہے، اس کا اطلاق یا تو مہیج پر ہوتا ہے یا رد عمل پر ۔ اگر رکاوٹیں دور نہ ہوں (مہیج)

تو انسان ناکام رہے گا - یا اگر وہ ناکامی کا مقابلہ غصے ' فکر اضطراب سے کرے (رد عمل) تو پھر بھی ناکام کہلائے گا - عام پر دیکھا گیا ہے کہ خوش باش ، با اعتماد اور بے فکر لوگ ناکامی سے اتنا نہیں گھبراتے جتنا فکر مند اور مضطرب لوگ - ووڈورتھ[1] کہ ہے ، اگر لکڑی آپ سے نہیں ٹوٹتی تو یا تو لکڑی سخت ہے یا کمزور ہیں - در حقیقت دونوں بیانات کا مطلب ایک ہی ہے - لیکن آپ جذباتی ہوں تو آپ لکڑی کو برا بھلا کہیں گے کہ اتنی سخت کیوں ہے یا اپنی کمزوری پر اظہار تاسف کریں گے اور اس ط احساس کمتری بھی پیدا کر لیں گے -

ہیجانی ناکامی میں کردار (Behaviour in Emotional Frustration)

ناکامی کی حالت میں انسان کا کردار معمول سے ہٹ جاتا ہے عجیب شکل اختیار کر لیتا ہے - ناکام آدمی پریشانی کے عالم میں ہے اور مسئلہ حل کرنے یا رکاوٹ دور کرنے کی بجائے اپنی پریشانی کرنے کے دھندے میں لگا رہتا ہے - چونکہ اس کا نقطۂ نگاہ حقیقت پسندانہ (Realistic) نہیں ہوتا ، اس لیے جو بھی طریقے پریشانی سے کے لیے اختیار کیے جاتے ہیں وہ عموماً غیر طبعی (Abnormal) ہوتے ہیں - ووڈورتھ ناکامی کے رد عمل کو تین جماعتوں میں تقسیم کرتا ہے:

(۱) بے سوچے سمجھے ہیجانی رد عمل -

(۲) الزام دھرنا -

(۳) اصل مقصد کو چھوڑ کر کوئی اور مقصد اختیار کر لینا

۱- بے سوچے سمجھے ہیجانی رد عمل ، اس کی چار صورتیں ہو سکتی ہیں :

(ا) غصہ اور دراز دستی (Angry Aggression) : ناکامی عام طور پر انسان غصے اور دراز دستی سے کام لیتا ہے

۱- ملاحظہ ہو اس کی Psychology -

تو وہ رکاوٹوں کو یا ان اشیا کو جو رکاوٹ کے بدل شمار کر لی جائیں ، زک پہنچانا چاہتا ہے ۔ بعض اوقات ظلم وستم اور دراز دستی سے ناکامی کا احساس کم ہو جاتا ہے ۔ مثلاً جب چور کو جو گھر میں آ گھسا ہو اور روپیہ نقدی چرا رہا ہو، گولی سے مار دیا جاتا ہے تو کامرانی اور فتح کا احساس ہوتا ہے ۔ لیکن عموماً دراز دستی سے ناکامی ختم نہیں ہوتی کیونکہ رکاوٹ بدستور موجود رہتی ہے ۔ صرف وقتی طور پر ناکامی کے ہمراہ جو ذہنی کھچاؤ آتا ہے وہ دور ہو جاتا ہے ۔ مثلاً بچے کا غصہ دیکھیں، پاگل نظر آتا ہے، ماحول سے نپٹنے کی بجائے اپنے ہیجانات کو ہوا دے رہا ہے ۔ ہر ایک کو لات لگاتا ہے ۔ میز سامنے آئی تو اسے ٹھوکر لگا دی ، گلاس سامنے آیا تو اسے زمین پر دے مارا ، بچہ غصہ تو نکال رہا ہے لیکن جس شے نے اسے ناکامی کا احساس دیا ہے وہ اس طریقے سے دور نہیں ہوتی ۔

دست درازی بالواسطہ یا بلاواسطہ ہو سکتی ہے ۔ انگلستان کے ایک قدیم بادشاہ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ سمندر کے ساحل پر بیٹھا تھا ۔ لہریں آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھیں حتیٰ کہ وہ اس کے قدموں تک پہنچ گئیں ۔ بادشاہ کو غصہ آیا اس نے حکم دیا کہ سمندر کو گستاخی کی سزا دی جائے ۔ چنانچہ لہروں کو زور زور سے کوڑے لگائے گئے ۔ لہریں بدستور بڑھتی رہیں البتہ بادشاہ کا غصہ کچھ فرو ہو گیا ۔ یہاں پر دراز دستی بلاواسطہ ظاہر ہوئی ہے ۔ کئی دفعہ اس کا اظہار بالواسطہ ہوتا ہے ۔ دراز دستی کا شکار اصل شخص کی بجائے کوئی اور شخص یا شے بن جاتی ہے ۔ اس کی دو وجوہات ہوتی ہیں ۔

(ا) ناکام آدمی کو ڈر رہتا ہے کہ اگر اصلی شخص سے کوئی جھگڑا کیا تو اسے خود نقصان پہنچے گا ۔ مثلاً ماتحت اپنے

افسر کو تنخواہ بڑھانے کے لیے کہتا ہے - لیکن اس کی درخواست مسترد ہو جاتی ہے - ماتحت ڈرتا ہے کہ اگر میں نے افسر سے کہا کہ درخواست نہ منظور ہونے پر مجھے رنج اور صدمہ ہوا ہے تو افسر ناراض ہو جائے گا - اس لیے وہ اپنا غصہ ماتحتوں پر نکالتا ہے ، چپراسی کو برا بھلا کہتا ہے - مالی کو ملازمت سے برطرف کر دیتا ہے، بیوی کو لعن طعن کرتا ہے ، بچوں کو زد و کوب کرتا ہے -

(ب) ناکام آدمی غصے کو پی جانے کی کوشش کرتا ہے - وہ اپنے آپ کو الزام دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ ترقی کا مستحق نہیں تھا - اس احساس سے اس کی ناکامی میں اور اضافہ ہوگا - وہ مایوس ، ہراساں اور پریشان رہے گا - ہولینڈ (Haveland) کا خیال ہے کہ ظلم اور دست درازی کی واردات کساد بازاری اور بیکاری کے زمانے میں زوروں پر ہوتی ہیں - انسانوں کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں اور وہ ایک دوسرے کا گلہ کاٹنے کو تیار ہو جاتے ہیں - کساد بازاری کے زمانے میں قتل و غارت کے واقعات بھی بڑھ جاتے ہیں، لیکن خوشحالی میں گھٹ جاتے ہیں - حبشیوں کے خلاف جو جذبہ امریکیوں کے دل میں ہے اس کی اصل وجہ امریکہ میں بے کاری اور روپیہ پیسے کی کمی ہے - لیکن امریکیوں کو پتہ نہیں کہ کون سے اسباب ان کی تکلیف کے ذمہ دار ہیں، اس لیے وہ حبشیوں کو صدقے کا بکرا بنا کر اپنا غصہ نکالتے ہیں -

صدقے کا بکرا (Scapegoat) : یوں تو زندگی کے ہر میدان میں ذاتی اغراض کی خاطر دوسروں کو صدقے کا بکرا بنایا جاتا ہے لیکن اس کا اظہار نسلی تعصب میں بڑی سختی سے ہوتا ہے - جب کبھی طاقت ور گروپ کو زک پہنچتی ہے تو وہ کمزور گروپ کو تختۂ مشق بنا کر

اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتا ہے ۔ نازی جرمنی میں یہودیوں کے خلاف بڑا جذبہ تھا ۔ نازی خیال کرتے تھے کہ ان کی ہر مصیبت کی ذمہ داری یہودیوں پر عائد ہوتی ہے، حالانکہ یہ دعوے بے بنیاد تھا ۔ اصل وجہ یہ تھی کہ دونوں عالمی جنگوں میں جرمنوں کو زبردست نقصان پہنچا تھا ۔ ان کی بین الاقوامی عزت خاک میں مل گئی تھی ۔ اس کے علاوہ معاشی تنگیوں نے ان کا برا حال کر رکھا تھا اور یوں بھی جرمنوں کو صدیوں سے یہودیوں کے خلاف بغض تھا ۔ لہٰذا جب جرمنوں کو ناکامی کا احساس تنگ کرنے لگا تو انھوں نے یہودیوں کو قربانی کا بکرا بنا کر اپنا دل ٹھنڈا کر لیا ۔

غیض و غضب کا مرکز بعض اوقات انسان کی اپنی ذات بن جاتی ہے اور شکست خوردہ انسان اپنے آپ سے اتنا تنگ آ جاتا ہے کہ وہ زندگی کو موت پر ترجیح دیتا ہے ۔ خود کشی کے واقعات انسان کی بے بسی، بے اعتمادی اور سادیت (Sadism) کی غمازی کرتے ہیں ۔ کارل ۔ اے ۔ مینںگر (Karl A. Menniger) ایک عورت کی ڈائری بیان کرتا ہے جس نے خود کشی کی ہے ۔ یہ عورت لکھتی ہے "مجھ سے مت دریافت کرو کہ میں کیوں مرنا چاہتی ہوں ۔ اگر مجھ میں طاقت ہوتی تو میں تم سے پوچھتی کہ مجھے کیوں زندہ رہنا چاہیے ۔ لیکن اب میرے پاس سوائے حیرانی کے کچھ نہیں اور حیرانی بھی مشکل ہے ۔ کیونکہ میں نے مرنے کے حق میں کبھی کا فیصلہ کر لیا ہے ۔ اگر سچی بات کہوں تو میں وہم میں مبتلا ہوں ۔ میں وہموں کے ہاتھوں تنگ ہوں ۔ مجھے سمجھ نہیں آتا کہاں وہم ختم ہوتے ہیں اور کہاں حقیقت شروع ہوتی ہے ۔ میں اس دنیا میں رہتی ہوں جہاں وہم نے حقیقت کا جامہ پہن رکھا ہے ۔ مجھے زیادہ کام کرنے میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا ۔ مجھے یہ ہزار درجے بہتر نظر آتا ہے کہ زمین میں مل کر خاک ہو جاؤں بہ نسبت اس امر کے کہ بے پناہ مظالم برداشت

کروں ۔ ایغو جو کبھی میری تشفی کا باعث بنتا تھا اب اس قدر حقیر نظر آتا ہے کہ مجھے اس سے نفرت ہو گئی ہے ۔ میرے جیسا بے کار ایغو جس کا فائدہ نہ مجھے ہو نہ کسی اور کو ، بہتر ہے اس دنیا سے رخصت ہو جائے اور موت کے بے پایاں سمندر میں ڈوب جائے ۔ اس ڈائری سے پتہ چلتا ہے کہ عورت اپنی خودی کو کھو بیٹھی ہے اور اپنے آپ کو عضو معطل سمجھتی ہے ۔ اس کے علاوہ اسے دنیا اور اس کے مظالم سے نفرت ہے ۔ لیکن زیادہ نفرت اسے اپنے آپ سے ہے اسی لیے خود کشی کی خواہشمند ہے ۔

(ب) بے چارگی اور بے بسی کی حالت میں فکر و اندیشہ : بچہ غصے کی بجائے بلبلانے لگتا ہے ۔ ایسے روتا ہے جیسے وہ انتہا درجے کا لاچار ، مجبور اور بےبس ہے ۔ رونے دھونے سے اس کی تکلیف رفع نہیں ہوتی اور نہ ہی ماحول سازگار بن جاتا ہے ، البتہ اس کا دل ہلکا ہو جاتا ہے اور کچھ لوگ ترس کھا کر اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں ۔ بچہ بے بس ، مظلوم اور افسردہ نظر آتا ہے ، پیار اور محبت چاہتا ہے لیکن اس کا رد عمل حقیقت پسندانہ نہیں ہوتا ۔ بڑے آدمی بھی مایوسی کی حالت میں بے بسی اور بد حواسی کا مظاہرہ کرتے ہیں ۔ ان کا کردار ظاہر کرتا ہے کہ وہ غیر حفاظتی کے شکار ہیں ، مسائل سے نپٹنے یا ماحول سے نبرد آزما ہونے کی بجائے بچوں کی طرح رونا دھونا شروع کر دیتے ہیں ۔

(ج) رجعت (Regression) : بعض دفعہ بے نیل و مرام لوگ لاشعوری طور پر بچپن کی طرف لوٹ آتے ہیں ۔ جس زندگی کی منزل پر وہ جاگزیں ہیں اس کی ذمہ داریاں اٹھانے کی سکت اپنے آپ میں نہیں پاتے ۔ جو مسائل ان کو در پیش ہیں انہیں بھی حل نہیں کر سکتے ۔ اس لیے وہ ان منازل کی طرف

لوٹتے ہیں جن کے مسائل وہ حل کر چکے ہیں اور جہاں کے
نشیب و فراز سے واقف ہیں ۔

زندگی کی کسی منزل پر رجعت ہو سکتی ہے ۔ والدین کو چاہیے کہ بچوں کو خود مختاری اور رجعت پسندی میں توازن رکھنا سکھائیں ۔ گھروں میں جب دوسرا بچہ آتا ہے تو پہلا بچہ ڈر کے مارے کہ اب وہ پیار اور محبت کا مرکز نہیں رہے گا رات کو چارپائی پر پیشاب کرنے لگتا ہے ۔ یہ ایک قسم کی رجعت ہے ۔ اس کی عمر کے بچے چارپائی پر پیشاب نہیں کرتے ، چھوٹے بچے کرتے ہیں ۔ چارپائی پر پیشاب کرنے سے ایک تو وہ دوبارہ بچہ بن جاتا ہے اور دوسرے ماں باپ کی توجہ اپنی طرف کھینچتا ہے اور شاید لاشعوری طور پر انہیں سزا بھی دے رہا ہو ۔

میسرمین (Masserman) نے ایک نوجوان لڑکی کا کیس بیان کیا ہے[۱] جو اپنے باپ کی اس قدر گرویدہ تھی کہ زندگی میں آگے بڑھنا نہیں چاہتی تھی ۔ لہذا اس نے بڑی ہو کر ایسا کردار اختیار کیا جو ہر وقت تقاضا کرتا تھا کہ اس کی حفاظت کی جائے اور اسے لاڈ پیار میں رکھا جائے ۔ میسرمین لکھتا ہے کہ اس سترہ سالہ لڑکی کو اس کی ماں کلینک میں لائی کیونکہ پچھلے پانچ مہینے سے اس کا کردار بالکل تخریبی اور پاگلانہ تھا ۔ احوال کے مطالعہ سے پتہ چلا کہ جب یہ لڑکی چار سال کی تھی تو اس کے والدین اکثر لڑتے جھگڑتے رہتے تھے ۔ اس سے بچی بڑی پریشان رہتی تھی ۔ اس عمر میں اس نے ناخن کاٹنے شروع کیے ۔ غصے میں آگ بگولہ ہو جاتی تھی ۔ رات کو چارپائی پر پیشاب کر دیتی تھی اور کئی قسم کے خوف سے ڈرتی رہتی تھی ۔ باپ سے اسے بے حد پیار تھا لیکن جب وہ سات سال کی ہوئی تو اس کی ماں اس کے باپ سے علیحدہ ہو گئی اور اس نے بچی کو اپنی پناہ میں لے لیا اور علیحدہ گھر

۱۔ ملاحظہ ہو اس کی کتاب Principles of Dynamic Fsychiatry ۔

میں رہنے لگی ۔ بچی کو اس پر غصہ آتا ۔ وہ ماں سے اکثر لڑتی جھگڑتی تھی، گھر میں فساد برپا کرتی تھی، سکول والوں کا کہنا نہیں مانتی تھی ۔ تین سال بعد اس کی ماں اسے باپ کے پاس لے گئی ۔ دوبارہ ماں باپ کا جھگڑا ہو گیا اور ماں لڑکی کو دوبارہ گھر لے آئی ۔ اس پر لڑکی نے سکول جانا چھوڑ دیا ۔ سب سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور چپ سادھ لی ۔ ماں کی غیرحاضری میں وہ گھر کی چیزیں اِدھر اُدھر پھینک دیتی تھی اور جو کپڑے اس کی ماں نے اس کے لیے بنوائے تھے انہیں پھاڑ دیتی تھی ۔ ایک دفعہ اسے اپنی تصویر ملی جس میں سوائے بھوؤں کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا ۔ تصویر دیکھنے کے بعد اس نے بال منڈھوا ڈالے اور کوشش کی کہ تصویر کے مطابق اس کے خدو خال بن جائیں ۔ جب اس لڑکی کو ہسپتال لے کر آئے تو وہ بڑی غلیظ تھی بستر پر پیشاب کر دیتی تھی ۔ بچوں کی طرح چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی تھی ۔ اپنا وقت گڑیوں کے ساتھ کھیلنے میں گزارتی تھی ۔ اسے کھلانا نہلانا اور دھلانا پڑتا تھا جیسے کہ وہ کوئی بچہ ہو ۔

وطن یا گھر کی یاد بھی بعض لوگوں کو ملول اور افسردہ رکھتی ہے ۔ یہ بھی ایک قسم کی رجعت ہے ۔ نئے ماحول کو مشکل پا کر اور نئے مسائل سے گھبرا کر لوگوں کو گھر یاد آتا ہے ۔ گھر میں ان کے عزیز و اقارب بہن بھائی ذمے داریوں میں شریک ہونے کے لیے ہر دم تیار نظر آتے تھے اور نئے ماحول میں کوئی ایسا ہمدرد نظر نہیں آتا ۔

(د) تثبیت (Fixation) : جب کوئی شخص بار بار ناکام ہوتا ہے تو موجودہ تکلیف دہ ماحول سے بچنے کے لیے وہ پہلی منزل کے کسی کردار کو اپنا لیتا ہے اور اس کردار کو اسی طریقہ پر ادا کرتا رہتا ہے ۔ یہ طریقہ مسائل کو حل نہیں کرتا ۔ لاشعوری طور پر کچھ نہ کچھ تشفی کا باعث بنا رہتا ہے ۔ اجباری حرکات (Compulsive Acts) کا شمار

تبثیت میں ہوتا ہے۔ یہ حرکات بڑی عجیب و غریب ہوتی ہیں۔
مریض کو بظاہر ان سے کچھ فائدہ بھی نہیں پہنچ رہا ہوتا
لیکن پھر بھی مجبوراً انہیں ادا کرنا پڑتا ہے۔ بعض دفعہ یہ
حرکات بے ضرر ہوتی ہیں اور بعض دفعہ مریض کو نقصان
پہنچاتی ہیں۔ مریض کو پتہ ہوتا ہے کہ یہ حرکات فضول اور
بے کار ہیں لیکن چھوڑ نہیں سکتا اور ان کا مقابلے کرنے میں
جو طاقت صرف ہوتی ہے، اس سے مریض کی پریشانی میں
اضافہ ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ اجباری حرکات اکثر اشاراتی
(Symbolic) ہوتی ہیں۔

مریض ان کے مطلب نہیں سمجھتا لیکن حقیقت میں مریض ان کے ذریعے اپنے مسائل کا حل ڈھونڈ رہا ہوتا ہے۔ ایک کیس دیکھیں جسے رش (Ruch) نے بیان کیا ہے۔ اس نے ایک عورت کو دیکھا جو متواتر بیس منٹ سے دوپٹہ لٹکا رہی تھی۔ یوں اس کام پر پانچ منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگنا چاہیے۔ اس عورت کے پیش نظر مسئلہ یہ تھا کہ دوپٹے کے سلوٹ سیدھے پڑیں۔ اس لیے وہ دوپٹے کی طرف جاتی تھی سلوٹ ٹھیک کرتی تھی، پھر دور کھڑے ہو کر دیکھتی تھی کہ سلوٹ حسب منشا پڑ گئے ہیں۔ اس کام میں بیس منٹ لگ گئے۔ مطالعہ احوال سے پتہ چلا کہ وہ اپنے خاوند کو مجبور کیا کرتی تھی کہ موٹر پر باہر چلیں۔ پھر موٹر گرد آلود سڑک کے کنارے کھڑی کر کے باہر نکل پڑتی تھی اور گرد کو اس طرح چھانتی تھی جیسے کوئی چیز ڈھونڈ رہی ہو۔ لیکن اسے پتہ نہ تھا کہ کس چیز کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

تحلیل نفسی سے معلوم ہوا کہ مریضہ کا ہر شے کو ٹھیک ٹھاک رکھنا جو دوپٹے کے سلوٹ صحیح کرنے سے معلوم ہوتا تھا اور اس کا کسی گم شدہ شے کا تلاش کرنا محض اشاراتی حرکات ہیں جن کا مطلب مریضہ نہیں جانتی۔ اصل بات یہ تھی کہ شادی سے پہلے مریضہ کے

جنسی تعلقات کسی مرد سے تھے ۔ اس کا ذکر اس نے خاوند سے کبھی نہیں کیا تھا ۔ لیکن ان جنسی تعلقات سے وہ ہمیشہ فکر مند رہتی تھی اور ضمیر کی ملامت سنتی رہتی تھی ۔ آہستہ آہستہ مریضہ کے تلخ تجربات شعور سے نکل کر لاشعور میں مقیم ہو گئے اور مریضہ کا عجیب و غریب رویہ اشارتی طور پر اس پاکیزگی اور پاک دامنی کو ڈھونڈ رہا تھا جو وہ کھو چکی تھی ۔

(ج) ابطان (Repression) : امراض ذہنی میں شعور کو چھوڑ کر اکثر لاشعور میں بیماریوں کے اسباب ڈھونڈنے پڑتے ہیں ۔ کیوں کہ اسباب کا علم مریض کو نہیں ہوتا۔ وہ بھول چکا ہوتا ہے کہ کیوں اور کس وجہ سے اس کا موجودہ کردار معمول سے ہٹ کر عجیب ہیئت اختیار کر گیا ہے ۔ شروع میں تو اسباب کا علم شعور میں موجود ہوتا ہے بعد میں انہیں لاشعور میں دبا دیا جاتا ہے اور دبنے کے بعد یہ لاشعور کا حصہ بن جاتے ہیں اور وہاں سے مریض کے کردار کو متأثر کرتے ہیں ۔ مثلاً مارٹن پرنس (Morton Prince) نے ایک عورت کا قصہ بیان کیا ہے جو قلعوں اور گرجاؤں کے میناروں سے ڈرتی تھی اور خصوصاً ان میناروں سے جہاں گھنٹیاں بجتی ہوں ۔ مریضہ اپنے خوف کی وجہ بیان نہیں کر سکتی تھی ۔ لیکن ہپنٹزم کے زیر اثر اسے بچپن کی کچھ یادیں آئیں ۔ اس نے کاغذ پر لکھا ”جی ۔ ایم ۔ چرچ اور میرا باپ ، میری ماں کو بی آنی لے گئے —جہاں وہ مر گئی اور پھر ہم بی آر چلے گئے— اور انھوں نے میری ماں کے ٹکڑے کر دیے اور گرجے کی گھنٹیاں بجتی رہیں ۔ مجھے ان سے نفرت ہے “ ۔ لکھتے ہوئے مریضہ رو رہی تھی ۔ جب یہ عورت ہوش میں آئی تو نفسی معالج کی مدد سے بہت سا قصہ یاد آ گیا ۔ اس کی ماں کا ایک

دفعہ اپریشن ہوا ، جس میں وہ مر گئی ۔ اس لڑکی کو خیال تھا کہ اس نے اپنی ماں کی ٹھیک طرح سے خدمت نہیں کی لہٰذا ہر وقت پریشان اور افسردہ رہتی تھی ۔ اس کا ضمیر بھی اسے کوستا تھا اور یہ تھا ''گرجا گھر کی گھنٹیاں بجتی رہنے'' کا مطلب گو مریضہ کو قصہ یاد آ گیا لیکن اس کا ڈر اس وقت تک دور نہ ہوا جب تک کہ مارٹن پرنس نے اسے یقین نہ دلایا کہ اس نے ماں کی بڑی خدمت کی اور اس کی ماں کی موت طبعی اسباب سے ہوئی جو انسانی حیطۂ اقتدار سے باہر ہیں۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیوں بعض نفسی واردات کو تو دبا دیا جاتا ہے لیکن بعضوں کو نہیں ، اس کا جواب یہ ہے کہ صرف انھی نفسی واردات کو دبا دیا جاتا ہے جو ایغو کی نظر میں تلخ ، غیرشریفانہ اور بے ضروری ہوں ۔ مثلاً بے بسی کی حالت میں رونا اور بلبلانا بڑے تلخ اور تکلیف دہ واردات ہیں ۔ یہ تکلیف اور بھی بڑھ جائے گی اگر ماں باپ بچے کو خاموش کرانے کے لیے جھڑکیں یا ماریں پیٹیں۔ واقعہ کے بعد مار پیٹ یا جھڑکیوں کے تکلیف دہ واقعہ کی یاد کا شعور میں رہنا زندگی کو وبال بنانے کے مترادف ہے ۔ لہٰذا بچہ اس واقعہ کی یاد کو شعور سے نکال کر لاشعور میں لے جاتا ہے ۔ بچے کو یاد بھی نہیں رہتا کہ کبھی اسے جھڑک پڑی تھی یا ماں باپ نے مارا تھا ۔ لاشعور میں پہنچ کر یہ تکلیف دہ واقعہ اپنی قسم کے دیگر واقعات سے مل کر ایک خلط (Complex) بنا لیتا ہے جو کئی طریقوں سے اپنا اظہار کرتا ہے ۔

٢۔ الزام دھرانا : انسان جب اپنے مقاصد میں فیل ہو جاتا ہے تو اپنے آپ کو الزام دینے کی بجائے کسی اور چیز کو مورد الزام ٹھہراتا ہے ۔ ماحول کو برا بھلا کہتا ہے یا مقصد کو مشکل اور ناممکن الحصول قرار دیتا ہے ۔ کالجوں اور سکولوں میں کئی طلبہ

دل لگا کر کام نہیں کرتے۔ اس کی ذمہ داری وہ حالات کے کندھوں پر تھوپ دیتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں ہوسٹل میں لڑکے پڑھنے نہیں دیتے۔ کالج میں اُستاد صاحبان نہیں پڑھاتے۔ پھر ہر روز یونیورسٹی کے امتحانات ہیں، کس چیز کو پڑھیں کس کو نہ پڑھیں۔ یہ طلبہ اس چیز کو بھول جاتے ہیں کہ کام نہ کرنے کی اصل وجہ وہ خود ہیں ۔ اگر انسان کا جی کام کو نہ چاہے تو ہزاروں بہانے تراشے جاتے ہیں اور اگر اس کا جی چاہے تو نامساعد حالات کے باوجود بھی کام کر لیا جاتا ہے ۔

الزام دھرنے کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں ۔

(ا) تعقیل(Rationalisation) : تعقیل سے مراد اپنے افعال اور عقاید کو اصلی اور غیر قابل قبول محرکات کی بجائے ان سے منسوب کرنا ہے جو انفرادی اور جماعتی لحاظ سے قابل قبول ہوں ۔ یہ عمل لاشعوری طور پر سر انجام پاتا ہے ۔ اپنے اعمال اور افکار کی توجیہ یا تشریح کرتے وقت ایسے دلائل پیش کیے جاتے ہیں جو بظاہر معقول ہوں اور سننے والا انہیں سچ مان لے، لیکن وہ اصلی اور حقیقی نہیں ہوتے۔ تقسیم ملک سے پہلے بعض لوگ ریل کا ٹکٹ نہیں خریدتے تھے اور بہانہ یہ بناتے تھے کہ ریلوں کے مالک غیر ملکی ہیں ، منافع بھی وہی کما رہے ہیں۔ ہندوستانیوں کو اس سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا ۔ لہٰذا اگر ٹکٹ نہ خریدنے سے غیر ملکیوں کو تھوڑا سا نقصان پہنچ جائے تو روا ہے ۔ اب بھی بعض لوگ ٹکٹ نہیں خریدتے اور کہتے ہیں کہ ملک کی دولت امیروں کے لیے ہے اس لیے غریب جس طریقے سے بھی کچھ بچا سکیں جائز ہے ۔ یہ سب جھوٹے دلائل ہیں ۔ اصل وجہ ان کی بددیانتی ، بدنیتی اور وطن دشمنی ہے ۔ بین الاقوامی سطح پر جو دلائل ایک قوم دوسرے کے خلاف دیتی ہے یا

اپنے تحفظ میں پیش کرتی ہے وہ بہانہ تراشی کی عمدہ مثالیں ہیں ۔ کشمیر کے مسئلہ پر طرفین کے دلائل کا جائزہ لیں تو تعقیل کی جیتی جاگتی تصویر آپ کی آنکھوں کے سامنے آ جائے گی ۔ انگریزوں نے سفید نسلوں کی ذمہ داری (White Man's Burden) کے بہانے بنا کر امپریلزم کے جال پھیلائے اور افریقہ اور ایشیا کی کمزور اور نہتی اقوام پر قبضہ جما لیا ۔ طلبہ بھی بہانہ سازی میں کسی سے کم نہیں ۔ کام سے گھبرا کر یا محض سستی کی وجہ سے کہہ دیتے ہیں کہ میری عمر کے لیے یہ کام بڑا مشکل ہے یا کہتے ہیں کہ یہ کام تو ٹھیک ہے لیکن حقیقی زندگی سے اس کا کوئی لگاؤ نہیں ۔ اگر میں فیل بھی ہو جاؤں تو پروا نہیں ، آج کل پاس ہونا یا فیل ہونا ایک برابر ہے کیونکہ ملازمتیں تو ملتی نہیں اور اگر ملتی ہیں تو سفارش سے ، قابلیت کو کوئی نہیں پوچھتا ۔ یا کہتے ہیں میرے حالات خراب ہیں گھر میں غریبی ہے ، ماں باپ لڑتے رہتے ہیں ، ایک منٹ کا چین نصیب نہیں ، پڑھوں تو خاک پڑھوں ۔ لیکن یہ سب بہانے ہیں ۔ کام کرنے کو جی نہیں چاہتا اور تعقیل سے کام لیا جاتا ہے ۔

(ب) **انگور کھٹے ہیں (Sour Grapes)** : بعض دفعہ جو چیز ہاتھ نہیں آتی اسے برا کہہ کر کشمکش سے نجات پا لی جاتی ہے ۔ مثلاً کسی شخص کو پارٹی پر دعوت نہیں دی جاتی ، وہ کہتا ہے کہ میں تو ایسی پارٹی میں جانا ہی نہیں چاہتا تھا یہ تو ہلکے لوگوں کی پارٹی ہے ۔ علاوہ ازیں میں کوئی نکما تھوڑا ہی ہوں ، مجھے کئی ضروری کام کرنے ہیں ۔ یا کسی طالب علم کو اچھے کالج میں داخلہ نہیں ملتا تو کہتا ہے

کہ یہ کالج بھی اچھا نہیں رہا ۔ فرسٹ ڈویژن طالب علم
لے کر تھرڈ ڈویژن میں پاس کراتا ہے ۔ پروفیسر ہیں کہ
کلاسیں نہیں لیتے ۔ طلبہ ہیں کہ شہزادے بنے رہتے ہیں ۔
میرا تو شروع سے اس کالج میں داخل ہونے کو جی نہیں
چاہتا تھا ۔ یا کوئی لڑکا امیر گھرانے کی لڑکی سے شادی
کرنے میں ناکام رہتا ہے تو کہتا ہے کہ امیر لڑکیاں
عموماً اچھے کیرکٹر کی نہیں ہوتیں ، وہ تو سارا وقت بال
بنانے میں مصروف رہتی ہیں ۔ میں کب کہتا تھا کہ امیر لڑکی
سے شادی کروں وہ تو میرے والدین تھے جو مجھے مجبور
کر رہے تھے ۔

جو لوگ دولت حاصل نہیں کر سکتے وہ کہتے ہیں کہ دولت ایک پھندا ہے جو خدا سے پرے رکھتا ہے ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب لوگ دنیا میں کامیاب نہیں ہوتے تو جوگی اور درویش بن کر دنیا کو ناگن اور ڈائن بناتے ہیں اور لوگوں کو تلقین کرتے ہیں کہ اس کے دام فریب میں نہ آئیں ۔

تظلیل (Projection) : کالج کے چند طلبہ کو کہا گیا کہ وہ مندرجہ ذیل خصائص سے اپنا اور دوسروں کا جائزہ لیں :

بخل ۔ ضد ۔ بدلگامی ۔ حیاداری ۔

ان جائزوں کا جب مطالعہ کیا گیا تو کئی دلچسپ باتیں نکلیں ۔ جن اشخاص میں کوئی خاص وصف نمایاں حد تک موجود تھا وہ دوسروں کو اس صفت سے بہت زیادہ متصف دیکھتے تھے ۔ مثلاً جو بچے خود دغا باز ہوں وہ دوسروں کی دغا بازی خوب معلوم کر لیتے ہیں اور جو لڑکے روشن دماغ ہوں وہ روشن دماغی کو خوب بھانپ لیتے ہیں ۔ فرائڈ (Freud) کا کہنا کہ لوگ اپنی خوبیاں اور برائیاں دوسروں پر تھوپ دیتے ہیں ، بالکل صحیح اور درست ہے ۔ ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا

ایک پرانا مقولہ ہے ۔ خود غرض آدمی ساری دنیا کو خود غرض دیکھتا ہے اور بزدل ہر آدمی کو بزدل خیال کرتا ہے - ایسے ہی بوڑھی عورتوں کا وہم کہ جب مرد عورتیں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو سوائے پیار محبت کے ان کا کوئی منشا نہیں ہوتا ، ایک قسم کی تظلیل ہے ۔ جب دو کاروں کی ٹکر ہوتی ہے تو ڈرائیور خود کو الزام نہیں دے گا بلکہ دوسرے ڈرائیور کی نا لائقی بیان کرے گا اور اس کے بروقت بریکیں نہ لگانے کو ٹکر کا ذمہ دار قرار دے گا۔ حالانکہ وہ خود نالائق ہوتا ہے اور خود وقت پر بریکیں نہیں لگاتا ۔ پس جب کوئی ایسا شخص دیکھیں جو دوسروں کی غلطیاں زور شور سے نکالے ، تو پہلے ان غلطیوں کو نکتہ چیں کی ذات میں دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے - جو آدمی ساری دنیا کو نا اہل کہتا ہے وہ خود بھی ضرور نا اہل ہوگا ۔ آسکروائلڈ (Osacr Wilde) نے خوب کہا ہے کہ ''ہر نکتہ چینی ایک قسم کی اپنی سوانح عمری ہے'' ۔ یعنی نکتہ چین اپنی ذات کو اجاگر کر رہا ہے -

۳- اصل مقصد کی بجائے کوئی اور مقصد ڈھونڈھ لینا : محرومیوں سے نجات پانے کا طریقہ یہ بھی ہے کہ اصل مقصد کی بجائے جس میں پے در پے ناکامی ہوتی ہے کوئی اور مقصد اختیار کیا جائے جس میں کامیابی یقینی امر ہو ۔ اصل مقصد کے ذرائع بدلے جا سکتے ہیں یا کوئی اور ملتا جلتا مقصد یا بالکل ہی مختلف مقصد اختیار کیا جا سکتا ہے ۔ بعض دفعہ ناکامی اس وجہ سے بھی ہوتی ہے کہ مقصد بہت اونچا ہے ۔ لہٰذا اسے نیچا لے آنا چاہیے تا کہ شکست نہ ہو اور خود اعتمادی قائم رہے ۔ لیکن کچھ لوگ ناکامیوں سے ڈر کر ہمیشہ اپنے مقاصد نیچے رکھتے ہیں جو ٹھیک نہیں ۔ اس مغالطے کی کئی صورتیں ہیں ۔

(ا) ترفع (Sublimation) : بعض اوقات خارجی دباؤ یا نامساعد حالات کے باعث انسان اپنی خواہشات کو پورا نہیں کر سکتا ۔

لٰہذا اس مقصد کو چھوڑ کر وہ ایسا مقصد اختیار کر لیتا ہے جو انفرادی اور اجتماعی لحاظ سے زیادہ موزوں ، مہذب اور کارآمد ہو ۔ مثلاً اگر کسی عورت کے اپنے بچے نہ ہوں تو وہ بچوں کے فلاح و بہبود کے ادارے کی نگران بن جائے اور صبح و شام بچوں کی بہتری کی سکیمیں بنائے ۔ یا وہ شخص جو کسی خاص جگہ پر شادی میں ناکام رہتا ہے، شادی کا خیال ترک کر کے اعلیٰ پایہ کے عشقیہ شعر کہنے لگے یا مصور یا بت‌تراش بن جائے ۔ شروع شروع میں تجزیۂ نفس کے عالموں کا خیال تھا کہ ہر قسم کے فن اور ادب کی تخلیق جنسی خواہش کی عدم تشفی سے ہوتی ہے ۔ لیکن یہ بات صحیح نظر نہیں آتی ۔ کیونکہ تجربوں نے ثابت کر دیا ہے کہ فن کاروں اور سائنس دانوں میں جنسی خواہش کی نوعیت وہی ہوتی ہے جو عام انسانوں میں ہوتی ہے ۔ ویسے ہی ان کے بیوی بچے ہوتے ہیں ۔ لٰہذا جنسی خواہش کی طاقتوں کو علم و ادب کے پناہ دینے کا نظریہ درست نظر نہیں آتا ۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل کی نفسیات میں ترفع پر کم زور دیا جاتا ہے ۔ اس کے علاوہ جو نوجوان عشقیہ نظمیں لکھتا ہے وہ محبوبہ کے علاوہ اپنی شاعری میں بھی دلچسپی رکھتا ہے ۔ وہ اچھے شعر اس لیے نہیں کہتا کہ اس کی محبوبہ بڑی حسین ہے بلکہ اس لیے بھی کہ اسے اپنے فن کا پاس ہے اور وہ شاعری کو دھبہ نہیں لگانا چاہتا ۔ ایسے ہی آرٹ اور سائنس کو ناکام محبت کا آلہ اظہار سمجھنا حقیقت کا مذاق اڑانا ہے۔ کیونکہ ان مضامین کی اپنی اپیل بھی ہے ۔ اگر ناکام عاشق کھیلوں میں حصہ لینے لگتا ہے تو کھیلوں کی اپنی جداگانہ حیثیت ہے ۔ اور یہ حیثیت اس امر کی متقاضی ہے کہ کھیلوں کو اصولوں کے

مطابق کھیلا جائے اور ان میں ٹھیک طرح کھیل کھیلنے سے ناموری حاصل کی جائے۔

اس سلسلہ میں دو چیزیں مد نظر رکھنی چاہییں :

(۱) نیا مقصد جس قدر پرانے مقصد کے مثل ہوگا اسی قدر آسانی سے پرانے مقصد کی توانائی اسے حاصل ہو جائے گی۔

(۲) فعلیاتی خواہشات کو چھوڑ کر باقی تمام مشاغل کے بدل تجویز ہو سکتے ہیں اور اس تبدیلی سے کشمکش کم ہو جاتی ہے۔

(ب) تلافی (Compensation) : جب بھی ناکام سرگرمی کی بجائے کامیاب سرگرمی اختیار کی جاتی ہے تو ناکامی کی کچھ نہ کچھ تلافی ہو جاتی ہے۔ لیکن اصطلاح میں تلافی کا اطلاق ان اشخاص کے افعال پر ہوتا ہے جو احساس کمتری سے تکلیف اٹھا رہے ہوں اور کسی شعبہ میں نمایاں ترقی کر کے خود اعتمادی اور عزت کو دوبارہ پا لیتے ہوں۔ لیکن تلافی نقصان دہ حد تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ مثلاً ایک بچہ پولیو کا مریض تھا، اس نے اپنے لیے خاص قسم کی موٹر گاڑی بنوائی۔ اس بچہ کی رفتار بلا کی تھی اور وہ گاڑی کو اس قدر تیز چلاتا تھا، کہ خود ہی ایک دن حادثہ کر بیٹھا اور لقمہ اجل ہو گیا۔ تلافی کی وجہ سے کئی ناپسندیدہ خصائص چھپے رہتے ہیں اور انسان کے جذبہ خودداری کو ٹھیس نہیں لگتی۔ ایڈلر (Adler) بیان کرتا ہے کہ ایک لڑکی کند ذہن ہونے کے علاوہ بد شکل بھی تھی۔ سکول میں اس نے کوشش کی کہ لڑکوں سے ملے جلے اور اپنی شکل و صورت کو زیادہ مقبول بنائے۔ لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔ لہٰذا معاشری پارٹیوں کو چھوڑ کر اس نے کتابوں پر توجہ مرکوز کی۔ لیکن چونکہ اس کی ذہانت اوسط درجے کی

تھی، پڑھائی میں بھی کوئی نمایاں ترقی نہ کر سکی۔ اس دوسری ناکامی سے اس کا رویہ جارحانہ ہو گیا۔ اب اس نے لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا اور اپنے کمرے کی لڑکیوں سے بڑی بحث کرتی تھی۔ اس کا طریقہ تھا کہ پہلے وہ کسی مضمون کو انسائیکلوپیڈیا سے پڑھ لیتی تھی پھر بحث کرتی تھی چونکہ دوسروں نے انسائیکلوپیڈیا پڑھا ہوا نہیں ہوتا تھا لہٰذا ان کا علم اس لڑکی کی برابری نہیں کر سکتا تھا۔ اور یہ لڑکی ان پر چھا جاتی تھی۔

ایڈلر کہتا ہے کہ تلافی کی اصل وجہ احساس کمتری ہے۔ فرض کیا کوئی بچہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ شکل و شباہت، ذہانت، خاندانی عزت اور روپے پیسے میں وہ دوسروں کے برابر نہیں۔ اور چونکہ وہ ان چیزوں سے محروم ہے، لوگ اس کی پروا نہیں کرتے اور پیار محبت نہیں کرتے۔ اس احساس سے اس کے جذبۂ خود داری کو ٹھیس لگتی ہے، بچے کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اس نقصان کی تلافی کرے اور کسی نہ کسی طریقے سے اپنی عزت بنائے۔ مثلاً روز ویلٹ کو بچپن میں پولیو ہوا اور اس کی ٹانگیں ماری گئیں۔ لیکن اس عارضہ سے اس نے ہمت نہ ہاری بلکہ اس کی تلافی کی۔ اور تلافی بھی اس طرح کہ دنیا حیران رہ گئی، وہ زبردست گھوڑ سوار ہو گیا اور اس نے جنگی جرنیل بن کر ثابت کر دیا کہ کامیابی اور عظمت کی راہ میں کوئی چیز روڑا نہیں اٹکا سکتی۔

بعض اوقات تلافی غلط راستے پر پڑ جاتی ہے۔ مثلاً کالج میں کوئی لڑکا نہ کھیلوں میں اور نہ پڑھائی میں کوئی پوزیشن حاصل کر سکا۔ لیکن ناموری کا جذبہ دل میں موجزن ہے۔ پس وہ جماعت میں اور جماعت سے باہر شرارتیں کرتا ہے، عجیب عجیب تماشے کرتا ہے تاکہ پروفیسروں اور ہم جماعتوں کی توجہ کھینچ لے۔ وہ لاشعوری طور پر

کہتا ہے کہ کیا ہوا اگر پڑھائی اور کھیلوں میں نمایاں ترقی نہ کر سکا، شرارتوں میں تو اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا اور اس سلسلے میں وہ صف اول میں ہے ۔ یعنی جب کوئی شخص تعمیری تلافی نہیں کر سکتا تو اس کا رجحان تخریبی تلافی کی طرف ہو جاتا ہے ۔

(ج) خواب ہائے بیداری اور خیالی پلاؤ (Daydreaming or Fantasy) : ناکامیوں اور محرومیوں سے بچنے کا ایک طریقہ خیالی پلاؤ پکانا ہے ۔ یوں خیالی پلاؤ ایک قسم کا تخیل (Imagination) ہے اور ہر تخیل برا نہیں ۔ بلکہ بعض حالتوں میں تو تخیل نعمت غیر مترقبہ ہے اور کامیاب سوچ بچار کا ایک جزو لاینفک ۔ جو شخص تخیل سے محروم ہو اس کی سوسائٹی بے کیف ہوتی ہے اور وہ کسی معاملہ کے متعلق کوئی کارآمد رائے نہیں دے سکتا ۔ یاد رہے کہ تخیل سے نہ صرف سوچ بچار کا درجہ بڑھتا ہے بلکہ زندگی کے ناخوشگوار حالات سے بھی رہائی مل سکتی ہے ۔ شاعری ، ڈرامہ ، ناول اور مذہب کی بے پناہ اور عالمگیر اپیل کا ایک سبب یہ ہے کہ ان کی بدولت زندگی کی تلخیوں سے نجات مل جاتی ہے اور مستقبل کے متعلق نہایت رنگین اور سہانے خواب دستیاب ہو جاتے ہیں ۔ عملی زندگی میں اس چیز کا بے بہا فائدہ ہے ۔ ولیم جیمز کا کہنا ہے کہ ایسا التباس جو زندگی کو خوشگوار اور رنگین بنا دے اس سچائی سے لاکھ درجہ بہتر ہے جو زندگی کی تلخیوں سے ہمکنار کرے ۔

لیکن اگر کوئی شخص خواب ہی دیکھتا رہے اور ان خوابوں کو عملی جامہ نہ پہنا سکے یا صرف سکیمیں اور پلان بناتا رہے اور کوئی عملی قدم نہ اٹھائے تو ایسے شخص کے لیے ذہنی خطرہ موجود ہے ۔ سکیموں اور تجاویز کو ذہن سے نکال کر میدان عمل میں لانے کی

ضرورت ہے ۔ جب تک ایسا نہ کیا جائے تخیل زندگی کی ذمہ داریوں اور حقائق سے محض ایک فرار ہے ۔ نفسیاتی معالجوں کو خیالی پلاؤ کے دوسرے نتائج سے واسطہ پڑتا ہے ۔ ایک میں تو مریض کی عادت بن جاتی ہے کہ وہ ہر قسم کے ناخوشگوار حالات سے پیچھے ہٹتا جائے اور ہر قسم کی دلچسپیوں کو دباتا جائے ۔ لہٰذا مریض اپنا زیادہ وقت تخیلات کی دنیا میں گزارتا ہے اور تخیلات کی دنیا کو ہی حقیقی دنیا سمجھنا شروع کر دیتا ہے ۔ جب مریض اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ تخیل اور حقیقت میں تمیز نہ کر سکے تو اسے باقی وقت پاگل خانے میں گزارنا پڑتا ہے ۔ دوسرے قسم کا خیالی پلاؤ خطرناک صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کسی نے کہا ہے ''خطرہ سے خوف آتے ہیں اور خوف سے خطرے بڑھتے ہیں ۔'' ناکامیوں کی وجہ سے مریض ہر کسی سے ڈرنے لگتا ہے اور ڈر کے مارے تشدد پر اُتر آتا ہے ۔

خواب ہائے بیداری کے علاوہ رات کے خوابوں میں بھی دبی ہوئی مرضیات اور مسترد محرکات اپنی تشفی اور اظہار کے لیے عجیب عجیب طریقے اختیار کرتے ہیں ۔ فرائڈ نے اپنی کتابوں میں اس کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے ۔ جو لوگ قطب شمالی یا جنوبی میں سیاحی کے لیے جاتے ہیں وہ اسی امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ مہینوں بھر تنگیاں اُٹھانے اور فاقہ مستیاں کرنے کے بعد انہیں اچھے اچھے کھانوں اور نرم نرم بستروں کے خواب آتے ہیں ۔ اسی لیے یتیم خانے کے بچے اکثر گھروں کے خواب دیکھتے ہیں یعنی جو چیز بیداری میں نصیب نہیں ہوتی وہ خواب میں دستیاب ہو جاتی ہے ۔ فرائڈ کہتا ہے کہ خوابوں سے ہماری متروک اور دبی ہوئی خواہشات کی تشفی ہوتی ہے اور ان سے لاشعور کا پتہ چلتا ہے ۔ لیکن وہ یہ بھی کہتا ہے کہ لاشور کا معلوم کرنا آسان کام نہیں ، کیوں کہ خواہشات کا اظہار سیدھے یا مکمل طریقے سے نہیں ہوتا ۔ علاوہ ازیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ

خوابوں کے اسباب کئی اور بھی ہو سکتے ہیں ۔ حسی تاثرات بھی خواب پیدا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دن کے صاف اور بین واقعات خواب میں عود کر آتے ہیں ۔

کالج کے طلبہ خیالی پلاؤ پکانے میں یدطولیٰ رکھتے ہیں ۔ ایل ۔ ایف ۔ شیفر (L. F. Shaffer) نے کالج کے ۱۹۵ طلبہ سے ان کے خیالی پلاؤ اور خواب ہائے بیداری پوچھے۔ نتائج فی صد حسب ذیل ہیں :

	مرد	عورتیں
پیشہ وارنہ کامیابی	۸۱	٦۹
جنسی	۷۴	۷۳
مال و دولت	٦۹	٦٦
علمی کارنامے	۴۸	۴۲
فکر	۴۵	۵٦
جسمانی خوبصورتی	۳۴	٦۳
جسمانی کارنامے	۳۰	۳
نمود و نمائش	۲۲	۲٦
عقیدت	۱٦	۱۳
بچت	۱۴	۵
اقتدار	۱۱	۹
موت یا تباہی	۹	۹
شہادت	۵	۱۵
دوسری اقسام	۳۰	۲۰
خواب ہائے بیداری کا تکرار	۴۸	۵۱

اس چارٹ سے پتہ چلتا ہے کہ طلبہ کی اکثریت خیالی پلاؤ پکاتی ہے ۔ اور اکثر اور بیشتر دفعہ ان کے تخیلات کا مرکز یا تو پیشہ ورانہ کامیابی یا جنسی تعلقات یا روپے پیسے کا حصول ہوتا ہے ۔

صحیح اور غلط تسویہ (Adjustment and Maladjustment) :

نفسیات میں کردار کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور کردار پیداوار ہے طبعی اور معاشری مہیجات کا۔ یہ بیان ہو چکا ہے کہ حیاتیاتی اصول تسویہ ہر قسم کے جاندار کے لیے صحیح ہے۔ ماحول سے جو مہیجات آٹھتے ہیں ان کا رد عمل ایک قسم کی ماحول سے تطبیق ہے۔ سردی ہو یا گرمی، مینہ ہو یا آندھی ہمارا جسم ان کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیتا ہے۔ اگر ہمارے جسم میں یہ صلاحیت موجود نہ ہو تو جلد ختم ہو جائے۔ لیکن مہیجات صرف طبعی نہیں ہوتے بلکہ اکثر و بیشتر معاشری ہوتے ہیں۔ یہ مہیجات بھی تطبیق کے خواہاں ہیں۔ جو شخص اپنے بھائی بہنوں، عزیز و اقارب، بڑوں اور چھوٹوں کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتا وہ جلد ہی اپنے اور دوسروں کے لیے مصیبت کا باعث بن جاتا ہے۔ شروع سے ہی ہر بچے کو اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ اگر وہ خود غرضی کم نہ کرے تو بڑی مشکل میں پھنس جاتا ہے۔ پہلے چند سال میں ہر بچہ ماں باپ کے لاڈ پیار اور توجہ کا مرکز بنا ہوا ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ سمجھتا ہے کہ دنیا محض اس کی تشفی اور تسلی کے لیے بنی ہے۔ لیکن یہ رویہ اسے بدلنا ہوگا، کیونکہ جو چیز بچپن میں صحیح ہے وہ بڑے ہو کر صحیح نہیں رہتی۔ خود غرضی کے ساتھ اسے ایثار کا جذبہ بھی پیدا کرنا چاہیے۔ خود غرضی کو بالکل ترک کر دینا بھی ٹھیک نہیں۔ جو ماں اپنے آرام کی مطلقاً پروا نہیں کرتی اور ہر وقت بچے کے لیے اپنا تن، من، دھن قربان کرنے کے لیے تیار رہتی ہے، وہ بچے کی صحیح معنوں میں خدمت نہیں کرتی۔ بچہ اتنے لاڈ پیار سے بگڑ جاتا ہے اور سوسائٹی کے قابل نہیں رہتا۔

بچے کو کئی تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جسمانی اور دماغی لحاظ سے وہ بڑا کمزور ہے۔ اس کی کئی خواہشات دوسروں سے ٹکرا جاتی ہیں۔ دودھ چھڑانے پر ایک مصیبت کا پہاڑ اس کے سر پر

آن گرتا ہے - پھر بول و براز، نشست و برخاست، خورد و نوش کے متعلق ہر سوسائٹی کے اپنے طور طریقے ہیں ، انہیں سیکھنا پڑتا ہے - جوں جوں بچہ بڑا ہوتا ہے مسائل بدلتے جاتے ہیں - لیکن زندگی کی کوئی منزل ایسی نہیں جہاں مسائل نہ ہوں - ان کا خاطر خواہ حل آسودگی اور سکون کا ضامن بنتا ہے - غلط حل مصیبتوں اور مشکلات کا پیش خیمہ بن جاتا ہے، جیسے صحیح تطبیق کی عادتیں پڑ جاتی ہیں ویسے غلط تطبیق کی بھی پڑ جاتی ہیں - کئی ذہین اور خوش نصیب انسان ایسے ہیں کہ ان کی تطبیق ہمیشہ صحیح ہوتی ہے اور کئی ٹیڑھے دماغ اور آلٹی کھوپری کے انسان ہیں کہ ان کی کوئی چیز ٹھیک نہیں بیٹھتی- جہاں جاتے ہیں ایک مسئلہ کھڑا کر دیتے ہیں - اپنی زندگی کو بھی دوزخ بناتے ہیں اور دوسروں کی زندگیاں بھی خراب کر دیتے ہیں -

شدید غلط تسویہ (Severe Mal-adjustment) :

یوں تو ہر چھوٹا بڑا آدمی کہیں نہ کہیں فیل ہو جاتا ہے - کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کی تطبیق ہر لحاظ سے خاطر خواہ اور مکمل ہے - جیسے جسمانی صحت میں کوئی شخص کامل نہیں ویسے ہی ذہنی صحت میں بھی کوئی آدمی کمال کا دعویٰ نہیں کر سکتا - لیکن جیسے جسمانی بیماری کی تشخیص ہو جاتی ہے ویسے ہی ذہنی بیماری کی تشخیص بھی ہو جاتی ہے - جسمانی بیماری میں انسان کا جسم معمول سے بہت پرے ہٹ جاتا ہے، ذہنی بیماری میں انسان کا ذہن معمول سے ہٹ کر غلط تسویہ کا شکار ہو جاتا ہے -

ذہنی بیماریوں کا سیرحاصل مطالعہ تو اس چھوٹے سے باب میں ممکن نہیں ، مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ذہنی بیماریاں یا تو بہت شدید قسم کی ہوتی ہیں یا ذرا کم شدت کی - زیادہ شدید قسم کی بیماریوں میں ذہنی ہسپتالوں کا رخ کرنا پڑتا ہے، خفیف ذہنی بیماریوں میں تھوڑے سے علاج معالجے سے کام بن جاتا ہے - خفیف ذہنی بیماریوں کو عصبانیت

(Neurosis) کہتے ہیں ۔ شدید ذہنی امراض کو اختلال ذہنی (Psychosis) کہتے ہیں ۔ بعض لوگوں کو بھوک نہیں لگتی یا جسم میں سکت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ سب خفیف ذہنی امراض کی مثالیں ہیں، ان کا علاج ہو سکتا ہے ۔ لیکن بعض بیماریاں شدید قسم کی ہیں ۔ مثلاً انتہائی پژمردگی کا دور آتا ہے ۔ یا دنیا سے اس قدر کنارہ کشی کر لی جاتی ہے کہ لوگوں سے کوئی رابطہ نہیں رہتا ۔ یا پرلے درجے کے شک کے ساتھ برتری اور غلبے کا شدید جذبہ پیدا ہو جاتا ہے ۔ یہ مثالیں اختلال ذہنی (Psychosis) کی ہیں ۔

ذہنی امراض کے اسباب معلوم کرنا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے ۔ ان میں ذہن کے علاوہ جسم کو بھی دخل ہے ۔ لیکن امراض میں جسم اور ذہن کا الگ الگ حصہ مقرر کرنا جوئے شیر لانے سے کم مشکل نہیں ۔ کم و بیش ہر انسان میں خفیف ذہنی بیماریاں پائی جاتی ہیں ، فرق صرف درجے کا ہے ۔ جب ان کا درجہ بڑھ جاتا ہے تو آدمی غیر طبعی ہو جاتا ہے۔ یعنی معمول سے انحراف کر جاتا ہے اور علاج چاہتا ہے۔ یہ بیماریاں محرکات کے تصادم اور محرومیت سے پیدا ہوتی ہیں ۔

ذہنی امراض کے متعلق کئی نظریے خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ فرائڈ کے مطابق بچے کی فطری خواہشات محبت اور خوشی حاصل کرنا ہے۔ لہٰذا جو چیز اسے محبت یا خوشی سے باز رکھتی ہے وہ اس کی نگاہ میں دشمن بن جاتی ہے ۔ بچے کے لیے دشمنوں سے نجات پانا آسان کام نہیں اور جب وہ اس سلسلے میں ناکام رہتا ہے تو غلط تسویہ میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔ ایڈلر کے خیال میں ہر بچہ برتری کا بھوکا ہے اور کمتری سے بھاگتا ہے۔ لیکن اس کے برتری کے جذبہ کو ہر قدم پر ٹھیس لگتی ہے ۔ اس سے مسائل پیدا ہوتے ہیں ۔ جب بچہ ان مسائل کا خاطر خواہ حل پیش نہیں کر سکتا تو محرومیت کا شکار ہو جاتا ہے ۔ آج کل کے تحلیل نفسی کے ماہر حفاظت پر زیادہ زور دیتے ہیں ۔ ہر بچہ حفاظت چاہتا ہے،

جب بچہ کو چھوڑ کر ماں باپ اِدھر اُدھر چلے جاتے ہیں تو وہ عارضی طور پر غیر محفوظ ہو جاتا ہے اور اگر بالکل ہی چھوڑ کر چلے جائیں جیسے طلاق یا علیحدگی میں ہوتا ہے تو بچے کے لیے قیامت آ جاتی ہے۔ بڑے ہونے سے حفاظت کی خواہش کم نہیں ہوتی بلکہ بدستور قائم رہتی ہے اور جب اس خواہش کو دھکا لگتا ہے تو مصیبت آن پڑتی ہے۔

ان نظریوں کے متعلق فیصلہ کرنا کہ کون سا سچا ہے اور کون سا جھوٹا، بڑا مشکل کام ہے۔ سب کے سب انسانی نفسیات کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ غالباً ہر بچہ محبت بھی چاہتا ہے، حفاظت بھی اور برتری بھی۔ لیکن اسے عمر کے ساتھ سیکھنا چاہیے کہ بچوں والی خوشیاں کم کر دینی چاہییں۔ ذمے داری کا احساس زیادہ ہونا چاہیے۔ حفاظت اور محبت کے تقاضے مناسب حدود میں رکھنے چاہییں۔ اس احساس کے لیے جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اگر یہ جدوجہد کامیاب نہ ہو یا غلط طریقے سے کی جائے تو غلط تطبیق رونما ہوگی۔

ذہنی مریضوں کی مدد کیسے کی جاتی ہے؟ کولمن (Coleman) کا کہنا ہے کہ امریکہ میں ذہنی مریضوں کی تعداد حسب ذیل ہے:

عصابی (Neurotics) خفیف امراض والے	۸۰,۰۰,۰۰۰
مختل الذہن (Psychotics) ہسپتال کے قابل مریض	۸۰,۰۰,۰۰۰
فاتر الذہن اشخاص (Psychopathic Personalities) جن میں ہیجانی، نا پختگی، بے چینی، غیر ذمہ داری اور اخلاقی موافقت کا فقدان پایا جاتا ہے۔	۱,۵۰,۰۰,۰۰۰
مرگی	۵۰,۰۰,۰۰
شرابی	۲۰,۰۰,۰۰۰
افیونی چرسی	۲۰,۰۰,۰۰۰
نوجوان خاطی	۳۰,۰۰,۰۰۰
جرائم پیشہ	۱۰,۰۰,۰۰۰

رنڈیاں	۳,۰۰,۰۰۰
خود کشی کے اقدامات	۱,۰۰,۰۰۰
خود کشی	۲۵,۰۰۰
ضعیف العقلی	۳۰,۰۰,۰۰۰

پاکستان میں ذہنی امراض کے اعداد و شمار کبھی نہیں لیے گئے۔ اس لیے ذہنی امراض کا صحیح صحیح پتہ لگانا محال ہے۔ ہمارے پاگل خانوں میں جو لوگ آتے ہیں وہ ان کا عشر عشیر بھی نہیں جو صحیح طور پر پاگل ہیں لیکن پاگل خانوں سے باہر زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔

ذہنی مریضوں کی اصلاح اور بہبودی کے لیے مختلف قسم کے علاج تجویز کیے گئے ہیں، موٹے موٹے علاج دو ہیں۔

(۱) مشیر مرکزی علاج (Counsellor Cnetred Therapy)۔

(۲) عمیل مرکزی علاج (Client Centred Therapy)۔

مشیر مرکزی علاج تین انواع کا ہے:

(ا) معلومات بہم پہنچانا (Information Giving)۔

(ب) طمانیت (Reassurance)۔

(ج) القا (Suggestion) اور نومیت (Hypnotism)۔

عمیل مرکزی علاج کی بھی تین قسمیں ہیں:

(ا) تنقیہ (Catharsis)۔

(ب) تحلیل نفسی (Psycho-analysis)۔

(ج) غیر ہدایتی مشورہ (Non-directive Counselling)۔

مشیر مرکزی علاج:

(ا) **معلومات بہم پہنچانا:** یہ سب سے آسان کام ہے۔ مریض کو چند ایک مسائل تنگ کر رہے ہیں۔ ان کا حل مہیا کر دینا مریض کی خدمت ہے۔ مثلاً کوئی عورت فیکٹری میں کام

کرتی ہے لیکن اسے پتہ نہیں کہ اپنی غیر حاضری میں بچوں کو کہاں رکھے۔ مشیر یا معالج کے پاس ایسے اداروں کی مکمل فہرستیں ہوتی ہیں جہاں والدین کی غیر حاضری میں بچوں کی دیکھ بھال کی جاتی ہے، ان کی مدد سے عورت کی رہنمائی کی جاتی ہے۔ معالجوں کے پاس مختلف اداروں کی مکمل اطلاع ہوتی ہے۔ پاگلوں کی کئی پریشانیاں صحیح اطلاع ملنے پر دور ہو جاتی ہیں۔

ہر شعبے اور محکمے کے متعلق کئی حل طلب سوالات ہوتے ہیں اگر شعبہ کے اندر کوئی ایسی تنظیم قائم ہو جائے جو اس شعبہ کے نظم و نسق کو پوری طرح سمجھا دے اور جو الجھنیں مبتدی کے دماغ میں پیدا ہوتی ہیں انہیں رفع کر دے تو کئی پریشانیاں دور ہوجائیں گی۔ جنگ کے بعد کئی عورتوں کو کارخانوں میں ملازم رہنا پڑا۔ انہیں کارخانوں کی زندگی سے پہلی دفعہ سابقہ پڑا تھا۔ لہٰذا وہ ضوابط اور قواعد سے نا آشنا تھیں۔ لا علمی، پریشانی کا موجب بن جاتی ہے۔ سمجھ دار فرموں کے مالکوں نے ایسے ادارے کھول دیے جہاں عورتوں کو صحیح اطلاع ملتی تھی اور ان کے شکوک رفع ہوتے تھے۔ ایک اور مثال لیجیے۔ جنگ کے بعد کئی فوجی ایسی عضوی تکالیف میں مبتلا ہو گئے جن کے اسباب ذہنی تھے۔ ایسے مریضوں کو اکٹھا کر کے چارٹ اور ماڈلوں کی مدد سے سمجھایا گیا کہ کس طرح محرومیت اور یاس کا احساس فعلیاتی نقائص کا باعث بنتا ہے۔ ان معلومات سے فوجیوں کے حوصلے بندھ گئے اور انہیں صحت یاب ہونے کی امید ہو گئی۔

(ب) طمانیت: بعض اوقات موکلوں کے مسائل اتنے اہم نہیں ہوتے جتنے وہ خیال کرتے ہیں۔ مشیر ان کی کہانی بڑے غور سے سنتا ہے۔ ان کی مشکلات کا اندازہ لگاتا ہے اور بعد میں انہیں تسلی، دلاسا دیتا ہے، کہ گھبرانے کی کوئی بات

نہیں، تکلیف چھوٹی سی ہے، خود بخود رفع ہو جائے گی، صرف وقت چاہیے ۔ جوں جوں جوان ہو گے یہ مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے ۔

تسلی : دلاسا دیتے وقت اس امر کا خیال رکھنا چاہیے کہ کہیں تسلی بے بنیاد نہ ہو ۔ اگر تکلیف واقعی اہم ہو اور یونہی تسلی دے دی جائے تو اس کے نتائجُ خوشگوار نہ ہوں گے ۔ مریض کو خیال پیدا ہو جائے گا کہ علاج کی ضرورت نہیں حالانکہ علاج کی ضرورت تھی ۔ تاخیر سے مرض بگڑ جانے کا مدھرے کا نہیں ۔ لٰہذا مشیر کی تشخیص صحیح ہونی چاہیے ۔

جنسی بد عنوانیوں سے جو مریض پریشان رہتے ہیں انہیں صحیح معلومات اور تسلی دلاسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ خراب لٹریچر پڑھ کر انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ جنسی بدعنوانیاں انسان کو تباہ کر دیتی ہیں اور مختلف قسم کے ذہنی عارضے پیدا کرتی ہیں ۔ حالانکہ یہ سو فی صد درست نہیں ۔ جب ان لوگوں کو صحیح علم ملتا ہے تو ان کی سراسیمگی دور ہو جاتی ہے ۔ معالج کا کام ہے غلط فہمیاں دور کرے اور مرض کی صحیح حقیقت بتائے۔ اس طریقے سے بے معنی خوف جاتے رہتے ہیں اور مریض بیاری کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے ۔

(ج) القا اور نومیت : القا سے مراد کسی خیال یا پلان کو بغیر تنقید کے قبول کر لینا ہے ۔ اس کی تین قسمیں ہیں ۔ علاج بالاعتقاد (Faith Healing) نومیت اور بالواسطہ القا (Indirect Suggestion) ۔

علاج بالاعتقاد صدیوں پرانا علاج ہے ۔ اس علاج میں مرض کی علامتوں اور اس کی اہمیت سے بحث نہیں کی جاتی مثال کے طور پر ایملی کوئے (Emile Cowe) کو لیں ، وہ اپنے مریضوں کو صبح و شام ایک جملہ کا ورد بتاتا تھا۔ وہ جملہ یہ ہے کہ میں ہر روز، ہر لحاظ سے

بہتر سے بہتر ہو رہا ہوں ۔ اس چھوٹے سے جملے کو بار بار دہرانے سے کئی کہنہ مریض شفایاب ہوگئے ۔ اس میں شک نہیں کہ علاج بالاعتقاد سے اختناق الرحم اور اس قسم کے دوسرے امراض ٹھیک ہو جاتے ہیں لیکن اس علاج میں ایک خرابی ہے ۔ یہ علاج مرض کی جڑوں تک نہیں جاتا ۔ اسی لیے مرض کی ایک علامت کم ہو جانے پر دوسری علامت کھڑی ہو جاتی ہے ۔

نومیت : ۱۷۷۸ء میں فرانز مسمر (Franz Mesmer) نے پیرس میں علاج معالجہ کا ایک نیا ادارہ کھولا ، اس علاج کا نام اس نے مسمریزم رکھا۔ میسمر کا خیال تھا کہ ایک قسم کا مقناطیسی مائع تمام کائنات میں بہہ رہا ہے ۔ انسانی جسم اس سے مستثنیٰ نہیں ۔ جب اس مائع کا توازن خراب ہو جاتا ہے تب بیماریاں آتی ہیں۔ لہٰذا اس مائع کا توازن قائم کرنا چاہیے ، بیماری خود بخود رفع ہو جائے گی ۔ اس لیے مریض کے جسم پر مقناطیس لگایا جاتا تھا کہ توازن ٹھیک ہو جائے۔ اس طریقہ سے میسمر نے کئی لوگوں کو آرام پہنچایا اور چند ایک کی بیماریاں دور کر دیں ۔ لیکن لوگوں کا خیال ہے کہ جو بیماریاں دور ہوئیں وہ القا (Suggestion) کی وجہ سے ہوئیں اور ان بیماریوں کا تعلق اختناق الرحم سے تھا ۔ میسمر کا طریقہ دراصل القا کا طریقہ تھا ۔ اس کے ہم عصروں نے نہ تو اس کی نوعیت کو سمجھا اور نہ اس کی اہمیت کو ۔ اس لیے ڈاکٹروں اور سائنس دانوں نے اس طریقہ کی نکتہ چینی کی۔ وہ کہتے تھے کہ میسمریزم کا دار و مدار تخیل پر ہے اس لیے اس طریقے سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا ۔ لیکن یہ دعویٰ سراسر غلط تھا ۔ لوگوں کو اب پتہ چلا ہے کہ میسمر نے بڑے کام کی چیز دریافت کی اور اسے نفسیات کی ترقی میں سنگ میل کا درجہ حاصل ہے ۔

نومیت بھی کوئی عجیب شے نہیں ۔ نومیت تو ایسی دماغی کیفیت کا نام ہے جس میں ہر چیز کو غیر ناقدانہ طریقے سے قبول کر لیا جاتا ہے ۔ ایسی حالت پیدا کرنے کے لیے مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھنا

پڑتا ہے :

۱۔ معمول اپنے آپ کو مکمل طور پر عامل کے حوالے کر دے ۔ عامل کو سمجھ دار اور تربیت یافتہ ہونے کے علاوہ شہرت یافتہ، معتبر اور باوقار ہونا چاہیے ۔

۲۔ معمول کو کہا جاتا ہے کہ بستر پر لیٹ کر کوئی معمولی سا کام کرے ۔ پھر اسے کچھ بتایا جاتا ہے جو کہ سو فی صدی صحیح ہوتا ہے ۔ مثلاً یہ کہ آج کا دن گرم ہے ۔ پنکھوں کی ہوا تپش کو کم نہیں کر رہی ۔ اس طریقے سے معمول کا اعتماد حاصل ہو جاتا ہے ۔

۳۔ اعتماد حاصل کرنے کے بعد کچھ ایسی باتیں کہی جاتی ہیں جو بالکل صحیح نہیں ہوتیں ۔ مثلاً یہ کہ تمھاری آنکھیں جل رہی ہیں اور تمھارے پپوٹے بھاری ہو رہے ہیں ۔ اگر معمول گہری نومیت میں ہو تو جو چیزیں بظاہر ناممکن دکھائی دیتی ہیں انھیں تسلیم کر لے گا اور ایسے فعل بھی کر لے گا جو عالم بیداری میں مطلقاً نہیں کرے گا ۔

معمول سے باتیں کرتے وقت عامل ایسے لگتا ہے جیسے لوری دے رہا ہو ۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ معمول خمار کی حالت میں آ جاتا ہے اور اس پر غنودگی طاری ہو جاتی ہے۔ اس حالت میں وہ عامل کا ہر حکم ماننے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ نفسیاتی لحاظ سے جو بات قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ عامل کو معمول کے ذہن پر اس قدر غلبہ حاصل ہو جاتا ہے کہ اختناق الرحم، ضعف اعصاب (Neuresthenia) اور اضطرابی عصبانیت (Anxiety Neurosis) کی نہ صرف علامات دور کر سکتا ہے بلکہ ان امراض کو جڑ سے بھی اکھاڑ دیتا ہے ۔ نومیت کی حالت میں اگر معمول کو کہا جائے کہ فلاں جسم کے حصے سے تمھیں درد نہیں ہوگا تو خواہ وہاں سوئیاں بھی چبھوئی جائیں معمول درد محسوس نہیں کرے گا۔ معمول کو وقتی طور پر اندھا اور بہرہ بنایا جا سکتا ہے۔ عامل کے کہنے پر معمول وہ چیزیں بھی دیکھے گا جو خارج میں موجود نہ ہوں اور

آوازیں بھی سنے گا جو حقیقت میں کہیں نہ ہوں ۔

نومیت سے جسم کے درد بھی دور ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے زیر اثر ماضی کے بھولے ہوئے واقعات بھی یاد آ جاتے ہیں ۔ معمول کو کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بچہ سمجھے اور بتائے کہ وہ کیا کرتا ہے۔ کیا محسوس کرتا ہے اور کن چیزوں کی خواہش رکھتا ہے ۔ چونکہ عامل کی حکم عدولی نہیں ہو سکتی ، معمول بچہ بن کر اس زمانے کے سارے واقعات اگل دیتا ہے ۔ اس نومیت سے مصنوعی رجعت (-Reg ression) پیدا کر کے گزشتہ واقعات کا علم حاصل کیا جاتا ہے۔ اس بات کا ثبوت کہ واقعی رجعت ہوئی ہے اس امر سے ملتا ہے کہ اگر معمول کو کہیں کہ وہ ہاتھ سے لکھے تو اگر وہ بچہ بنا ہوا ہے تو اس کی لکھائی بھی بچوں جیسی ہوگی ۔ شکاگو کی یونیورسٹی میں ڈاکٹر ساربن (Sarbin) اور ڈاکٹر لوئس (Lewis) نے بلیک بورڈ کے اوپر ایک لڑکی سے نومیت کی حالت طاری کرنے سے پیشتر کچھ لکھوایا، پھر نومیت کے زیر اثر بچپن کے مختلف مدارج پر لکھوایا ۔ جوں جوں وہ لڑکی پیچھے کی طرف جاتی تھی اس کا خط زیادہ بچوں والا ہوتا جاتا تھا ۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ معمول نے واقعی رجعت کی ہے اور جو واقعات وہ بیان کر رہی تھی وہ اس وقت کے نہیں بلکہ بچپن سے تعلق رکھتے تھے ۔

نومیت کو تجزیہ سے ملا کر ایک نیا طریقہ علاج نکالا گیا ہے جسے تنویمی تجزیہ (Hypno Analysis) کہا جاتا ہے ۔ آرتھر جینس (Arthur Jenness) نے ذہنی ہسپتال کی ایک ملازمہ کا کیس بیان کیا ہے ، کسی شخص نے اس عورت کو شادی کا پیغام دیا اور اس پر افسردگی (Depression) چھا گئی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ یہ لڑکی پاگل ہو گئی اور اس کی بیماری جنونی افسردگی ہے ۔ تحلیل نفسی(Psycho Analysis) کا استعمال ہوا لیکن کوئی کامیابی نہ ہوئی ۔ ایک دن اس پر نومیت کی حالت طاری کی گئی اور اس حالت میں لڑکی کو کہا گیا کہ وہ دس سے

تیرہ سال کی عمر میں لوٹے۔ معلوم ہوا کہ اس عمر میں لڑکی کو اس کی والدہ نے (Sex) کے متعلق بالکل غلط معلومات دے دیں۔ وہ غلط فہمیاں عالم بیداری اور عالم نومیت میں دور کی گئیں۔ اس طرح لڑکی کی بہت سی ذہنی رکاوٹیں دور ہو گئیں۔ لڑکی نے اپنے آپ کو سمجھ لیا، اس کی افسردگی دور ہو گئی اور شادی بھی اس شخص سے ہو گئی جس نے پہلے شادی کا پیام دیا تھا۔

یہ کیس ظاہر کرتا ہے کہ نومیت بڑے فائدے کی چیز ہے۔ لیکن عامل بڑا سمجھ دار، تربیت یافتہ اور ماہر فن ہونا چاہیے ورنہ بجائے فائدے کے نقصان ہوگا۔ نقصان دو طرح سے ہو سکتا:

۱۔ نومیت کی حالت طاری کرنا کوئی مشکل امر نہیں لیکن نومیت کے بعد جو اثرات ظاہر ہوتے ہیں ان پر قابو پانا آسان کام نہیں۔ مثلاً معمول کے متعلق ایک خطرہ ہمیشہ لگا رہتا ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی تکالیف بجائے خود دور کرنے کے عامل کی طرف دوڑے گا اور اس طرح خود اعتمادی کا جوہر کھو بیٹھے گا اور خود کوشش کرنا چھوڑ دے گا۔

۲۔ نومیت کی حالت طاری کرنے کے بعد عامل کی تلقین شروع ہوتی ہے۔ اگر عامل نااہل اور اناڑی ہو تو معمول کو ایسی باتیں کہہ دے گا جو اس کی ذہنی الجھنوں کو زیادہ الجھا دیں گی۔ اور صورت حال بہتر بنانے کی بجائے ابتر کر دیں گی۔

(د) نقلی دوا (Placebo): بعض مریض ناکامیوں کے شکار ہوتے ہیں۔ انہیں کھانے یا پینے کی نقلی دوائیاں دی جاتی ہیں لیکن اگرچہ ان دوائیوں کا ڈاکٹری فائدہ کچھ نہیں ہوتا، دوائیوں کا نفسیاتی فائدہ ضرور ہوتا ہے۔ کیونکہ جب تک مریض محسوس نہ کرے کہ اس کا علاج معالجہ ہو رہا ہے تندرست نہیں ہوگا۔ اس علاج میں میٹھی ٹکیوں سے لے کر بجلی کے شاکس تک دیے جا سکتے ہیں۔

اس علاج سے عارضی آرام آجاتا ہے لیکن نقصان بہت ہوتا ہے۔ مریض کی بیماری تو ہلکی سی ہوتی ہے جسے وہ اہم سمجھ لیتا ہے۔ اس طرح مریض کی رائے سے اتفاق کر کے اور سخت دوائیاں دے کر ڈاکٹر اس کا وہم پکا کر دیتا ہے۔ لہٰذا جب علاج کی ضرورت پڑتی ہے تو مریض کو بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک کیس ملاحظہ کریں جو شیفر (Shaffer) اور ڈورکس (Dorcus) نے رپورٹ کیا ہے۔ ایک آدمی بازو کے فالج میں مبتلا تھا لیکن اس کے اعصاب بالکل ٹھیک ٹھاک تھے۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا اور مریض کو صحیح تشخیص نہ بتائی۔ مریض کو کہا گیا کہ مرض کی حقیقت معلوم ہو گئی ہے اس کے اعصاب میں رکاوٹ ہے جو بجلی سے دور ہو جائے گی۔ چنانچہ اسے بجلی لگائی گئی جس سے مریض کو شدت کی درد محسوس ہوئی۔ بجلی سے عضلات میں کھچاؤ پیدا ہوا جس کی بنا پر مریض کو کہا گیا کہ نقص دور ہو گیا ہے اور وہ پٹھوں کو استعمال کر سکے گا۔ مریض کو ہدایت کی گئی کہ اگر فالج کا دوبارہ اندیشہ ہو تو اسے فوراً ہسپتال آ جانا چاہیے۔ گو ڈاکٹروں کا رویہ بڑا مشفقانہ تھا لیکن بجلی کے عمل کو جس قدر تکلیف دہ بتایا جا سکتا تھا بنایا گیا تا کہ مریض دوبارہ علاج کرانے سے ڈرے۔ اس مریض کو فالج کا کبھی دورہ نہ پڑا لیکن اختناق الرحم ہو گیا۔ اس کی بینائی جاتی رہی۔ آواز میں نقص آ گیا اور غشی کے دورے پڑنے لگے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ اس شخص کا اگر علاج سخت نہ ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی۔

پس نقلی دواؤں سے بنیادی تکلیف رفع نہیں ہوتی وقتی طور پر آرام آ جاتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد بھی تکلیف کسی اور شکل میں ظاہر ہو جاتی ہے۔

عمیل مرکزی علاج (Client-Centred Theraphy) :

اس علاج میں معالج کے بجائے عمیل کو مرکزی حیثیت دی جاتی

ہے - اس کی مندرجہ ذیل اقسام ہیں :

(ا) تنقیہ (Catharsis) : یہ طریقہ بہت پرانا ہے - اس طریقہ میں مریض کو بولنے کی عام اجازت ہوتی ہے - وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال سکتا ہے، اپنا دل ہلکا کر سکتا ہے - لیکن مشکل یہ ہے کہ بعض دفعہ مریض کو خود بھی علم نہیں ہوتا کہ اسے کون سی چیز تنگ کر رہی ہے، لہٰذا اس کا بولنا زیادہ مفید ثابت نہیں ہوتا۔ نفسی معالجوں کو پتہ ہے کہ مریض کی چند ایک ابتدائی ملاقاتیں زیادہ سود مند نہیں ہوتیں - مریض اخفا سے کام لیتا ہے - آہستہ آہستہ جب اس کا اعتبار بندھ جاتا ہے تب اپنے دل کی بات کہتا ہے - مریض کو بات کرنے پر مجبور نہیں کرنا چاہیے۔ مجبور کرنے سے معالج اور مریض کے درمیان ایک دیوارحائل ہو جاتی ہے جسے پار کرنا مشکل ہو جاتا ہے - بعض دفعہ مریض کی مدافعت (Resistance) توڑنے کے لیے نومیت کا استعمال ہوتا ہے -

آج کل تنقیہ کے لیے کئی طریقے نکل آئے ہیں - ان طریقوں کا فائدہ یہ ہے کہ مریض کو پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کسی آزمائش میں ہے اور اپنا ما فی الضمیر نادانستہ طور پر ظاہر کر دیتا ہے - یہ طریقے حسب ذیل ہیں :

(ء) انگشتی نقاشی (Finger Painting) : مریض کو کہا جاتا ہے کہ برش کی بجائے انگلی استعمال کرے اور کوئی تصویر بنائے۔ تصویر بناتے بناتے اس کے جذبات کا اظہار ہو جاتا ہے اور اسے کچھ سکون آ جاتا ہے - مثلاً رش (Rush) نے ایک کیس بیان کیا ہے ، کہ ایک فوجی کو کلینک لایا گیا۔ اس کے خلاف الزام تھا کہ وہ گستاخ ہے اور رات کو دوسروں کے ساتھ نہیں سوتا ، کیونکہ اسے ڈر ہے کہ خواب میں وہ باتیں کرنے لگ پڑے گا اور دوسرے اس سے تنگ ہوں گے - اس مریض کو کہا گیا کہ وہ کوئی تصویر بنائے۔

اس نے چند منٹ میں ہاتھ ، بازو اور انگلیوں سے تصویر بنا ڈالی -

رنگ اس نے سبز استعمال کیا ۔ کیونکہ وہ کہتا تھا کہ سبز رنگ اسے بہت پسند ہے ۔ درمیان میں اس نے مٹیالا رنگ استعمال کیا ۔ تصویر کا تناسب خوب تھا اور مریض چاہتا تھا کہ اس کا ناقدانہ جائزہ لیا جائے۔ اس تصویر کا نام اس نے "غار کے اندر" رکھا ۔ غار میں اس نے تین شکلیں دکھائیں ۔ ان شکلوں کے متعلق کہنے لگا کہ یہ ماں ، باپ اور بچہ کی تصویریں نہیں بلکہ ایک ہی شخص کی تین تصویریں ہیں۔ ایک جب وہ ۱۴ سال کا تھا پھر جب وہ ۱۶ سال کا ہوا اور پھر جب اس کی عمر ۱۸ سال ہو گئی ۔

معالج کے پوچھنے پر وہ کہنے لگا کہ ۱۴ سال کی عمر میں اسے کسی لڑکی سے تلخ تجربہ ہوا ۔ پھر جب اس کی عمر ۱۶ برس کی ہوئی تو کسی فاحشہ عورت سے اس کا پالا پڑا ۔ ۱۸ سال کی عمر میں وہ کسی لڑکی کو دل دے بیٹھا ، لیکن کامیابی نہ ہوئی کیونکہ اس کا باپ نہ مانا ۔ اس لیے اسے ڈر ہے کہ کہیں اس لڑکی کے متعلق خواب میں باتیں نہ کرے ۔ لہٰذا وہ کسی کے ساتھ سونا نہیں چاہتا ۔

(*ii*) علاج باللعب (Play-therapy) : کھیلوں سے کشمکش اور ناکامیوں کا پتہ چلتا ہے اور علاج بھی ہوتا ہے ۔ بچے اپنے مسائل کا اظہار گڑیوں ، کھلونوں اور مٹی سے کھیلتے ہوئے کر دیتے ہیں اور بعض دفعہ کھیلوں کھیلوں میں ان کا حل ڈھونڈ لیتے ہیں ۔ مثلاً لیوی (Levy) نے بیان کیا ہے کہ آٹھ سال کی لڑکی کو کلینک لایا گیا ، شکایت یہ تھی کہ وہ نچلی نہیں بیٹھتی اور ہر وقت بے قرار رہتی ہے ، ضدی بھی ہے اور کسی کام کو توجہ نہیں دے سکتی ۔ پہلی ہی ملاقات میں پتہ چل گیا کہ لڑکی سوتیلے باپ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے ۔ جب وہ کوئی کھیل کھیلتی تھی تو اس کی کھیل اکثر ماں ، بچے اور سوتیلے باپ کے متعلق ہوتی تھی اور کبھی اس کا تعلق پیشاب وغیرہ سے ہوتا تھا ۔ تب اس کا انداز بڑا تخریبی ہوتا تھا

گڑیوں کو پھاڑ دیتی تھی اور آنکھوں میں تنکے چبھو دیتی تھی۔

پانچ ملاقاتوں (Sessions) کے بعد لڑکی کا مزاج راستی پر آ گیا۔ اس کی بے چینی رفع ہو گئی اور جماعت میں ٹھیک کام کرنے لگی۔ بعض دفعہ بچوں کو کھیلنے کے لیے اتنی گڑیاں دی جاتی ہیں جتنے ان کے گھر کے افراد ہوتے ہیں ۔ بچوں کو کہا جاتا ہے کہ جتنا ان کا جی چاہے ان گڑیوں سے کھیلیں۔ بچہ ان سے گھر بناتا ہے انہیں مختلف جگہوں پر رکھتا ہے ۔ اگر اس کھیل کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ کھیل محض کھیل نہیں ۔ بچہ کھیل کے ذریعہ اپنی مشکلات بیان کر رہا ہوتا ہے اور حل ڈھونڈ رہا ہوتا ہے ۔

(iii) نفسی تمثیل (Psychodrama) : مریضوں کو کہا جاتا ہے کہ ڈرامہ کریں ۔ اس ڈرامے میں ان کے اپنے مسائل ہوتے ہیں ۔ ساربن (Sarbin) نے ایک کیس رپورٹ کیا ہے ۔ ایک ۲۱ سال کا نوجوان ہسپتال میں لایا گیا اس کا مرض انشقاق ذہنی (Schizophrenia) تھا ۔ اسے بجلی کے شاکس دیے گئے لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ یہ لڑکا سوسائٹی سے گھبراتا تھا ۔ بے حس اور بے شوق تھا ۔ خود ساختہ خیالات کی دنیا میں زندگی کاٹ رہا تھا ۔ اس مریض کے لیے ڈرامے تجویز ہوئے ۔ ابتدائی آزمائشوں سے پتہ چلا کہ وہ اپنے آپ کو ہائی سکول کا مقبول، با رسوخ ہیرو سمجھتا ہے لیکن اس کے پاس وہ ہنر نہیں تھے جن سے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنا سکے۔

پہلے اسے دوسرے مریضوں کے ڈرامے دکھائے گئے بعد میں اسے کہا گیا کہ وہ بھی کوئی ڈرامہ تیار کرے ۔ دوسرے سیشن پر اس نے کہا کہ وہ ٹیلیفون اپریٹر کا ڈرامہ کرے گا ۔ یہ ڈرامہ اس نے اکیلے ہی کیا، کوئی اس کا ساتھی نہ تھا ۔ حالانکہ جو ڈرامہ وہ دیکھ چکا تھا اس میں کئی کئی ساتھی ہوتے تھے ۔ اس کے بعد جو سیشن آیا اس میں اسے کسی اور کا ضمنی اداکار بننا پڑا ۔ یہاں پر اسے کسی جرنیل کی

جھڑکیاں سہنی پڑیں ۔ تیسرے سیشن میں اس نے ایسا ڈرامہ پیش کیا جس میں ضمنی اداکاروں کی ضرورت پڑی ۔ پہلے ڈراموں میں تو وہ حاضرین سے گھبراتا تھا ، لیکن یہ ڈرامہ اس نے بڑے چین اور سکون سے کیا ۔ لوگ اس کا ڈرامہ دیکھ رہے تھے لیکن اسے مطلقاً پروا نہ تھی۔ چوتھے سیشن میں پھر اسے ضمنی اداکار کا پارٹ ادا کرنا پڑا۔ اب وہ کسی اور کا باپ بنا اور جو رویہ اس کا باپ کے متعلق تھا وہ ہی رویہ اس لڑکے نے ظاہر کیا ۔

ان سیشنوں میں وہ لوگوں سے مل جل رہا تھا ۔ مل جل کر ڈرامہ کرتا تھا ۔ بلکہ فارغ وقت میں اپنے ڈرامہ کے ساتھیوں کے پاس جا کر صلاح مشورہ بھی کرتا تھا ۔ پانچویں سیشن میں اسے کہا گیا کہ وہ ہائی سکول کے طالب علم کا ڈرامہ کرے ۔ اس ڈرامہ میں اس نے لاشعوری طور پر اپنی مشکلات کا اظہار کیا ۔ لیکن اس کی گفتگو بالکل صحیح تھی اور جو مریض سکول کے ڈائرکٹر کا پارٹ ادا کر رہے تھے ان سے معقول طریقہ پر بات کر رہا تھا ۔

ان ڈراموں کے بعد مریض کا کردار بدل گیا ۔ لوگوں سے ملاقاتیں شروع ہو گئیں اور اس کا مرض دور ہو گیا ۔

(*vi*) **تحلیل خدری (Narco-analysis)** : اس علاج میں مریض کو نشہ آور دوائی دی جاتی ہے لیکن خیال رکھا جاتا ہے کہ مریض بےہوش نہ ہو جائے یا سو نہ جائے ۔ جب وہ نیم نشہ کی حالت میں ہوتا ہے تو اسے اپنے تکلیف دہ واقعات بتانے کے لیے کہا جاتا ہے ۔ اگر یہ علاج الجھنوں کی علامت ظاہر ہونے پر فوراً شروع کر دیا جائے تو بڑا کامیاب رہتا ہے ۔ جو دوائی عام طور پر دی جاتی ہے اس کا نام سوڈیم پنتھول (Sodium Panthol) ہے ۔ جب مریض حالات بتا چکتا ہے تو اسے تسلی دی جاتی ہے کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ۔ جنگ کے دنوں میں بعض فوجی نفسی الجھنوں

کی وجہ سے لنگڑے ہو گئے ۔ نشہ آور دوائی دے کر ان کی تحلیل کی گئی۔ بعد میں تسلی دی گئی تو ان کا لنگڑا پن جاتا رہا ۔

(ب) **تحلیل نفسی (Psycho-analysis)** : علاج کا یہ طریقہ فرائڈ کے نام سے منسوب ہے ۔ فرائڈ کی رائے میں عصبانی (Neurotic) کو صحت یاب بنانے کے لیے اس کے بچپن کے خیالات اور واردات تک پہنچنا لازمی ہے ۔ فرائڈ اپنے مریضوں پر نومیت کی حالت طاری نہیں کرتا تھا بلکہ انہیں آرام سے صوفے پر لٹا کر آزاد تلازم کی فرمائش کرتا تھا ۔ اس طریق کار سے مریض کی پرانی یادیں تازہ ہو جاتی تھیں ۔ مریض کا تلازم بالکل آزاد نہیں ہوتا تھا کیونکہ فرائڈ اس بات کی احتیاط کرتا تھا کہ مریض کے خیالات بے معنی راستوں پر نہ پڑ جائیں۔ اس لیے فرائڈ کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ مریض سے پچھلی رات کے خواب سنتا تھا اور خواب کی ہر مد پر آزاد تلازم کرایا جاتا تھا ۔ اس طرح سے جو پرانے خیالات یاد آتے تھے (اگر مریض مرد ہو) تو ماں سے محبت اور باپ سے عناد کے متعلق ہوتے تھے ۔ اگر لڑکی ہو تو معاملہ بر عکس ہوتا ۔ تحلیل سے بچے کے جذباتی رویے عیاں ہو جاتے تھے ۔ دیکھا گیا ہے کہ باپ کی طرف بچے کا رویہ کچھ محبت کا کچھ فرماں برداری اور کچھ مخالفت اور نفرت کا ملا جلا رویہ ہوتا ہے - جو رویہ مریض کا اپنے باپ کے متعلق ہو وہی نفسی معالج کی طرف منتقل ہو جاتا ہے - انتقال کے بعد مریض کی اصلاح شروع ہوتی ہے ۔ آہستہ، آہستہ مریض کو معالج سے علیحدہ کر کے خود مختار زندگی کے قابل بنا دیا جاتا ہے ۔

یاد رہے کہ یہ علاج بڑے لمبے عرصہ کا ہوتا ہے جب تک مریض مکمل کورس لینے کے لیے تیار نہ ہو یہ علاج نہیں کرنا چاہیے اگر مریض درمیان میں علاج چھوڑ دے تو اس کی حالت زیادہ خراب ہو جائے گی ۔

تحلیل نفسی کا طریق کار اس امر پر زور دیتا ہے کہ مرض کی تہہ

تک جانا چاہیے ۔ لہٰذا جو ڈر کسی نوجوان کو آج تنگ کر رہا ہے
وہ آج کی پیداوار نہیں ۔ اس کا آغاز بچپن میں ہوا ۔ مریض کو سمجھ
جانا چاہیے کہ بچپن کے واردات، بچپن کے بعد کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔
لہٰذا جب مریض کو علم ہو جاتا ہے کہ اس کی موجودہ تکلیف کا باعث
بچپن کا کوئی حادثہ ہے اور اس حادثے کی اب کوئی اہمیت نہیں تو تکلیف
رفع ہو جاتی ہے ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کوئی نوجوان چلتے پانی سے ڈرا
کرتا تھا۔ جب اسے پتہ چلا کہ اس کے موجودہ ڈر کا تعلق بچپن کے کسی
خوف اور احساس گناہ سے ہے تو ڈر جاتا رہا ۔ یوں بھی اگر ہمارے ڈر
اور خوف کسی مشروطی فعل کی بدولت بچپن کی پیداوار ہوں تو انھیں
بچپن کے بعد قائم رہنے کا کوئی حق نہیں ۔

فرائڈ نے نفسی امراض میں لاشعور پر زور دیا اور جنسی خواہشات
کو اہمیت دی لیکن کئی لوگ فرائڈ سے اتفاق نہیں رکھتے۔ ایڈلر(Adler)
شروع شروع میں فرائڈ کا شاگرد تھا بعد میں علیحدہ ہوگیا۔ اس کا طریقہ
زیادہ سادہ اور آسان ہے وہ مریض کا طرز زندگی (Style of life) معلوم
کرتا ہے اور اس سے مرض کی تشخیص ہو جاتی ہے ۔ مثلاً اگر کسی
عورت کو ہر پارٹی سے پہلے سر درد ہو جاتا ہے تو ایڈلر اس سر درد
میں مریض کا طرز زندگی دیکھتا ہے ۔ عورت کی سر درد سے سب لوگ
پریشان ہو جاتے ہیں ، عورت کو اس طرز سے تسلط اور غلبہ یا ہمدردی
اور شفقت حاصل ہو جاتی ہے ۔ ان دونوں طریقوں سے مریضہ کی برتری
کی خواہش پوری ہوتی ہے ۔ ایڈلر کا خیال ہے کہ ہر شخص میں غلبہ
پانے کی خواہش موجود ہے ، نفسی امراض اس غلبہ کی خواہش کو ظاہر
کرتے ہیں ۔

(ج) غیر ہدایتی مشورہ (Non-directive Therapy) ; تحلیل نفسی
کی طرح غیر ہدایتی مشورہ کا منشا بھی مریض کی موجودہ ہیجانی تکالیف

سے پرے جا کر اس کی صحت یابی کی تجاویز کرنی ہیں ۔ اس علاج میں مریض کی اپنی قابلیتوں اور صلاحیتوں پر بھروسہ کیا جاتا ہے ۔ معالج کی کوشش ہوتی ہے کہ مریض اپنی صحت کے لیے خود کوشش کرے ۔ مسائل کا حل خود ڈھونڈے اور بہتری کے نئے راستے خود تلاش کرے ۔ معالج کا کام خفیہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا ہے اور ایسا ماحول پیدا کرنا ہے جس میں مریض اپنی تکالیف کا خود اندازہ لگا سکے اور خود علاج معالجہ کرے ۔

اس علاج میں زندگی کے موجودہ مسائل پر زور دیا جاتا ہے نہ کہ مریض کے گزشتہ تجربات پر۔ معالج کا حصہ بھی بہت تھوڑا ہوتا ہے، وہ صلاح مشورہ نہیں دیتا ، تسلی دلاسا بھی نہیں دیتا ۔ وہ صرف ایک ہمدرد کی حیثیت سے مریض کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ اپنی تکالیف اور مسائل کو خود سمجھے۔ لہٰذا معالج نہ تو مریض کو شاباش کہتا ہے نہ ملامت کرتا ہے بلکہ اس کے احساسات کی آئینہ‌داری کرتا ہے ۔ امریکہ میں اس طریق علاج کا حامی راجرز (Rogers) ہے ۔ اس کی کتاب سے مندرجہ ذیل کیس بیان کیا جاتا ہے :

ایک عورت کو اپنے دس سالہ بچے سے نہایت تلخ تجربہ ہوا ۔ یہ تجربہ سیاہی کی دوات کے متعلق تھا۔ بچہ دوات کو سکول لے جانا چاہتا تھا ۔ ماں نے منع کیا، جب بچہ منع نہ ہوا تو اس نے بچے کو سخت مارا ۔ یہ قصہ ماں کی زبانی سنیے۔ گفتگو ماں اور مشیر کے درمیان ہو رہی ہے۔

ماں: تب میں نے اس سے کہا کہ دوات رکھ دو، وہ نہ مانا، اس پر میں نے کہا کہ دوات رکھوگے یا مار کھاؤگے ۔ لیکن وہ باز نہ آیا ۔ میں نے اسے خوب پیٹا ۔ بچہ بڑا پریشان ہوا لیکن مجھے پتہ نہیں کیا ہوا مجھے اسے دوات لے جانے دینی چاہیے تھی۔ دوات بالکل معمولی سی شے ہے، پھر میں ایسا طوفان نہیں مچنا چاہیے تھا ۔ اب میں حیران ہوں یہ کیوں ہوا ۔

مشیر : ہر سوال کا ایک جواب نہیں ہوتا خاص طور پر اس سوال کا جو تمھارے سامنے ہے - شاید تم بھی بہت پریشان ہوئی ہوگی -

ماں : میں بے حد پریشان تھی اور - - -

مشیر : دونوں پریشان ہوئے ہوں گے اور دونوں نے محسوس کیا ہوگا کہ بات تو کچھ بھی نہیں تھی -

ماں : ہاں میں نے اپنے خاوند کو بعد میں کہا کہ لڑکا بڑا پریشان ہے اور روتا رہا ہے - بس میں اسے اوپر لے گئی اور اسے نہلایا دھلایا - اسے کچھ سکون ہوا - پھر میں نے اسے کشتی لے دی اور خود برتن صاف کرنے لگ پڑی - جب قصہ ختم ہو گیا تو میں نے خاوند سے کہا کہ یہ سب میرا قصور تھا اور مجھے افسوس ہے کہ میں نے اسے دوات نہ لے جانے دی لیکن منع کرنے کے بعد میرے پاس بھی کوئی چارہ نہیں تھا۔

مشیر : ایسا اکثر ہوتا ہے جو بات منہ سے نکل جاتی ہے اس پر ہم ڈٹ جاتے ہیں -

اس انٹرویو میں دیکھیے - مشیر کا کام مشورہ دینا نہیں بلکہ ایک ہمدرد کی حیثیت سے عورت کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ خود اپنا مسئلہ سمجھ جائے۔ چنانچہ، وہ دو چیزیں سمجھ گئی کہ

(۱) اس کا سلوک بیٹے سے آمرانہ (Authoritarian) ہے -

(۲) وہ خود اس تکلیف کی ذمہ دار ہے -

ان دونوں امور کا علم، اصلاح کے لیے بڑا ضروری ہے - عورت نے خود اپنا مسئلہ سمجھا اور اسے حل کیا -

فرہنگ مصطلحات
(GLOSSARY)

A

After image بعد شبیہ
Astigmatism لاماسکیت
Auditory sensations سمعی تحسسات
Anvil bone آئرن نما ہڈی
Anosmia فقدان شامہ
Acuity حدت
Ampulla پھکنا
Analytic تحلیلی
Analysis تحلیل
Amplitude وسعت
Attention توجہ
Anticipatory توقعانہ
Attitudes رویے
Abnormal غیر طبعی
Association تلازم
Affection احساس
Alternative متبادل
Adjustment توافق ۔ تسویہ
Assimilative forces جذب کن قوا
Adrenal gland کظری غدودہیں
Adrenin مادہ کظریہ
Arc قوس
Anatomy علم تشریح
Activity تفاعل
Association reaction ایتلاف رد عمل
Assortment صف بندی
Anxiety neuroses اضطراری عصبانیت
Anesthesia تخدیر
Achievement تحصیل مہارت
Aversion کراہت
Artries لسیں
Abstraction تجرید
Autonomic nervous system خود اختیاری نظام عصبی
Aggression عدائیت
Aphasia حبسہ
Ability قابلیت
Aptitudes Tests صلاحیتوں کی آزمائشیں

Animism روحیت
Autistic خود کام
Axons محورے
Apraxia فساد فعلی
Agnosia لا ادراکیت
Adequate stimulii
مکتفی مہیجات
Absolute Threshold
مطلق دہلیز
Acme حد انتہا
Adaptability توافق پذیری
Adjustability مطابقت پذیری
Acquisitiveness تملک
Apperception ادراک

B

Brightness تابانی
Behaviorists کرداری
Behaviorism کرداریت
Biographical method
سرگزشت کا طریقہ
Behaviour Pattern
نظام کردار
Bowels آنتوں
Birth order ترتیب پیدائش

C

Complementry colours
متمم رنگ
Colour Blindness رنگ کوری
Cones مخروطی خلیے
Concave مجوف
Convex محدب
Compression دباؤ
Cochlea قاقلیہ
Cavity جوف
Consonants حروف صحیح
Crebellum دمیغ
Configural تشکیل دینے والی
Constancy استقلال
Ciliary muscles مژگانی عضلات
Consciousness شعور
Chain Reflex theory
اضطراری سلسلہ کا نظریہ
Conditioned learning
مشروطی آموزش
Constant معین
Cognition وقوف
Conation طلب
Cause علت
Choice انتخاب
Conflict کشمکش
Compulsive acts
اجباری حرکات
Complex خلط ۔ تعقید
Compensation تلافی
Curve of learning
آموزش کا خط
Commonsense فہم عامہ
Controlled observation
منضبط مشاہدہ

Case history method
مطالعہ احوال
Counseller-centred
مشیر مرکزی
Client-centred عمیل مرکزی
Complex reaction
مرکب رد عمل
Controlled association
منضبط ایتلاف
Criminology جرمیات
Combination اتصال
Cells خلیے
Chromosome اجسام لونیہ
Catharsis تنقیہ
Cerebrum مخ کبیر
Cross section قطع شدہ تراش
Cortex قشر
Capacity استعداد ۔ صلاحیت
Concept تعقل
Cornea قرنیہ
Concrete مقرون
Creative thinking تخلیقی فکر
Chronological age سنی عمر
Correlation باہمی تعلق
Choleric صفراوی
Code ضابطہ
Cutaneous جلدی
Coloured hearing
رنگدار سامعہ

Continuum principle
مسلسلہ کا اصول
Conjugate مزدوج

D

Disappearing colours pairs
معدوم رنگوں کے جوڑے
Double vision دوہری بصارت
Disc قرص
Distraction اختلال توجہ
Developmental method
نموئی طریقے
Dualism ثنویت
Deductive استخراجی
Day book method
روزنامچہ کا طریقہ
Dependent variable
تابع متغیرہ
Delinquent خاطی
Destructive forces تخریبی قوا
Dominant unit غالب عنصر
Dislikes نا پسند
Depression افسردگی
Differentiation امتیازات
Dendrites شجرے
Desires اشتہات
Diaphragm پردہ شکم
Distribution درجہ بندی ۔ تقسیم
Dynamic حرکی
Disintegration انتشار

Double personality دوہری شخصیت
Degeneration رفادت نسیج
Duration زمانیت ۔ مدت

E

Elementary ابتدائی
Ear drum طبل گوش
Emotion ہیجان
Exploration تجسس
Event وارده
Expectancy توقع
Evolution ارتقا
Empiricism تجربیت
Explanation توجیہ
Effect معلول
Epilepsy مرگی
Energy توانائی
Effectors برآور
Exceptions مستثنیات
Embryo جنین
Effective environment مؤثر ماحول
Emergency motives ہنگامی محرکات
Excitement جوش
Empathy درون احساسی
Exp licit جلی
Electrode برق مورچہ

Extirpation استیصال
Extraceptors خارجی اعضائے تحسسات
Extensity امتداد

F

Frequency تعدد
Fovea قعر
Focus ماسکہ
Farsightedness دراز نظر
Foresight پیش بینی
Forgetting فراموشی
Function فریضہ
Frustration ناکامی ۔ محرومی
Fixation تثبیت
Fluctuations of attention مد و جذر توجہ
Fringe of attention توجہ کا حاشیہ
Field study میدانی مطالعہ
Feeble mindedness ضعیف‌العقلی
Faith healing علاج بالاعتقاد
Fraternal twins اخوی توام
Foster children رضائی بچے
Foster parents اتکہ والدین
Feeling تاثر
Familiarity شناسائی

Frontal lobe جبہی لختہ

G

Generalisation تعمیات
Gestalt گسٹالٹ
Gene جواہر تخلیق
Genius فطین لوگ
Germ plasm جرثومہ حیات
Germ unit جوہر اکائی
Gonads مولدہ غدودیں
Goal مقصد
Gray مٹیالا رنگ

H

Hue لون
Hammer bone ہتھوڑا نما ہڈی
Hypnotism نومیت
Hallucination واہیت
Homeostasis ہم توازنی میلان
Hybrid دو نسلے
Hypothesis مفروضہ
Hindsight پس بینی

I

Interpretative stage توضیحی منزل
Illusion التباس
Impressions تأثرات
Images شبیہ ۔ تمثال
Involuntary attention انفعالی توجہ
Inattention بے توجہی
Insight بصیرت
Inductive استقرائی
Introspection مطالعہ باطن
Integration تکمل
Inhibition مزاحمت
Ideo-motor action تصوری حرکی حرکات
Imagery اشباع
Independent variable غیر تابع متغیرہ
Imagination تخیل
Intelligence score ذہانتی شمار
Identical twins مماثل توام
Indirect suggestion بالواسطہ القا
Instincts جبلات
Incentive ترغیب
Iris قرخیہ
Implicit مخفی
Incubation حضانت
Inspiration آمد
Intelligence ذہانت
Individual psychology انفرادی نفسیات
Intellect عقل
Idiot بدھو ۔ ابلہ
Imbecile بے وقوف

Introceptors
اندرونی اعضائی تحسسات

J

Juvenile deliquency
طفلانہ خطا

K

Kinaesthetic sensations
عضلی تحسسات

Keys کلیدیں

L

Lens عدسہ
Larynx حنجرہ
Liquid سیال
Learning آموزش
Law of frequency اصول تکرار
Law of recency اصول تاخر
Law of primary اصول اولیت
Law of intensity اصول تأثر
Likes پسند
Layer تہہ
Loco motor ataxia تحرکی ہرجلہ
Lymph بے رنگ پانی
Localisation تحصیر

M

Mixture محلول ۔ آمیزش
Myopia ضعف البصری
Migraine شقیقہ
Molecule سالمہ مادہ
Medulla oblangata
سر حرام مغز
Manipulation دست ورزی
Motive محرک
Memory حافظہ
Metronome تال ترازو
Muscle عضلات
Mythology اسطوریات
Memory image شبیہ حافظہ
Mathematics ریاضیات
Methodology طریقیات
Mal-adjustment
عدم مطابقت ۔ غلط تسویہ
Metabolism تحول
Mood مزاج
Muscular reaction
عضلاتی رد عمل
Monster عجیب الخلقت
Mongolism منگولی ہونا
Manic-depressive
مانیائی اضمحلال
Mental deficiency
ذہنی کم عقلی
Maturation پختگی
Motor activity حرکی فعلیت
Musculation نظام عضلات
Mean اوسط
Mental age ذہنی عمر
Moron احمق

Melancholia مالیخولیا

N

Nausea متلی
Nucleus مرکزی حصہ
Neuresthenia ضعف اعصاب
Non directive counselling
غیر ہدایتی مشورہ
Narco-analysis تحلیل خدری
Neruotic عصبانی
Negative correlation
منفی باہمی تعلق
Numerical عددی
Nervous system نظام عصبی
Neuron عصبانیہ

O

Overtones زائد سرتیاں
Organism عضویہ
Objective conditions
معروضی اسباب
Over-learning بیش آموزش
Objective observation
خارجی مشاہدہ
Odour بو
Objective motives
خارجی محرکات
Organic sensations
حشوی تحسسات
Orbit مدار
Optimistic رجائی
Occipital lobe فص مؤخری

P

Purple اودا رنگ
Primary colour اصلی رنگ
Partial colour blindness
جزوی رنگ کوری
Pitch ٹھاپ
Physiological drives
فعلیاتی محرکات
Perception ادراک
Percept درک
Passive انفعالی
Perspective تناظر
Physiology فعلیات
Phi-phenomenon فائی مظہر
Pre perceptive قبل ادراکی
Place learning مقاماتی آموزش
Physiological limit فعلیاتی حد
Plateau حدب
Psycho-analysis تجزیہ نفس
Psychology نفسیات
Peripheral factors محیطی عناصر
Pessimism یاسیت ـ قنوطیت
Primary memory image
ابتدائی شبیہ حافظہ
Prediction پیش گوئی
Perceptual ادراکی

Pancreas gland لبلبہ غدود
Pituitary gland بلغمی غدود
Polymorphous perverse
کثیرالاشکال بے راہ
Plasticity شکل پذیری
Pleasantness خوشگواری
Preferences ترجیحات
Psychosomatic نفسی بدنی
Premises مقدمات
Prodigies عجوبۂ روزگار
Positive correlation
مثبت باہمی تعلق
Projective techniques
تظلیلی تکنیک
Pessimistic قنوطی
Phelgmatic بلغمی
Protoplasm خزمایہ
Peripheral nervous system
محیطی نظام عصبی
Para-sympathetic nervous
system چھوٹا شرکی نظام
Parietal lobe جداری فص
Pathological method
امراضیاتی طریقہ
Pre motor area قبل حرکی رقبہ
Proprio-ceptors
عضوی اعضائے تحسسات
Presbyopia بصرالشیوخ

Q

Quantity کمیت
Quality کیفیت

R

Rods مستقیم خلیے
Retina شبکیہ
Rhythm ترنم - تناسب
Receptors آخذات
Reinforcement تقویت
Retention خازنیت
Recall بازیافت
Recognition شناخت
Recitation قرأت - دہرائی
Re-learning مکرر آموزش
Rationalism عقلیت
Response رد عمل
Reflex اضطراری فعل
Retro-active inhibition
معکوس فعالی مزاحمت
Realistic حقیقت پسندانہ
Regression رجعت
Rationalization تعقیل
Reassurance طمانیت
Reaction time زمان رد عمل
Recessive unit فراری عنصر
Resistance مدافعت
Reward صلہ - جزا
Reasoning استدلال

Relaxation تسکین - ستانا
Raw score کچا شمار
Rating درجہ بندی
Role کردار

S

Saturation سیری
Salient نمایاں
Spectrum عکس شعاعی
Simultaneous contrast ہم وقت تضاد
Scotoma تاریک نقطہ
Successive contrast سلسلہ وار تضاد
Stirrup bone رکاب نما ہڈی
Sensory adaptation حسی تطبیق
Solution محلل
Sensation محسسات
Static sensitivity سکونی محسسات
Semi-circular canals نیم دائرہ نالیاں
Stimulus مہیج
Symbolic علامتی
Set سٹ
Span of attention توجہ کی وسعت
Subjective conditions موضوعی اسباب
Suggestion ایماء
Struggle for existence تنازع للبقا
Sequence تواتر
Span of memory حافظہ کی وسعت
Spaced repetition غیر مسلسل اعادہ
Score شمار
Sensitive حساسی
Sensory nerves حسی اعصاب
Self assertion اثبات ذات
Scape goat صدقے کا بکرا بنانا
Sadism سادیت
Stereotype تبیک
Sublimation ترفیع - ترفع
Sensori-motor arc حسی حرکی قوس
Sensorial reaction حسی رد عمل
Segregation, law of قانون علیحدگی
Spinal cord نخاع - حرام مغز
Sensitivity حسیت
Spurt تیز رفتاری
Self regulating خود انضباطی
Synthesis ترکیب
Sentiment جذبات
Self-abasement انکساری

Strangeness اجنبیت
Sympathy ہمدردی
Sensationism حس پسندی
Standard deviation
انحراف معیاری
Scatter پھیلاؤ
Statistical methods
شماریاتی طریقے
Spatial مکانی
Sanguine دموی
Subject معمول - زیر تجربہ فرد

T

Total colour blindness
مکمل رنگ کوری
Tunnel vision سرنگ بصارت
Timbre خاصیت آواز
Tones سریں
Tendons رباط - اوتار
Tabesdorsal فراع
Thalamus عرشہ
Trail and error
آموزش بہ سعی و خطا
Tendencies میلانات
Tool learning آلاتی آموزش
Temporal contiguity
زمانی قرب
Technique تکنیک
Tradition روایات
Touch group لامسی گروپ
Tissues بافتوں
Thyriod gland درقیہ غدود
Tri-dimensional theory of feeling نظریہ ابعاد ثلاثہ
Tension تناؤ
Testimony شہادت
T.A.T. نفس مضمون کے ادراک کی آزمائشیں
Temperament طبع
Taboo تابو

U

Ultra violet rays
بالائے بنفشی شعاعیں
Unconscious لاشعور
Unspaced repetition
غیر مسلسل اعادہ
Unpleasantness ناخوشگواری

V

Vibration ارتعاش
Violet بنفشہ
Visual contrast تضاد بصری
Visual defects بصری نقائص

Vocal cord اوتار صوت
Vowels حروف علت
Viscera احشا
Vestibule دهلیز
Visual perception
بصری ادرک
Variable متغیرہ
Valence گرفت
Vector خط حامل
Verbal method لفظی طریقہ
Visual map بصری نقشہ
Verification تصدیق

Vocational guidance
پیشہ ورانہ رہنمائی

W

Wave length طول موج
Will power قوت ارادہ
Whole and part method
کلی اور جزی طریقہ
World of ideas عالم مثال
World of sense experience
عالم حسیات
World association
لفظی ایتلاف